درسی تفسیر
تبیان الفرقان
الاول
امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
حکیم العصر محدث دوراں مخدوم العلماء محبوب الطلباء
حضرت اقدس مولانا عبدالمجید لدھیانوی صاحب
مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ
اردو بازار لاہور

مکتبہ جلیلیہ رشیدیہ
اردو بازار لاہور 0321-4102117/0332-4377621

فہرست

سورۃ الفاتحہ

سورۃ البقرۃ

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ الخ

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا الخ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي الخ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً الخ

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً الخ

وَقُلْنَا يَآ اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ الخ

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ الخ

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی الخ

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا الخ

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ الخ

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا الخ

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ الخ

یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ الخ

وَمَنۡ یَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ الخ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ الخ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ الخ

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا الخ

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ الخ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ الخ

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ

سَلْ بَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ الخ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ الخ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ الخ

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى الخ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ الخ

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ الخ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ الخ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ الخ

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ الخ

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْ الخ

حرف اوّلیں

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ کی لاریب کتاب ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پروردگار عالم نے لی ہے، اور چودہ سو سال سے امت اس سے تعلق قائم کیے ہوئے ہے، قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے علوم ومعارف کو سمجھنا بھی نہایت اہم فرض ہے، وہ علم جس میں قرآن کریم کے علوم ومعانی کو بیان کیا جائے اور اس کی حکمتوں کو واضح کیا جائے اس کو اصطلاح میں علم تفسیر کہا جاتا ہے۔

رسول پاک ﷺ کے فرائض منصبیہ میں جہاں تلاوت کتاب ہے وہاں تعلیم کتاب وحکمت بھی اس میں شامل ہے اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے" وانزلنا الیك الکتاب لتبین للناس مانزل الیھم "اور ہم نے قرآن پاک اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے وہ باتیں وضاحت سے بیان کریں جو ان کی طرف اتاری گئی ہیں، دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے "ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة "اس میں تلاوت کتاب کے ساتھ تعلیم کتاب کو علیحدہ ذکر کیا ہے۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی کی بھی تعلیم دیتے تھے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے شاگردوں کے سامنے معانی کی وضاحت کرتے، اور وہ اپنے شاگردوں کے سامنے، یوں یہ سلسلة الذہب چلتا رہا اور ہر دور کے اہل علم دوسروں تک پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب محدث جلیل، مفسر کبیر، ولی وقت، حضرت اقدس الشیخ مولانا عبدالمجید صاحب لدھیانوی دامت برکاتہم العالیہ نے اپنے بزرگوں سے حاصل کئے ہوئے تفسیری علوم کو طالبان علوم نبویہ تک پہنچانا شروع کیا، اور آپ کے تفسیری ذوق اور اکابرین پر اعتماد کامل کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ کے تفسیری دروس کا شہرہ دور دور تک ہوا اور طلباء آپ کے ارد گرد جمع ہونے لگے اور یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا، اس سلسلہ کی ایک جھلک آپ نے "قطرات الیم فی تفسیر پارہ عم" میں ملاحظہ

کی ہوگی، جس کو کچھ عرصہ قبل شائع کرنے کی سعادت حاصل کی اور عوام وخواص نے اس کو بہت سراہا، اور مزید کی فرمائش کی، اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے حضرت الشیخ مدظلہ کے تفسیری علوم ومعارف میں سے فی الوقت سورۃ البقرۃ کی تفسیر شائع کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

حضرت الشیخ مدظلہ کا انداز خطبات ومواعظ کی طرح تفسیر میں بھی عام فہم اور نہایت سادہ ہے، بامحاورہ ترجمہ اپنی مثال آپ ہے، اور پھر تفسیر کرتے ہوئے تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر القرآن بالحدیث، تفسیر القرآن باقوال الصحابۃ والتابعین والائمۃ المجتہدین والاکابرین (علماء دیوبند) کے اہتمام نے اس کو چار چاند لگادیے ہیں اور ہر آیت کی تفسیر وتشریح ایسے محققانہ، سلیس عام فہم اور سادہ انداز میں کی گئی ہے کہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ موضوع ہونے کے باوجود ہر آیت کا معنیٰ، مفہوم، مطلب، شان نزول اور ماقبل ومابعد سے ربط بالکل واضح ہوتا چلا جاتا ہے، اور ہر قاری اس کو سب سے آسان موضوع سمجھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے پناہ شکر ادا کرتے ہیں اس بات پر کہ "قطرات الیم فی تفسیر پارہ عم" کی اشاعت پر کیے جانے والے وعدے کو پورا کرنے کی یہ چھوٹی سی کاوش ہے، ان شاء اللہ العزیز باقی قرآن پاک کی تفسیر کو بھی سلسلہ وار شائع کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہم پر اتنا بڑا احسان فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم نے کیسٹوں سے اتار کر اس کو کتابی شکل میں آپ حضرات کے سامنے پیش کیا، ہم اللہ تعالیٰ سے اخلاص اور للّٰہیت کی بھی توفیق مانگتے ہیں اور بقیہ تفسیری کام کو مکمل کرنے کی بھی توفیق مانگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اس سلسلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں اور اس تفسیر کو ہم سب کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائیں۔

زیر نظر تفسیر حضرت الشیخ مدظلہ کی تصنیف نہیں بلکہ طلباء کے سامنے درس ہے درس اور تصنیف کا فرق بالکل واضح ہے، سمجھانے کے لئے حضرت الشیخ مدظلہ نے بات کو مختلف انداز میں بھی پیش کیا ہے، اس لئے اس میں آپ کو تکرار بھی نظر آئے گا اگر آپ اس کے مطالعہ کے دوران درس گاہ کے ماحول کو مدنظر رکھ کر مطالعہ کریں گے تو ان شاء اللہ العزیز بہت فائدہ ہوگا اور استاذ کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے کا لطف پائیں گے۔

"قطرات الیم فی تفسیر پارہ عم" پر کچھ آراء سامنے آئیں جن کو مدنظر رکھا گیا ہے اب بھی قارئین سے گزارش ہے کہ اس سلسلہ کو مزید مفید سے مفید تر بنانے کے لئے اپنی آراء سے مطلع فرمائیں، بہت شکریہ کے ساتھ

آپ کی آراء کو قبول کیا جائے گا، نیز اگر کہیں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو اس سے بھی آگاہ فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو سکے۔

امسال حضرت الشیخ مدظلہ دامت برکاتہم جب حج پر تشریف لے جانے لگے تو بندہ نے عرض کیا کہ تفسیر کا نام تجویز فرمادیں حضرت نے خاموشی اختیار فرمائی، اللہ تعالیٰ نے کرم کا معاملہ فرمایا حضرت الشیخ مدظلہ جب حج سے واپس تشریف لائے تو فرمانے لگے کہ میں حرم کی طرف جارہا تھا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس تفسیر کا نام ''تبیان الفرقان'' ڈالا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقبولیت کی دلیل ہے۔

آخر میں ''من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ'' کے تحت شکریہ ادا کرتا ہوں ان تمام حضرات کا جنہوں نے اس مجموعہ کی تیاری میں حصہ لیا بالخصوص میں دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں حضرت مولانا قاری نسیم الدین صاحب کے لئے جنہوں نے عرصہ دراز تک تمام کیسٹوں کو محفوظ رکھا اور ہماری درخواست پر بڑی فیاضی سے کیسٹوں کا پورا سیٹ عنایت کیا، اور برادر صغیر مولانا قاری محمد زاہد اقبال صاحب (مدیر جامعہ حفصہ چیچہ وطنی) کے لئے جنہوں نے حضرت الشیخ مدظلہ کے دروس کو کیسٹوں میں محفوظ کیا۔

اور برخوردار عزیزم مفتی صہیب ظفر سلمہ جنہوں نے اس مجموعہ کی تیاری اور اشاعت میں بھرپور محنت کی، اور مولوی صہیب محمود و مولوی حامد علی جنہوں نے اس کو کمپوز کیا اور مولوی کلیم اختر جنہوں نے اس کی پروف ریڈنگ کی، آخر میں اپنے بہت ہی مخلص دوست کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے اس تفسیر کی اشاعت میں زر کثیر صرف فرمایا اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اپنی شایان شان اجر عظیم عطا فرمائیں اور اس مجموعہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر لوگوں کے لئے ہدایت اور بندہ کے لئے نجات اخروی کا ذریعہ بنائیں۔

(آمین)

ابوطلحہ ظفر اقبال غفرلہ

ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑپکا

سورۃ الفاتحہ مکی ہے اس کی سات آیتیں اور ایک رکوع ہے

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ﴿۲﴾

سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے ﴿۱﴾ بے حد مہربان ہے نہایت رحم والا ہے ﴿۲﴾

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ﴿۳﴾ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؕ﴿۴﴾

جزا کے دن کا مالک ہے ﴿۳﴾ (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ﴿۴﴾

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ

ہمیں سیدھے راستے پر چلا ﴿۵﴾ راستہ ان لوگوں کا جن پر تو نے انعام

عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ﴿۶﴾ ع

کیا ۙ۬ جن پر غضب نہیں کیا گیا اور نہ وہ بھٹکنے والے ہیں ﴿۶﴾

تفسیر:

سورۃ الفاتحہ کے اختتام پر لفظ ''آمین'' کہنا مسنون ہے جیسا کہ روایات میں آیا ہوا ہے (بخاری ج ۱ ص ۱۰۸) ''آمین'' کا معنی ہے اے اللہ! قبول فرما، اس لیے دعاؤں کے بعد یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم:

سورۃ الفاتحہ کے ساتھ لفظ ''مکیہ'' لکھا ہوا ہے اور قرآن کریم کی سورتوں پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو بعض

سورتوں کی ابتداء میں مکیہ لکھا ہوا ہوتا ہے اور بعض سورتوں کی ابتداء میں ’’مدنیہ‘‘ لکھا ہوا ہوتا ہے جیسا کہ اگلی سورۃ شروع ہوگی سورۃ البقرۃ اس کے ساتھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابتداء میں ’’مدنیہ‘‘ کا لفظ لکھا ہوا ہے، قرآن مجید کی سورتیں دو حصوں میں تقسیم ہیں؛ بعض مکی کہلاتی ہیں اور بعض مدنی کہلاتی ہیں لیکن یہ دو حصوں پر تقسیم کس طرح سے ہوئیں؟ سرور کائنات ﷺ کی تیئس (۲۳) سالہ زندگی جو نبوت کی زندگی ہے وہ دو حصوں میں تقسیم ہے، ابتدائی تیرہ سال مکی زندگی کہلاتی ہے اور بعد والے دس (۱۰) سال مدنی زندگی کہلاتی ہے، قرآن کریم کی جو سورتیں یا جو آیات سرور کائنات ﷺ کی ہجرت سے قبل نازل ہوئیں ان کو مفسرین کی اصطلاح میں مکی کہتے ہیں، مکی کا یہ مفہوم نہیں کہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہوں بلکہ مکی کا مفہوم یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ کی مکی زندگی میں نازل ہوئیں اور مکی زندگی حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے تک ہے پھر وہ سورۃ چاہے مکہ معظمہ شہر میں اتری ہو، چاہے مکہ معظمہ کے اردگرد علاقے میں اتری ہو سرور کائنات ﷺ سفر میں ہوں تو کہیں مکہ معظمہ سے دور اتری ہو، اس سے بحث نہیں ہے جو ہجرت سے قبل سورتیں یا آیات اتری ہیں وہ ساری کی ساری اصطلاح مفسرین میں مکی کہلاتی ہیں۔

اور جس وقت حضور ﷺ نے مکہ معظمہ سے ہجرت کرلی پھر آپ ﷺ کی زندگی مدنی بن گئی، اب جو سورتیں یا جو آیات ہجرت کے بعد اتریں وہ مدنی کہلاتی ہیں چاہے وہ مدینہ منورہ میں اتری ہوں، چاہے مدینہ منورہ سے باہر کسی میدان میں اتری ہوں حتیٰ کہ اگر سرور کائنات ﷺ ہجرت کے بعد سفر کر کے مکہ معظمہ میں تشریف لائے ہوں اور وہاں کوئی سورۃ اتری ہو تو وہ بھی اصطلاحی طور پر مدنی کہلائے گی تو اس طرح ہجرت کے بعد جو سورتیں یا جو آیات اتریں وہ مدنی کہلائیں گی۔

سورۃ الفاتحہ کے ساتھ لکھا ہوا ہے ’’مکیہ‘‘ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی اور یہ سورۃ ان سورتوں میں سے ہے جو ابتداء اسلام میں اتری ہیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ اس کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا اور ایک دفعہ اس کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا اس کی عظمت کے طور پر، اس لیے اس کو مکی بھی کہہ سکتے ہیں اور مدنی بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن معروف یہی ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے اور ابتدائی اترنے والی آیات میں سے ہے۔

سورۃ الفاتحہ کی آیات کی تعداد:

مجموعہ اس کی سات آیتیں ہیں اس بات پر فقہاء رحمہم اللہ اور مفسرین رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں ہیں اسی لیے ’’سورۃ الحجر‘‘ میں جو ذکر آیا ہے ’’(اتینٰک سبعا من المثانی)‘‘ کا تو سبعا من المثانی‘‘ کا مصداق بھی اسی سورۃ کو قرار دیا گیا ہے (بخاری ج ۲ص ۶۸۳) سات بار بار دہرائی ہوئی آیتیں چونکہ ان کو بار بار دہرایا

جاتا ہے نماز کے اندر کثرت سے یہ سورۃ پڑھی جاتی ہے، جتنی تلاوت اس سورۃ کی ہوتی ہے اتنی تلاوت کسی دوسری سورۃ کی نہیں ہوتی، اس لیے اس کو سات بار بار دہرائی ہوئی آیتوں کا مصداق قرار دیا گیا ''سبعا من المثانی'' جب اس کا مصداق سورۃ الفاتحہ کو قرار دیا گیا ہے تو اس لحاظ سے گویا کہ منصوص ہو گیا کہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں ہیں۔

بسم اللہ سورۃ کا جزء ہے یا نہیں؟:

آگے فقہاء ﷭ کے درمیان کچھ تھوڑا سا اختلاف ہے، فقہی مسئلہ کی تفصیل اس سبق کے اندر زیادہ نہیں کی جاتی لیکن ابتداء سبق ہونے کی بناء پر اشارہ کرتا ہوں مسئلہ حدیث شریف میں آئے گا۔

سورۃ الفاتحہ کا ''**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**'' جزء ہے یا نہیں؟ ''**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**'' جو ابتداء میں تحریر ہے یہ سورۃ الفاتحہ کا جزء ہے یا نہیں؟ فقہاء ﷭ کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، قرآن کریم میں جتنی بھی سورتیں آئی ہیں ان میں سے صرف ایک ''سورۃ البراۃ'' کو چھوڑ کر باقی سب سورتوں کی ابتداء میں یہ **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** ''تحریر ہے۔

احناف ﷭ کے نزدیک ''**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**'' کے الفاظ قرآن مجید کا جزء تو ہیں، قرآن کریم کی ایک آیت ہے لیکن ''سورۃ نمل'' کے علاوہ باقی کسی اور سورۃ کا یہ جزء نہیں ہے ''سورۃ نمل'' کے وسط میں آیت آئی ہوئی ہے ''انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' تو یہ الفاظ'' سورۃ نمل'' کا جزء ہیں لیکن جو سورۃ کی ابتداء میں لکھی ہوئی ہے وہ کسی سورۃ کا جزء نہیں ہے نہ ''سورۃ الفاتحہ'' کا اور نہ کسی اور سورۃ کا، دو سورتوں کے درمیان میں فصل کرنے کے لیے اور تبرک کے طور پر یہ آیت اتری تھی۔

اس لیے احناف ﷭ قرآن کا جزء تو قرار دیتے ہیں، متعین طور پر کسی سورۃ کا جزء قرار نہیں دیتے اس ''**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**'' کو جو ابتداء میں لکھی ہوئی ہے ''سورۃ نمل'' کے وسط میں چونکہ یہ الفاظ آ گئے اس لیے ''سورۃ نمل'' کا یہ جزء ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ حضرات کے نزدیک رمضان المبارک میں قرآن مجید سناتے وقت اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کم از کم ایک دفعہ ''**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**'' کو جہراً پڑھ لیا جائے جس جگہ بھی پڑھ لیا جائے شروع میں، آخر میں، ایک دفعہ جہراً اس کو پڑھ لیں تاکہ سارے کا سارا قرآن جہراً پڑھنے کا مصداق متحقق ہو جائے اور اگر ایک دفعہ بھی ''**بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ**'' آپ جہراً نہیں پڑھیں گے کسی سورۃ کی ابتداء میں بھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک آیت آپ نے تراویح کے اندر چھوڑ دی، ایک دفعہ اس کا پڑھنا احناف کے نزدیک ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم کا یہ جزء ہے تو'' آیت من القرآن''

ہونے کے طور پر جب اس کی ایک دفعہ تلاوت ہو جائے گی تو قرآن کریم مکمل ہو جائے گا اور اگر آپ اس کو نہیں پڑھیں گے تو ایک آیت کم رہ جائے گی۔

بعض فقہاء ﷭ اور قراء کے نزدیک "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" جو ابتداء میں لکھی ہوئی ہے یہ ہر سورۃ کا جزء ہے اور پھر "سورۃ الفاتحہ" کے متعلق اکثریت کی رائے یہی ہے کہ یہ "سورۃ الفاتحہ" کا جزء ہے، جس وقت "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو "سورۃ الفاتحہ" کا جزء بنالیا جائے گا تو پڑھتے وقت بھی اس کی ہیئت وہی ہوگی جو "سورۃ الفاتحہ" کی ہے جب آپ "سورۃ الفاتحہ" کو جہراً پڑھیں گے تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" بھی ساتھ آپ کو جہراً پڑھنی پڑے گی، جس وقت "سورۃ الفاتحہ" کو سراً پڑھیں گے پھر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ بھی "سورۃ الفاتحہ" کے ساتھ سراً پڑھنی پڑے گی، جب یہ اس کی آیت بن گئی، اس کا ایک جزء بن گیا تو جو صفت جہراً و سراً ہونے کے اعتبار سے "سورۃ الفاتحہ" کی ہوگی وہی صفت "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی ہوگی، اگر اس کو جہراً پڑھنا ہے تو اس کو بھی جہراً پڑھیے اگر اس کو سراً پڑھنا ہے تو اس کو بھی سراً پڑھیے۔

اس لیے جب اس مسئلے کے اختلاف کو ذکر کیا جاتا ہے حدیث شریف میں تو جن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو "سورۃ الفاتحہ" کے ساتھ جہراً نہیں پڑھتے تھے یہی احناف ﷭ کی دلیل ہوتی ہے کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" "سورۃ الفاتحہ" کا جزء نہیں ہے، ورنہ اگر جزء ہوتا تو جب "سورۃ الفاتحہ" جہراً پڑھی تھی تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" بھی جہراً پڑھتے، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان ﷢ کا عمل روایات کے اندر تفصیل سے موجود ہے ان کے عمل کو جب ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ "سورۃ الفاتحہ" کی ابتداء "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" سے کیا کرتے تھے اور "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" جہراً نہیں پڑھتے تھے یہی دلیل بن جاتی ہے اس کی کہ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" "سورۃ الفاتحہ" کا جزء نہیں ہے اگر جزء ہوتا تو جیسے فاتحہ کو جہراً پڑھا تھا تو اسی طرح سے "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو بھی جہراً پڑھتے، چنانچہ جن کے نزدیک جزء ہے ان کے نزدیک پڑھنے کا طریقہ یہی ہے کہ فاتحہ جہراً پڑھو تو ساتھ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو بھی جہراً پڑھیئے تو جب ان کے نزدیک "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو جزء بنا لیا جائے گا "سورۃ الفاتحہ" کا، آیات ان کے نزدیک بھی سات ہی ہیں، آیات کی تعداد نہیں بڑھتی "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کو ساتھ شامل کر کے، وہ بھی آیتیں سات ہی قرار دیتے ہیں۔

پھر آگے جا کر آخری جو دو آیتیں ہیں ان میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ ہمارے نزدیک صِرَاطَ الَّذِيْنَ

اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ اس پر بھی آیت ہے اوران کے نزدیک صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ کے اوپر آیت نہیں ہوگی بلکہ وہ آخر تک ایک آیت قرار دیتے ہیں تو گویا ان کے نزدیک " صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ " یہ ساری ایک آیت بن جائے گی اور احناف رحمہم اللہ کے نزدیک " صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ " یہ بھی آیت ہے اور " غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ " یہ بھی مستقل آیت ہے۔

بہر حال اس بات پر اتفاق ہوگیا کہ اس کی سات آیتیں ہیں باقی سات آیتیں کس طرح سے ہیں " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " کو ساتھ شامل کرکے یا بغیر " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " کے یہ فقہاء رحمہم اللہ کے نزدیک مختلف فیہ بات ہے۔

عمل احتیاط پر ہونا چاہئے:

احناف رحمہم اللہ کا یہ متعین مسلک ہے کہ " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " قرآن مجید کی کسی بھی سورۃ کا جزء نہیں ہے حتیٰ کہ " سورۃ الفاتحہ " کا بھی جزء نہیں ہے لیکن نماز پڑھتے وقت ہمیشہ اکابر علماء تلقین فرمایا کرتے ہیں کہ اختلاف سے نکلنا اور بچنا اچھا ہوتا ہے اس لیے نماز میں " سورۃ الفاتحہ " کی ابتداء میں سراً " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " ضرور پڑھ لینی چاہیئے اگر چہ ہمارے نزدیک ضروری نہیں ہے لیکن دوسروں کے نزدیک چونکہ وہ " سورۃ الفاتحہ " کا جزء ہے ان کے نزدیک اس کا پڑھنا ضروری ہوا، ہمارے نزدیک اس کا پڑھنا کوئی ممنوع نہیں ہے تو اس لیے اگر " سورۃ الفاتحہ " سراً پڑھنی ہے تو بھی " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " پڑھیئے اور اگر " سورۃ الفاتحہ " جہراً پڑھنی ہے تو بھی سراً " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " پڑھ لینی چاہیئے تاکہ اس اختلاف سے انسان کسی نہ کسی طریقے سے نکل جائے کہ فاتحہ کی ایک آیت کسی کے نزدیک چھوٹے نہیں، ورنہ جن کے نزدیک " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " " سورۃ الفاتحہ " کا جزء ہے تو جب ہم " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " نہیں پڑھیں گے تو ایسا ہوگا گویا کہ نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے ہم نے ایک آیت چھوڑ دی۔

مسئلہ اس طرح سے ہے یعنی پہلی رکعت میں تو آپ پڑھتے ہی ہیں " اعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم " " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " افتتاح کے بعد جس طرح سے پڑھا جاتا ہے تو جب آپ دوسری رکعت کی طرف اٹھیں تو خیال کرکے سراً " بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ " پڑھ لینی چاہیئے چاہے " سورۃ الفاتحہ " جہراً پڑھنی ہو چاہے " سورۃ الفاتحہ " سراً پڑھنی ہو پھر اس کے بعد " سورۃ الفاتحہ " شروع کرنی چاہیئے، تو یہ سبع آیات کی تفصیل تھی جو آپ کی خدمت میں عرض کی گئی یہ سات آیتیں ہیں۔

سورۃ الفاتحہ کے متعدد نام:

''الفاتحہ'' اس کا نام ہے ''الفاتحہ'' اس کو اس لیے کہا گیا کہ قرآن کریم کا افتتاح اس کے ذریعے سے کیا گیا ہے، فاتحہ کے معنی ابتداء کرنے والی، فتح کرنے والی، قرآن مجید کا افتتاح جمع کرتے وقت چونکہ اسی کے ساتھ ہی کیا گیا اس لیے اس کو سورۃ الفاتحہ کہتے ہیں، ویسے اس کے متعدد نام حدیث شریف میں آتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں اس کو ''اُمّ الکتاب'' بھی کہا گیا ہے'' اُمّ القرآن'' (بخاری ج ۲ ص ۶۴۲) بھی کہا گیا ہے۔

''اُمّ الکتاب'' اس کا لفظی معنی بنتا ہے کتاب کی اصل'' اُمّ القرآن'' ''قرآن کی اصل'' ام اصل کے معنی میں ہوتا ہے'' اُمّ الکتاب'' اور اُمّ القرآن کہنے کی وجہ بھی علماء کی تشریح کے تحت اس طرح سے ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت قرآن کریم کے تمام تفصیلی مضامین کو اشارۃً اس سورۃ کے اندر بند کر دیا بالکل اس طرح سے جیسے آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بیج ہوتا ہے جس وقت اس کو بویا جاتا ہے اس میں سے ایک مفصل درخت یا ایک مفصل پودا نکلتا ہے اور علم نباتات والوں کے نزدیک اس پودے کی اور اس درخت کی پوری تصویر اس بیج کے اندر بند ہوتی ہے یعنی اگر خورد بین کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ بیج کے اندر کتنی حیات کا اثر ہے، اس سے جو پودا نکلے گا وہ کتنا بڑا ہو گا اور کتنی دیر تک وہ سرسبز رہ سکتا ہے، کتنا وہ پھیلے گا تحقیقات کے تحت یہ بیج کی طرف دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے، اتنا بڑا درخت جو آپ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کا اجمالی وجود جس طرح ایک بیج میں ہے کہ جب اس کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق بویا جاتا ہے، اس کو سینچا جاتا ہے، پانی دیا جاتا ہے تو پھر اس میں سے کونپل نکلتی ہے پھر مکمل پودا بن جاتا ہے جب کہ اس پودے کی اصل وہی بیج ہوتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں جتنے مضامین ہیں وہ اجمال کے درجہ میں اشارۃً اس سورۃ کے اندر سمو دیئے گئے ہیں، اس میں بھر دیئے گئے اور آگے جو بھی مضمون آئے گا وہ ایک قسم کی سورۃ الفاتحہ کی تفصیل کے درجے میں ہوگا اس کو بنیاد کے درجے میں، قرآن کریم کے اصل کے درجے میں رکھ دیا گیا اور وہ سارے کے سارے مضامین اس میں کس طرح سے سمو دیئے گئے ان شاء اللہ العزیز اس کی تشریح اپنے وقت پر آپ کے سامنے آتی چلی جائے گی ''اُمّ الکتاب'' اور'' اُمّ القرآن'' کہنے کی یہ وجہ ہے۔

ایسے ہی حدیث شریف میں اس سورۃ کا نام'' سورۃ الشفاء'' بھی ذکر کیا گیا ہے (قرطبی) شفاء باطنی امراض سے تو ہے ہی جس طرح سے قرآن کریم کو'' ھدی وشفاء'' ذکر کیا گیا کہ جتنی اس کی تلاوت کرو گے، پڑھو گے،

اس کے اندر غور کرو گے تو جس کے اندر مختلف قسم کے روگ ہوتے ہیں، بیماریاں ہوتیں ہیں ان سے یہ شفاء ہے، حسد ہو گیا، بغض ہو گیا، دل کے اندر دیگر امراض جن کی تفصیل آپ کے سامنے تصوف اور اخلاق کی کتابوں میں آتی رہتی ہے، قرآن کریم میں ان سب بیماریوں کا بھی علاج ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ صرف روحانی امراض کا علاج نہیں، قلبی امراض کا علاج نہیں بلکہ یہ جو جسمانی طبی امراض ہوتی ہیں قرآن کریم میں اس کا بھی علاج ہے۔

چودہ سو سال سے اس شعبے میں بھی قرآن کریم کا استعمال اُمت کے اندر چلا آرہا ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ بیماریاں قرآن کریم کی آیات پڑھ کر پھونکنے کے ساتھ یا آیات لکھ کر گلے میں ڈالنے کے ساتھ، ان آیات کے ورد کرنے کے ساتھ بیماریاں دور ہو جاتی ہیں، خصوصیت کے ساتھ "سورۃ حمد" کو تو "سورۃ شفاء" قرار دیا گیا ہے اور ہر بیماری سے شفاء قرار دیا گیا ہے (مشکوٰۃ ص ۱۸۹) اور عاملین کو یہ بات معلوم ہے کہ "سورۃ الفاتحہ" کے ساتھ دم کرنے سے کتنی بیماریوں کا علاج ہو جاتا ہے اسی لیے امت کے اندر یہ معمول چلا آرہا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے ذریعے شفا پر ایک واقعہ:

حدیث شریف کے اندر بھی اس کا ذکر آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دفعہ سفر پر جا رہے تھے ایک جگہ جا کر قیام کیا اس زمانے کے دستور کے مطابق جو لوگ وہاں آباد تھے ان سے مہمانی کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے کسی قسم کا تعاون کرنے سے انکار کر دیا، اتفاق ایسا ہوا کہ اس قبیلے کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا، جس وقت سانپ نے ڈسا وہ اِدھر اُدھر بھاگے جب کوئی دوا نہ ملی تو انہیں کے پاس آئے اور آکر کہنے لگے کہ تمہارے پاس کوئی منتر جھاڑ پھونک ہو تو ہمارے سردار کا علاج کرو اس کو سانپ نے ڈس لیا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا کہ ہم جھاڑ پھونک کے ساتھ علاج نہیں کریں گے تم نے ہماری مہمانی نہیں کی اور کسی قسم کا تعاون نہیں کیا اب ہم اس شرط پر جھاڑ پھونک کریں گے کہ اتنی بکریاں لیں گے بکریوں کی تعداد متعین کر لیں، مرتے کیا نہ کرتے انہوں نے وعدہ کر لیا کہ ہم اتنی بکریاں دیں گے۔

چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ گئے اور جا کر "سورۃ الفاتحہ" پڑھ کر پھونکا، پھونکنے سے اس کو آرام آگیا جب آرام آگیا تو بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے تو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا یہ تو حلال نہیں "اخذت علی کتاب اللہ اجرا" تو نے تو کتاب اللہ کی اجرت لے لی اور اللہ کی کتاب کی اجرت لینا ٹھیک نہیں ہے، جس وقت تک ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کو دریافت نہ کر لیں اس وقت تک ہم اس کو حلال نہیں سمجھتے حاصل یہ کہ مدینہ منورہ میں جس وقت واپس آئے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آپ نے قرآن کریم کے ساتھ جھاڑ پھونک

کی ہے اس کے اوپر تم اجرت لے سکتے ہو اور یہ تمہارے لیے حلال ہے آپس میں ان کو بانٹ لو اور ان کی دل جوئی کے طور پر فرمایا کہ میرا حصہ بھی ساتھ لگا لو (بخاری ج ۲ ص ۷۴۹)۔

یہ حضور ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے جب کوئی ایسی بات پوچھی جاتی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کھانے پینے کی کسی چیز میں کوئی شبہ ہوتا اور وہ مسئلہ پوچھتے تو آپ ﷺ فرماتے کہ میرا حصہ بھی ساتھ لگا لو اس میں اور مزید اطمینان ہو جاتا کہ کوئی شبہ کی بات نہیں ہے، جس کے تحت علماء اور شارحین نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ''آیت من آیت اللہ'' پڑھ کر کوئی دم کیا جائے یا کسی جائز الفاظ کے ساتھ کسی کو دم کیا جائے اگر اس کا معاوضہ وصول کر لیا جائے یا کچھ اس کی اجرت لے لی جائے تو اس کا جواز ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دم کر کے اس طرح سے بکریاں لی تھیں، سرور کائنات ﷺ نے ان کو آپس میں تقسیم کرنے کے لیے فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس طرح سے کوئی معاوضہ وغیرہ لے لیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

تعویذ اور اس پر اجرت کی شرعی حیثیت:

اگرچہ بعض علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ تعویذ لکھ کر اس پر معاوضہ لینا درست ہے یا نہیں؟ بہت سارے اس کو ناجائز بھی کہتے ہیں لیکن ہمارے علماء کا رجحان ادھر ہی ہے کہ اگر تعویذ میں کوئی کفر و شرک کی بات نہیں ہے، جس طرح سے جاہل قسم کے لوگ جادو کرتے ہیں وہ تو ہمیشہ حرام ہی حرام ہے اور اس پر جو کسی قسم کی اجرت لیں گے وہ بھی حرام، لیکن اگر جائز طریقے سے کوئی دم کیا جائے قرآن کریم کی آیت پڑھ کر یا ان دعاؤں سے جو حدیث شریف میں آئی ہوئی ہیں یا کوئی ایسے الفاظ جن میں کوئی کسی قسم کا ناجائز لفظ نہیں ہے جیسے کفر، شرک ''استعانۃ من الشیاطین'' یا ارواح خبیثہ سے استعانت اس قسم کے لفظ نہ ہوں تو یہ دم کرنا جائز ہے اور اس کے اثرات مسلّم ہیں اور اس دم کرنے کے بعد اگر کسی قسم کا معاوضہ وصول کر لیا جائے تو اس کا بھی جواز ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ جب کوئی کسی قسم کی تکلیف ہوتی تھی سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم کر لیا کرتے تھے اس لحاظ سے سورۃ الفاتحہ یہ شفاء ہے اور روحانی و قلبی امراض کے علاوہ جسمانی امراض کے لیے بھی ہمیشہ سے امت اس کو پڑھتی آئی ہے باقی پڑھنے کے تجربے کے طور پر طریقے مختلف ہوتے ہیں عاملین کے نزدیک کوئی کسی طرح سے پڑھ لیتا ہے بہر حال اگر توجہ کے ساتھ پڑھی جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ شفاء عطا فرما دیتے ہیں اس لحاظ سے اس سورۃ کا نام ''سورۃ الشفاء'' بھی ہے۔

سورۃ الفاتحہ اور دعا کے آداب:

اور ایک روایت میں اس کا نام ''سورۃ تعلیم المسئلۃ'' ہے جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حاشیہ

کے اندر ذکر فرمایا ''تعلیم المسئلۃ'' مانگنا سکھانا، یعنی قرآن کریم کی یہ سورۃ سوال کرنے کی تعلیم دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنا کس طرح سے چاہیئے، چنانچہ یہاں جو طریقہ اختیار کیا گیا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی گئی حمد وثناء کرنے کے بعد پھر سوال کیا گیا، اللہ تبارک کے سامنے جو دعا اس انداز سے مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے۔

صحیح مسلم (ج ا ص ۱۷۰) میں حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''سورۃ الفاتحہ'' کی فضیلت کے طور پر ایک بات منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سورۃ میرے اور میرے بندے کے درمیان میں مشترکہ ہے ''ولعبدی ماسئل'' میرے بندے کے لیے وہ چیز ہے جو وہ مانگے گا ابتدائی آیات اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے طور پر ہیں اور اگلی آیات بندے نے اللہ کے دربار میں حاجات کے طور پر پیش کرنی ہیں اور جب حمد وثناء کرنے کے بعد اللہ کے دربار کے اندر درخواست پیش کی جائے گی تو دعا قبول ہوگی ''ولعبدی ماسئل'' اس لیے عام طور پر بھی دعا سے قبل ''سورۃ الفاتحہ'' کا پڑھنا معمول ہے کہ ''سورۃ الفاتحہ'' پڑھ کر دعا کی جائے کیونکہ روایات صحیحہ کے اندر آیا ہوا ہے کہ جب یہ الفاظ انسان اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا ہے ''ولعبدی ماسئل'' میرے بندے کے لیے وہ چیز ہے جو وہ مانگے تو ایسے وقت میں ''اقرب الی الاجابۃ'' ہو جاتی ہے وہ دعا جو ''سورۃ الفاتحہ'' پڑھنے کے بعد کی جائے۔

عام طریقہ بھی یہی ہے کہ دعا کرتے وقت حمد وثناء کرو اگر سورۃ الفاتحہ ہی پڑھ لو تو زیادہ مناسب ہے، اور اس طرح سے اس کے مختلف نام آئے ہیں اور ناموں کا اس کثرت کے ساتھ آنا اور ایسے الفاظ کے ساتھ یہ اس کی عظمت کے اوپر دلالت کرتا ہے، سورۃ الفاتحہ کی فضیلت کے طور پر جو روایتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک روایت تفسیر مظہری کے اندر موجود ہے کہ اس کا پڑھنا ثلث قرآن کریم کے پڑھنے کے ثواب کے برابر ہے اس مسئلے کو بھی ابتداء میں تھوڑا سا سن لیجیے۔

بعض سورتوں کے مخصوص فضائل:

قرآن کریم کا ایک ایک لفظ بابرکت ہے اور قرآن کریم کی ایک ایک آیت بابرکت ہے لیکن اللہ نے اپنی حکمت کے تحت بعض آیات کو بعض آیات پر فضیلت دی ہے اور وہ فضیلت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی ہے ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کی وجہ سمجھ جائیں اللہ تعالیٰ کے قرار دینے کے ساتھ بعض آیات بعض کے مقابلے میں افضل ہیں، بعض سورتیں، بعض سورتوں کے مقابلے میں افضل ہیں، جس طرح ''سورۃ یٰسین'' کے بارے میں آتا ہے کہ اس کو پڑھ لیں تو دس قرآن کریم کے برابر ثواب مل جاتا ہے (مشکوٰۃ ص ۱۸۷) ''سورۃ الاخلاص'' کے

متعلق آتا ہے کہ یہ ثلث قرآن کے برابر ہے (مشکوٰۃ ص ۱۸۵) ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ'' کے بارے میں آتا ہے کہ ربع القرآن کے برابر ہے (مشکوٰۃ ص ۱۸۸) ''اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ'' کے متعلق آتا ہے کہ اس کا پڑھنا ہزار آیتوں کے پڑھنے کے برابر ہے (مشکوٰۃ ص ۱۹۰) ''سورۃ الزلزال'' کے متعلق آتا ہے کہ نصف قرآن کے برابر ہے (مشکوٰۃ ص ۱۸۸) اس طرح ''سورۃ الفاتحہ'' کے متعلق بھی بعض روایات میں آتا ہے کہ دو ثلث کے برابر ہے (درمنثور ج ا ص ۵) اور ایسے ہی سورۃ الروم کی تین آیتیں

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾

ان کی فضیلت حدیث شریف میں ذکر کی گئی ہے کہ اگر صبح کے وقت کوئی پڑھ لے تو رات کے وقت اپنے اعمال و وظائف میں کوئی کمی کوتاہی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ پوری فرمادیتے ہیں، شام کے وقت، رات کے وقت پڑھ لو تو دن کی کمی کوتاہی کی اللہ تعالیٰ تلافی فرمادیتے ہیں بارہ گھنٹے کے اندر وظائف و اعمال میں کسی قسم کی کمی کوتاہی رہ جاتی ہے تو ان آیات کا اتنا ثواب ہے کہ اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

''سورۃ الحشر'' کی آخری آیات ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

یہ آیات صبح کو پڑھو، حدیث شریف میں پڑھنے کا طریقہ یوں آیا ہے ''اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطٰن الرجیم''، پہلے تین بار اس کو پڑھ لیا جائے اور اس کے بعد ان آیات کو پڑھ لیا جائے اگر صبح کو پڑھ لیا جائے تو سارا دن ستر ہزار فرشتے اس کے لیے استغفار اور دعا کرتے ہیں اور اگر مر جائے تو شہادت کی موت ہے اور شام کو پڑھ لو تو ساری رات کے لیے یہ فضیلت حاصل ہو جاتی ہے کہ ستر ہزار فرشتے دعا و استغفار میں لگے رہتے ہیں اور اگر اس شب کو انتقال ہو جائے تو شہادت کی موت ہے (مشکوٰۃ ص ۱۸۸) تو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے بعض آیات کو بعض آیات پر فضیلت حاصل ہے۔

فاتحہ خوانی کی حقیقت اور شرعی حیثیت:

''سورۃ الفاتحہ'' چونکہ عام طور پر سب کو یاد ہوتی ہے اور فضیلت والی بھی ہے، اس لیے لوگوں نے مردوں کو ایصال ثواب کرنے کے لیے بھی اسی سورۃ کو خاص کر لیا اب یہ محاورہ ہی بن گیا ہے کہ جس وقت آپ کسی میت کی طرف جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ فاتحہ کہنے جارہے ہیں کہ جب جاتے ہیں جا کر ''سورۃ الفاتحہ'' پڑھ لی جاتی ہے ''سورۃ الفاتحہ'' پڑھنے کے بعد ایصال ثواب کر دیا جاتا ہے تو عام طور پر چونکہ ایصال ثواب میں بھی اس سورۃ کو پڑھا جاتا ہے تو اسی لیے جو کوئی بھی کسی کے پاس تعزیت کے لیے جاتا ہے اصل میں مجلس تو تعزیت کی ہوتی ہے کہ جا کر صبر کی تلقین کرو لیکن اب اس کا عنوان یہی بن گیا کہ فاتحہ کہنے کے لیے جارہے ہیں اور وہاں جا کر ''سورۃ الفاتحہ'' پڑھیں گے اور ''سورۃ الفاتحہ'' پڑھ کر ایصال ثواب کر دیں گے مردے کے لیے فاتحہ ہوگئی۔

اسی فضیلت کی بناء پر گویا کہ ایصال ثواب کے لیے اسی سورۃ کو عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے یہ دعا مانگنا ٹھیک ہے باقی قرآن کریم ہاتھ اٹھا کر پڑھنا مناسب نہیں ہے اور یہ جو کسی گھر میں میت کی مجلس ہوا کرتی ہے یہ اصل میں مجلس تعزیت ہے، سنت طریقہ اس میں یہ ہے کہ میت والے بیٹھیں اور جانے والے جا کر ان کو صبر کی تلقین کریں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ایسے تھی، اللہ کو منظور ایسے ہی تھا، اللہ کے کاموں میں کس کا دخل ہے؟ ہمیں صبر کرنا چاہیئے، صبر نہیں کریں گے تو اور کیا ہوگا، رونے دھونے میں اپنا ثواب بھی کھوئیں گے، اللہ تعالیٰ کارساز ہے جیسے اس نے دیا تھا ویسے اس نے لے لیا، جیسے موقع محل ہو اگر کسی کا بچہ مرگیا تو اس کو کہہ دے اللہ تجھے اس کا نعم البدل دے، بیوی مرگئی تو اس کو کہہ دے کہ اللہ تجھے اس کا نعم البدل دے، کوئی اچھی رفیقہ حیات دے، اصل مجلس تعزیت کی ہوتی ہے جہالت کے ساتھ جیسے ہم نے ہر چیز کا حلیہ بگاڑ دیا اس کا بھی حلیہ بگاڑ دیا۔

شریعت نے تین دن تک اجازت دی کہ انسان اپنے صدمے اور غم کے طور پر بیٹھ سکتا ہے اور خیر خواہ آئیں اور اس کی تعزیت کر کے چلے جائیں، اب لوگوں نے تعزیت کی بجائے عملاً ایصال ثواب کی مجلس بنا لیا آپ جاتے ہیں تو جاتے ہی پہلا مطالبہ ہوتا ہے کہ کلام بخشو، اب ایصال ثواب سے ابتداء ہوتی ہے وہ ایصال ثواب کی مجلس نہیں ہے اور اگر ایصال ثواب کرنا ہے تو قرآن پڑھو اور پڑھنے کے بعد دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھا لو یہ تو قاعدے کے مطابق ہے کہ پہلے قرآن کریم پڑھ لیجیے پڑھنے کے بعد دعا کرنے لگیں تو اس وقت ہاتھ اٹھا لیجیے اگر آپ کسی عزیز یا بزرگ کی قبر پر جاؤ اور سورۃ الفاتحہ اور تین بار سورۃ الاخلاص پڑھو اور جتنا اللہ توفیق دے قرآن

پڑھو اور دعا کرتے وقت ہاتھ اٹھا لو لیکن ہمارے بزرگوں کا معمول یہ ہے کہ قبر پر جا کر ہاتھ نہیں اٹھاتے، دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ہر حمد اصالۃً اللہ کے لیے ہے:

" اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ صفات کمال جتنی بھی ہیں وہ سب اصالۃً اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں، تعریف کسی اچھی صفت پر ہی ہوا کرتی ہے جب اصل کے اعتبار سے سب اچھی صفتیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں تو تعریف کا مستحق بھی اللہ ہوا اور اگر مخلوق میں کوئی اچھی صفت آئے چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے تو اس لیے تعریف ظاہری طور پر مخلوق کی ہوگی لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے، سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں اس کا مطلب عرض کر رہا ہوں کہ ظاہری طور پر تعریف تو ہم مخلوق کی بھی کرتے ہیں کسی کے حسن کی، کسی کے علم کی، کسی کے عمل کی تعریف کر دی، کسی کے اندر کوئی خوبی ہے تو بظاہر تعریف مخلوق کی بھی ہوتی ہے۔

لیکن اصل کے اعتبار سے جو تعریف بھی آپ کریں گے وہ اللہ ہی کی ہوگی، کیونکہ اچھی صفات جتنی بھی ہیں وہ ساری کی ساری اصالۃً اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں اور اگر مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے اندر کوئی صفت نظر آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے، جب وہ اللہ کی عطا کردہ ہوئی تو جو تعریف اسی صفت کی بناء پر آپ کریں گے وہ حقیقت کے اعتبار سے اللہ ہی کی ہوئی اس کو اس طرح سے سمجھو کہ ایک عمارت ہے، بہت شاندار بنی ہوئی آپ اس کو دیکھتے ہی بے ساختہ اس کے نقش ونگار کی، اس کی بناوٹ کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑی پائیدار عمارت ہے، بڑی خوبصورت عمارت ہے، اس کے مینارے کنارے جتنے بھی ہیں سب دلکش ہیں، پھول بوٹے گل کاریاں خوب ہیں۔

بظاہر آپ جو الفاظ استعمال کرتے ہیں یہ اس عمارت کی تعریف ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ عمارت خود بخود تو نہیں بن گئی، عمارت میں یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ مضبوط ہو جاتی، عمارت میں اختیار نہیں تھا کہ اس کے مینارے اونچے ہو جاتے یا اس کے اوپر گل کاری ہو جاتی، ظاہری طور پر اگرچہ یہ صفتیں عمارت کی ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ معمار جس نے عمارت بنائی ہے یہ نسبت اس کی طرف ہے، جب آپ ایک عمارت کی تعریف کریں گے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا معمار اچھا ہے جس نے یہ عمارت بنائی ہے چاہے آپ اس کی طرف نسبت نہ ہی کریں اور تعریف کا رجحان اس عمارت کی طرف ہی ہو لیکن وہ تعریف معمار کی طرف راجع ہوگی، ایسے ہی مخلوق جتنی بھی ہے جب ان کا اپنا وجود ہی اختیاری نہیں تو ان کی صفات ان کے اختیار میں کیسے ہو سکتی ہیں؟ آپ کا پیدا ہونا بننا آپ

کے اختیار میں نہیں تھا جس وقت آپ کے اختیار میں نہیں تو آپ دیکھنے والے کیسے ہو گئے، سننے والے کیسے ہو گئے، آپ کا یہ حسن و جمال آپ کے اختیار میں کیسے ہوا۔

آپ کا علم و عمل آپ کے اختیار میں کیسے ہوا تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مخلوق کو وجود ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مخلوق کو صفات ملتی ہیں اس لیے کسی اچھی صفت کی بناء پر کسی مخلوق کی تعریف کی جائے تو حقیقت کے اعتبار سے وہ تعریف اسی عطا کرنے والے کی طرف راجع ہو گی، اس مطلب کے تحت آپ کے سامنے یہ آ گیا کہ تعریف کا حصر اللہ کے لیے ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں ہر قسم کی صفات کمال اس کے لیے ثابت ہیں اور جو بھی تعریف کی جائے گی اس کا اصل مستحق بھی وہی ہے اور وہ تعریف راجع بھی اسی کی طرف ہوتی ہے اور مخلوق کی جب بھی تعریف کی جائے گی وہ حقیقت کے اعتبار سے اللہ کی ہے، اسی بات کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہوئے کہتا ہے جس کا مفہوم یوں ہے۔

کہ حمد کو تیرے ساتھ ایسی نسبت ہے کہ یہ بظاہر کسی کے دروازے پر نظر آئے حقیقت میں تیرے دروازے پر ہے۔

وجہ اس کی وہی ہے جو میں نے عرض کر دی کہ حمد ہوا کرتی ہے کسی اچھی صفت کی بناء پر اور اچھی صفتیں جتنی بھی ہیں وہ ساری کی ساری اصالۃً اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں اور مخلوقات میں اگر کوئی صفت ثابت ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے جب وہ اللہ کی عطا کردہ ہوئی تو ظاہری طور پر اگر کسی مخلوق کی تعریف بھی کرو گے تو حقیقت کے اعتبار سے اس کے خالق اور عطا کرنے والے کی تعریف کہلائے گی اللہ تبارک وتعالیٰ ساری کی ساری صفات کے جامع ہیں۔

صفت ربوبیت کی حقیقت:

"رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یہاں سے اللہ تعالیٰ نے پہلی سورۃ میں اپنا تعارف کروایا ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت آ گئی، رب کا معنی ہے پالنے والا، تربیت کرنے والا، جس کو ہندی زبان میں "پالن ہار" کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں، فارسی میں "پروردگار" کہہ دیتے ہیں، پروردن پالنا، پروردگار پالنے والا، پالن ہار، تربیت کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو ابتداء سے لے کر اس کی مصالح کی رعایت رکھتے ہوئے، حکمت کی رعایت رکھتے ہوئے، بڑھاتے ہوئے اس کو کمال تک پہنچا دینا، تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور اس کو کمال تک پہنچانے والا ہے اور کمال تک پہنچانے کے لیے درمیان میں جتنی حاجاتِ ضروریہ

ہوں گی سب کو پوری کرنے والا وہی ہے اللہ تعالیٰ کی پہچان مخلوق کو کروائی گئی تو سب سے پہلے لفظ ''رب'' کے ذریعے سے کروائی گئی جس میں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے ساتھ تعلق رب ہونے کا ہے پیدا بھی وہی کرتا ہے، وجود بھی وہی دیتا ہے اور تربیت بھی وہی کرتا ہے اور درجہ بدرجہ ترقی دیتے ہوئے کمال تک وہی پہنچاتا ہے لفظ ''رب'' کا مفہوم جو میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تعارف لفظ ''رب'' سے کروایا اس صورت میں بھی اس کی حقیقت نمایاں ہے۔

عقیدہ ربوبیت کے مختلف مراحل:

لیکن ''سورۃ الاعراف'' میں جہاں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے اخذ میثاق کا ذکر کیا جو ابتدائی کلام ہے اللہ کی اپنی مخلوق کے ساتھ، پہلی کلام اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ وہ قرآن کریم میں بھی ذکر کی گئی کہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اس کی ساری ذریت کو موجود کیا تفصیل جیسے حدیث میں موجود ہے اور ذریت کو موجود کرنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا سوال کیا جس سے مقصد ان کی تعلیم ہے سوال یہی ہے ''الست بربکم'' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟۔

اور پھر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے جواب جس طرح سے تلقین ہوا مخلوق نے کہا ''بلی'' کیوں نہیں! گویا کہ یہ اقرار کروالیا کہ رب تمہارا میں ہوں اور تمہیں صفات عطا کر کے کمال تک پہنچانے والا میں ہوں تو پھر میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے کا کوئی معنی نہیں بندوں کا مکمل تعلق رب کے ساتھ ہونا چاہیے جو ان کی حاجات کو پورا کرتا ہے اور ضرورت کی ہر چیز عطا کرتا ہے، لفظ ''رب'' کے اندر اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر یہ توحید کا عقیدہ رکھ دیا۔

تعارف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کا مخلوق کے ساتھ اسی لفظ سے ہوا، تعلق اسی لفظ سے نمایاں ہوا پھر اس دنیا میں پیدا ہو جانے کے بعد جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ بھی یہی ہے قرآن مجید میں جس طرح سے ذکر کیا گیا ''ان الذین قالوا ربنا اللہ'' جو لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے ''ثم استقاموا'' پھر اسی کے اوپر جمے رہتے ہیں ''تتنزل علیھم الملئکۃ'' ان کے اوپر اللہ کے فرشتے اترتے ہیں اور آ کے بشارتیں دیتے ہیں، تو جس کا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں سے جس بات کے اوپر استقامت مطلوب ہے کہ بندے اس بات پر ڈٹے رہیں جم جائیں اور اس سے پھسلیں نہیں اور اس کو چھوڑیں نہیں وہ عقیدہ ربوبیت ہے ''ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا'' اللہ کو رب کہنے کے بعد پھر اسی کے اوپر جم جائیں اور اسی کے

اوپر ڈٹے رہیں، تو ان کے اوپر فرشتے اترتے ہیں اور ان کو بشارتیں دیتے ہیں تو زندگی میں جس بات پر استقامت مطلوب ہے وہ بھی یہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کو رب قرار دیا جائے، اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ بندے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسی ربوبیت کے عنوان سے ہے۔

اور یہ بات سامنے آجانے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، ہمیں پیدا کرنے والا ہے، ہماری ضروریات کو پورا کرنے والا ہے، کمال کی انتہاء تک پہنچانے والا ہے اسی کا پھر مقتضیٰ طبعی یہی ہوگا کہ ہم اسی کی اطاعت کریں، اسی کی عبادت کریں اور کسی دوسرے کے ساتھ ہمارا قلبی تعلق نہ ہو، کسی دوسرے کی طرف ہم اپنی احتیاج نہ رکھیں یہ ساری کی ساری باتیں جو عقیدہ توحید کہلاتی ہیں وہ اسی لفظ ''رب'' سے خود بخود طبعی اقتضاء کے طور پر نکلنے لگ جاتی ہیں تو زندگی کے اندر مطالبہ اسی بات کا ہوا اور پھر آپ یہ بھی پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ جس وقت ہماری یہ عملی زندگی ختم ہوجائے گی یعنی موت آجائے گی ہم پر تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت ہم نے بطور امتحان کے پیش ہونا ہے تمہید اس امتحان کی عالم برزخ سے شروع ہوجاتی ہے مرنے کے بعد حدیث شریف پڑھنے والوں نے تو پڑھ لیا مشکوٰۃ شریف میں ''باب اثبات عذاب القبر'' میں تفصیل آتی ہے اور سنتے سارے ہی ہیں، گھروں کے اندر ان کے تذکرے ہوتے رہتے ہیں کہ مرنے کے بعد قبر میں منکر نکیر آئیں گے اور انہوں نے انسان سے ابتدائی سوالات کرنے ہیں جو خلاصہ ہے اس امتحان کا جو تفصیلی طور پر قیامت کے دن پیش آنے والا ہے ان کا پہلا سوال یہ ہوگا ''من ربك'' ''تیرا رب کون ہے؟ تو مؤمن کا جواب ہوگا ''ربی الله'' ''میرا رب اللہ ہے، اور کافر اور منافق اس سوال کے جواب میں پریشان ہوجائے گا وہ جواب نہیں دے سکے گا، جھوٹ بولنا نہیں ہے اور نہ کوئی جھوٹ بول سکے گا، زندگی کے اندر جس کو رب سمجھا تھا اسی کا وہاں پر اقرار کریں گے جیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب سوال معلوم ہوگئے کہ امتحان میں یہ سوال آنے والے ہیں تو جواب یاد کرلو زندگی کیسی گزار لو جواب وہ دو جو رٹا ہوا ہے۔

جس طرح سے آپ کو معلوم ہوجائے کہ امتحان میں کتاب کا فلاں مقام پوچھا جائے گا آگے پیچھے ایک لفظ نہ آتا ہو تو آپ وہی مقام رٹ لیں گے اور جس وقت آپ سے پوچھیں گے آپ فر فر سنادیں گے اور ممتحن دھوکے میں آجائے گا کہ اس کو ساری کتاب ایسے ہی یاد ہے جیسے اس نے یہ پیراگراف سنادیا، ایسے ہوجاتا ہے امتحانوں میں پتہ چل گیا کہ حساب کا فلاں سوال آنا ہے وہ یاد کرلیا جس وقت پرچہ آیا وہ حل کردیا، ممتحن سمجھتا ہے کہ بڑا لائق طالب علم ہے یہ حساب میں بڑا ماہر ہے دیکھو کیسا اچھا سوال حل کیا ہے تو اسی طرح سے جب یہ تین سوال معلوم ہوگئے جو برزخ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیے جائیں گے۔

من ربك ، مادينك ، ما تقول فی هذا الرجل ، سوال بھی بتا دیئے گئے ،ان کے جواب بھی بتا دیئے گئے کہ مومن نے یہ جواب دینے ہیں تو پھر آپ ان جوابوں کو رٹ لیں اور زندگی چاہے جیسی کیسی بھی گزار لیں، قبر میں جب منکر نکیر سوال کریں گے آپ یہی متعین جواب دے دیں تو پھر یہ امتحان کیا ہوا جس کا پرچہ پہلے ہی آؤٹ ہو گیا جواب بھی معلوم ہو گئے کہ یہ پوچھا جائے گا یوں بتانا ہے تو پھر وہ امتحان کیا ہوا لیکن اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ بات نہیں چلے گی زندگی میں تو زبان جھوٹ بول لیتی ہے، قلب میں کچھ ہوتا ہے زبان کچھ کہہ لیتی ہے لیکن موت کے بعد یہ غلط ترجمانی نہیں ہو سکے گی ،اس سوال کے جواب میں ’’ربی اللہ‘‘ وہی شخص کہہ سکے گا جس نے ’’ربنا الله‘‘ کہہ کر اس کے اوپر موت تک استقامت اختیار کی ہوگی اور جس نے ’’ربنا الله‘‘ کہہ کر زندگی کے آخر تک اس پر استقامت اختیار نہیں کی ہوگی وہ ’’ربی الله‘‘ وہاں نہیں کہہ سکے گا اور اسی طرح سے جس نے اپنا دین اسلام کو قرار دیا ہوگا وہ وہاں ’’ مادينك‘‘ کے جواب میں کہہ سکے گا’’ دینی الاسلام ‘‘اور جس نے اسلام کے علاوہ کسی دوسری چیز کو اختیار کیا ہوگا وہ وہاں اس سوال کا جواب نہیں دے سکے گا’’ ماتقول فی هذا الرجل ‘‘کے جواب میں وہی شخص سرور کائنات ﷺ کی رسالت کا اقرار کر سکے گا جس نے زندگی کے اندر رسول اللہ ﷺ کو مانا ہوگا اور جس نے زندگی کے اندر حضور ﷺ کو نہیں مانا ہوگا وہ یہ جواب نہیں دے سکے گا۔

بہر حال میں آپ کے سامنے لفظ ’’رب‘‘ کے مفہوم کی حقیقت نمایاں کر رہا تھا تاکہ اس کو آپ سمجھ لیجئے ،لفظ ’’رب‘‘ کے مفہوم کی یہ وسعت ہے اور پوری حقیقت کا ایک اجمالی عنوان ہے جس کی وجہ سے بنی آدم سے اقرار لیتے ہوئے سب سے پہلے ربوبیت کا اقرار لیا گیا، زندگی کے اندر اسی ربوبیت کے عقیدہ کے اوپر استقامت کا مطالبہ کیا گیا، مرنے کے بعد سب سے پہلے یہی سوال کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کی پہلی سورۃ میں یہی تعارف کروایا’’ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ‘‘ اور قرآن کریم کے اختتام پر ’’سورۃ الناس‘‘ میں یہی لفظ استعمال کیا ’’ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ تو اس کلام کی ابتداء بھی ربوبیت کے تذکرے کے ساتھ ہے اور اس کلام کی انتہاء بھی ربوبیت کے ساتھ، اور ہمارا جو عالم ارواح میں وجود ہوا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق نمایاں ہوا تو اسی ربوبیت کے ساتھ، مرنے کے بعد سب سے پہلے سوال ہوگا تو اسی ربوبیت کے متعلق۔

اس سے سمجھ لیجئے کہ یہ لفظ کتنا حاوی ہے اور اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کا طبعی اقتضاء آ گیا کہ اس کا طبعی اقتضاء کیا ہے؟ تو اس طرح چند لفظوں میں آپ کے سامنے وضاحت ہوگئی کہ رب کا مفہوم یہ ہوا کہ جس نے ہمیں وجود دیا، جس نے ہماری ضروریات پوری کیں، جس نے ہمیں ہر قسم کی صفات عطا فرمائیں اور اس طرح ہمیں کمال

تک پہنچایا تو جب ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے، وجود دینے والا وہی ہے، صفات دینے والا وہی ہے، ہر قسم کی ضروریات پوری کرنے والا وہی ہے تو اس کا طبعی اقتضاء یہ ہوگا کہ قلبی تعلق صرف اسی کے ساتھ ہو اس کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف احتیاج محسوس نہ کی جائے۔

عقیدہ ربوبیت کا کیا اثر ہونا چاہیے؟:

مثال کے طور پر ایک طالب علم ہے میں ذمہ داری لے لیتا ہوں کہ تیری ہر ضرورت میں پوری کروں گا، تجھے کپڑے کی ضرورت ہو مجھے کہنا، روٹی کی ضرورت ہو مجھے کہنا، خرچ کے لیے ضرورت ہو مجھے کہنا، کتاب کی ضرورت ہو تو میرے پاس آنا، کوئی اور ضرورت ہو زندگی کی تو میرے پاس آنا، میرے علاوہ تجھے کسی دوسرے کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے سامنے وضاحت کر دیتا ہوں، اب آپ بتائیے کہ جس وقت ایک لڑکے کو میں یہ کہہ دوں گا تو کیا سب چیزوں کا بوجھ میں اس کے ذہن سے اتار نہیں دوں گا؟ اور میرے اتنا کہہ دینے کے باوجود پھر وہ طالب علم اگر روٹی کے لیے کسی دوسری طرف بھاگا پھرتا ہے، کپڑے کے لیے کسی اور طرف بھاگا پھرتا ہے، اور اپنی کسی ضرورت کے لیے کسی اور کے پیچھے پھرتا ہے تو کیا خیال ہے جب مجھے پتہ چلے گا تو میں یہی کہوں گا کہ یہ نادان، بے وقوف، کم عقل ہے جب میں نے اسے سب سے مستغنی کر دیا اور ہر چیز کی ذمہ داری میں نے لے لی تو اس کو چاہیئے تھا کہ یہ ہر وقت میرے دروازے کی طرف جھانکے یہ دوسرے دروازوں کے کیوں چکر کاٹتا پھر رہا ہے تو اس بچے کی یہ حرکت جو ہوگی تو کیا خیال ہے آپ کا یہ کوئی عقلمندی ہوگی؟ اور کیا اس حرکت کے اوپر میری طبیعت پر ناگواری نہیں آئے گی؟ ایسے ہی سمجھ لیجئے۔

سمجھانے کے لیے یہ ایک بات بتا رہا ہوں جب ایک شخص کی تمام ضروریات کا ذمہ اللہ نے لے لیا تو باقیوں سے استغناء ضرور ہونا چاہیئے اس کی طرف مکمل احتیاج ہونا چاہیئے اور جب مکمل احتیاج اس کی طرف ہوگا باقیوں سے استغناء ہوگا تو اطاعت کی، عبادت کی جو باتیں بھی ہوگی اسی ذات کے ساتھ تعلق رکھے گی کسی دوسرے کی طرف جھانکنے کی ضرورت ہی نہیں، پھر یہیں سے ہدایات لے کر مخلوق کے ساتھ تعلق رکھا جائے گا کہ ماں باپ سے کیسا، استاذ سے کیسا، مشائخ سے کیسا تعلق رکھنا ہے، اپنے کمرے کے ساتھیوں کے ساتھ کس طرح سے رہنا ہے، پڑوسیوں کے ساتھ تمہارا معاملہ کیا ہونا چاہیئے، تمہاری خرید وفروخت کیسی ہونی چاہیئے، جو ہدایات اس دروازے سے ملیں گی ان کا پابند رہنا ضروری ہوگا پھر نہ کسی اور طرف سے ہدایات لینے کی ضرورت، نہ کسی طرف محتاج رہنے کی ضرورت، ضروریات کی ذمہ داری لینے کے بعد انسان سب سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

اس لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں (حضرت شیخ کا لفظ جس وقت میری زبان پر بغیر کسی کا نام لینے کے آئے تو اس سے مراد حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ہوتے ہیں) گلستان میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول پڑھا۔

موحد چہ	بر پائے	ریزی	زرش
چہ	شمشیر ہندی	نہی	بر سرش
امید	وہراسش	نباشد	زکس
بریں است	بنیاد	توحید	وبس

کہ موحد کے سامنے سونے کے ڈھیر لگا دو، یا اس کے سر کے اوپر تلوار لے کر کھڑے ہو جاؤ اسے نہ کسی سے امید ہوتی ہے اور نہ کسی سے خوف ہوتا ہے، توحید کی بنیاد اسی بات پر ہے کہ نہ کسی سے خوف اور نہ کسی سے لالچ ہے اور یہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے لفظ "رب" میں غور کرنے سے جتنا اس میں غور کرتے چلے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا مفہوم کھلتا چلا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتنا ہی زیادہ تعلق پیدا ہوتا چلا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج بڑھتی چلی جائے گی، ہر چیز میں ہم اپنے آپ کو اس کا محتاج پائیں گے، صرف قولاً لفظاً ہی نہیں بلکہ ہر درجہ میں اپنے آپ کو اس کا محتاج پائیں گے اور دوسروں سے اسی قدر ہی استغناء ہوتا چلا جائے گا اور ادھر اطاعت اور عبادت کا تعلق ہوتا جائے گا اور باقیوں کے ساتھ معاملہ انہی کی ہدایات کے تحت ہوگا تو وہ بھی اللہ ہی کی عبادت بنتا جائے گا۔

جس وقت آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت والدین کی خدمت کریں گے یہ عبادت اللہ کی ہے کیونکہ اس کے حکم کے تحت ہو رہی ہے ظاہری طور پر چاہے آپ کا رخ والدین کی طرف ہوگا، خدمت کا تعلق بظاہر آپ کا استاذ کی طرف ہوگا لیکن حقیقت میں یہ عبادت اللہ کی ہوگی کیونکہ اس کے حکم کے تحت ہو رہی ہے تو یہ ہے لفظ "رب" کی اہمیت جس کی بناء پر اس کو کتاب اللہ کے اول و آخر میں ذکر کیا گیا، اور ہماری حیات کے ابتدائی مراحل کے اندر بھی ہمارے سامنے یہی بات آئی اور اس حیات کے ختم ہونے کے بعد ابتدائی مراحل کے اندر بھی یہی بات آئے گی تو اللہ تعالیٰ نے اس لفظ کے ساتھ اپنا تعارف کروایا کہ اللہ وہ رب العلمین ہے۔

عالمین:

یہ عالَم کی جمع ہے، عالم لام کے فتح کے ساتھ "مایعلم به شئی" عالَم اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے کسی دوسری چیز کا علم حاصل کیا جائے دوسرے الفاظ میں آپ اس کو علامت کہہ لیجئے، اور عالم ماسواء اللہ جتنا بھی ہے وہ اللہ کی معرفت کے لیے ایک علامت ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاتا ہے اس لیے اللہ کے علاوہ

جو کچھ ہے وہ سب عالم کا مصداق ہے اور جمع جو یہاں لائی گئی تو یہ انواع کے اعتبار سے ہے، مختلف قسموں کے اعتبار سے ہے، ستاروں کا عالم، عالم حیوانات، عالم نباتات، عالم جمادات، وغیرہ کروڑہا عالم ہیں اس کائنات کے اندر، اللہ تعالیٰ نے مختلف انواع کے بنانے، مختلف اجناس کے بنانے ان مختلف انواع واجناس کے اعتبار سے یہاں جمع آ گئی ورنہ اصل کے اعتبار سے اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب عالم ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاتا ہے تو عالمین جمع لاکر بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ موجود ہے اس کائنات میں کسی نوع کا ہو، کسی جنس کا ہو اللہ کی ربوبیت کا تعلق اس کے ساتھ ہے ساری کائنات اللہ کی پیدا کردہ ہے اور دنیا جہاں میں جو کچھ موجود ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے محتاج، اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے۔

رحمت کا مفہوم:

اگلی صفت آ گئی ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ''

یہ دونوں لفظ رحمت سے ماخوذ ہیں، رحمت رَحِمَ يَرْحَمُ باب سَمِعَ سے اس کا استعمال ہے آپ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ رحمت کا معنی ہے ''رقت قلب'' دل کا نرم ہونا اور یہ لفظ لکھنے کے بعد پھر آگے لکھ دیتے ہیں کہ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا اطلاق مجازی ہے کیونکہ دل کی نرمی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاسکتی تو ایصال خیر کا مفہوم اس سے مراد ہوا کہ اللہ تعالیٰ خیر پہنچانے والے ہیں تو رحمت کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات کے اوپر مجازاً قرار دے دیا کیونکہ اس کا اصل معنی ہوا رقت قلب۔

اس پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی بات یاد آ گئی مولانا ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ میاں چنوں میں بزرگ ہوتے تھے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے ان کی خدمت میں ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا تھا مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کی نسبت کہاں کہاں ہے، میں نے پوچھ لیا کہ حضرت آپ نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی ہے؟ فرمانے لگے کہ زیارت کیا میں تو ان سے بیعت ہوں اور پھر وہ بیان کرنے لگ گئے کہ میں نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس فلاں، فلاں چیز پڑھی ہے اور فلاں فلاں بزرگ کے ساتھ میرا تعلق رہا تو اس کے ضمن میں انہوں نے ایک بات بتائی کہ توضیح تلویح پڑھاتے ہوئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ تعجب ہے ان اہل علم پر جو یہ کہہ دیتے ہیں کہ رحمت کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر مجازاً ہے رحمت تو اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفت ہے وہاں اس کو مجاز بنادیا اور مخلوق کے اندر رحمت مجازاً تھی وہاں انہوں نے اس کو حقیقت بنادیا۔

حقیقت تو یہ اللہ ہی پر صادق آتی ہے، رحمت حقیقتاً صفت اللہ کی ہے وہاں کہہ دیتے ہیں کہ مجازاً صادق آتی ہے اور مخلوق کے اندر یہ مجازاً پائی جاتی ہے وہاں کہہ دیتے ہیں کہ حقیقتاً صادق آتی ہے، تمہیں کہا کس نے ہے

کہ تم اس کا مفہوم رقت قلب ذکر کرو؟ تم اس کا مفہوم وہ ذکر کرو جو براہ راست اللہ پر صادق آتا ہے تو حقیقتاً رحمت کا مفہوم یہی ہے جس کو آپ ایصال خیر یا دوسرے کے لیے نفع کی فکر کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ رحیم ہے اللہ تعالیٰ رحمٰن ہے، رحمت کی صفت اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہے یہ لفظاً جو یہاں پر ذکر کر دیا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ مخلوق کو پیدا کرنا یا اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وجہ سے ہے، اللہ اپنی مخلوق کے لیے رحیم ہے، کریم ہے اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض، کوئی نفع مخلوق سے متعلق نہیں ہے اس کی صفت رحمت کا تقاضہ ہے کہ مخلوق کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

رحمٰن اور رحیم میں فرق:

ان دونوں لفظوں میں کیا فرق ہے؟ یہ بھی آپ ابتدائی کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

میں مختصراً عرض کر دیتا ہوں، موٹی سی بات یاد رکھیئے، رحمٰن کے اندر عموم رحم کی طرف اشارہ ہے اور رحیم کے اندر کمال رحم کی طرف اشارہ ہے تو رحمٰن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہوا اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت عام ہے جو کائنات کے ذرے ذرے کو شامل ہے یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے پر نہیں بولا جاتا، رحمٰن کا لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے غیر اللہ کے اوپر اس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا، رحیم میں کمال رحمت ہے کہ کامل طریقے سے کسی پر رحمت کرنا، ہو سکتا ہے کہ ماں اپنے بچے پر پوری طرح سے رحمت کرے، مہربان ہو، باپ کامل طریقے سے اپنے بچے کے اوپر مہربان ہو، یہ صفت غیر کے لیے ثابت ہو سکتی ہے اس لیے رحیم بندے کی صفت بھی آ جاتی ہے یہ اللہ کی صفت صفات مختصہ میں سے نہیں قرآن کریم میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''بالمؤمنین رؤف رحیم'' کا لفظ بولا گیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤف بھی اور رحیم بھی قرار دیا گیا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ رحیم کا اطلاق غیر اللہ پر ہو جاتا ہے۔

اور رحمٰن کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے عموم رحم اور کمال رحم کو بیان کرنے کے لیے یہ دو لفظ بڑھ گئے، اس میں بھی آپ سے ایک مطالبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قلبی تعلق جو ہو گا اس کی رحمت کو یاد کرتے ہوئے، اس کی شفقت کو یاد کرتے ہوئے وہ محبت پر مشتمل ہو گا، اس کی عظمت جو دل میں پیدا ہو گی محبت کی بناء پر پیدا ہو گی اور یہ جو خوف اور ڈر والی بات ہے کہ اس کا جبار ہونا، قہار ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات میں کامل طریقے سے ہے وہ ''شدید العقاب'' بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے ابتدائی تعارف کے اندر ان صفات کو ذکر نہیں کیا تو جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ زیادہ تر محبت کا پہلو رکھتا ہے اور حدیث شریف میں بھی اس کی

وضاحت ہوگئی سرور کائنات ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب مخلوق پیدا کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ایک تحریر لکھی اور لکھ کر اس کو عرش پر رکھ لیا گویا کہ اصول موضوعہ کے درجے میں یہ بات آگئی "رحمتی سبقت غضبی" (مشکوۃ ص ۲۰۷) کہ میری رحمت میرے غضب پر سابق رہے گی، تو اس مخلوق کے اندر جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے اس میں رحمت غالب ہے اور غضب مغلوب ہے اس لیے انسان کو اللہ کا جو تصور کرنا چاہیئے "الرحمن الرحیم" ان لفظوں کے تحت اللہ تعالیٰ کا تصور کرنا چاہیئے جس میں اللہ کی رحمت کاملہ، کمال رحمت، عموم رحمت نمایاں ہوتی ہے کیونکہ اس سے قلب کے اندر محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، صرف خوف اور ڈر کی بات ہوتی تو عظمت پھر بھی پیدا ہوتی لیکن اس میں محبت کی چاشنی کم ہوتی۔

قیامت کے دن کا مالک:

"مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" دین کا معنیٰ جزا يَوْمِ الدِّيْنِ جزا کا دن "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" جزا کے دن کا مالک، مفہوم اس کا اصل میں یہ ہے "يَوْمِ الدِّيْنِ" سے مراد قیامت یعنی قیامت کے دن کا مالک ہے یعنی قیامت کے دن میں ملکیت اسی کے لیے ہوگی، کس چیز کی ملکیت ہوگی وہ واضح نہیں کیا گیا، مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز میں ملکیت اسی کی ہوگی، دنیا میں رہتے ہوئے بھی ہر شئی کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

لیکن یہاں مجازاً ہی صحیح ملکیت کی نسبتیں دوسروں کی طرف بھی ہیں آپ بھی بعض چیزوں کے مالک کہلاتے ہیں اور حقوق شرعیہ کے تحت ملکیت بعض حضرات کی بعض حضرات کے لیے ہے تو مالک کا اطلاق آپ پر بھی ہوتا ہے، مجازاً نسبت آپ کی طرف ہوسکتی ہے لیکن قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ملکیت اس طرح سے نمایاں ہوگی کہ کوئی دوسرا مجازاً بھی مالک نہیں ہوگا، اس لیے اس کو "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں خاص کر کے ذکر کر دیا ہے، قرآن کریم میں "سورۃ زمر" اور "سورۃ مؤمن" کے اندر اس مضمون کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے "لمن الملك اليوم لله الواحد القهار" سورۃ مومن میں یہ آیت ہے، لمن الملك اليوم آج ملک کس کے لیے ہے؟ حکومت سلطنت کس کی ہے؟، سب طرف سے جواب یہی آئے گا "لله الواحد القهار" اللہ واحد کے لیے جو سب کو کنٹرول کرنے والا ہے اسی کے لیے ہر قسم کی مِلک اور ملکیت ثابت ہے ان سورتوں کے اندر اس مضمون کی وضاحت زیادہ کی گئی ہے تو یہ ظاہری طور پر جو مِلک کی نسبتیں آپ کی طرف یا ہماری طرف ہوئی ہیں اس دن یہ ساری کی ساری ختم ہو جائیں گی اور مالک حقیقی اللہ ہی ہوگا اور یہ بات ہر کسی کے سامنے واضح ہو جائے گی اس لیے "يَوْمِ الدِّيْنِ" کی طرف نسبت کر کے اللہ تعالیٰ کو مالک قرار دیا گیا ہے۔

توحید اور شرک میں صرف ''ہی'' اور ''بھی'' کا فرق ہے:

''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' ترجمہ اس کا آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ حصر کے ساتھ کرنا ہے، تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں، تیری ہی ''ہی'' کا لفظ اردو کے اندر حصر کے لیے آتا ہے جس طرح سے ''بھی'' شرکت کے لیے آتا ہے، جہاں ''بھی'' آجائے وہاں شرکت ہوتی ہے، میں آپ کا بھی دوست ہوں! جس کا مطلب ہے کہ اور بھی ہیں جن کا میں دوست ہوں آپ کا بھی ہوں اس فہرست میں تیرا بھی نام ہے، اور جب کسی کو کہا جائے کہ آپ ہی کا دوست ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرا کوئی دوسرا دوست نہیں میں صرف آپ کا ہی ہوں، جیسے حضرت مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمۃ اللہ علیہ تقریر میں یہ عموماً ذکر کیا کرتے تھے جہاں کہیں توحید پر وعظ ہوتا میں نے ان کی زبان سے بار ہا سنا فرمایا کرتے تھے کہ توحید اور شرک میں تو صرف ''ہی'' اور ''بھی'' کا فرق ہے موحد کہتے ہیں تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور مشرک کہتے ہیں تیری بھی کرتے ہیں۔

اور قرآن کریم میں چونکہ مشرک کی مثال ''سورۃ النور'' میں زانی کے ساتھ بھی دی گئی ہے تو فرمایا کرتے تھے کہ زانی اور زانیہ کی بھی یہی صفت ہے کہ جب پاک دامن عورت اپنے شوہر سے بات کرے گی اس کے دل دماغ میں یہ ہوتا ہے کہ تیری ہی ہوں اور بازاری عورت جس وقت اپنی محبت کا اظہار کرے گی کہے گی تیری بھی ہوں تو فرق ''ہی'' اور ''بھی'' کا جس طرح سے زانی اور زانیہ ''بھی'' کے قائل ہیں اسی طرح سے مشرک بھی ''بھی'' کا قائل ہے، تو ''سورۃ النور'' میں مشرک اور زانی، مشرکہ اور زانیہ کا ذکر اکٹھے ایک آیت میں آیا ہوا ہے۔

اس کی مناسبت کو ذکر کر دیتے ہیں کہ ان دونوں میں وجہ اشتراک کیا ہے کہ یہ دونوں ''بھی'' کے قائل ہیں مشرک بھی ''بھی'' کہتے ہیں کہ ہم تیری بھی عبادت کرتے ہیں اور زانی اور زانیہ بھی دوسروں کو کہتے ہیں تیرا بھی ہوں، تیری بھی ہوں، اور جو عفیف عورت ہوتی ہے وہ ''ہی'' کی قائل ہوتی ہے کہ تیری ہی ہوں کسی دوسرے سے تعلق نہیں اسی طرح موحد بھی ''ہی'' کا قائل ہوتا ہے کہ تیرا ہی ہوں، تیری ہی عبادت کرتا ہوں ''ہی'' کا لفظ اردو کے اندر حصر کے لیے آیا کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تیرے علاوہ ہم کسی کی عبادت نہیں کرتے۔

گویا کہ یہ لفظ ہمیں تلقین کیے جارہے ہیں کہ اپنی زبانوں سے یوں ادا کرو اسی لیے آپ جلالین کے اندر پڑھیں گے کہ انہوں نے اس سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' سے پہلے ''قولوا'' کا لفظ مقدر ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جارہا ہے ''قولوا الحمد للہ رب العلمین'' الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ گویا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں

تلقین کر رہے ہیں جس طرح سے ابتداءً بچے کو سبق پڑھایا جاتا ہے تو استاد کہتا ہے کہہ ''الف'' ''ب'' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں کہا کہ یوں کہو'' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ''اصل میں ہماری زبان سے کہلوایا جارہا ہے۔

اسی طرح'' اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ '' بھی ہماری زبان سے کہلوایا جارہا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اگر یہ قال اللہ کے طور پر ذکر کیا جاتا'' قال اللہ الحمد للہ رب العٰلمین'' تو'' قال اللہ'' کے تحت'' ایاک نعبد'' نہیں آئے گا'' قال اللہ قولوا الحمد للہ رب العٰلمین'' اب اس کے ساتھ جوڑ لگ جائے گا'' قولوا ایاک نعبد وایاک نستعین '' کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم یوں کہا کرو'' اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ '' ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

گذشتہ صفات کا طبعی اقتضاء:

اب یہ پچھلی صفات کا ایک طبعی اقتضاء ہے جب سب صفات کمال اسی میں ہیں تو یہ اس کا ذاتی کمال ہوگیا '' رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ '' یہ اس کا ایک ذاتی کمال ہوگیا کہ مخلوق کے ساتھ اس کا ربوبیت کا تعلق ہے، مخلوق کے لیے وہ'' رحمٰن'' ہے، مخلوق کے لیے وہ'' رحیم'' ہے، جیسے لفظی وضاحت کے تحت آپ کے سامنے ذکر کردیا گیا کہ اس سے دل و دماغ پر قابو پالیا گیا کہ وہی پیدا کرنے والا ہے، وہی سب کچھ دینے والا ہے اور وہی سب ضرورتیں پوری کرنے والا ہے جب آپ اس مفہوم کو سمجھ جائیں گے کہ ایک ذات کامل الصفات ہے اور وہ کامل الصفات ہونے کے ساتھ مخلوق کا رب بھی ہے اور اس کا تعلق مخلوق کے ساتھ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہونے کا بھی ہے اور پھر وہ مخلوق کے ساتھ'' مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ '' ہونے کا تعلق بھی رکھتی ہے۔

کہ ہم نے زندگی گزار کر آخر اسی کے سامنے پیش ہونا ہے، ساری ملکیتیں ختم ہوجائیں گی جس میں قیامت کے دن کا تصور دے دیا گیا تو ان کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر بندگی اور عبادت کا تعلق اسی ذات کے ساتھ ہے جیسے لفظ'' رب'' کے مفہوم میں میں نے ذکر کیا کہ اس کا مفہوم حقیقی طور پر اگر دل و دماغ میں اتار لیا جائے تو یہ باقی مخلوق سے استغناء کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف احتیاج کا تقاضا کرتا ہے، ایاک نعبد میں ہم نے اسی چیز کا اعتراف کیا جو پچھلے الفاظ کا لازمی نتیجہ ہے، پچھلی باتوں کے اقرار کرنے کا ایک طبعی نتیجہ ہے کہ ہم باقی سب مخلوق سے بے نیاز ہیں، ہم کسی کا اپنے آپ کو محتاج نہیں سمجھتے، عبادت اور بندگی کا تعلق صرف تیرے ساتھ ہی ہے اور ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں، کس بارے میں مدد چاہتے ہیں؟ یہاں اس کی بھی تعیین نہیں کی گئی، زندگی کے ہر معاملے میں

کہ جب پیدا کرنے والا وہی، ہر قسم کی صفات دینے والا وہی، تو کسی کام کے ہونے نہ ہونے کا اختیار بھی اسی کو ہے اسباب موافق مہیا کردے گا کام ہو جائے گا اگر اسباب مخالف مہیا ہوں گے تو کام نہیں ہوگا ''الیہ یرجع الامر کلہ'' جب اس کی شان یہ ہے کہ ہر امر کا رجوع اسی کی طرف ہی ہے۔

تو ہم جو کچھ کریں گے تیری ہی مدد سے کریں گے، تیری مدد براہ راست نمایاں ہو جائے تجھے اختیار ہے، تیری مدد اس طرح نمایاں ہو جائے کہ تو مخلوق کے دل میں ڈال دے کہ وہ ہمارے ساتھ کسی معاملے میں موافقت کرے، تو بادلوں کو تلقین کردے ہمارے کام کے لیے، ہواؤں کو متعین کردے ہمارے کام کے لیے، کسی بندے کے دل میں ڈال دے بہر حال جو چیز بھی بظاہر ہمارے لیے مددگار ثابت ہو رہی ہے اس زندگی کو گزارنے کے لیے، ظاہری طور پر ہم بیلوں سے مدد لیں گے کاشتکاری کے لیے، ظاہری طور پر ہم گھوڑوں گدھوں سے مدد لیں گے بار برداری کے لیے اور یہ آگ، پانی، مٹی، ہوا، اس کو ہم استعمال کریں گے لوہا، تیل جو کچھ بھی ہے استعمال کر کے ہم اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں یہ زندگی گزارنے میں ہمارے مددگار ہیں۔

لیکن چونکہ سب کا عطا کرنے والا مہیا کرنے والا تو ہی ہے تو ہم تیرے سامنے درخواست کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں مددگار تو ہی ہے، ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں کہ ہمارے لیے اسباب مہیا کردے جس سے ہمارے کام ہو جائیں گویا کہ یہ پچھلے الفاظ کے اقرار کرنے کا ایک طبعی اقتضاء ہے کہ احتیاج بھی اسی کی طرف، بندگی کا تعلق بھی اسی کے لیے اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں زندگی گزارنے کے لیے، اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے، عملی زندگی کے لیے، مدد بھی اسی کی ہی چاہتے ہیں اگر مدد اس کی شامل حال نہ ہو تو کام نہیں ہو سکتے، اس کی مدد کے ظاہر ہونے کے بظاہر آگے مختلف طریقے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ظاہر کس طرح سے ہوتی ہے تو اس میں صراحت کے ساتھ اس توحید کا ذکر آ گیا جو اللہ تعالیٰ کی صفت تقاضہ کر رہی ہے، باقی رہی یہ بات کہ عبادت کسے کہتے ہیں؟ یہ اس سورۃ کے اختتام پر پھر واضح کروں گا۔

ہدایت اور صراط مستقیم کا مفہوم:

''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' یہ بھی وہی ''قولوا'' کے تحت آ گیا کہ اب آگے یہ دعا کرو کہ ہمیں ''صراط مستقیم'' کی ہدایت دے، بتلانا، دکھانا، چلانا، ہدایت کا سارا مفہوم ہوتا ہے، شرح تہذیب کی ابتداء میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ ہدایت کا مفہوم ''اراءۃ الطریق'' بھی ہے اور ہدایت کا مفہوم ''ایصال الی المطلوب'' بھی ہے اور ان دونوں الفاظ کے درمیان فرق کس طرح سے ہوتا ہے شرح تہذیب کے مقدمہ میں طالب علموں نے پڑھ لیا

تو یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں بہر حال یوں ترجمہ کرلو کہ ہمیں صراط مستقیم دکھلا جس طرح سے بعض تراجم میں ذکر کیا گیا یہ بات بھی صحیح ہے، ہمیں صراط مستقیم پر چلا یہ بات بھی صحیح ہے ''صراط مستقیم'' سیدھا راستہ۔

سیدھے راستے سے مراد ہے کہ اس میں کوئی پیچ وخم نہ ہو اور کوئی اس میں خوف وخطر نہ ہو ایک جگہ سے انسان چلتا ہے دوسری جگہ پہنچنا چاہتا ہے دو خط آپ کھینچ لیجئے ایک اوپر، ایک نیچے ایک نقطہ اس میں متعین کرلیں اور ایک نقطہ اس میں متعین کرلیں، اس نقطے سے اس نقطے کو ملانے کے لیے آپ جتنے خطوط کھینچیں گے جو سب سے زیادہ سیدھا ہوگا وہی سب سے زیادہ چھوٹا ہوگا یعنی ایک نقطے کو دوسرے نقطے سے ملانے کے لیے آپ خطوط کھینچیں جتنے بھی کھینچ لو جو خط سب سے زیادہ سیدھا ہوگا گویا کہ ''صراط مستقیم'' مسافت کے لحاظ سے مختصر بھی ہے کہ جس میں محنت تھوڑی کرنی پڑے اور مقصد تک جلدی پہنچ جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ مفہوم یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بے خوف وخطر بھی ہو ورنہ آپ ایک مختصر راستہ لے لیں اس میں خوف وخطرہ ہے، گڑھے اور کھڈے ہیں۔

اور ایک لمبی سڑک اور صاف ستھری ہے تو بسا اوقات آپ لمبی سڑک پر چلیں گے تو جلدی پہنچ جائیں گے اور یہ جو خراب راستہ ہے اس میں وقت زیادہ لگ جائے گا تو صحیح طور پر صراط مستقیم وہی ہوتا ہے جس میں دونوں صفتیں پائی جائیں کہ مسافت کم ہو اور اس میں کسی قسم کا خوف وخطرہ نہ ہو، تاکہ ہم اپنے مطلب تک جلدی پہنچ جائیں اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت میں کہ درست راستے پر چلو اگرچہ دور ہی کا کیوں نہ ہو اس میں یہی بے خوف وخطر والا راستہ مراد ہے، ایک راستہ ایسا ہے کہ اس میں مسافت کم ہے لیکن اس میں خطرات ہیں اس راستے کو چھوڑ دو اور جس راستہ میں مسافت زیادہ ہے لیکن خطرات نہیں ہیں اس راستے کو استعمال کرو، صراط مستقیم کے دو مفہوم ہوئے، ایک تو یہ ہے کہ مسافت کم ہو کہ ہمیں محنت کم کرنی پڑے اور ہم اپنے مطلب تک پہنچ جائیں اور دوسرا یہ ہے کہ اس راستے میں خوف وخطرہ کوئی نہ ہو ایسا سیدھا راستہ ہمیں دکھادے۔

صراط مستقیم کی وضاحت:

''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' مفسرین کہتے ہیں کہ ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' یہ ''الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' سے بدل ہے اور بدل کا مفہوم آپ نے نحو کے اندر پڑھا کہ جہاں بدل اور مبدل منہ اکٹھے آجایا کرتے ہیں وہاں مقصود بالنسبت بدل ہوا کرتا ہے، تو اس کو بدل قرار دیا گویا کہ ''صراط مستقیم'' یہ بطور تعارف کے ذکر کیا ہے اور اصل مقصود ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' ہے اور بدل مبدل منہ کا ترجمہ کرتے وقت لفظ ''یعنی'' کا بڑھا دیا جاتا ہے ''جاء نی اخوك زيد'' ''میرے پاس تیرا بھائی آیا یعنی زید یوں کہہ دیا

جائے تو مفہوم ذرا واضح ہو جاتا ہے میرے پاس تیرا بھائی زید آیا یہ بات بھی صحیح ہے تو یہاں اسی طرح ہے دکھا ہمیں سیدھا راستہ یعنی راستہ ان لوگوں کا اگر یوں کہہ دیا جائے تب بھی بات ٹھیک ہے اور ''یعنی'' کا لفظ بولے بغیر کہہ دیں بتلا تو ہمیں سیدھا راستہ ان لوگوں کا جن پر تیرا انعام ہوا اس طرح سے بھی بات صحیح ہے۔

''الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' جن پر تیرا انعام ہوا اس سے مراد ''منعم علیهم'' وہ چار گروہ ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہ آیا ہوا ہے ''انعم الله علیهم من النبیین والصدیقین والشهداء والصالحین وحسن اولئك رفيقا'' یہ چار گروہ ہیں ''منعم علیهم'' ، تو صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کا مطلب یہ ہوا کہ ''منعم علیهم'' کے راستے پر ہمیں چلنے کی توفیق دے، یہ راستہ ہمارے سامنے واضح کر، نبیوں والا راستہ، صدیقین کا راستہ، شہداء کا راستہ اور صالحین کا راستہ، اس راستے پر ہمیں چلا۔

''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن پر تیرا غضب نہیں کیا گیا اور وہ گمراہ نہیں ہوئے ایسے ''منعم علیهم'' جن پر تیرا غضب نہیں ہوا بلکہ تو ان سے راضی ہے تو جب ان لوگوں کے راستے پر ہم چلیں گے تو ہم سے بھی اللہ راضی ہو جائے گا اور وہ بھٹکے ہوئے نہیں ہیں کہ ''صراط مستقیم'' کو چھوڑ کر کسی اور طرف بھٹک جائیں ایسا نہیں۔

مغضوب علیهم اور ضالین میں فرق اور ان کا مصداق:

''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' یہ دو لفظ یہاں بولے گئے، مفسرین دونوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ''صراط مستقیم'' سے پھسل جانا دو وجہ سے ہوتا ہے ایک سبب ہے جہالت کہ سیدھا راستہ معلوم نہیں تھا، غلط راستے پر چل دیئے جیسے مسئلہ معلوم نہ ہوا اور عمل غلط کر لیا جائے یہ جہالت ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ علم تو ہے مسئلہ معلوم ہے لیکن انسان اس کے مطابق عمل نہیں کرتا، عالم ہونے کے باوجود غلط روی اختیار کر لیتا ہے، اس کو معلوم ہے کہ راستہ یہ ہے لیکن وہ جان بوجھ کر راستہ دوسرا اختیار کر لیتا ہے، جہالت کی بناء پر جو ''صراط مستقیم'' سے بھٹک جاتے ہیں وہ ضالین کا مصداق ہیں، اور جو جان بوجھ کر صراط مستقیم کو چھوڑ دیتے ہیں وہ ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کا مصداق ہیں، تاریخی طور پر عیسائی ضالین کا مصداق ٹھہرتے تھے اور یہود ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کا مصداق ٹھہرتے تھے جو عام طور پر آپ تفاسیر کے اندر لکھا ہوا دیکھیں گے ''الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' سے مراد یہود ہیں اور ''ضالین'' سے مراد نصاریٰ ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔

جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہود کے راستے سے بھی ہمیں بچا اور نصاریٰ کے راستے سے بھی ہمیں بچا، لیکن اصل بات وہ ہے جو عرض کر رہا ہوں، ان لوگوں کے راستے پر ہمیں چلا جو تیرے "منعم علیھم" ہیں نہ تو وہ بے علم ہیں اور نہ جاننے کے باوجود وہ بد عمل ہیں اور یہی دو کمال ہیں کہ انسان کے پاس علم بھی ہو، اور علم کے مطابق عمل بھی ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن کے پاس علم بھی ہے اور علم کے مطابق ان کا عمل بھی ہے، جاہلوں کے راستے سے بچا کہ جن کو علم ہی نہیں اس لیے وہ جہالت کے اندر ڈگمگاتے پھرتے ہیں اور ان لوگوں کے راستے سے بھی بچا جو جانتے سب کچھ ہیں لیکن جانتے ہوئے کج روی اختیار کرتے ہیں۔

تو عالم "اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" کا مصداق ہوا اور جاہل ضالین کا مصداق ہوا، تو ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا اور وہ کون لوگ ہیں جن پر تیرا انعام ہوتا ہے جو علم بھی رکھتے ہیں اور علم کے مطابق ان کا عمل بھی ہے ایسے نہیں ہیں کہ جہالت کی بناء پر وہ غلطیاں کر رہے ہوں، نہ وہ ایسے ہیں کہ علم تو ہے لیکن نفسانی شرارت کی بناء پر، شہوت پرستی کی بناء پر وہ اس علم کے مطابق عمل نہ کرتے ہوں تو یہ ہے اس دعا کا حاصل۔

لفظ عبادت کی تشریح:

"اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" اس میں جو لفظ عبادت آیا ہوا ہے اس کی تشریح میں عبد شدن، بندہ بننا، کسی کے ساتھ بندگی کا تعلق رکھنا، ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے، مطلب اس کا یہ ہوا کرتا ہے کہ کسی کے ساتھ عبدیت کا تعلق ہو جائے غلامی کا تعلق ہو جائے، تو پھر انسان کے اپنے اختیارات ختم ہو جایا کرتے ہیں، عبد کے اوپر، غلام کے اوپر اختیارات اس کے مولیٰ کے چلتے ہیں، جیسے فقہ کی کتابوں میں آپ عبد کے احکام پڑھتے رہتے ہیں کہ وہ اپنا نکاح کرنے کا مجاز نہیں، خرید و فروخت کرنے کا مجاز نہیں، کوئی بھی اس کا تصرف بغیر اس کے مالک کی اجازت کے نہیں ہو سکتا، وہ کسی چیز کا مجاز نہیں، مالک جس کام کی اجازت دے گا وہی کام وہ کر سکتا ہے۔

تو یہاں مطلب یہ ہوا کہ بندگی کا تعلق ہمارا صرف اللہ تعالیٰ سے ہے کسی اور کی ہم عبادت نہیں کریں گے، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ عبادت کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی ذات کے متعلق انتہائی عظمت کا عقیدہ رکھتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنا، یہ عبادت کا مفہوم ہے کہ کسی شخصیت کے متعلق، کسی ذات کے متعلق انتہائی عظمت کا عقیدہ رکھتے ہوئے کہ اس کو ہم پر اتنی عظمت حاصل ہے کہ جس کی کوئی انتہاء نہیں اور اس کے سامنے

غایت تذلل اختیار کرنا، انتہائی عاجزی اور ذلت اختیار کرنا ان الفاظ کے ساتھ عبادت کا مفہوم ذکر کیا جاتا ہے جب کسی کے متعلق آپ یہ عقیدہ رکھیں کہ ان کو ہمارے اوپر بہت عظمت حاصل ہے، بے انتہاء بڑائی حاصل ہے تو اس کے بعد آپ زبان سے اقوال ایسے نکالیں جو عظمت پر دال ہوں یا آپ اس قسم کا فعل اختیار کریں جو عظمت پر دال ہو یہ سارے کے سارے اعمال، افعال اور اقوال عبادت ہیں۔

زبان سے اس کی تعریف، حمد وثناء کی جائے، بدنی طور پر اس کے سامنے جھکا جائے، اس کو سجدہ کیا جائے، اس کے سامنے مالی ہدیہ پیش کیا جائے، اس کے حکم پر مال خرچ کیا جائے تو یہ قولی، فعلی، مالی عبادت ہے اور اگر کسی کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے نفع ونقصان کا مختار مطلق ہے، ہمارا بنانا اور بگاڑنا اسی کے اختیار میں ہے، ہمیں وہ بنانا چاہے تو کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور وہ بگاڑنا چاہے تو کوئی بنا نہیں سکتا، وہ ہمیں کوئی نفع پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اگر وہ ہمیں نقصان پہنچائے تو کسی شخص میں طاقت نہیں ہے کہ وہ اس کو دفع کر دے یہ عقیدہ جس شخصیت کے متعلق آپ رکھیں گے تو آپ نے اسی کو معبود بنالیا، یہ عقیدہ رکھنے کے بعد آپ اس کے سامنے جھکیں گے، اس کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھیں گے، اس کے نام پر اس کو خوش کرنے کے لیے مال دیں گے، زبان کے ساتھ اس کی حمد وثناء کریں گے تاکہ وہ خوش ہو جائے یہ سارے اقوال، سارے افعال عبادت بن جائیں گے۔

اور اگر کسی کے متعلق یہ عقیدہ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ آپ اس قسم کی حرکات کرتے ہیں جیسے استاذ کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھتے ہیں یا آپ اپنے شیخ کی اپنی زبان سے تعریف کرتے ہیں، اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے سامنے مالی ہدیہ پیش کرتے ہیں جس طرح انسان اپنے اساتذہ کے سامنے، اپنے مشائخ کے سامنے مالی ہدیے بھی تو پیش کرتا ہے، جاتے ہوئے آپ فروٹ لے جاتے ہیں، کبھی کپڑوں کا جوڑا دے دیا، کبھی اس کو نقد ہدیہ پیش کر دیا، اب یہ سلسلہ جاری ہے مشائخ کو، اساتذہ کو جن کو انسان بزرگ سمجھتا ہے تو ان کے سامنے مالی ہدیے بھی پیش کیے جاتے ہیں اور انسان ان کے سامنے جاتا ہے تو دوزانوں ہو کر بھی بیٹھتا ہے اور زبان کے ساتھ ان کی تعریف بھی کرتا ہے، ان کا شکریہ بھی ادا کرتا ہے یہ اقوال یہ افعال سارے کے سارے تعظیم کے ہیں۔

اس سے ان کی تعظیم کی جاتی ہے، لیکن ان کو عبادت نہیں کہیں گے کیونکہ جس کے متعلق آپ اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں یا یہ حرکات اختیار کر رہے ہیں ان کے متعلق آپ کا یہ عقیدہ نہیں کہ ہمارا بگاڑنا، سنوارنا اس کے اختیار میں ہے یہ ہمارے نفع، نقصان کا مختار مطلق ہے جس کے اشارے کے ساتھ ہی کایا پلٹ جاتی ہے اس قسم کا عقیدہ ان کے متعلق نہیں ہے لہٰذا یہ تعظیم کی حرکات تعظیم ہی کہلائیں گی عبادت نہیں کہلائیں گی اور اگر اسی کے متعلق یہ

عقیدہ ہو جائے تو پھر اس کے نام پر مال دیں، اسی کے سامنے جھکیں، اس کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھیں تو یہ حرکات عبادت ہو جائیں گی، حتیٰ کہ سجدہ ہے سجدے کی دو قسمیں آپ کے سامنے آتی رہتی ہیں ایک سجدہ تعظیمی ہے جو شرک نہیں ہے اگرچہ حرام ہے اور ایک سجدہ عبادت ہے جو شرک ہے۔

سجدہ تعظیمی اور سجدہ عبادت میں فرق:

اب یہ سجدہ تعظیمی اور سجدہ عبادت کے درمیان فرق کس طرح سے ہوگا، ایک آدمی پیر کو سجدہ کرتا ہے، اس کے سامنے اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیتا ہے اب کیسے پتہ چلے گا کہ اس کا یہ سجدہ کرنا شرک ہے یہ شخص مشرک ہو گیا یا اس نے حرام فعل کا ارتکاب کیا؟ اب ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کس طرح سے ہوگا؟ فرق کی بات آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں کہ فرق ہوگا اس کے اپنے عقیدے کے ساتھ اگر اس کا عقیدہ اپنے پیر کے متعلق یہ ہے کہ ہمارے نفع ونقصان کا مختار مطلق ہے، بنانا بگاڑنا اسی کے ہاتھ میں ہے اس نظریے کے تحت اگر اس کو سجدہ کرتا ہے تاکہ خوش ہو کر میری قسمت بنا دے اور یہ ناراض نہ ہو کہ میرا کچھ بگاڑ دے اس نظریے کے تحت اگر وہ اپنے پیر کو سجدہ کرتا ہے زندہ ہو یا مردہ ہو جب وہ سجدہ کرے گا مشرک ہو گیا، ایمان سے خارج ہو گیا، اور اگر اس کا اس کے متعلق یہ عقیدہ نہیں وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہے تو یہ میرے جیسا انسان لیکن اللہ کا مقبول بندہ ہے، بگاڑنا بنانا اس کے اختیار میں نہیں ہے اللہ کے اختیار میں ہے، نظریہ اس کا صحیح ہے تو پھر اگر وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور پیشانی زمین کے اوپر رکھ دیتا ہے تو ایسی صورت میں اس نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے اس کو مشرک نہیں کہیں گے۔

یہ فرق جو پڑتا ہے ان دونوں باتوں کے درمیان اس نظریے سے پڑتا ہے اگر اس کے متعلق عقیدہ یہ ہو کہ وہ مختار مطلق ہے وہ قادر مطلق ہے، اگر وہ نفع پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اگر وہ کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کوئی ہٹا نہیں سکتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر بار بار اس مضمون کو بیان فرمایا، سورۃ یونس کے آخری رکوع میں ہے ”ان یمسسك الله بضر فلا کاشف له الا هو وان یردك بخیر فلا راد لفضله“

اگر وہ تجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو اس نقصان کو دور ہٹانے والا اس کے بغیر کوئی نہیں اور اگر وہ آپ کے متعلق کسی خیر اور فضل کا ارادہ کرے تو اس کے خیر وفضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں، حضور ﷺ کی دعاؤں کے اندر بھی یہ الفاظ آئے ہیں، آپ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے اس میں یہ الفاظ بھی ہوا کرتے تھے اللہ کی حمد وثناء کے طور پر ”اللھم لامانع لما اعطیت ولامعطی لما منعت“ (اے اللہ جو تو دینا چاہتا ہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو تو روک لے اس کو دینے والا کوئی نہیں) یہ عقیدہ اصل کے اندر الوہیت پیدا کرتا ہے اس ذات میں جس کے متعلق

آپ یہ عقیدہ رکھتے ہیں تو عبادت کا مفہوم یہ ہوا کہ ہم اپنے اوپر کسی کو مختار مطلق نہیں مانتے، اپنے اوپر کسی کو قادر مطلق تسلیم نہیں کرتے، ہمارے بنانے، بگاڑنے کا اختیار سوائے تیرے کسی کو نہیں، ہمارے نفع ونقصان کا مختار مطلق تیرے علاوہ کوئی نہیں، جب یہ عقیدہ ہم رکھیں گے تو اس کے بعد جو بھی ہماری حرکات ہوں گی وہ عبادت کہلائیں گی۔

اس عقیدہ کو کسی غیر کے ساتھ لگا لیا جائے تو انسان مشرک ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہی عقیدہ رکھیں گے جہاں یہ عقیدہ ہوگا تو اس کے بعد عظمت پر دلالت کرنے والی بات، عظمت پر دلالت کرنے والا فعل یہ سارے عبادت کہلائیں گے، اور اگر اس عقیدے سے خالی ہو اگر چہ حرکات اسی قسم کی ہوں جس قسم کی عبادت کے لیے کی جاتی ہیں تو وہ عبادت نہیں کہلائیں گی بلکہ تعظیم کہلائیں گی یہ عبادت کا مفہوم ہوا۔

صراط مستقیم کی حقیقت اور دور حاضر کی گمراہی:

آگے جو ذکر کیا گیا " اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ " لفظی تشریح ان کی ہوگئی "صراط مستقیم" کا لفظ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر عبادت کے تذکرے کے بعد آیا ہے۔

"سورۃ یٰسین" کی آیت " الم اعهد الیکم یٰبنی آدم ان لا تعبدوا الشیطٰن انه لکم عدوٌ مبین وان اعبدونی، هذا صراط مستقیم "

میری عبادت کرو یہی صراط مستقیم ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرے کے اندر اسی قسم کے الفاظ ہیں "هو ربی وربکم فاعبدوه، هذا صراط مستقیم " وہ اللہ ہی میرا رب ہے، تمہارا رب ہے "فاعبدوه" اسی کی عبادت کرو" هذا صراط مستقیم "صراط مستقیم یہی ہے تو ان آیات کے قرینے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس صراط مستقیم کی ہم نے اللہ سے ہدایت طلب کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں طریقۂ عبادت بتا دے کہ ہم تیری عبادت کس طرح سے کریں؟ جو عبادت کا طریقہ ہے ہمیں اس کے اوپر چلا اور اس عبادت کے طریقہ کا پتہ کس طرح سے چلے کہ یہ طریقہ ہے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا تو اس میں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کتاب نازل کر دیتے اور کہتے کہ یہی کتاب آپ کو طریقہ بتائے گی یہ بھی کافی ہے، پھر اس کتاب کو پڑھ کر علمی دلائل کے تحت اس طریقے کو متعین کر لیا جاتا لیکن علمی دلائل کے تحت کسی طریقے کو متعین کرتے وقت اس کی تعبیرات میں اختلافات ہو سکتے ہیں۔

کیونکہ اکیلی کتاب پڑھ کر کوئی شخص سیدھا راستہ اپنا نہیں سکتا، یہ بات اصولی طور پر یاد رکھیے اور آج کے دور میں گمراہی کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ مطالعہ کے ساتھ کوئی شخص کسی چیز کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے، یہ عقیدہ آج کی گمراہی کی بنیاد ہے، کوئی شخص مشکوٰۃ شریف کا اردو ترجمہ گھر میں رکھ لیتا ہے، اور اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سمجھتا

ہے کہ میں محدث بن گیا پھر اپنے فہم کے مطابق لوگوں کے ساتھ بحثیں کرتا ہے خود بھی گمراہ ہوتا ہے دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے، اردو کی تفسیر گھر میں رکھ لی اس کو پڑھنے کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ ہم قرآن کا مفہوم صحیح سمجھ گئے یا عربی لغت جان لی تو لغت جاننے کے بعد وہ اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قرآن کریم کو حل کر سکتے ہیں اور پھر وہ اسی زعم کے ساتھ اہل علم سے ٹکراتے ہیں اور بے ہودگیاں کرتے ہیں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

محض کتاب سے مہارت حاصل نہیں ہوتی:

یاد رکھیئے! کسی فن کی کوئی کتاب ہو اس کتاب کا مطالعہ کر کے کوئی انسان اس فن میں مہارت اختیار نہیں کر سکتا، یہ ایک ایسا فطری اصول ہے جس کے اوپر کسی قسم کی دلیل کی ضرورت نہیں ہے اگر کوئی شخص اس کی تردید کرے اور کہے کہ نہیں مطالعہ کر کے انسان فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے تو اس کو بہت جلد مشاہدہ کے ساتھ جھوٹا کیا جا سکتا ہے، شاہی دستر خوان ایک کتاب چھپی ہوئی ہے جس میں ہر قسم کے کھانے پکانے کے طریقے لکھے ہوئے ہیں آپ کباب بنانا چاہیں کہ شامی کباب کس طرح سے بنائیں گے، قورمہ کس طرح سے بنائیں گے، پلاؤ کس طرح سے پکائیں گے، فلاں قسم کا حلوہ آپ کس طرح سے پکائیں گے۔

ایک پڑھے لکھے گریجویٹ کے ہاتھ میں وہ کتاب دے دو اور اس کو باورچی خانہ میں بٹھا دو اسے کہو کہ یہ کتاب ہے اور یہ رکھی ہوئیں ہیں تمام اشیاء نسخہ آپ دیکھتے جائیے ہمیں آپ کھانا تیار کر کے دیجئے، اگر وہ کتاب دیکھ کر کھانا تیار کر لے تو یہ علامت ہوگی کہ واقعی کوئی شخص کتاب کا مطالعہ کر کے کسی فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ قدم قدم پر غلطی کرے گا اور کسی صورت میں بھی اچھی قسم کا کھانا نہیں پکا سکے گا بمقابلہ اس شخص کے جس نے کسی استاد کے پاس بیٹھ کر کھانا پکانے کی مشق کی ہوگی۔

کپڑے سینے کے متعلق درزیوں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ایک کتاب خرید لیجئے اور ایک مشین خرید لیجئے اور بیٹھ جائیں پینٹ کوٹ اور دوسرے کپڑے سینے شروع کر دیجئے، جتنے کپڑے صبح سے لے کر شام تک سلائی کرو گے فی جوڑا سو جوتا شام تک نہ کھایا تو پھر کہنا۔ اور کپڑے دینے والے سوائے اس کے کہ آپ کی مرمت جوتے سے کریں کہ ہمارے کپڑے برباد کر دیئے اور کیا کریں گے، جس وقت آپ کتاب دیکھ کر کپڑے سینے کی کوشش کریں گے تو یہی حال ہوگا۔

لوہار نہیں بن سکتا انسان جس وقت تک لوہار کے پاس بیٹھ کر کام کرنا نہ سیکھے، درکھان نہیں بن سکتا، الغرض کوئی کام نہیں سیکھ سکتا، کپڑا بنانا نہیں سیکھ سکتا جس وقت تک کسی استاد کی مار نہ کھائے، کون سی چیز ہے جو آج تحریر میں آئی

ہوئی نہیں، دور نہ جایئے! کیا طب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوگیا؟ ڈاکٹری کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوگیا؟ تو کیا ضرورت ہے سکولوں، کالجوں میں دھکے کھانے کی، کسی کے پاس جوتیاں چٹخانے کی، کتابیں خرید و اور دکان کھول کر بیٹھ جاؤ، تپ دق کا مریض آ گیا تو تپ دق کے باب کا مطالعہ کرو اور اس کو نسخہ لکھ کر دے دو، نزلے کا مریض آ گیا تو نزلے کے باب کا مطالعہ کرو اور اس کو نسخہ لکھ کر دے دو، اب اس قسم کا ڈاکٹر جو کتابوں پہ مدار رکھ کر طبیب اور ڈاکٹر بن گیا ہو کسی استاد سے اس نے مار نہ کھائی ہو تو بتلاؤ وہ سوائے قبرستان کو آباد کرنے کے اور کیا کام کرے گا؟ سب چیزوں کے متعلق لوگوں کا عقیدہ یہی ہے کہ جب تک کسی استاد کی صحبت اختیار نہ کی جائی اور اس کی مار نہ کھائی جائے اس وقت تک کوئی شخص کسی فن کے اندر مہارت حاصل نہیں کر سکتا، اکبر الہ آبادی مرحوم نے چند لفظوں میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ کورس تو الفاظ ہی **سکھاتے** ہیں، آدمی، آدمی بناتے ہیں۔

یعنی کورس جو ہوتا ہے، کورس کی کتابیں، نصاب کی کتابیں ان سے تو آپ الفاظ سیکھ جائیں گے، الفاظ رٹ لیں گے باقی یہ ہے کہ کوئی آدمی بن جائے، آدمی بنانا آدمی کا کام ہے تو جس وقت تک کسی آدمی کی صحبت اختیار نہیں کریں گے جو اس فن کے اندر مہارت رکھنے والا ہو اس وقت تک انسان اس فن کی حقیقت سے کبھی واقف نہیں ہو سکتا یہ ایک واقعہ ہے اور جس وقت آپ چاہیں اس اصول کی صداقت کو تجربے میں لا کر واضح کر لیں کہ صرف الفاظ سے، کتابوں کے مطالعہ کرنے سے کبھی کسی فن کے اندر مہارت حاصل نہیں ہوتی آپ کے گھروں میں آپ کی مائیں، آپ کی بہنیں کھانا پکاتی ہیں، روٹی پکاتی ہیں اور آپ چولہے کے پاس بیٹھ کر ان کو پکاتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن کیا کسی دن ضرورت پیش آ جائے تو آپ پیڑا بنانے پر اور روٹی بنانے پر قادر ہو جائیں گے جیسی روٹی وہ پکاتی ہیں آپ پکا لیں گے، جیسی ہانڈی وہ پکاتی ہیں آپ پکا لیں گے، قدم قدم پر آپ غلطی کریں گے آپ نہیں پکا سکتے۔

ہاں البتہ آپ کی چھوٹی بہن جس نے ماں کی ماریں اور جھڑکیں کھائی ہیں، پاس بیٹھ کر پیڑا بنانا سیکھا ہے، روٹی پکانا سیکھی ہے وہ چند دنوں میں مہارت حاصل کر لے گی اور آپ کو چالیس چالیس سال ہو جائیں گے دیکھتے ہوئے لیکن جب ضرورت پیش آئے گی آپ روٹی نہیں پکا سکیں گے، فرق کیا ہے کہ اس نے اپنی اماں کی روٹی پکانے کے لیے شاگردی اختیار کی ہے اور آپ نے شاگردی اختیار نہیں کی، یہ اتنا واضح اصول ہے کہ جس کے اوپر زیادہ دلائل دینے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس وقت تک کسی فن میں مہارت پیدا نہیں ہوتی جس وقت تک کہ ماہرین کی رفاقت اختیار نہ کی جائے، اور ان سے فیض حاصل نہ کیا جائے، صرف مطالعہ کتب اس کو کبھی بھی اس فن کے رموز سے واقف نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے اندر کوئی مہارت حاصل ہو سکتی ہے۔

دورِ حاضر کی بڑی گمراہی اور حل:

اور آج سب سے بڑی گمراہی کی بات یہی ہے کہ باقی سب فنون کے متعلق لوگوں کا یہی خیال ہے کہ جب تک ہم اس کی سند حاصل نہیں کریں گے کسی استاذ کے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے نہیں اس وقت تک اس میں مہارت حاصل نہیں ہوگی۔

لیکن دینیات کے بارے میں ہر اردو خواں مجتہد بنا ہوا ہے، حدیث کی کتاب کا ترجمہ پڑھ لیا تو اس کو زعم ہوگیا کہ میں نے پورا اسلام سمجھ لیا، قرآن کریم کا ترجمہ پڑھ لیا تو اس کو زعم ہوگیا کہ میں نے سارا قرآن کریم سمجھ لیا، اسی کے بعد پھر وہ فتوے دیتے ہیں۔

اپنی تحقیقات پیش کرتے ہیں خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، ان کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں اور صرف الفاظ سے حقیقت سمجھ میں نہیں آیا کرتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ''صراط مستقیم'' کا ذکر کرنے کے بعد اس کی وضاحت کے طور پر ''صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کہہ دیا یہ ایک حسی نشانی ہے جس سے ہم پہچان سکیں گے کہ طریقہ عبادت اور ''صراط مستقیم'' کیا چیز ہے، حاصل اس کا یہ ہوا کہ ''منعم علیھم'' کا راستہ یہ ''صراط مستقیم'' ہوا، آپ کو پتہ کیسے چلے گا کہ آپ سیدھے راستے پر چل رہے ہیں؟ دلائل کے الجھاؤ میں تو آپ کو کوئی شخص بھی غلط بات صحیح ثابت کر کے دکھلا سکتا ہے، ایک آدمی زبان دراز ہے اس کو بولنے کا طریقہ آتا ہے وہ آپ پر غالب آ سکتا ہے اور کسی غلط بات کا جواب بھی آپ سے نہیں بنے گا ہو سکتا ہے وہ دلائل کے ساتھ آپ کو خلاف حقیقت بات کا حقیقت ہونا سمجھا دے اور وہ حقیقت ظاہری طور پر حقیقت کہلاتی ہو۔

لیکن وہ غلط ہو دلائل میں آپ پر غالب آ سکتا ہے تو ''صراط مستقیم'' کو پہچاننے کے لیے واضح علامت یہ بتادی گئی کہ اس راستے کو تم اللہ کا راستہ سمجھو ''صراط مستقیم'' سمجھو جس راستے پر تمہیں انبیاء علیہم السلام چلتے ہوئے نظر آئیں، صالحین کا راستہ ''صراط مستقیم'' ہے، نبیین کے بعد صدیقین میں عموم ہے، صدیق نبی بھی ہوتا ہے غیر نبی بھی ہوتا ہے، شہداء صدیقین سے عام ہوگئے، صالحین سب سے عام ہوگئے، یعنی یہ ترقی ہے خصوص سے عموم کی طرف کہ صالحین سب سے عام ہیں کہ صالحین کا اطلاق نبیین پر بھی ہوتا ہے، صدیقین پر بھی ہوتا ہے، شہداء پر بھی ہوتا ہے یعنی جن کو عرف عام میں اولیاء اللہ نیک قسم کے لوگ کہا جاتا ہے تو اگر اس کا یہ عنوان اختیار کیا جائے کہ ''صراط مستقیم'' صالحین کا صراط ہے، صالحین کا طریق ''صراط مستقیم'' ہے تو یہ بات بالکل قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہے اسی لیے ہمارے ہاں دین کو سمجھنے کا جو اصول

ہے وہ یہی ہے کہ ہم صرف قرآن وحدیث کے الفاظ پر مدار نہیں رکھتے، بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کی کیا مراد واضح فرمائی اور عمل کیسے اختیار کیا اور سنت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار کو دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کی مراد کو کیا سمجھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مراد کو سمجھنے کے لیے اگلی صدی کے فقہاء رحمہم اللہ کی باتوں کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اس سے کیا سمجھا اس طرح درجہ بدرجہ ایک سلسلہ امت کے اندر صالحین کا چلا آرہا کیونکہ دین ان سے آتا ہے اگر چہ وہ بات آپ کو بظاہر الفاظ کے مخالف معلوم ہو لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے تسلسل کے ساتھ کہ صالحین کا یہی طریقہ چلا آرہا ہے تو ''صراط مستقیم'' یہی ہے جس کو صالحین نے اختیار کیا، قرآن وحدیث کے الفاظ سے وہ آپ کو سمجھ میں آجائے تو بہتر، سمجھ میں نہ آئے تو اس کو اپنی سمجھ کی غلطی قرار دیجئے اور ''صراط مستقیم'' وہی ہوگا جس کو اولیاء امت نے، نیک لوگوں نے، اور مجتہدین نے، فقہاء رحمہم اللہ نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنایا، یہی وجہ ہے کہ جب سرور کائنات ﷺ نے یہ ذکر کیا تھا۔

میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے:

(یہ ایک اہم بات ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں اس کو ذہن نشین کر لیجئے، اس بات کو جس نے اچھی طرح سے سمجھ لیا وہ انشاء اللہ زندگی بھر راہ راست سے کبھی بھٹکے گا نہیں) سرور کائنات ﷺ نے بیان فرمایا کہ میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے جن میں سے بہتر جہنم میں جائیں گے اور ایک جنتی ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جو میرے طریقہ پر ہوں گے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر ہوں گے'' ما انا علیہ واصحابی'' (مشکوۃ ص ۳۰) ملت واحدہ اس کی تعبیر فرمائی'' ما انا علیہ واصحابی'' وہ طریق وہ راستہ جس پر میں ہوں اور جس پر میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔

یعنی یہاں شخصیات کو پیش کیا، یہ نہیں کہا کہ جو قرآن وسنت کے متبع ہوں گے، قرآن وسنت تو ایک علم کے درجے کی چیز ہے لیکن اس ''صراط مستقیم'' کو پہچاننا کس طرح سے ہے کہ اس کی صحیح مراد کیا ہے'' ما انا علیہ واصحابی'' میرے عمل کو دیکھو، میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طرز وطریق کو دیکھو، جس راستے پر میں ہوں اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں وہ راستہ ملت واحدہ ہے جو جنت میں لے جائے گا تو'' ما انا علیہ واصحابی'' یہ جو آپ لفظ استعمال کیا کرتے ہیں کہ ہم اہل سنت والجماعت ہیں اگر چہ اپنی نادانی کے ساتھ ہم نے اس لفظ کو اپنے ہاتھ سے گنوا دیا اور دوسرے قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔

مقام غور:

دوسروں نے تشہیر اپنے متعلق اس طرح سے کی کہ جب کہا جائے کہ یہ مسجد اہل سنت والجماعت کی ہے تو ذہن بریلویوں کی طرف ہی جاتا ہے اور ہم رہ گئے خالص دیوبندی اور اس لفظ کا استعمال ہم نے ترک کر دیا

ور ترک کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قابض ہو گئے یہ ایک ہماری عملی کوتاہی کا نتیجہ ہے اگر ہمارے ہاں بھی کوئی پوچھتا کہ تم کون ہو تو ہم کہتے کہ اہل سنت والجماعت ہیں تو یہ لفظ ان کے لیے الاٹ نہ ہو جاتا، ہماری غفلت سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور اس کو اپنے لیے خاص کر لیا جو کہ ایک جنتی طبقے کا عنوان ہے جس طرح سے میں بار ہا اس دکھ کا اظہار کیا کرتا ہوں کہ یہ بھی ایک تاریخی ظلم ہے کہ اس طبقے نے، بدعتیوں کے طبقے نے اولیاء اللہ کو اپنی صف میں کھڑا کر لیا اور ہمیں مخالف کر کے دکھا دیا کہ یہ اولیاء اللہ کے مخالف ہیں۔

اب ہم ہر سٹیج پر مجبور ہو یہ کہنے کے لیے کہ ہم اولیاء اللہ کو مانتے ہیں کتنی افسوس والی بات ہے یعنی اولیاء اللہ کا ماننا ہمارا اتنا مخفی ہو گیا کہ ہر سٹیج کے اوپر ہمارے واعظوں کو گلے پھاڑ پھاڑ کر ثبوت دینا پڑتا ہے کہ ہم بزرگوں کے قائل ہیں، ہم اولیاء اللہ کے قائل ہیں، ہم اولیاء اللہ کے منکر نہیں ہیں یہ ثبوت دینے پڑتے ہیں، یہ بات کہاں سے پیدا ہو گئی کہ آپ کا عقیدہ اولیاء اللہ کے متعلق اتنا مخفی ہو گیا کہ آپ سٹیج کے اوپر زور لگا لگا کر ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ ہم بھی اولیاء اللہ کو ماننے والے ہیں اور وہ بڑی جلدی عوام کو یقین دلا دیتے ہیں کہ دیکھو یہ لوگ اولیاء اللہ کو نہیں مانتے، میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی ہمارے طرز عمل کا تھوڑا سا قصور ہے جس کی کوتاہی سے دشمن نے فائدہ اٹھایا اور کمزور پہلو کے اوپر اس نے حملہ کیا، اصل بات یوں ہوئی کہ جو اولیاء اللہ معروف ہیں ان کے بن گئے **مقبرے**، ان کی قبروں کے اوپر غلط حرکتیں ہونے لگ گئیں اور ان غلط حرکتوں کی تردید کرنے کی وجہ سے ہمارے لوگ ان مقابر پر آنا جانا ترک کر بیٹھے، ترک کرتے کرتے یہ اگلی نسل اس قسم کی آ گئی کہ یہ کبھی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ سنت کے مطابق ہی کسی مزار کی زیارت کر کے اس پر فاتحہ پڑھ آئیں۔

آخر زیارت قبور کا مسنون طریقہ بھی تو ہے، یہ موجودہ دور میں تصادم ہونے سے قبل جس وقت دیوبندی، بریلوی تصادم ہوا اس سے قبل ہمارے اکابر دیوبند انہی مقابر پر جاتے تھے، یہ جو مقبرے بنے ہوئے ہیں انہی پر جاتے تھے جا کر مراقبے بھی کرتے تھے، فاتحہ بھی پڑھتے تھے لیکن آج کے مبلغین میں سے کوئی ہے جو اس طرح سے کسی مقبرے کی زیارت کے لیے جائے اور وہاں جا کر ادب کے ساتھ کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھے تو جس وقت آپ لوگ ان مقابر پر کبھی نظر نہیں آتے تو دوسروں کو کہنے کا یہ موقع مل گیا کہ ان کا کیا تعلق ان بزرگوں سے اگر ہماری آمد و رفت بھی سنت کے مطابق وہاں ہوتی رہتی تو کم از کم اس گھر کے اوپر یہ مبتدع تو قابض نہ ہوتے اور وہ تو اس لیے یقین جلدی دلا دیتے ہیں کہ آئے دن جو وہ قبروں پر گئے ہوئے ہوتے ہیں، اور تم وہاں کبھی نظر نہیں آتے تمہارے پاس رہ گیا صرف دعویٰ ہی دعویٰ کہ ہمارا تعلق ہے اور بالکل صحیح تعلق ہے، یہ نہیں کہ کوئی لاتعلق ہیں، دل میں عقیدت ہے،

ان کی تعلیمات پر عمل ہے اور ہم ان کے متعلق بڑے اچھے جذبات رکھتے ہیں، ہمارے وہ محسن ہیں کہ ان کی وساطت سے ہدایت اس علاقے میں آئی، اللہ تعالیٰ کی ہدایت اس علاقے میں ان ہی کی وساطت سے پھیلی ہے، ہم ان کے شکر گزار ہیں، ان کے لیے دعا گو ہیں، نام ان کا لیتے ہیں تو ادب سے لیتے ہیں، اور جب ان کا نام آئے تو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں، عقیدت محبت ہے، ہمارے شجروں کے اندر سلسلوں کے اندر ان کے نام آتے ہیں سب کچھ صحیح ہے۔

لیکن وہی عملی بات آگئی کہ عملاً آپ چونکہ کہیں آتے جاتے نظر نہیں آتے تو ان جاہلوں کو موقع مل گیا کہ ان نادانوں کو یہ یقین دلا دیں کہ دیکھو ان کا اولیاء اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور ہمارے اکابر اس طرح دور نہیں رہتے تھے وہ سنت کے مطابق زیارت کرتے اور زیارت کر کے چلے جاتے تھے، اب اس قسم کے واقعات کیا بیان کروں کہ ہمارے دیوبند والے اکابر قریب قریب والے وہ بھی اسی طرح سے معروف معروف مقبروں پر جاتے تھے اور جائز سنت کے مطابق زیارت کر کے واپس آجاتے تھے، اس تصادم کے نتیجے میں ہمارے مبلغین اور جو مولویوں کا طبقہ بالکل کٹ گیا ہے جب کٹ گیا تو دوسروں کو یقین دلانا آسان ہو گیا کہ وہ جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ دیکھو یہ کبھی نظر آئے ہیں؟۔

"ما انا علیہ واصحابی، ما انا" یہ سنت ہے" اصحابی" یہ جماعت ہے تو جنہوں نے یہ طریقہ اپنایا وہ اہل سنت والجماعت ہوئے گویا کہ ہمارا مذہبی طرز یہی ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سنت اور طریق صحابہ رضی اللہ عنہم کیا ہے، اس کو دیکھ کر ہم ایک مسلک اختیار کرتے ہیں اس لیے اہل سنت والجماعت کہلاتے ہیں، یہ عنوان اس روایت کے انہی الفاظ سے لیا گیا ہے تو یہاں بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے شخصیات کو پیش کیا کہ شخصیات کے ساتھ اس ملت کو پہچانو جو ملت ناجیہ ہے، جس پر چلنے والوں کی نجات ہوگی وہاں بھی ان شخصیات کو پیش کیا کہ میرے طریقے کو دیکھو میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھو، تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے "صراط مستقیم" کا تعارف کروا دیا کہ وہ صراط صالحین ہے جس کو ہم طریق اتباع اسلاف کے نام سے ذکر کرتے ہیں کہ ہمارا طریق اتباع اسلاف ہے کہ اسلاف نے جو طریق اختیار کیا ہم اس پر چلیں گے بالکل یہ قرآن کریم کے مطابق عنوان ہے اس کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ صحبت میں بیٹھنے کے ساتھ جو مزاج صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سمجھا جو شخص صحبت میں بیٹھنے والا نہیں ہے وہ لفظوں کی طرف دیکھ کر اس بات کو قطعاً نہیں سمجھ سکتا۔

فہم دین کے لیے صحبت کی ضرورت کیوں؟:

اب میں آپ کی خدمت میں ایک بات عرض کرتا ہوں اس کو ذرا سمجھئے، میری زبان سے الفاظ ادا ہوتے ہیں "کیا ہے؟ لکھا ہوا تو ہوگا" کیا ہے"۔

یہی دو لفظ آئیں گے لیکن آپ جانتے ہیں کہ لب ولہجہ کے بدلنے کے ساتھ اس کا مفہوم بدل جاتا ہے ''کیا ہے'' یہ بھی ہے کہ ایک چیز آپ کے ہاتھ میں ہے میں واقعی پوچھ رہا ہوں کہ یہ کیا ہے؟ اور کبھی آپ کوئی حرکت کر رہے ہوں گے جو مناسب نہیں ہے تو میں کیا ہے کیا ہے، کہہ کر اس پر تنبیہ کروں گا اور آپ متوجہ ہو جائیں گے، اس بات سے رک جائیں گے، کیا بات ہے؟ کبھی پوچھا جاتا ہے، کبھی تعجب کی بناء پر کہا جاتا ہے آپ نے کوئی بات کی میں نے کہا ''کیا بات ہے'' اب کیا بات ہے کا لفظ جو زبان سے جاری ہوا یہ اظہار حیرت کے لیے ہے، اب ان باتوں کے درمیان فرق یہ جو باریک باریک ہوتا ہے ذرا سا لب ولہجہ بدلا اور لب ولہجہ بدلنے کے ساتھ ہی مفہوم بدل گیا، ایک آدمی آ کر مجھ سے پوچھتا ہے کہ جی یہ کام میں کرلوں؟ میرا جواب ہوگا کہ کرلو، سننے والا سمجھے گا اجازت مل گئی، اور ایک آدمی سوال کرے گا کہ کرلوں؟ میری آنکھوں میں غصے کے آثار ہوں گے، چہرے پر انقباض ہوگا میں کہوں گا کرلو وہ سمجھ جائے گا کہ اجازت نہیں ہے، پوچھنے پر ناراض ہو گئے اور اگر ہم یہ کام کریں گے تو یہ ٹھیک نہیں ہے چہرے کے آثار آنکھوں کی ہیئت اور چہرے کے اوپر غصے کے اثرات آتے ہیں۔

اور غصے میں آ کر انسان کہتا ہے کرلو تو وہ بھی یہی سمجھے گا کہ یہ صحیح نہیں ہے، بات صحیح ہے یا نہیں؟ ان دونوں باتوں کے درمیان فرق دیکھنے والا تو کر سکتا ہے، جو وہاں موجود ہو وہ تو کر سکتا ہے اگر یہی بات کاغذ پر لکھی ہوئی آ جائے کہ فلاں شخص نے کام کرنے کی اجازت مانگی تھی اس نے جواب میں کہہ دیا کہ کرلو تو کیا یہ کرلو اس مفہوم کو ادا کر سکتا ہے جو دیکھنے والے نے چہرے کی ہیئت دیکھ کر، اور ماحول دیکھ کر بات سمجھی ہے وہ لفظوں کے تحت آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح سے میں ایک دفعہ مولانا عبدالمجید کے ہمراہ چوک منڈے کی طرف گیا وہاں بس میں رش بے انتہاء تھا، بس اس طرح سے بھری ہوئی تھی کہ جس طرح سے ٹرک کسی چیز سے بھرا ہوا ہوتا ہے راستے میں دائرہ دین پناہ میں پولیس اسٹیشن پر دو سپاہی کھڑے تھے انہوں نے سوار ہونا تھا تو ڈرائیور نے اگلی سیٹ خالی کروا کر ان کو سوار کروا دیا اب راستے میں اور لوڈ کرتا آیا جب پولیس والے ساتھ سوار ہو گئے اب اس کو کیا ڈر؟ چوک منڈا جس وقت اترے تو میں نے مولوی عبدالمجید سے (ان دنوں میں یہی بحثیں چلا کرتی تھیں اتباع اسلاف کی راولپنڈی والوں کے ساتھ کچھ اختلافات تھے تو اس وقت یہ بحثیں چلی ہوئی تھیں اور یہی عنوان بہت زیادہ زیر بحث آیا کرتا تھا)۔

میں نے عبدالمجید سے کہا کہ میں اب اگر ان پولیس والوں سے ہاتھ ملاؤں اور ہاتھ ملا کر کہہ دوں کہ پاکستان کی پولیس واقعی بڑی فرض شناس ہے، یہ فقرہ میں بول دوں اور کل کو یہ فقرہ اخبار میں چھپا ہوا ہو کہ عبدالمجید نے

پولیس والوں سے ہاتھ ملایا اور یہ کہا کہ پاکستان کی پولیس فرض شناس ہے، سارا ملک یہ کہے گا کہ یہ پولیس کی تعریف ہے اور تو کہے گا کہ یہ مذمت ہے اور میرے اس فقرے کو سن کر پولیس والوں کی نگاہیں بھی شرمساری سے نیچی ہو جائیں گی وہ سمجھیں گے کہ ہم نے اپنا فرض نہیں ادا کیا اور یہ کہتا ہے کہ بڑے فرض شناس ہیں تو یہ اس نے استہزاء کیا ہے اور اب جس وقت اس فقرے کی تشریح کا موقع آئے گا تو ملک کی دس کروڑ آبادی اس طرف ہوگی کہ یہ تعریف ہے، مدح ہے اور تو اکیلا ایک طرف ہوگا اور کہے گا کہ نہیں یہ مذمت ہے۔

کہیں گے دنیا کی پوری لغات اٹھا کر لے آؤ اس میں مذمت کا لفظ ہے کون سا، اور یہ اردو زبان ہے ہم سمجھتے ہیں کہ جب کسی سے کہا جائے کہ تو بڑا فرض شناس ہے تو یہ تعریف ہوتی ہے، اردو زبان ہے ہم اس کو سمجھتے ہیں اور اس میں کون سا ایسا لفظ ہے جو لغۃً اس پر دلالت کرتا ہو کہ یہ مذمت ہے، میں نے کہا دس کروڑ کی رائے ایک طرف ہوگی تیرے اکیلے کی رائے ایک طرف ہوگی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تیرے اکیلے کی رائے درست ہے دس کروڑ کی رائے غلط، فرق یہ ہے کہ جس موقع محل میں یہ لفظ استعمال کیا گیا وہ موقع محل تو نے دیکھا ہے اور جنہوں نے اخبار کے اندر یہ فقرہ پڑھا ہے وہ کیا اس موقع محل کو سمجھیں گے؟ جب تک موقع محل سامنے نہ ہو تو اس فقرے کی مراد کس طرح سے صحیح متعین کی جائے گی؟ اب اس کے سامنے واقعہ تھا کہ انہوں نے انتہائی غفلت کا ثبوت دیا جوان کا فرض تھا کہ اس پر کنٹرول کرتے اس کو انہوں نے چھوڑا اور اپنے مفاد کی خاطر کہ مفت انہوں نے سوار کر لیا اور ان کی موجودگی سے دوسروں نے اور فائدہ اٹھایا یہ فرض ناشناسی ہے، فرض شناسی نہیں ہے اس ماحول میں جب اس فقرے کو استعمال کیا گیا تو یقیناً یہ مذمت ہے یہ تعریف نہیں ہے۔

یہی فرق ہوتا ہے اس شخص کا جو کسی کی صحبت میں بیٹھ کر، کسی کی خدمت میں بیٹھ کر اس کی باتوں کو سمجھتا ہے اور اس شخص کے درمیان جس نے کسی دوسری مجلس میں بیٹھ کر صرف اس کے چھپے ہوئے ملفوظات سنے ہیں یا پڑھے ہیں، مزاج شناسی ہمیشہ انہی لوگوں کو حاصل ہوا کرتی ہے جو صحبت میں رہتے ہیں اور گفتگو کے انداز کو دیکھتے ہیں، گفتگو کا ماحول سمجھتے ہیں، تو اتباع اسلاف کے اندر یہی نقطہ ملحوظ ہے کہ ہر نسل اوپر والوں سے جب دین کو اخذ کرتی آئے گی ان کے مزاج کو دیکھ کر ان کی باتوں کو سن کر صحیح مراد یہی سمجھیں گے، جنہوں نے صرف لفظوں کا مطالعہ کرنا ہے وہ کبھی بھی صحیح مراد نہیں سمجھیں گے اس لیے آگے جو لفظ بڑھا دیئے گئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ "صراط مستقیم" کی تعیین طریق نبیین سے کرو، طریق صدیقین سے کرو، شہداء کے طرز و طریق سے کرو، صالحین کے طرز و طریق سے کرو، صالحین چونکہ سب سے زیادہ عام لفظ ہے ہم اگر یہ اختیار کر لیں کہ

صالحین کا طریقہ، اولیاء امت کا طریقہ یہی ''صراط مستقیم'' ہے جو شخص ان کی اتباع کرے گا وہ اللہ کے راستے پر چلنے والا ہے، وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گا جو ''صراط مستقیم'' کی پیروی کرنے والا ہے یہ عنوان بالکل قرآن کریم سے تقریباً صراحت کے ساتھ ثابت ہے جس میں کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں ہے۔

باقی اولیاء امت صالحین ان کی بھی آگے صفتیں ذکر کردیں کہ وہ ''مغضوب علیھم'' نہیں ہوتے، بھٹکے ہوئے بھی نہیں ہوتے یعنی ان میں جہالت بھی نہیں ہوتی کہ وہ جہالت کی بناء پر غلطیاں کرتے ہوں اور علم حاصل ہو جانے کے بعد وہ جان بوجھ کر بھی کوتاہی نہیں کرتے آگے اس کی یہ تشریح آگئی تو ''صراط مستقیم'' کی تعیین ہمارے سامنے ایک عملی نقشے کے طور پر کردی گئی کہ دلائل اپنی جگہ اور اس کا تشخص خارجی یہ ہے کہ صالحین کا راستہ ہی ''صراط مستقیم'' ہے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا طریقہ وہی معتبر ہوگا جو انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، صالحین کی وساطت سے ہمارے سامنے آیا۔

سورۃ الفاتحہ کا سورۃ البقرۃ سے ربط:

سورۃ الفاتحہ ختم ہو رہی ہے تو آگے جس وقت سورۃ البقرہ شروع ہوگی تو عام طور پر سورۃ البقرہ کے ساتھ ربط ان الفاظ کے ساتھ واضح کردیا جاتا ہے کہ ہم نے ہدایت طلب کی تھی ''صراط مستقیم'' کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ ساری کتاب ہدایت کے طور پر نازل کی ہے اور صرف کتاب نازل نہیں کی بلکہ اپنا رسول بھی ساتھ بھیجا جس نے اس کتاب کو سمجھا اور سمجھایا اس کے اوپر عمل کر کے دکھایا تو جو شخص ''صراط مستقیم'' اختیار کرنا چاہتا ہے تو یہ کتاب اس کے لیے نصاب کے درجے میں ہے اور اللہ کا رسول اس کا شارح اور اس کا مفسر بن کر آگیا لہٰذا قرآن کریم کے ساتھ سنت کو جوڑ کر اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کو ساتھ ملا کر اسی ترتیب کے ساتھ اس کتاب کو سمجھو اور اس پر عمل کرو جب عمل کرو گے تو سمجھ لیجیے کہ تمہیں ''صراط مستقیم'' حاصل ہو گیا کورس یہ ہے جس طرح سے میں نے عرض کیا باقی شخصیات کے ساتھ ہم بس کورس کو سمجھیں گے، سمجھنے کے بعد اس کے اوپر عمل کریں گے، عمل کرنے کے ساتھ ہدایت حاصل ہوگی جو دعا تلقین کی گئی تھی کہ ہمیں صراط مستقیم پر چلا تو ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ'' کے اندر گویا کہ اس ہدایت نامہ کی نشان دہی کردی گئی کہ آگے آنے والی یہ کتاب ہدایت نامہ ہے، اس کو سمجھو اور اس پر عمل کرو تو تم ''صراط مستقیم'' پر چلنے والے بن جاؤ گے۔

کتاب اللہ کا موضوع:

اور کتاب اللہ کا موضوع بھی اس سے سمجھ میں آگیا کہ طریق عبادت کی تعلیم اصل کے اعتبار سے کتاب

اللہ کا موضوع یہی ہے، طریق عبادت کی تعلیم احکام کے درجے میں بھی آئے گی کہ اللہ تعالیٰ احکام دیں گے کہ اس طرح سے عمل کرو اور پھر ان پر عمل کرنے کی ترغیب کے طور پر دنیاوی انعامات اور اخروی انعامات کا تذکرہ آئے گا، ترہیب کے طور پر جہنم کا ذکر آئے گا اور دنیاوی عذابوں کا ذکر آئے گا اور ماننے والوں کے دنیا اور آخرت میں کامیابی کے واقعات بیان کیے جائیں گے اور نہ ماننے والوں پر جو بربادی آئی دنیا میں اور آخرت میں جو بربادی آئے گی وہ سنائی جائے گی تو وہ سارے کے سارے اسی لیے ہوں گے تاکہ عمل کرنے کی ترغیب وترہیب ہو۔

ترغیب وترہیب آخرت کے حالات کے تحت بھی ہوئی اور ترغیب ترہیب دنیا کے حالات کے تحت بھی ہوئی کہ سابقہ اقوام کے واقعات سنائے جائیں گے کہ دیکھو احکام ماننے سے وہ کامیاب ہو گئے جنہوں نے نہیں مانے تھے وہ برباد ہو گئے اور آخرت کے قصے بھی آئیں گے، اگر آپ اس نظریے کے ساتھ دیکھیں گے تو قرآن کریم کا سارا مضمون اسی نقطہ پر جمع ہوتا چلا جائے گا کہ اصل میں آپ کو عبادت پر برانگیختہ کرنا ہے، عبادت کا طریقہ بتایا جائے گا احکام کے درجے میں پھر اس پر برانگیختہ کرنے کے لیے ترغیب وترہیب کے طور پر آخرت کا جنت کا اور دوزخ کا ذکر آئے گا اور دنیا کے واقعات عذاب کے، راحت کے، قوموں کی کامیابی کے، بربادی کے یہ سارے واقعات ذکر کیے جائیں گے تو ان کے ساتھ ترغیب ہو گی اللہ تعالیٰ کے احکام کو اختیار کرنے کی اور ان کے چھوٹنے سے ترہیب ہو گی۔

اس طرح قرآن کریم کا موضوع بھی متعین ہو جاتا ہے کہ یہ طریق عبادت کی تعلیم کے لیے آیا ہے تو یہ ضروری باتیں آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئیں ہیں انشاء اللہ العزیز آگے سورۃ البقرۃ شروع کریں گے۔

ایاتھا ۲۸۶ ۲ سورۃ البقرۃ مدنیۃ ۸۷ رکوعاتھا ۴۰

سورۃ البقرۃ مدنی ہے اس میں دو سو چھیاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ﴿١﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٢﴾

الٓمّٓ (۱) یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہے یہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے (۲)

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا

وہ لوگ جو تصدیق کرتے ہیں غیب کی اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

ہم نے دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں (۳) اور (متقی) وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس چیز کے ساتھ جو آپ کی طرف اتاری گئی

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾

اور اس چیز کے ساتھ جو آپ سے قبل اتاری گئی اور آخرت کے ساتھ وہ یقین رکھتے ہیں (۴)

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾

یہی لوگ ہدایت پر ثابت ہیں ایسی ہدایت جو ان کے رب کی طرف سے ہے اور یہی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں (۵)

سورۃ کا نام اور وجہ تسمیہ:

سورۃ کا نام ''البقرۃ'' صحیح روایات میں آیا ہے، بقرۃ اس کا نام یہ ماخوذ ہے اس واقعہ سے جو چند رکوع کے بعد ذبح بقرۃ کا آئے گا، بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا ایک گائے کے ذبح کرنے کا وہ واقعہ جو سورۃ میں مذکور ہے تو تسمیۃ الکل باسم الجزء کے طور پر ساری سورۃ کا نام ہی ''بقرۃ'' رکھ دیا گیا، بقرۃ اصل میں گائے کو کہتے ہیں، مذکر ہو یا مؤنث دونوں کے لیے لفظ بقرۃ استعمال ہوتا ہے اسی لیے جب وہاں بقرۃ کا قصہ آئے گا مفسرین کے

نزدیک یہ بات زیر بحث ہے کہ وہ مذکر تھی یا مؤنث تھی جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا یا جو بنی اسرائیل نے ذبح کی تھی تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر ہوتا ہے اگر چہ مذکر کے لیے لفظ ''ثور'' علیحدہ بھی استعمال ہوتا ہے، ثور بیل کو کہتے ہیں جیسے شاۃ کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے بولتے ہیں یہ نوع ہے بکری کی، اور بکرے کے لیے ''طیس'' کا لفظ علیحدہ بھی بولا جاتا ہے، مدنیہ کی اصطلاح آپ کے سامنے واضح کر دی گئی تھی کہ مدنیہ ان سورتوں کو کہا جاتا ہے جو ہجرت کے بعد نازل ہوئیں تو اسی طرح یہ سورۃ بھی ہجرت کے بعد نازل ہوئی اس لیے اس سورۃ کو مدنیہ قرار دیا۔

حروفِ مقطعات کی وضاحت:

'' الٓمّٓ '' ان حروف سے جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔

مفسرین کی اصطلاح میں ان حروف کو مقطعات کہا جاتا ہے، سورتوں کی ابتداء میں جو اس قسم کے حروف آئے ہوئے ہیں ان کو مقطعات کہتے ہیں اور مقطعات کہنے کی وجہ ہے کہ عام کلام کے دستور کے مطابق ان کو ملا کر نہیں پڑھا جاتا بلکہ ہر حرف کو علیحدہ پڑھتے ہیں، الف، لام، میم، علیحدہ علیحدہ، قطع قطع کر کے پڑھے جاتے ہیں اس لیے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں، ان حروف کا مطلب اور مفہوم کیا ہے؟ مفسرین کی کلام میں بہت سارے اقوال نقل کئے گئے ہیں، تمام کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہے کہ سرور کائنات ﷺ سے حدیث مرفوع میں اس بارے میں کچھ نہیں نقل کیا گیا اور ہمیں اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملی جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سرور کائنات ﷺ سے سوال ہو کہ ''الٓمّٓ، الٓمّٓرٰ'' وغیرہ یہ حروف جو سورتوں کی شروع میں آئے ہوئے ہیں ان کی کیا مراد ہے؟ یہ کس معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا ہو، اور سرور کائنات ﷺ نے آگے سے کوئی جواب دیا ہو کہ ان کا کوئی معنیٰ ہے یا نہیں ہے یا یہ کوئی راز اور بھید ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے درمیان ہے اس قسم کا کوئی تذکرہ کسی صحیح روایت میں موجود نہیں ہے۔

حضور ﷺ سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا گیا، جب سوال نہیں کیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس کی وضاحت کسی صحیح روایت میں نہیں ہے تو اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ حروف مقطعات کا کسی کلام کی ابتداء میں استعمال کرنا یا خطبات کے شروع کے اندر اس قسم کے حروف کا زبان پر لانا ہو سکتا ہے اہل عرب کے ہاں ایک معروف طریقہ ہوگا کہ جس وقت ان کے خطیب خطبہ دینا شروع کرتے ہوں تو ابتداء ایسے ہی حروف سے کرتے ہوں، کوئی شاعر قصیدہ وغیرہ پڑھتے ہوں تو قصیدہ شروع کرنے سے پہلے ایسے حروف استعمال کرتے ہوں کوئی معروف طریقہ ہوگا ورنہ اگر یہ طریقہ معروف نہ ہوتا تو لازماً اس لفظ کے متعلق سوال ہونا چاہئے تھا

اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی تفہیم وتبیین ہوتی یا پھر اس کا معنی اور مفہوم متعین کیا جاتا یا منع کر دیا جاتا کہ اس بارے میں سوال نہ کرو یہ راز اور بھید کی بات ہے جو میرے اور اللہ کے درمیان ہے، حدیث مرفوع میں اس قسم کا کوئی مضمون نہیں ہے۔

اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کے طور پر باتیں نقل کی گئیں ہیں کہ یہ حروف اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان بھید ہیں اس لیے ان میں کھود کرید کرنے کی اجازت نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ ''الٓمٓ'' سے کیا مراد ہے انہی اقوال کی طرف دیکھتے ہوئے عام طور پر مفسرین یہ الفاظ بولا کرتے ہیں جو میں نے اپنی کلام کی ابتداء میں بولے ہیں، عربی تفاسیر میں آپ پڑھیں گے تو ''الٓمٓ'' کے بعد لکھا ہوا ہوگا ''الله اعلم بمراده بذٰلك الحروف'' اور اردو کی اگر آپ تفسیر دیکھیں گے تو ان میں اس قسم کے حروف کے بعد لکھا ہوتا ہے'' ان حروف سے جو اللہ کی مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے''۔

بہر حال ان کا کوئی مفہوم ہمارے سامنے متعین نہیں، بعض حضرات نے ان کو سورتوں کا نام قرار دیا ہے، بعض حضرات نے ان کو اسماء الٰہیہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اور بعض نے ان کو لمبی عبارت کا مخفف قرار دیا ہے، اس قسم کے اشارات یہ سب کی سب ظنی باتیں ہیں جن میں کسی کے اوپر یقین نہیں لایا جاسکتا اور کسی کی دلیل کو غلط نہیں کہا جاسکتا، یہ بات متیقن ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان حروف کے بارے میں کوئی کسی قسم کی وضاحت نہیں ملتی اس لیے مختار قول وہی ہے جو ہمارے اکابرین اور مفسرین لکھتے آئے ہیں'' الله اعلم بمراده بذٰلك الحروف'' ان حروف سے جو اللہ کی مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے چاہے اس میں کوئی اشارہ ہو، کوئی رازداری ہو جو اللہ اور اللہ کے رسول کے درمیان ہے، چاہے یہ سورتوں کے نام کے طور پر آئے ہوئے ہوں، چاہے یہ لمبی عبارتوں کی کوئی تخفیف ہو جو بھی مقصد ہے، (بہر حال احادیث صحیح میں حدیث مرفوعہ میں ان کے متعلق کسی قسم کی کوئی تعیین نہیں)

سورۃ البقرۃ کا اجمالی تعارف:

سورۃ البقرۃ قرآن کریم کی سورتوں میں سے سب سے بڑی سورۃ ہے اور احکام الٰہیہ بھی اس سورۃ میں باقی سورتوں کے مقابلے میں زیادہ آئے ہیں، عقائد کے، عبادات کے، معاملات ومعاشرات کے اور اخلاقیات کے متعلق بھی دین کے جتنے شعبے ہیں ان شعبوں کے بارے میں ہدایات باقی سورتوں کے مقابلے میں اس سورۃ میں زیادہ دی گئیں ہیں، ابتداء کے اندر ایمانیات کا ذکر ہے اور اس کے متصل کافروں کا ذکر آئے گا اور پھر اس سے متصل

منافقوں کا ذکر آئے گا ان تینوں طبقوں کو ذکر کرنے کے بعد اجتماعی طور پر تمام انسانوں کو خطاب کر کے ایمان کے اصول بیان کئے جائیں گے توحید، رسالت، معاد جو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ایمان کے اندر اور پھر انسانوں کے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احسانات، انعامات کا تذکرہ ہوگا مادی بھی اور روحانی بھی، زمین وآسمان کا پیدا کرنا، اس کے اندر نعمتوں کا قائم کرنا ثابت کرنا، اور روحانی نعمتیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں بیان کی جائیں گیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو علم وشرافت کے ساتھ فضیلت دی تو بنی آدم کو خطاب کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانو جس نے اس طرح سے تمہیں جسمانی وروحانی نعمتوں سے نوازا ہے اور پھر بنی آدم میں سے خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل کو خطاب شروع ہو جائے گا۔

کیونکہ مدینہ منورہ میں جانے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی بجائے جس قسم کی انہوں نے شرارتیں اور بداخلاقیاں اختیار کر رکھی تھیں ان کے اوپر تنقید کی جائے گی تو آدھی سورۃ تقریباً اسی قسم کے حالات میں ہے اس کے بعد پھر براہ راست خطاب اہل ایمان کو کیا جائے گا اور ان کو ہدایات دی جائیں گی اور درمیان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کیا جائے گا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بنی اسرائیل کے مقتداء تھے اور وہ بھی اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا پیروکار قرار دیتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات اور ان کا کعبۃ اللہ کے ساتھ تعلق اور تحویل قبلہ کا مسئلہ یہ درمیان میں آجائے گا گویا کہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف انتقال ہوتے ہوئے درمیان میں یہ ایک واسطہ ہوگا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کو واضح کیا جائے گا، اس طرح سے یہ کلام اختتام کو پہنچ جائے گی یہ اجمالی سا تعارف ہے اس سورۃ کے مضامین کا۔

سورۃ البقرۃ کے فضائل:

حدیث شریف میں اس سورۃ کے فضائل بہت ذکر کئے گئے ہیں، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی ہے سورۃ البقرۃ کو پڑھنے کی اور فرمایا کہ جس گھر کے اندر یہ پڑھی جائے اس گھر کے شیطان قریب نہیں آتا (مشکوٰۃ ص ۱۸۴) اور اس سورۃ کے اندر ایک آیت ہے جس کو آیت الکرسی کہتے ہیں، قرآن کریم کی جمیع آیات کے مقابلے میں افضل آیت ہے اور اس سورۃ کے اختتام پر جو تین آیتیں ہیں وہ بھی افضل ترین آیتیں ہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر رات کو کوئی شخص وہ تین آیتیں پڑھ لے آخری رکوع "لله مافی السمٰوٰت ومافی الارض" سے آخر تک ان کی تلاوت کر لے اور کوئی وظائف نہ کر سکے تو یہ تین آیتیں اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں (مشکوٰۃ ص ۱۸۵)۔

بلکہ سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق قرآن کریم کا حق ہے اہل قرآن پر کہ وہ اس کی رات کو

کچھ نہ کچھ تلاوت ضرور کریں اور اگر کوئی شخص قرآن کریم کی زیادہ تلاوت نہ کر سکے تو سورۃ البقرۃ کی آخری تین آیتیں پڑھ لی جائیں تو گویا کہ یہ قرآن کریم کا حق ادا کرنے کے لیے کافی ہیں، قیامت کے دن یہ سورۃ بادل کی شکل میں آئے گی یا سائبان کی شکل میں آئے گی اور اپنے پڑھنے والوں کے اوپر سایہ افگن ہوگی (مشکوۃ ص ۱۸۴) حضور ﷺ نے اسی طرح سے وضاحت فرمائی ہے کہ جو اس سورۃ کے ساتھ محبت رکھیں گے اس کو پڑھتے رہیں گے قیامت کے دن یہ سورۃ ان کے اوپر سایہ کرے گی بہرحال فضلیت والی اور قرآن کریم کی سب سے بڑی سورۃ ہے اور سب سے زیادہ احکام اس سورۃ کے اندر مذکور ہیں۔

ایک زبردست اشکال اور جواب:

"ذلك الكتاب لاريب فيه" "یہ کتاب، اس کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی تردد اور شک نہیں ہے" کتاب میں کوئی شک نہیں ہے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے بلکہ بالکل یقینی طور پر ایک نمایاں حقیقت کی طرح یہ اللہ کی کتاب ہے، اب آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بارے میں تو کافی سارے لوگوں کو شک ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں تو یہ ابتداءً دعویٰ کے طور پر کیسے کہہ دیا گیا کہ اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں بلکہ بہت صاف ستھری سی بات ہے کہ جس طرح نصف النہار میں سورج واضح ہوتا ہے اور کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے اسی طرح اس کتاب کا من جانب اللہ ہونا واضح ہے اس میں کوئی تردد اور شک کی گنجائش نہیں یہ بات بطور دعویٰ کے کہہ دی گئی حالانکہ واقعہ ہے کہ بعض لوگوں کو اس بارے میں شک ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے یہ ذہن میں ایک اشکال ابھرتا ہے۔

جس کا جواب اس طرح سے دیا جا سکتا ہے کہ شک دو طرح سے ہوتا ہے ایک ہوتا ہے کلام میں شک اور ایک ہوتا ہے دماغ میں کجی، یہ بات صحیح طور پر اس وقت سمجھ میں آیا کرتی ہے کہ بات بھی اپنی حقیقت کے طور پر صحیح ہو اور سوچنے والے کا ذہن بھی صحیح ہو، تردد دو طرح سے ہوتا ہے، بسا اوقات سوچنے والے کا ذہن صحیح ہوتا ہے بات غلط ہوتی ہے اس لیے وہ ذہن میں بیٹھتی نہیں ہے اور بسا اوقات بات صحیح ہوتی ہے سننے والے کا ذہن خراب ہوتا ہے اس لیے وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا، دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟ چار، یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن اب یہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے وہ کہے کہ نہیں دو اور دو پانچ ہیں چار نہیں ہیں تو سارے سمجھدار کہیں گے کہ بات صحیح ہے لیکن اس آدمی کا دماغ خراب ہے کہ اس کو دو اور دو چار سمجھ میں نہیں آتا بلکہ کہتا ہے پانچ ہیں، تو یہاں دو اور دو چار کے اندر جو شخص شک کرے گا تو یہ اس کے دماغ کی خرابی ہے اور یہ اصول اپنی جگہ بالکل صحیح کہ دو اور دو

چار ہیں اور اگر آپ کے سامنے کوئی شخص آئے اور کہے کہ دو اور دو پانچ اور آپ کو سمجھانے کی کوشش کرے اور یہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے کہ دو اور دو پانچ کس طرح سے ہو گیا۔

تو یہ شک اور تردد جو اس میں پیدا ہوگا دماغ اس بات کو قبول نہیں کرے گا تو اس میں یہی وجہ ہے کہ آپ کا دماغ صحیح ہے اس کی بات غلط ہے تو کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بات غلط ہوتی ہے اس لیے صحیح دماغ اس کو قبول نہیں کرتا اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ بات صحیح ہوتی ہے اور دماغ غلط ہوتا ہے اس لیے سمجھ میں نہیں آتی کجی دماغ میں ہوتی ہے بات صحیح ہوتی ہے تو یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ بات تو یہ بالکل صحیح ہے سولہ آنے صحیح اس میں تردد کی بات نہیں کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہے باقی اگر یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی اور اس صحیح بات کو تمہارے ذہن قبول نہیں کرتے تو اس کا پھر آگے علاج بتایا جائے گا۔

قرآن کے منجانب اللہ ہونے پر شاندار دلیل:

ابھی آپ کے سامنے چند آیات کے بعد ایک آیت آئے گی "ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین"

اب کہا جا رہا ہے اس آیت کو اس کے ساتھ جوڑو کہ ہم نے تو دعویٰ کر دیا کہ یہ بلا ریب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے باقی اگر تمہیں تردد ہے اور تمہارا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا تو اپنے اشکال کو اس طرح دور کر لو کہ انسان کی بنائی ہوئی چیز کی مثل انسان بنا سکتا ہے، ایک کاریگر ایک چیز بناتا ہے دوسرا اس کی نقل اتار لے گا، ایک ملک والوں نے ہوائی جہاز بنایا تو دوسروں نے اس کی نقل اتار لی، ایٹم بم بنایا دوسروں نے اس کی نقل اتار لی، دنیا کے اندر کونسی ایسی چیز ہے کہ ایک انسان اس کو بنائے اور دوسرا انسان اس کی نقل نہ اتار سکے، انسان کی مصنوعات جتنی بھی ہیں ان کی نقل اتاری جا سکتی ہے اور دوسرا انسان اس جیسی بنا کر پیش کر سکتا ہے۔

بلکہ پہلے نے جو چیز بنائی ہو دوسرا جو بنائے گا تو وہ اس کی خامیوں کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو پہلے سے زیادہ اچھے طریقے سے بنائے گا، ایک جگہ کپڑا بنتا ہے دوسرا اس کی نقل اتار لیتا ہے، ایک آدمی جوتی بنانے والا جوتی بناتا ہے دوسرا دیکھ کر ویسی جوتی بنا لیتا ہے، چھوٹی چیز سے لے کر بڑی چیز تک جتنی بھی انسان مصنوعات بناتا ہے دوسرا آدمی اس کی نقل اتار کر ویسی ہی بلکہ اس سے اچھی بنا سکتا ہے کیونکہ جس نے پہلی دفعہ بنائی ہے ہو سکتا ہے اس میں کچھ خامیاں رہ گئیں ہوں اور جو دوبارہ اس کو بنائے گا وہ ان خامیوں کا ازالہ کر کے پہلے سے بھی اچھی بنا لے گا، انسان کے واسطے سے جو چیز وجود میں آئی ہو دوسرا انسان اس کی مثل تیار کر سکتا ہے۔

لیکن جو چیز براہ راست قدرت کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور اس میں انسان کا واسطہ نہیں ہوتا تو وہاں آپ کو یہ کہنا پڑے گا کہ اس کی مثل نہیں لائی جاسکتی، سورج اللہ نے بنایا ہے اس میں کسی انسان کا واسطہ نہیں ہے اگر سارے انسان مل جائیں تو اس سورج جیسا دوسرا سورج نہیں بناسکتے، چاند اللہ نے بنایا ہے اس میں کسی انسان کا واسطہ نہیں ہے تو سارے انسان مل جائیں اس چاند جیسا کوئی چاند نہیں بناسکتے، زمین اللہ نے بنائی ہے سارے انسان اکھٹے ہوجائیں اس زمین جیسی دوسری زمین نہیں بنائی جاسکتی، آسمان اللہ نے بنایا ہے تم ساری دنیا اکھٹی کرلو اس آسمان جیسا دوسرا آسمان نہیں بناسکتے تو جس کی مثل نہ لائی جاسکے تو وہ براہ راست قدرت کا فعل ہے۔

اور جس کے اندر انسان کی قدرت کا دخل ہو، اس کے عمل کا دخل ہو اس کی مثل لائی جاسکتی ہے آپ ایسی کوئی مثال نہیں دکھاسکتے پوری کائنات کے اندر کہ ایک انسان نے کوئی چیز بنائی ہو اور یہ کہے کہ دوسرا اس کی نقل نہیں اتار سکتا، ساری کائنات اس کے سامنے عاجز آجائے، جب سے دنیا آباد ہوئی ہے اس وقت سے لے کر اب تک اور قیامت تک اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ بنائی ہوئی ہو چیز انسان کی اور کوئی دوسرا انسان اس کی نقل نہ اتار سکے، تو یہاں اسی اصول کے تحت اس قرآن کریم کی حقانیت کو پیش کیا گیا ہے کہ ایک ہی بات میں فیصلہ ہوجاتا ہے کہ اس میں انسان کی قدرت کا دخل ہے یا نہیں، حضور ﷺ تمہارے سامنے ہیں تمہارا خیال ہے کہ انہوں نے خود بنائی، تمہاری برادری کا آدمی ہے، تمہاری قوم کا آدمی ہے تم جیسی زبان بولتا ہے اگر اس نے بنالی تو تم ایک نہیں سارے مل کر اور پھر تم ہی نہیں بلکہ تمہارے جتنے معبود، تمہارے جتنے بھی مددگار جیسے آگے تفصیل بھی آجائے گی کہ چاہے وہ جن ہوں جو بھی ہوں سب کو اکٹھا کرلو اور اکٹھا کرنے کے بعد اس کتاب جیسی کتاب یا اس کتاب کی دس سورتوں جیسی دس سورتیں جیسے ''عشر سور مثلہ'' اور آخر میں کہہ دیا گیا کہ اس کی سورتوں میں سے ایک سورۃ کی مثل بنا کرلے آؤ ''وادعو اشھداء کم من دون اللہ'' اور جتنے تمہارے شہداء ہیں اللہ کے علاوہ ان کو بھی بلالو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ کتاب اللہ کی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی اپنی بنائی ہوئی ہے تو اس کتاب کی ایک سورۃ کی مثل بنا کر لے آؤ تم سچے اور یہ جھوٹے جو کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے آئی ہے اور اگر تم سارے کے سارے مل کر اس قرآن کریم کی ایک سورۃ جیسی بھی سورۃ نہیں بناسکتے اور ہم پیش گوئی کرتے ہیں ''لن تفعلوا'' کہ تم ہرگز یہ کام نہیں کرسکو گے اور ساتھ یہ پیش گوئی بھی کردی کہ تم ہرگز یہ کام نہیں کرسکو گے اور ''لن'' میں مستقبل کی نفی کا استغراق ہوتا ہے۔

یعنی ہرگز نہیں کرسکو گے تم جس کا مطلب یہ ہے کہ رہتی دنیا تک یہ ممکن نہیں ہے آنے والی نسلیں بھی اس

قرآن کریم کی مثل نہیں لاسکتیں تو جب اس کی مثل نہیں لاسکتے تو اسی فطری اصول کے تحت جو میں نے آپ کے سامنے واضح کیا ہے کہ انسان کی مصنوعات کی بالیقین نقل اتاری جاسکتی ہے اور جس کی نقل نہ اتاری جاسکے یہ دلیل ہے کہ وہ انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے تو پھر تمہیں یقین کرلینا چاہیئے کہ یہ کتاب کسی انسان کی تراشیدہ نہیں ہے بلکہ براہ راست یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے یہ کتنی واضح سی بات ہے۔

یعنی اس میں کسی مقدمے جوڑنے کی ضرورت نہ اس میں استدلال کی ضرورت یہ بات فطری ہے کہ انسان کی بنی ہوئی چیز کی نقل انسان اتار سکتا ہے تو پھر اسی اصول پر فیصلہ کرلو اگر تم اس کی نقل تیار کر کے لے آؤ تو معلوم ہوگیا کہ یہ انسان کی ساختہ ہے اور اگر تم اس کی مثل نہ لاسکو تو تمہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ کتاب انسان کی قدرت سے باہر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا سورج ہے ایسا سورج نہیں بنایا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کی زمین جیسی زمین نہیں بنائی جاسکتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی اس کتاب جیسی کتاب نہیں بنائی جاسکتی، نہایت ہی عمدہ اور بہترین طریقے سے اور سیدھے سادے طریقے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ کتاب انسان کی قدرت سے باہر ہے اور معلوم ہوجائے گا کہ یہ براہ راست اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اس میں انسان کے عمل کا دخل نہیں اگر انسان کے عمل کا دخل ہوتا تو اس کی مثل لائی جاسکتی، تو جو ذہنوں میں تردد ہوا تھا اس صحیح بات کو قبول کرنے میں اس کے ازالے کی ترکیب بتادی۔

معلوم ہوگیا کہ بات تو صحیح ہے تمہارے دماغ قبول نہیں کرتے تو تم اپنے اس شک کو، اپنے اس تردد کو اس سیدھی سادی دلیل کے ساتھ دور کرلو، اگر تم اتنی سیدھی سادی دلیل بھی نہیں سمجھتے تو پھر یہ سوائے ضد وعناد کے اور کوئی بات نہیں، اب دونوں باتیں آپ کے سامنے آگئیں کہ بات تو بالکل صحیح اس میں کوئی تردد نہیں ہے باقی اگر کسی کا دماغ اس بات کو قبول نہیں کرتا تو یوں سمجھو جس طرح دو اور دو چار کسی کے ذہن میں نہ آئے جس کی سمجھ میں دو اور دو چار نہ آئے تو یقین ہوتا ہے کہ دماغ اس کا خراب ہے اصول اپنی جگہ صحیح ہے اب "لَا رَيْبَ فِيْهِ" کا مفہوم آپ کے سامنے اچھی طرح سے واضح ہوگیا کہ اس کتاب کا من جانب اللہ ہونا بالکل یقینی ہے اور اس میں کوئی تردد اور کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور اگر اس بات کو تمہارے ذہن قبول نہیں کرتے تو خرابی تمہارے دماغ کی ہے جس طرح کسی کا دماغ دو اور دو چار کو نہ سمجھے اور اس شک وتردد کو دور کرنے کے لیے تمہارے سامنے ایک فطری دلیل پیش کی جارہی ہے اس اصول کے تحت جس سے کسی جاہل کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انسان کی مصنوعات کی نقل اتاری جاسکتی ہے جس کی نقل نہ اتاری جاسکے یہ دلیل ہے کہ یہ کسی انسان کی صنعت نہیں ہے تم اس کتاب کی نقل اتار کر دیکھ لو،

کوشش کر کے دیکھ لو اگر اس کا ایک حصہ بھی تم بنا کر لے آؤ اس جیسی ایک سورۃ بھی بنا کر لے آؤ تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ یہ انسان کی صنعت ہے۔

اور اگر تم اس کی مثل تیار نہ کر سکو جس طرح سورج براہ راست اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اللہ کی مخلوق ہے اسی طرح یہ کتاب بھی اللہ کی اتاری ہوئی ہے اور اللہ کی کلام ہے پھر یہ کسی انسان کی کلام نہیں ہے تو پہلی ہی آیت کے اندر اس کتاب کی حیثیت کو واضح کر دیا ''لَا رَیْبَ فِیْهِ'' کا مطلب ہوا کہ اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے یہ اللہ کی کتاب ہے۔

ایک سوال اور جواب:

''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے، اور اس پر بھی وہی اشکال جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ متقین کے لیے ہدایت کا کیا مطلب؟ متقین تو خود ہی ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اور اس کتاب کو متقین کے لیے ہدایت قرار دیا گیا حالانکہ ہدایت تو گمراہوں کے لیے ہونی چاہیئے؟۔

یہ ایک عام مشہور سوال ہے، جواب بھی بالکل واضح ہے، دو طرح سے اس اشکال کو حل کیا گیا ہے کہ یا تو متقین سے ادنیٰ درجے کے ڈرنے والے مراد ہیں کہ اس کتاب سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جن کے دل کے اندر کوئی اللہ کا خوف ہوگا، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور یہ بات صحیح ہے کہ نصیحت کتنی ہی کیوں نہ اچھی ہو اگر کسی کے دل میں اپنے آپ کو سنوارنے کی فکر ہی نہیں ہے تو وہ نصیحت اس کے کچھ کام نہیں آسکتی نصیحت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم سننے والے کے قلب کے اندر داعیہ پیدا ہو کہ میں اس بات کو قبول کر کے کوئی فائدہ اٹھاؤں جس وقت تک فکر نہیں ہوگی اس وقت تک بات نفع نہیں دے سکتی تو پہلے دل کے اندر کوئی خوف، کچھ نہ کچھ ڈر، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوگا تب آپ اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے اور اگر اس قسم کا تقویٰ، خوف، فکر، ڈر قلب کے اندر پیدا نہ ہو تو اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، تو متقین سے مراد ہو جائے گا ڈرنے والے، بچنے والے، یعنی اس کا ابتدائی درجہ کہ پہلے قلب میں فکر پیدا ہو، قلب میں ڈر پیدا ہو اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے متعلق اس کے بعد اس کتاب سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

اور اگر متقین سے کامل متقین مراد ہوں تو پھر اس کے مفہوم کو یوں سمجھئے کہ جس طرح ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پرائمری کا نصاب ہے، یہ مڈل کا نصاب ہے، میٹرک کا نصاب ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو پرائمری پاس کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ اس نصاب کے اوپر عبور حاصل کرے، جو مڈل پاس کرنا چاہتا ہے اس کو چاہیئے کہ

وہ اس کے اوپر عبور حاصل کرے، اور جو میٹرک پاس کرنا چاہتا ہے، میٹرک کی سند لینا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ اس نصاب کو پڑھ کر اس میں کامیابی حاصل کرے، بی، اے (B.A) کا نصاب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بی، اے، پاس کرنا چاہتا ہے اسے چاہیئے کہ اس نصاب کے اندر کامیابی حاصل کرے۔

پھر "هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ" کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ متقین کا نصاب ہے اگر کوئی شخص متقی بننا چاہے، متقین والا درجہ حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ کتاب ایک نصاب کے درجے کی ہے اس کا یہ کورس ہے کہ اس کو پڑھو گے پڑھ کر اس کے مطابق عمل کرو گے تو متقی بن جاؤ گے اور تمہیں وہ کمال حاصل ہو جائے گا جو متقین کو حاصل ہوا کرتا ہے جس وقت تک اس کتاب کو پڑھو اور سنو گے نہیں تو متقی نہیں بن سکتے اور اس کتاب کے علاوہ کوئی اور دوسری کتاب نہیں جو متقیوں کے درجے تک کسی انسان کو پہنچائے پھر اس کا مطلب یوں بنے گا کہ جتنا جتنا تقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے گا اتنا ہی انسان اس کتاب سے ہدایت حاصل کرتا چلا جائے گا جتنی ہدایت حاصل کرتا چلا جائے گا اتنا ہی تقویٰ میں ترقی ہوتی چلی جائے گی۔

متقین کی صفات:

"الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" آگے متقین کی صفات ذکر کی ہیں جس میں یہ معیار بتا دیا گیا کہ متقین کیسے ہوتے ہیں اور تمہیں اس کتاب سے تعلیمات حاصل کر کے ایسا ہی بننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

پہلی بات تو عقائد صحیحہ کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان صحیح ہوتا ہے مغیبات پر، ایسی چیزوں کو وہ رسول پر اعتماد کر کے مانتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خبر ملنے کی بناء پر مانتے ہیں جو باتیں ان کے حواس سے باہر ہیں اس کے اندر اللہ کی ذات، اللہ کی صفات، آخرت کے حالات، فرشتے اور اس کے علاوہ جو چیز بھی آپ کو آنکھ سے نظر نہیں آتی جس کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے وہ سب اس میں شامل ہیں چاہے ان کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہو، چاہے آنے والے زمانے سے ہو ایسی حقیقتیں جو اللہ کے رسول نے ہمارے سامنے واضح کی ہیں ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے ان کا ماننا ان کے اوپر ایمان لانا، ان پر یقین کرنا یہ ضروری ہوا، متقی تب انسان بنے گا جب اس کے اندر یہ صفت آ جائے گی، عقائد کے اصول اس میں واضح کر دیئے گئے یہاں اجمال ہے اسی سورۃ کے اختتام پر اس کی کچھ تفصیل آئے گی "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ" کے تحت تفصیل آئے گی، اسی طرح پہلے پارے کے آخر میں بھی اس کی کچھ تفصیل ذکر کی جائے گی کہ ایمان کن کن چیزوں پر لانا ضروری ہوتا ہے تو "یؤمنون بالغیب" کے اندر انہی عقائد کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ متقی انسان تب کہلائے گا جب وہ اس قسم کی مغیبات کو تسلیم کرے۔

''وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ'' ''یقیمون'' یہ لفظ اقامت سے لیا گیا ہے، اور یہ محاورے کے تحت اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے صرف نماز کا پڑھنا مراد نہیں بلکہ اقامت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے آداب کی، حقوق کی، اوقات کی، فرائض کی، شرائط کی، ہر چیز کی رعایت رکھتے ہوئے علی الدوام نماز پڑھتے ہیں۔

نماز کا پڑھنا یہ بدنی عبادت ہے تو عملی احکام جتنے بھی ہیں وہ دو ہی قسم کے ہوا کرتے ہیں بدنی ہیں یا مالی، عقائد کا تعلق قلب سے ہے تو بدنی احکام میں سے ''اقامت صلوٰۃ'' یہ ایمان کے بعد سب سے بڑا حکم ہے اس لیے اس کو ذکر کر دیا گویا کہ بدنی عبادت جو تھی اس کی اعلیٰ نوع کو پیش کر دیا گیا اشارہ ہو گیا سب انواع کی طرف، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایمان لانے کے بعد بدنی عبادت بھی کرتے ہیں جس کا اعلیٰ فرد ہے'' اقامت صلوٰۃ جو اقامت صلوٰۃ'' کرے، نماز صحیح انداز میں ادا کرے وہ باقی احکام کا پابند ہو ہی جایا کرتا ہے۔

''وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ'' ''جو کچھ ہم نے انہیں دے دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اس میں مالی عبادت کو ذکر کر دیا، انفاق فی سبیل اللہ یہ مالی عبادت ہے اور اس انفاق کو ذکر کرتے ہوئے ''مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ'' کہا کہ جو کچھ ہم نے انہیں دیا دیکھو اس میں یہ لفظ ایسا بول دیا جس میں غور کرنے کے بعد انفاق مشکل نہیں رہتا کہ جب تم خرچ کرنے لگو یہ سوچ لیا کرو کہ یہ دیا ہوا بھی تو ہمارا ہے اسی میں سے ہم کچھ خرچ کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

''مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ'' جو کچھ ہم نے انہیں دیا، جب ماں کے بدن سے آپ پیدا ہوئے تھے تو کیا ساتھ لائے تھے؟ ننگ دھڑنگ تو آئے تھے، نہ بدن پر کپڑا، نہ پاؤں میں جوتی، اور نہ سر پر ٹوپی تھی، کیا تھا تمہارے پلے اور جو کچھ دیا سب کچھ اللہ نے دیا اسی کی دی ہوئی چیزوں میں سے مطالبہ ہے کہ یہ اللہ کے راستے میں خرچ کر دو تو یہ کوئی مشکل نہیں ہونا چاہیے، خوش دلی کے ساتھ انسان خرچ کرے، جب یہ حقیقت سمجھ میں آ جاتی ہے تو پھر انسان کہتا ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کہ اگر اللہ کے لیے جان قربان کر دی جائے وہ بھی تو اسی کی دی ہوئی تھی ہم نے کونسی کوئی چیز اپنی طرف سے دے دی پھر پیسے خرچ کرنے تو اپنی جگہ رہے جان دے کر بھی انسان سمجھتا ہے کہ میں نے کیا کیا؟ وہ اللہ کی چیز تھی اللہ کی طرف واپس لوٹا دی، اور مالی عبادت میں جب کوتاہی ہوتی ہے تو اسی نظریے سے ہوتی ہے کہ انسان کہتا ہے کہ میں نے کمایا ہے یہ میری چیز ہے، اللہ تعالیٰ کہتا ہے نہیں یہ ہم نے دی ہوئی ہے، جب ہم

نے دی ہوئی ہے تو اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا مطالبہ ہو تو اللہ کے راستے میں دینے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے اس طرح اس میں مالی عبادت کا اصول واضح کر دیا۔

''وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ'' جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو آپ کی طرف اتاری جارہی ہے، جو آپ کی طرف اتاری گئی۔

'' وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ '' اور اس چیز کے ساتھ جو آپ سے پہلے اتاری گئی، اس میں توراۃ، انجیل، زبور، اور دوسرے صحیفے آ گئے جو انبیاء علیہم السلام پر نازل کیے گئے تو گویا کہ ایمان صحیح کے لیے ضروری ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی چیزوں کو جس طرح سے مانا جارہا ہے ایسے ہی انبیاء سابقین پر بھی ایمان لایا جائے اور ان کے اوپر اتری ہوئی ہدایات کو بھی مانا جائے، ماننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ تعلیمات حق تھیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئیں، باقی اس کے مطابق عمل کرنا ہے یا نہیں کرنا، یہ ایک علیحدہ بات ہے، تسلیم ان کو کرنا پڑتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اتری تھیں اور حق تھیں باقی عمل قرآن کریم پر ہوگا جو حقیقت باقی ہوگی اس کو اپنائیں گے، حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کی بعض آیات منسوخ ہوجائیں باوجود اس بات کے کہ ہم ان کو حق سمجھیں گے لیکن ان پر عمل نہیں کریں گے، عمل کرنا ایک علیحدہ چیز ہے، ماننا کسی چیز کو ایک علیحدہ چیز ہے۔

عقیدہ ختم نبوت کی روشن دلیل:

توراۃ کو ہم مانتے ہیں کہ اللہ کی کتاب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتری لیکن اب اس پر عمل کرنا ہے یا نہیں کرنا اللہ کی کتابوں کا آخری ایڈیشن یہ قرآن کریم ہے جس چیز کو باقی رکھا اس پر عمل کریں، جس کو باقی نہیں رکھا اس پر عمل نہیں کریں گے اور بہت ساری آیات ایسی آئیں گی جہاں اللہ تعالیٰ ''مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ اور مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کو ذکر کریں گے، مفسرین کہتے ہیں کہ اس میں ختم نبوت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی جگہ بھی متقی ہونے کے لیے مابعد کے کسی نبی پر بھی ایمان لانے کے متعلق نہیں کہا گیا۔

جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ وعدے لیے جاتے تھے کہ آنے والے پیغمبر کی تصدیق کرنی ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میرے بعد پیغمبر آنے والا ہے اس کی تصدیق کرنی ہے تو جو کلام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری گئی اس میں کہیں بھی کوئی اس قسم کا اشارہ نہیں دیا گیا، یہ تو کہا گیا ہے کہ پہلی اتری ہوئی چیزوں کو مانو آگے اترنے والی چیز کے متعلق کوئی اشارہ نہیں۔

انقلابی عقیدہ:

''وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ'' آخرت کا لفظی معنیٰ ہے پیچھے آنے والی، اور یہ لفظ دنیا کے مقابلہ میں آیا کرتا ہے اور دنیا یہ ادنیٰ کی مؤنث ہے یعنی جو چیز قریب ہو'' الدنیا من الآخرۃ ''یعنی وہ جہان جو آخرت کے مقابلہ میں ہمارے زیادہ قریب ہے اس کو دنیا کہا جاتا ہے، اور پیچھے آنے والی زندگی کو آخرت کہتے ہیں۔

مغیبات کے اندر اگرچہ آخرت بھی شامل ہے جس کا ذکر پہلے بھی کر دیا گیا تھا لیکن اس کو علیحدہ ذکر کر دیا کیونکہ عقائد کے اندر اس کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اسلامی عقائد میں سے انقلابی عقیدہ یہی ہے کہ جب کسی شخص کا آخرت پر یقین ہو جائے اور وہ آخرت کو تفصیل کے ساتھ سمجھ لے کہ میں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور میں نے اپنی زندگی کے اعمال کا حساب دینا ہے تو اس کی عملی زندگی کا رخ سیدھا ہو جاتا ہے اور جس وقت تک یہ عقیدہ نہ ہو اس وقت تک انسان اپنے عمل میں آزاد رہتا ہے اور لاپرواہی کے ساتھ وقت گزارتا ہے تو اسلامی عقائد میں سے سب سے بڑا انقلابی عقیدہ آخرت کا ہے جس کے ساتھ انسان کے خیالات میں، رجحانات میں، اور عملی زندگی کے اندر تغیر برپا ہوتا ہے، جتنا آخرت کے متعلق عقیدہ پختہ ہو جائے گا اس کی تفصیلات کے تحت اتنا ہی انسان معصیت سے بچے گا، نیکی کرنے کی کوشش کرے گا، پھر اس کو یہ خیال نہیں ہوگا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا، مجھے سزا کا ڈر ہے یا نہیں ہے، پھر وہ اللہ تعالیٰ کے علم پر مدار رکھتے ہوئے، اپنی آخرت کی زندگی کی فکر رکھتے ہوئے برے کاموں سے بچے گا اچھے کام کرے گا، چاہے کوئی دیکھ رہا ہو چاہے نہ دیکھ رہا ہو، چاہے سزا کا ڈر نہ بھی ہو اس لیے اس کو مستقل ذکر کر دیا۔

متقین کا انجام:

''اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' جو یہ صفات اپنائیں کہ ان کا ایمان مغیبات کے ساتھ صحیح ہو جائے، بدنی عبادات کے پابند ہوں، مالی عبادات کے پابند ہوں اور سرور کائنات ﷺ پر اتری ہوئی چیزوں کے ساتھ ساتھ انبیاء سابقین پر اتری ہوئی چیزوں کو بھی مانتے ہوں، اور آخرت کے اوپر ان کا یقین پختہ ہو جائے یہی اس ہدایت پر قائم ہیں جو ان کے رب کی طرف سے آئی ہے، یہی ہدایت یافتہ سمجھے جائیں گے، اور یہی لوگ ہیں جو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے والے ہیں، مقصد ہے اللہ کی رضا کا حاصل کرنا اور آخرت کی کامیابی اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ان صفات کو اپنا ؤ جو متقین کی ذکر کی گئی ہیں۔
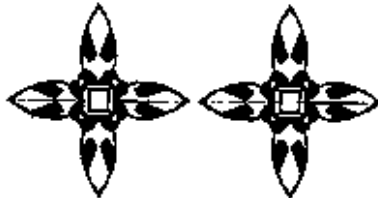
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا برابر ہے ان پر تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہیں لائیں گے ﴿۶﴾

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ

مہر کردی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر ، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ

اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے ﴿۷﴾ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر اور قیامت کے دن

الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ﴿٨﴾ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۚ وَمَا

پر ایمان لائے اور وہ ایمان لانے والے نہیں ﴿۸﴾ وہ چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لائے ، اور وہ

يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾ ۗ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ ۙ

چالبازی نہیں کرتے مگر اپنے آپ سے اور وہ جانتے نہیں ﴿۹﴾ ان کے دلوں میں بیماری ہے

فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۢ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿١٠﴾

پس زیادہ کردیا اللہ نے ان کو از روئے بیماری کے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بسبب ان کے جھوٹ بولنے کے ﴿۱۰﴾

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ ۙ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں ﴿۱۱﴾

أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ

خبردار بے شک یہی لوگ فسادی ہیں لیکن انہیں شعور نہیں ﴿۱۲﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ

آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ

ایمان لے آؤ جس طرح کہ لوگ ایمان لائے تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف لے آئے ہیں خبردار بے شک

هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا

یہی لوگ نادان ہیں لیکن یہ جانتے نہیں ﴿۱۳﴾ جس وقت یہ ملتے ہیں ان لوگوں کو جو ایمان لے آئے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور جس وقت چلے جاتے ہیں اپنے شیاطین کی طرف تو کہتے ہیں بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں، سوائے اس کے نہیں ہم تو استہزاء کرنے والے ہیں ﴿۱۴﴾

اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ استہزاء کرتا ہے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں اس حال میں کہ وہ بھٹکتے پھرتے ہیں ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾

خریدا (اختیار کیا) گمراہی کو ہدایت کے بدلے ان کی تجارت نے نفع نہ پایا اور یہ لوگ سیدھا راستہ پانے والے نہیں ﴿۱۶﴾

ماقبل سے ربط:

سورۃ البقرۃ کی ابتداء سے ''الْمُفْلِحُوْنَ'' تک پانچ آیتیں ہیں، ان پانچ آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے چشمۂ ہدایت کی نشاندہی فرما کر ''مھتدین''، ''متقین کا حال بیان کیا کہ جو اس چشمہ ہدایت سے سیراب ہوتے ہیں اور اس کتاب سے ہدایت حاصل کرتے ہیں وہی متقی ہیں، وہی مفلح ہیں اور ان کے عقائد، ان کے اعمال، ان کے اصول کی طرف اشارہ فرمایا کہ متقین کا یہ حال ہوتا ہے کہ ''یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' اور اعمال ان کے جو ہیں ''وَیُقِیْمُوْنَ الصلوٰۃ، یؤتون الزکوٰۃ'' کو ذکر فرمایا اور انجام کے اعتبار سے ''وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'' فرمایا کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں یہ تو متقین'' مفلحین'' کا ذکر ہوا۔

پھر دوسرے نمبر پر ان کے مقابل وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جب وہ ہدایت کو قبول نہیں کریں گے تو وہ نہ متقی بن سکتے ہیں، نہ مفلح رہ سکتے ہیں بلکہ وہ مومن کہلانے کے بھی حق دار نہیں تو یہ لوگ آگے پھر دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے بعض ان میں سے وہ تھے کہ جنہوں نے دل سے بھی قبول نہیں کیا اور اوپر سے بھی انکاری رہے جن کو شریعت کے عرف میں کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض لوگ ایسے تھے کہ جنہوں نے دل سے تو قبول نہیں کیا بلکہ اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے زبانی طور پر اقرار کر لیا اور ظاہری طور پر وہ مومنوں کی فہرست میں داخل ہو گئے جن کو شریعت کی اصطلاح میں منافقین کہا جاتا ہے، غیر مومن ہونے میں یہ دونوں شریک ہیں اس لیے اصل کے اعتبار سے تو طبقے دو ہی بنے کہ بعض مومن اور بعض کافر اس لیے انسانوں میں یہ تقسیم ثنائی ہے۔

لوگوں کی تقسیم شریعت کی نظر میں:

شریعت جن طبقات کا اعتبار کرتی ہے وہ طبقے دو ہی ہیں، ایک مومنوں کا طبقہ دوسرا کافروں کا طبقہ،

اور جتنے احکام دیئے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے اسی طرح سے دو طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں باقی دنیا کے اندر جو تقسیمیں ہیں وطنیت کے اعتبار سے تقسیم ہے، کوئی ہندوستانی ہے، کوئی پاکستانی ہے، کوئی افریقی ہے، کوئی امریکی ہے، یا قبیلوں اور قوموں کے اعتبار سے تقسیمیں ہیں، یا رنگت کے اعتبار سے تقسیم ہے کوئی کالا ہے، کوئی گورا ہے، یا زبانوں کے اعتبار سے تقسیم ہے کوئی سندھی ہے، کوئی بلوچی ہے، یہ تقسیمیں جتنی بھی ہیں یہ سب انسان کی خودساختہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ان تقسیموں کا کوئی اعتبار نہیں اس لیے اللہ کے دین میں سب کا درجہ برابر ہے کوئی امریکی ہو، کوئی افریقی ہو، کوئی کالا ہو، کوئی گورا ہو، کوئی ہندی ہو، کوئی سندھی ہو، کوئی بھی ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں سب کے سب انسان برابر ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اگر طبقات ہیں تو وہ دو (۲) ہی ہیں۔

سورۃ التغابن میں اسی کو واضح فرمایا'' ھوالذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مؤمن ''
یہاں بھی اس تقسیم کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا پھر تم میں سے بعض مؤمن ہیں اور تم میں سے بعض کافر ہیں بس یہ دو طبقے ہیں جن کا شریعت اعتبار کرتی ہے باقی دنیا کے اندر جتنے بھی طبقات ہیں شریعت کی نظر میں ان کا کوئی اعتبار نہیں اور احکام شریعت کے اعتبار سے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ سب برابر ہیں جو ایمان اور تقویٰ اختیار کرلے گا وہ اللہ کے ہاں مقبول ہے، جو کفر، فسق نفاق اختیار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود ہے اس کے علاوہ شریعت نے کسی دوسرے طبقے کا اعتبار نہیں کیا سب انسانوں کو بھائی قرار دیا ہے، یہ تقسیمیں جو دنیا کے لوگوں نے کررکھی ہیں یہ سراسر فساد کا ذریعہ ہیں، شریعت کے اندر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے، جو لوگ کافر ہو گئے ان میں پھر دو درجے نکال لیے بعضے ایسے ہیں جو زبان سے بھی انکار کرتے رہے اور بعضوں نے مصلحتاً زبان سے اقرار کیا دل سے تو یہ بھی منکر تھے جن کو منافق کہا جاتا ہے اور اس کے بعد تیرہ آیتوں کے اندر ذکر ہے ان لوگوں کا جنہوں نے دل سے تو تسلیم نہیں کیا بلکہ زبان سے اپنے آپ کو مؤمن کہہ کر مؤمنوں کی فہرست میں شمار ہونا چاہتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیتوں کے اندر ان کی قباحتوں کو بیان کر کے واضح کردیا ہے کہ عنداللہ یہ بھی کافر ہیں اور اس قسم کے ظاہری اور رسمی ایمان کا کوئی اعتبار نہیں یہ مفہوم ہے ان آیات کا جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں۔

کفر کی حقیقت:

'' اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا '' کفروا یہ لفظ کُفر سے بنا ہے۔

کُفر کا لغوی معنی چھپانا، اور یہ لفظ قرآن وحدیث میں دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، کفر شکر کے مقابلے میں بھی آتا ہے اور ایسے موقع پر اکثر اس مصدر کو کُفران کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے کفران نعمت مادہ وہی ہے،

تو جب یہ لفظ شکر کے مقابلے میں آئے گا تو اس کا مفہوم ہوگا ناشکری، ناقدری اور چھپانے والا معنی اس میں بھی پایا جاتا ہے کہ منعم کے انعام کو، محسن کے احسان کو چھپالیا اور اس کا کسی قسم کا اظہار نہیں کیا، محسن کے احسان کا اظہار زبان سے ہوتا ہے، عمل سے ہوتا ہے، دلی جذبات کے ساتھ ہوتا ہے لیکن کوئی انسان اس کو اس طرح سے چھپالے کہ پتہ ہی نہ چلے کہ اس کے اوپر کسی نے احسان کیا ہے یا نہیں کیا، اس کو کفران نعمت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے تو شکر کے مقابلے میں جب یہ لفظ آئے تو اس کا ترجمہ ناشکری کے ساتھ کردیا جاتا ہے، ناقدری ناشکری۔

اور ایک یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں آتا ہے جس وقت یہ لفظ ایمان کے مقابلے میں آئے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے کسی ایک کا انکار انسان کو کافر بنادیتا ہے اور ایمان کی مختصر سی تعریف آپ کے سامنے ذکر کی تھی کہ اللہ کی جانب سے اس کا رسول جو دین لے کر آئے بشرطیکہ وہ لانا قطعی طور پر ثابت ہو جن کو ہم اپنی اصطلاح کے اندر ضروریات دین سے تعبیر کرتے ہیں۔

اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے جو بات لے کر آئے بشرطیکہ اس کا ثبوت اللہ کے رسول سے قطعی ہو، قطعی اور یقینی جس میں شک کی گنجائش نہیں ہے ان باتوں کو تسلیم کرنا، ماننا، قبول کرلینا یہ ایمان ہے اور ان قطعیات میں سے کسی چیز کا انکار کردینا کفر ہے تو کفر کے لفظ کے ساتھ ہی تعبیر کریں گے اس کا متبادل دوسرا لفظ کوئی نہیں، ہم اپنی زبان میں اس کو بے ایمان کہہ دیں وہ ایک علیحدہ بات ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ ایمان حاصل نہیں ہے ورنہ عرف شریعت میں ایسے شخص کو کافر کے لفظ کے ساتھ ہی تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا یہ نظریہ کفر کہلاتا ہے کہ جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان باتوں میں سے کسی ایک کا انکار کردیا جائے۔

''سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ'' جو لوگ کافر ہوئے برابر ہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان لانے والے نہیں، یہاں انذار اور عدم انذار میں برابری کرنا مقصود ہے، اور یہاں ہمزہ استفہام کا ہے لیکن ترجمہ استفہام کے طور پر نہیں کرنا بلکہ یہ تسویہ اور برابری کے لیے ہے اور اس میں اصل مقصد تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم محنت کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تبلیغ میں، اپنی کوشش میں کوئی کسی قسم کی کمی نہیں کی لیکن بعض لوگ جس طرح سے اڑے ہوئے ہیں کسی بھی صورت میں ماننے نہیں ہیں۔

ان کی آپ فکر نہ کیجئے یہ لوگ ہی اس قسم کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی استعداد ختم ہوچکی ہے یہ ماننے والے ہیں ہی نہیں، آپ اس فکر میں نہ رہیں کہ یہ کیوں نہیں مانتے، آپ اپنی تبلیغ کرتے جایئے ان کے حق میں برابر ہے کہ آپ ڈرائیں یا نہ ڈرائیں باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب فرضی ہے ڈرانا، آپ ڈرائیں گے اس ڈرانے

پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ثواب ملے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام عبث نہیں ہے اور ضائع نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فرض کو ادا کریں گے تو اللہ کے ہاں اجر پائیں گے لیکن ان سے یہ امید نہ رکھیئے کہ یہ مان جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے مہر کن پر لگائی اور کیوں؟:

"الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تبلیغ شروع فرمائی تو سارا عالم ہی تقریباً کفر کی گود میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے بہت سارے لوگ متاثر ہو کر مسلمان بھی ہو گئے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اول سے لے کر آخر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدمقابل بعض لوگ اس قسم کے تھے کہ جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے تبلیغ بھی کی لیکن تبلیغ کے نتیجے میں یہ بات تو بالکل واضح ہو گئی کہ ان کے سامنے کوئی حقیقت مخفی نہیں ہے، یہ سمجھتے ہر چیز کو ہیں لیکن اپنی اغراض کے تحت اور اپنے دیگر مصالح سے وہ اڑے ہوئے ہیں کسی صورت میں مانتے نہیں وہ لوگ معاشرے کے اندر ممتاز ہو جایا کرتے ہیں۔

اور اس وقت کے لوگ ان کو جانتے پہچانتے ہیں کہ یہ ضدی ہیں کسی صورت میں ماننے والے نہیں تو جس ماحول کے اندر گفتگو ہوتی ہے وہاں "الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کا مصداق متعین لوگ ہیں ساری دنیا کے کافر مراد نہیں ہیں کہ جنہوں نے بھی کفر کر لیا وہ ایمان نہیں لائیں گے یہ تو واقعہ کے خلاف ہے آئے دن لوگ کفر چھوڑ کر ایمان کی طرف آتے تھے تو پھر ہم کیسے کہیں کہ "الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" جو بھی ہوں گے ایمان نہیں لائیں گے ایسی بات نہیں ہے اس کو آپ اپنے اصطلاحی الفاظ میں ادا کریں گے کہ اس سے معہود لوگ مراد ہیں عام لوگ مراد نہیں، یعنی ایسے لوگ جو کہ اس معاشرے میں ممتاز تھے، معلوم تھے جن کے متعلق یہ یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ کوئی حقیقت ان سے مخفی نہیں ہر بات کو یہ سمجھتے ہیں لیکن ضد کی بناء پر، عناد کی بناء پر، بغض کی بناء پر یہ ماننے والے نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دن رات یہ فکر رہتا تھا کہ یہ کسی طرح سے مان جائیں اور جب امید لگی رہتی ہو اور وہ امید پوری نہ ہو تو پھر آپ جانتے ہیں کہ تکلیف بھی زیادہ ہوا کرتی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے امید کو منقطع کرتے ہیں تا کہ وہ فکر ختم ہو کچھ راحت ہو جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فرض ادا کرتے رہیں اس قسم کے لوگ جن کی ضد اور ہٹ دھرمی نمایاں ہو چکی ہے وہ مانیں گے نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سمجھاتے رہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل کے اوپر ثواب پائیں گے باقی ان سے امید کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم منقطع کر دیجئے وہ ایمان نہیں لائیں گے کیوں کہ ایمان لانے کی استعداد ان کے اندر ختم ہو چکی ہے اور یہ واقعہ ہے کوئی ایسی مخفی بات نہیں ہے کہ ایک آدمی جان بوجھ کر کسی بات پر اڑ جائے اور یہ طے کر لے

کہ میں نے فلاں کی بات مانی نہیں ہے اور مخالفت پر اُتر آئے جس کو مخالفت برائے مخالفت کہتے ہیں تو یہ مخالفت کرتے کرتے دونوں میں اتنا بعد ہو جایا کرتا ہے کہ پھر یہ توقع ہی نہیں رہتی کہ کسی وقت ان میں آپس میں اتفاق بھی ہو سکتا ہے، اتفاق کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے، انسان اگر کسی بات کو سمجھتا ہے، سوچتا ہے، تو اس کے قلب کے اندر استعداد ہے اگر اس میں سوچنا سمجھنا چاہے تو سوچ سمجھ سکتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر اپنے آپ کو دوسری طرف لے جائے تو آہستہ آہستہ قلب کی استعداد بھی ختم ہو جاتی ہے آنکھ کے ساتھ دیکھ کر انسان متاثر نہیں ہوتا، کانوں کے ساتھ سن کر انسان متاثر نہیں ہوتا، ضد اور عناد میں اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ اپنے مخالف کی کوئی اچھی بات اس کو اچھی نظر نہیں آتی اور بری بات کو وہ اخذ کرتا ہے، جس کی بناء پر اس کی نظر برائی پر رہتی ہے، پھر اچھائی پر نہیں رہتی۔

''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ'' قلوب قلب کی جمع ہے، ''ختم یختم'' مہر لگا دینا ''تبع یتبع'' یہ بھی مہر لگانے کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید ہے ''تبع علی قلوبھم'' تو ختم اور تبع کا مفہوم ایک ہی ہے ''سمع'' یہ لفظ قرآن کریم میں مفرد ہی استعمال ہوا ہے، جمع کے طور پر ایک جگہ بھی نہیں آیا جبکہ قلوب قلب کی جمع ہے اور ابصار بصر کی جمع ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے محاورے میں بھی اسی طرح تھا ورنہ سمع کی جمع اسماع بھی آ سکتی تھی، اور غشاوۃ پردے کو کہتے ہیں، اس آیت کے اندر اس استعداد کے ختم ہو جانے کو اللہ تعالیٰ نے لفظ ختم کے ساتھ تعبیر کیا گویا کہ اس کے اوپر مہر ہی ہوگئی، باقی اللہ تعالیٰ نے اس مہر لگانے کو منسوب اپنی طرف کیا کہ اللہ نے مہر لگا دی اس کی وجہ یہ ہے کہ چاہے کوئی اس کائنات کے اندر جوہر ہو چاہے کوئی عرض ہو خالق ہر چیز کا اللہ ہے خالق کوئی دوسرا نہیں ہے۔

''لاخالق الا اللہ'' جواہر کا خالق بھی وہی ہے اور اعراض کا خالق بھی وہی ہے جوہر ہو یا عرض یہ دو چیزیں جو آپ بیان کیا کرتے ہیں کہ ساری کائنات جوہر ہے یا عرض، ان میں سے جو چیز بھی ہوگی اس کا خالق اللہ ہے اس لیے انسان کے اوپر جتنی کیفیات طاری ہوتی ہیں یہ انسان کے اعراض ہیں ان کا خالق بھی اللہ ہے، کیفیت کو پیدا کرتا ہے، پیدا کرنے کے اعتبار سے نسبت اس کی طرف ہے باقی وہ پیدا ہوئیں کن اسباب کی بناء پر اس کی نشاندہی قرآن کریم میں جگہ جگہ کر دی گئی کہ جب آخرت کے مقابلے میں انسان دنیا کو ترجیح دیتا ہے اور ارادہ کر لیتا ہے کہ میں نے حق کو ماننا نہیں ہے تو آہستہ آہستہ یہ بعد پیدا ہوتا چلا جاتا ہے بعد پیدا ہونے کی بناء پر یہ استعداد ختم ہو جاتی ہے تو ختم ہونے کی نسبت انسان کی اپنی ضد، عناد، اور ہٹ دھرمی پر ہے لیکن جو کیفیت پیدا ہوگی کہیں گے اس کو یہی کہ یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے، کوئی کیفیت ہو، کوئی چیز جو بھی انسان کے اس وجود کے اندر آئے گی وہ اللہ کے پیدا کرنے کے ساتھ آئے گی

لیکن انسان کے عمل کا، انسان کے کسب کا، اس میں ابتدائی طور پر دخل ہوتا ہے اور اس کے عمل اور کسب کی بناء پر انسان کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے ورنہ کیفیت جو بھی آئے گی وہ آئے گی اللہ کی جانب سے۔

بہترین مثال:

آپ ایک آدمی کو زہر دے دیتے ہیں اور اس کے اوپر موت واقع ہو جاتی ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ موت دینے والا تو اللہ ہی ہے، موت کو پیدا اس کے وجود میں اللہ نے ہی کیا ہے، موت طاری اللہ نے کی ہے اس کا سبب اور ذریعہ چونکہ آپ کا زہر دینا ہوا ہے تو نسبت آپ کی طرف ہو جائے گی اسی طرح سے ان کی جو استعداد ختم ہوئی وہ ان کی ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہوئی لیکن یہ کیفیت جو ان کے اندر پیدا ہوئی کہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے اس کیفیت کا خالق بھی اللہ ہے اس اعتبار سے اس قسم کی باتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کے اوپر مہر کر دی اور ان کے کانوں پر مہر کر دی، مہر کی نسبت دو کی طرف آئی قلوب کی طرف اور ''سمع'' کی طرف اور آنکھوں کے اوپر پردے کا ذکر کیا، کہتے ہیں کہ دل کے سوچنے کی ایک جہت متعین نہیں ہے کہ یہ صرف سامنے کی بات کو سوچ سکتا ہے پیچھے کی بات کو نہیں سوچ سکتا، دائیں طرف نہیں سوچ سکتا، یا بائیں طرف نہیں سوچ سکتا، اس کے سوچنے کی کوئی جہت متعین نہیں، اسی طرح کان کے سننے کی کوئی جہت متعین نہیں، کوئی آگے گفتگو کرے تو یہ سنتا ہے، کوئی دائیں کرے، بائیں کرے، پیچھے کرے تو یہ ہر طرف سے گفتگو کان کے اندر آ جاتی ہے تو اس لیے مہر کا ذکر کیا کہ ایسے جیسے بالکل ہی بند کر دیے کہ کسی طرف سے بھی ان کے اندر کوئی بات داخل نہیں ہو سکتی۔

قلب پر مہر کر دی کہ اب کوئی نیک بات کوئی اچھا جذبہ ان کے دل میں آ نہیں سکتا جو کفر اندر بھرا ہوا ہے وہ نکل نہیں سکتا، اسی طرح کانوں پر مہر کر دی کہ بالکل بند لگا دیا اب کوئی حق بات یہ سن نہیں سکتے جس کو یہ قبول کر لیں، لیکن آنکھوں کے دیکھنے کے لیے ایک جہت متعین ہے کہ صرف سامنے دیکھ سکتی ہے آگے پردہ ڈال دیا تو آنکھوں کی بینائی ختم ہو جاتی ہے تو یہاں غشاوۃ کے ساتھ ذکر کر دیا کہ ان کی آنکھوں کے اوپر پردہ ہے۔

برائی اختیار کرنے کا اثر:

''وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ'' اور ان کے لیے بڑا عذاب ہوگا یعنی دنیا کے اندر تو ان پر یہ اثر پڑا کہ نیکی کی صلاحیت ختم ہو گئی یہ دنیا کے اندر ایک سزا ہے، یہ دنیا کی ایک سزا ہے جس طرح بعض بزرگ کہتے ہیں کہ '' انما جزاء السیئات بالسیئات وجزاء الحسنات بالحسنات'' یہ ایک ضابطہ ہے کہ برائی کی جزا برائی ہے اور نیکی کی جزا نیکی ہے

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دنیا کے اندر اگر آپ کوئی برائی اختیار کرتے ہیں تو وہ ذریعہ بنتی ہے کسی دوسری برائی کے اختیار کرنے کا حتیٰ کہ وہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اتنا چلتا رہتا ہے کہ پھر برائی قلب کے اوپر غالب آجاتی ہے اور قلب کے اوپر غالب آجانے کے ساتھ نیکی کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب انسان ایک گناہ کرتا ہے تو دل کے اوپر ایک سیاہ داغ نمایاں ہوجاتا ہے اگر توبہ کرلے تو دل صاف ہوجاتا ہے اور اگر اسی طرح سے برائی کرتا رہے تو سیاہی پھیلتی رہتی ہے حتیٰ کہ اس کے قلب کے اوپر غالب آجاتی ہے اور سیاہی جس وقت قلب کے اوپر غالب آجاتی ہے تو سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ یہی وہ "ران" ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا "بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون" (مشکوٰۃ ص ۲۰۴) جو یہ کسب کرتے ہیں ان کے دلوں کے اوپر وہ بطور زنگ کے جم گیا، ان کے دل زنگ آلود ہوگئے، جب یہ زنگ اس طرح سے چڑھ جاتا ہے "ما کانوا یکسبون" جو کرتے ہیں وہ بطور زنگ کے ان کے دل کے اوپر لگتا جاتا ہے، جب یہ زنگ غالب آجاتا ہے، سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے تو پھر نیکی کی توفیق بالکل ہی ختم ہوجاتی ہے پھر انسان کے توبہ کرنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا تو یہ دنیا کے اندر برائی کی سزا ملتی ہے کہ ایک برائی دوسری برائی کو جنم دیتی ہے، جب انسان ایک برائی اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے دوسری برائی آسان ہوگئی پھر اگلی آسان ہوگئی اس طرح برے راستہ پر چلا تو پھر چلتا ہی چلا جاتا ہے "وانما جزاء الحسنات بالحسنات" اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر تم ایک نیکی کرو گے تو ایک نیکی کے ساتھ دوسری نیکی کی توفیق ہوگی اس طرح نیکیوں کا سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔

تو قلب کے اندر اتنی صلاحیت نمایاں ہوجائے گی کہ پھر طبیعت گناہ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوگی تو یہاں بھی اسی طرح سے کفر کرتے کرتے ان کے قلب بالکل سیاہ ہوگئے اب ان کے اندر نیکی کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، تو دنیا کے اندر یہ سزا ہوئی کہ صلاحیت ختم ہوگئی اب یہ نیکی اختیار نہیں کرسکتے اور آخرت میں "وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ" بڑا عذاب ہے۔

تو متقین کے لیے، مفلحون ذکر کیا گیا تھا کہ وہ کامیاب ہوں گے اپنی مراد کو پہنچیں گے یہاں کافروں کا انجام بیان کردیا گیا کہ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

لفظ انذار کی تحقیق:

ایک لفظ درمیان میں آیا ہے انذار کا، اَنْذَرَ اِنْذار باب افعال سے ہے اور انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی نذیر کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کا ترجمہ کردیا جاتا ہے ڈرانا لیکن یہ عام ڈرانے کی طرح نہیں ہوتا، ڈرانا دو قسم کا ہوتا ہے

ایک ڈارانا ہے جس طرح سے چور ڈاکو کسی آدمی کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور اس سے کوئی چیز چھیننے کی کوشش کرتے ہیں، ایک ڈرانا یہ ہے کہ ڈرا دھمکا کر کوئی کام کروالیا، نذیر کا مفہوم یہ نہیں بلکہ نذیر کا مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو محبت اور شفقت کی بناء پر برے انجام سے آگاہ کرے کہ جن کاموں میں تو لگا ہوا ہے اگر تو ان کے اندر لگا رہا تو کسی ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا اس کے اندر محبت اور شفقت کا پہلو غالب ہوتا ہے اور برے انجام سے ڈرایا جاتا ہے یہ ڈرانا انبیاء علیہم السلام کی صفت ہے اس لیے نذیر ہونا انبیاء علیہم السلام کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، بشیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی خبر سنائی جائے جس سے قلب کے اوپر سرور طاری ہو جائے اور نذیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو برے انجام سے ڈرایا جائے اور یہ ڈرانا محبت اور شفقت کی بناء پر ہوتا ہے تو عربی کے اندر لفظ انذار اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، ہمارے ہاں ڈرانے کے دو مفہوم آتے ہیں ایک ڈرانا ایسے ہے جیسے دشمن کو ڈرانا ہے، دھمکی دینا ہے، انذار میں یہ مفہوم نہیں بلکہ انذار میں ایسے ہے جس طرح سے والد اپنے بچے کو کسی بری عادت سے چھڑانے کے لیے اس کے انجام سے ڈراتا ہے، استاد اپنے شاگرد کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر فلانی عادت نہیں چھوڑو گے تو اس کا نتیجہ غلط نکلے گا، ماں اپنے بچوں کو سمجھاتی ہے تو یہ محبت اور شفقت کے ساتھ برے انجام سے ڈرانا اور اس کو بری خصلتوں سے چھڑانے کی کوشش کرنا عربی کے اندر لفظ انذار کا یہ مفہوم ہے اور اس معنی کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کو نذیر کہا جاتا ہے یہاں کافروں کا ذکر ختم ہوا آگے منافقین کا ذکر ہے۔

سوال ”سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ“ برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں؟، پھر اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی ہے تبلیغ کرنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو تبلیغ کرتے رہیں، اس میں تو قرآن کریم کی توہین بھی ہوگئی یہاں ایمان کی توہین ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پیچھے لگے رہیں۔

جواب اصل میں باتیں دو ہیں یہ نہیں کہا گیا کہ آپ کے حق میں برابر ہے بلکہ یوں کہا گیا کہ ان کے حق میں برابر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تو فرض منصبی ہے اور جو شخص بھی اپنا فرض منصبی ادا کرے گا اللہ کے ہاں جزا پائے گا دوسرا کوئی متاثر ہو یا نہ ہو یعنی اس میں مبلغ کے لیے بھی ایک بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور نصیحت کے آگئی کہ مبلغ کو اس بات پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے کہ کوئی مانتا ہے یا نہیں مانتا اس کا فرض ہے کہ حق کی منادی کرتا رہے اور حق کا وعظ ہر کسی کے کان تک پہنچاتا رہے آگے کوئی مانے یا نہ مانے اس سے بحث نہیں ہے۔

سوال جب وہ لوگ یہ کلام سنتے ہوں گے اور پھر وہ سمجھتے بھی ہیں پھر وہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرما دیا کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان نہیں لائیں گے پھر ہمیں تبلیغ کرنے کا کیا مقصد؟

جواب قرآن کریم کی یہ آیت قرآن میں پڑھی گئی اور ان لوگوں کے سامنے پڑھی گئی جو کہ اس کے مخاطب ہیں لیکن تاریخ میں جھوٹی سے جھوٹی بھی روایت یہ نہیں ہے کہ ان کافروں نے کہا ہو کہ جب اللہ نے کہہ دیا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر ہمارا کیا قصور؟ ورنہ جن کے اوپر یہ الزام لگایا جا رہا ہے سب سے پہلے تو اعتراض ان کی طرف سے ہونا چاہیئے تھا ان میں سے کسی ایک نے یہ نہیں کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ یہ نہیں مانیں گے اس لیے ہم معذور ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ یہ اشارہ ہماری جانب ہی ہے کہ ہم مانیں گے نہیں اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ہم نے ماننا نہیں اور وہ اپنے دل و دماغ میں یہ بھی جانتے تھے کہ ہم جو مانتے نہیں یہ بھی پتہ ہے کہ فلاں غرض کی وجہ سے نہیں مانتے، فلاں ضد کی وجہ سے نہیں مانتے، ضدی آدمی جو ہوتا ہے وہ تو اپنی حالت کو جانتا ہی ہے، اگر یہاں حقیقت یہ ہوتی کہ وہ لوگ بھی اپنے آپ کو مجبور پاتے کہ ہم نہیں مانیں گے اور نہ ماننے پر مجبور ہیں تو وہ یقیناً اپنی اس مجبوری کو واضح کر دیتے۔

ضد کے اندر آپ انتہاء کو پہنچ جائیں لیکن پھر بھی جب خالی الذہن ہو کر سوچیں گے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر آپ آنا چاہیں تو آ سکتے ہیں لیکن بسا اوقات اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ واقعہ کے اعتبار سے واپس آتے نہیں، دوسرا آدمی کہتا ہے کہ یہ اب اس درجے پر پہنچ گیا ہے اس سے اب ماننے کی امید نہ رکھو ایسا ہوتا ہے، اگر ایسی بات ہوتی کہ لوگ سمجھتے کہ اب ہمارے دلوں کو تالے لگ گئے اور اب ہم بات کو سمجھ نہیں سکتے تو یہ اعتراض سب سے پہلے ان کی طرف سے ہونا چاہیئے تھا لیکن آپ اس زمانے کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے جھوٹ موٹ کے طور پر بھی آپ کو کسی کافر کی طرف سے یہ اعتراض نہیں ملے گا کہ جب قرآن کہتا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو ٹھیک ہے ہم ایمان نہیں لاتے تو اس کا صحیح مفہوم وہی ہو گا جو اس اعتراض سے بالاتر ہے اور جو اس کے مخالف تھے وہ اپنے آپ کو سمجھتے بھی تھے کہ یہ چوٹ ہم پر لگائی جا رہی ہے اور ہمیں کہا جا رہا ہے کہ ان کے کانوں کی، ان کے دل کی، اور ان کی آنکھوں کی صلاحیت ختم ہو گئی تو مخاطب سمجھتے تھے۔

لیکن ان کے سامنے اپنا حال بھی تھا کہ جو کچھ ہم کئے بیٹھے ہیں اپنے اختیار سے کئے بیٹھے ہیں اور جب اپنے اختیار سے کیے بیٹھے ہیں تو پھر کسی دوسرے پر کیا اعتراض؟ کیوں کہ جو اس کا مصداق تھے وہ کافروں کے لیڈر تھے، کفر کے لیڈر تھے جس وقت لیڈر کو زیادہ سے زیادہ تفہیم کی جائے اور اس کو اچھے سے اچھے دلائل سے متاثر کرنے کی کوشش کی جائے پھر بھی وہ متاثر نہ ہو اور اس کے بغض و عناد کو نمایاں کر دیا جائے تو اس کا اثر یہ پڑتا ہے کہ جو لوگ اس کے پیچھے لگنے والے ہوتے ہیں اکثر و بیشتر وہ ماننے لگ جاتے ہیں یعنی ان کی ضد نمایاں ہونے کے ساتھ اگر اس کے

مقتدیوں میں سے کسی کے اندر اچھی صلاحیت ہوتی تو ان کے سامنے آجاتی کہ ہمارا لیڈر خوامخواہ کی ضد کر رہا ہے بات تو کوئی ایسی مخفی رہی نہیں تو اس میں ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کے اوپر ان کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے اور اگر ان کو خطاب کر کے ان کی ضد اور عناد کو نمایاں نہ کیا جائے تو بسا اوقات پچھلے لوگ سمجھتے رہتے ہیں کہ شاید یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔

لیکن جب گفتگو کر کے ان کو انتہاء تک پہنچا دیا جاتا ہے تو ان کے پیچھے لگنے والے اکثر و بیشتر ان کی قیادت پر اعتماد چھوڑ دیتے ہیں اور قیادت پر اعتماد جس وقت چھوٹتا ہے تو پھر وہ دوسری طرف سے متاثر ہوتے ہیں، قرآن کریم میں بہت ساری آیات اس قسم کی آئیں گی جن میں آج کل کے محاورے کے مطابق ان کی قیادت پر جرح کر کے ان کے قائدین کو مجروح کر کے قوم کو ان سے علیحدہ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ یہ قائدین تو اپنی اغراض کے تحت لگے ہوئے ہیں اور اپنی غرض کے تحت اس قسم کے فساد کرتے ہیں بدبختو! تم ان کے پیچھے لگے ہوئے ہو کل کو جب جہنم میں جاؤ گے تو یہ تمہارا کیا بنائیں گے، اللہ کی گرفت میں آجاؤ گے تو پھر یہ قائدین تمہارے کچھ کام نہیں آئیں گے، قرآن کریم میں بہت ساری آیات ہیں جن میں یہ مفہوم ذکر کیا گیا وہاں اس کی وضاحت کی جائے گی، وہاں قائدین سے قوم کا اعتماد اٹھانا مقصود ہوتا ہے تا کہ ان ضدی لوگوں کو چھوڑ کر قوم حق بات کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ان کا رعب اپنے سے اتار دے یہ مقصد بہر صورت حاصل ہو سکتا ہے۔

تیسرا طبقہ:

''وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'' من الناس میں من تبعیضیہ ہے معنیٰ ہے لوگوں میں سے بعض من یقول میں من یہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے یقول کی مفرد ضمیر ہی لوٹ رہی ہے اور معناً یہ جمع ہے کیونکہ کوئی ایک متعین فرد اس سے مراد نہیں جو بھی ایسا ہو گا وہ اس کا مصداق ہے اور واقعہ کے اعتبار سے وہ متعدد افراد تھے اس لیے یہ معناً جمع ہے، یہی وجہ ہے کہ ''وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ'' میں جمع کی ضمیر ادھر لوٹا دی گئی، لفظوں کی رعایت رکھتے ہوئے جمع کے صیغے استعمال کریں گے تا کہ آنے والے صیغوں کے ساتھ اس کی مطابقت رہے۔

ماقبل سے ربط:

شروع سورۃ سے ابتدائی پانچ آیتوں میں متقین کا ذکر تھا ان کی صفات اور ان کے انجام کا، اور اس کے بعد دو آیتوں میں جو علی الاعلان کافر تھے ان کا حال اور ان کا انجام ذکر کیا گیا تھا اور آئندہ تیرہ آیات میں تیسرے

گروہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کو منافقین کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے یہ لفظ اگرچہ اس رکوع میں استعمال نہیں ہوا لیکن جو ان کا حال بیان کیا گیا ہے اس حال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے اور قرآن کریم میں دوسری آیت میں یہ لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے اور ان کا حال بھی اسی کے ساتھ ملتا جلتا واضح کیا گیا ہے۔

طبقہ منافقین کا تعارف ونشانی:

یہ تیسرا طبقہ جو تھا وہ ایسے لوگوں کا تھا جن کو آپ اپنی زبان میں صلح پسند کہہ سکتے ہیں جنہوں نے اپنے لیے یہ طرز عمل تجویز کیا کہ ہر کسی سے بنا کر رکھنی چاہیئے، بگاڑنی نہیں چاہیئے اور یہ جو جذبہ ہے کہ ہر کسی سے بنا کر رکھی جائے، بگاڑی نہ جائے خاص طور پر اس وقت جب حق و باطل کی آپس میں جنگ ہو، یہ جذبہ دو وجہ سے پیدا ہوتا ہے یا تو اس کی بناء بزدلی پر ہوتی ہے یا اس کا منشاء لالچ وحرص اور مفاد پرستی ہوتی ہے، دو گروہوں میں حق و باطل کی ٹکر ہو گئی، دونوں حق پر ہو نہیں سکتے، ایک کو قبول کرنا ہے اور ایک کو چھوڑنا ہے لیکن اس کے لیے جرأت چاہیئے کہ انسان حق بات کا ساتھ دے اہل باطل سے کہہ دے کہ میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

جس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا تھا کہ جب تک تم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لاؤ تو ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں، سورۃ ممتحنہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا نمونہ اہل ایمان کے سامنے پیش فرمایا کہ جس طرح انہوں نے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا تو تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اندر یہ اسوہ ہے کہ تم بھی جو اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے، توحید کا اقرار نہیں کرتے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے ان کے ساتھ محبت اور تعلق نہ رکھو، اب اگر اس طرح سے کیا جاتا ہے تو لازماً ایک گروہ سے عداوت ہو جائے گی، ایک گروہ کے ساتھ تعلق ہوگا دوسرے کے ساتھ دشمنی ہو جائے گی تو یہ خطرات برداشت کرنا جرأت ہمت اور بہادری چاہتا ہے تو جن کے دل میں بزدلی ہو اور وہ ہر شخص سے ڈرتے ہوں، دبتے ہوں ان میں یہ ہمت نہیں ہوا کرتی کہ کھل کر کہہ دیں کہ ہم فلاں گروہ کے ساتھ ہیں، فلاں گروہ کے ساتھ نہیں ہیں اور جن کے ساتھ نہیں ہیں ان کی دشمنی برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

دل کی کمزوری اور بزدلی اس اظہار کی نوبت نہیں آنے دیتی تو جب یہ آئیں گے انہیں کہہ دیا جائے گا کہ ہماری دوستی تمہارے ساتھ ہے فکر نہ کرو اور جب دوسرا گروہ آیا تو ان کو کہہ دیں گے ہماری دوستی تمہارے ساتھ ہے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں اور اُن کے خطرات سے بھی محفوظ رہیں یوں دوغلہ پن اختیار کر لیتے ہیں بزدلی کی بناء پر تو اس نفاق کا اور دوغلے پن کا مبنیٰ یا تو بزدلی اور جبن ہوتا ہے اور یا مفاد پرستی کہ دونوں

گروہوں میں سے اگر ایک گروہ کے ساتھ مخالفت علی الاعلان کر لی تو ہمارا جو مفاد ان سے متعلق ہے وہ ختم ہو جائے گا تو ہم ایسی ہوشیاری کیوں نہ دکھائیں کہ یہ آئیں تو ان کے سامنے ذکر کر دیں کہ ہم تمہارے ہیں۔

جو فائدہ ان سے اٹھایا جا سکتا ہے ان سے اٹھالو اور دوسرے آجائیں تو ہم ان کے ساتھ بھی محبت کا اظہار کر دیں اور جو فائدہ ان سے اٹھایا جا سکتا ہے اس کو بھی ضائع نہ ہونے دیں تو یہ لالچ، حرص اور مفاد پرستی بسا اوقات انسان کو دوغلے پن پر مجبور کرتی ہے، ورنہ جو شخص بہادر ہو اور اس کے دل کے اندر حق پرستی ہو، مفاد پرستی نہ ہو کبھی بھی وہ دو فریقوں کے درمیان میں دوغلہ پن اختیار نہیں کر سکتا وہ علی الاعلان ظاہر کر دے گا کہ میں فلاں کے ساتھ ہوں، فلاں کے ساتھ نہیں ہوں چاہے اس میں اس کا مفاد ختم ہو جائے، چاہے اس میں اس کو خطرات پیش آئیں وہ جرأت کے ساتھ اس بات کا اظہار کر دے گا۔

منافق کی مثال:

اسی لیے سرورِ کائنات ﷺ نے منافقین کی مثال دیتے ہوئے بیان فرمایا" مثل المنافق كالشاة العائرة" شاۃ بکری، عائرہ کہتے ہیں کہ جس وقت بکری بہار میں آجاتی ہے اور بکرے کی طالب ہوتی ہے، جب جانور ایک خاص کیفیت میں ہوتے ہیں۔

جب ان کو نر کی طلب ہوتی ہے، بولتی پھرتی ہے، بے چینی سے دوڑتی پھرتی ہے اس کی طبیعت میں شہوت ہوتی ہے اس کیفیت کو کس لفظ سے ادا کیا کرتے ہو؟" واری ہوئی بکری" "مثل المنافق كالشاة العائرة" (مشکوٰۃ ص ۱۷) منافقین کی مثال تو واری ہوئی بکری کی طرح ہے" تعير الىٰ هذه مرة والىٰ هذه مرة" کبھی وہ اس ریوڑ کی طرف جاتی ہے بکرے کی تلاش میں، جب اس کو وہاں بکرا نہیں ملتا تو دوڑتی ہوئی اس ریوڑ کی طرف آتی ہے یعنی اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لیے جدھر بھی اس کو کوئی موقع ملے کہ ادھر شہوت پوری ہو سکتی ہے تو بھاگ کر ادھر کو جاتی ہے پوری بے چینی کے ساتھ اور کوئی انثیٰ جس وقت اس کی شہوت بھڑکی ہوئی ہو اور اس شہوت کو پورا کرنے کے لیے اس میں بے چینی پیدا ہو جائے اس وقت وہ اپنی قوت فکریہ کھو دیتی ہے۔

پھر اس کی طبیعت اسی تلذذ کی طالب ہوتی ہے چاہے کسی کی گود میں بیٹھ کر اس کو یہ تلذذ ملے وہ اس تلذذ کو چاہے گی اور قوت فکریہ اس کی جواب دے دیتی ہے تو ایسے ہی شہوتی عورتوں اور شہوتی اونٹوں کی طرح یہ منافقوں کا حال ہے کہ یہ اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے کبھی مومنوں کی گود میں گھستے ہیں، کبھی کافروں کی گود میں گھستے ہیں ان کو اپنے مفاد سے غرض ہے۔

ان کو تلذذ حاصل ہونا چاہیے، ان کا مزہ کرکرہ نہ ہو اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کی شہوت کہاں سے پوری ہو رہی ہے، یہ شہوت کافروں سے پوری ہوتی ہے تو وہاں سے پوری کرلیں گے، مومنوں سے پوری ہوتی ہے تو مومنوں سے پوری کرلیں گے، یہ دوسرے کی گود میں بیٹھ کر عیاشی چاہتے ہیں باقی ان کے اندر اتنی جرأت نہیں ہے کہ مردوں کی طرح علی الاعلان کہہ دیں کہ ہم فلاں کے دوست ہیں، فلاں کے دوست نہیں ہیں، موقع محل کے مطابق یہ ایک بہترین مثال ہے، اس سے زیادہ اچھی مثال کسی مفاد پرست انسان کی دی نہیں جاسکتی جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی اور ایسے ہی یہ نفاق ہے جس کو حقیقی نفاق کہتے ہیں۔

نفاق کی تعریف اور منافق کی اقسام:

''اخفاء الکفر و اظہار الایمان'' کفر کا چھپالینا اور ایمان کا ظاہر کرنا یہ نفاق حقیقی ہے کہ اندر سے انسان کافر ہو اور اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کرے اور ایک نفاق ہوتا ہے عرفی جس کو ہم دوغلے پن سے تعبیر کرتے ہیں چاہے وہ کفر اور ایمان کی بات نہ ہو لیکن اپنے دل کی حقیقت کسی کے سامنے ظاہر نہ کی جائے اور ہر کسی کو یہ تاثر دیا جائے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں حتیٰ کہ دو متصادم لوگ ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنے آپ کو واضح نہ کیا جائے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ لوگ ''اخوان العلانیۃ اعداء السریرۃ'' ہوں گے'' اخوان اعلانیہ'' کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر میں تو بھائی بنے ہوئے ہوں گے ''واعداء السریرۃ'' لیکن در پردہ دشمن ہوں گے یعنی اپنی دشمنی چھپائیں گے اور دوستی ظاہر کریں گے، ایک وقت ایسا آجائے گا کہ لوگ یہ عادت اختیار کرلیں گے ظاہری طور پر تو بھائی بنے ہوئے ہوں گے۔

لیکن در پردہ دشمن ہوں گے، عداوت کو مخفی کریں گے اور اخوت کو ظاہر کریں گے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوگا اس کی وجہ کیا ہوگی کہ ظاہری طور پر بھائی بن کر رہیں اور اندر سے دشمن بن کر رہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ذٰلِكَ بِرَغْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰى بَعْضٍ وَرَهْبَةِ بَعْضِهِمْ اِلٰى بَعْضٍ'' (مشکوٰۃ ص ۴۵۵) کہ چونکہ بعض کو بعض سے لالچ ہوگا مطلب ہوگا تو دل کی دشمنی کو مخفی کرکے اپنے مطلب کو حاصل کرنے کے لیے وہ دوستی اور محبت کا اظہار کریں گے اور بعضوں کو بعضوں سے خوف ہوگا ڈریں گے کہ اگر ہم نے اپنے دل کی عداوت اس کے سامنے ظاہر کردی کہ میں تیرے ساتھ نہیں ہوں، میں تیرا دشمن ہوں تو اس سے کسی نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ ہے تو یہ خوف اور لالچ یہ دو باتیں ہیں جو انسان کو اس کمزوری کے اندر مبتلاء کرتی ہیں کہ انسان اپنے دل کی بات ظاہر کرکے نہیں کہتا۔

بلکہ اپنے دل کی بات کو چھپاتا ہے دل میں کچھ اور ہوتا ہے ظاہر کچھ اور کرتا ہے اور یہ اخلاق کے اندر ایک

جذباتی کمزوری ہے، جب کسی انسان کے یہ جذبات ہو جائیں کہ مفاد کی خاطر وہ باطل کا ساتھ بھی دے سکتا ہے اور وہ نقصان کے خوف سے حق کو بھی چھوڑ سکتا ہے اور اس کے عمل کا، کردار کا ہر چیز کا مدار اپنے مفاد پر ہے اور اپنی حفاظت پر ہے ایسے وقت میں اس کی کوئی اخلاقی قدر محفوظ نہیں رہ سکتی اس لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مذمت کی اور منافقین کے ٹولے کو کافروں کے مقابلے میں بھی زیادہ خطرناک قرار دیا اور زیادہ خطرناک ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ جو علی الاعلان دشمن ہوا کرتا ہے اس کا دفاع آسان ہے اس کے ضرر سے بچنا آسان ہے لیکن اگر کوئی علی الاعلان دشمن نہ ہو ظاہری طور پر تو محبت کا اظہار کر رہا ہو اور مخفی طور پر وہ دشمن ہو تو جو نقصان یہ پہنچاتا ہے علی الاعلان دشمن اس قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا، اسی کو اردو کے محاورے میں مارِ آستین کہتے ہیں۔

آستین کا سانپ یعنی ایسا سانپ جو انسان کے اندر چھپا ہوا ہے اس قسم کے جو لوگ ہوا کرتے ہیں جو ظاہری طور پر دوست ہوں اور حقیقت کے اعتبار سے دشمن ہوں اور اپنے کسی مفاد کے تحت یا اپنی بزدلی کی بناء پر اپنے دلی جذبات کو چھپائے ہوئے ہوں یہ مارِ آستین کہلاتے ہیں اور ان سے نقصان کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے اس لیے اگر علی الاعلان کافروں کا ذکر دو آیتوں میں آیا تو ان کا ذکر آگے تیرہ آیتوں میں آ رہا ہے، پہلے تو اس کا عنوان نہیں قائم کیا کہ بعضے لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور یوم آخرت پر۔

''وَمَاهُم بِمُؤْمِنِينَ'' (اور وہ بالکل ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور یہ ''بالکل'' یہ تاکید کے طور پر ترجمہ کیا جا رہا ہے کہ ''ما'' کی خبر کے اوپر ''با'' زائدہ آ گئی ان کا یہ ایمان معتبر نہیں ہے سورۃ المنافقون کے اندر ابتداء میں یہی بات ذکر کی ہے'' اذا جاءك المنٰفقون قالو انشهد انك لرسول الله والله يعلم انك لرسوله، والله يشهد ان المنٰفقين لكاذبون '' یہ جو کہتے ہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ یہ دل سے نہیں کہہ رہے بلکہ اوپر اوپر سے محض آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں یہاں بھی اسی طرح سے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور آخرت پر ایمان لے آئے حالانکہ یہ بالکل مومن نہیں۔

منافق اللہ اور مؤمنین کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں:

''يُخٰدِعُونَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا'' (چال بازی کرتے ہیں اللہ کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ)

''خادع مخادعة'' یا ''خداع'' دونوں طرح سے مصدر آتا ہے، باب مفاعلہ اصل کے اعتبار سے مشارکت کو چاہتا ہے جیسے ''قاتل مقاتلة'' ''آپس میں قتال کرنا'' ''جادل مجادلة'' ''ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کرنا'' ''کالم

مـکـالـمۃ“ آپس میں گفتگو کرنا یہ سب مشارکت کی مثالیں ہیں لیکن کہیں اس کو مشارکت سے خالی کر دیا جاتا ہے اور یہاں یہ مشارکت سے خالی ہے کیونکہ اگر مشارکت کے طور پر ہو تو معنیٰ یوں ہوگا کہ اللہ اور کافر یہ آپس میں ایک دوسرے سے چال بازی کرتے ہیں اور یہ مفہوم صحیح نہیں ہوگا اس لیے اس کو مشارکت کے معنیٰ سے خالی کر کے ترجمہ یوں کریں گے کہ یہ لوگ اللہ سے دھوکہ بازی کرتے ہیں۔

اللہ کے ساتھ چال بازی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسول کے ساتھ چال بازی کرتے ہیں، اللہ کے نیک بندوں سے چال بازی کرتے ہیں، اصل کے اعتبار سے ان کی چال بازی تو مومنوں کے ساتھ تھی کہ ان کو دھوکہ دینا چاہتے تھے، دھوکہ دے کر ان کے ضرر سے بچنا چاہتے تھے اور مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ کا رسول اور مومنین کیونکہ یہ حزب اللہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات پر چلنے والے ہیں جو ان کے ساتھ چال بازی کا ارادہ کرتا ہے تو یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چال بازی کرتا ہے ورنہ منافقین جو کردار ادا کر رہے تھے تو ان کے دل میں بھی یہ نہیں تھا کہ ہم اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں لیکن اللہ کی جماعت کو دھوکہ دینے کی کوشش کرنا یہ ایسے ہے جیسے کہ اللہ کو دھوکہ دینا اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ انسان کا معاملہ ایسے ہوتا ہے جیسے کہ اللہ کے ساتھ۔

اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے ”من عـادلـي ولیـاً فـقـد اذنتـه بـالـحـرب“ (مشکوۃ ص ۱۹۷، بخاری ج ۲ ص ۹۶۳) جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے، کیا مطلب؟ کہ جس کی عداوت میرے ولی کے ساتھ ہے! اس کی عداوت میرے ساتھ ہے میں اس کا دشمن وہ میرا دشمن، اس لیے نیک لوگوں کے ساتھ جن کا ظاہر شریعت کے مطابق ہے وہ اللہ اللہ کرنے والے ہیں جن کو عرف عام کے اندر ولی کہا جاتا ہے ان کی قدر و منزلت پہچاننی چاہیئے کہ ان کے متعلق اچھے جذبات کی اللہ کے ہاں قدر ہے، ان کے ساتھ اچھے جذبات رکھنا، ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنا، ان کے ساتھ محبت رکھنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کی علامت ہے اور اگر ان کے ساتھ کسی قسم کے برے جذبات رکھے جائیں دل کے اندر بغض ہو، عداوت ہو یا ان کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایسے ہی ہوتا ہے۔

جیسے یہ معاملہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کر رہا ہے تو ولی کی عداوت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عداوت قرار دیا اسی طرح وہ چال بازی تو اللہ کے رسول سے کرتے تھے اور مومنین سے کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ چال بازی اللہ سے کرتے ہیں اس کا بھی وہی معنیٰ کہ جو اللہ کے گروہ کے ساتھ قتال کرتا ہے، بدمعاشی کرتا ہے، چال بازی کرتا ہے، تو اس کی شدت بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ چال بازی قرار دیا

کہ اللہ کے رسول کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کر رہے، مومنوں کو دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کر رہے یوں سمجھو کہ وہ اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

منافق حقیقت میں اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے:

''وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ '' (یہ نہیں دھوکہ دیتے مگر اپنی ہی جانوں کو) اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ان کے اس نفاق کا نقصان انہی کو پہنچے گا اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ کے رسول کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ کی جماعت کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے ان کی کیفیات کو، ان کے حالات کو اپنے رسول تک پہنچا دے گا اور وہ ان کے ضرر سے بچنے کی تدبیر کرلیں گے، اس لیے اس نفاق کا، اس دوغلے پن کا جو نقصان ہونا ہوگا انہی کو ہوگا اور ویسے بھی آپ دیکھ لیا کریں عرف عام میں بھی ایسے ہی ہے کہ جو آدمی دو اختلاف کرنے والوں کے درمیان میں دوغلہ پالیسی اختیار کرتا ہے دیر نہیں لگتی وہ رسوا ہو جاتا ہے۔

بسا اوقات وہ دونوں فریق آپس میں متفق ہو جائیں گے اور سب سے زیادہ ذلیل یہی شخص ہوا کرتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ اس نے جو دوغلہ پالیسی کے ذریعے سے دوسروں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی سب سے زیادہ نقصان میں یہی رہا اور یہاں بھی اس طرح سے ہے اور قرآن کریم میں جو واقعات نقل کئے جاتے ہیں، کسی جماعت کے احوال ذکر کئے جاتے ہیں تو محض وہ قصہ گوئی اور واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں ہوتا اس نقطہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں رکھیے، واقعات جو بھی قرآن کریم میں ذکر کئے جاتے ہیں یا کسی گروہ کے احوال ذکر کئے جائیں تو صرف قصہ گوئی مقصود نہیں ہوتی کہ ایک شخص کو سامنے رکھ کر اس کے حالات ذکر کر دیئے یا واقعہ ذکر کر دیا، یہاں وہی بات ہوا کرتی ہے کہ خوش تر آں باشد کہ سرے دل براں گفتہ آید در حقیقت وہ دیگراں بات دوسروں کی سنائی ہے اور اس میں سبق آپ کو پڑھانا ہے کہ اس گروہ میں شامل ہونے کی کوشش نہ کریں اور اس گروہ سے تعلق نہ رکھیں جس کے یہ حالات اور کیفیات ہیں۔

ان سے بچنے کی کوشش کرو اور اگر آپ اس طرح کے حالات اور کیفیات اختیار کریں گے تو آپ کا شمار بھی اسی گروہ میں ہو جائے گا بس ایک واقعہ کے ضمن میں یہ ایک نصیحت کر دی جاتی ہے کہ فلاں شخص نے ایسا کیا تھا اس کا یہ انجام نکلا جس میں سننے والوں کو یہ کہنا مقصود ہے کہ تم ایسا نہ کرنا ورنہ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا اس لیے نیک لوگوں کے ساتھ جو چال بازی کی کوشش کرے یوں سمجھو کہ اس کی چال بازی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اس کا نقصان اسی کو پہنچے گا ''نہیں دھوکہ دیتے وہ مگر اپنے ہی نفسوں کو'' ''وما یشعرون'' اور ان کو شعور نہیں اور ان کو سمجھ نہیں۔

منافقوں کے دلوں میں مرض ہے:

''فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ'' (ان کے دلوں میں بیماری ہے) بیماری کسے کہتے ہیں؟ بیماری کا لفظ صحت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، بیماری اس کیفیت کو کہا جاتا ہے کہ جس کے تحت انسان اپنے اعتدال سے نکل جائے، جسمانی بیماری کا بھی یہی مطلب ہوتا ہے کہ جو انسان کی طبیعت میں اعتدال ہونا چاہیئے گرمی کا، سردی کا، خشکی کا، تری کا جس اعتدال کی بناء پر انسان صحت مند ہوتا ہے، چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اس کی قوتیں بحال ہوتی ہیں جس وقت انسان اس اعتدال سے نکل جاتا ہے، تو یہ بیماری ہے اور اگر یہ بیماری بڑھتی جائے تو نتیجتاً انسان ہلاکت تک پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح بیماری روحانی بھی ہوتی ہے کہ قلب کی صحیح کیفیت کہ اس میں خلوص ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہو، اللہ کے دین کے ساتھ پیار ہو یہ ایک روحانی صحت ہے اور جس وقت کوئی شخص اس صحت سے زوال میں آتا ہے تو یہ بیماری ہے اور بیماری بھی بسا اوقات بڑھتی جاتی ہے، بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ روحانی موت کا باعث بن جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں نیکی کرنے کی اور برائی سے بچنے کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں رہتی، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دلوں کے اندر جو امراض ہیں یہ زیادہ تر اتباع شہوات کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں جب انسان اپنی خواہش پہ چلتا ہے، ہدایت کی پیروی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہیں کرتا بلکہ اپنی خواہشات پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اس سے پھر دل کے اندر مختلف قسم کے عوارض لاحق ہو جاتے ہیں جن کو روحانی لحاظ سے بیماری کہا جاتا ہے اور وہ بیماری روح کو بھی فنا کر دیتی ہے، روحانی موت کا باعث بن جاتی ہے اور بسا اوقات وہ بیماری جسم کے لیے بھی تکلیف دہ ثابت ہو جاتی ہے جیسے یہاں ان لوگوں کے دل میں کیا بیماری تھی ایک تو انہوں نے کفر کو چھپا رکھا تھا اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حسد تھا۔

جس کی وجہ سے یہ مسلمانوں کے اقتدار کو برداشت نہیں کرتے تھے، اب اللہ تعالیٰ دن بدن ان کی بیماری کو بڑھائے گا کہ مسلمان تو ترقی پذیر ہوتے چلے جائیں گے اور یہ اپنے حسد کے اندر جلتے رہیں گے اور ان کا کفران کے دل کے اندر اور بڑھتا رہے گا تو روحانی طور پر بھی یہ گریں گے اور جسمانی طور پر بھی ہر وقت کی کڑھن، ہر وقت کی جلن، ہر وقت کا غم، ہر وقت کا فکر مستقل ان کے لیے ایک روگ ہوگا تو اگرچہ نفاق اور کفر کی بیماری اصل کے اعتبار سے روحانی بیماری ہے لیکن اس کے نتیجے میں جو حسد کڑھن اور غم مومنوں کی طرف دیکھ دیکھ کر دل کے اندر ہر وقت رہتا تھا یہ جسم کو بھی بیمار کر سکتا ہے اور اکثر و بیشتر اس قسم کا انسان جسمانی طور پر بھی بیماری کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔

منافقین کا مرض بڑھتا رہتا ہے:

"فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا" (زیادہ کیا ان کو اللہ تعالیٰ نے از روئے بیماری کے) مرضاً یہ تمیز ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ تمیز کبھی محول عن الفاعل ہوتی ہے اور کبھی محول عن المفعول ہوتی ہے، جیسے "طاب زید نفسا" زید خوش ہو گیا از روئے دل کے اس کا مفہوم ہے "طاب نفس زید" زید کا دل خوش ہو گیا، یہ تمیز محول عن الفاعل ہے اور یہ فاعل والا مفہوم ادا کرے گی، اور یہاں "فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا" میں تمیز محول عن المفعول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "زاد مرضهم" زیادہ کر دیا ان کو اللہ نے از روئے بیماری کے، یعنی اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی یعنی آئندہ بھی ان کی مرض بڑھتی رہے گی ان کی خواہش کے مطابق مسلمانوں پر زوال نہیں آئے گا بلکہ مسلمان ہر وقت ترقی پذیر ہوں گے جب ترقی پذیر ہوں گے تو یہ مزید جلتے رہیں گے اور اپنے اسی حسد کی آگ کے اندر جلتے رہیں گے یہ ہو گا ان کے مرض کا بڑھانا۔

کذب کی اقسام و احکام:

"وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ" اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے بسبب اس کے کہ یہ جھوٹ بولتے تھے"

اس بات کو بھی سمجھ لیجیے یہاں "كَذَبَ، يَكْذِبُ" جھوٹ بولنے کے معنی میں ہے، جھوٹ کہتے تھے، جھوٹ بولتے تھے اور جھوٹ بولنے سے مراد ان کا یہ دعویٰ ہے جو کہتے تھے کہ "امنا بالله وباليوم الاخر" یہ جو جھوٹا دعویٰ کرتے تھے حقیقت کے اعتبار سے ان کا ایمان نہیں نہ اللہ پر نہ یوم آخرت پر، جھوٹ بولتے ہوئے کہتے تھے "امنا بالله وباليوم الاخر" اس جھوٹ کی وجہ سے ان کے لیے "عذاب اليم" ہے یہ بات کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ "کِذب" جو صدق کے مقابلے میں آتا ہے کہ جو خلاف واقعہ بات کہہ دی جائے شریعت میں اس کا ایک ہی درجہ نہیں ہے کہ یہ کفر ہو بلکہ اس کے مختلف درجات ہیں، اگر ایمان کا دعویٰ جھوٹا ہو گا زبان سے جھوٹ ادا کرے گا یہ کذب کفر ہے اور کبھی کوئی شخص جھوٹ معاملات میں بولتا ہے عقائد میں نہیں بولتا لغوی حیثیت سے کذب اس پر بھی صادق آئے گا، لیکن وہ کفر نہیں ہے۔

اگر کسی کو دھوکہ دینے کے لیے، نقصان پہنچانے کے لیے جھوٹ بولے گا معاملات میں تو یہ کذب حرام ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شرعی مصلحت کے تحت کہ صحیح بات کہنا شرعی مصلحت کے خلاف ہے وہاں خلاف واقعہ

بات کہنا شریعت کا مطالبہ ہو کہ ایسے کہو وہ لغوی طور پر جھوٹ ہوگا ہم اس کو حرام بھی نہیں کہیں گے چہ جائے کہ کفر کہیں جیسے ایک آدمی دوسرے کو قتل کرنا چاہتا ہے اور وہ شخص جس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا اور آپ نے اس کو چھپتے ہوئے دیکھ لیا اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ ظالم ہے ظلم کے طور پر قتل کرنا چاہتا ہے وہ آپ سے پوچھتا ہے کہ زید کدھر گیا آپ کو معلوم بھی ہے کہ اس کوٹھڑی میں چھپا ہوا ہے یا اس فصل میں چھپا ہوا ہے تو آپ پر فرض ہے کہ آپ کہہ دیں کہ مجھے نہیں معلوم یا اس قسم کی بات کہہ کر اس کو اس راستے سے ٹال دیں اور اس شخص کو ظلم سے بچالیں ایسے موقع پر سچ بولنا جائز نہیں ہوتا اور خلاف واقعہ بات کہنا ضروری ہوتی ہے تو لغوی طور پر تو ''کِذبْ'' اس پر بھی صادق آتا ہے تو یہ حرام بھی نہیں چہ جائے کہ ہم اس کو کفر قرار دیں۔

اس لیے تو ہمارا شیخ رحمۃ اللہ علیہ کہتا ہے کہ ''**دروغ مصلحت آمیز به از راستی فتنه انگیز**'' کہ جس سچ کے بولنے کے ساتھ فتنہ اٹھتا ہے اس کے مقابلے میں دروغ مصلحت آمیز بہتر ہوتا ہے، ایسا جھوٹ جس میں مصلحت ہو وہ بہتر ہوتا ہے حدیث شریف میں پڑھیں گے کہ شریعت نے غیبت کو حرام قرار دیا اور اس طرح سے چغلی کو حرام قرار دیا، غیبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کسی بھائی کا عیب اس کے پس پشت بیٹھ کر اچھالتے ہیں محض اس کو مجلس میں ذلیل کرنے کے لیے یہ غیبت ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا تھا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یا رسول اللہ! ما الغیبۃ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' ذکرك اخاك بمایکرہ (مشکوٰۃ ص ۴۱۲) ''تیرا اپنے بھائی کو ایسے الفاظ کے ساتھ یاد کرنا جن کو وہ پسند نہیں کرتا، اس کو اگر پتہ چلے کہ میرا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا گیا تھا اس کو تکلیف پہنچے تو یہ غیبت ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! اگر وہ بات واقعی اس میں موجود ہو جو ہم بیان کرتے ہیں وہ عیب اس میں واقعی موجود ہے جس طرح سے ہم کسی کا عیب اچھالتے ہیں پھر ساتھ کہتے ہیں کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں یہ بات سچی ہے یہ کوئی جھوٹ نہیں ہے میں سچ کہہ رہا ہوں۔

تو سچی بات ہو، عیب واقعی اس کے اندر موجود ہے کیا اس کا ذکر کرنا بھی غیبت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ غیبت تو یہی ہے کہ وہ عیب واقعی اس کے اندر موجود ہو اور تم اس کو اچھالو اور اگر عیب اس کے اندر موجود ہی نہیں تم اس کو اچھال رہے ہو تو یہ بہتان ہے اور بہتان کا درجہ غیبت سے بھی اوپر ہے ایک عیب اس میں تھا نہیں تم نے اپنی طرف سے لگا یا لگانے کے بعد اس کو رسوا کرنے کے لیے مجلس میں بیٹھ کر اس عیب کو اچھالا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرمادی کہ غیبت سچی بات ہوتی ہے لیکن جب آپ کسی مومن کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے یہ بات کر دو گے تو ایسی صورت میں تمہارا وہی سچ بولنا تمہیں جہنم میں لے جائے گا اور چغلی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ سے

بات سنی اور دوسری جگہ پہنچادی اس نیت کے ساتھ تا کہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں، ایک کو دوسرے کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے ایک کی بات دوسرے تک پہنچادی جائے آپ ﷺ نے فرمایا" لایدخل الجنة نمام "(مشکوٰۃ ص۴۱۱) چاہے اس نے سچی بات کہی ہو لیکن دو کو لڑانے کے لیے کہی ہے تو یہ سچ بولنے والا جہنمی ہے ایسے موقع پر سچ بولنا جائز نہیں ہے آپ قسمیں کھا کر کہیں کہ اس نے بالکل اس طرح سے کی ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا کہ دو مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا اور اس کے مقابلے میں سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ "لیس بالکاذب من اصلح بین الناس" (ابوداود ص۳۲۶ ج۲) جو شخص دو آدمیوں کے درمیان صلح کرواتا ہے وہ کذاب نہیں ہے، کیا مطلب کہ اگر اس کو صلح کروانے کے لیے کبھی خلاف واقعہ بات بھی کہنی پڑ جائے چونکہ یہ ایک اصلاحی فعل ہے، اصلاحی فعل کے لیے اگر وہ خلاف واقعہ بات کہتا ہے تو شریعت اس کو کذاب نہیں کہے گی " لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس" (مشکوٰۃ ص۴۱۲) ذرا خیال فرمالیجیے! ہمارا کردار اس روایت کی روشنی میں کتنا گھٹیا ہے کہ ہم فساد مچانے کے لیے تو جھوٹ بھی بولتے ہیں جبکہ شریعت کے نزدیک سچی بات بھی کہنے کی اجازت نہیں ہے اور صلح کروانے کا جذبہ ہمارے اندر کم ہوتا ہے "لیس بالکاذب من اصلح بین الناس" کا مطلب یہی ہے۔

مثلاً ایک شخص عمرو میرے پاس آتا ہے اور آکر میرے سامنے غصے کا اظہار کرتا ہے زید کے متعلق، اس کو برا بھلا کہتا ہے، اس کی کوئی شکایت کرتا ہے میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان دونوں کی آپس میں لڑائی ہے دوسرے وقت زید میرے پاس آجاتا ہے کہ عمرو میرے متعلق کیا کہہ کر گیا ہے اب اگر میں صحیح بات کہہ دوں کہ عمرو تجھے برا بھلا کہہ کر گیا ہے تو لازمی بات ہے کہ ان کی لڑائی آپس میں بڑھے گی یہاں سچی بات بتانا بھی جائز نہیں ہے بلکہ یہاں اس کے سامنے ایسی بات کہی جائے جس کے ساتھ اس کے جذبات میں فرق آئے، انکار کر دیا جائے کہ تیری شکایت تو نہیں کی یا یوں کہہ دیں کہ یہ کہہ کر گیا ہے کہ زید کے ساتھ میرے پرانے تعلقات تھے کسی غلط فہمی کی بناء پر ہمارے اختلافات ہو گئے ہیں۔

کیا ہی اچھی بات ہے کہ ہم آپس میں مل بیٹھیں جس کے ساتھ دوسرے کے جذبات کو تسکین دینی مقصود ہو اور اس کا رجحان بھی صلح کی طرف کرنا مقصود ہو کہ وہ بھی صلح کی طرف آمادہ ہو جائے تو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بعد میں ان کا اختلاف ختم ہو جائے اور یہ آپس میں جڑ جائیں کتنے سارے شر و فساد سے بچ جائیں گے تو یہ بات اگرچہ میں خلاف واقعہ کہوں گا حقیقت یہ ہے کہ عمرو میرے سامنے گالیاں دے کر گیا تھا لیکن میں انکار کر دوں یا میں کہوں کہ وہ تو بڑا خواہش مند ہے آپ کے ساتھ دوستی لگانے کو اور اس اختلاف کو دور کرنے کے

متعلق وہ کہتا ہے کہ کیا ہی اچھی بات ہے کہ ہمارے اختلافات دور ہو جائیں اس طرح میں اس کو آمادہ کروں گا پھر اس کی جو بات ہوگی اس کو ایسے ہی پہنچاؤں کہ تو اس پر ناراض ہو رہا تھا لیکن وہ تو میرے پاس آیا تھا وہ تو بڑے اچھے جذبات کا اظہار کر رہا تھا وہ تو آپ کے ساتھ صلح کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر واقعی کوئی غلطی درمیان میں ہوگئی ہے غلط فہمی کی بناء پر اس کو دور کر دیا جائے اس طرح سے اس کو ٹھنڈا کر دیا جائے اور ان کو آپس میں ملا دیا جائے یہ بات اگرچہ ظاہراً خلاف واقعہ ہوگی۔

لیکن چونکہ یہ اصلاحی نقطہ نظر کے ساتھ کہی گئی ہے تو یہ لغۃً جھوٹ ہے شریعت کی نظر میں ایسا شخص کذاب نہیں ہے "لیس بالکاذب من اصلح بین الناس" اس لیے شریعت کی نظر میں کذب کا ایک درجہ نہیں ہے کسی جگہ خلاف واقعہ بات کہنا ضروری ہوتا ہے اور جہاں کسی کو دھوکہ دینا اور نقصان پہنچانا مقصود ہو، مغالطہ میں ڈالنا مقصود ہو معاملات کے اندر وہاں کذب حرام ہے اگرچہ کفر نہیں ہے اور اگر ایمان کا دعویٰ جھوٹا کیا جائے تو یہ کذب کفر ہے اور یہاں جو "عَذَابٌ اَلِیْمٌ" کہا گیا ہے کہ "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ" تو یہاں کذب سے مراد یہی ایمان کا جھوٹا دعویٰ ہے ہر جھوٹ کی سزا "عَذَابٌ اَلِیْمٌ" نہیں ہے یہاں جھوٹ سے خاص جھوٹ مراد ہے جو انہوں نے کہا تھا "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" بسبب اس کے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے یہ ترجمہ اس لیے کیا جائے گا تاکہ اشارہ صراحۃً ادھر ہو جائے کہ ان کا "اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" یہ جھوٹ یہاں مراد ہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ترجمہ کیا ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے اور یہ لفظ استعمال اس لیے کیا گیا تاکہ صراحۃً اشارہ ادھر ہو جائے۔

منافقین کا کام زمین میں فساد پھیلانا ہے:

"وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ" اور جب اس گروہ کو کہا جاتا ہے، ان لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ، وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں۔

انما کلمہ حصر ہے اور اس کا ترجمہ آپ عام طور پر یوں کرتے ہیں "سوائے اس کے نہیں" لفظوں کے تحت ترجمہ بالکل صحیح ہے لیکن آج کل محاورے میں جس وقت آپ اس کو سہل اردو میں ادا کریں گے تو اس کا ترجمہ یوں ہوگا "ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہی ہیں" (ہم تو مصلح ہی ہیں) مطلب یہ کہ ہمارے اندر مصلح ہونے کے علاوہ کوئی دوسری بات پائی ہی نہیں جاتی، اس آیت کے اندر ان سے کہا گیا ہے کہ فساد نہ مچاؤ، وہ فساد کیا مچاتے تھے اور کس قسم کے اصلاحی جذبے کے تحت مچاتے تھے جب ان سے کہا جاتا کہ تم فساد نہ مچاؤ وہ کہتے کہ ہم تو اصلاح

کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگیا کہ وہ جو کچھ کرتے تھے ان کی نیت میں یہ نہیں تھا کہ ہم فساد مچاتے ہیں تو یہ بات واضح ہوگئی کہ فساد فساد ہی ہے چاہے کوئی نیک نیتی کے ساتھ ہی کیوں نہ کرے اور کرنے والے کی نیت نیک ہی کیوں نہ ہو تو بھی وہ مفسد ہے جس وقت قاعدے کی رو سے اس کو فساد قرار دیا جائے۔

فساد کس اعتبار سے تھا ایک فساد فی الارض تو یہ ہوتا ہے ظاہری طور پر چوری، ڈاکہ، قتل، بدمعاشی، لڑائی، جھگڑا، وغیرہ ایک فساد تو یہ ہے اور ایک فساد فی الارض ہوتا ہے باطنی طور پر کہ زمین کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ سارے کے سارے اللہ کے احکام کے پابند ہوجائیں اور اللہ کے قانون کی پابندی کرنے کا نتیجہ ہوگا کہ امن سکون دنیا کے اندر عام ہوجائے گا اور انسانوں کے دلوں کے اندر خوف خدا قائم ہوجانے کی وجہ سے ہر شخص دوسرے کا حق پہچانے گا اور کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی ایک یہ ہے اصلاحی صورت کہ لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا جائے، ایمانی جذبات ابھارے جائیں اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی کرائی جائے جو قانون ہر شخص کی مصلحت کی رعایت رکھتے ہوئے اللہ نے بنایا ہے یہ ہے نظام عالم کو برقرار رکھنے کی ایک صورت، جو شخص بھی اس نظام میں خلل ڈالے گا وہ فساد فی الارض کا ارتکاب کرے گا۔

کیونکہ جو ظاہری قانون امن قائم کرنے کے لیے بنایا جاتا ہے آپ لوگوں کی عافیت کے لیے بنایا جاتا ہے آپ جانتے ہیں کہ ظاہری قانون یہ خود کار مشین نہیں ہوتی کہ حالات خود بخود ٹھیک کردے اگر اس ملک کا قانون بنا ہوا ہے کہ چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو، دھوکہ نہ دو لیکن اگر اس آئین کو صرف کاپی میں لکھ دیا گیا، قانون بنا ہوا ہے تو اس کا کیا فائدہ؟ یہ کوئی خود کار مشین نہیں ہے اس آئین کو چلانے والے انسان ہوتے ہیں تو جس وقت تک انسان کے قلوب کی اصلاح نہ ہو اس وقت تک آئین کے صرف الفاظ کسی ملک اور کسی زمین کے خطے کی اصلاح نہیں کرسکتے یہ بات تو واضح ہے، اگر انسانوں کے اندر صلاحیت نہیں ہے تو یہ کاغذوں کے اوپر لکھا ہوا قانون کسی صورت میں بھی کسی ملک میں یا زمین کے کسی خطے کی اصلاح نہیں کرسکتا اور امن قائم نہیں کرسکتا۔

اگر اصلاح ہوسکتی ہے حالات کی تو اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ جس وقت اس آئین کو چلانے والے انسانوں کے قلوب سدھرے ہوئے ہوں تو چوری ڈاکہ یہ تو ظاہری فساد ہے اور انسانوں کے قلوب کے اندر فساد پیدا کرنا یہ باطنی فساد ہے جس کے بعد ظاہری فساد اس کا ایک لازمی حصہ ہے تو یہ لوگ اس اسلام کی تحریک جو اٹھی تھی اور سرور کائنات ﷺ نے ایمان کی جو دعوت دی تھی اس میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے یہ چاہتے تھے کہ اس طرح کی کوئی صورت حال پیدا ہوجائے کہ جس طرح سے ہم پہلے خلط ملط ہوکر رہتے تھے ویسے ہی خلط ملط ہوں اور کافروں کے ساتھ، اہل باطل کے ساتھ براہِ راست ٹکر نہ لی جائے یہ جذبہ جو تھا آپ جانتے ہیں کہ اصل کے اعتبار سے لوگوں

کے قلوب کی اصلاح کو روکنے والا جذبہ ہے اور قلوب کے اندر اس طرح کی مفاد پرستی اور بزدلی پیدا کردینا یہ کسی صورت میں بھی حق کو غالب کرنے کی بات نہیں ہے پھر وہ جب دونوں کے ساتھ ملتے تھے تو اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر پہنچاتے اپنے طور پر وہ سمجھتے کہ ہم ان کے درمیان میں صلح کروانے کی کوشش کررہے ہیں یا آپس میں ان کو جوڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔

حقیقت کے اعتبار سے اِدھر کی بات اُدھر پہنچانے کے اعتبار سے نتیجہ زیادہ خراب ہوجاتا ہے یہ تھا فساد جو وہ کرتے تھے اور اپنے طور پر وہ اصلاح کے جذبے سے کرتے تھے لیکن قرآن کریم نے کہا ہے کہ نہیں یہ مصلح نہیں ہیں یہ مفسد ہیں کیونکہ جب یہ قاعدے اور قانون کی رو سے فساد ہے تو ان کی نیک نیتی یا ان کا جذبہ کہ ہم اصلاح کی کوشش کررہے ہیں اس کے ساتھ وہ فساد اصلاح نہیں کہلائے گا قاعدے اور قانون کی رو سے جب ان کا طرز عمل فساد قرار پایا اب اگر یہ ارادہ اصلاح کا بھی رکھتے ہیں تو ان کے ارادے کے ساتھ یہ اصلاح نہیں بنے گی۔

''الله یعلم المفسد من المصلح'' مفسد اور مصلح کو اللہ جانتا ہے کہ مفسد کون ہے؟، مصلح کون ہے؟ ایک انسان ہے آپ کو زبان سے کہتا ہے کہ میں مصلح ہوں لیکن اس کی کاروائیاں جس وقت فساد کا باعث بنتی ہیں تو وہ زبان کے ساتھ کہنے سے مصلح نہیں بن جایا کرتا، جب انہیں کہا جاتا ہے کہ علاقے میں فساد نہ مچاؤ یہاں ارض سے وہی ارض معہود مراد ہے مدینہ منورہ کی زمین اپنا علاقہ ان کا جو بھی تھا جس میں ان کی کاروائیاں جاری تھیں جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم فساد نہ کرو ملک میں، اپنے علاقے میں'' الارض '' یہاں سے زمین کا معہود خطہ مراد ہے ''قَالُوْٓا'' وہ کہتے ہیں'' اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ''سوائے اس کے نہیں کہ ہم تو مصلح ہی ہیں جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ'' انما'' حصر کے لیے ہوتا ہے۔

'' اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ '' '' اَلَآ '' یہ کلمہ تنبیہ کیلئے ہوتا ہے بمعنی خبردار '' اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ''اس کلام میں بھی تاکید ہے یعنی بے شک یہی لوگ فسادی ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ یہ لوگ مفسد ہی ہیں، اس میں حصر ہے کہ یہ مصلح بالکل نہیں ہیں بلکہ یہی لوگ فسادی ہیں اور لیکن انہیں شعور نہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے معیار حق ہونے پر واضح دلیل:

''وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ'' النَّاسُ سے یہاں مخلص صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اخلاص کا تعلق رکھتے تھے محبت کا تعلق رکھتے تھے اور وہ اس معاشرے کے اندر نمایاں تھے جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جس طرح سے لوگ ایمان لائے ہیں یعنی جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے مخلص ساتھیوں کا ایمان ہے تم بھی اس طرح سے ایمان لاؤ اس ایمان کے تقاضے سے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی ہو کر رہو اور یہ تمہارا دوسروں کے ساتھ تعلق رکھنا، گڑبڑ کرنا اس کو ترک کردو یہ معیار تمہارے سامنے ہے جس طرح سے یہ مخلص ہیں تم بھی اس طرح سے ہو جاؤ، ان کے سامنے ایمان کے لیے گویا کہ ایک حسی کسوٹی پیش کی گئی ہے کہ ایمان وہی صحیح ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کے مشابہ ہو" كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ " سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی لوگوں کے سامنے اس طبقے کو جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جڑ گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا تھا۔

اور آپ کے ساتھ اخلاص اور محبت کے ساتھ ہر معاملہ کرتا تھا ان کے اس ایمان کو اس زمانے میں بھی دوسرے لوگوں کے سامنے بطور معیار کے پیش کیا گیا اور یہی معیار قیامت تک قائم ہے اس لیے اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عقیدے کی صحت اور اسی طرح عمل کی صحت کو پرکھنے کا ذریعہ یہی ہے دیکھو کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس عقیدے کو کس انداز میں اختیار کیا اور اس عمل کو کس طرح سے کیا اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ لے کر اس میں سے کوئی ایسا عقیدہ نکالنا چاہتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے نہیں سمجھا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے اخذ نہیں کیا تو وہ ظاہری طور پر لفظوں کے مطابق کتنا ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ حق نہیں ہے باطل ہے یہ معیار ہمارے سامنے ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے سامنے معیار حق ہیں اپنے عقیدے کو اور اپنے عمل کو انہی کے عقیدے اور عمل پر پرکھا جائے گا اگر ہمارا ایمان، ہمارے عقائد، ہمارے اعمال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرز کے مطابق ہیں تو صحیح ہیں اور اگر مطابق نہیں ہیں تو صحیح نہیں ہیں، جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جس طرح کہ یہ لوگ ایمان لے آئے ہیں،

صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ کو چھوڑنے والا نادان ہے:

" قَالُوْٓا "وہ کہتے" اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ "سفہاء یہ سفیہ کی جمع ہے اور لفظ سفیہ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، سفیہ بے عقل، نادان، اور خفیف العقل کو کہتے ہیں اور اس کے لیے لفظ بے وقوف بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی جس کو وقوف حاصل نہ ہو، جو کسی چیز پر مطلع نہ ہو، تو لاعلم جاہل جو کسی چیز پر اطلاع نہیں رکھتا اس کو بے وقوف سے تعبیر کر دیا جاتا ہے" تو وہ کہتے کیا ہم ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے قوف لے آئے ہیں" یہ بات یا اپنی مجلسوں میں کہتے یا بعض مساکین غرباء کے سامنے کہہ دیتے ورنہ منافق علی الاعلان تو یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے، وہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو "سفہاء" کے لفظ سے تعبیر کرتے کہ یہ تو نادان لوگ ہیں، خفیف العقل ہیں، یہ عقل مند لوگ نہیں ان جیسا بننے کے لیے ہمیں کہتے ہو؟ یہ سفیہ اور نادان کس اعتبار سے کہتے تھے؟۔

یہ وہی جذبہ ہے جس کو ابتداء کے اندر میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا وہ کہتے کہ یہ تو نادان لوگ ہیں خوامخواہ ایک کے ساتھ مل کر باقی ہزاروں سے دشمنی مول لے لی اپنا گھر گنوایا، بیوی سے جدائی اختیار کی، اپنے بچوں سے علیحدہ ہوئے، مار پٹائی برداشت کی اور اپنی املاک اور جائیدادیں لٹادیں یہ کوئی عقل مندی ہے، ہوشیار تو ہم ہیں کہ اِن کے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں، اُن کے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں کہیں بھی ہم اپنے مفاد کو نقصان نہیں پہنچنے دیتے یہ کون سی عقلمندی ہے کہ ایک کے ساتھ ہو کر ہزاروں سے بگاڑ لو اور پھر سب لٹ پٹ کے آگئے نہ گھر رہے، نہ بیوی پاس رہی، نہ بچے پاس رہے، نہ جائیداد رہی، گھر سے بے گھر ہو گئے، تکلیفیں اٹھائیں، مار پٹائی کا نشانہ بنے یہ کوئی عقلمند لوگ نہیں ہیں، سمجھدار تو ہم ہیں کہ جدھر چلے جائیں لوگ اکرام کرتے ہیں کسی سے ہماری بگڑی ہوئی نہیں ہے اس طرح سے جو انہوں نے اپنے آپ کو رکھا ہوا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے اپنا مفاد محفوظ کیا ہوا ہے اور اپنے مفاد کو محفوظ کر لینا اور مختلف لوگوں کے خطرات سے بچ جانا ہی عقلمندی ہے۔

یعنی ان کا جذبہ اس قسم کا تھا کہ اپنے مفاد کو نقصان نہیں پہنچنے دینا چاہیے یہ وہی ابتداء والی بات کہ مفاد پرستی اور بزدلی اس کے تحت وہ سمجھتے تھے کہ اچھی زندگی اسی طرح سے گزرتی ہے کہ اپنے مفاد کو ہمیشہ مدنظر رکھو اور کسی کے ساتھ بگاڑ کر خوامخواہ خطرات مول نہ لو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے علی الاعلان سب سے بگاڑ لی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دے کر جس کے نتیجے میں نقصان بھی اٹھایا، تکلیفیں بھی برداشت کیں، وطن بھی چھوڑا، اہل وعیال سے بھی جدا ہوئے وہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں "اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ" نادان تو یہ لوگ ہیں جو دنیا کے عارضی مفاد کی خاطر اور چند روزہ زندگی میں اپنے اس مفاد کو عزیز رکھتے ہیں اور آخرت کو برباد کر رہے ہیں یہ تو ایسے ہے کہ جس طرح چند ٹکوں کی حفاظت کی جارہی ہے اور سونے کے ڈھیر سے صرف نظر کی جارہی ہے اور ایک آدمی چند ٹکوں کو قربان کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں سونے کے ڈھیر لیتا ہے عقل مند تو وہ شخص ہے۔

جس نے حق کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑا، تکلیفیں اٹھائیں اس نے یہ بہت عارضی سا مفاد چھوڑا ہے اور دائمی مفاد حاصل کر لیا اور بمقابلہ ان کے جو عقل مند بنے پھر رہے ہیں انہوں نے اپنے اس عارضی مفاد کو مدنظر رکھا ہے اور دائمی "عذاب الیم" لے لیا تو عقل مند یہ ہوئے یا وہ عقل مند ہوئے؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو جنہوں نے بے عقل سمجھا بے وقوف سمجھا، نادان سمجھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب یہ ہے کہ یہ خود نادان ہیں وہ تو بہت بڑے عقل مند تھے جنہوں نے آخرت کے مفاد کو مدنظر رکھا حق کا ساتھ دیا اور حق کا ساتھ دینے والا بہر حال جیتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے چاہے وہ میدان کے اندر شہید ہی ہو جائے اور باطل کا ساتھ دینے والا بہر حال خسارے میں ہے۔

اگر چہ عارضی طور پر وہ فتح بھی پالے اور اس کو کوئی مال و دولت بھی مل جائے کیونکہ فانی اور باقی کا فرق ہے کہ حق کا ساتھ دینے والا فانی کو چھوڑتا ہے باقی کو اختیار کرتا ہے اور باطل کا ساتھ دینے والا باقی کو چھوڑتا ہے اور فانی کو اختیار کرتا ہے فانی اور باقی کا کیا مقابلہ؟ اس لیے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو عقل مندی قرار دیا گیا اور جن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل نادانی نظر آتا تھا ان کو نادان کہا '' اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ '' خبردار بے شک یہی لوگ نادان ہیں '' وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ '' لیکن ان کو علم نہیں۔

منافقین سرکشی میں بڑھتے رہتے ہیں:

'' وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا '' یہ ان کی چوتھی قباحت ہے جب یہ ملتے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تو یہ کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔

'' وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ '' ''شیٰطین'' یہ شیطان کی جمع ہے شیطان یہ '' فُعْلان '' کے وزن پر ہے ''شَاطَ يَشِيْطُ '' سے، تندخو ہونا، بدمزاج ہونا، مشتعل مزاج ہونا، شریر ہونا اس کا مفہوم اس قسم کا ہوتا ہے تو جو شخص تندخو، تیز مزاج شریر، مشتعل مزاج ہو اس کو شیطان سے تعبیر کرتے ہیں۔

چاہے وہ انسانوں سے ہو، چاہے وہ جنوں سے ہو، شیاطین ''الجن والانس'' دونوں قسم کے ہوتے ہیں کہ ''جب یہ خلوت میں جاتے ہیں اپنے شیاطین کی طرف'' یہاں سے ان کے روساء مراد ہیں '' خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ '' جب خلوت میں جاتے ہیں جب تنہاء ہوتے ہیں اپنے سرداروں کی طرف، کہتے ہیں '' اِنَّا مَعَكُمْ ''، ہم تمہارے ساتھ ہیں یعنی اِدھر مومنوں کے پاس جاتے تو کہہ دیتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور اُدھر کافروں کے پاس، اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو کہہ دیتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں یہی ان کی چستی تھی کہ دونوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے جس کو آج کل کے محاورے میں آپ زمانہ ساز سے تعبیر کرتے ہیں، زمانہ ساز کا معنی زمانے سے موافقت کرنے والا کہ جس قسم کے حالات ہوں وہ ان کے ساتھ موافقت کر لیتا ہے جیسے کیسے لوگ آ جائیں ان کے ساتھ موافقت کر لیتا ہے اس کو کہتے ہیں زمانہ ساز، اسی کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں ذکر کیا ہے کہ

حدیث بے خبراں است کہ
تو بزمانہ ساز

یہ تو بے خبروں کی بات ہے کہ تم زمانے کے ساتھ موافقت کرو، اصل یہ ہے کہ اپنے آپ کو تم مستقل رکھو، زمانہ تمہارے ساتھ موافقت کرتا ہے تو بہتر اور اگر زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تمہیں چاہیئے کہ تم زمانے

سے لڑتے رہو مخالف ماحول میں رہتے ہوئے اس مخالف ماحول سے ٹکر لے کر رکھنا، لڑتے رہنا اور حق کا ساتھ نہ چھوڑنا یہ ہے عقل مندی کی بات، اور یہ بے خبروں کی بات ہے کہ تو زمانہ کے ساتھ موافقت کرے، یہ بے خبروں کی بات ہے، عقل مندی کی بات یہ ہے کہ اگر زمانہ تیرے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تو زمانے کے ساتھ لڑ۔

انبیاء علیہم السلام کا اسوہ یہی ہے کہ وہ مخالف ماحول میں آتے ہیں اور ماحول کو موافق بنانے کی کوشش کرتے ہیں اگر کوشش کے ساتھ ماحول موافق بن گیا تو بہتر اور اگر نہیں بنا تو آخری دم تک اس ماحول سے لڑتے رہیں گے ماحول سے کبھی صلح نہیں کرتے تو اہل حق کے جو پیشوا ہیں انبیاء علیہم السلام کا گروہ ان کا بھی کردار یہی ہے تو اہل حق کو چاہیئے کہ وہ جہاں بیٹھے ہوں اپنے حق کا اظہار کریں اور اگر ماحول موافقت کرتا ہے تو بہتر ورنہ ساری زندگی ٹکراؤ رہے اور اسی ٹکراؤ میں مرجائیں یہی انبیاء علیہم السلام کا اسوہ ہے اور یہی اہل حق کی پہچان ہے باقی حق کو دبا کر ماحول سے موافقت کر لینا یہ اہل حق کا کام نہیں ہے اور حدیث شریف میں بھی صراحۃً سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی بات بیان فرمائی مشکوٰۃ شریف میں آتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لاتکونوا اِمَّعۃ" اِمَّعۃ نہ بنو۔

"اِمَّعۃ" اسی لفظ سے لیا گیا ("انا مع الناس" یہ تمہارا نعرہ نہیں ہونا چاہیئے) "لاتکونوا اِمَّعۃً" اِمَّعۃ نہ بنو یہ تمہارا نعرہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم تو لوگوں کے ساتھ ہیں، جدھر کی ہوا دیکھو ادھر کو چل پڑو یہ نعرہ تمہارا نہیں ہونا چاہیئے، اگر لوگ نیکی کریں تو ان کے ساتھ مل کر نیکی کرو اور اگر لوگ برائی کریں تو ان کے ساتھ مل کر برائی نہ کرو آگے روایت کے الفاظ اس طرح سے ہیں ان میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ لوگ اگر نیکی کریں تو نیکی کے اندر تو لوگوں کے ساتھ موافقت رکھو لیکن اگر لوگ برائی کرتے ہیں تو برائی میں لوگوں کا ساتھ نہ دو، اور اُن کا یہ کام تھا "انا مع الناس" والی بات تھی مومنوں کے پاس جاتے تو کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور جب اپنے شیاطین کی طرف جاتے کہتے ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

اور پھر ان کو مطمئن کرنے کے لیے کہتے ہم نے جو وہاں جا کر کلمہ پڑھ لیا اور اہل ایمان کو جو جا کر کہہ دیا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو استہزاء کرتے ہیں وہ تو ہماری ہنسی مذاق تھی، ہنسی مذاق کے طور پر ہم نے کہا تھا کہ ہم اللہ کے رسول کو مانتے ہیں، یوم آخرت کو مانتے ہیں، فلاں چیز کو مانتے ہیں یہ تو ہم نے ایسے دل لگی کے طور پر ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ہنسی وہ نہیں کر رہے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ استہزاء کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ استہزاء کس طرح سے کر رہا ہے کہ یہ تو خوش ہیں کہ ہماری حالت دن بدن اچھی ہوتی جا رہی ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ہلاکت کے گڑھے میں جا رہے ہیں جس دن نتیجہ واضح ہوگا تو پتہ چلے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے تھے یا غلط راستے پر چل رہے تھے۔

یہ اللہ کی طرف سے اس استہزاء کا جواب ہے کہ یہ دل لگی تمہاری نہیں ہے یہ تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ استہزاء کرتا ہے کہ تم اس طرح سے گمراہی کی طرف بڑھتے جا رہے ہو کہ تمہیں پتہ ہی نہیں چل رہا جیسے اگلے الفاظ میں بیان فرمادیا کہ اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے اور انہیں ترقی دیتا ہے ان کی سرکشی میں ''یعمھون'' یہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

یہ لفظ عمہ سے لیا گیا ہے جس طرح عمی آنکھوں سے بے بصر ہونے کو کہتے ہیں اس طرح عمہ دل سے بے بصیرت ہونے کو کہتے ہیں، دل کے اندر بصیرت نہ رہے، کوئی سمجھ نہ رہے تو اس کے لیے عمہ کا لفظ بولا جاتا ہے اس لیے ''یعمھون'' کا ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے یوں کیا ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں اور اگر اس کو یوں ادا کریں کہ بھٹکتے پھرتے ہیں تو بھی مفہوم صحیح ہے کیونکہ بھٹکنا پھرنا تب ہی ہوتا ہے جب انسان کے اندر کسی قسم کی بصارت نہ ہو اور انسان کسی صحیح راستے کو اختیار نہ کرے۔

''اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى'' یہی لوگ ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو ہدایت کے بدلے'' یہاں معروف خرید وفروخت مراد نہیں ہے بلکہ یہاں یہ ہے کہ ایک چیز چھوڑ دی دوسری چیز لے لی'' ہدایت اور ضلالت میں سے انہوں نے ہدایت کو چھوڑ دیا ضلالت کو لے لیا اس لیے یہ اختیار کرنے کے معنی میں ہے کہ ہدایت کو چھوڑ کر ان لوگوں نے گمراہی کو اختیار کیا، اور نہ ان کو تجارت کرنے کا ڈھنگ آتا ہے، تجارت تو ایسے طور پر ہونی چاہیئے کہ انسان سرمایہ خرچ کرے اور نفع اٹھائے اور یہ تو دن بدن خسارے میں جا رہے ہیں، ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت جو اختیار کی یہ کوئی نفع کی تجارت نہیں ہے ان لوگوں کو تجارت کرنے کا طریقہ نہیں آیا تو یہاں'' اھتداء فی التجارۃ ''مراد ہے یعنی یہ جو انہوں نے تجارت کی کہ ہدایت کو چھوڑا ضلالت کو لیا یہ ان کی بے ڈھنگی تجارت ہے جس کے نتیجے میں یہ نقصان میں رہیں گے۔

''فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ'' ان کی تجارت نے نفع نہ پایا، اور نہ یہ ہدایت یافتہ ہیں۔

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ

ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی جب روشن کر دیا اس آگ نے

مَا حَوۡلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾

اس شخص کے ارد گرد کو تو لے گیا اللہ ان کے نور کو اور چھوڑ دیا ان لوگوں کو اندھیروں میں ایسے حال میں کہ وہ دیکھتے نہیں ﴿۱۷﴾

صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۸﴾ اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ

وہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں پس وہ لوٹیں گے نہیں ﴿۱۸﴾ یا مثل آسمان سے نازل ہونے والی بارش کے

فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ ۚ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡٓ اٰذَانِهِمۡ

اس میں تاریکیاں ہیں اور کڑک ہے اور چمک ہے کرتے ہیں وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں

مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ‌ؕ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾

بجلیوں کی وجہ سے موت کے ڈر سے اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۱۹﴾

يَكَادُ الۡبَرۡقُ يَخۡطَفُ اَبۡصَارَهُمۡ‌ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمۡ مَّشَوۡا

قریب ہے کہ چمکنے والی بجلی اچک لے ان کی آنکھوں کو جب وہ بجلی روشن ہوتی ہے ان کے لیے تو چل پڑتے ہیں

فِيۡهِ ۙ وَاِذَآ اَظۡلَمَ عَلَيۡهِمۡ قَامُوۡا ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ

اس کی روشنی میں اور جب وہ بجلی ان پر تاریک ہو جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں اگر اللہ چاہے تو لے جائے

بِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۰﴾

ان کے کانوں کو اور ان کی آنکھوں کو بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾

لغوی تحقیق:

اِسْتَوْقَدَ، استقاد آگ جلانا اَوْقَدَ باب افعال سے اِسْتَوْقَدَ باب استفعال سے "استقاد النار"

آگ جلانا وقود کا لفظ آپ کے سامنے اگلے رکوع میں آئے گا وقود اس ایندھن کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے آگ

جلائی جاتی ہے ''مایوقد بہ النار'' اور باب افعال سے بھی یہ لفظ سورۃ رعد میں استعمال ہوا ہے، ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی ''فَلَمَّآ اَضَاءَتْ مَاحَوْلَهٗ'' اضاءت کی ضمیر النار کی طرف لوٹ گئی جب روشن کر دیا، اضاء لازم اور متعدی دونوں طرح سے استعمال ہوتا ہے روشن ہونا، روشن کرنا، یہاں چونکہ ماحولہ اس کا مفعول آیا ہوا ہے اس لیے اس کا ترجمہ متعدی کے ساتھ کرنا ہے جب روشن کر دیا اس آگ نے ''ماحول'' اس شخص کے ماحول کو ماحول اردگرد کی جگہ آپ جو بولا کرتے ہیں ہمارے مدرسے کا ماحول اچھا ہے، فلاں جگہ کا ماحول اچھا نہیں ہے تو اس ماحول سے اردگرد مراد ہوتا ہے تو یہاں بھی ماحول کا مطلب یہی ہے کہ اس کی اردگرد جگہ کو اس آگ نے روشن کر دیا جب روشن کر دیا اس آگ نے اس شخص کے اردگرد کو۔

''ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ'' اب یہ ''الذی'' بھی لفظوں میں مفرد ہے اس لیے اسْتَوْقَدَ کی ضمیر ادھر لوٹ رہی ہے ماحول کی ضمیر بھی ادھر لوٹ رہی ہے لیکن معناً چونکہ جمع ہے اس لیے ''ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ'' کے اندر جمع کی ضمیر لوٹا دی جیسے کہ ''ومن الناس من یقول'' کے اندر ذکر کیا کہ وہاں بھی یقول کی ضمیر مفرد لوٹ رہی تھی آگے ''آمنا'' جمع کا صیغہ تھا ''وماھم بمومنین'' کے اندر ضمیر جمع کی لوٹ رہی تھی، اسی طرح یہاں بھی ''بنورھم'' کے اندر ضمیر جمع کی آگئی ''ذھب'' یہ لازم ہے جانے کے معنی میں لیکن جس وقت اس کے بعد باء آگئی تعدیہ کی اب اس کا ترجمہ ہم لے جانے کے ساتھ کریں گے ''ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ'' لے گیا اللہ تعالیٰ ان کے نور کو، ان کی روشنی کو اللہ لے گیا یعنی اللہ نے ان کی روشنی ختم کر دی۔

''وَتَرَكَهُمْ'' اور چھوڑ دیا ان لوگوں کو۔

''فِیْ ظُلُمٰتٍ'' ظلمت کی جمع ظلمات بمعنی تاریکی، چھوڑ دیا ان لوگوں کو اندھیروں میں، تاریکیوں میں۔

''لَّا یُبْصِرُوْنَ'' لوگ دیکھتے نہیں یعنی ایسے حال میں چھوڑ دیا کہ وہ دیکھتے نہیں۔

''صُمٌّ'' صم یہ اصم کی جمع ہے، اصم بہرے کو کہتے ہیں۔

''بُكْمٌ'' یہ ابکم کی جمع ہے، ابکم گونگے کو کہتے ہیں جو زبان سے بول نہ سکتا ہو۔

''عُمْیٌ'' اعمیٰ کی جمع ہے اور اعمیٰ اندھے کو کہتے ہیں اور یہ تین صفتیں اکٹھی ذکر کر دیں بغیر عطف کے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت یہ تینوں باتیں موجود ہیں۔

''صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ'' ''ھُمْ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ'' مبتداء محذوف نکالیں گے اور یہ سب خبریں ہیں۔

وہ لوگ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یعنی ان کے کانوں میں بھی صلاحیت نہیں، ان کی آنکھوں میں بھی صلاحیت نہیں، ان کی زبانوں میں بھی صلاحیت نہیں، "فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ" پس وہ لوٹیں گے نہیں۔

"أَوْ كَصَيِّبٍ" "صَيِّب نازل ہونے والی بارش صَيْوِب تھا اصل میں جیسے سید کو آپ کہا کرتے ہیں کہ یہ سیود تھا یہ "صیب" بھی "صیوب" تھا جب واؤ اور یا ایک جگہ اکٹھی ہوگئیں ان میں سے پہلا ساکن ہے تو واؤ کو یا کر دیا اور یاء کا یاء میں ادغام کر دیا تو صیب بن گیا، یا مثل آسمان سے نازل ہونے والی بارش کے۔

"فِيْهِ ظُلُمٰتٌ" "اس بارش میں تاریکیاں ہیں، اندھیرے ہیں۔

"وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ" "اور کڑک ہے، اور چمک ہے۔

"رعد، برق، صاعقه" یہ تینوں لفظ استعمال ہوا کرتے ہیں جیسے "صاعقه" کا لفظ بھی آگے آ رہا ہے "صواعق" جمع ہے صاعقہ کی بجلی کڑکتی ہے اور بسا اوقات کڑک کر گرتی ہے یا آسمان کے اوپر چمکتی ہے یہ مختلف کیفیتیں ہیں آسمانی بجلی کی اور انہی کیفیتوں کے اعتبار سے اس کے تین نام ہیں، کڑک کر گر جائے اس کو صاعقہ کہہ دیتے ہیں اس لیے صاعقہ کا ترجمہ کڑک کے ساتھ بھی کر دیا جاتا ہے اس میں دونوں باتیں ہوتی ہیں کہ کڑک کر گرنے والی اور رعد کڑکنے والی بجلی ہوگئی جو آواز دیتی ہے اور برق چمکنے والی ہوگئی، اس بارش میں تاریکیاں ہیں کڑک ہے اور چمک ہے۔

"يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ" "اب یہ يَجْعَلُوْنَ کی ضمیر جمع مذکر کی ہے یہ لوٹ رہی ہے ان لوگوں کی طرف جو کہ اس بارش میں گھر جائیں اسی لیے مفسرین نے ترجمہ کرتے وقت ك کا مدخول جو ہے "صَيِّبْ" کے اوپر مضاف کو محذوف مانا ہے "او کذو صیب" تاکہ "یجعلون" کی خبر کا مرجع لفظوں میں متحقق ہو جائے "او کذو صیّب" یا ان کی مثال ان لوگوں جیسی ہے جو آسمان سے اترنے والی بارش والے ہوں، اب وہ بارش والے یعنی جو بارش کے اندر گھر گئے "يَجْعَلُوْنَ" کی خبر اُدھر لوٹے گی، وہ لوگ جو اس بارش کے اندر گھر گئے ہیں وہ کرتے ہیں اپنی انگلیاں "اصابعهم، اصابع، اصبع" کی جمع ذکر یہاں کل کا ہے اور ارادہ جزء کا ہے مراد ہے پورے، انگلیوں کا آخری حصہ۔

ساری انگلی تو کان میں نہیں جایا کرتی آخری حصہ جایا کرتا ہے، کرتے ہیں وہ اپنی انگلیاں "فِيْ اٰذَانِهِمْ" "اپنے کانوں میں "مِّنَ الصَّوَاعِقِ" بجلیوں کی وجہ سے صواعق، صاعقہ کی جمع جس کے اندر کڑک کا مفہوم بھی ہے، گرنے کا مفہوم بھی ہے، بجلیوں کی وجہ سے، موت کے ڈر سے "حَذَرَ الْمَوْتِ" یہ

"یَجْعَلُوْنَ" کا مفعول لہٗ ہے "حَذَرَ الْمَوْتِ" موت سے بچنے کے لیے، موت کے ڈر سے دونوں طرح سے آپ اس کو کہہ سکتے ہیں "وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ" اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔

"یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ" "یَكَادُ" افعال مقاربہ میں سے ہے "قریب ہے کہ چمکنے والی بجلی اچک لے ان کی آنکھوں کو" یعنی وہ اتنی تیز روشنی آتی ہے کہ ان کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو جاتی ہے جس کو آپ کہتے ہیں کہ آنکھیں چندھیا گئیں اتنی تیز روشنی آ جاتی ہے کہ آنکھیں ماؤف ہو جاتی ہیں دیکھتی کچھ نہیں ہیں، قریب ہے کہ چمکنے والی بجلی اچک لے ان کی آنکھوں کو۔

"كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ" "اضاء" یہاں متعدی بھی ہو سکتا ہے اور لازم بھی ہو سکتا ہے، متعدی ہوگا تو ترجمہ یوں کریں گے جب کبھی بجلی روشن کر دے ان کے لیے راستے کو "مَّشَوْا فِیْهِ" تو وہ اس روشنی میں چل پڑتے ہیں، اضاء کا مفعول محذوف نکلے گا "اَضَآءَ لَهُمْ ممشی" چلنے کی جگہ، راستہ، جب وہ بجلی روشن کر دیتی ہے ان کے لیے راستے کو تو وہ اس میں چل پڑتے ہیں یعنی اس کی روشنی میں چل پڑتے ہیں اور اگر لازم کے طور پر ہوگا تو پھر یوں ترجمہ کریں گے جب وہ بجلی روشن ہوتی ہے ان کے لیے تو اس کی روشنی میں چل پڑتے ہیں۔

"وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ" اور جس وقت وہ بجلی ان پر تاریک ہو جاتی ہے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

جب ان کے اوپر تاریکی چھا جاتی ہے "قَامُوْا" قَامُوْا کا یہاں ترجمہ کرنا ہے ٹھہر جاتے ہیں کیونکہ "قـــام" جو ہے اس کا مفہوم دو طرح سے آیا کرتا ہے ایک چلتا ہوا آدمی رک گیا اس کو بھی کہتے ہیں ٹھہر گیا اور اسی طرح سے ہماری زبان میں بھی اس کے لیے لفظ استعمال ہوتا ہے کھڑا ہو گیا، دوڑ رہا تھا کھڑا ہو گیا، چل رہا تھا کھڑا ہو گیا یہ کھڑا ہونا جو ہے یہ چلنے کے مقابلے میں ہے جس کے لیے دوسرا لفظ ہے ٹھہرنا اور ایک ہے بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا، بیٹھنے کے مقابلے میں بھی کھڑا ہونا آیا کرتا ہے یہاں کیونکہ مشی کے مقابلے میں آ رہا ہے اس لیے اس کا مفہوم انہی لفظوں میں ادا کرنا ہے کہ جب ان کے اوپر تاریکی ہو جاتی ہے تو "قاموا" وہ ٹھہر جاتے ہیں۔ مشی کے مقابلے میں آنے کی وجہ سے ترجمہ اس طرح سے کیا جائے گا کہ وہ کھڑے ہو جاتے ہیں اس کا معنی دو طرح سے ہوتا ہے چلتے ہوئے کھڑے ہو گئے، بیٹھے ہوئے تھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تو ٹھہرنا جو ہے یہ اسی مفہوم کو ادا کرتا ہے جو چلتا ہوا دوڑتا ہوا آدمی ٹھہر جائے جب ان کے اوپر تاریکی ہو جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔

"وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ" اگر اللہ چاہے تو لے جائے ان کے کانوں کو، ان کی آنکھوں کو۔

"اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے۔

ماقبل سے ربط:

پچھلی آیات میں آپ کے سامنے منافقین کے مختلف احوال ذکر کئے گئے تھے اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ انہی کے حال کو دو مثالوں کے ساتھ واضح فرمارہے ہیں یہ مثال ہے تشبیہ نہیں۔

مثال اور تشبیہ میں فرق:

تشبیہ اور مثال میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، جہاں تشبیہ پائی جائے وہاں تشبیہ کے ارکان مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ تشبیہ ان تینوں کا نکالنا ضروری ہوتا ہے پھران کی آپس میں مطابقت دیکھی جاتی ہے، مشبہ کیا ہے تشبیہ کس کو دی جارہی ہے، مشبہ بہ کیا ہے کس کے ساتھ تشبیہ دی جارہی ہے اور وجہ تشبیہ کیا ہے، تشبیہ کس اعتبار سے دی جارہی ہے جس طرح آپ کہیں کہ " زید اسد یا زید کالاسد"، تو آپ نے زید کو تشبیہ دے دی شیر کے ساتھ، زید مشبہ ہے اور اسد مشبہ بہ ہے اور وجہ تشبیہ آپ اس میں شجاعت نکال لیں جس طرح شیر کے اندر شجاعت پائی جاتی ہے اسی طرح زید میں بھی شجاعت پائی جاتی ہے تو تینوں جزء وہاں نکالے جایا کرتے ہیں اور جتنی وجہ تشبیہ دونوں کے درمیان میں کامل ہوتی ہے اتنی ہی تشبیہ کامل کہلاتی ہے۔

اور مثال کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ اس کے اجزاء کو ممثل لہ کے ساتھ مطابق کرنا ضروری نہیں ہوتا، مثال کے کل اجزاء کو ممثل لہٗ کے کل اجزاء کے ساتھ مطابقت دینی ضروری نہیں ہوتی بلکہ مثال کے ساتھ ایک ہیئت اور کیفیت سامنے لائی جایا کرتی ہے اور وہ ہیئت اور کیفیت جو ہے وہ ممثل لہٗ کے اوپر صادق آتی ہے جس کے لیے مثال پیش کی جارہی ہے اس لیے اس میں علیحدہ علیحدہ اجزاء دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس جزء سے کیا مراد ہے، اس جزء سے کیا مراد ہے تشبیہ کا یہاں مفہوم نہیں ہوا کرتا بلکہ کل مثال کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہیئت اور کیفیت انسان کے ذہن میں آتی ہے ممثل لہ کے بارے میں وہی کیفیت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے علیحدہ علیحدہ اجزاء کی دوسرے کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود نہیں ہوتا اس طرح سے یہ مثال ذکر کی جارہی ہے۔

منافق کی اقسام:

منافق اصل میں دو طرح کے تھے جس طرح عام طور پر مفسرین ذکر کرتے ہیں بعض تو ایسے تھے جن کو اپنے کفر کے اوپر قرار تھا، ان کے دل میں تردد نہیں تھا اندر کفر چھپایا ہوا تھا ظاہری طور پر ایمان کو ظاہر کرتے تھے، اپنے آپ کو مومن کہتے تھے اور دوسرے تھے کہ کفر ان کے دل میں تھا لیکن وہ کبھی کبھی تردد کی کیفیت اختیار کر لیتے تو یہ دونوں مثالیں ان دونوں گروہوں کو واضح کرنے کے لیے ہیں۔

مثال نمبر ا کا حاصل:

پہلی مثال کا حاصل یہ ہے کہ جیسے ایک شخص آگ جلاتا ہے اس لیے جلاتا ہے کہ وہ بھی اور اس کے اردگرد والے لوگ بھی اس کی روشنی سے، گرمی سے فائدہ اٹھائیں آگ میں یہی تو دو مقصد ہوا کرتے ہیں پہلے زمانے میں چراغوں کا اس طرح سے سلسلہ نہیں تھا تو لوگ روشنی حاصل کرنے کے لیے بھی آگ جلاتے تھے، اپنے ہاں جس طرح سے قریب زمانے میں بھی دیئوں کا رواج تھا دیا بھی ایک آگ ہے جو انسان جلاتا ہے روشنی حاصل کرنے کے لیے اور باہر جانے والے مسافر، جنگل میں رہنے والے وہ تو باقاعدہ لکڑیاں جلا کر روشنی حاصل کرتے ہیں تو گرمی حاصل کرنا بھی مقصود ہوتا ہے اور روشنی حاصل کرنا بھی مقصود ہوتا ہے، جلانے والے کا مقصد یہ ہے کہ خود بھی وہ فائدہ اٹھائے اور اس کے ساتھی بھی اس کی روشنی اور گرمی سے فائدہ اٹھائیں، آگ جل پڑی اردگرد روشن ہو گیا اور جس وقت ان کے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا یک دم آگ بجھ گئی جس وقت یک دم آگ بجھ گئی تو وہ ہر قسم کے فائدہ سے محروم ہو گئے، یہ ایک مثال دی ہے، آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کا شخص جس نے آگ جلائی ہو اور کسی فائدے کے حاصل کرنے کے لیے جلائی ہو لیکن جب فائدہ حاصل کرنے کا موقع آئے اور وہ آگ بجھ جائے تو یہ ایک انتہائی درجے کی ناکامی کی صورت ہے اسی طرح ان لوگوں نے اپنی زبان سے ایمان کو ظاہر کیا اور دل میں کفر چھپایا ہوا ہے اور ظاہر اس لیے کیا تھا کہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

لیکن جس وقت وہ مریں گے مرتے ہی ان کا یہ دیا بجھ جائے گا اور وہ ایمان جس سے انہوں نے ظاہری طور پر ایک روشنی مہیا کرنے کی کوشش کی تھی وہ ان کے کسی کام نہیں آئے گا اور یہ گروہ جنہوں نے اپنے دل کے اندر کفر کو چھپایا ہوا ہے جیسے پہلے ان کافروں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی، ان کے کانوں پر مہر کر دی ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اس لیے یہ لوگ کسی صورت میں سمجھتے نہیں اور ایمان نہیں لائیں گے ان کے بارے میں بھی کہا کہ ان کے کان بے کار ہو چکے ہیں کانوں سے باتیں سن کر ان کا دل متاثر نہیں ہوتا، زبان سے یہ گونگے ہیں کہ حق بات اپنی زبان سے کہہ نہیں سکتے یہاں گونگے اس اعتبار سے ہیں ورنہ حقیقت کے اعتبار سے وہ بہرے نہیں تھے کان میں آواز ان کے جاتی تھی لیکن جس وقت وہ اس آواز سے متاثر نہیں ہوتے تھے تو یوں سمجھو کہ یہ بہرے ہیں، سننا مقصود ہوتا ہے متاثر ہونے کے لیے اور اگر کوئی شخص بات سنتا ہے اور اس کے کان میں آواز جاتی ہے لیکن اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایسے ہے جیسے سنی نہیں اور یہ لفظ ہمارے محاورے میں بھی یونہی استعمال ہوتا ہے جیسے میں آپ کو کہوں کہ میں تمہیں بار بار نصیحت کرتا ہوں لیکن تم سنتے ہی نہیں۔

اب یہ سنتے ہی نہیں جو میں کہہ رہا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ آواز آپ کے کان میں نہیں جا رہی آواز

تو جاتی ہے لیکن متاثر نہ ہونے کو نہ سننے سے تعبیر کیا جارہا ہے کہ جو مقصود تھا جب وہ حاصل نہیں ہوا تو سننا اور نہ سننا برابر ہے اسی طرح سے یہاں جب وہ کانوں کے ذریعے سے متاثر نہیں ہوتے تو یوں سمجھو کہ وہ کانوں سے بہرے ہیں اور ان کے کانوں میں سننے کی صلاحیت ہی نہیں رہی، زبان کے ساتھ حق بات کا اعتراف کرنا یہ اصل زبان کا کام ہے اور اگر کوئی شخص حق کا اعتراف نہیں کرتا، حق بات اپنی زبان پر نہیں لاتا تو یوں سمجھو کہ گونگے ہیں۔

جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ عالم آدمی جو کسی کی برائی کو دیکھے اور اس کی برائی کو ظاہر نہ کرے اس کو شیطان اُخرس کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے گونگا شیطان، اس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ زبان سے کام لینا چاہیے تھا کہ حق بیان کرے، حق کا اظہار کرے، حق کا اقرار کرے، جس وقت وہ حق کو بیان نہیں کرتا اور حق کا اقرار نہیں کرتا تو یوں سمجھو کہ یہ گونگا ہے اور اسی طرح بعض حقائق اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر انسان متاثر ہوتا ہے، آنکھ اللہ تعالیٰ نے اس لیے دی کہ تم اس کے ذریعے سے حقائق کو پہچانو اور ان حقیقتوں سے متاثر ہو، بعض باتیں ایسی ہیں جن کو انسان مشاہدہ کر کے تسلیم کرتا ہے تو جب وہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ان حقیقتوں کو پہچانتے نہیں اور ان سے متاثر نہیں ہوتے تو یوں سمجھو کہ اندھے ہیں۔

ایک چیز آپ کے سامنے پڑی ہوئی ہے لیکن آپ اس کا انکار کرتے چلے جاتے ہیں تو آپ کو آپ کے ساتھ کلام کرنے والے کہیں گے اندھے ہو تمہیں نظر نہیں آرہی حالانکہ پتہ بھی ہے گفتگو کرنے والے کو کہ آپ اندھے نہیں ہیں لیکن جس وقت آپ سامنے پڑی ہوئی چیز کو بھی نہیں دیکھتے اور تسلیم نہیں کرتے تو انسان یہ کہتا ہے کہ یہ تو اندھا ہے اس سے کیا بات کرتے ہو، یہاں ان کو اندھے اسی اعتبار سے کہا جارہا ہے جب کان ماؤف ہوگئے اور زبان حق کے اقرار سے محروم ہوگئی اور اسی طرح آنکھیں بھی حقیقت پہچاننے سے اندھی ہوگئیں "فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ" تو یہ لوگ اپنے راستے سے واپس نہیں لوٹ سکتے۔ یہ فیصلہ ہوگیا ان کے بارے میں کہ اب یہ لوگ واپس نہیں لوٹیں گے جدھر کو یہ جارہے ہیں اندھے دھندادھر کو ہی دوڑتے چلے جائیں گے پیچھے سے آوازیں دیتے رہو یہ سنیں گے نہیں، آنکھیں انہوں نے بند کر رکھیں ہیں کچھ دیکھتے نہیں، زبان سے کسی سے پوچھتے نہیں جب یہ تینوں راستے ہی معلومات حاصل کرنے کے ان کے ماؤف ہوگئے تو جدھر کو ان کا رخ ہے ادھر کو چلتے چلے جائیں گے اب ان کے واپس آنے کی کیا صورت ہے؟ تو "صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ" کا یہ مفہوم ہوا۔

تو یہاں آگ کا ذکر ہوا، جلانے کا ذکر ہوا، نور کے پھیلنے کا ذکر ہوا، نور کے بجھنے کا ذکر ہوا ہر چیز کی مثال کسی دوسرے سے ذکر کرنا ضروری نہیں کہ آگ سے کیا مراد ہے، جلانے والے سے کیا مراد ہے؟ یہ ایک مثال ہے

جس کے ساتھ ایک ہیئت اور کیفیت آپ کے سامنے لائی گئی اور ان لوگوں کے اوپر یوں منطبق کی گئی کہ ان لوگوں کا حال بھی اس شخص جیسا ہے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا حدیث شریف میں آتا ہے (مشکوٰۃ شریف ص ۲۸) میں آئے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جیسے ایک شخص آگ جلاتا ہے اور یہ پتنگے، کیڑے مکوڑے زبردستی آ کر آگ میں گرنے لگ جاتے ہیں اور وہ شخص ان کیڑے مکوڑوں، اور پتنگوں کو دور ہٹاتا ہے کہ وہ جلیں نہیں کیونکہ آگ اس لیے جلائی گئی ہے کہ لوگ فائدہ اٹھائیں اس لیے تو نہیں جلائی کہ یہ کیڑے مکوڑے اس میں چھلانگیں لگا لگا کر اپنے آپ کو جلا لیں فرمایا کہ میری مثال بھی اسی طرح ہے کہ میں تمہیں پکڑ پکڑ کر دور ہٹاتا ہوں یہ کہتا ہوں "ھلم عَنِ النَّار" آگ سے دور ہو جاؤ، آگ سے دور ہو جاؤ لیکن تم ہو کہ کیڑے مکوڑوں اور پتنگوں کی طرح اس میں گھستے ہی چلے جا رہے ہو تو اس قسم کی مثالیں دے کر کیفیت کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

تو یہاں بھی اسی طرح ان منافقین کی جو کہ اپنے دلوں کے اندر کفر پر قرار پکڑے ہوئے ہیں ان کی مثال اس طرح دے دی کہ یہ محروم ہیں اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے باقی اب ان کے متاثر ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے یہ اغراض میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ یہ نہ کانوں سے متاثر ہوں، نہ یہ زبان سے اقرار کریں اور بولیں اور نہ یہ آنکھوں سے متاثر ہوں اس لیے ان کا اپنی حالت سے دوسری طرف کو لوٹ کر آنا ممکن نہیں رہا "فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ" کا یہ مفہوم ہے۔

دوسری مثال کا حاصل:

دوسری مثال ذبذبی مترددین کے لیے یا یوں سمجھو کہ چند آدمی سفر کرتے ہوئے جا رہے ہیں رات ہو اور بادل چھا جائیں اور پھر زور کی بارش آ جائے، اب اس مثال کو اپنے ذہن میں لایئے کہ ایک تاریکی تو رات کی ہوگئی اور اس کے اوپر اضافہ بادل کے ساتھ ہو گیا اور پھر جس وقت زور سے بارش آئے گی تو پانی گرنے کے ساتھ تیسری تاریکی ہوگئی، تاریکیاں ہی تاریکیاں جمع ہوگئیں گھٹا ٹوپ اندھیرا جس کو آپ کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنا ہاتھ بھی نکالے تو اس کو دیکھ نہیں سکتا "ظلمات بعضها فوق بعض اذا اخرج يده لم يكد يراها" (سورۃ نور ۴۰) یہ مثال قرآن کریم میں آئی ہے اردو میں اس کے لیے محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا اتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ دکھائی نہیں دیتا دیکھو یہ ہاتھ اس ہاتھ کو تلاش کرنا چاہے تو آپ اگرچہ آنکھیں بند کر لیں حقیقتاً اندھے ہوں تو بھی یہ ہاتھ ہاتھ کو تلاش کر لیتا ہے یہ کہیں ایک دوسرے سے خطا نہیں کرتے لیکن جب مبالغۃً تاریکی کو ذکر کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا یہ ایک مبالغہ ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

یہاں بھی ہاتھ کی مثال اس لیے دے دی کہ انسان اپنے ہاتھ کو قریب سے قریب تر کر سکتا ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کی آنکھوں کے زیادہ سے زیادہ قریب آ جائے یہ ہاتھ قریب، دور جدھر چاہو کر لو جب انسان کو اپنا ہاتھ ہی نظر نہ آئے تو کسی دوسری چیز کے نظر آنے کی کیا توقع، اس طرح تاریکیاں ہی تاریکیاں اکٹھی ہو گئیں رات کی تاریکی اور اس کے اوپر بادل چھا گئے پھر زوردار بارش ہو گئی یہ تاریکیاں ہی تاریکیاں ہو گئیں جا رہے ہیں سفر میں اور یہ حالت آ گئی آپ کو معلوم ہے کہ بادلوں میں کڑک ہے اور بجلی چمکتی ہے اور بجلی کے گرنے کا اندیشہ بھی ہے اب یہی لوگ جو پھنسے ہوئے ہیں جس وقت وہ زور سے کڑک آتی ہے اور موت کا ڈر ہے کہ کہیں بجلی گر کر مر نہ جائیں تو اپنی انگلیاں کانوں میں دے کر وہ اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔

انگلیاں دیتے ہیں کانوں میں یہ بجلی کے ڈر سے یہ کڑک جس وقت آتی ہے خوفزدہ ہو کر اپنے کانوں کو بند کرتے ہیں ان میں انگلیاں دیتے ہیں اور جب ذرا سا راستہ نمایاں ہو جاتا ہے آگے کو چل پڑتے ہیں اور جس وقت روشنی ختم ہو جاتی ہے تاریکی چھا جاتی ہے پھر حیران ہو کر وہیں ٹھہر جاتے ہیں اب یہ لوگ جو بارش کے اندر گھرے ہوئے ہیں دیکھو کس قسم کی یہ پریشانی کی کیفیت ہوتی ہے تو بعض لوگ اسی قسم کے تھے قرآن کریم اسی طرح ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے بارش اتاری اور اس کے اندر جو وعیدیں ہیں اور دنیا اور آخرت کے عذابوں کا جو تذکرہ آیا تو اس سے بعض لوگ خوفزدہ بھی ہوتے ہیں اور پھر ان سے بچنے کے لیے کوئی وہمی تدبیریں بھی اختیار کرتے ہیں جب اس کے قبول کرنے میں ذرا سا نفع معلوم ہوتا ہے تو قدم آگے کو بھی بڑھتے ہیں اور جس وقت کوئی مصیبت یا تکلیف کا سامنا ہوتا ہے اس دین کو قبول کرنے سے پھر وہ پیچھے کو بھی ہٹ جاتے ہیں تو یہ جو تردد کی کیفیت ہے اس کو اس مثال کے ساتھ واضح کیا گیا۔

ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وعید سنا دی گئی کہ انکار کرنے والے جتنے بھی ہیں سب اللہ کے احاطے میں ہیں جس طرح سے کوئی شخص گرنے والی بجلی سے کڑکنے والی بجلی سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے کر بچ نہیں سکتا یہ ایک ایسی وہمی سی تدبیر ہے جب بجلی گرے یا بجلی کڑکے اور کوئی کہے کہ میں اپنے کانوں میں انگلیاں دے کر نہ اس کی آواز سنوں گا اور نہ میں اس بجلی کا شکار بنوں گا اس قسم کی تدبیروں کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے بچا نہیں جا سکتا اللہ تعالیٰ نے ان کو گھیر رکھا ہے اور اگر اللہ چاہے تو ان کی آنکھیں بھی ختم کر دے اور ان کے کان بھی ختم کر دے یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں ہے اس طرح یہاں ان کو وعید بھی سنا دی گئی تو یہ مثال ان لوگوں کی ہو گئی جو کہ متردد قسم کے ہیں اور وعیدوں اور قرآن کریم کی ان جھڑکیوں سے وہ ڈرتے بھی ہیں دنیا و آخرت کے عذاب کے ساتھ جو وعیدیں سنائی جا رہی ہیں اور کچھ نفع کی توقع ہوئی تو آگے کو بھی بڑھتے ہیں اور جہاں وہ نفع ختم ہوتا نظر آتا ہے مشقت اور مجاہدہ سامنے آتا تو ان کے قدم رک جاتے ہیں اور وہ پیچھے کو ہٹتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے تم کو اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا فرمایا

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ

تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ﴿۲۱﴾ جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو

بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ

چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالا اس کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے رزق

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا

پس تم اللہ کے لیے مقابل نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۲۲﴾ اور اگر تم اس کتاب کی طرف سے شک میں ہو جو

نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ

ہم نے اپنے بندہ پر نازل کی تو لے آؤ کوئی سورت جو اس جیسی ہو اور بلا لو اپنے مددگاروں کو

دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو ﴿۲۳﴾ پس اگر تم نہ کرو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو ڈرو آگ سے

الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ

جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے ﴿۲۴﴾ اور خوشخبری دیجیے ان لوگوں کو

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط

جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ بے شک ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ

جب کبھی بھی ان کو ان باغوں میں سے کوئی پھل بطور غذا کے دیا جائے گا تو کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ط وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان کو ہم شکل پھل دیے جائیں گے اور ان کے لیے ان باغوں میں بیویاں ہوں گی جو پاکیزہ بنائی ہوئی ہیں اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵﴾

ماقبل سے ربط:

سورۃ کی ابتداء سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کے تین گروہوں کا تذکرہ کیا، مؤمنین کا ذکر کیا ان کی صفات کو بیان فرمایا، پھر کافروں کا ذکر کیا اور اس کے بعد جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہیں یعنی منافقین ان کا تفصیلی ذکر کیا، ان کی عادات کو بیان کیا، اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور توحید کے دلائل کو بیان کیا جارہا ہے سب سے پہلے فرمایا ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ'' (اے لوگو! اپنے ربّ کی عبادت کرو) یہ خطاب عام ہے، مؤمن اور کافر سب کو شامل ہے کہ سارے کے سارے لوگ اپنے رب کی عبادت کریں، اور پھر صفت ربوبیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہارا رب وہ ہے جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا فرمایا کہ تمہارا خالق صرف اور صرف اللہ ہے اور اس کی خالقیت کا تقاضہ ہے کہ اسی کو اپنا معبود تسلیم کیا جائے اور اپنی جبین نیاز کو اسی کے سامنے جھکایا جائے۔

لفظ عبادت کا مفہوم:

''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ'' اس آیت کریمہ میں لوگوں کو عبادت کا حکم دیا گیا اور لفظ عبادت یہ عبد سے ہے، عبد عربی زبان میں اس غلام کو کہتے ہیں جو مکمل طور پر اپنے آقا کا تابع ہوتا ہے کہ جو آقا اسے دے گا وہی کھائے گا، جو آقا اسے پہنائے گا وہ وہی پہنے گا اور جو خدمت آقا اس سے لینا چاہے گا وہ اس خدمت کو سرانجام دے گا یعنی اس کی ساری زندگی، زندگی کے صبح وشام آقا کے تابع ہوں گے اور وہ اپنی زبان پر حرف شکایت نہیں لاسکتا اور وہ اتنا مجبور ہوتا ہے کہ آقا کی اجازت کے بغیر نہ وہ کچھ بیچ سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے نہ کوئی اور معاملہ کرسکتا ہے اگر کر بھی لے گا تو وہ بھی آقا کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر آقا تسلیم کرلے تو درست ہوگا ورنہ باطل قرار پائے گا، جو شخص اس قدر مجبور ہو اس کو عربی زبان میں عبد کہا جاتا ہے اور یہاں بھی عبد بننے کا مطالبہ ہے کہ اپنی ساری خواہشات کو اپنے خالق اور مالک کے تابع کردو، جن چیزوں کا حکم دے ان کو اپنالو اور جن چیزوں سے منع کرے ان سے رک جاؤ، اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے عبد اور غلام بنا کر رکھو جس حال میں بھی وہ رکھے اسی حال میں خوش رہو اپنی زبان پر حرف شکایت نہ لاؤ، یہ ہے عبادت کا مفہوم اور اسی کا مطالبہ ہم سے اس آیت کے اندر کیا گیا ہے۔

''لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ'' (تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ) فرمایا کہ اس عبادت کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ جب تم ہر وقت اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو گے، اس کے فرمانبردار بن جاؤ گے، اپنی خواہشات کو اس کے

حکموں کے تابع کردو گے تو پھر تمہیں تقویٰ والی صفت حاصل ہو جائے گی، اور تم اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے بن جاؤ گے، پھر تقویٰ کے مختلف درجات ہیں، اس کا ایک معنیٰ گناہوں سے بچنا بھی ہے کہ جب کوئی شخص ہر وقت اللہ کی عبادت میں لگا رہے گا اس کو خوش رکھنے کی فکر میں ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گناہوں سے بچے گا، اور اس کا ایک معنیٰ دوزخ کے عذاب سے بچنا بھی ہے کہ جب کوئی شخص گناہوں سے بچے گا تو ظاہر ہے دوزخ کے عذاب سے بھی محفوظ رہے گا اسی لیے بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ لکھا ہے ''تاکہ تم دوزخ سے بچو''۔

توحید کے دلائل:

''اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا'' اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ تو ہر چھوٹی بڑی چیز میں ہوتا ہے اور اللہ کی قدرت ہر چیز سے نمایاں ہوتی ہے اور پہچاننے والوں نے تو اپنے رب کو شہتوت کے پتے سے پہچانا ہے، کسی نے صرف ایک چھوٹے سے کیڑے سے اللہ کو پہچانا ہے لیکن اس آیت میں دلائل قدرت میں سب سے عیاں اور واضح چیز جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اس کو بیان کیا ہے۔

اس آیت میں تین چیزیں بیان کی گئی ہیں۔

① ......''اس نے زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا'' اب زمین کا وجود سب کے سامنے ہے، ان پڑھ سے ان پڑھ اور جاہل سے جاہل شخص بھی سمجھتا ہے کہ وہ زمین پر آباد ہے، پھر یہ زمین ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہے، اور اس زمین کے اندر بہت سارے منافع ہیں جن سے ہم صبح وشام ہر وقت فائدہ حاصل کرتے ہیں اور یہ زمین کا وجود ہی خود بتاتا ہے کہ اس کو بنانے والا بہت بڑی قدرت کا مالک ہے۔

② ......زمین کے تذکرے کے ساتھ ہی پھر آسمان کا ذکر فرمایا کہ اللہ نے آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا ہے جیسے مکان کی چھت ہوتی ہے تو زمین کی چھت آسمان ہے اور پھر چھت میں روشنی کے لیے بلب لگائے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے بھی آسمان کو سورج، چاند اور ستاروں سے مزین کیا ہے اس کے علاوہ آسمان کے اور بھی بہت سارے فوائد ہیں مثلاً غم کا کم ہونا، وہم اور خوف کا زائل ہونا، اور آسمان دعا کرنے والوں کا قبلہ ہے۔

③ ......زمین اور آسمان کے تذکرے کے بعد پھر بارش کا ذکر فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے مختلف قسم کے پھل پیدا فرمائے جو لوگوں کے لیے رزق ہیں، ان کے ذریعے انسان نشوونما پاتا ہے اور قوت حاصل کرتا ہے، اس زمین کی رونق بارش کی وجہ سے ہی قائم ہے کہ جب بارش ہوتی ہے تو بارش کا پانی

انسانوں اور جانوروں کے کام آتا ہے، اس سے زمین سیراب ہوتی ہے اور اس کے ذریعے پھل، پھول، بیل بوٹے اگتے ہیں، اور اس سے اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ زمین ایک ہی ہے، اترنے والا پانی بھی ایک ہی قسم کا ہے، لیکن زمین سے جب سبزہ نکلتا ہے تو اس کے رنگ بھی مختلف ہیں، ذائقے بھی مختلف ہیں، یہ تینوں اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے انعام ہیں جو کسی سے بھی مخفی نہیں ہیں۔

''فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا'' زمین، آسمان اور بارش کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم نے اپنے خالق کی قدرت کو پہچان لیا اور اس کے انعامات تم پر واضح ہوگئے تو اب عقل اور سمجھ کا تقاضہ یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کو ہی اپنا خالق اور مالک تسلیم کرو، صرف اسی کی عبادت کرو، صرف اسی کی ربوبیت کا اقرار کرو اب اس کے مقابل شریک مت ٹھہراؤ، اس کے علاوہ رب بھی کوئی نہیں، پالنے والا بھی کوئی نہیں، پیدا کرنے والا بھی کوئی نہیں نعمتیں دینے والا بھی کوئی نہیں، ان سب باتوں کو جانتے ہوئے پھر بھی شرک کرنا اور اس کے مقابل کسی کو اس کی ذات وصفات میں شریک ٹھہرانا یہ عقل اور فہم کے خلاف ہے، اس لیے ان نعمتوں کا تقاضہ یہی ہے کہ صرف اس ایک اللہ کو ہی اپنا خالق اور رب تصور کرکے صرف اور صرف اسی کی بندگی کی جائے۔

حقانیت قرآن پر کھلا چیلنج اور کفار کا عجز:

''وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا'' عقیدہ توحید کو ثابت کرنے کے بعد اب اس آیت میں عقیدہ رسالت کو ماننے کی دعوت دی جارہی ہے کیونکہ جب اپنے خالق اور مالک کو پہچان لیا تو اب اس کی ذات وصفات کو جاننا بھی لازم ہے اور اس کی مرضیات ونامرضیات کو جاننا بھی ضروری ہے، اب اللہ کی مرضیات ونامرضیات کیا ہیں؟ ہمیں خود بخود اس کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ بسا اوقات جب ہمارا کوئی دوست مہمان آتا ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ ٹھنڈا پسند کریں گے یا گرم؟ دوست ہے، جان پہچان ہے اکٹھے رہتے ہیں پھر بھی اس کے بتائے بغیر ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ اس کو کیا پسند ہے تو اللہ کی مرضیات ونامرضیات کو ہم خود بخود کیسے پہچان سکتے ہیں؟ اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے اظہار کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور ہر نبی کو اس کی نبوت کے ثبوت کے لیے اس ماحول کے مطابق معجزات دیے کہ جس زمانہ میں جس چیز کا رواج تھا اللہ نے اپنے نبی کو ویسی ہی چیز عطا فرمائی جس کا مقابل لانے سے اس کے مقابل عاجز رہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو کا زور تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اس قسم کے معجزات عطا فرمائے جیسے

عصا، اور ید بیضاء، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب اور حکمت کا زور تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اس قسم کے معجزات عطا فرمائے، مثلاً مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں کا بینا کرنا، کوڑھیوں کو تندرست کرنا، اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں فصاحت و بلاغت کا بڑا چرچا تھا حتی کہ اہل عرب اپنے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کو گونگے تصور کرتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جہاں اور بہت سارے معجزات عطا فرمائے گئے ان میں سے سب سے بڑا معجزہ آپ کا قرآن کریم ہے جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے تمام عرب کے شعراء عاجز آگئے اور قرآن کریم کا چیلنج آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے، جب قرآن کریم نازل ہوا تو بعض جاہلوں نے کہا ''لو نشاء لقلنا مثل ھذا'' اور کچھ لوگوں نے قرآن کے مقابلہ میں کچھ عبارتیں بنائیں پھر خود ہی جب آپس میں مل کر بیٹھے تو کہنے لگے کہ یہ تو قرآن جیسی نہیں ہیں اور آج تک کوئی اس جیسی ایک آیت بھی بنا کر نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا، آیت مذکورہ میں اہل عرب کو قرآن جیسی ایک سورۃ بنا کر لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور یہ بھی چھوٹ دی ہے کہ اس کے بارے میں اللہ کے علاوہ اپنے سب حمایتیوں اور مددگاروں کو بلالو، ابتداء میں دس سورتیں بنانے کا حکم دیا تھا پھر بعد میں ایک سورۃ بنانے کا حکم دیا لیکن عرب کے تمام فصحاء و بلغاء اس جیسی ایک چھوٹی سی سورۃ بھی بنا کر نہ لا سکے اور اس سے عاجز رہے۔

''فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا'' اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کے ہمیشہ باقی رہنے کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور یہ بھی پیشین گوئی کی گئی ہے کہ قیامت تک کوئی فرد یا جماعت اس جیسا دوسرا قرآن نہیں بنا سکتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جیسے قیامت تک باقی رہے گی اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ قرآن کریم بھی قیامت تک باقی رہے گا، قرآن موجود ہے اس کی دعوت عام ہے پھر بھی اس کو قبول نہ کرنا اپنے آپ کو جہنم کے عذاب میں ڈالنے والی بات ہے اس لیے فرمایا کہ تم اس قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے خوامخواہ اس کا انکار کر کے عذاب کے مستحق نہ بنو اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، انسان تو وہی جو منکر ہیں اور پتھروں سے وہ پتھر مراد ہیں جن کی مشرکین دنیا میں عبادت کیا کرتے تھے، وہ پتھر بھی جہنم میں ہوں گے'' اعدت للکافرین'' اور یہ دوزخ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اہل جنت کے انعامات کا ذکر:

''وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' اس رکوع میں عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت اور نہ

ماننے والوں کے لیے عذاب کے تذکرے کے بعد اب اس آیت میں ایمان لانے والے اور نیک اعمال کرنے والے لوگوں کے لیے جزا کا ذکر ہے جو مختلف نعمتوں کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

پہلے تو یہ بیان کیا کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لیے جنت کے اندر باغات ہوں گے اور ان باغات میں نہریں جاری ہوں گی، پھر یہ مختلف قسم کی نہریں ہوں گی، صاف شفاف پانی کی نہر ہوگی، دودھ کی نہر ہوگی، شراب طہور کی نہر ہوگی اور شہد کی نہر ہوگی، اور وہ شراب ایسی ہوگی جو پینے والوں کے لیے لذت کا باعث ہوگی نہ اس سے نشہ آئے گا نہ سر میں درد ہوگا جب کہ دوسری جگہ ہے ''لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون''۔

دوسرا یہ بیان فرمایا کہ ان درختوں کے جو پھل ہوں گے ان پھلوں میں سے جب کبھی بھی کوئی پھل ان کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا کیونکہ وہ پھل آپس میں ہم شکل ہوں گے اگرچہ لذت اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ من قبل سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو پھل دیا گیا تھا یہ اسی جیسا ہے اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہیں جنت میں جو پھل دیے جائیں گے ان کے بارے میں کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کھایا تھا اور علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پہلا قول زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ جنت کے اندر سب سے پہلے جو پھل دیا جائے گا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے دیا گیا تھا یہ اس وقت ہی صحیح ہوگا جب ''من قبل'' سے دنیا والے پھل مراد ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جنت کے پھلوں جیسا دنیا میں کوئی پھل نہیں بس ناموں کی مشابہت ہے یعنی پھلوں کو دیکھ کر اہل جنت کہیں گے کہ یہ سیب ہے، یہ انار ہے ہم نے اس کو دنیا میں کھایا تھا لیکن وہ مزے میں دنیاوی پھل کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ان کا مزہ اور ذائقہ جنت کے اعتبار سے ہوگا جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے۔

''وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ'' (ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی) جنت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت پاکیزہ بیویوں کا ملنا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ گندگی اور تکلیف دینے والی چیز سے پاک ہوں گی یعنی ان کا ظاہر اور باطن سب کچھ عمدہ اور بہترین ہوگا، شوہروں کی اطاعت کریں گی اور ان کا

حسن وجمال بیان کرتے ہوئے سورۃ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''کانھن الیاقوت والمرجان'' کہ گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں ایسی پاکیزہ بیویاں اہل جنت کو ملیں گی۔

''وَهُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ'' اور سب سے بڑی بات یہ کہ مؤمن ان نعمتوں کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے نہ وہاں سے نکلیں گے اور نہ نکالے جائیں گے، نہ ان نعمتوں کو فنا کیا جائے گا نہ مؤمن فنا ہوں گے، نعمتیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوں گی اور فائدہ حاصل کرنے والے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے، حدیث میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ کی طرف سے ندا دینے والا ندا دے گا کہ تمہارے لیے یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے اور یہ کہ ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی تمہیں موت نہ آئے گی اور جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے اور نعمتوں میں رہو گے پس تم کو کبھی محتاجی نہ ہو گی (مشکوٰۃ ص ۴۹۶) اور اس کے برعکس دنیا کی نعمتوں کے اندر ایسی بات نہیں ہے یہاں کی ساری نعمتیں فانی ہیں اس لیے اہل جنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان نعمتوں کے اندر رہنا یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑا انعام ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِ أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ

بے شک اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی بھی مثال بیان فرمائے مچھر ہو یا اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز ہو پس جو لوگ

آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ

ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ بے شک یہ مثال ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اور لیکن وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ کہتے

مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ

ہیں کہ کیا ارادہ کیا اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے کا، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور بہت ساروں کو ہدایت دیتے ہیں

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن

اور اس کے ذریعہ نہیں گمراہ کرتے مگر نافرمانوں کو ﴿۲۶﴾ جو لوگ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کی مضبوطی کے

بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ

بعد اور توڑتے ہیں ان چیزوں کو جن کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے اور فساد کرتے ہیں

فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ

زمین میں یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿۲۷﴾ تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کے ساتھ

وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾

حالانکہ تم بے جان تھے پس اس نے تم کو زندگی دی پھر تم کو موت دے گا پھر تم کو زندہ فرمائے گا پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۸﴾

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے پیدا فرمایا جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف

فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

پس ان کو ٹھیک طرح بنا دیا سات آسمان اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

تفسیر:

اس مثال سے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے، ان آیات میں اسی شبہ کو دور کیا جا رہا ہے اور حاصل اس کا کیا ہے؟ شبہ کو دور کس طرح سے کیا گیا؟ مثال کی حقیقت کیا ہوتی ہے؟ مثال کی

حقیقت یہ ہوتی ہے کہ مثال ممثل لہٗ کے مطابق ہونی چاہیئے نہ کہ مثال دینے والے کے، جس کی مثال دینا مقصود ہوتی ہے وہ مثال اس کے حال کی وضاحت کرے، مثال دینے والا کون ہے اس کے ساتھ مثال کی مطابقت ضروری نہیں ہوتی۔

مچھر اور مکھی کی مثال سے معبودان باطلہ کا عجز ثابت ہوتا ہے:

یہاں مثال دینے والے اگرچہ اللہ تعالیٰ ہیں لیکن جس چیز کی مثال دی جارہی ہے وہ عاجز اور نکمے بت ہیں اور اللہ کے علاوہ دوسرے جو الٰہ اختیار کر لیے گئے ہیں ان کا عجز ثابت کرنے کے لیے یہ مثال بیان کی گئی ہے کہ جن کو تم نے اپنا کارساز سمجھ رکھا ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ مشکل وقت میں یہ ہمارے کام آئیں گے، ان کی تو حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک مکھی کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، مکھی کو پیدا کرنا تو دور کی بات ہے اگر مکھی ان کے چڑھاوؤں میں سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس سے وہ واپس نہیں لے سکتے۔

جب وہ اتنے عاجز ہیں تو تم ان کو اپنا کارساز اور مشکل کشا کس طرح سے سمجھتے ہو؟ اور ایسے ہی مکڑی کی مثال دی گئی وہاں بھی اسی حقیقت کی وضاحت کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو سہارے تلاش کر لیے گئے ہیں اور لوگوں نے جو سہارے اختیار کر رکھے ہیں کہ یہ مصیبت کے وقت ہمارے کام آئیں گے ان کی مثال دی گئی ہے کہ جیسے مکڑی گھر بنالیتی ہے اور تمام چیزوں سے زیادہ کمزور تر گھر مکڑی کا ہوتا ہے ''ان او ھن البیوت لبیت العنکبوت'' آندھی کا ایک جھونکا آئے تو وہ سارے کا سارا جالا اڑ جاتا ہے اور اگر ایک بچہ جھاڑو لے کر پھیر دے تو سارے کا سارا جالا اکٹھا ہو جاتا ہے، دار عنکبوت اپنی کمزوری میں ایک ضرب المثل ہے۔

تو اللہ تعالیٰ ان شرکاء کا عجز بیان کرنے کے لیے فرماتے ہیں کہ یہ سہارے تو دار عنکبوت ہیں، تم ان کو سمجھتے ہو کہ مشکل وقت میں یہ ہمارے کام آئیں گے، یہ مشکل وقت میں کام آنے والے نہیں ہیں اگر ان کا عجز ثابت کیا جاسکتا ہے تو مکھی اور مچھر کی مثال سے ہی کیا جاسکتا ہے، اگر یوں کہا جائے کہ تمہارے الٰہ ہمالیہ پہاڑ پیدا نہیں کرسکتے، سورج نہیں بنا سکتے، چاند نہیں بنا سکتے تو اس میں ان کا اتنا عجز نمایاں نہیں ہے جتنا مکھی کی مثال دینے میں یا مکڑی کی مثال دینے میں ان کا عجز نمایاں ہے تو جب مثال کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ممثل لہٗ کی وضاحت کے لیے ہوتی ہے تو اس مقصد کے تحت یہ مثال عین موقع محل کے مطابق ہے، اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ ایمان لے آئے اور ان کا طرز فکر صحیح ہو گیا وہ اس مثال کو عین موقع کے مطابق سمجھتے ہیں اور اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں۔

''فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ'' حق کا معنی یہاں یہ ہے کہ یہ مثال عین موقع کے مطابق ہے لیکن جو لوگ کافر ہیں اور ان کو حقیقت سمجھنے کا سلیقہ نہیں ہے، طرز فکر ان کا غلط ہے وہ ان مثالوں سے مزید کفر کی طرف چلے جاتے ہیں اور استہزاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ان مثالوں سے کیا ارادہ ہے؟

مچھر اور مکھی کی مثال کیوں بیان کی؟:

''یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا'' تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان سے ارادہ یہی ہے کہ ان کے ذریعے سے بہتوں کو ہدایت دی جائے اور بہتوں کو گمراہ کیا جائے یہ بات ایسے ہے جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا مثال دیتے ہوئے کہ ایک ڈاکٹر نے نگاہ کے شیشے تیار کئے اور ایک سمجھدار آدمی وہاں جائے گا وہ شیشے کو طریقے کے مطابق استعمال کرے گا تو اس کی بینائی تیز ہوگی اور وہ ان شیشوں سے فائدہ اٹھائے گا اور اگر ایک جاہل اناڑی، اجڈ آدمی چلا جائے اور وہ ان شیشوں کو اٹھا کر اپنی آنکھوں میں مارنا شروع کردے اور اس کا ڈیلا پھوٹ جائے بعد میں وہ ڈاکٹر پر ناراض ہو کہ ڈاکٹر صاحب یہ شیشے کیوں بنائے ہیں تو ڈاکٹر یہی کہے گا کہ اس لیے بنائے ہیں تاکہ سمجھداروں کی بینائی تیز ہو اور تیرے جیسے بے وقوفوں کی آنکھیں پھوٹیں۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر کا یہ قول اصل میں اس کے غلط استعمال کی بناء پر اس پر ایک الزام ہے کہ جب جاہل آدمی اپنی جہالت کی بناء پر ایک چیز کو غلط استعمال کرے گا تو نقصان اٹھائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی یہ بیان کردہ مثال ہے اگر اس کو ممثل لہٗ کے ساتھ مطابقت لے کر دیکھا جائے اور اس مثال کے ذریعے سے شرکاء کے عجز کو سمجھ لیا جائے تو یہ مثال مزید ہدایت کا باعث بنے گی اور اگر اپنی بے وقوفی اور جہالت کے ساتھ محض اس کے ظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہ اللہ عظیم الشان ہے اور وہ مثال مکھیوں کی بیان کرتا ہے یہ اس کی شان کے لائق نہیں، اس قسم کی کج روی کے نتیجے میں گمراہی بڑھتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ گمراہ نہیں کرتا اس کے ذریعے سے مگر نافرمانوں کو، جن کو بغاوت کی عادت ہے، اطاعت سے نکلنے کی عادت ہے وہی اس کے ذریعے سے گمراہ ہوتے ہیں اور اضلال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اسی اعتبار سے ہے جو آپ کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ ہر کیفیت اور ہر چیز کا خالق چونکہ اللہ ہے اس لیے چاہے ضلالت ہو، چاہے ہدایت ہو جو کچھ پیدا ہوگا سب اللہ کے پیدا کرنے سے ہوگا خالق ہونے کے اعتبار سے اس کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔

فاسق کی پہچان:

''الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ'' اس آیت میں فاسقین کی وضاحت کردی گئی کہ فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیتے ہیں اس کی پختگی کے بعد، اس عہد سے مراد وہ عہد ہے جو عالم ارواح میں آدم علیہ السلام کی اولاد سے لیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے سب سے خطاب کرکے کہا تھا ''الست بربکم''

اورسب نے جواب دیا تھا" بلی" اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر لینا اس کے ضمن میں اللہ کی اطاعت کا اقرار ہے تو وہاں جو عہد کیا گیا تھا دنیا میں آ کر اس کو توڑ دیا، اس میں حقوق اللہ کے تلف کی طرف اشارہ ہے۔

"وَيَقْطَعُونَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ" جن چیزوں کے وصل کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کو ملایا جائے جیسے صلہ رحمی ہے، دوسرے انسانوں کے حقوق ہیں جن کو ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ ان کو قطع کرتے ہیں اور اس قطع رحمی کے نتیجے میں، صلہ رحمی وغیرہ کے ختم کرنے میں، دیگر اپنے ہم عصروں کے حقوق ادا نہ کرنے میں، زمین کا فساد ہے اسی لیے فرمایا کہ وہ زمین میں فساد کرتے ہیں، یہ ہے" فاسقون" کی تعریف کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کی بھی رعایت نہیں رکھتے اور جن تعلقات کو اللہ تعالیٰ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے ان کو قطع کرتے ہیں اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہیں، یہی لوگ ہیں خسارے والے جو دنیا میں بھی خسارہ اٹھائیں گے اور آخرت میں بھی خسارہ پائیں گے۔

مسئلہ معاد کی وضاحت:

"كيف تكفرون بالله" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معاد کے مسئلے کو واضح کیا جس طرح اجمالاً پہلے ذکر کر دیا گیا تھا کہ اس رکوع کے اندر عقیدوں کی وضاحت ہے۔

فرمایا کہ تم اللہ کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے، بے جان ہونے سے مراد یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے انسان مختلف ذرات کی شکل میں، کہیں اجزاء کی صورت میں، کہیں دوا کی صورت میں اور اس کے بعد خون کی صورت میں، پھر نطفے کی صورت میں جہاں جہاں موجود ہوتا ہے بے جان ہوتا ہے

"فَاَحْيَاكُمْ" پھر اس نے تمہیں زندگی دی یعنی عدم سے موجود کیا، بے جان ہونے کے بعد تمہیں جاندار بنایا۔

"ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ" پھر وہ تمہیں موت دے گا، دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد جو موت آتی ہے اس اماتت سے مراد وہی موت ہے۔

"ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ" اس احیاء سے قیامت کی احیاء مراد ہے، قیامت کے دن پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف ہی لوٹائے جاؤ گے، اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق اس موت کے بعد اور قیامت کی زندگی سے پہلے جو زمانہ عالم برزخ میں گزرتا ہے اس میں بھی من وجہ حیات نصیب ہوتی ہے جس کی وجہ سے قبر کے عذاب اور قبر کے ثواب کا ادراک ہوتا ہے اس کا یہاں ذکر نہیں بلکہ حیات کاملہ کا ذکر ہے جو قیامت کو ہوگی، اس کو اس لیے ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ من وجہ حیات ہے اور من وجہ موت کے مشابہ ہے کامل حیات نہیں ہے اس لیے اس کو ذکر نہیں کیا گیا ورنہ روایات صحیحہ میں اور قرآن کریم کی آیات کے اشاروں میں ایسے اشارے جو کہ صراحت کے

قریب ہیں ان میں عذاب برزخ کا ذکر ہے اور اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس موت کے بعد قیامت سے پہلے برزخ کے اندر بھی انسان کو من وجہ حیات ملتی ہے۔

جس سے اس کو راحت کا، ثواب کا، عذاب کا، الم کا ادراک ہوتا ہے اور بالکل انسان بے حس بے جان پڑا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کو کسی چیز کی خبر نہ ہو جو اس قسم کے ثواب وعذاب برزخ کا منکر ہے اس کو کافر قرار دیا گیا ہے کہ یہ بھی ضروریات دین میں سے ہے یہ تواتر معنوی سے ثابت ہے اس کی تفصیل حدیث شریف ''باب اثبات عذاب القبر'' کے اندر ذکر کی جاتی ہے۔

''ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ'' پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے اس میں صراحۃً معاد کا ذکر آ گیا۔

انعامات ربانی کا ذکر:

''هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا'' اللہ وہ ہے جس نے تمہارے نفع کے لیے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں، یہاں سے پھر وہ انعامات کا سلسلہ شروع ہوا۔

پہلے مادی انعامات کا ذکر ہے جس سے انسان اس دنیا میں فائدہ اٹھاتا ہے زمین کی چیزیں کھانے سے تعلق رکھتی ہیں، پینے سے تعلق رکھتی ہیں، ہر قسم کی آرائش کی زیبائش کی، آسائش کے سامان جتنے بھی انسان اختیار کرتا ہے سب زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفع کے لیے ان سب چیزوں کو پیدا کیا پھر متوجہ ہوا آسمان کی طرف پھر برابر کیا ان کو، ٹھیک کر کے بنایا ان کو سات آسمان، یعنی پہلے ایک مادے کی شکل میں تھا کیونکہ ''مایؤل'' کے اعتبار سے وہ سات بننے والے تھے اس لیے ''فسوھن'' کے اندر ضمیر سماء کی طرف جمع کی لوٹا دی گئی کہ یہ ''مایؤل'' کے اعتبار سے جمع ہے، دخان کی شکل میں تھا دخان جس طرح سے قرآن کریم میں ہے پہلے دھویں کی شکل میں ایک ہی تھا پھر اس کو ٹھیک کر کے سات آسمان بنا دیئے ''وَهُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ'' اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔
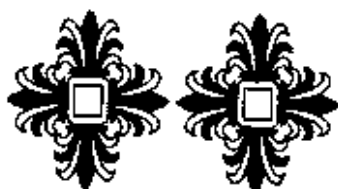
وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں پیدا کرنے والا ہوں زمین میں خلیفہ تو انہوں نے کہا

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ

کیا آپ پیدا فرمائیں گے اس زمین میں اس کو جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا اور ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں

بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ

اور تیری تقدیس کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کہا بے شک میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے ﴿۳۰﴾ اور اللہ نے

اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ أَنْۢبِـُٔونِي

آدم کو سکھا دیے سارے نام پھر ان کو فرشتوں پر پیش کیا اور کہا تم مجھے خبر دو ان

بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ

چیزوں کے ناموں کی اگر تم سچے ہو ﴿۳۱﴾ فرشتوں نے کہا آپ تو پاک ہیں ہمیں کوئی علم نہیں

إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ أَنْۢبِئْهُمْ

مگر جو تو نے سکھا دیا ہمیں بے شک تو علم والا ہے حکمت والا ہے ﴿۳۲﴾ اللہ نے کہا اے آدم! ان کو ان چیزوں کے

بِأَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ أَنْۢبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ إِنِّيٓ

ناموں کی خبر دو جب آدم نے ان چیزوں کے ناموں کی خبر دے دی تو اللہ نے کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ بے شک میں

أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۙ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ

جانتا ہوں آسمانوں اور زمین میں چھپی ہوئی چیزوں کو اور جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو

تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ ۖ

تم چھپاتے ہو ﴿۳۳﴾ اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو کہ تم سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے

أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ﴿۳۴﴾

اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور ہو گیا وہ کافروں میں سے ﴿۳۴﴾

لغوی تحقیق:

"وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" اذ ظرف کے لیے ہے اور اپنا معنی ظاہر کرنے کے لیے اس کو کسی نہ کسی چیز کے متعلق کرنا پڑتا ہے، عام طور پر اہل ترجمہ اس کو "اُذْكُرْ" کے متعلق کرتے ہیں "یاد کیجئے اس وقت کو جب کہ کہا تیرے رب نے" پھر ترجمہ یوں ہوگا "لیذ کر اذ قال ربك" چاہیئے کہ ذکر کیا جائے وہ وقت جب کہ کہا تیرے رب نے "ملئكة" کو، فرشتوں کو، تو یہاں اسی طرح سے اس کا عامل محذوف نکال لیجئے اس کے مطابق بھی ترجمہ صحیح ہے یا اس اِذْ کو "قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا" کے ساتھ متعلق کر دیا جائے تو عامل محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں ترجمہ پھر بھی صاف ہو جاتا ہے۔

"ملئكة" یہ ملئك کی جمع ہے ملئك اور آخر میں تا کا اضافہ یہ جمع تانیث ہے ورنہ یہ جمع اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہمزہ اس میں ہے یہ مَلَكٌ نہیں بلکہ مَلْئَكٌ ہے اس کی جمع آگئی مَلَائِك اور تاء تانیث جمع کے آخر میں بڑھا دی گئی تو مَلٰئِكَة ہو گیا اور مَلْئَكٌ صرفی تاویل کے تحت ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دے دی ہمزہ کو گرا دیا تو "مَلَكٌ" بن گیا، مَلَكٌ کہتے ہیں فرشتے کو۔

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" خلیفه خَلَفَ پیچھے آنا، خلیفه پیچھے آنے والا جس کو نائب کہتے ہیں، میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب "قَالُوْٓا" تو فرشتوں نے کہا "اَتَجْعَلُ فِیْهَا" کیا آپ بنائیں گے اس زمین میں "مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا" جو اس زمین میں فساد کرے گا "وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ" الدِّمَآءَ یہ دَمٌ کی جمع ہے کہ خونریزیاں کرے گا، خون بہائے گا۔

"وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ" اس میں دو لفظ آرہے ہیں ایک تسبیح اور ایک تقدیس، دونوں لفظ قریب قریب ہیں پاکی بیان کرنا، لطائف سے طہارت بیان کرنا کہ کوئی کسی قسم کا نقص موجود نہیں ہے اس ذات میں فرق صرف اتنا کیا گیا ہے کہ تسبیح یہ قول اور عمل کے درجے میں ہے اور تقدیس یہ عقیدے کے درجے میں ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم دل کے عقیدہ سے بھی آپ کو پاک قرار دیتے ہیں اور اپنی زبان کے ساتھ بھی آپ کی پاکی کا اقرار کرتے ہیں، تو یہ تسبیح ہوگئی "لساناً وار کاناً وجیناناً" قلب کے اعتبار سے بھی تسبیح ہوگئی، زبان کے اعتبار سے بھی، اور ظاہری اعمال کے اعتبار سے بھی تسبیح ہوگئی اور تسبیح کا معنی ہوتا ہے منزہ قرار دینا کہ ہم تجھے پاک جانتے ہیں کہ تیرے اندر کوئی کسی قسم کا نقص وعیب نہیں اور زبان کے ساتھ بھی تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔

"قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک میں جانتا ہوں وہ چیز جو تم نہیں جانتے۔

''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا'' سکھا دیا اللہ تعالیٰ نے، تعلیم دے دی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو الاسماء کے اوپر جو الف لام ہے یہ جنس مضاف الیہ ہے، اسماء مسمیات تمام چیزوں کے نام مسمیات جن کے نام رکھ دیئے گئے ہوں تمام چیزوں کے ناموں کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دے دی، نام بھی بتا دیا اور اس کے خواص وآثار بھی بتا دیئے کہ اس چیز کا یہ نام ہے اور یہ یہ کام آتی ہے، یہ اس میں نفع کا پہلو ہے، یہ اس میں نقصان کا پہلو ہے، یہ حلال ہے یہ حرام ہے اس قسم کی تفصیلات جو تھیں اس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دے دی۔

''كُلَّهَا'' تمام کی تمام چیزوں کے ناموں کی۔

''ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ'' ''هُمْ'' کی ضمیر انہی مسمیات کی طرف لوٹ رہی ہے پھر پیش کیا اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کو فرشتوں کے سامنے۔

''فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ'' پھر کہا اللہ تعالیٰ نے اَنْۢبِـُٔوْنِىْ انبؤ کا خطاب فرشتوں کو ہے تم مجھے خبر دو۔

''بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ'' ان چیزوں کے ناموں کی۔

''اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ'' اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو، جو بات پیچھے سے سمجھ میں آرہی تھی کہ ہم خلافت کے اہل ہیں ہم اس فرض کو ادا کردیں گے اگر تم اپنی اس اہلیت کے خیال میں اور اس کام کو سنبھالنے کے بارے میں جو تم نے ظاہر کیا کہ ہم اس کو سنبھال لیں گے ان لفظوں کے تحت یہی بات سمجھ میں آرہی ہے اگر اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تم اس خلافت کے اہل ہو، تم نظم کو سنبھال لو گے تو مجھے ان چیزوں کے اسماء بتاؤ۔

''قالوا'' فرشتوں نے کہا ''سبحنك'' آپ تو پاک ہیں ''لاعلم لنا'' ہمیں کوئی علم نہیں ''الا ما علمتنا'' مگر جو تو ہمیں سکھا دے ''انك انت العليم الحكيم'' تو علم والا ہے، حکمت والا ہے ''قال یاآدم'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم ''انبئهم'' ان فرشتوں کو خبر دے ''باسماء هم'' ان چیزوں کے ناموں کی'' فلما انباء هم'' پس جب آدم علیہ السلام نے خبر دی ان کو چیزوں کے ناموں کی ''قال'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' الم اقل لكم'' کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا ''انی اعلم غيب السمٰوٰت والارض'' کہ بیشک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین میں چھپنے والی چیزوں کو ''واعلم ماتبدون'' اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جو تم ظاہر کرتے ہو'' وما كنتم تكتمون'' اور جس کو تم چھپاتے ہو'' واذ قلنا للملئكة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابليس'' جب کہا ہم نے فرشتوں کو کہ تم سجدہ کرو آدم علیہ السلام کو'' فسجدوا'' تو انہوں نے سجدہ کردیا'' الا ابليس'' سوائے ابلیس کے۔

''اَبٰى'' وہ اڑ گیا، شدت کے ساتھ کسی چیز سے رک جانا اس کو اَبٰى سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ اڑ گیا، رک گیا اس نے انکار کر دیا۔

''وَاسْتَكْبَرَ'' اور اس نے اپنے آپ کو بڑا جانا اس نے تکبر کیا استکبار کا معنی یہی ہے کہ اپنے آپ کو بڑا جاننا۔

تکبر کا مفہوم اصل کے اعتبار سے ہوا کرتا ہے بتکلف اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں بڑا قرار دینا اور شرعی مفہوم اس کا یہی ہے'' بطل الحق وغمط الناس'' دوسروں کو ذلیل جاننا، حقیر جاننا اور سچی بات کے قبول کرنے کے مقابلے میں اڑ جانا، شرعی طور پر تکبر کی یہ تعریف ہے۔ وَاسْتَكْبَرَ وہ متکبر ہو گیا اس نے اپنے آپ کو بڑا جانا۔

''وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ'' اور وہ ہو گیا کافروں میں سے۔

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع کی آخری آیات میں اللہ تعالیٰ نے انعامات کا سلسلہ شروع کیا تھا معاد کا تذکرہ کرنے کے بعد انعامات کا ذکر چھیڑا تھا اور هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا اس آیت میں مادی انعامات کا ذکر کیا یعنی محسوس انعامات جو انعامات انسان کو محسوس ہوتے ہیں اور ان سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔

اب اللہ تعالیٰ ان آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرماتے ہیں اور اس قصہ کے ضمن میں روحانی انعامات جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائے ہیں، عزت، شرافت، علم، دوسروں کے مقابلے میں بلندی، عظمت اس کو بیان فرماتے ہیں۔

ابتداء سے دشمن کا تعارف:

اور ان انعامات کے تذکرہ سے مقصود اپنی اطاعت اور عبادت کی طرف ہی بلانا ہے جس کی آپ کے سامنے پہلے وضاحت کر دی گئی تھی، انسان کی ابتداء کیسے ہوئی؟ کن حالات میں ہوئی؟ ان آیات میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی اور اس کے بعد ابلیس نے جس طرح سے مخالفت کی اور آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کا مظاہرہ کیا اور آدم علیہ السلام کو بہکانے کا باعث بنا اور آئندہ آدم علیہ السلام کی اولاد کے متعلق اس نے جس قسم کے دعوے کئے اور جس قسم کے جذبات کا اظہار کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی مختلف آیات میں اس واقعے کو نمایاں کیا ہے۔

انسان کے سامنے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک تمہارا ازلی دشمن تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی پر برانگیختہ کرتا ہے پس تم اپنے دشمن کو پہچانو اور اپنے دوست کی پہچان کرو، اللہ تعالیٰ جس طرح کے احکام تمہیں دیتا ہے اس میں تمہارا فائدہ ہے اور وہ شیطان ابلیس تمہیں بہکا کر جس راستے کی طرف لے جاتا ہے اس میں تمہارا نقصان ہے اور اس کی عداوت اس وقت سے نمایاں ہے جب سے آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ

نے عظمت عطا فرمائی اب اگر تم اس کے پیچھے لگو گے تو جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو بہکایا تھا تمہیں بھی بہکائے گا، اللہ کی نافرمانی کی طرف ڈال دے گا جس کے نتیجے میں تم جہنم میں جاؤ گے اور اپنے باپ کی وراثت جنت سے تم محروم ہو جاؤ گے۔

اس چیز کو نمایاں کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد سورتوں میں حضرت آدم علیہ السلام اور شیطان کے واقعہ کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے تو ان آیات کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل واضح ہو جائے گی۔

انسان کی ابتداء کیسے ہوئی؟:

سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کا تذکرہ ہے قرآن کریم نے اس بات کے اوپر روشنی ڈالی ہے کہ یہ انسان جو اس وقت زمین کے اوپر پھیلے ہوئے ہیں اور جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کائنات کی باقی چیزوں کے مقابلے میں ان کو برتری دی ہے ان کی ابتداء اس طرح سے ہوئی کہ ان کے جدِ اعلیٰ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت کے ساتھ پیدا فرمایا اور یہ شرافت ہے اس آدم علیہ السلام کی کہ باقی چیزوں کی نسبت اللہ نے کلمہ ”کُن“ کی طرف کی ہے کہ میں نے ان کو کلمہ ”کُن“ سے پیدا کیا ہے اور جہاں آدم علیہ السلام کا ذکر فرمایا وہاں یہ ہے کہ ”خلقتہٗ بیدی“ کہ اس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، یہ ہاتھ کا لفظ اگرچہ متشابہات میں سے ہے ہم اس کی تعبیر نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ کیسا ہے؟ اور اپنے دونوں ہاتھوں سے کس طرح بنایا؟

بہر حال باقی مخلوق کے مقابلے میں یہ شرافت وعظمت حاصل ہے اس کو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنے ہاتھوں کی طرف نسبت کی اور کہا ”خلقتہٗ بیدی“ میں نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے حدیث شریف میں بھی اس کی وضاحت ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ! تو نے آدم علیہ السلام کے لیے دنیا کی نعمتیں بنا دیں یہ کھاتا ہے پیتا ہے سواری کرتا ہے ہر قسم کی عیاشی اس کو دنیا کے اندر نصیب کر دی اس لیے اس کو تو دنیا دے دے اور ہمارے لیے تو آخرت کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں میں نے کلمہ کن سے پیدا کیا ہے اس مخلوق کی طرح قرار نہیں دے سکتا جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے (مشکوٰۃ ص ۵۱۰) اس روایت کا مفہوم یہ ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی اور اس روایت کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی شرافت بیان کرتے ہوئے یہی فرمایا کہ میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے تو یہ خصوصیت حضرت آدم علیہ السلام کی ہے باقی مخلوق کے مقابلے میں، باقیوں کو بنانے اور کرنے میں نسبت کلمہ ”کُن“ کی طرف ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا، حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا

کرنے کے بعد پھر اس کے ساتھ اس کی زوجہ کو پیدا کیا جیسے سورۃ النساء کی پہلی آیت میں ہے ''وخلق منھا زوجھا'' اُسی سے اس کا جوڑا بنایا پھر فرمایا'' وبث منھما رجالا کثیرا ونساء'' پھر ان دونوں سے آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حواء علیہا السلام سے بہت سارے مرد اور عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے پھیلا دیا پھر آگے یہ سلسلہ جتنا پھیلا ہے وہ آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام سے ہی پھیلا، جتنے بھی انسان دنیا کے اندر موجود ہیں گورے ہیں یا کالے ہیں، عرب ہیں یا عجم ہیں، یورپی ہیں یا مشرقی ہیں جیسے بھی ہوں، وہ سارے کے سارے آدم علیہ السلام کی نسل ہیں اور آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں خاندان ان سب کا ایک ہی ہے، قرآن کریم نے انسان کی ابتداءِ آفرینش کی طرف اس طرح سے یہ اشارہ فرمایا ہے اور ان آیات کے اندر اس کی وضاحت کی ہے۔

ڈارون کا فلسفہ:

اور اس سے تردید ہو جاتی ہے آج کل کے دہریوں کی خاص طور پر جو ڈارون کا فلسفہ مشہور ہے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کسی ایک فرد کی اولاد نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جمادات سے نباتات، نباتات سے آگے حیوانات پیدا کرنا شروع کیے کہ ابتداء ان کی ایسے کیڑوں سے ہوئی کہ جن کے اندر اعضاء بہت کم تھے، صلاحیتیں بہت کم تھیں تو اس کے اوپر دوسری نسل بڑھی پھر یوں کرتے کرتے تیسری نسل پھر چوتھی نسل اس طرح سے جو حیوانات تھے وہ ترقی کرتے کرتے بندر تک آگئے بندر ایک ترقی یافتہ انسان ہے کہ جس میں بہت ساری صلاحیتیں اور بہت ساری خوبیاں ہیں بہت سمجھ بوجھ پائی جاتی ہے۔

اور پھر بندر سے آگے ترقی کر کے یہ انسان وجود میں آیا گویا یہ بندر کی ترقی یافتہ صورت ہے، باقی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آدم علیہ السلام سے بنایا ہو، آدم علیہ السلام کی نسل سے انسان پھیلا ہو اس بات کا وہ انکار کرتے ہیں، بندر کی ترقی یافتہ صورت قرار دیتے ہیں انسان کو، گویا کہ حیوان کی ایک اعلیٰ اور ترقی یافتہ صورت ہے اور درجہ بدرجہ ترقی کرتا کرتا یہ حیوان اپنے کمال کو پہنچا ہے اور انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے کمال رکھ دیئے اور اس کے اعضاء ہر طرح سے کامل کر دیئے باقی ایک خاندان کہیں یا ایک باپ کی اولاد کہیں اس کو آج جدید فلسفہ تسلیم نہیں کرتا اور بناء اس کی ساری کی ساری توہمات پر ہے نہ تو انسان کی ابتداء کسی نے دیکھی نہ یہ دیکھا کہ کس طرح سے ایک نسل منتقل ہو کر دوسری نسل بنتی ہے۔

کسی نے اپنی آنکھوں کے ساتھ نہیں دیکھا تو ان توہمات کے مقابلے میں جو پردہ شریعت نے اٹھایا ہے اور اللہ کی کلام نے اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والے ہیں وہی یقین کے قابل ہے اور اسی پر اعتماد کرنا چاہیئے

اور انسان کی شرافت کے لائق بھی یہی چیز ہے کہ مرد اور عورت اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے، پہلے آدم علیہ السلام کو بنایا پھر اس کی بیوی کو بنایا اور اس کے پیدا کرنے کی نسبت اپنے ہاتھوں کی طرف کی اور پھر اس سے اس کی اولاد کو پھیلایا یہی حقیقت ہے اور اس کے ساتھ انسان کی شرافت زیادہ نمایاں ہے پیدا کرنے سے قبل فرشتے موجود تھے اور سورۃ حجر کے اندر آیت آئے گی جس سے معلوم ہوگا کہ جنات کی خلقت بھی آدم علیہ السلام سے پہلے ہو چکی تھی۔

فرشتوں کی عرض اور اس کا مقصد:

جنات بھی موجود تھے، فرشتے بھی موجود تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے ذکر کیا کہ میں اپنا ایک نائب بنانے والا ہوں جس کا مطلب یہ ہوگا کہ نہ تو یہ نیابت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دی اور نہ یہ نیابت اللہ تعالیٰ نے جنات کو دی۔

جس وقت یہ اعلان ہوا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے آگے ایک بات کہی ان کی بات کا حاصل یہ ہے کہ یا اللہ! ہم موجود ہیں اور ہر طرح سے تیرے فرمانبردار ہیں، زبان کے ساتھ بھی تیری تسبیح کرتے ہیں اور دل کے ساتھ بھی تیرے مطیع ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اگر کوئی نیا کام تجویز ہو رہا ہے تو اس کو ہمارے سپرد کر دیجیے ہم ہی اس کو کر لیں گے۔

باقی جو آپ نئی مخلوق بنانے والے ہیں وہ تو زمین میں فساد کرے گی، خونریزیاں کرے گی، ہم جو خادم موجود ہیں یہ کام آپ ہم سے لے لیجیے یہ فرشتوں کا کہنا بطور اعتراض کے نہیں ہے، نہ اللہ تعالیٰ نے ان سے مشورہ لیا بلکہ اس حکمت کے تحت کہ فرشتوں کے جذبات نمایاں ہوں اس بات کو ذکر فرمادیا اور فرشتوں کی اس بات کا حاصل یہی ہے جس طرح سے ایک فرمانبردار نہایت صالح قسم کا خادم کسی کے پاس موجود ہو اور آقا اس کے سامنے ذکر کرے کہ گھر کا کام ایک اور نکل آیا اس کے لیے میں کسی اور کو متعین کر دوں تو وہ کہے کہ نہ جی بالکل ضرورت نہیں ہے دوسرا جو آئے گا وہ معلوم نہیں آپ کے مزاج کو سمجھے یا نہ سمجھے اس کو کام کرنے کا سلیقہ ہو یا نہ ہو پھر آپ خوامخواہ پریشان ہوں گے میں جو موجود ہوں آپ کا خادم یہ کام بھی میرے سپرد کر دو میں اس کام کو بھی کرتا رہوں گا۔

تو جس طرح سے ایک نیازمندی کے طور پر یہ خادم کہتا ہے اور ملازم رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ کام بھی میرے سپرد کر دو میں آپ کا مزاج شناس ہوں اس گھر میں رہتے ہوئے مجھے مدت ہوگئی آپ کا مزاج کیا ہے اس لیے جو کام کروں گا آپ کی مرضی کے موافق کروں گا آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، نیا آدمی آپ بلائیں گے وہ کیسا ہوگا، کیسا نہیں ہوگا ایسی حرکتیں کرے گا جو آپ کے لیے باعث تکالیف ہوں گی تو مناسب یہی ہے کہ یہ

خدمت بھی میرے سپرد کر دیجئے یہ ایک قسم کی نیاز مندی کا اظہار ہے جو وہ خادم کر رہا ہے کسی قسم کا اعتراض کرنا مقصود نہیں۔

یہاں بھی فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی طرح کی نیاز مندی کا اظہار کیا کہ آنے والا نیا کام بھی ہمارے سپرد کردو ہم اسے سنبھال لیں گے اور اس کام کے لیے کسی نئی مخلوق کو بنانے کی ضرورت نہیں۔

فرشتوں کو کیسے معلوم ہو گیا؟:

البتہ درمیان میں آپ کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرے گا کہ فرشتوں نے جو یہ کہا کہ یہ زمین میں فساد کرے گا اور خون ریزیاں کرے گا، فرشتوں کو یہ معلوم کیسے ہوا کہ یہ جو نئی مخلوق پیدا کی جارہی ہے وہ فسادی ہوگی آپس میں لڑیں گے اور خونریزیاں کریں گے فرشتوں کو اس بات کا علم حاصل کیسے ہو گیا؟ مفسرین نے دونوں قسم کی باتیں نقل کی ہیں۔

ایک تو یہ نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت اس خلیفہ کا تذکرہ کیا تھا تو اس کا تعارف بھی کردیا تھا کہ وہ ایسا ہوگا اس کی آگے اولاد پھیلے گی، ان میں سے بعض میرے فرمانبردار ہوں گے، بعض نافرمان ہوں گے اور خلیفہ میں اس کو بناؤں گا، اس کے اوپر احکام نازل کروں گا، اور وہ ان احکام کے تحت عدل وانصاف قائم کرے گا دنیا کے نظام کو سنبھالے گا، اس قسم کی تفصیل ان کے سامنے ذکر کردی ہو جس میں یہ بات بھی آگئی کہ بعض نافرمان بھی ہوں گے آپس میں لڑیں گے بھی اور خون ریزیاں بھی کریں گے اس لیے حکومت قائم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، پکڑ دھکڑ ہوگی عدل وانصاف ہوگا، اس سے انہوں نے اندازہ کیا کہ یہ تو بہت لمبا چوڑا دھندا شروع ہو جائے گا فساد کا، خون ریزیوں کا، دھندا پھیلانے کی کیا ضرورت ہے اگر خلافت کا کوئی کام اس قسم کا ہے تو ہم سے لے لیجیے جس وقت خلیفہ کا اعلان اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو خلیفہ کا کام اور اس خلیفہ کی آگے اولاد پھیلے گی تو اس کے جس قسم کے واقعات ہوں گے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے اس کا تذکرہ کردیا وہاں سے یہ سمجھ گئے مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت آدم علیہ السلام کو بنایا تھا تو آدم علیہ السلام کا یہ ڈھانچا بنا پڑا تھا ابلیس آدم علیہ السلام کو دیکھنے کے لیے آیا حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ابلیس دیکھنے کے لیے آیا تو آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنا پڑا تھا ابھی اس میں روح نہیں ڈالی تھی، آیا اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا دیکھتے ہوئے اس نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ اجوف ہے یعنی اندر سے کھوکھلا ہے صرف اردگرد یہ تہہ ہے اور اندر سے ہم خالی ہیں یہ ہوا بھری ہوئی ہے جس وقت اس کو اجوف دیکھا کہ یہ اندر سے خالی ہے تو ابلیس نے دیکھ کر اندازہ لگایا کہنے لگا۔

"خلق خلقاً لایتمالك"، (مشکوٰۃ ص ۵۰۶) اللہ تعالیٰ نے کیسی مخلوق پیدا کی ہے جو اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی یہ اندر سے کھوکھلی ہے اور اس کے کھوکھلے ہونے سے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ مخلوق ایسی ہے کہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکے گی یعنی جس وقت اس کو کہیں سے ہوا ملے گی، کوئی اس کو ہوا دے گا کبھی یہ کدھر کو اڑے گا کبھی یہ کدھر کو اڑے گا اس میں اتنی قوت نہیں ہوگی کہ اپنے آپ کو سنبھال لے، جیسے اس نے بناوٹ کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا ممکن ہے ان کی بناوٹ دیکھ کر جس قسم کے اعضاء انسان کو دیئے جارہے تھے جس قسم کا انسان کو پیدا کیا جارہا تھا تو ہوسکتا ہے کہ فرشتوں نے بھی اسی سے اندازہ لگایا ہو ابلیس کے اس اندازے کا ذکر صحیح حدیث کے اندر موجود ہے، فرشتوں کے اس اندازے کا ذکر موجود نہیں لیکن اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو انہوں نے قبل الوقت کہہ دیا کہ لڑے گا، فساد کرے گا ہوسکتا ہے کہ اس کی خلقت کے اندازے ہی انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ ان کے آثار کچھ اس قسم کے ہیں ایسا بھی ممکن ہے، اس وقت انہوں نے اپنی تسبیح و تقدیس کا ذکر کیا۔

فرشتوں کی بات کا جواب:

اللہ تعالیٰ نے پہلے تو اجمالی جواب دیا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس زمین میں خلافت کو سنبھالنے کے لیے، نظام خلافت قائم کرنے کے لیے کس قسم کی اصطلاحات کی ضرورت ہے، کس قسم کے علم کی ضرورت ہے، کیسی کیسی صلاحیتیں چاہئیں وہ مجھے معلوم ہیں تم میں نہیں ہیں اور وہ جو میں نئی مخلوق پیدا کررہا ہوں اس میں یہ صلاحیتیں ہیں یہ تو اجمالی بیان فرمادیا کہ اس کام کے لیے جس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ صلاحیتیں تم میں موجود نہیں اس لیے میں نئی مخلوق کو پیدا کررہا ہوں جو اس نظام ارضی کو سنبھالے گی اور وہ وہاں جاکر میرے احکام کی تنفیذ کرے گی تمہارے اندر وہ صلاحیتیں نہیں ہیں، پہلے تو اجمالی جواب دیا پھر فرشتوں کے سامنے تفصیل نمایاں کرنے کے لیے جس میں آدم علیہ السلام کی شرافت بھی نمایاں ہوجائے گی اللہ تعالیٰ نے زمین کی اشیاء ان سب کے نام، ان سب کے خواص، ان سب کا طرز استعمال، ان کا نفع و نقصان، ان کی حلت و حرمت جس قسم کے اوصاف ان کو عطا فرمانے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی آدم علیہ السلام کو تعلیم دے دی اب آدم علیہ السلام کو جو تعلیم دی ضروری نہیں کہ فرشتوں سے علیحدہ کرکے چھپا کر تعلیم دی ہو یہ کوئی ضروری نہیں ہے ہوسکتا ہے فرشتے بھی موجود ہوں۔

فرشتوں کی موجودگی میں تعلیم دے دی ہو ایسے بھی ہوسکتا ہے لیکن فرشتوں میں جب اس بات کی استعداد ہی نہیں تھی وہ اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے تو ان کے سامنے بھی اگر اس مسئلے کی تقریر کی جائے گی تو ان کے علم میں اضافہ نہیں ہوسکتا فرشتے اس بات کو یاد نہیں کرسکتے۔

جس طرح سے آپ لوگ منطق پڑھتے ہیں فلسفہ پڑھتے ہیں اب فلسفے کا کوئی پیچیدہ سا مسئلہ آگیا استاد اس کی تقریر آپ کے سامنے کرتا ہے، آپ میں اس کی صلاحیت ہے سمجھنے کی آپ اس کو اخذ کر جائیں گے اور ایک جٹ آدمی جس نے ''الف، باء، تاء'' بھی نہیں پڑھی وہ بھی اس درسگاہ کے اندر موجود ہو جس وقت سبق ختم ہوگا آپ کا دماغ معلومات کے ساتھ بھرا ہوا ہوگا اور وہ جیسے خالی کا خالی آیا تھا ویسے ہی خالی بیٹھا ہوا آپ کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہوگا اب اگر آپ اس سے پوچھیں گے کہ بتا میں نے کیا بیان کیا وہ کہے گا جی مجھے تو معلوم نہیں اور آپ سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ میں نے کیا بیان کیا تو آپ فرفر سارا سبق سنا دیں گے کیونکہ آپ میں صلاحیت ہے اور اس میں صلاحیت نہیں ہے۔

تو آدم علیہ السلام کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان علوم کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھی تھی اللہ تعالیٰ نے جب تعلیم دی وہ تو ان کو اخذ کر گئے اور فرشتوں کے اندر صلاحیت ہے ہی نہیں نہ بھوک کا پتہ، نہ ان کو کھانے کے اثرات کا پتہ کہ فلاں چیز کے کھانے سے نشہ چڑھتا ہے وہ نشے کو بھی نہیں جانتے کہ نشہ کیا ہوتا ہے، نشہ کی کیفیت نہیں سمجھتے اس چیز کے مارنے کے ساتھ انسان زخمی ہو جاتا ہے، یہ زہر ہے، مر جائے گا، فلاں ہوگا، وہ موت کو نہیں جانتے، حیات کو نہیں سمجھتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ ان چیزوں سے بالا و برتر ہیں جب ان چیزوں کو استعمال کرنے کی اور ان کے اثرات اپنے اوپر طاری ہونے کی ان کے اندر صلاحیت ہی نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم آدم علیہ السلام کو اگر ان کے سامنے بھی دی ہو تو بھی فرشتے خالی کے خالی رہیں گے اور آدم علیہ السلام ان علوم کو اخذ کر جائیں گے۔

فرشتوں اور حضرت آدم علیہ السلام کا امتحان:

اس لیے اس تعلیم کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے وہ چیزیں فرشتوں کے سامنے پیدا کیں اور کہا کہ بتاؤ کہ ان کے کیا نام ہیں؟ ان کے کیا خواص ہیں؟ ان کو کس طرح سے استعمال کیا جاتا ہے؟ اور ان کے اثرات کیا ہوں گے وہ کہنے لگے ''لاعلم لنا'' ہمیں تو کوئی علم نہیں ہم تو وہی چیزیں جانتے ہیں جو آپ نے ہمیں ہماری استعداد کے مطابق سکھائی ہیں اور جس کی تعلیم آپ نے ہمیں نہیں دی اور جس کا علم آپ نے ہمارے دل و دماغ میں نہیں ڈالا یعنی ہمارے اندر اس کی استعداد نہیں رکھی ہم ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے اپنی لاعلمی کا انہوں نے اعتراف کر لیا اور وہ سمجھ گئے کہ واقعی خلافت کے لیے جس قسم کے مسائل کی ضرورت ہے وہ ہمارے بس کے نہیں ہیں۔

پھر وہی سوال اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کر دیا کہ آدم! ذرا ان کو سناؤ کہ ان چیزوں کے کیا نام ہیں؟ تو آدم علیہ السلام نے فر فر بیان کر دیئے جیسے کیسے تھے تو ان کو اندازہ ہو گیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی بات جو تھی یہ آدم علیہ السلام اخذ کر گئے ہمارے بس کی بات نہیں یعنی جب آپ اس مسئلے کی تقریر کریں گے اس مسئلے کو سمجھنے کے بعد جاٹ آپ کی بات بھی نہیں سمجھے گا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط کہہ رہے ہیں لیکن اس سے اس کو پتہ چل جائے گا کہ واقعی اس کو سبق یاد ہے جب ایک طالب علم استاد کی تقریر کو نقل کرے گا اگرچہ وہ جاہل ویسے ہی بیٹھا ہو گا لیکن آپ کے بولنے سے اس کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے کوئی چیز بھی نہیں میرے پلے تو کوئی لفظ پڑا نہیں لیکن ان کے فر فر بولنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات کو سمجھ گئے ہیں، اس طرح سے آدم علیہ السلام کی تقریر کے بعد فرشتوں کو اعتراف ہو گیا کہ واقعی خلافت کے لیے جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے اور جس قسم کے مسائل جاننے کی ضرورت ہے آدم علیہ السلام ان سے واقف ہیں ہم ان سے واقف نہیں ہیں، علم کے ذریعے سے آدم علیہ السلام کی برتری فرشتوں کے اوپر نمایاں کر دی کہ خلافت کی صلاحیت ان میں زیادہ ہے۔

فرشتوں میں استعداد نہ رکھنے کی وجہ:

باقی یہ کہ فرشتوں میں استعداد کیوں نہیں رکھی کہ ان کی بناوٹ یہی ہے ان کی خلقت کا موضوع ایسا ہے اگر ان کے اندر بھی استعداد رکھ دی جاتی تو پھر انسان اور فرشتوں میں فرق کیا رہ جاتا پھر تو یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انسان ہی کیوں نہ بنا دیا جب دو نوع علیحدہ علیحدہ ہیں، فرشتے علیحدہ نوع ہے اس کے خواص اور ہیں اور انسان ایک علیحدہ نوع ہے اور انسان کی بعض ایسی امتیازات ہیں جو فرشتوں کی نوع میں پائی نہیں جاتیں اور ان امتیازات میں یہ ہے کہ دنیا کی چیزوں کو استعمال کرنا، ان کے اثرات سے واقف ہونا، ان کے نفع ونقصان کی تفصیل یہ انسان کی صلاحیت سے تعلق رکھتی ہے فرشتوں کی صلاحیت سے تعلق نہیں رکھتی ان کی بناوٹ اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے بنائی ہے باقی ایسی کیوں نہ بنائی یہ اس کی حکمت کا تقاضہ ہے۔

اگر ان کو کھانے پینے والے بنا دیتا، ان کو بھی نکاح کرنے والے بنا دیتا اور بیماریاں اور تندرستیاں بھی ان کے ساتھ لگا دیتا تو پھر انسان اور فرشتوں میں کیا فرق رہ جاتا لیکن اتنا ان کی سمجھ میں آ گیا کہ واقعی اس زمین کی چیزوں کے نام جاننا، استعمال کے طریقے کا سمجھنا، نفع ونقصان سے واقف ہونا یہ ایک ایسا علم ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ تو تعلق رکھتا ہے ہمارے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے تو خلافت کے لیے آدم علیہ السلام کی برتری فرشتوں کے سامنے اس علم کے ذریعے سے نمایاں ہو گئی۔

"عَلَّمَ یعلم" مصدر ہے اس کا معنی ہوتا ہے کہ دوسرے کے دل ودماغ میں علم کو ڈال دینا اور فرشتوں کے دل ودماغ میں تو یہ علم ڈالا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس علم کی صلاحیت سے ہی محروم کردیا ان کے سامنے یہ بات آگئی غرض ہم نے یہ چیزیں ان کے سامنے پیش کیں اور انہیں کہا کہ بتاؤ ان کے کیا نام ہیں انہوں نے کہہ دیا کہ ہمیں کوئی علم نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے نتیجے میں ان کے دل ودماغ میں یہ علم نہیں آیا کیونکہ اس علم کے حاصل کرنے کی ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے صلاحیت ہی نہیں رکھی یہی بات تو میں اپنے بیان کے اندر واضح کرتا آرہا ہوں کہ تعلیم آدم علیہ السلام کو ان کے سامنے بھی دی ہوتو تو بھی وہ علم حاصل نہیں کرسکتے کیونکہ ان کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے، جس میں صلاحیت ہوتی ہے وہ بات کو سمجھا کرتا ہے اور جس میں صلاحیت ہی نہ ہو وہ بات نہیں سمجھا کرتا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی برتری علم کے ساتھ نمایاں ہوئی:

تو جب فرشتوں کے اندر ان چیزوں کے متعلق اللہ نے صلاحیت ہی نہیں رکھی ان کے علم کی تو اگر ان کے سامنے بھی تقریر ہوتی رہے تو وہ اس کا علم حاصل نہیں کرسکتے، اس لیے "لاعلم لنا الاما علمتنا" کا مطلب یہی ہے کہ جو علم تو نے ہمارے دل ودماغ کے اندر ڈالا ہے ہم تو وہی جانتے ہیں باقی اس کی چونکہ ہمارے اندر تو نے صلاحیت ہی نہیں رکھی اس لیے ہمیں اس کا کوئی علم نہیں تو علیم ہے، حکیم ہے، تو ہر قسم کا علم رکھتا ہے، ہر قسم کی حکمت ودانائی تیرے لیے ہے، تو ہی جانتا ہے کہ کس کو کیسا بنانا ہے اور کون کس کے لائق ہے، قولی طور پر گویا کہ آدم علیہ السلام کی برتری کا انہوں نے اعتراف کرلیا کہ واقعی اس علم کے اندر فوقیت آدم علیہ السلام کو حاصل ہے، یہاں آدم علیہ السلام کی جو برتری نمایاں ہوئی ہے وہ علم کے رنگ میں ہوئی ہے ورنہ جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو تسبیح وتقدیس کے اندر فرشتے کوئی پیچھے نہیں۔

یہ برتری علم کے طور پر نمایاں ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے علم ایک بہت بڑی صفت ہے جس کا اثر انسان پر پڑتا ہے تو اس کو شان ملتی ہے باقی رہی عبادت یہ بندے کی صفت ہے اللہ کی صفت نہیں ہے عبادت اور علم کے اندر اسی طرح سے فرق ہے جس طرح سے مخلوق کی صفت میں اور اللہ کی صفت میں فرق ہوا کرتا ہے، علم کو عبادت کے مقابلے میں اتنی برتری حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عملاً بھی عظمت دینے کا ارادہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی تعظیم باقی مخلوق سے کرائی جائے تاکہ عملاً اس کی برتری سامنے آجائے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم اور ابلیس کا انکار:

اعلان ہو گیا فرشتوں کو کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو جن پہلے پیدا ہو چکے تھے اور جنوں کا سردار ابلیس فرشتوں میں ملا جلا رہتا تھا جیسے کہ آگے معلوم ہوگا کہ آسمانوں میں رہتا تھا ان کے ساتھ پھرتا تھا، فرشتے اشرف نوع تھی جب ان کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو تبادراً معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کو بھی حکم تھا کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں اور اس کے علاوہ باقی ساری مخلوق ایسی ہے کہ جس میں ایسا شعور نہیں ہے اس لیے ان سے سجدہ کروانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ان پر برتری ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی یہ ذی شعور مخلوق جن اور فرشتے موجود تھے ان کو حکم دے دیا اس کو حکم دینا قرآن کریم کی آیات سے دلالۃً ثابت ہوتا ہے کیونکہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے پوچھا کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو اس نے آگے سے یہ نہیں کہا کہ مجھے تو حکم ہی نہیں دیا گیا، فرشتوں کو حکم دیا تھا انہوں نے سجدہ کر دیا مجھے آپ نے کب کہا تھا کہ سجدہ کرو یہ عذر نہیں کیا بلکہ اس نے آگے سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ حکم ہی ٹھیک نہیں تھا یہ تو میری شان کے لائق نہیں میں برتر ہوں وہ ادنیٰ ہے ادنیٰ اعلیٰ کو سجدہ کیا کرتا ہے اعلیٰ ادنیٰ کو سجدہ کیسے کرے؟ یہ تو حکم ہی حکمت کے خلاف ہے اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اس قسم کی حکمتیں بتانی شروع کر دیں اور اپنی منطق لڑانی شروع کر دی جس کے نتیجے میں وہ مردود ہوا لیکن کسی آیت و روایت میں یہ اشارہ نہیں ہے کہ اس نے یہ عذر کیا ہو کہ مجھے تو حکم ہی نہیں دیا گیا جس سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی اور اس کی جماعت کو بھی سجدہ کرنے کا حکم تھا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد فرشتے تو سجدے میں گر گئے اور ابلیس اکڑ گیا اس نے اپنے آپ کو بڑا قرار دیا جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۃ اعراف میں آئے گی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

حکم الٰہی کو حکمت کے خلاف سمجھنا کفر ہے:

یہاں اس کے ترک سجدہ کے اوپر کفر کا حکم لگ گیا کہ یہ کافر ہے اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے حکم کو عملاً ترک کرتا ہے تو فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کافر نہیں، کفر آتا ہے عقیدے پر، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو حکمت کے خلاف سمجھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو یہ سمجھے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے تو پھر انسان بالاتفاق کافر ہے، یہاں یہ ترک سجدہ کی وجہ سے کافر نہیں ہوا بلکہ اللہ کے حکم کو خلاف حکمت ٹھہرانے کے ساتھ یہ کافر ہوا کسی فرض کو عملاً ترک کر دیا جائے جیسے نماز فرض ہے

اس کو کوئی شخص فرض سمجھتا ہے اور اس کے حکم کو حکمت کے مطابق بھی سمجھتا ہے لیکن نماز پڑھتا نہیں عملاً اس کا تارک ہے تو کافر نہیں ہے لیکن اگر کوئی کہہ دے کہ یہ حکم ٹھیک ہی نہیں ہے نماز پڑھنے کا، یہ تو حکمت کے منافی ہے ایسی صورت میں وہ کافر ہو جائے گا، ابلیس کا کفر اسی وجہ سے ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو خلاف حکمت قرار دیا اس کے سامنے اکڑ گیا کہ میں اس حکم کو نہیں مان سکتا۔

''انا خیر منہ'' میں تو اس سے بہتر ہوں آگے دلیل دے دی کہ میں بہتر کس طرح سے ہوں، حاصل اس کا یہی ہے کہ جب میں اعلیٰ ہوں یہ ادنیٰ ہے اعلیٰ ادنیٰ کو سجدہ نہیں کیا کرتا اس لیے میں اس کو سجدہ نہیں کر سکتا اللہ تعالیٰ کے حکم کی حکمت کے انکار کرنے کی وجہ سے وہ کافر ٹھہرا، یہ مفہوم ہے ان آیات کا جہاں تک آپ کے سامنے ترجمہ عرض کیا جا چکا ہے۔
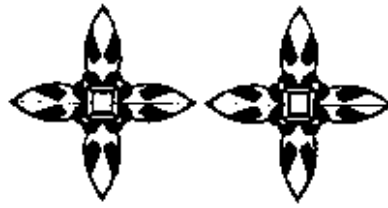
وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا

اور ہم نے کہا کہ اے آدم تو بھی اور تیری بیوی بھی جنت میں رہو اور تم دونوں کھاؤ کھلم کھلا

حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

جہاں سے چاہو اور نہ قریب جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے خسارہ پانے والوں میں سے ﴿۳۵﴾

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا

پھسلا دیا شیطان نے ان کو بسبب اس درخت کے اور نکال دیا ان کو اس عیش وعشرت سے جس میں وہ دونوں تھے ہم نے کہا اتر جاؤ تم سب

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ

بعض تم میں سے بعض کا دشمن ہوگا اور تمہارے لیے ٹھہرنا ہے زمین میں اور فائدہ اٹھانا ہے

اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ اِنَّهٗ هُوَ

ایک وقت تک ﴿۳۶﴾ حاصل کر لیے آدم نے اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات پس اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی بے شک وہ تو

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ

بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۳۷﴾ ہم نے کہا اترو تم سب اس سے اکٹھے ، پس اگر آئے تمہارے پاس میری

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

طرف سے ہدایت پھر جو شخص پیروی کرے گا میری ہدایت کی تو نہ ان کے اوپر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے ﴿۳۸﴾

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور میری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ دوزخ والے ہیں ،

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

یہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۳۹﴾

لغوی تحقیق:

''وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ'' وقلنا اور ہم نے کہا (یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے) یاآدم اے آدم!'' اسکن '' تو سکونت اختیار کر، ٹھہر، تو رہ ''انت وزوجك'' وزوجك کا عطف اسکن کی ضمیر مستتر پر ہے اور ضمیر مرفوع متصل کے اوپر عطف اگر کرنا ہو تو منفصل کے ساتھ اس کا اعادہ ضروری ہے اس لیے '' انت '' کا ذکر آ گیا یہ ضمیر مرفوع متصل کا اعادہ ہے ضمیر منفصل کی صورت میں '' وزوجك '' کا عطف ہو گیا اس پر، ٹھہر تو بھی اور تیری بیوی بھی الجنۃ یہ'' اسکن '' کا مفعول فیہ ہے۔

''وكلا ''اور تم دونوں کھاؤ۔

''منها ''اس جنت سے۔

''رغدا'' یہ مصدر ہے اور یہ مفعول مطلق کی صفت واقع ہو رہا ہے اور مصدر کو صفت بنا دیا مبالغۃً

''وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا'' کھاؤ تم دونوں اس جنت سے کھلم کھلا، فراخی اور وسعت کے ساتھ،

''حیث شئتما'' جہاں کہیں تم چاہو یعنی جنت میں تمہیں چلنے پھرنے کی بھی اجازت اور جس جگہ سے جو چاہو کھاؤ، فراخی کے ساتھ کھاؤ۔

''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ''اور تم دونوں قریب نہ جانا اس درخت کے، اشارہ کے ساتھ اس درخت کو متعین کر دیا گیا۔

''فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ '''' فتکونا '' کے آخر سے نون گرا ہوا ہے اصل میں '' فتکونان '' تھا نون گر گیا گرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ '' تکونا '' مجزوم ہوا اور اس کا عطف '' تقربا '' کے اوپر ہو پھر یہ بھی لاءِ نہی کے نیچے آ جائے گا '' لاتکونا من الظلمین ''اور ظالموں میں سے مت ہو جانا پھر ترجمہ یوں ہو گا اس درخت کے قریب نہ جانا پھر تم ظالموں میں سے نہ ہو جانا، نہی کے ساتھ ترجمہ یوں ہو گیا۔

اور یہ '' تکونا ''، منصوب بھی ہو سکتا ہے کیونکہ نصب کی وجہ سے بھی نون اعرابی گر جایا کرتا ہے پھر یہ جواب نہی ہے اور '' فاء '' کے بعد '' ان '' مقدر ہے پھر ترجمہ یوں کریں گے تم دونوں قریب نہ جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے تم ظالموں میں سے، یعنی تم اگر قریب چلے گئے تو تمہارا شمار ظالموں میں سے ہو جائے گا۔

'' ظالمین '' یہ ظالم کی جمع ہے اور ظلم کہتے ہیں حق تلفی کرنے کو، جو شخص بھی کسی دوسرے کے اوپر ظلم کرتا ہے

تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اس کے کسی حق کو تلف کر دیا، اس کا حق دبالیا یا اس کا کوئی حق چھین لیا، اس کا حق تلف کر دیا یہ ظلم ہے، اسی لیے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا کیونکہ اس میں انسان اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے حق کو تلف کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا بندوں پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ وہ اُسے ذات وصفات میں ایک جانیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں جو بندہ اس حق کو تلف کرتا ہے وہ ظالم ہے اور ظلم عظیم کا ارتکاب کرتا ہے،''ان الشرك لظلم عظیم''اس لیے اگر کوئی شخص اپنے نفس کا حق ادا نہیں کرتا ایسا کام کرتا ہے جس کی بناء پر آنے والے وقت میں اس کے نفس کو عذاب ہوگا، تکلیف میں ڈال دیا جائے گا تو یہ اپنے نفس کی حق تلفی ہے، جس کو''ظلم علی النفس''کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

''فقد ظلم نفسه''اس نے اپنے نفس پر ہی ظلم کیا تو اپنے نفس پر ظلم کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس نے اپنی حق تلفی کی کہ اس پر اپنے نفس کا حق یہ ہے کہ اس کو عذاب سے بچانے کی کوشش کرو اور اس کے لیے اچھا انجام سامنے لاؤ اور اگر آپ اس قسم کا کام کریں گے جس کے نتیجے میں آپ عذاب میں چلے جائیں یہ آپ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں، تو یہاں ظالمین کا مفہوم بھی ایسے ہی ہے تم ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں یہاں ظالمین کا یہ معنی ہے کیونکہ اگر وہ درخت آدم علیہ السلام نے کھایا تو کھا کر کسی اور کا نقصان نہیں کیا اپنا ہی کیا تو یہ اپنے نقصان کو ظلم کے ساتھ تعبیر کیا تو یہ ظلم''علیٰ النفس''ہے، ہو جاؤ گے تم ان لوگوں میں سے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں اس میں تمہارا اپنا نقصان ہے اگر تم اس درخت کے قریب چلے جاؤ گے یہ تمہارا ظلم''علی النفس''ہے کسی دوسرے پر یہ ظلم نہیں ہے تو ظالمین کا مفہوم ایسے ہوا ورنہ ہو جاؤ گے تم قصورواروں میں سے یوں ترجمہ کر دو تو بھی ٹھیک ہے۔

ورنہ تم ہو جاؤ گے ان لوگوں میں سے جو اپنا نقصان کر لیتے ہیں تو بھی ٹھیک ہے، اور اگر آپ ظالم کا لفظ ہی بولیں تو یہ ہماری زبان میں ذرا گراں سا سمجھا جاتا ہے، ہو جاؤ گے تم ظالموں میں سے، ظالم کا لفظ ہماری زبان میں بہت سنگین سا ہے اس کے مفہوم میں کچھ ایسی باتیں آجاتی ہیں جن کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف ٹھیک نہیں ہے اور یہاں انہوں نے گندم کھا کر یا جو بھی درخت تھا کھا کر نقصان کیا تو اپنا کیا تو یہاں ظالم کا مفہوم ظلم''علی النفس''والا ہے، پھر ہو نہ جانا تم ظالموں میں سے، یا ورنہ تم ہو جاؤ گے ظالموں میں سے، ترکیب کے تحت دونوں ترجمے آپ کے سامنے آگئے۔

''فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ'' اَزَلَّ پھسلا دیا زَلَّ يَزِلُّ پھسلنا، زَلَّتْ قدمه اس کا قدم پھسل گیا'' فتزل قدم بعد ثبوتها''(قرآن کریم میں بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے) لغزش قدم کا پھسل جانا، ازل پھسلا دینا، ازلهما پھسلا دیا ان دونوں کو شیطان نے۔

''عنھا'' عن سببہ ہے یعنی اس درخت کے سبب سے، پھسلا دیا شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کے سبب سے ''فاخرجھما'' پھر نکالا ان دونوں کو۔

''مما کانا فیہ'' اس عیش و آرام سے جس میں وہ دونوں تھے اس سے مراد جنت کا عیش و آرام ہے۔

''وَقُلْنَا'' اور ہم نے کہا۔

''اهْبِطُوا'' اتر جاؤ یعنی آسمانوں سے اتر جاؤ جنت آسمانوں پر ہے، اتر جاؤ تم سب۔

''بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ'' تمہارا بعض بعض کے لئے دشمن ہوگا، ''اھبطوا'' کا خطاب آدم علیہ السلام حوا علیہا السلام اور شیطان ان تینوں کو ہے، اتر جاؤ تم سب بعض تمہارا بعض کے لیے دشمن ہوگا۔

''وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ'' اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے ''ومتاع الی حین'' اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک وہاں بھی دوام نہیں بلکہ کچھ وقت کے لیے تم وہاں جا کر وقت گزارو وہاں تمہارا ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ایک وقت تک ہوگا۔

''فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ'' حاصل کر لیے آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف سے کچھ کلمات۔

''فَتَابَ عَلَيْهِ'' تاب توبۃً اس کے اندر معنی ہے رجوع کرنے کا، لوٹنے کا، اس لیے یہ صفت بندے کی بھی آتی ہے ''تاب العبد'' جیسے بندوں کو خطاب کیا جاتا ہے کہ ''توبوا الی اللہ'' اور یہ صفت اللہ کی بھی آتی ہے ''تاب اللہ'' ''تاب'' کا فاعل اللہ بھی آتا ہے اور تاب کا فاعل بندہ بھی آتا ہے لیکن جس وقت اس کا فاعل اللہ ہوتا ہے اس وقت اس کا صلہ عموماً علی آیا کرتا ہے ''تاب علیہ'' اور جس وقت اس کا خطاب بندے کو ہوتا ہے تو اس وقت اس کا صلہ اِلیٰ آیا کرتا ہے ''توبوا الی اللہ'' تاب الی اللہ اس وقت اس کا صلہ جو ہے وہ اِلیٰ کے ساتھ آئے گا۔

مفہوم اس کا یہ ہوا کرتا ہے کہ بندے کا اصل رخ اللہ کی طرف ہوتا ہے اور جس وقت وہ معصیت اختیار کرتا ہے تو اس نے اللہ سے اعراض کر لیا، اس نے اللہ سے اپنا رخ پھیر لیا اور اللہ تعالیٰ بھی اپنا رخ اس بندے سے پھیر لیتا ہے جیسے اس کی شان کے لائق ہے اور بندے کی توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف لوٹ آیا اس نے جو اعراض شروع کر دیا تھا وہ اعراض ختم کر دیا اور اللہ کی طرف وہ لوٹ آیا اور اللہ کی طرف اس کے لوٹنے کا پھر یہ اثر ہوتا ہے کہ اللہ بھی اس پر رحم اور شفقت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو اس کی معصیت کی بناء پر اس سے اعراض کر لیا تھا بندے کے لوٹنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توجہ بھی ہو جاتی ہے، تو اس تاب علیہ کے اندر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ مہربانی کے ساتھ رحم اور شفقت کے ساتھ اس پر متوجہ ہو گیا یہ مفہوم ہے جس کی بناء پر تاب کا فاعل اللہ بھی

آجاتا ہے اور تاب کا فاعل بندہ بھی ہوتا ہے۔" فتاب علیہ "اللہ تعالیٰ نے مہربانی کے ساتھ آدم علیہ السلام پر توجہ فرمائی اور اسی کا حاصل مفہوم ہوا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرلی، توبہ کے قبول کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اس معصیت کی بناء پر جو اعراض فرمالیا تھا وہ اب بندے پر متوجہ ہوگیا، اللہ نے توبہ قبول کرلی یہ حاصل ترجمہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ" "تواب" بھی اللہ کی صفت ہے بے شک وہ تو بہت توجہ کرنے والا ہے۔

"الرَّحِيْمُ "رحم کرنے والا ہے۔

"قُلْنَا اهْبِطُوْا" ہم نے کہا کہ اترو تم سب۔

"مِنْهَا" اس آسمان سے۔

"جمیعاً اهبطوا" سارے کے سارے اکٹھے اترو۔

"فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى "اِمَّا" یہ اصل میں "اِنْ مَا" تھا، ان شرطیہ، ما زائدہ، اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت۔

"فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ" پھر جو شخص پیروی کرے گا میری ہدایت کی۔

"فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ "نہ ان کے اوپر کوئی خوف ہوگا۔

"وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔

خوف اور حزن میں فرق:

خوف اور حزن یہ دو لفظ آگئے، خوف ہوا کرتا ہے کسی آنے والے خطرے کے تصور سے اور حزن ہوا کرتا ہے کسی واقعہ پر جو پیش آچکا ہو یعنی انسان کے دل کو دکھ دو طرح سے پہنچا کرتا ہے، بچہ ہے بیمار ہے اس احتمال کی بناء پر کہ یہ مر جائے گا جب انسان کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ مر نہ جائے اس خطرے کا تصور جو انسان کو آتا ہے تو دل کو تکلیف ہوتی ہے یہ خوف کہلاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، آنے والے واقعات سے جو خطرہ ہوتا ہے اور دل کے اندر انسان دکھ سا محسوس کرتا ہے فکری لگ جاتی ہے یہ ہے خوف جس کے تحت تاثر یہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا ہو نہ جائے اس کو کہتے ہیں خوف۔

اور ایک ہے کہ بچہ مر گیا واقعہ پیش آگیا اور اس کے بعد جو دل میں دکھ ہے اس کو عربی کے اندر حزن سے تعبیر کرتے ہیں، یہ گزرے ہوئے واقعہ پر جو تکلیف ہوتی ہے اس کو حزن سے تعبیر کرتے ہیں۔

''لاخوف علیھم ولاھم یحزنون'' کا مطلب یہ ہوا کہ نہ ان کو کسی آنے والے خطرے کی بناء پر دل میں تکلیف ہوگی اور نہ ہی کسی گزرے ہوئے واقعہ پر ان کو دکھ ہوگا اور ان الفاظ کے ساتھ تعبیر قرآن کریم میں جنت کی زندگی کی ہوتی ہے کہ جنت کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس میں نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی ڈر، دنیا کے اندر رہتے ہوئے انسان طبعی طور پر خوف وحزن سے بچ نہیں سکتا، یہاں زیادہ تر واقعات مرضی کے خلاف پیش آتے ہیں، مرضی کے خلاف پیش آنے کی جو توقع ہوتی ہے اس کی بناء پر بھی قلب کے اوپر ایک ناگوار سی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو خوف سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور طبیعت کے خلاف جو واقعات پیش آجاتے ہیں ان سے قلب کے اوپر ناگواری کی جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کو حزن سے تعبیر کیا جاتا ہے، دنیا کے اندر خوف اور حزن یہ انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔

بعض چیزوں کا ڈر ہے اور بعض واقع ہو چکی ہیں ان کا دکھ ہے اور جنت کی زندگی ایک ایسی زندگی ہوگی کہ جس کے اندر نہ آنے والے واقعات کا انسان کے اوپر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ کوئی واقعہ ایسا پیش آئے گا جس کے پیش آنے کے بعد انسان کے دل کو تکلیف ہو اس لیے '' لاخوف علیھم ولاھم یحزنون'' یہ جنت کی زندگی کا ایک عنوان ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے دوبارہ جنت میں چلے جائیں گے خوف وحزن کی زندگی سے نجات پا جائیں گے۔

''وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا'' اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور میری آیات کی تکذیب کی، آیات آیت کی جمع ہے ویسے تو نشانی کو کہتے ہیں ایسی آیات جو احکام پر دال ہوں یا معجزات وہ سب اس کا مصداق ہوتے ہیں، آفاق پر ایسی نشانیاں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اوپر دلالت کرتی ہیں ان کو بھی آیات کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

کفر اور تکذیب میں فرق:

ان دونوں کے درمیان میں فرق یہ ہے کہ کفر قلب کے ساتھ ہوتا ہے اور تکذیب زبان کے ساتھ ہوتی ہے، دل میں غلط عقیدہ بٹھالیا یہ دل کا کفر ہے اور زبان سے اس کا اظہار کر دیا یہ زبان سے اللہ کے احکام کی تکذیب ہے، جس طرح اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ایمان کے دو درجے ہوتے ہیں کہ دل سے مانا جائے اور زبان سے اقرار کیا جائے، اس طرح ایک آدمی دل سے نہیں مانتا اور زبان سے جھٹلاتا ہے تو کفر اور تکذیب ان دونوں کے لیے استعمال ہوگا، جیسے توبہ اور استغفار کے اندر بھی یہی فرق کیا جاتا ہے کہ توبہ اصل کے اعتبار سے قلب سے ہوتی ہے اور استغفار زبان سے۔

زبان سے جب انسان اظہار کرتا ہے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے تو اس کو استغفار سے تعبیر کر دیتے ہیں اور توبہ اصل کے اعتبار سے قلب سے ہوتی ہے توبہ استغفار کا مطلب کہ قلب میں بھی ندامت محسوس کرو اپنے کیے پر اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرو کہ ہم سے غلطی ہوگئی یہ معاف کر دی جائے اور آئندہ میں ایسا نہیں کروں گا زبان سے جب انسان اس طرح ظاہر کرتا ہے یہ استغفار ہو گیا پھر توبہ و استغفار، کفر و تکذیب، اقرار و تصدیق دونوں کے درمیان فرق کر دیا جاتا ہے کہ ایک کو قلب سے لگا دیا اور ایک کو زبان سے لگا دیا۔

"اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ" یہ جہنم والے ہوں گے۔

"هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ" اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

سجدہ کی اقسام واحکام:

اللہ تعالیٰ نے جو فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں تو یہ سجدہ غیر اللہ کو ہے تو کیا اللہ کے غیر کو سجدہ کرنا جائز ہے؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو کروایا؟

اس بارے میں عرض یہ ہے کہ سجدہ دو قسم پر ہے، ایک ہے سجدہ عبادت اور ایک ہے جس کو سجدہ تعظیمی کہتے ہیں ان دونوں کے درمیان میں فرق انسان کے عقیدہ سے ہوتا ہے جس کے سامنے وہ جھکتا ہے جس کو وہ سجدہ کرتا ہے اگر تو اس میں الٰہ والی صفات مانتا ہے اس کو اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھتا ہے، اپنے حالات کا جاننے والا عالم الغیب مانتا ہے اور اس کے لیے تصرف کا قائل ہے کہ بنانا، بگاڑنا اس کے اختیار میں ہے جو الٰہ کے مفہوم میں آپ کے سامنے باتیں ذکر کی جایا کرتی ہیں۔

سورۃ الفاتحہ میں عبادت کے تحت یہ عرض کیا تھا کہ اپنے اوپر کسی کا تسلط غیبی اس درجے میں مان لینا کہ اس سے بڑا کوئی درجہ متصور نہ ہو اور انتہائی عظمت محسوس کرتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی تذلل اور انکساری کا اظہار یہ عبادت کہلاتا ہے اگر اس قسم کے جذبے کے تحت وہ سجدہ کیا گیا ہے تو وہ سجدہ عبادت ہے اور ایک ہوتا ہے کہ اس قسم کے جذبات تو نہیں ہیں اور نہ اپنے مسجود لہ کے اندر اس قسم کی صفات مانتے ہیں بلکہ جس طرح سے آج کل ہم محبت کے ساتھ سلام کرتے ہیں یا اپنے بزرگوں کے ہاتھ چوم لیتے ہیں یہ عظمت کا اقرار ہے اور ان کے سامنے اپنی پستی اور اپنے چھوٹے ہونے کا اظہار ہے تو اسی درجے میں تعظیم کی جائے سر ٹیک کر اور زمین کے اوپر سر رکھ کر جس کو سجدہ کہتے ہیں تو یہ سجدہ تعظیمی ہے ظاہری طور پر فعل ایک ہی ہے۔

لیکن دونوں کے درمیان میں فرق انسان کے عقیدے کے ساتھ ہے یہ سجدہ تعظیمی گزشتہ امتوں کے اندر جائز تھا، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم کروائی سجدے کے ساتھ، یوسف علیہ السلام کے والدین نے بہن بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے اسی طرح سے سجدہ کیا تو یہ سجدہ، سجدہ تعظیمی کہلاتا ہے پچھلی امتوں میں یہ جائز تھا اور ہماری امت میں سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد اس شریعت میں جو قرآن وحدیث کی طرف منسوب ہے اس نے سجدہ تعظیمی کو بھی حرام ٹھہرادیا۔

حدیث شریف میں آتا ہے سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا کہ کسی جگہ کا رواج ہے کہ وہ اپنے بڑے کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ رواج ذکر کر کے اجازت چاہی کہ آپ زیادہ حقدار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور یہ کہا کہ اگر میں کسی کو حکم دینے والا ہوتا کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کرے تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کیا کرے، اللہ تعالیٰ نے جو خاوند کے حقوق بیوی پر بنائے ہیں اس کا تقاضہ تھا کہ بیوی خاوند کو سجدہ کرے تو جب بیوی کو اجازت نہیں دی گئی خاوند کو سجدہ کرنے کی تو پھر اللہ کی مخلوق میں سے کسی دوسرے کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو ذکر کیا الفاظ بولوں گا تو آپ پر سجدہ واجب ہوجائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کیا کرو سجدہ اس کو کیا کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے، وہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب صرف سجدہ خالق کے لیے ہے اور کسی دوسرے کے لیے نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو سجدہ کرنے سے بھی ممانعت کردی اور اس بات کو گوارہ نہیں کیا۔

اور یہ روایت تقریباً بیس صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اس لیے اس کا درجہ تواتر کا ہے اور جو جواز ان واقعات سے سجدے کا معلوم ہوتا ہے ان کے نسخ کے لیے یہ روایت حجت ہے، قرآن کریم کی ان آیات سے جو جواز نکلتا ہے کہ اس قسم کا سجدہ کیا جاسکتا ہے یہ روایت اس سجدے کے نسخ کے لیے حجت ہے جبکہ قرآن کریم میں اس قسم کے دوسرے اشارے موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدے کی علی الاطلاق ممانعت ہے اور سجدہ صرف خالق کے لیے ہے اور کسی دوسرے کے لیے نہیں، یہ تقریر کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی جب کہ ہم تسلیم کرلیں کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا تھا یہ آدم علیہ السلام کو ہی کیا گیا تھا اور ''وضع الجبه علی الارض'' کی صورت میں کیا گیا تھا اور یوسف علیہ السلام کو جو سجدہ کیا گیا تھا وہ یوسف علیہ السلام کو ہی کیا گیا تھا اور وضع الجبه علی الارض کی صورت میں کیا گیا تھا زمین پر پیشانی رکھنے کی صورت میں کیا گیا تھا، ان دونوں باتوں کو تسلیم کرلینے کے بعد پھر یہ تقریر ہے کہ یہ سجدہ اب منسوخ ہے اور اس پر اجماع امت ہے۔

فقہاء میں سے کسی فقیہ نے اجازت نہیں دی، صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کا اس کے متعلق جواز کا قول نہیں ہے تابعین میں سے کسی کا جواز کا قول نہیں ہے اور ہندوستان کے بعض صوفیاء کی طرف نسبت کی گئی ہے کہ ان کی مجلس کے اندر سجدہ کیا جاتا تھا یہ ان کی ہمیشہ غلطی قرار دی گئی اور ان کا عمل حجت نہیں ہے اگر انہوں نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر ایسا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ معذور ہیں اور اگر کسی تعبیر کی غلطی پر کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے بہر حال ان کے اس عمل کے اوپر مدار نہیں رکھا جا سکتا، ان کا عمل اس کے جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے، ان پر ملامت بھی نہیں کرنی چاہیئے کہ متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں ناواقفیت، علم کی کمی، تحقیق کی کمی، کسی تاویل وغیرہ کی غلطی بہر حال ان کے عمل سے جواز نہیں ثابت کیا جا سکتا اور اگر یہ تسلیم ہی نہ کیا جائے کہ یہ سجدہ آدم علیہ السلام کو تھا اور اسی طرح سے یہ بھی تسلیم نہ کیا جائے کہ زمین کے اوپر پیشانی رکھ کر انہوں نے سجدہ کیا تھا تو ان دونوں کی بھی گنجائش ہے۔

مفسرین نے یہ اقوال اختیار کیے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ فرشتوں نے کیا تھا تو آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ یہ ایسے تھا جس طرح سے ہمارے لیے کعبۃ اللہ ہے کہ ہم بھی کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں بظاہر ہمارا سجدہ اس کوٹھے کو ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے عبادت اللہ کی ہے ہاں البتہ جس طرف منہ کرا کر سجدہ کرا لیا کسی نہ کسی درجے میں اس کی عظمت نمایاں ہوگئی تو حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے لیے بطور کعبہ کے قائم کیا گیا اور آدم علیہ السلام کی طرف منہ کر کے جو فرشتوں نے سجدہ کیا وہ سجدہ اللہ کو تھا اور اس میں عظمت نمایاں تھی حضرت آدم علیہ السلام کی یہ تاویل بھی اس میں کی گئی ہے۔

یہ آپ کتابوں کے اندر پڑھیں گے اور غالباً جلالین کے اندر بھی یہ قول آیا ہے کہ سجدہ ''وضع الجبہ علی الارض'' کے طور پر نہیں تھا بلکہ مطلقاً انہماک کو سجدے سے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ تعظیماً جھک گئے اگرچہ اس طرح کا جھکنا یہ بھی ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ان کے بھائی اس طرح سے جھکے تعظیم کے طور پر اور سجدہ اللہ کو کیا شکر ادا کیا گویا کہ یوسف علیہ السلام کی حالت کو دیکھ کر منہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا حقیقت میں اللہ کا شکر ادا کرنا مقصود تھا۔

اور یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا یوسف علیہ السلام کے لیے نہیں تھا یہ تاویلیں بھی تفسیر کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں اور '' اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال'' جب یہ احتمال بھی موجود ہیں ان آیات کے اندر تو یہاں سے سجدہ تعظیمی کے جواز کے لیے استدلال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

بہر حال زیادہ پختہ بات پہلی ہے اس میں زیادہ تاویلات کی ضرورت پیش نہیں آتی، تسلیم کر لیں کہ یہ سجدہ وضع الجبہ کے ساتھ تھا تسلیم کر لیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو تھا لیکن ہم یہ کہیں

گے کہ ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا اور یہ سجدہ تعظیمی تھا سجدہ عبادت نہیں، سجدہ عبادت کبھی کسی شریعت میں مشروع نہیں ہوا جس طرح سے آج مصافحہ ہے معانقہ ہے تقبیل ہے ہم محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کام کر لیتے ہیں۔

پچھلی امتوں میں یہ سجدہ اس درجے میں تھا جیسے آج یہ مصافحہ معانقہ تقبیل وغیرہ ہے، دست بوسی، پاؤں بوسی جو صورت بھی ہو اور اس صورت کو شریعت کے اندر منع کر دیا گیا کیونکہ اس میں جاہلوں کے لیے عقیدے کے خرابی کی گنجائش ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی نہ رہے سجدہ عبادت بن جائے اور حضور ﷺ کی شریعت چونکہ آخری شریعت ہے اس کے بعد کوئی نبی نہیں آنا کہ وہ آ کر ہدایات دے تو اس صورت کو بھی ممنوع ٹھہرا دیا گیا کہ جس کی صورت شرک کے ساتھ ملتی جلتی ہو تو یہ ہے اس مسئلے کی تحقیق جو آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔

حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش اور عورت کی فطرت:

اگلی آیات جو آپ کے سامنے پڑھی گئیں ان کا حاصل یہ ہے کہ یہ واقعہ پیش آ گیا کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی عظمت کا اعتراف کر لیا اور ابلیس آدم علیہ السلام کے سامنے نہ جھکنے کی بناء پر مردود ہو گیا اب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اور ان کی بیوی کو جو آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے کے بعد روایات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی کسی پسلی سے کوئی مادہ لے کر اس کو بنیاد بنا کر یہ ان کے لیے زوجہ بنا دی گئی تا کہ اس کے ساتھ سکون حاصل کریں۔

پسلی سے کوئی مادہ لیا گیا تھا جس سے بنائی گئی صحیح روایات میں یہی ہے اس لیے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کے متعلق میری وصیت قبول کرو کہ ان کے اوپر زیادہ سختی نہ کیا کرو ان کی طبیعت میں فطری طور پر کجی ہے ان سے فائدہ اٹھاؤ ان کی کجی کو دیکھتے ہوئے ان کو زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی کیونکہ ان کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے اور ان کی خلقت کے اندر، ان کی فطرت کے اندر کسی نہ کسی درجے کی کجی ہے اور ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے نکال دو گے طلاق دے دو گے اور اگر یہ چاہو کہ یہ بالکل سیدھی ہو جائے اور ہمارے ساتھ پوری طرح سے موافقت کرے یہ بہت مشکل ہے عورت کی طبیعت کے اندر مرد کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ کجی ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ کجی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھاؤ اور اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی اور اس کا ٹوٹنا یہ ہے کہ طلاق ہو جائے گی تو آدم علیہ السلام کی پسلی سے کچھ مادہ لے کر اس کو بنیاد بنا کر آدم علیہ السلام کی بیوی بنا دی گئی تھی تو اس کے بننے کے بعد یہ حکم ہوا کہ تو بھی اور تیری بیوی

بھی دونوں جنت میں رہیں بیوی سے مراد حواء علیہا السلام ہے اور حواء علیہا السلام کا نام قرآن میں نہیں آیا ہو اور روایات سے معلوم ہوتا ہے اور تم دونوں اس جنت میں جو چاہو، جہاں سے چاہو کھاؤ تمہیں کھلی چھٹی ہے صرف ایک درخت کی پابندی لگاتا ہوں کہ اس کے قریب نہ جانا، قرآن کریم کی آیات میں اور حدیث شریف کی صحیح روایات میں کہیں بھی مذکور نہیں کہ اس شجرہ سے کونسا شجرہ مراد ہے لوگوں نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں، وہ احتمال کے درجے میں ہیں اور قرآن کریم کی تفسیر اس پر موقوف نہیں کہ تعیین کی جائے یہ اللہ تعالیٰ نے ایک قسم کا امتحان متعین کیا آدم علیہ السلام کے لیے ان کو ایک چیز کی ممانعت کردی باقی لاکھوں چیزوں کی چھٹی دے دی۔

جس طرح آج دنیا میں رہتے ہوئے بھی ہمارے لیے ایسے ہی ہے کہ ممنوعات، محرمات وہ چند گنتی کی چیزیں ہیں یہ نہ کرو، یہ نہ کرو، یہ نہ کرو، یہ چیز کھانی نہیں، یہ چیز کھانی نہیں، باقی ساری دنیا سے تمہیں فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی یہ بھی ایک قسم کا امتحان ہے لیکن انسان کی طبیعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے حکمت کے تحت ایک یہ کمزوری رکھی ہے کہ ''الانسان حریصٌ علی ما منع'' جدھر سے اس کو روکا جائے ادھر ہی کو اس کی طبیعت زیادہ متوجہ ہوتی ہے یہ مقام امتحان ہے انسان کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے پابندی لگادی یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے قریب بھی نہ جانا قریب جانے کی ممانعت ہے جیسے کہیں کہ ''لاتقربوا الزنا'' زنا کے قریب بھی نہ جانا، مطلب یہ ہے کہ اس کے مقدمات اور اس قسم کے اسباب کہ جن کے ذریعے سے انسان وہاں تک پہنچ سکتا ہو ان سے بھی بجوشدت کے ساتھ بچنا، اس کا بیان ہوتا ہے کہ اس کام کے قریب بھی نہ جاؤ اگر قریب چلے جاؤ گے تو نقصان اپنا کرو گے یہ بات آدم علیہ السلام کو سمجھا دی گئی، جنت میں آدم علیہ السلام رہنے لگ گئے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے شیطان کی دشمنی کا آغاز:

اب وہ ابلیس چونکہ آدم علیہ السلام کی وجہ سے مار کھا چکا تھا شکست کھا گیا تھا اللہ کے ہاں وہ مردود ہوگیا، ملعون ہوگیا اور وہ سمجھتا تھا کہ آدم علیہ السلام کی بناء پر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہے تو حسد کی بناء پر، تکبر کی بناء پر اس نے سجدہ کرنا گوارہ نہیں کیا تھا اور اس گوارہ نہ کرنے کی بناء پر وہ مردود، ملعون ہوا تو غصہ اور بھڑک گیا، چنانچہ سورۃ اعراف میں آپ کے سامنے آئے گا کہ اس نے اللہ کے سامنے ندامت اور شرم ساری کا اظہار کرنے کی بجائے جس وقت اللہ نے اس کے اوپر ناراضگی کا اظہار کیا وہ نادم نہیں ہوا، شرم سار نہیں ہوا اور یاد رکھیئے جو شخص گناہ کرنے کے بعد معافی مانگ لیتا ہے اور وہ شخص جو گناہ کرنے کے بعد معافی نہیں مانگتا ان دونوں میں فرق ہے کہ طبعی کمزوری کی بناء پر انسان سے جو غلطی ہوتی ہے اس پر توبہ کرنے میں، ندامت کا اظہار کرنے میں انسان ذرا سی ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کرتا۔

ایک آدمی پکڑا گیا اس نے غلطی کر لی وہ کہے گا ہاں جی مجھ سے غلطی ہو گئی اور میری غلطی ہے میں نے کوتاہی کی مجھے معاف کر دیا جائے بہت جلدی مان جائے گا لیکن جو گناہ کسی نے تکبر کی بناء پر کیا ہو یا کسی کے ساتھ حسد کی بناء پر کیا ہو وہ وہاں جھکنے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہو گا۔

ابلیس کا گناہ جو تھا وہ آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کی بناء پر تھا اور تکبر کی بناء پر تھا اس لیے جس وقت اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اُسے یہ کہنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ مجھ سے غلطی ہو گئی میں اب آدم کو سجدہ کر دیتا ہوں، یہ بات اس کے تکبر کے بھی منافی تھی اور اس کے حسد کے بھی منافی تھی تو وہ آگے سے اکڑ گیا اور اکڑنے کے بعد اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی اولاد کے متعلق جس قسم کا اظہار کیا سورۃ اعراف میں اس کی تفصیل آئے گی جس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح سے آج کوئی کہے اچھا یہ آپ کا بہت چہیتا ہے جس کی وجہ سے آپ نے میرے اوپر بہت سختی کی ہے دیکھوں گا کوئی موقع ملا تو میں بتاؤں گا کہ یہ آپ کا کتنا فرمانبردار ہے اس کی فرمانبرداری آپ کے سامنے آجائے گی ذرا مجھے مہلت دو میں اس کی غلطیاں پکڑ کر آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیا کرتا ہے کیا نہیں کرتا جب دو میں مقابلہ ہوتا ہے تو پھر اس قسم کے جذبات ہوتے ہیں، تو ابلیس نے بھی وہاں اسی طرح سے کیا کہ ٹھیک ہے بہت لاڈلا ہے آپ کا، ذرا مہلت دے کر دیکھو میں نے اس کا سارا لاڈلا پن نہ نکال دیا تو کہنا، جس کی آج اتنی عزت افزائی کر رہے ہو اور ہم نے اس کو سجدہ نہیں کیا ہمیں مردود کر دیا، میں دیکھوں گا کہ کتنا فرمانبردار بن کر رہتا ہے آپ کا، اگر اس کی ساری کی ساری اولاد کو قابو نہ کر لیا تو پھر کہنا۔

''لاتجد اکثرھم شاکرین'' تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائے گا، اس طرح سے کھڑے ہو کر گویا کہ اس نے تقریر جھاڑ دی کہ مجھے ذرا چھٹی دو میں بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے بھی کہہ دیا چل مہلت ہے کر لینا جو کچھ تجھ سے ہوتا ہے اور آدم علیہ السلام کو کچھ ہدایات دے دیں۔

اندازہ کیجئے آپ کہ ابلیس کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں اور آدم علیہ السلام جنت میں اعزاز کے ساتھ اور بڑے احترام کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں اور اب وہ حیلہ جوئی کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو کسی نہ کسی طریقہ سے پھسلائے اور جیسے اس نے آدم علیہ السلام کا تابوت پڑا ہوا دیکھا تھا اور دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کو بہکایا جا سکتا ہے، اسی سے اس کی حوصلہ افزائی ہوئی کہ کوئی نہ کوئی راستہ اس قسم کا تلاش کروں کہ آدم علیہ السلام کو بہکاؤں۔

شیطان کا طریقہ واردات؟

حضرت آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لیے اس نے طریقہ کیا اختیار کیا؟ سورۃ الاعراف میں اس کی تفصیل

آئے گی چونکہ واقعہ شروع ہو گیا ہے اس لیے اس کو یہیں عرض کر دیتا ہوں ، طریقہ اس نے یہ اختیار کیا کہ آدم علیہ السلام کے ساتھ جس طرح سے میل جول ہو گیا یا تو جنت میں اس کا بھی آنا جانا تھا، اللہ نے مردود، اس کو کر دیا تھا لیکن ابھی وہ آسمان سے اترا نہیں تھا جیسے اس رکوع سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو سمجھانے کے لیے کہتے ہیں کہ جیسے ایک کریم آقا کا حال ہوتا ہے کہ اگر نوکر گستاخی کرے تو اس کو کہہ دیا جاتا ہے کہ نکل جا یہاں سے، دفعہ ہو جا یہاں سے، نوکری سے اس کو معزول کر دیا لیکن فوراً بوریا بستر اٹھا کر باہر نہیں پھینک دیا جاتا آہستہ آہستہ وہ اپنا کوئی انتظام کر کے دو چار دن میں چلا جاتا ہے یہ نہیں کہ اسی وقت بوریا بستر اٹھایا اور باہر پھینک دیا، چاہے اس کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا لیکن اس کو فوراً گھر سے نہیں نکال دیا جاتا، اسی طرح سے یہ مردود ہو گیا تھا، لیکن ابھی اس کی آمد و رفت تھی یا جنت میں نہ جاتا ہو آسمان میں گھومتا پھرتا تھا اور آدم علیہ السلام جنت میں گھومتے پھرتے کہیں جنت کے دروازے پر آ گئے ہوں اور وہیں آپس میں ملاقات ہو گئی جب ملاقات ہوئی تو علیک سلیک ہو گئی، جس طرح ووٹ لینے والے ممبر بڑے مخلص بڑے مومن اور سب کچھ ہو جایا کرتے ہیں، اس طرح وہ بھی جب آدم علیہ السلام کو دیکھتا ہو گا بڑے ادب و احترام کے ساتھ پیش آتا ہو گا ظاہری طور پر داؤ کھیلنے کے لیے کہ کسی طرح اس کو قابو کروں باتیں کرتے کرتے معلوم کر لیا کہ جنت کی نعمتوں کا کیا حال ہے، کیا تمہیں اللہ نے کسی چیز سے روکا بھی ہے۔

وہ کہنے لگے جی ہاں ہمیں فلاں درخت سے روکا ہے، یہ صورت یوں بنے گی ان آیات کی طرف دیکھتے ہوئے، فلاں درخت سے روکا ہے اور باقی ہمیں ہر چیز کھانے پینے کی اجازت دی ہے، وہ کہتا ہے کہ آدم میں تجھے ایک بات بتاؤں یہ جو اللہ تعالیٰ نے تجھے اس سے روکا ہے وہ ابتداء ابتداء کی بات تھی جس وقت تو نیا نیا جنت میں گیا تھا کہ وہ بہت قوی غذا ہے اور جس وقت معدہ نیا نیا ہوتا ہے تو وہ قوی غذا کو ہضم نہیں کر سکتا، جیسے آپ کو سمجھانے کے لیے کہوں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو گوشت کتنی لذیذ غذا ہے اور یہ بھینس کا دودھ کتنا ہی قوت بخش ہے اور مکھن کتنا ہی اچھا ہے، مرغی کا انڈہ کتنا ہی مقوی ہے۔

لیکن پیدا ہونے والے بچہ کو تو نہیں دیا جاتا، ممانعت ہوتی ہے کہ اس بچے کو گوشت نہیں کھلانا، بچے کو مکھن نہیں کھلانا، بچے کو انڈہ نہیں دینا کیونکہ اس کا معدہ ابھی ان چیزوں کا متحمل نہیں ہے جب وہ دنیا کی چیزیں کھا کھا کر اس قابل ہو جاتا ہے کہ انڈہ ہضم کرے، گوشت کھالے اور دودھ اچھی طرح سے پی لے، مکھن کھالے پھر سیروں کے حساب سے کھاتا ہے الٹا وہ اس کی قوت کے اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

وہ تو نئی بات تھی تم جنت میں گئے تھے وہ بہت مقوی غذا ہے تو اس لیے تمہیں روک دیا کہ تم پہلے جنت کی نعمتوں کے ساتھ مانوس ہو جاؤ ورنہ اس درخت کا اثر یہ ہے کہ اگر تم اس کو کھالو گے تو تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی اور دوسرے یہ تمہارا ملک اور تمہاری یہ سلطنت اور تمہاری یہ بادشاہت ہمیشہ کے لیے قائم رہے گی یہ لفظ قرآن کریم میں آئے ہوئے ہیں" هل ادلك على شجرة الخلد وملك لايبلى " میں تمہیں ایسے درخت کی رہنمائی نہ کروں جو" شجرة الخلد " ہے کہ جو اس کو کھالے اس کو موت نہیں آتی اور اسی طرح" ملك لايبلى "اور تیری ایسی سلطنت کی طرف رہنمائی نہ کروں جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوگی ہمیشہ کے لیے بادشاہ بن جاؤ گے ہمیشہ اسی طرح سے رہو گے، شیطان نے اس طرح سے تقریر شروع کردی کہ یہ شجرة الخلد ہے اس کے کھانے کے ساتھ انسان موت سے بچ جاتا ہے جیسے آب حیات کے متعلق مشہور ہے کہ جو اس کو پی لے اس کو موت نہیں آتی تو شیطان نے کہا یہ" شجرة الخلد " ہے اور اس کے کھانے کے ساتھ انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور ایسی سلطنت مل جاتی ہے جو کبھی بوسیدہ نہیں ہوتی چونکہ بہت قوت والا درخت ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابتداء ابتداء میں تمہیں اس کی ممانعت کردی تھی کہ اس کو نہ کھالینا تمہارے اندر صلاحیت نہیں ہے اس کو ہضم کرنے کی اور اگر اس وقت کھالیتے تو آپ کا نقصان ہوتا۔

جس طرح سے بچے کو اگر آپ مقوی غذا دے دیں تو اس کو پچس لگ جائیں گے، پیٹ میں درد ہو جائے گا، بچے کا نقصان ہو جائے گا اسی طرح سے تجھے جو ممانعت کی گئی تھی کہ تو اس کو نہ کھائیو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

مطلب یہ تھا کہ ابھی آپ میں صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی اور اب تو صلاحیت پیدا ہوگئی اگر آپ کھالو گے تو کھانے کے ساتھ تمہیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے گی، ہمیشہ کے لیے سلطنت حاصل ہو جائے گی اور کبھی بھی تم موت کا شکار نہیں ہوؤ گے اور اس بات کو بیان کرنے کے بعد" قاسمهما انى لكما لمن الناصحين " قرآن کریم نے جو ابلیس کی طرف سے بات نقل کی ہے" قاسمهما " ان دونوں کے آگے وہ اللہ کی قسم کھا گیا ساتھ ہی یہ کہنے لگا " انى لكما لمن الناصحين " میں تمہارے لیے خیر خواہوں میں سے ہوں۔

کیونکہ ہر غلط کار آدمی جب کسی کو کسی غلط راستے کی طرف لگاتا ہے تو اپنے آپ کو اس کے لیے خیر خواہ ثابت کرتا ہے، میں تیرا بڑا خیر خواہ ہوں، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تیرے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں، تو بتا تو سہی بھلا اس میں میرا کوئی فائدہ ہے، اب اگر تم موت سے بچ جاؤ اور تمہیں ہمیشہ کے لیے جنت نصیب ہو جائے، ہمیشہ کے لیے بادشاہت تمہیں مل جائے اس میں میرا کیا فائدہ ہے؟ میں تو تمہارے لیے خیر خواہوں میں سے ہوں " قاسمهما " اور ان کے سامنے قسمیں کھا گیا۔

اب بابا ہمارا بھولا بھالا اس کو کیا معلوم تھا کہ شیطان کیا کیا کرتب کھیلتے ہیں، وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اللہ کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے کہ چاہے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہیں جو کچھ بھی ہے لیکن اللہ کا نام لے کر قسمیں کھا کر بھی کوئی جھوٹ بول سکتا ہے اور جو صوفی مزاج بندے ہوتے ہیں سب کا یہی حال ہوتا ہے جلدی سے دوسرے پر اعتماد کر لیتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم خدا سے ڈرتے ہیں دوسرے بھی اسی طرح خدا سے ڈرتے ہیں، جیسے ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیتے شاید ہمیں بھی کوئی دھوکہ نہیں دیتا، اسی لیے تو محدثین کہتے ہیں کہ صوفی کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔

وہ کہتے ہیں جس سند کے اندر کوئی صوفی آ جائے اس سند سے ہاتھ دھو لو وہ سند کسی کام کی نہیں ہے وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ خود نیک ہوتے ہیں، خود جھوٹ بولتے نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ شاید دوسرا بھی جھوٹ نہیں بولتا اس لیے وہ ہر ایرے غیرے کے اوپر اعتماد کر کے روایت لے لیتے ہیں اور اکثر ان کو روایت سنانے والے اس قسم کے لوگ ہوتے ہیں جس کی بناء پر صوفیاء کے ہاتھوں میں غلط روایتیں آجاتی ہیں جس کو وہ آگے نقل کرتے رہتے ہیں ''اذا کان في السند صوفي فاغسل یدیك'' جس وقت کسی سند کے اندر صوفی آ جائے اپنے ہاتھ دھو لو وہ سند کسی کام کی نہیں ''روایة صوفي لایعتبر'' صوفی کی روایت معتبر نہیں ہے محدثین کے نزدیک اس کی وجہ یہی ہے کہ تحقیق نہیں کرتے جو آ کر کان میں پھونک مار دے یہ اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

تو یہ بھولا بھالا جو ہوتا ہے یہ اصل خوش اعتقادی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم اللہ سے ڈرتے ہیں اسی طرح دوسرا بھی اللہ سے ڈرتا ہے جیسے ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولتے کوئی دوسرا بھی نہیں بولتا ہوگا، جیسے ہم کسی کو دھوکہ نہیں دیتے کوئی دوسرا بھی دھوکہ نہیں دیتا ہوگا اس لیے وہ اپنے جیسا سمجھ کر جلدی سے اعتماد کر لیتے ہیں ''المرء یقیس علی نفسه'' جس طرح سے آپ کہا کرتے ہیں کہ نیک آدمی دوسرے کو نیک سمجھتا ہے اور جو خود گڑبڑ ہوتا ہے وہ دوسرے کو بھی گڑبڑ سمجھتا ہے عام طور پر جس طرح سے آپ کہا کرتے ہیں۔

بہر حال نیک بندوں میں جو صوفی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ان میں تحقیق کا جذبہ نہیں ہوتا یہ تو واقعہ ہی پہلا تھا آدم علیہ السلام کے سامنے، اللہ تعالیٰ کی محبت آدم علیہ السلام کے دل میں، اللہ کی عظمت آدم علیہ السلام کے دل میں، اللہ کا خوف آدم علیہ السلام کے دل میں اب وہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ کوئی اللہ کا نام لے کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے، اس لیے ہمارا بابا اس گڑبڑ میں آ گیا اور انہوں نے اس بات کا اعتبار کر لیا کہ اچھا ٹھیک ہے ایسی بات ہے تو ہم درخت کو کھا لیتے ہیں اور کھانے کے بعد ہیشگی کی زندگی حاصل ہو جائے گی، اور انہوں نے وہ درخت کھا لیا اور درخت کا کھانا ہی تھا

یعنی جو ممانعت تھی اس کا ارتکاب ہو گیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح ناراضگی کا اظہار ہوا کہ جس طرح سے ابلیس نے غلطی کی تھی تو اس کو تیز لب ولہجہ کے ساتھ کہا تھا'' مامنعك ان تسجد اذ امرتك '' جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو نے سجدہ نہیں کیا کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا، یہ سوال تھا جس کے آگے وہ اکڑ گیا۔

آدم علیہ السلام کی ندامت اور توبہ:

آدم علیہ السلام پر بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح سے سوال کیا کہ میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ اس درخت کے قریب نہیں جانا اور اس ابلیس کی باتوں میں نہیں آنا، اب آدم علیہ السلام نے جو غلطی کی، آدم علیہ السلام کی جو یہ کوتاہی تھی اپنی طبعی کمزوری کی بناء پر تھی یہ کوئی تکبر کی بناء پر، حسد کی بناء پر یا کسی ایسی بات کی بناء پر نہیں تھی جب اس کی ایک طبعی کمزوری کی بناء پر یہ غلطی پیش آئی تھی تو آدم علیہ السلام فوراً اللہ کے سامنے جھک گئے کہنے لگے یا اللہ! مجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دے اگر تو مجھے معاف نہیں کرے گا تو میں واقعی خسارے میں پڑ گیا، اب آدم علیہ السلام نے اس طرح سے اللہ کے سامنے رونا شروع کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ توبہ اس وقت قبول نہیں حکم دیا کہ چلو نکلو یہاں سے جا کے دنگل مچاؤ زمین میں یہاں تمہاری لڑائی کا مقام نہیں ہے، اب ابلیس نے چوٹ کھائی ہوئی تھی آدم علیہ السلام سے، اب آدم علیہ السلام نے چوٹ کھائی ابلیس سے ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر اس دنیا میں اتار کر اس دنیا کو میدان جنگ بنا دیا۔

آدم علیہ السلام داؤ کھیلتے ہیں ابلیس کے خلاف اور ابلیس داؤ کھیلتا ہے آدم علیہ السلام کے خلاف اب میدان جنگ یہی آپ کی زمینی زندگی ہے اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف مشتعل کر کے اس میدان میں اتار دی گئیں لیکن آدم علیہ السلام کو تو فکر یہی لگی ہوئی تھی کہ میرا آقا میرے سے ناراض ہو گیا روتے رہے روتے رہے آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہربانی ہوئی کہ ان کو چند کلمات بطور توبہ کے سکھائے گئے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے اوپر اتنا غم طاری ہوا اور اتنا صدمہ ہوا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کہ آدم علیہ السلام کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے معافی کس طرح سے مانگوں، اللہ تعالیٰ کے خوف کی بناء پر جیسے ایک بچہ ہے غلطی کر کے استاد کے سامنے آگیا اب وہ چاہے ہاتھ باندھے کھڑا ہے رو بھی رہا ہے لیکن اس کو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ میں کیا لفظ بولوں کتنی دیر اس طرح کھڑا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے اور پھر استاد بولتا ہے کہ اچھا کہہ پھر وہ کہتا ہے میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا، کہہ کہ دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا اور عہد کرتا ہوں کہ پھر ایسا کبھی نہیں کروں گا

استاد کہلاتا جاتا ہے اور طالب علم پیچھے کہتا چلا جاتا ہے جب وہ اپنی زبان سے ادا کر لیتا ہے تو کہتے ہیں چل معاف کیا، خود الفاظ کہلوا لیے خود الفاظ کہلوانے کے بعد خود ہی کہہ دیا کہ چل تجھے معاف کیا۔

تو یہاں اسی طرح سے آدم علیہ السلام نے اللہ کے سامنے اس طرح سے گریہ زاری ظاہر کی غم اور صدمے کا اظہار کیا معلوم نہیں کتنے برس روتے رہے تو پھر اللہ نے کہا کہ اچھا یوں کہہ کہ" ظلمت نفسی "میں نے اپنا قصور کر لیا" ربنا ظلمنا انفسنا "یا اللہ ہم نے اپنے نفسوں کے اوپر ظلم کیا "ان لم تغفر لنا وترحمنا "اگر تو ہمیں نہیں بخشے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا ہم تو بہت خسارہ پانے والے ہو جائیں گے یہ ہیں وہ کلمات جو آدم علیہ السلام نے اللہ سے لیے" فتلقی آدم من ربہ کلمات "یعنی یہ کلمات بھی اللہ نے سکھائے تو اللہ سے یہ کلمات سیکھ کر جب ادا کیے تو اللہ نے توبہ قبول کر لی قبول کرنے کے بعد اپنی رضا کا اظہار تو کر دیا لیکن ساتھ یہ کہہ دیا کہ اب رہنا دنیا میں ہی ہے کہ اب تمہارا میدان زمین ہے آسمان نہیں کیونکہ تمہیں پیدا ہی کیا گیا تھا زمین میں خلیفہ بنانے کے لیے اب جاؤ اب وہاں جا کر دیکھو کہ تمہاری آپس میں کیا گزرتی ہے۔

میں تمہاری رہنمائی کے لیے باتیں اتارتا رہوں گا جو ان کو قبول کرے گا وہ دوبارہ جنت والی زندگی حاصل کرے گا اور جو ان کو نہیں مانے گا، ان کا انکار کرے گا، ان کی تکذیب کرے گا وہ آخرت میں عذاب کے اندر مبتلاء ہوگا اور اس جنت کی وراثت سے وہ محروم ہو جائے گا یہ ہدایت دے کر آدم علیہ السلام کو حواء علیہا السلام کو اور ابلیس کو ان تینوں کو زمین کے اوپر آزاد چھوڑ دیا گیا، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اسی ابتدائی تاریخ کو آپ کے سامنے واضح کیا ہے، سارا مضمون ان آیات پر منطبق ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا

اے اسرائیل کی اولاد! یاد کیجئے میرے اس احسان کو جو میں نے تم پر کیا اور پورا کرو

بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

میرے عہد کو، میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو اور تم خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو ﴿۴۰﴾ اور تم ایمان لاؤ اس چیز کے ساتھ جو میں نے اتاری

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ

اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے اور نہ بنو تم اس کے ساتھ پہلے کفر کرنے والے، نہ لو میری آیات کے بدلے

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا

ثمن قلیل اور مجھ ہی سے ڈرو ﴿۴۱﴾ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور حق کو چھپاؤ نہیں

الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا

حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۴۲﴾ قائم کرو نماز کو اور دیا کرو زکوۃ اور رکوع کیا کرو

مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ

رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر ﴿۴۳﴾ کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو حالانکہ تم

تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ

کتاب کی تلاوت کرتے ہو کیا تمہیں عقل نہیں ہے ﴿۴۴﴾ مدد حاصل کرو صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ۙ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا

بے شک یہ نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر جو خشوع اختیار کرنے والے ہیں ﴿۴۵﴾ جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ بے شک وہ ملاقات کرنے والے ہیں

رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

اپنے رب کے ساتھ اور وہ خیال رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ﴿۴۶﴾

لغوی وصرفی تحقیق:

"یبنی اسرائیل" اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے اور یہ لفظ سریانی زبان کا ہے سریانی زبان میں اس کا معنی ہے عبداللہ، اسرائیل کا معنی عبداللہ، اللہ کا بندہ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کے صاحبزادے تھے حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے آگے بارہ بیٹے تھے بارہ خاندان آگے پھیلے ہیں تو بنی اسرائیل سے انہی خاندانوں کو خطاب ہے اے اسرائیل کی اولاد۔

"اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم" یاد کیجئے میرے اس احسان کو جو میں نے تم پر کیا، نعمت بمعنی احسان، یاد کیجئے میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا۔

"واوفوا بعھدی" اَوْفوا امر کا صیغہ ہے ایفاء سے پورا کرو میرے عہد کو "عھدی" کے اندر اضافت مفعول کی طرف ہے یعنی جو عہد تم نے مجھ سے کیا اس کو پورا کرو کیونکہ میں پورا کروں گا۔

"بعھدکم" تمہارے عہد کو یہاں بھی اضافت اس طرح سے مفعول کی طرف ہے یعنی اس عہد کو جو میں نے تم سے کیا، تم پورا کرو میرے عہد کو اور میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو یعنی جو میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔

"وایای فارھبون" ایای یہ مفعول مقدم کر دیا حصر پیدا کرنے کے لیے اور "فارھبون" کے آخر میں جو نون ہے اس کے نیچے جو کسرہ ہے وہ بھی دال ہے یاءِ متکلم پر جو اصل میں "فارھبونی ایای" تھا "ایای" مفعول مقدم ہے اور بعد میں جو کسرہ ہے وہ بھی دال ہے یاءِ متکلم پر مفعول کی جگہ پر ہے اس میں تاکید در تاکید ہوگئی، تم خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو، کسی اور شخص سے کسی اور چیز سے اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں، رھب ڈرنے کو کہتے ہیں تین لفظ استعمال ہوتے ہیں ① رھب ② خشیت ③ تقویٰ اور ان کا قریب قریب ہی مفہوم ہے کسی کی عظمت اور جلال کو یاد کرتے ہوئے جو انسان کے دل کے اوپر ایک لرزہ اور کپکپی طاری ہوتی ہے یہ رہبت ہے۔

اور اس عظمت اور جلال کے تصور سے جو انسان پر اپنی پستی نمایاں ہوتی ہے اپنا عجز وانکسار منکشف ہوتا ہے آواز دب جاتی ہے اور انسان خود اپنے آپ کو ایک عاجز سا محسوس کرتا ہے یہ عجز وانکساری کی کیفیت جو انسان کے اوپر طاری ہوتی ہے یہ خشیت ہے اور دل میں خوف پیدا ہو جانے کے بعد اپنے عجز اور بیچارگی کے نمایاں ہو جانے کے بعد جو ذوالجلال کی نافرمانی سے بچنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جب اپنے آپ کو عاجز محسوس کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اس کے اوپر منکشف ہو جاتی ہے تو پھر اس کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ میں اپنے مالک ذوالجلال کی نافرمانی نہ کروں، نافرمانی کرنے سے وہ بچتا ہے یہ جو کیفیت ہے یہ تقویٰ ہے تو اس لیے یہ لفظ

آپس میں تقریباً لازم ملزوم سے ہیں کہ رہبت دل میں پیدا ہوگئی تو خشیت آجائے گی اور خشیت جب آجائے گی تو تقویٰ کی کیفیت انسان میں پیدا ہوجائے گی گناہوں سے، نافرمانی سے بچنے کا جذبہ جو پیدا ہوتا ہے وہ تقویٰ ہے۔

''ایایَ فارھبون'' تم خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو۔

'' وآمنوابماانزلت '' اور تم ایمان لے آؤ اس چیز کے ساتھ جو میں نے اتاری۔

'' مصدقالمامعکم '' مصدقاً اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے'' لمامعکم '' اس کتاب کی جو تمہارے ساتھ ہے یعنی جو کچھ میں نے اتارا یہ اتاری ہوئی چیز تمہارے پاس جو کتاب ہے اس کے ساتھ ٹکراتی نہیں اس کا یہ انکار نہیں کرتی کہ تم یہ کہو کہ یہ ہماری کتاب کے مخالف ہے بلکہ یہ میری اتاری ہوئی کتاب اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے تصدیق کرتی ہے اسے سچا بتلاتی ہے تو اس سے معلوم ہوگیا کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جس طرح سے عادت ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد اپنی حکمت و مصلحت کے تحت احکام میں تغیر کرتے ہیں اب اگر کہیں تبدیلی ہے تو ایسی ہے جیسے پہلے سے ہوتی آرہی ہے، ورنہ یہ اتاری ہوئی کتاب اس کتاب کے ساتھ جو تمہارے پاس موجود ہے ٹکراتی نہیں ہے اس کے ساتھ اس کا تعلق کوئی تضاد کا نہیں ہے تصدیق کا ہے، مصدقاً کا اگر معنی کریں تصدیق کرنے والی سچا قرار دینے والی تو پھر اس کا مفہوم یہ ہے۔

اور اس مفہوم کو ان الفاظ سے بھی واضح کر سکتے ہیں کہ ''مصدقاً'' اس حال میں کہ وہ مصداق بننے والی ہے اس چیز کا جو تمہارے پاس ہے یہ اس کا مصداق ہے، مطلب پھر بھی وہی کہ تمہارے پاس جو کتاب ہے اس میں پیش گوئیاں موجود ہیں کہ ایک ایسا رسول آئے گا اور ایک ایسی کتاب اترے گی۔

اب اگر وہ رسول نہیں آتا اور وہ کتاب نہیں اترتی تو تمہاری کتاب کی پیش گوئیوں کا مصداق مہیا نہیں ہوگا اور مصداق مہیا نہ ہونا یہ تمہاری کتاب کی تکذیب کا ذریعہ بنے گا جب ایک کتاب کے اندر پیش گوئی کی گئی ہے کہ اس کے بعد ایک اور عالی شان کتاب آنے والی ہے، ایک اور عالی شان رسول آنے والا ہے، اب اس کتاب کا آجانا اور اس رسول کا آنا یعنی اس پیش گوئی کا مصداق مہیا ہوجانا یہ تمہاری کتاب کی صداقت کی دلیل ہے اب اگر تم آنے والے پیغمبر کو نہیں مانو گے اور اس پر اتاری گئی کتاب کو تسلیم نہیں کرو گے تو تمہاری کتاب کی پیش گوئیوں کا مصداق کہاں رہا۔

اور جب اس کا مصداق نہیں آئے گا جو پیش گوئی کی گئی تھی اس پیش گوئی کے سچے ہونے کی کیا صورت ہوگی اس لیے اس رسول کو ماننا اصل میں اپنی کتاب کی تصدیق ہے اور اس رسول کو مان لینا اصل کے اعتبار سے تمہارے اپنے رسول کی تصدیق ہے اور اگر انکار کرو گے نہیں مانو گے تو تمہاری اپنی کتاب کی تکذیب لازم آتی ہے

پھر اس کا مفہوم یہ نکلے گا یہ کتاب جو میں نے اتاری یہ مصداق بننے والی ہے اس چیز کا جو تمہارے پاس ہے مفہوم ایک سا ہی ہے صرف الفاظ بدل گئے یوں کہہ دو تصدیق کرنے والی ہے، سچا قرار دینے والی ہے یا مصداق بننے والی ہے، مطلب دونوں کا اس طرح سے ایک ہی ہے، کیونکہ مصداق بننا بھی اس کی تصدیق ہے اور مصداق کا مہیا ہونا یہ بھی اس کتاب کی صداقت کی دلیل ہے۔

" ولاتکونوااول کافربہ " یہ کافر کالفظ چونکہ مفرد آ گیا اس لیے اس کا موصوف فریق نکال لیجئے " ولاتکونوااول فریقٍ کافر " یہاں معناً جمع کافر مراد ہے کوئی متعین کافر مراد نہیں ہے۔

تفسیروں میں دونوں توجیہیں کی گئی ہیں، نہ ہو اس " ماانزلت " کے ساتھ پہلے کفر کرنے والے، پہلے کافر نہ بنو اولیت اس میں اضافی ہے یعنی تم کفر کرو گے تو تمہارے مریدین، تمہارے معتقدین، تمہاری وجہ سے وہ بھی کفر کریں گے اس بارے میں امامت کا درجہ تمہیں حاصل ہو جائے گا تم اولین کافر نہ بنو اس کتاب کے ساتھ۔

" ولاتشتروابایٰتی ثمناً قلیلا " اشتراء خریدنا، بیع وشراء کا لفظ جس طرح سے آپ سنتے رہتے ہیں اور خریدنا حقیقتاً ہوتا ہے جیسے ایک طرف سے مال دیا اور دوسری طرف سے مال لیا جس طرح سے بیع وشراء کیا کرتے ہیں اور ایک بدل کے طور پر کسی چیز کا لے لینا یہ بھی اشتراء کہلاتا ہے جیسے پیچھے آیا تھا " اولئک الذین اشتروا الضللة بالھدیٰ فماربحت تجارتھم " یہاں بھی اسی طرح سے ہے۔

میری آیات کے بدلے ثمن قلیل نہ لو، نہ لو میری آیات کے بدلے ثمن قلیل، قلیل ثمن، قلیل قیمت، میری آیات کو قلیل قیمت پر نہ بیچو اور قلیل قیمت سے یہاں مراد متاع دنیاوی ہے "قل متاع الدنیا قلیل" دنیا کا سامان جتنا بھی ہو وہ قلیل ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس لیے اگر کوئی سونے کا پہاڑ لے کر بھی اللہ کے کسی حکم میں تحریف کرتا ہے یا اس کو چھپاتا ہے تو بھی ثمن قلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں اور آخرت کے مقابلے میں دنیا کثیر ہے ہی نہیں "قل متاع الدنیا قلیل" دنیا کا سارا سامان قلیل ہے، فانی ہے ان چیزوں کو لے کر میری آیات کو نہ چھوڑو، نہ لو میری آیات کے بدلے ثمن قلیل۔

" وایای فاتقون " اور مجھ ہی سے ڈرو، جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ میری ہی نافرمانی سے بچو جیسے میں نے عرض کیا کہ رہبت، خشیت اور تقویٰ یہ الفاظ قریب قریب ہیں ایک سے دوسری کیفیت حاصل ہوتی ہے، مجھ سے بچو یعنی میری نافرمانی سے بچو۔

" ولاتلبسوا الحق بالباطل " لَبَسَ لَبْساً خلط کرنا، حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو، یعنی کچھ کچھ حق

اور کچھ کچھ باطل ملا لیا ایسا نہ کیا کرو، نہ خلط کرو حق کو باطل کے ساتھ، حق خالص کر کے ہی قبول کرو اور خالص کر کے حق کا اظہار کرو اس میں باطل کی آمیزش نہ کرو۔

''وتکتموالحق'' اور یہ'' تلبسوا'' کے اوپر عطف ہے اور یہ بھی لا کے نیچے داخل ہے'' وتکتموالحق'' اور حق کو چھپاؤ نہیں'' وانتم تعلمون'' حالانکہ تم جانتے ہو، یہاں صرف ان کو علم کے ساتھ موصوف کرنا مراد ہے حالانکہ تم صاحب علم ہو اور علم ایک نور ہے جس کے ساتھ حق و باطل نمایاں ہوتا ہے تو صاحب علم ہونے کی وجہ سے تم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ تم حق کو پہچانو اور حق کا اظہار کرو'' وانتم تعلمون'' پھر اس کا مفعول نکالنے کی ضرورت نہیں ہے جب یہاں مصدر کے ساتھ ہی فاعل کو موصوف کرنا مراد ہے تو پھر اس کا مفعول نکالنے کی ضرورت نہیں تو'' وانتم تعلمون'' کا معنی یوں ہو جائے گا حالانکہ تم صاحب علم ہو، اب اس کا مفعول نکالنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر اس کا ترجمہ متعدی کے ساتھ ہی کرنا ہو تو مفعول نکالا جاسکتا ہے حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق کا چھپانا بری بات ہے تو پھر اس جاننے کے باوجود تم کیوں حق چھپاتے ہو۔

''واقیموا الصلوۃ'' قائم کرو نماز کو۔

''واتوا الزکوۃ'' اور دیا کرو زکوٰۃ۔

''وارکعوا مع الراکعین'' ارکعوا، رَکَعَ رُکُوعاً عاجزی کرنا رکوع چونکہ نماز کے اندر ہے اور نماز کا ایک رکن ہے تو ایک رکن بول کر کل صلوٰۃ مراد لے لی جاتی ہے جیسے سجدہ کا حکم ہو تو اس سے مراد نماز ہوتا ہے تو'' وارکعوا مع الراکعین'' کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ مل کر، یا یہ ہے کہ رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھو۔

خصوصیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ رکوع کا تذکرہ اس لیے کر دیا کہ نماز میں رکوع ہی ایک ایسا رکن ہے کہ جس میں لوگ عموماً غفلت برتتے ہیں جیسے ہمارے ہاں رکوع صحیح ادا نہیں ہوتا رکوع کے بعد قومہ صحیح ادا نہیں ہوتا، لوگ تعدیل ارکان میں زیادہ تر جو کوتاہی کرتے ہیں رکوع کے معاملے میں ہی کرتے ہیں، اس طرح سے رکوع یہود کی نماز میں تھا ہی نہیں تو'' وارکعوا مع الراکعین'' کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام قبول کر کے امت محمدیہ کے ساتھ مل کر نماز پڑھو جن کی نماز میں رکوع ہے یا ممکن ہے انہوں نے بھی اس طرح سے کوتاہی کر رکھی ہو اصل کے اعتبار سے حکم ہو، لیکن جلد بازی میں جس طرح سے ہمارے ہاں لوگ صحیح رکوع ادا نہیں کرتے تو وہ بھی اس طرح سے کوتاہی کرنے لگ گئے ہوں، تو یہ ایک وجہ ہوسکتی ہے نماز کو خصوصیت کے ساتھ لفظ رکوع کے ساتھ ادا کرنے کی۔

''اتامرون الناس بالبر'' بر کا لفظ بار بار قرآن کریم میں آئے گا اس کا مفہوم ذکر کر دیا جاتا ہے نیکی، کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور احسان کرنا، ایفائے عہد یہ سب اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہیں۔

''اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم'' یہ ہمزہ جو ہے یہ انکار کے لیے ہے انکار ہے ''وتنسون انفسکم'' کے اوپر، حکم دیتے ہو تم لوگوں کو بھلائی کا اور بھولتے ہو تم اپنے نفسوں کو، دیکھو لب ولہجہ سے اردو میں استفہام انکار والا معنی پیدا ہو رہا ہے، لوگوں کو بھلائی سکھلاتے ہو، لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو، یہ اردو زبان میں لب ولہجے کے ساتھ انکار کس کا ہوگا تو آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس بات سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے کہ تم نیکی سکھاتے ہو ایسے نہ کیا کرو، نیکی سکھانا تو ایک اچھا کام ہے اس پر انکار کا کیا مطلب؟ انکار اس بات پر ہے کہ تم اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو، اپنے آپ کو بھلا دیا، اپنا آپ یاد نہیں ہے یہ انکار اس جملے پر کرنا مقصود ہے۔

اب ہم ترجمہ یوں کریں گے کہ کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور بھولے بیٹھے ہو اپنے آپ کو اس انداز کے ساتھ ادا کریں تو مفہوم بالکل خود واضح ہو جاتا ہے انکار کرنا جو مقصود ہے'' وتنسون انفسکم '' پر مقصود ہے کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور اپنے آپ کو بھول گئے، اپنے آپ کو بھلائے بیٹھے ہو۔

'' انتم تتلون الکتاب '' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو اس کتاب میں عالم بے عمل کے لیے کتنی وعیدیں ہیں تو جب لوگوں کو بھلائی سکھاؤ گے اور خود اپنے آپ کو بھلا بیٹھو گے تو تم عالم بے عمل ہو گئے اور تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو اور کتاب کے اندر عالم کے لیے وعیدیں موجود ہیں تو کتاب بھی پڑھتے ہو اور پھر بھی اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو۔

'' افلا تعقلون '' کیا تمہیں عقل نہیں ہے یہاں بھی '' انتم تعلمون '' کی طرح مصدر کے ساتھ فاعل کو موصوف کر دیا ہے'' انتم تعلمون '' حالانکہ تم جانتے ہو تم صاحب علم ہو'' انتم تعقلون'' حالانکہ تم سمجھدار ہو اور پھر ایسا کرتے ہو اور'' افلا تعقلون'' کا مفہوم اس طرح سے ہوگا کہ کیا تمہیں عقل نہیں ہے تو یہاں مصدر کے ساتھ فاعل کو موصوف کرنا مقصود ہے اس لیے مفعول نکالنے کی ضرورت نہیں'' انتم تعلمون ''تم صاحب علم ہو '' انتم تعقلون ''تم صاحب عقل ہو'' افلا تعقلون '' کیا تم سوچتے نہیں ہو تمہیں عقل نہیں ہے یہاں بھی اسی طرح سے استفہام انکاری ہے یعنی تمہیں عقل ہے تو صحیح لیکن تم اس سے کام کیوں نہیں لیتے سمجھدار ہونے کے باوجود ایسی باتیں کرتے ہو۔

''واستعینوابالصبر والصلوٰۃ ''مدد حاصل کرو صبر کے ساتھ اور نماز کے ساتھ۔

'' وانھا لکبیرۃ'' ھا ضمیر صلوٰۃ کی طرف لوٹ رہی ہے بے شک یہ نماز گراں ہے، دشوار ہے، بوجھل ہے، ثقیل ہے۔

''الاعلی الخشعین ''مگران لوگوں پر جو خشوع اختیار کرنے والے ہیں عاجزی کرنے والے ہیں ان پر ثقیل نہیں ہے کبیر نہیں ہے، کبیرۃ کا یہاں مطلب '' ثقیلۃ '' ہے ، بوجھل، گراں جس کی پابندی دشوار گزرتی ہے مگر خاشعین پر، خاشعین وہ لوگ ہیں۔

''الذین یظنون انھم ملقواربھم ''جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں ''ظن '' گمان کرنا خیال رکھنا جو اس بات کا خیال رکھتے ہیں 'انھم ملقواربھم '' کہ بے شک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب کے ساتھ۔

''ملقوا ''اصل میں ملقون تھا نون اضافت کی وجہ سے گر گیا ہے جو خیال رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ ملنے والے ہیں اپنے رب کے ساتھ''وانھم الیہ راجعون ''اور وہ خیال رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

عقیدہ عصمت انبیاء علیہم السلام:

پچھلے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے گزرا ہے اس میں حضرت آدم علیہ السلام کو ایک درخت کھانے سے ممانعت کی گئی اس کا ذکر آیا، اس ممانعت کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو کھالیا اور اس کے کھالینے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدم علیہ السلام کو تنبیہ ہوئی، اس کے متعلق پچھلے بیان میں ایک بات رہ گئی تھی اس کو ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق اہل سنت والجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ وہ معصوم ہوتے ہیں۔

عقیدہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی تفصیل:

عصمت انبیاء علیہم السلام متفق علیہ عقیدہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی گناہ نہیں کرسکتا نبوت کے اظہار کے بعد صغیرہ اور کبیرہ دونوں سے محفوظ، دونوں سے بچا ہوا، دونوں کا ارتکاب نہیں کرسکتا اور نبوت کے اظہار سے قبل کبیرہ سے ''بالتعیین ''اور صغیرہ کے بارے میں اختلافی اقوال ہیں لیکن راجح یہی ہے کہ صغیرہ سے بھی بچے ہوئے ہوتے ہیں نبوت کے بعد تو ہیں ہی بچے ہوئے قبل از نبوت بھی نبی کا دامن ہر قسم کے گناہ سے صاف ہوتا ہے یہ عقیدہ ایسا عقیدہ ہے کہ جس میں اختلاف کی گنجائش ہی نہیں نہ اس میں شک کی گنجائش ہے۔

عقل ونقل کے ساتھ یہ ثابت ہے، زیادہ تفصیل اس وقت ذکر کرنا مقصود نہیں ہے صرف اتنا جان لیجئے کہ نبی کا منصب ہوا کرتا ہے کہ وہ دوسرے بندوں کے لیے جن بندوں کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست تعلق نہیں ہے ہدایت حاصل کرنے کا ان سب کے لیے وہ نمونہ ہوتا ہے۔

جیسے سرور کائنات ﷺ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا قرآن کریم میں اسوۂ حسنہ قرار دے کر اتباع کی طرف بلایا گیا تو نبی دوسرے لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا چاہتے ہو یا اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے بننا چاہتے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا نمونہ تمہارے سامنے موجود ہے۔

اب اگر وہ نمونہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ترین نہ ہو تو پھر وہ ہدایت خلق کے اندر خلل واقع ہوتا ہے اگر نبی سے بھی گناہ صادر ہو جائے اور نبی کے عمل کے اندر بھی کسی قسم کی کوتاہی پائی جائے تو پھر وہ باقی مخلوق کے لیے نمونہ کس طرح سے بنے گا اس لیے اس کی ایک ایک حرکت، اس کے ایک ایک قول کا اللہ تعالیٰ ذمے دار ہوتا ہے یہ ہے بنیادی عقیدہ کہ اگر نبی بھی معصیت کار ہو جائے (نعوذ باللہ) تو باقی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کس طرح سے دے گا پھر تو انسان کہے گا کہ جو اللہ کے خاص اور مقبول بندے ہیں اور جن کے اوپر براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے جب یہ بھی شہوات کی اتباع کر لیتے ہیں اور یہ بھی گناہوں کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں تو ہماری کیا بات اس طرح سے دعوت میں خلل آ جائے گا اور انسان انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا عقیدہ تو یہ ہے۔

لیکن اس کے باوجود قرآن کریم میں ہی انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کرتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئیں ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی گناہ ہو جاتا ہے (نعوذ باللہ) قرآن کریم میں ایسے واقعات منسوب ہیں اور پھر ذنب کی نسبت بھی ہے اور انبیاء علیہم السلام کا استغفار اور اپنے ذنب کا اقرار واعتراف اور پچھلے سے معافی مانگنا اور آئندہ محتاط رہنے کا عہد خود قرآن کریم کی آیات میں موجود ہے اسی سلسلے میں جو پہلی آیت آپ کے سامنے آئی وہ یہی حضرت آدم علیہ السلام کی اکل شجرہ کی ہے کہ ممانعت کے باجود درخت کھایا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے قصور کا اعتراف کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''عصٰی آدم ربه فغویٰ'' ''آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ بھٹک گیا نسیان کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف قرآن کریم کی آیات میں موجود ہے تو ان واقعات کی پھر کیا توجیہات ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے آیا تھا کہ قبطی کو مار دیا یہ بظاہر قتل کا گناہ ہے اور پھر اللہ تعالیٰ

سے قصور کا اعتراف کر کے معافی بھی مانگی، حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق تذکرہ آئے گا حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ذکر آئے گا یہ واقعات قرآن کریم میں ہیں اور سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''واستغفرہ لیغفرلک اللہ ماتقدم من ذنبک وماتأخر'' یہ نسبتیں موجود ہیں۔

معصیت کسے کہتے ہیں:

اس کے بارے میں یہ یاد رکھیے کہ حقیقتاً معصیت کیا چیز ہے نافرمانی کسے کہتے ہیں؟ حقیقتاً معصیت اور نافرمانی وہ ہوتی ہے کہ انسان سوچتا ہوا سمجھتا ہوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرے، یہ سمجھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے اور یاد بھی ہے۔ سمجھتے ہوئے، سوچتے ہوئے، باہوش وحواس اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ اس حکم کی مخالفت کرتا ہے یہ ہے معصیت کی تعریف۔

اگر تاویل میں غلطی ہو جائے یا سہو ونسیان طاری ہو جائے یا اپنی طرف سے قصد خیر کا کیا تھا لیکن نتیجتاً کوئی ایسی بات ہوگئی جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اس کو لغزش اور زلت سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے معصیت نہیں ہے زلت کا معنی ہوتا ہے جیسے پاؤں پھسل گیا، ایک آدمی کوٹھے پر چڑھا ہوا چھلانگ مارتا ہے قصد کے ساتھ اور نیچے گرتے ہوئے اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے تو ہر شخص اسے ملامت کرے گا کہ یہ تو نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تو نے کیوں کیا تھا؟ تجھے نہیں کرنا چاہئے تھا، ہر کوئی کہے گا کہ اس میں قصور تیرا ہے تو نے ایسے کیوں کیا تو نے چھلانگ کیوں ماری؟ جب تو نے قصور کے ساتھ جان بوجھ کر چھلانگ ماری چوٹ تو لگنی تھی لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے رحمت وشفقت کی بات نہیں ہوگی بلکہ غصہ آئے گا اور اس کو بےوقوف کہیں گے۔

اور ایک ہے کہ انسان قصد کر کے سیدھا چلا جا رہا ہے اور اتفاقاً پاؤں پھسل گیا اور جب اتفاقاً پاؤں پھسل گیا گرا اور ٹانگ اس کی بھی ٹوٹی لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ کے قلوب میں بھی اور اس شخص کے متعلقین کے قلوب میں بھی اس کے لیے شفقت اور رحمت آئے گی دونوں کے اندر بڑا فرق ہے کہ ایک جان بوجھ کر چھلانگ لگاتا ہے اور ایک کا چلتے ہوئے پاؤں پھسل جاتا ہے، پاؤں پھسلنے والے کا اگر کوئی نقصان ہوتا ہے تو ہر کوئی کہتا ہے کہ بس اس بےچارے کا کیا قصور ہے اللہ تعالیٰ کو منظور ہی ایسے تھا یہ ''زلت'' ہے پاؤں پھسل جانا، انبیاء علیہم السلام کے واقعات جتنے بھی ہیں وہ ایک ایک واقعہ آپ کے سامنے آئے گا اور اس کی توجیہ ہوتی چلی جائے گی وہاں قصد نہیں ہے گناہ کرنے کا، نافرمانی کرنے کا، بلکہ بلاقصد یا خیر کے جذبے کے تحت یا بھول چوک سے ایسا کام ہوگیا ہو کہ جس میں صورتاً اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوگئی۔

انبیاء علیہم السلام پر معصیت کا لفظ صادق نہیں آتا:

جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کی تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ شیطان نے آکر مغالطہ دیا دھوکہ دیا اور یہ کہا کہ یہ درخت ایسا ہے کہ اس کو کھاؤ گے تو تم اللہ کے مقرب فرشتے بن جاؤ گے اور ہمیشہ کے لیے تمہیں جنت میں رہنا نصیب ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کے قرب کی طمع دلائی اور پھر قسمیں کھا کر اپنے خیر خواہ ہونے کی اطلاع دی اور ادھر جہاں تک درخت کو کھانے کی ممانعت کا تعلق تھا اس میں تاویل کی گنجائش ہے کہ یہ ابتداء ابتداء کی بات ہے جب تم جنت کی نعمتیں برداشت نہیں کر سکتے تھے، تمہارے معدے میں قوت نہیں تھی اب قوت آ گئی یا وہ متعین درخت جدھر اشارہ کیا گیا تھا آدم علیہ السلام کے ذہن میں بات ڈالی گئی کہ وہی درخت مراد ہے اس کی نوع مراد نہیں ہے اور آدم علیہ السلام نے اس مشار الیہ درخت سے نہ کھایا ہو بلکہ اس کی نوع کھائی ہو اور اللہ تعالیٰ کا مقصود اس نوع کی ممانعت ہے۔

جیسے یہاں دو روٹیاں پڑی ہیں اور میں کہوں کہ دیکھو یہ روٹیاں تم نے نہیں کھانیں تمہیں نقصان دیں گی اور تم یہ نہیں کھاتے اور تندور سے اور لے کر کھالو یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید خصوصیت کے ساتھ صرف انہیں کی ممانعت کرنی مقصود ہے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے، اور اللہ کی طرف سے جو اس کے دشمن ہونے کی نشاندہی کی گئی تھی یا اس درخت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جس طرح سے ممانعت کی تھی خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہے نَسِیَ، آدم بھول گیا۔

''ولقد عهدنا الیٰ آدم من قبل فنسی ولم نجدله عزماً'' آدم کو ہم نے ایک حکم دیا تھا لیکن آدم علیہ السلام نے یاد ہی نہیں رکھا بھول گیا اور ہم نے اس کے لیے کوئی پختگی نہیں پائی ۔نسیان کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے اور یہ اقدام جو کیا تھا آدم علیہ السلام نے قرب خداوندی حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ خیر میں رہنے کے لیے اور نا فنا ہونے والے ملک کو حاصل کرنے کے لیے اس قسم کے جذبات کے تحت یہ اقدام کیا گیا تھا اس لیے یہ حقیقتاً معصیت کی تعریف میں نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آئے گا وہ اس سے بھی زیادہ واضح ہے کہ ایک ظالم ایک مظلوم کو پکڑے ہوئے ہے، مظلوم فریاد رسی کرتا ہے، ظالم کو پہلے آپ نے زبانی سمجھایا وہ باز نہیں آیا تو آخر مظلوم کی حمایت میں ایک مکا ہی مارا تھا'' فوکزہٗ موسیٰ '' موسیٰ علیہ السلام نے اس کو مکا مارا مظلوم کی حمایت میں تھا نیکی کا جذبہ اور ظالم کو ظلم سے روکنا ایک نیکی کا جذبہ ہے اور جب وہ تنبیہ کے ساتھ باز نہ آئے تو پھر تنبیہ ہاتھ کے ساتھ بھی ہوتی ہے'' فوکزہ موسیٰ فقضیٰ علیہ''

اب یہ اتفاقی بات ہے کہ مکا لگا اور وہ مر گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کرنے کے جذبہ کے ساتھ اس کو مکا نہیں مارا اسی لیے تو فوراً گھبرا گئے اور یہ کہا کہ یہ شیطانی حرکت ہوگئی تو جذبات اچھے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے لیکن کوئی اجتہادی لغزش یا انسان ہونے کی وجہ سے نسیان زلول خطا چوک جانا اور اس طرح سے یہ جو کام ہو جایا کرتا ہے اچھے جذبے کے ساتھ یہ حقیقتاً معصیت نہیں ہے، البتہ چونکہ صورتاً معصیت ہوگئی اب خیال فرمائیے۔

انبیاء علیہم السلام پر گرفت کا سبب ان کا مقرب ہونا ہے:

یہ طبقہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انتہائی مقرب تو جتنا انسان مقرب ہوا کرتا ہے اتنی ہی اس کے اوپر گرفت زیادہ ہوتی ہے، جتنا کوئی دور ہے ہم سے کوئی تعلق نہیں ہم بھی اس کی بیسیوں غلطیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔

ماں باپ کو جتنا اپنی اولاد کی غلطی پر غصہ آیا کرتا ہے وہ محبت کی بناء پر آتا ہے وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا بچہ بگڑا ہوا ہو بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ زیادہ سے زیادہ سدھرا ہوا ہو اور اسی قسم کی غلطیاں محلے کے اندر اور بچے کرتے پھرتے ہوں گے انسان ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، اپنا بچہ غلطی کرتا ہے تو انسان اس پر اس کو تنبیہ بھی کرتا ہے اور اس کی حالت پر پریشان بھی ہوتا ہے یہ محبت کی بناء پر ہے اور چونکہ انبیاء علیہم السلام اللہ کے بہت مقرب ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کے سامنے بطور نمونے کے پیش کرنا ہوتا ہے اس لیے جب ان سے کسی قسم کی کوئی لغزش ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ان پر ایسی ہوتی ہے کہ جس طرح سے کسی گناہ گار کے اوپر کی جائے اس سے ان کا مقام اور اونچا ہوتا ہے اور وہ اللہ کے سامنے تو بہت لجاجت کرتے ہیں جس سے ان کا قرب اور بڑھتا ہے۔

اور یہی بات بندوں کے لیے نمونہ بنتی ہے کہ اگر کہیں بغیر قصد کے بھی نافرمانی ہو جائے تو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ اپناؤ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر توبہ کر کے استغفار کر کے اپنا دامن صاف کر لو تو یہ حقیقتاً معصیت نہیں ہوتی تو جتنے انبیاء علیہم السلام کے واقعات آتے ہیں وہاں سب میں یہی توجیہ ہے کہ وہاں معصیت کی حقیقتاً تعریف نہیں صورتاً معصیت ہے اور ان کے مقرب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے اوپر گرفت زیادہ ہوتی ہے۔

حقیقتاً معصیت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو اللہ کا حکم یاد ہو اور اس کا مطلب صحیح سمجھ رہا ہو اور باہوش وحواس قصد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرتا ہے حقیقتاً معصیت یہ ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا دامن اس سے پاک ہے ان کا فعل تو ایسے ہے جیسے آپ بارش میں چل رہے ہوں اور آپ کا قصد ہے کہ ہم سیدھے چلیں لیکن کسی جگہ پاؤں پھسل جاتا ہے اور آپ گر جاتے ہیں اور آپ کا دامن آلودہ ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ دامن کی آلودگی کسی کے نزدیک بھی باعث ملامت نہیں کیونکہ آپ قصداً نہیں گرے اور اگر آپ کیچڑ کے اندر خود چھلانگ لگائیں گے کسی گندے نالے کے اندر تو ہر شخص آپ کو ملامت کرے گا تو انبیاء ﷷ کے واقعات جتنے بھی ہیں ان سب کے اندر توجیہ اس طرح سے ہوگی تو حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے آیا تھا تو میں نے اس کی توجیہ کردی متفق علیہ مسئلہ ہے کہ انبیاء ﷷ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں یعنی وہ گناہ کر نہیں سکتے باوجود اس بات کے کہ ان میں صلاحیتیں سب تام ہوتی ہیں یہ نہیں کہ ان سے گناہ کی طاقت سلب کرلی جاتی ہے طاقت سلب نہیں کی جاتی، ان کی جتنی قوتیں، طاقتیں جو کچھ ہیں سب بحال ہوتی ہیں لیکن طاقت اور قوت ہونے کے باوجود ان کی فطرت اتنی صاف ہوتی ہے کہ وہ گناہ کا تصور ہی نہیں کرسکتے اور گناہ ان کے قریب بھی نہیں بھٹک سکتا۔

اپنے آپ کو خالی الذہن کرلو:

''لنصرف عنه السوء'' جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہم اس سے سوء کو دور ہٹا دیں گئے۔

اللہ تعالیٰ ان سے سوء کو دور رکھتا ہے اور فطرت کی پاکیزگی کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا قصد بھی نہیں کرسکتے سمجھانے کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں، اس مضمون کو سمجھانے کے لیے عرض کررہا ہوں اس کا ماقبل کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہے، ذرا غور فرمانا یہ نہ ہو کہ جس طرح سے بریلوی لوگ جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ دیکھو جی اللہ تعالیٰ کی مثال اس چیز کے ساتھ دے دی، اللہ کے رسول کی مثال اس چیز کے ساتھ دے دی یہ ان کی مثال دینی مقصود نہیں ہے اس سے ذرا سا اپنے ذہن کو کاٹ لیجئے۔

میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ فی حد ذاتہ طاقت ہونے کے باوجود کسی کام کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اس کو نہیں کرسکتا یہ کہنا ٹھیک ہے باوجود اس بات کے کہ آپ میں قوت موجود ہے آپ میں طاقت موجود ہے، ماقبل سے اس مضمون کو علیحدہ کر کے بیان کررہا ہوں صرف اس مسئلے کو سمجھانے کے لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں کہ دیکھو فلانی چیز کی مثال فلاں چیز سے ہوگئی، فلاں چیز سے ہوگئی ایسی بات نہیں ہے۔

عقیدہ عصمت انبیاء ﷷ پر ایک بہترین مثال:

آپ میں طاقت ہے کہ آپ ایک چیز کھا سکتے ہیں اللہ نے دانت دیئے ہیں چبا سکتے ہیں، حلق سے نگل سکتے ہیں لیکن اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ گوبر کھالیں تو کیا آپ گوبر کھالیں گے؟ یعنی نہیں کھائیں گے یا کھانہیں

سکتے، آپ کہیں گے کہ انسان کے ہوش وحواس قائم ہوں تو وہ جان بوجھ کر پاخانہ کھا نہیں سکتا، باہوش وحواس انسان پاخانہ کھا سکتا ہے؟ نہیں کھا سکتا، کیا بات اس میں طاقت نہیں کہ وہ ہاتھ سے اٹھا کر اس کو منہ میں ڈال نہیں سکتا، دانتوں سے چبا نہیں سکتا، حلق سے نگل نہیں سکتا کیا نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود یہی بات کہے گا کہ کوئی انسان گند کھا نہیں سکتا، گوبر نہیں کھا سکتا پاخانہ نہیں کھا سکتا۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ طبیعت کی لطافت اس بات سے انکار کرتی ہے جس وقت بھی آپ بات کریں گے تو یہی کریں گے کہ گوبر کھانا کسی انسان کا کام نہیں ہے انسان کھا ہی نہیں سکتا یعنی اس کو پتہ ہو کہ یہ پاخانہ ہے اور باہوش وحواس انسان ہو اور اس سے کہا جائے تو وہ اس طرح سے محسوس کرے گا کہ مجھے تکلیف ''مالا یطاق'' دی جارہی ہے، میری قوت اور طاقت میں یہ نہیں ہے کہ میں یہ کام کرلوں، جان دے دے گا انسان اگر اس کو کہو کہ پاخانہ کھالے وہ پاخانہ نہیں کھائے گا وہ کھا نہیں سکتا، کھانہ سکنے کا اب مطلب یہ نہیں کہ وہ کھا نہیں سکتا، آنکھیں بند کر کے اٹھا کر منہ میں ڈال لے اور یوں کر کے حلق سے نگل جائے۔

آپ کہیں گے قوت تو ہے لیکن وہ کر نہیں سکتا اپنے آپ کو انسان عاجز محسوس کرتا ہے بے بسی محسوس کرتا ہے لہٰذا اس کے سر پر ڈنڈا بھی لے کر کھڑے ہو جاؤ اور کہو کہ یہ کھا تو بھی انسان نہیں کھائے گا، بسا اوقات جان دے دے گا لیکن یہ ہمت نہیں ہوگی کہ اٹھا کر اس کو منہ میں ڈال لے، یہاں کیا چیز ہے قوتیں، طاقتیں بحال ہونے کے باوجود طبیعت کی لطافت اس نجاست حسی سے آپ کو عاجز کر دے گی اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام میں قوتیں پوری ہوتی ہیں لیکن جب ان کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے یاد ہو کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے تو ان کی فطرت لطیفہ اس بات سے انکار کرتی ہے کہ اس کے قریب جائیں یا اس کو برداشت کریں۔

قوتیں ہونے کے باوجود یہ نہیں کہ قوتیں سلب ہو جائیں قوتیں سلب نہیں ہوتیں لیکن ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا اتنا انکشاف ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے پاخانہ کی پلیدی کا نجاست کا اتنا انکشاف نہیں ہے تو جس طرح تم طاقتیں اور قوتیں رکھنے کے باوجود حسی نجاست کے قریب نہیں جاسکتے اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی نافرمانی کے قریب نہیں جاسکتے باقی خطاء، نسیان، اجتہاد، ذھول، تاویل میں غلطی ہوگئی، قصد ہے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا، اور قصد ہے نیکی کرنے کا لیکن آخر انسان ہے کبھی نسیان طاری ہوگیا کبھی کوئی اسی قسم کی بات ہوگئی اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ایک صورت بن جاتی ہے اس میں حقیقت نہیں ہوتی اور یہ چیز عصمت کے منافی نہیں۔

انسان کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اس میں نسیان بھی آ جاتا ہے، ذہول بھی آ جاتا ہے اجتہاد انسان کرتا ہے کوشش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ثواب کو نہیں پہنچ سکتا اس میں انسان بے قصور ہوتا ہے اور اس کے اوپر کسی قسم کا کوئی قصور نہیں، یہ حقیقت ہے اس مسئلہ کی جس کو عصمت انبیاء علیہم السلام کہتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ آیا تھا اس کے متعلق میں نے اس کی وضاحت کردی اور آگے جس جس نبی کا واقعہ جس جس انداز میں آئے گا اس کی توجیہ وہاں کرتے چلے جائیں گے۔

گذشتہ سبق کا خلاصہ:

پچھلے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا تھا جس میں تمام بنی آدم پر اللہ تعالیٰ کا روحانی انعام مذکور تھا کہ اس نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور اس کو علم عطا فرما کر فرشتوں کے مقابلے میں اور دیگر مخلوق کے مقابلے میں شرافت بخشی اور جنت کو ان کا ٹھکانہ بنایا پھر ان کے ساتھ حسد کی بناء پر ابلیس مردود ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق اس کے دل میں بغض بڑھ گیا آخر کار وہ آدم علیہ السلام کو لغزش دینے میں کامیاب ہو گیا اور اس لغزش کے نتیجے میں حضرت آدم علیہ السلام کا جنت سے خروج ہوا، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سامنے آئی۔

حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی استغفار کیا اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرلی، گویا کہ اس واقعہ کے ضمن میں ابلیس اور آدم علیہ السلام کی عداوت کو نمایاں کر دیا گیا، اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ابلیس جو پھسلا ہے یہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ حسد کرنے کی بناء پر پھسلا ہے، تکبر میں آ گیا اور اس نے آدم علیہ السلام کی تحقیر کی اپنے آپ کو سمجھتا تھا کہ میں بہتر ہوں ''انا خیر منه'' ''خلقتنی من نار وخلقته من طین'' اس قسم کے حالات ذکر کیے گئے پچھلے رکوع میں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ آمد اور اہل کتاب کا طرز عمل:

اب آگے کلام منتقل ہو رہی ہے اہل کتاب کی طرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ یہود کے ساتھ پڑا جو اسرائیلی ہیں، یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے۔

اس وقت علمی ریاست انہی کے پاس تھی اہل عرب، مشرکین عرب امی کہلاتے تھے ان پڑھ، ان کے اندر علم کا چرچا نہیں تھا اور یہ اہل کتاب تھے، اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر کی تعلیمات ان کے پاس تھیں، اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب کی طرف یہ منسوب تھے، علمی ریاست اور علمی سرداری انہی کو حاصل تھی، یہ اس وقت کے علماء تھے، اس وقت کے درویش تھے آج کل کی اصطلاح میں اس وقت کے گدی نشین پیر تھے، مشائخ تھے، تو علم کی وجہ سے بھی مرجع یہی لوگ تھے، اور بزرگی کے لحاظ سے بھی لوگ انہی کی طرف رجوع کرتے تھے ان کی سرداری مانتے تھے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں جب تشریف لے گئے تو ان لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسد لاحق

ہو گیا، اس وجہ سے کہ اگر ہم ان کو پیغمبر تسلیم کر لیں تو علمی ریاست منتقل ہو جائے گی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی طرف، جو لوگ ہمارے آستانوں پر آیا کرتے تھے اب وہ ہمارے آستانوں پر نہیں آیا کریں گے ان کا رجوع ان کی طرف ہو جائے گا، ہماری مشیخیت زائل ہو جائے گی، لوگ ہمیں پیر نہیں سمجھیں گے، لوگ ہمیں عالم نہیں سمجھیں گے، جس قسم کے نذرانے، چڑھاوے لوگ دیا کرتے تھے، اور ان کو حرام خوری کی عادت پڑی ہوئی تھی، لوگوں کو غلط مسئلے بتا کر وہ جو آمدنی حاصل کرتے تھے وہ آمدنی زائل ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی، حرام خور کا لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے قرآن کریم نے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے "اکالون للسحت" یہ لوگ بہت حرام خور ہیں، سحت حرام کو کہتے ہیں "اکالون" مبالغے کا صیغہ ہے یہ بہت حرام خور لوگ ہیں لوگوں کو دھوکہ دے دے کر رشوتیں کھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکام غلط بتاتے ہیں اور مختلف حیلوں کے ساتھ یہ لوگوں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

"یاایھاالذین امنوا ان کثیراً من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل" احبار علماء، رھبان درویش، بہت سارے علماء اور درویش لوگوں کے مال بہت غلط طریقے سے کھارہے ہیں، قرآن کریم نے اس وقت کے لوگوں کا جو نقشہ تھا وہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی صورت میں ہر چیز کو نقصان پہنچتا تھا ان کے خیال کے مطابق کہ ہماری عزت بھی نہیں رہے گی یہ حب جاہ ہے اور ہمارے پاس کوئی مالی آمدنی بھی نہیں رہے گی یہ حب مال ہے تو اسی مال وجاہ کی محبت کی وجہ سے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت پر اتر آئے باوجود اس بات کے کہ ان کی کتابوں میں علامات اور نشانیاں بعد میں آنے والے پیغمبر کی ذکر کی گئیں تھیں وہ سارے کے سارے سمجھتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ان کا انطباق ان کے سامنے کوئی مخفی حقیقت نہیں تھی، سب کچھ جاننے کے باوجود وہ منکر ہو گئے قرآن کریم کہتا ہے اور ببانگ دہل کہتا ہے جس کے انکار کی یا تردید کی ان لوگوں نے جرأت نہیں کی۔

"یعرفونہ کمایعرفون ابناء ھم" یہ اس پیغمبر کو اس طرح سے پہچانتے ہیں علامات کے ساتھ جس طرح اپنے بیٹے کو پہچانتے ہیں کہ مجمع عام ہے ان کا بیٹا پھر رہا ہو تو اس کو پہچانتے ہوئے ان کو کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ بیٹے کی شکل اتنی ذہن میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے، کسی استدلال کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ دیکھو اس کا ناک ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے اس کی شکل ایسی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا لڑکا ہے اس کی علامات اتنی ذہن میں بیٹھی ہوتی ہیں کہ انسان نظر ڈالتے ہی دفعۃً پہچان لیتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے۔

اسی طرح وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو علامات کے ساتھ اللہ کا رسول اور اسی طرح اس قرآن کریم کو اللہ کی کتاب پہچانتے تھے ان علامات کے ساتھ اور اچھی طرح پہچانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے انکار کیا تو یہ

حسد کی بناء پر تھا پہلے ابلیس کا قصہ سنا کر ان کے ذہن پر یہ اثر ڈالا گیا کہ پچھلی تاریخ کو دیکھو کسی کے کمالات کا اعتراف نہ کرنا اور حسد کے اندر مبتلاء ہو جانا یہ انسان کو اللہ کا ''مبغوض'' بنا دیتا ہے ''ملعون'' بنا دیتا ہے، قبولیت کے درجے سے گر کر انسان مردود ہو جاتا ہے، دائمی جہنمی ہو جاتا ہے اس لیے تم حسد کی بیماری کو چھوڑ دو یہ حسد تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔

دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت:

پھر اللہ تعالیٰ کے تمہارے اوپر کتنے احسانات ہیں، بنی آدم ہونے کے لحاظ سے احسانات وہ تو سب پر ہیں خصوصی خصوصی انعامات تم پر کتنے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں کتاب دی تمہارے اندر پیغمبر بھیجے اور ان کے ذریعے سے تم سے عہد معاہدے کئے تمہیں چاہیئے کہ تم ان عہد معاہدوں کا پاس رکھو اور لوگوں کے سامنے جو تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیئے، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے جس طرح جب ہم منبر پر بیٹھتے ہیں، سٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں وعظ کرنے کے لیے تو لوگوں کو کیا کیا کہتے ہیں کہ آخرت کا خیال کرو، آخرت کے مفاد کے مقابلے میں دنیاوی مفاد کوئی چیز نہیں ہے اگر دنیا کی لذات کے پیچھے پڑ کر تم آخرت کو نقصان پہنچاؤ تو یہ گھاٹے کا سودا ہے انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے انسان کو چاہیئے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کی طرف متوجہ رہے۔

ہم وعظ کرتے ہوئے کہیں گے کہ دیکھو حسد بہت بڑی بیماری ہے حسد اختیار نہیں کرنا چاہیئے، اور مالی طمع کے اندر آ کر جاہ کے پیچھے لگ کر حق سے کبھی روگردانی نہ کرے اور اگر کبھی غلطی ہو جائے تو فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ و استغفار کرے ہمارے وعظ کا خلاصہ یہی ہوتا ہے۔

آخرت سے ڈرانا، اللہ سے ڈرانا، عبادت اور اطاعت کے اوپر برانگیختہ کرنا، روحانی بیماریوں کے ازالے کی تدبیریں بتانا ہمارا وعظ یہی ہوتا ہے۔

لیکن جس وقت اپنا شخصی معاملہ آ جائے گا اس وقت اپنے شخصی معاملے میں آ کر ہم انہی نصیحتوں کو بھول جاتے ہیں لوگوں کو ہم کہتے ہیں کہ خدا سے ڈرو لیکن خود ہم خدا سے نہیں ڈرتے، لوگوں کو کہتے ہیں کہ جب اپنی خواہشات اور ہدایت کا مقابلہ آ جائے تو ہدایت کو اختیار کرو اپنی خواہشات کے پیچھے نہ چلو، حب مال خطرناک چیز ہے، حب جاہ خطرناک چیز ہے اور آخرت کے معاملے میں انسان ان جذبات سے متاثر ہو کر آخرت کو نقصان نہ پہنچائے جس وقت ہم اپنے شخصی معاملات میں آتے ہیں تو ہم مالی محبت کے معاملے میں آ کر حق کو چھوڑتے ہیں، اپنی عزت کے احساس کے طور پر حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ہم ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں ایک دوسرے سے بغض رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں وہ جوش وخروش نہیں دکھاتے جس جوش وخروش کے ساتھ ہم منبر کے اوپر کھڑے ہوکر قوم کو تلقین کرتے ہیں تو جب اس قسم کا معاملہ آئے گا تو ہمیں یہی یاد دہانی کرائی جائے گی کہ بھائی لوگوں کو نصیحت کرتے ہوا پنے آپ کو کیوں بھولے بیٹھے ہو، لوگوں کو ترغیب دیتے ہو کہ آخرت کا خیال کرو دنیا کے پیچھے نہ لگو تو خود تم کیوں یہ اصول چھوڑے بیٹھے ہو ہمیں بھی آج اسی طرح سے کہا جائے گا۔

جس طرح حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ واعظوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں جس کا حاصل یہی ہے کہ یہ واعظ لوگ جو محراب ومنبر کے اوپر کھڑے ہوکر جوش وخروش دکھاتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ گیر محراب ومنبر مے کنند
چوں بخلوت میروند کارے دیگر مے کنند

اب کارے دیگر کا مصداق پتہ نہیں کیا ہے آپ کہیں گے کہ ہم فلاں کام نہیں کرتے تو اس نے تو کوئی نام نہیں لیا کہ آپ فلاں کام نہیں کرتے اس نے تو کارے دیگر کہا، جب خلوت میں چلے جاتے ہیں تو (کارے دیگر) فارسی زبان میں کارے دیگر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ منبر پر کھڑے ہوکر لوگوں کو تلقین کرتے ہیں جس قسم کا معیار زندگی لوگوں کے سامنے اپنی زبان سے پیش کرتے ہیں خلوت میں جا کر وہ معیار زندگی نہیں رہتا۔

کہ لوگوں کو توبہ کی بہت تلقین کرتے ہیں لیکن یہ خود توبہ کیوں نہیں کرتے جس طرح سے ہمارا طرز گفتگو ہے کہ بھائی جس طرح زبان سے کہتے ہو اسی طرح سے کرو بھی جیسے لوگوں کے اندر نیکی کے جذبات ابھارتے ہو اسی طرح سے تمہارے اندر بھی جذبات ابھرنے چاہئیں اسی انداز کی گفتگو ہے یہاں جو بنی اسرائیل کو خطاب کرکے کی کہ یہ اس وقت کے اہل علم تھے، اہل علم کا کام ہوتا ہے لوگوں کو نصیحت کرنا اور لوگوں کو نیکی کی ترغیب دینا اور یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو۔

قرآن کہتا ہے کہ کم از کم تم تو ان چیزوں کا خیال کرو اگر تم مال کے پیچھے لگ کر اگر تم اپنے مالی مفاد سے ڈرو گے تو تم خدا سے نہ ڈرے بلکہ اہمیت مال کو دے دی، اگر تم اپنی آخرت کا خیال نہیں کرتے اس فانی دنیا کو آباد کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہو تو تم دنیا پرست ہوئے دین پرست کہاں ہوئے؟ تو بے عمل علماء کے متعلق جو وعیدیں کتابوں کے اندر پڑھتے ہو وہ کتاب تمہارے لیے ہے ”انتم تتلون الکتاب“ لیکن اس کے باوجود تم خود نصیحتوں کو بھولے بیٹھے ہو۔

اس رکوع میں اصولی طور پر گفتگو ہے اور اگلے رکوع سے پھر جزئیات کا تذکرہ شروع ہو جائے گا تم نے یہ کیا، یہ کیا اور ہم نے تمہارے ساتھ یہ کیا، یہ کیا یہ قصہ آگے سارے کا سارا تفصیلاً شروع ہو جائے گا۔

نماز اور صبر کی تلقین کی کہ صبر کرو، مشکلات برداشت کرنے کی عادت ڈالو، مالی مفاد کو نقصان پہنچنے لگے جو تم سمجھتے ہو کہ ہماری لذت پرستی کو نقصان پہنچے گا تو اس کا صبر کی عادت کے ساتھ مقابلہ کرو، برداشت کرو اگر طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آ رہی ہو۔

نماز کی پابندی کرو تا کہ تمہارے تکبر کا علاج ہو اور حب جاہ کا علاج ہو تواضع اور انکساری سیکھو اور اگر نماز کی پابندی تمہیں گراں گزرے تو یہ خیال رکھو کہ تم نے ایک دفعہ اللہ کے سامنے جانا ہے اور اس کے سامنے جا کر حساب وکتاب پیش کرنا ہے یہ مراقبہ کرو، اس کو صوفیاء والا مراقبہ کہیں گے کہ آپ اپنے ذہن کے اندر یہ بات بٹھاؤ کہ تم اپنے رب سے ملنے والے ہو اور تم نے لوٹ کر جانا ہے اور جا کر تم نے حساب وکتاب دینا ہے جس وقت اس خیال کو اپنے ذہن کے اندر بٹھاؤ گے تو نماز کی پابندی بھی تمہارے لیے آسان ہو جائے گی۔

صبر کی عادت ڈالو گے برداشت کی عادت ڈالو گے تو جو ذات کو نقصان پہنچے گا اس کو برداشت کرنا آسان ہو جائے گا اس طرح اصولی طور پر تلقین کی گئی ہے بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے اس رکوع میں اور اگلے رکوع سے پھر تفصیلی تذکرہ شروع ہو جائے گا۔

تم اپنے عہد کو پورا کرو میں اپنے عہد کو پورا کروں گا:

”اوف بعھد کم“ ”اے بنی اسرائیل! اے اولادِ یعقوب! (میں نے عرض کیا تھا کہ اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے) یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا یہ آگے تفصیل آئے گی کہ کس کس موقع پر انعامات کئے خصوصاً بنی اسرائیل پر باقی جو احسانات عام انسانوں پر ہیں وہ تو ہیں ہی خصوصی احسانات کا تذکرہ آگے تفصیلاً آ رہا ہے، میرے احسان کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میرے عہد کو پورا کرو یعنی جو عہد تم نے میرے ساتھ کیا تھا اس کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا یعنی جو میں نے تم سے کیا ہے میں اس کو پورا کروں گا۔

وہ عہد کون سا ہے اس کی تفصیل بھی آگے سورۃ مائدہ کی آیات میں ہے ”ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل الخ“

اگر تم یہ کام کرو گے کہ نماز کو قائم کرو گے زکوٰۃ دو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کو قوت

پہنچاؤ گے اور اللہ کو قرض حسنہ یعنی اللہ کے راستے میں خیر خیرات کی عادت رکھو گے تو میں تم سے تمہارے گناہ دور ہٹاؤں گا اور تمہیں ایسی جنت میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

''اوف بعھدکم'' اللہ کا عہد آ گیا کہ تم ایسا کرو گے تو میں یہ کروں گا اب آ ؤ عہد تم نے کیا ہوا ہے جو کتابوں کے اندر مذکور ہے اس کو پورا کرو مال کی محبت میں مبتلاء ہونے کی بجائے اللہ کے راستے میں خیرات کرنے کی عادت ڈالو، زکوٰۃ دو، اور قرض حسنہ دو اس میں یہ عام نفلی خیرات بھی آ گئی، نماز کی پابندی کرو، اللہ کے سامنے جھکنے کی عادت ڈالو تو تم کو حق قبول کرنے کی عادت پڑے گی، رسولوں پر ایمان لانے کا وعدہ تم نے کیا تھا جو رسول آ جائے اس کے اوپر تم ایمان لاؤ اگر تم یہ کرو گے تو میرا تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ آخرت میں تمہیں کامیابی ہوگی، دنیا میں اللہ تعالیٰ تمہیں عزت کے ساتھ نوازے گا تم میرے عہد کو پورا کرو تو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا تو یہ اسی عہد کی طرف اشارہ ہے جو قرآن کریم کی مختلف آیات کے اندر ذکر کیا گیا ہے۔

''وایای فارھبون'' تین لفظ آپ کی خدمت میں عرض کئے تھے، رھبت، خشیت، اور تقویٰ، میں نے کہا تھا کہ ان کا مفہوم قریب قریب ہے، کسی باعظمت شخصیت کا تصور کر کے قلب کے اوپر جو لرزہ اور کپکپی طاری ہوتی ہے یہ رھبت ہے، اور اس کی عظمت کو محسوس کرتے ہوئے انسان جو اپنی پستی کا احساس کرتا ہے، عجز و انکساری کے جذبات جو انسان کے قلب میں پیدا ہوتے ہیں یہ خشیت ہے، اور ان چیزوں کے حاصل ہو جانے کے بعد اس باعظمت شخصیت کی نافرمانی سے جو انسان بچنے لگ جاتا ہے یہ تقویٰ ہے، یہ ساری چیزیں قریب قریب ہی ہیں۔

تو ''وایای فارھبون'' کا معنیٰ ہے کہ خاص طور پر مجھ ہی سے ڈرو تمہارے دلوں کے اوپر ہیبت ہو تو صرف میری ہو باقی مفاد پرستی اور دنیا کے نقصان سے ڈرنا، عزت کے زوال سے ڈرنا یہ تمہاری شان نہیں ہے تمہیں چاہیئے کہ صرف مجھ سے ڈرو ''وآمنوا بما انزلت'' ایمان لے آؤ اس چیز کے ساتھ جو میں نے اتاری۔

''مصدقا لما معکم'' اس کا مطلب دو طرح سے آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا تھا، ما انزلتُ، جو چیز میں نے اتاری وہ تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو تمہارے پاس ہے یا مصداق بننے والا ہے اس چیز کا جو تمہارے پاس ہے مصداق بننا بھی ایک تصدیق ہی ہے کیونکہ جو پیشین گوئی توراۃ کے اندر ذکر کی گئی تھی اگر اس کا مصداق مہیا نہیں ہوگا تو وہ کتاب سچی ثابت نہیں ہوگی اور اگر تم آنے والے پیغمبروں کو نہیں مانو گے تو وہ پیشین گوئیاں غلط ثابت ہو جائیں گی جو تمہاری کتاب میں موجود ہیں۔

ان کا سچا ہونا تب ہی ثابت ہوگا کہ اس آنے والے رسول کو مانو اور اس اتاری ہوئی کتاب کو تسلیم کرو تب جاکر تمہاری کتاب سچی ثابت ہوگی ورنہ جب اس کی پیشین گوئیاں پوری ثابت نہیں ہوں گی تو وہ بھی غلط ہوجائے گی۔

عالم کا پھسلنا پورے جہان کا پھسلنا ہے:

اور پھر ان کو ان کے مقتداء ہونے کا احساس دلایا کہ لوگ تمہارے چہروں کی طرف دیکھتے ہیں کہ تم آنے والے رسول کو قبول کرتے ہو کہ نہیں کرتے چونکہ تم اہل علم ہو، اور جس وقت تم قبول نہیں کرو گے تو لوگ کہیں گے کہ جس وقت ہمارے پیر نے نہیں مانا، ہمارے استادوں نے نہیں مانا، ہمارے مفتیوں نے نہیں مانا تو ہم کیسے مانیں تو یہ کفر کے اندر بھی مقتدیت تمہیں حاصل ہوجائے گی تو قرآن کریم کا انکار کرکے اول کافر نہ بنو اہل علم کی یہی بات ہوا کرتی ہے، اہل علم ہدایت پر آتے ہیں تو قوم بھی ہدایت پر آتی ہے اور اگر اہل علم پھسل جاتے ہیں تو قوم بھی پیچھے پھسل جاتی ہے اسی لیے وہ فقرہ مشہور ہے عربی میں'' زلۃ العالم '' عالم کا پھسلنا'' زلۃ العالم '' یہ جہان کا پھسلنا ہے اور یہ علماء کے گروہ کے متعلق بات ہے کہ جس وقت یہ سدھر جائیں تو قوم بھی سدھر جاتی ہے اور اگر ان کا طرز عمل غلط ہوجائے تو آگے قوم کا طرز عمل بھی غلط ہوجاتا ہے۔

انسان کے بدن کے اندر جس طرح دل اور دماغ کی اصلاح ہوجانے کے ساتھ انسان کے اعمال وکردار کی اصلاح ہوجاتی ہے تو امت کے اندر اور قوم کے اندر بھی دو طبقے ایسے ہوا کرتے ہیں جن کے سدھرنے کے ساتھ قوم اور امت سدھرتی ہے، ایک علماء کا طبقہ اور ایک امراء کا طبقہ، امراء اور حکام یہ سدھر جائیں اور اہل علم سدھر جائیں تو قوم کی اصلاح ہوجایا کرتی ہے اور اگر یہ دونوں طبقے بگڑے ہوئے ہوں تو کوئی طاقت قوم کو سیدھے راستے پر نہیں لاسکتی اس لیے کہا جاتا ہے'' فساد العالِم فسادالعالَم'' عالم کا بگڑنا یہ عالم کا بگڑنا ہے اس کے ساتھ جہان میں فساد ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بچہ کا جواب:

واقعہ عام طور پر لوگ بیان کرتے ہیں کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک دفعہ اپنے شاگردوں کے ساتھ چلے جارہے تھے اور ایک بچہ بھی ساتھ تھا تو راستے میں ایک طرف کیچڑ ساتھا وہ بچہ اس کیچڑ کی جانب سے چل رہا تھا۔

حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بیٹے ادھر سے مت چلو کہیں پھسل نہ جانا، کیچڑ ہے، کہتے ہیں اس بچے کے منہ سے ایک فقرہ نکلا کہنے لگا حضرت! میرے پھسلنے سے کچھ نہیں ہوتا خود اپنا دھیان رکھنا اگر آپ پھسل گئے تو سارا جہان پھسل جائے گا حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے فقرہ سے بہت متاثر ہوئے۔

کہتے ہیں کہ وہاں کھڑے ہو کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگردوں کو کہا کہ دیکھو! میرا قول تمہارے سامنے آئے اور دوسری طرف صحیح حدیث غیر متعارض تمہارے سامنے آ جائے تو میرے قول کو چھوڑ دینا اور صحیح حدیث کو لے لینا ایسا نہ ہو کہ تم اس وجہ سے کہ یہ ہمارے استاد کا قول ہے چاہے مقابلے میں صحیح حدیث غیر متعارض، غیر منسوخ کوئی حدیث سامنے آ جائے یہ کہو کہ چونکہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے کہا تھا ہم ایسے ہی کریں گے، مطلب یہ ہوگا کہ اگر مجھ سے لغزش ہوئی ہے تو اس لغزش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پیچھے والے سارے کے سارے پھسل جائیں گے، تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آدھا جملہ کسی کے منہ سے نکل جاتا ہے اور دوسرے کے لیے تنبیہ کا باعث بن جاتا ہے۔

یہی بات ہے کہ عالم کا پھسلنا سارے جہان کا پھسلنا ہوتا ہے عالم بن جانے کے بعد صرف شخصی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ قوم کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے، یہی ان کو ان کا مقام یاد دلایا ہے کہ اول کافر نہ بنو کہ لوگ تمہاری طرف دیکھ کر کفر پر اڑیں گے یہ کہیں گے کہ جس وقت ہمارے علماء نہیں مانتے، جس وقت ہمارے اہل فتویٰ نہیں مانتے اور یہ ہمارے مشائخ نہیں مانتے تو ہم کس طرح مان لیں یہ ان کو ان کی مقتدیت کا احساس دلایا اور اگر تم مان جاؤ گے تو تمہیں ادھر بھی مقتدیت حاصل ہوگی کہ تمہاری وجہ سے جتنے لوگ ایمان لائیں گے ان کا ثواب بھی تمہیں ہوگا۔

'' ولا تکونوا اول کافر بہ '' یہ اولیت اضافی ہے ورنہ مشرکین مکہ بھی پہلے انکار کر چکے تھے لیکن مدینہ منورہ میں آنے کے بعد ان اہل علم کا انکار کرنا یہ پچھلوں کے لیے اولیت کا درجہ ہے۔

"ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلاً" یہ وہی ان کی دکھتی رگ پکڑی کہ تمہیں جو یہ عادت پڑ گئی ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھپانے اور بدلنے کی اور لوگوں سے فیسیں بٹورنے کی یہ تو تم اللہ کی آیات کو ثمن قلیل کے عوض میں بیچ رہے ہو اور ثمن قلیل کا مصداق ساری دنیا ہے'' قل متاع الدنیا قلیل '' اللہ کے حکم کے مقابلے میں اگر ساری دنیا بھی لے لی جائے تو بھی وہ ثمن قلیل ہے۔

'' ایای فاتقون '' مجھ سے ہی ڈرو میری نافرمانی سے بچو یہ بھی اسی طرح سے تاکید ہے، ایای مفعول مقدم بھی آ گیا، اور فاتقو کے اوپر نون کسرہ والی وہ بھی دال بر یائے متکلم ہے۔

اظہار حق کی تاکید:

’’ولا تلبسوا الحق بالباطل‘‘ حق اور باطل کو خلط ملط نہ کرو کہ تھوڑی سی حق بات بھی بتادی اور اس کے اندر تھوڑی سی چیرا پنی بھی لگادی۔

’’وتکتموا الحق‘‘ اور حق کو چھپایا نہ کرو۔

دوصورتیں ہوتی ہیں حق کو چھپانے کی، ایک تو ہے کہ سرے سے ہی انکار کردیا کہ یہ مسئلہ ہماری کتاب میں ہے ہی نہیں۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ مسئلہ ہے تو صحیح لیکن اس میں تاویل اور اس میں کوئی توجیہ اس قسم کی کردی کہ حق کے ساتھ باطل بھی ملادیا یہ دونوں صورتیں کتمان حق کی ہیں تو نہ مطلقاً چھپایا کرو اور نہ حق اور باطل کو ملایا کرو، صاف صاف بات کہا کرو جو سچی ہے اور جو تم کتاب اللہ کی طرف دیکھ کر سمجھتے ہو وہی بات کہا کرو، حق اور باطل کو خلط ملط نہ کیا کرو اور نہ حق کو چھپایا کرو، وتکتموا الحق، اس کا عطف ولا تلبسوا کے اوپر ہے اور یہ بھی نفی کے تحت داخل ہے ولا تلبسوا، ولا تکتموا، خلط ملط بھی نہ کرو اور چھپاؤ بھی نہیں، حالانکہ تم صاحب علم ہو اور صاحب علم کا کام حق کا اظہار ہوتا ہے، حق کو چھپانا اور حق اور باطل کو خلط ملط کرنا یہ تو جہالت ہے علم والوں کی شان کے لائق نہیں،

’’انتم تعلمون‘‘ یعنی مصدر کے ساتھ ہی فاعل کو موصوف کر کے ذکر کردیا گیا حالانکہ تم صاحب علم ہو اور صاحب علم کا کام نہیں ہے کہ حق کو چھپائے اس کا کام تو یہ ہے کہ لوگوں کو حق بتائے، حق کا اظہار کرے، حق و باطل کو خلط ملط کرنا یا حق کو چھپانا یہ دونوں کام ہی صاحب علم کی شان کے منافی ہیں اور تم صاحب علم ہو تمہیں اس قسم کی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

اچھی اور بری صحبت کے اثرات مسلّم ہیں:

’’واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ‘‘ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور عاجزی کرنے والوں کے ساتھ مل کر عاجزی کرو یا امت محمدیہ میں شامل ہو کر ان کے ساتھ مل کر نماز پڑھو کیونکہ رکوع امت محمدیہ کے اندر ہی نمایاں طور پر کیا جاتا ہے یہود کی نماز میں تو یہ تھا ہی نہیں اگر تھا تو انہوں نے کوتاہی کے طور پر چھوڑنا شروع کردیا تو جب راکعین کے ساتھ ملو گے، تواضع کرنے والوں کے ساتھ ملو گے تو تمہارے اندر بھی تواضع پیدا ہوگی اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ یہ اخلاق باطنہ جو ہیں ان پر زیادہ تر اثر صحبت کا پڑتا ہے جس قسم کے لوگوں کے پاس بیٹھو گے بسا اوقات غیر شعوری طور پر انسان میں اسی قسم کے اثرات پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

متکبروں کے پاس بیٹھو گے تو ان کا اٹھنا بیٹھنا، چال چلن سب تکبر پر دلالت کرے گا تو آہستہ آہستہ تمہاری طبیعت وہی عادات چوری کر کے اختیار کرنی شروع کر دے گی اچھے لوگوں کے پاس بیٹھو گے تو طبیعت نقل اتارتی ہے تو آہستہ آہستہ وہی اچھی عادتیں پڑ جائیں گی، متواضع لوگوں کے پاس بیٹھو گے تو تمہارے اندر بھی تواضع آ جائے گی متکبروں کے پاس بیٹھو گے تو تمہارے اندر بھی تکبر پیدا ہو جائے گا۔

عربی میں جیسے آیا کرتا ہے'' ان الطبع من الطبع یسرق ''طبیعت طبیعت سے چوری کرتی ہے باطنی اخلاق ہمیشہ اسی طرح سے سرایت کیا کرتے ہیں جس قسم کے لوگوں کے پاس بیٹھنا شروع کرو گے اسی قسم کے اثرات پڑنا شروع ہو جائیں گے، تو متواضعین کے ساتھ شامل ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی تواضع کی عادت پڑے گی اور تمہارا تکبر ختم ہو گا۔

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو؟

آگے وہی ملامت ہے، جس طرح سے میں نے عرض کیا تھا کہ لوگوں کو نیکی سکھاتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو، اب اس میں کسی ایک نیکی کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کیا نیکی سکھاتے اور خود قبول نہیں کرتے تھے اگرچہ تفسیروں کے اندر یہ بات لکھی ہوئی ہے (یہ واقعہ بیان القرآن میں مذکور ہے) کہ ان میں سے بعض علماء نے اپنے اقارب کو رشتہ داروں کو مشورہ دیا کہ تم ایمان لے آؤ یہ رسول سچا ہے اور ایمان لانے کے بعد انہوں نے تائید کی کہ تم نے بہت اچھا کیا یہ رسول بالکل سچا ہے۔

وہ کہتے ہیں تم کیوں نہیں مانتے وہ کہتے کہ ہم اس لیے نہیں مانتے کہ گدی کو نقصان پہنچے گا یہ سارے کا سارا سلسلہ ہی ختم ہو جائے گا تم ٹھیک ہو اتباع کرتے رہو، جب اس قسم کی باتیں وہ دوسروں سے کرتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے تھے تو اس بات پر ملامت ہے، ورنہ اگر یہ واقعہ ثابت نہ ہو کہ کسی عالم نے اپنے رشتہ دار کو ماننے یا اپنے قریبی کو ایمان لانے کے لیے کہا تھا اور خود ایمان نہیں لایا کوئی ضرورت نہیں کوئی واقعہ متعین کرنے کی عالم کا کام ہے کہ لوگوں کو وہ نصیحت کرتا ہے، خدا سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہے، آخرت کی ترجیح کا قول کرتا ہے کہ آخرت کو دنیا کے مقابلے میں ترجیح دو، فسق و فجور چھوڑنے کے لیے کہتا ہے، معصیت ترک کرنے کے لیے کہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کی طرف متوجہ کرتا ہے ہر عالم جو وعظ و نصیحت کرتا ہو اس قسم کی باتیں کیا کرتا ہے۔

لیکن جب اپنا شخصی معاملہ آ جائے گا، تو پھر انہی نصیحتوں کو بھول جاتا ہے، اپنے شخصی مفاد کے پیچھے حب مال سے متاثر ہو کر یا حب جاہ سے متاثر ہو کر پھر حق کو چھوڑ بیٹھتا ہے جو بھی عالم منبر پر یا سٹیج پر کھڑا ہو کر لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ آخرت کو ترجیح دو دنیا کی محبت چھوڑ دو۔

کہتا ہے اللہ سے ڈرو کسی دوسری چیز سے ڈرنا نہیں چاہیئے ،لوگوں کو نصیحت کرتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو، یہ جو استفہام انکاری ہے'' تأمرون '' کے اندر اس انکار کا تعلق تنسون کے ساتھ ہے جیسے کہ جب ہم اپنے لب ولہجے میں ترجمہ کریں گے تو یوں ہوگا لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھولے بیٹھے ہو، اس انداز گفتگو میں جو انکار کیا جا رہا ہے وہ اپنے آپ کو بھولنے پر ہے جس کا دوسرا عنوان لے لیجئے ،اس کا مقصد یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیئے ، واعظ کو چاہیئے کہ جس قسم کا وعظ لوگوں کو کہتا ہے اس کے اوپر عمل بھی کرے، واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہیئے ، یہ مطلب اس کا غلط ہے کہ کوئی یہ کہے کہ بے عمل کو وعظ نہیں کہنا چاہیئے کہ جو خود بے عمل ہے اس کو وعظ نہیں کہنا چاہیئے اس کا یہ مطلب نہیں ہے۔

برائی کو نیکی چھوڑنے کا ذریعہ نہ بناؤ:

بے عملی ایک مستقل جرم ہے وعظ کہنا نیکی ہے، برائی کو نیکی چھوڑنے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ چونکہ ہمارا اپنا عمل نہیں ہے اس لیے ہم لوگوں کو کیوں کہیں؟

آپ میں عمل نہیں ہے یہ آپ کی برائی ہے اور لوگوں کو نصیحت کرنا یہ ایک نیکی تھی آپ اپنی برائی کو اس نیکی کے چھوڑنے کا ذریعہ نہ بنائیں البتہ ایک نیکی کو دوسری نیکی کا ذریعہ بنائیں کہ جب آپ لوگوں کو کہتے ہیں یہ نیکی ہے یہ تبلیغ ''امر بالمعروف ونھی عن المنکر'' تو اپنی اس عادت کو خود عمل کرنے کی عادت کا ذریعہ بنائیں تو ایک نیکی دوسری نیکی کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

جرم کو سبب نہیں بنانا چاہیئے دوسرا جرم کرنے کا بلکہ نیکی کو سبب بنانا چاہیئے دوسری نیکی کی عادت ڈالنے کا، وعظ کہنا نیکی ہے اس وعظ کہنے کے جذبے سے اپنے آپ کو عمل کی راہ پر لگاؤ، یہ ایک نیکی دوسری نیکی کا ذریعہ بن گئی کہ جب لوگوں کو کہتے ہو تو خود بھی کرو اور اگر یوں کہیں گے کہ خود کرتے نہیں پھر دوسروں کو نصیحت کیوں کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک برائی کو دوسری برائی کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے، نیکی کی تلقین کرنا ایک مستقل نیکی ہے اس کو سبب بنا کر تم اپنے آپ میں بھی نیکی کی عادت ڈالو، یہ نہیں ہے کہ اگر تمہیں نیکی کرنے کی عادت نہیں ہے تو تم دوسرے کو نیکی کی بات کہنا ہی چھوڑ دو یہ مطلب غلط ہے تو یہاں انکار تأمرون پر نہیں ہے، تأمرون تو نیکی کا کام ہے انکار تنسون پر ہے کہ تم اپنے آپ کو بھولے کیوں بیٹھے ہو۔

''وانتم تتلون الکتاب'' حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو اور اس کتاب کے اندر عالم بے عمل کے لیے وعیدیں ہیں تو سب کچھ تمہارے سامنے ہے پھر بھی تم ایسے کرتے ہو۔

''افلا تعقلون'' کیا تم سمجھتے نہیں ہو ان باتوں کو، تم عقل سے بات نہیں مانتے ، یہ ملامت کا انداز ہے۔

استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا مفہوم:

اس حق کے قبول کرنے میں تمہاری خواہشات کو نقصان پہنچے گا وہ لذت پرستی نہیں رہے گی استعانت ''بالصبر'' کروصبر کی عادت ڈالو یہ صبر تمہارے لیے معاون بنے گا ان حالات کو برداشت کرنے کے لیے، صبر ایک ایسا ملکہ ہے انسان کی طبیعت میں کہ جس سے انسان خلاف طبیعت امور کو سہہ جاتا ہے برداشت کر جاتا ہے، صبر اخلاق باطنہ میں سے ایک خلق ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنی طبیعت میں ایسی چیز پیدا کرو کہ اگر خلاف طبیعت کوئی چیز واقع ہو جائے تو آپ اس کو برداشت کرسکیں یہ ملکہ پیدا کرو اس کو صبر کہتے ہیں۔

صبر کا مفہوم بہت عام ہے آپ سنتے رہتے ہیں'' صبر علی المصیبت '' کوئی مصیبت پہنچ گئی تو اس کو برداشت کرو اس پر واویلا نہ کرو زیادہ رو دھو نہیں ''صبر علی الطاعت ''فرمانبرداری اطاعت کرنے میں ناگواری طبیعت میں ہے تو اس ناگواری کو برداشت کرو نیکی کی عادت ڈالو اور'' صبر علی المعصیت ''طبیعت کا میلان معصیت کی طرف ہے اس سے رکنے میں طبیعت کو ناگواری ہے تو اس کو روکو تو یہ صبر کا مفہوم ہر طرح سے ہے اصل ہے "ضبط النفس علی ماتکرہ'' کہ جو چیز نفس کو ناگوار ہے اس کے اوپر نفس کو پابند کرنا۔

مصیبت آجائے تو نفس کی خواہش ہے کہ شکوہ شکایت کرے، واویلا کرے اور خاموش ہو جانا اور اس کو سہہ جانا یہ نفس کو ناگوار ہے یہ عادت ڈالو برداشت کرنے کی، طاعت کی طرف جانا نفس کو ناگوار ہے اس پر اسے پابند کرو، معصیت چھوڑنا نفس کو ناگوار ہے اس کے اوپر نفس کو پابند کرو، اس طرح صبر کا دائرہ تمام طاعات کی طرف وسیع ہو جاتا ہے اور اسی طرح تمام معاصی سے بچنے کی طرف، اور خلاف طبیعت واقعات جو پیش آتے ہیں جن کو ہم اپنی اصطلاح میں مصیبت کہتے ہیں ان کو سہنا یہ بات بھی صبر میں داخل ہو جاتی ہے۔

صبر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خلق اتنا مضبوط ہو جائے کہ طاعت ناگوار ہے تو بھی کرو، معصیت کا چھوڑنا ناگوار ہے تو بھی چھوڑو، اور خلاف طبیعت واقعہ پیش آ گیا جس پر خاموشی اختیار کرنا طبیعت کو ناگوار ہے تو اس پر بھی خاموشی اختیار کرو۔

اور جو لذت پرستی اور شہوت پرستی ہوتی ہے وہ صبر کے منافی ہے کہ گناہ کرنے کو طبیعت چاہی گناہ کر لیا نیکی نہ کرنے کو طبیعت چاہی نہیں کی، اور اس طرح سے ذرا سی تکلیف پہنچی اور خلاف طبیعت واقعہ پیش آنے پر شکوہ شکایت اور واویلا کرنے میں نفس لذت محسوس کرتا ہے تو یوں کرنے لگ گئے، یہ سب چیزیں صبر کے خلاف ہیں تو تم بھی صبر کی عادت ڈالو اور نماز کی عادت ڈالو یہ تمہارے لیے معاون بنے گی اس حق کے قبول کرنے میں۔

عاجزی اختیار کرو اور تکبر سے بچو:

باقی رہا کہ صبر اور صلوٰۃ یہ تو معاون بن جائیں گے لیکن صبر اور صلوٰۃ کو اختیار کس طرح سے کریں ان کی عادت کس طرح سے ڈالیں آخر یہ بھی تو مشکل کام ہیں آگے اس کا بھی طریقہ بتا دیا ''انھا'' کی ضمیر صلوٰۃ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، مجموعی طور پر اس خصلت کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے جس کا ذکر ''واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ'' کے اندر کیا گیا ہے صبر وصلوٰۃ کے ساتھ استعانت یہ خصلت گراں ہے، اس کا اختیار کرنا بوجھل ہے، مگر خشوع اختیار کرنے والوں پر جو عاجزی اختیار کرنے والے ہیں ان پر گراں نہیں ہے اور عاجزی اختیار کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اپنے رب سے ملنا ہے۔

'' انھم ملقوا ربھم '' کہ بے شک وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب کے ساتھ اور اسی کی طرف انہوں نے لوٹنا ہے تو اللہ کی طرف لوٹنے کا خیال اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا تصور یہ انسان میں خشوع پیدا کرتا ہے، عاجزی پیدا کرتا ہے اور جس وقت عاجزی پیدا ہو جائے گی تو یہ خصلت اختیار کرنی آسان ہو جائے گی کہ تم صبر وصلوٰۃ کو اختیار کرو گے اور صبر اور صلوٰۃ جس وقت تمہیں حاصل ہو جائے گا تو تکبر چلا جائے گا، شہوات پرستی ختم ہو جائے گی تو حق کا قبول کرنا تمہارے لیے آسان ہو جائے گا جس حق کے قبول کرنے میں تم یہ سمجھتے ہو کہ ہماری عزت اور مال کو نقصان پہنچے گا تو صبر وصلوٰۃ کی عادت پڑ جانے کے بعد اس حق کو قبول کرنا آسان ہو جائے گا اس طرح ان آیات میں روحانی علاج کی طرف ان علماء بنی اسرائیل کو متوجہ کر دیا گیا، یہ اجمالی تذکرہ ہے اور اگلے رکوع سے تفصیلی تذکرہ شروع ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میری طرف سے یہ یہ انعامات ہوئے اور تمہاری طرف سے ایسے ایسے واقعات پیش آئے۔

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ

اے اولاد یعقوب! یاد کرو میرے اس احسان کو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تمہیں فضیلت دی

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا

جہانوں پر ﴿۴۷﴾ اور ڈرو اس دن سے کہ جس دن نہیں ادا کرے گا کوئی نفس کسی کی طرف سے کچھ بھی

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ

اور نہیں قبول کی جائے گی کسی نفس کی طرف سے کوئی سفارش اور نہیں لیا جائے گا کسی کی طرف سے کوئی بدل اور نہ وہ

يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ

مدد کیے جائیں گے ﴿۴۸﴾ اور یاد کیجیے جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے کہ وہ پہنچاتے تھے تمہیں بڑا

الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ

عذاب، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں بھی

بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ

تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش ہے ﴿۴۹﴾ اور یاد کیجیے جب ہم نے پھاڑا تمہاری وجہ سے سمندر کو پھر ہم نے تم کو نجات دی

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى

اور فرعون کے لوگوں کو غرق کیا اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۰﴾ اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ

چالیس راتوں کا پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو معبود اس کے بعد اور تم

ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

ظلم کرنے والے تھے ﴿۵۱﴾ پھر ہم نے اس کے بعد تم سے درگزر کیا تا کہ تم شکرگزار ہو جاؤ ﴿۵۲﴾

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

(اور یاد کیجیے) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فرقان تا کہ تم ہدایت حاصل کرو ﴿۵۳﴾

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِ

اور یاد کیجئے جس وقت کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اے میری قوم! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا بچھڑے تو

كُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ

معبود بنا کر پس تم توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور قتل کرو تم اپنے لوگوں کو ، یہ قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے

لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تو پھر اللہ نے تمہاری توبہ قبول کرلی بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۵۴﴾

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً

اور یاد کیجئے جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے جب تک ہم دیکھ نہ لیں اللہ کو کھلم کھلا

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ

تو پکڑ لیا تمہیں کڑکنے والی بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے ﴿۵۵﴾ پھر ہم نے تمہیں اٹھایا

بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا

تمہارے مرنے کے بعد تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿۵۶﴾ اور ہم نے سائبان بنا دیا بادل کو تمہارے اوپر اور اتارا ہم نے

عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا

تمہارے اوپر من و سلویٰ (اور کہا) ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہ کیا

وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ

لیکن وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۵۷﴾ اور یاد کیجئے جب ہم نے کہا کہ تم داخل ہو جاؤ اس شہر میں

فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا

پھر تم کھاؤ اس شہر میں جہاں تم چاہو کھلم کھلا اور داخل ہو جاؤ تم جھکتے ہوئے اور یہ کہو

حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

حطۃ ہم تمہارے لیے تمہارے گناہ معاف کر دیں گے اور نیکو کاروں کو ہم زیادہ دیں گے ﴿۵۸﴾ بدل دی بات ان لوگوں نے

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

جنہوں نے ظلم کیا سوائے اس بات کے جوان سے کہی گئی تھی پھر اتارا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

عذاب آسمان سے بسبب اس بات کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

لغوی، صرفی ونحوی تحقیق:

''یٰبنی اسرائیل'' اے اولاد یعقوب۔

''اذکروانعمتی التی انعمت علیکم'' یاد کرو میرے اس احسان کو جو میں نے تم پر کیا، نعمت احسان کو کہتے ہیں، التی انعمت علیکم جو میں نے تم پر کیا۔

''وانی فضلتکم'' اس کا عطف نعمتی کے اوپر ہے اور اس بات کو یاد کرو کہ بے شک میں نے تمہیں فضیلت دی۔

''علی العٰلمین'' جہانوں پر۔

''واتقوایوماً'' اور ڈرو اس دن سے۔

''لا تجزی نفس عن نفس شیئاً'' لاتجزی سے آگے جو جملے ہیں یہ یوماً کی صفت واقع ہو رہے ہیں اس لیے ترجمہ میں یہ لفظ بولا گیا کہ ڈرو ایسے دن سے جس میں یہ واقعات پیش آئیں گے، جَزَا یَجْزِیْ ادا کرنا، نہیں ادا کرے گا کوئی نفس کسی کی طرف سے کچھ بھی اصل معنی اس کا یہی ہے باقی اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نفس کسی نفس کے لیے کافی نہیں ہوگا، کوئی نفس کسی نفس کے کام نہیں آئے گا، مفہوم ان الفاظ کے ساتھ ادا ہو جاتا ہے اصل ترجمہ یہی ہوا کہ کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا۔

''ولایقبل منھا شفاعۃ'' لایقبل نہیں قبول کی جائے گی منھا اس نفس کی طرف سے شفاعۃ، سفارش یعنی کسی نفس کی طرف سے کسی نفس کے لیے سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔

''ولایؤخذ منھا عدل'' عدل کا معنی بدلہ، عدل اصل میں برابر چیز کو کہتے ہیں ایک چیز ادا نہ کی جائے اس کے بدلے میں اس کے برابر کوئی دوسری چیز ادا کی جائے تو وہ عدل ہے، نہیں لیا جائے گا کسی نفس کی طرف سے کوئی بدل۔

''ولاھم ینصرون ''اور نہ وہ لوگ مدد کیے جائیں گے، مدد دیئے جائیں گے، مفہوم دونوں طرح سے ادا ہو جائے گا۔

''واذنجینٰکم من ال فرعون ''اور پھر یاد کیجئے جبکہ ہم نے تمہیں نجات دی من ال فرعون ، ال کا لفظ اولاد کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ تمام متعلقین اور اتباع کرنے والے تابعین وہ سب آل کہلاتے ہیں۔

یہ فرعون جس کا ذکر ہے یہ تو سرے سے بے اولاد تھا تو آل فرعون سے یہاں مراد اس کی فوجیں اور فرعون کے متعلقین ہیں فرعون کے کارکن، یاد کیجئے جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے، فرعون کے متعلقین سے۔

''یسومونکم سوء العذاب ''پہنچاتے تھے وہ تمہیں بڑا عذاب۔

''یذبحون ابناء کم ''یہ سوء العذاب کی تفسیر ہے، یذبحون ابناء کم ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو۔

''ویستحیون نساء کم ''اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو۔

''وفی ذٰلکم بلآء من ربکم عظیم '' بلآء کا معنی آزمائش بھی ہوتا ہے اور بلآء کا معنی انعام بھی ہوتا ہے احسان انعام اور بلآء کا معنی مصیبت بھی ہوتا ہے اور یہ تینوں معنی یہاں لگ سکتے ہیں'' ذٰلکم '' کا اشارہ اگر'' یسومونکم سوء العذاب، یذبحون ابناء کم ، ویستحیون نساء کم ''یا آل فرعون کا جو معاملہ تھا بنی اسرائیل کے ساتھ '' ذٰلکم '' کا اشارہ اگر ادھر ہو جائے تو بلاء مصیبت کے معنی میں ہے اس میں بڑی مصیبت تھی تمہارے لیے اور اگر'' نجینٰکم '' میں جو نجات دینا مذکور ہے، ذٰلکم کا اشارہ ادھر ہو جائے تو پھر یہ انعام اور احسان کے معنی میں ہے اس نجات دینے میں تمہارے لیے تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا اور تمہارے لیے بہت بڑا احسان تھا اور اگر مجموعے کی طرف اشارہ ہو جائے تو پھر یہ آزمائش کے معنی میں ہے کہ فرعونیوں کی طرف سے جو عذاب ہو رہا تھا وہ بھی مستقل آزمائش تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نجات ملی اس میں بھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

''واذفرقنا بکم البحر ''اور یاد کیجئے کہ جب پھاڑا ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو۔

''فانجینٰکم ''پھر ہم نے تمہیں نجات دے دی۔

''واغرقنا ال فرعون ''اور فرعون کے متعلقین کو، فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا۔

''وانتم تنظرون ''اور تم دیکھ رہے تھے یعنی تمہاری آنکھوں کے سامنے، تمہارے دیکھتے دیکھتے فرعونیوں کو غرق کر دیا۔

''واذوٰعدناموسیٰ'' اور یاد کیجئے جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے اربعین لیلۃً چالیس راتوں کا۔

''ثم اتخذ تم العجل'' پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو، دوسرا مفعول یہاں محذوف ہے۔

''ثم اتخذتم العجل الٰھاً'' کہ پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

''من بعدہٖ'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد، اصل عبارت ہوگی ''من بعدذھابہٖ'' موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعدتم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

''وانتم ظلمون'' اورتم بہت بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے، اورتم بہت ہی ظلم ڈھانے والے تھے، ظلم کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اصل کے اعتبار سے ظلم کہتے ہیں حق تلفی کو، کسی کی حق تلفی کی جائے یہ ظلم ہےاور شرک سب سے بڑا ظلم ہے کیونکہ اس میں مالک الملک کی حق تلفی ہوتی ہے۔

''ان الشرك لظلم عظیم ''مالك الملك'' کی اس میں حق تلفی ہےاور بہت بڑی حق تلفی ہے، اس کے متعلق توحید کا عقیدہ رکھنا یہ بہت بڑا حق ہے اللہ تعالیٰ کا بندوں پر اور جو شخص شرک کا ارتکاب کرتا ہے وہ اس حق کو فوت کرتا ہے اس لیے یہ ظلم عظیم ہےاورتم ظلم کرنے والے اور تمہاری یہ حرکت ظالمانہ تھی تو تم ظلم ڈھانے والے تھے۔

''ثم عفونا عنکم'' پھر ہم نے تم سے درگزر کیا۔

''من بعد ذلك'' اس شرک کے ارتکاب کے بعد۔

''لعلکم تشکرون'' تاکہ تم شکرگزار ہوجاؤ، احسان مانو۔

''واذآتینا موسیٰ الکتاب والفرقان'' اور یاد کیجئے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور فرقان، کتاب سے توراۃ مراد ہے، فرقان کہتے ہیں ایسی چیز کو جوکہ فارق بین الحق والباطل ہو، حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز، اس لیے یہ عطف تفسیری بھی ہے کہ وہی کتاب ''فرقان'' ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب بھی اترتی ہے وہ ''فرقان'' ہی ہوتی ہے، حق اور باطل میں، حلال اور حرام میں، غلط اور صحیح میں فرق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب'' فرقان'' کی مصداق ہوسکتی ہے، جیسے قرآن کریم کے بارے میں متعدد آیات میں یہی لفظ آیا ہے۔

''تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون للعلمین نذیرا'' وہاں قرآن کو بھی فرقان کہا گیا

ہے، دسویں پارہ کی ابتداء میں آئے گا کہ یوم بدر کو اللہ تعالیٰ نے یوم فرقان قرار دیا تو وہی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے کا دن تھا جس میں حق و باطل خوب اچھی طرح سے نمایاں ہوگئے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے جو معجزات ہوتے ہیں وہ بھی فرقان ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ بھی سچے اور جھوٹے میں فرق ہوتا ہے۔

تو یہاں فرقان سے وہی توراۃ مراد لے لی جائے تو بھی ٹھیک ہے اور جو معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے جو ان کی صداقت کی دلیل تھے جن کے ساتھ سچے اور جھوٹے میں فرق ہوتا ہے فرقان کا مصداق وہ بھی بن سکتے ہیں۔

عظیم معجزات، ید بیضاء، عصاء موسیٰ، خاص طور پر ان کا جوذکر کیا گیا ہے پہلے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف لے کر گئے تھے تو فرقان کا مصداق یہ بھی ہو سکتے ہیں اور اسی طرح دلائل علمیہ جن کے ساتھ حق اور باطل کو متعین کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ حرام وحلال کا امتیاز کیا جاتا ہے، سچے اور جھوٹے میں امتیاز کیا جاتا ہے'' دلائل علمیہ'' بھی فرقان کا مصداق ہو سکتے ہیں۔

''لعلکم تھتدون'' تا کہ تم ہدایت حاصل کرو، تا کہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔

''واذقال موسیٰ لقومہٖ'' یاد کیجئے جس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اگر اس کا ترجمہ یوں کریں کہ قوم کے لیے کہا تو اس سے مفہوم صاف نہیں ہوتا، جیسے قلت لزید کا ترجمہ ہے کہ میں نے زید کو کہا یا میں نے زید سے کہا، یہاں بھی قوم موسیٰ علیہ السلام کی مخاطب ہے تو قال موسیٰ لقومہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تو قوم مخاطب ہے یا قومِ، قوم میں میم کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے کہ اے میری قوم!

''انکم ظلمتم انفسکم '' تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، تم نے اپنے آپ پر زیادتی کی۔

''باتخاذکم العجل'' عجل کو معبود بنا کر، بچھڑے کو معبود بنا کر، بسبب بنا لینے تمہارے بچھڑے کو معبود، اتخاذ مصدر ہے اور اس کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور عجل پہلا مفعول اور الھاً دوسرا مفعول ہے۔

باتخاذکم العجل الھا تم نے بچھڑے کو معبود بنانے کے سبب سے اپنا نقصان کیا، اپنی جان پر ظلم کیا کیونکہ اپنے نفس کا حق بھی یہی ہے کہ انسان اس کے ساتھ ایسے کام کرے جس سے یہ اللہ کے عذاب سے نجات پائے اور آخرت کی کامیابی حاصل کرے تو جس وقت آپ اپنے آپ کو کسی گناہ میں مبتلا کرتے ہیں تو اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اپنے نفس کا حق بھی فوت کرتے ہیں، اے میری قوم! بے شک تم نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا ہے، اپنے نفسوں پر ظلم کیا، اپنی حق تلفی کی، اپنا نقصان کیا بسبب تمہارے بنا لینے بچھڑے کو معبود۔

''فتوبو االی بارء کم ''پس تم لوٹو، رجوع کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف، توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اس کا بھی وہی مفہوم ہوا جیسے تاب کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اصل کے اعتبار سے لوٹنے کو کہتے ہیں، رجوع کرو تم، لوٹو تم، توبہ کرو تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف۔

''فا قتلوا انفسکم ''اور اپنے لوگوں کو قتل کرو، انفسکم سے مراد اپنی قوم کے افراد ہیں اپنے آپ کو قتل کرنا مراد نہیں ہے یہاں قتل کرنے والے وہ تھے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی بلکہ وہ موحد رہے اور قتل ان کو کرنا ہے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی چونکہ مرتد ہو گئے تھے شرک کا ارتکاب کیا تھا تو ان کی سزا یہ تھی کہ اپنے لوگوں قتل کرو فا قتلوا انفسکم ''قتل کرو تم اپنے لوگوں کو'' اس کا ترجمہ یوں کریں گے۔

''ذلکم خیر لکم ''یہ قتل کرنا تمہارے لیے بہتر ہے'' عند بارئکم ''تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک۔

''فتاب علیکم ''پہلے یہ مضمون مقدر ہوگا کہ پھر تم لوگوں نے اللہ کی ہدایت کے مطابق اپنے لوگوں کو قتل کیا تو اللہ نے تم پر توجہ کی تمہاری اس توبہ کو قبول کر لیا ساری قوم کا گناہ معاف ہو گیا۔

''ذلکم خیر لکم عند بارئکم ''یہ بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک پس تمہاری اللہ نے توبہ قبول کر لی، اس سے آپ کو یہ مضمون بیان کرنا پڑے گا کہ تم نے ہدایت کے مطابق اپنے لوگوں کو قتل کیا پھر اللہ نے تمہاری توبہ قول کر لی۔

''انه هو التواب الرحیم ''وہ تو بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

''واذقلتم یموسیٰ ''اور یاد کیجئے جب تم نے کہا اے موسیٰ ''لن نؤمن لك ''ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے، تیری بات نہیں مانیں گے۔

''حتی نری اللہ جهرةً'' حتی کے بعد اردو محاورے میں مضارع کا ترجمہ نفی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، اردو محاورے کے مطابق ترجمہ یوں ہوگا ہم تیری بات نہیں مانیں گے تیری بات کا یقین نہیں کریں گے جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو کھلم کھلا، اردو محاورے کے مطابق ترجمہ اس طرح سے ہوگا جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا نہیں دیکھ لیں گے اس وقت تک ہم تیری بات کو نہیں مانیں گے۔

''فاخذتکم الصعقة'' صاعقہ کا لفظ پہلے آپ کے سامنے گزر گیا ہے صواعق منافقین کی مثال دیتے ہوئے یہ لفظ آیا تھا صواعق جمع صاعق کی، صاعق اس بجلی کو کہتے ہیں جس میں کڑک بھی ہو اور جو کبھی گر بھی جاتی ہو تمہیں کڑک نے پکڑ لیا، تمہارے اوپر ایک بجلی کڑ کی اس گرفت میں تم آ گئے، پکڑ لیا تمہیں کڑ کنے والی بجلی نے۔

''وانتم تنظرون'' اور تم دیکھ رہے تھے، کھلی آنکھوں تمہارے سامنے یہ معاملہ پیش آیا۔

''ثم بعثنکم '' پھر ہم نے تمہیں اٹھادیا ''من بعد موتکم'' تمہارے مرنے کے بعد، تمہاری موت کے بعد پھر ہم نے تمہیں اٹھادیا ''لعلکم تشکرون'' تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ تاکہ تم احسان مانو۔

''وظللنا علیکم الغمام''

غمام کہتے ہیں باریک بادل کو ظللنا ہم نے تمہارے اوپر سایہ فگن کر دیا، سایہ ڈالنے والا بنادیا، ہم نے تمہارے اوپر سائبان بنادیا بادل کو ظُلّ کہتے ہیں سائبان کو جو سایہ کرنے کیلئے اوپر تان دیا جاتا ہے ''یوم الظل'' کا لفظ بھی قرآن کریم میں آئے گا سائبان کا دن جس دن بادل اس طرح سے طاری ہو گیا تھا جس طرح کہ کوئی سائبان تنا ہوا ہو ہم نے سایہ دار کر دیا تمہارے اوپر یا ہم نے سائبان بنادیا تمہارے اوپر بادل کو'' وانزلنا علیکم المن والسلوٰی ''اور اتارا ہم نے تمہارے اوپر من وسلوٰی، سلوٰی ایک پرندہ ہے بٹیر کے مشابہ، عام طور پر اس کا ترجمہ بٹیر کے ساتھ ہی کیا جاتا ہے اور مــنّ یہ کوئی چیز آسمان سے برستی تھی اوس (شبنم) کی طرح جس طرح شبنم کے دانے پڑے ہوئے ہوتے ہیں اس طرح سے کوئی چیز برستی تھی میٹھی تھی جس کو یہ اٹھا لیتے تھے اور کھاتے تھے۔

ہم نے من وسلوٰی تمہارے اوپر اتارا'' کلوا من طیبٰت مارزقنکم '' کلوا من طیبٰت ثمر سے پہلے'' قلنا '' کا لفظ مقدر ہے اور ہم نے تمہیں کہا کہ کھاؤ ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے عمدہ چیزیں، ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ'' وما ظلمونا ''اور ان لوگوں نے ہم پر ظلم نہ کیا ''ولکن کانوا انفسھم یظلمون'' ''لیکن وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے'' اگر انہوں نے کوئی گڑبڑ کی جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم ہو گئے'' من وسلویٰ '' سے محروم ہو گئے تو اس میں ہمارا کیا نقصان؟ انہوں نے ایسی گڑبڑ کر کے اپنا نقصان کیا، ایسی حرکتیں کیں جس کی وجہ سے وہ ان نعمتوں سے محروم ہو گئے اس سے انہوں نے ہمارے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی اپنا نقصان کیا۔

'' ولکن کانوا انفسھم یظلمون '' جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمارا کیا بگاڑا نقصان اپنا کرتے ہیں، اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انہوں نے ایسی حرکت کی تھی جس حرکت کی بناء پر وہ اللہ کی اس نعمت سے محروم ہو گئے۔

''واذقلنا ادخلوا ھذہ القریۃ'' اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے کہا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں، قریۃ آبادی کو کہتے ہیں جس میں لوگ جمع ہو کر سکونت اختیار کر لیتے ہیں، چھوٹے دیہات بڑے شہر سب کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

قـــریتـــن کا لفظ سورۃ زخرف میں آئے گا جس کا مصداق طائف اور مکہ ہیں اور اسی طرح سورۃ یوسف میں "واسئل القریۃالتی کنافیھا" میں قریۃ کا لفظ آئے گا جس سے شہر مصر مراد ہے جو اس وقت کی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔

"فکلوا منھا حیث شئتم رغدا" پھر تم کھاؤ اس شہر سے جہاں تم چاہو کھلم کھلا "رغدا" کا لفظ ماقبل میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعے میں بھی گزرا کہ کھلم کھلا کھاؤ، وسعت کے ساتھ کھاؤ "کـــلـــوا اُکُلاً رَاغِـــداً" اس طرح راغداً مصدر کی صفت ہو کر کــلــوا کا مفعول مطلق ہو جائے گا ویسے مصدر ہے اور وسعت، عیش کے معنی میں یہ لفظ آیا کرتا ہے۔

"وادخلوا الباب سجدا" سجدا یہ ساجد کی جمع ہے "اور داخل ہو جاؤ دروازے میں جھکتے ہوئے" دروازے سے شہر کا دروازہ مراد ہے یا عبادت خانے کا، عبادت خانے کے دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہو جاؤ، یا شہر کے دروازے میں جھکتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔

"وقولو احطۃ" اور یہ کہتے ہوئے جاؤ حطۃ مسئلتنا حطۃ ہمارا سوال یہ ہے کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیئے جائیں یہ حطۃ کا لفظ اس سارے مفہوم کے اوپر دلالت کرتا ہے حطۃ حطۃ یہ ایسے ہی ہے جس طرح ہم کہتے ہیں، توبہ توبہ، یہ توبہ توبہ کا جو لفظ ہم کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں توبہ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہوں لفظ ایک ہے اور اس کے اندر یہ سارے کا سارا مفہوم آ گیا۔

یہ توبہ کا لفظ مفرد استعمال ہو رہا ہے لیکن مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری توبہ میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، اسی طرح یہاں بھی ہے کہ "حطۃ حطۃ" کہتے ہوئے جاؤ جس کا مطلب یہ ہوگا "مسئلتنا حطۃ" ہمارا سوال یہ ہے کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیئے جائیں، توبہ استغفار کرتے ہوئے دروازے کے اندر داخل ہو جاؤ، عملی طور پر جھکتے ہوئے اور قولی طور پر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ استغفار کرتے ہوئے۔

"نغفرلکم خطیٰکم" یہ جواب امر ہے یعنی اگر تم نے ایسے کیا کہ تم جھکتے ہوئے دروازے میں داخل ہوئے اور زبان سے حطۃ حطۃ کہنے لگے تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔

"وسنزید المحسنین" اور نیکوں کاروں کو ہم اور زیادہ دیں گے جتنا اپنے عمل میں احسان پیدا کرتے چلے جاؤ گے اتنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، احسان کا معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنا۔

احسان فی العبادت یہ ہوتا ہے کہ عبادت کو ایسے طور پر کیا جائے اس یقین کے ساتھ کیا جائے گویا کہ انسان اللہ کو دیکھ رہا ہے۔

باقی ہر معاملے میں احسان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کام کو اچھے طریقے سے کر دیا نیکو کار اچھی طرح سے کام کرنے والوں کو ہم زیادہ دیں گے۔

"فبدل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم" "بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا قول غیر اس قول کے جو ان کے لیے کہا گیا تھا" جو بات ان سے کہی گئی تھی انہوں نے اس کو تبدیل کر کے اور بات بنالی، ایک چیز کو دوسری چیز سے بدل دیا، جو بات ان سے کہی گئی تھی اس کے بدلے میں اور بات کہنے لگ گئے، جیسے کہ مفسرین نے ذکر کیا کہ حطۃ کا لفظ جو تھا اس کو بطور استہزاء کے ٹھٹھہ کرتے ہوئے لفظ بگاڑ لیا، حطۃ کی بجائے حنطۃ کہنے لگ گئے اور حنطۃ کا معنیٰ ہے گندم، کہاں تو حطۃ تھا جس کا مطلب تھا کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیئے جائیں اور کہاں انہوں نے مذاق کر کے حطۃ کو حنطۃ بنالیا گندم گندم کرتے جا رہے ہیں گندم کا یہاں کیا معنی یہ بھی تو فطرت میں شرارت تھی اس نے بات بگاڑ دی۔

"بدل دی ان لوگوں نے بات غیر اس بات کے جو ان سے کہی گئی" بدل دی ظالموں نے، بدل دی ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات سوائے اس بات کے جو ان سے کہی گئی تھی۔

"فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً" پھر اتارا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا، "رجزا" عذاب کو کہتے ہیں، اتارا ہم نے ان لوگوں کے اوپر جنہوں ظلم کیا عذاب آسمان سے۔

"بما کانوا یفسقون" بسبب اس بات کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، بسبب اس بات کے کہ وہ "خروج عن الطاعۃ" کا ارتکاب کرتے تھے، ان کے فسق وفجور کی وجہ سے۔

تفسیر:

پچھلے رکوع میں بنی اسرائیل کو کچھ اصولی خطاب تھا اور یہاں سے اب تفصیلی واقعات شروع ہو رہے ہیں۔

پہلی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجمالاً اپنے انعام کا تذکرہ ہے اور آخرت کی ترغیب ہے اور آگے پھر جس طرح سے آپ نے ترجمہ میں سن لیا مختلف واقعات اللہ تعالیٰ بیان فرما رہے ہیں۔

بنی اسرائیل کو فضیلت کلی حاصل تھی یا جزوی؟:

"یابنی اسرائیل اذکروا" اس آیت میں تو وہی بات ہے کہ اپنا احسان جتلایا جا رہا ہے

کہ اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمہیں جہانوں پر فضیلت دی۔

''العالمین'' سے اگر تو اس دور کے لوگ مراد لیے جائیں ''علی الاطلاق'' سارے جہان مراد نہیں ہیں پھر تو کوئی اشکال نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے تمام عالمین میں سے افضل امتی تھے، ایک نبی پر ایمان لائے وہ صاحب کتاب تھے، اہل حق اس وقت وہی لوگ سمجھے جا رہے تھے تو ایک وقت تم پر ایسا گزرا ہے کہ تم زمانے میں سب سے اچھے لوگ تھے اور یہ میں نے تمہیں فضیلت دی تھی کہ نبی بھیج کر تمہیں ہدایت دی اور تمہارے پاس کتاب اتاری تم اہل حق کا گروہ تھے یہ اتنا بڑا انعام تھا کہ ایک وقت میں تم سب جہان سے افضل تھے وہ بات ان کو یاد دلائی جا رہی ہے، پھر کوئی اشکال نہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد چونکہ جو وجہ فضیلت تھی ان کی وہ ختم ہو گئی اب وہ متبع شریعت نہیں رہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کے پیروکار نہ رہے اب آنے والے نبی کا انکار کر کے وہ کافر ہو گئے، اپنی ضد وعناد کی بناء پر انہوں نے حق کو قبول کرنا چھوڑ دیا، اب وہ افضل العلمین نہیں ہیں بلکہ شر العالمین ہیں تمام جہانوں میں سے ان کا درجہ بدتر ہو گیا، وہ مبغوض ہو گئے، ملعون ہو گئے اب ان کا درجہ عالمین کے اوپر فضیلت کا نہیں۔

ہاں ایک وقت تم پر گزرا ہے کہ تم تمام جہانوں میں سے افضل ترین لوگ تھے اور اللہ کا یہ تم پر کتنا بڑا انعام تھا ساری مخلوق میں سے تم افضل تھے اور اگر العالمین سے سارے جہان ہی مراد لیے جائیں تو پھر مفسرین کہتے ہیں کہ اس میں توجیہ کر لی جائے گی جزوی فضیلت کے طور پر کہ تم اپنی تاریخ میں غور کرو کہ میں نے تمہارے ساتھ ایسے ایسے معاملے کئے ہیں کہ جیسے معاملے میں نے مخلوق میں سے کسی سے نہیں کیے ان معاملوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے جو خصوصی خصوصی انعامات تم پر کیے ہیں ان کی بناء پر تم جہانوں سے افضل ہو یعنی فضیلت جزوی ہے کہ ایسے معاملات تمہارے ساتھ کیے گئے جو دنیا میں کسی کے ساتھ نہیں کیے گئے جیسا کہ ان کی تفصیل آپ کے سامنے آ رہی ہے اس کو جزوی فضیلت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جزوی فضیلت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک بات میں کوئی شخص دوسرے سے زائد ہو جائے لیکن کلی فضیلت کا مدار ہوا کرتا ہے سارے حالات کو دیکھ کر جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے تھے جو قرآن کریم کے حافظ نہیں تھے اور آپ حضرات قرآن کریم کے حافظ اور قاری ہیں، اس اعتبار سے کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ آپ اس وصف کے اعتبار سے فلاں صحابی سے افضل ہیں لیکن جہاں تک کلی

فضیلت کا تعلق ہے وہ سارے حالات کی طرف دیکھتے ہوئے ہوگی، لیکن ایک بات کی طرف دیکھتے ہوئے اگر مفضول کو افضل سے اچھا قرار دے دیا جائے تو اس میں کوئی بات نہیں ہوتی تو اسرائیلیوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کے وہ معاملات تھے جو عام لوگوں کے ساتھ نہیں اس اعتبار سے وہ ساری دنیا میں ممتاز ہیں، پھر یہ جزوی فضیلت کا قول کر دیا جائے گا پھر اگر العالمین کو عام بھی رکھا جائے گا تو کوئی حرج نہیں۔

قیامت کے دن کے متعلق بنی اسرائیل کا نظریہ:

''واتقو ایوماً لاتجزی نفس عن نفس شیئاً'' اس سے مراد ہے قیامت کا دن جس کی آگے صفات ذکر کی گئی ہیں کہ اس دن میں کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کر سکے گا، اسرائیلی جو بگڑے بیٹھے تھے ان کے اندر جو فساد آیا تھا اس فساد کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ کہنے لگ گئے'' نحن ابناء الله'' ہم تو اللہ کے بیٹوں کی طرح ہیں اللہ کے محبوب ہیں اور یہ ایسا کیوں کہتے تھے اس لیے کہتے تھے کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں، بزرگوں کی نسل ہونے پر فخر کرنے لگ گئے تھے جس طرح آج جاہل پیرزادوں کا حال ہے ایک بزرگ کی نسل میں پیدا ہو گئے چاہے بیسویں نسل بزرگوں کی کیوں نہ ہو اور نیچے والے اب دن رات بندر ریچھ کتوں کا کھیل ہی کیوں نہ رچاتے ہوں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد ہیں لہذا ہم بخشے بخشوائے ہیں۔

جب ہم اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے، ہمارے وہ بزرگ آئیں گے اور سارا حساب کتاب ٹھیک ٹھاک کر کے ہمیں ساتھ لے جائیں گے دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہی معاملہ ہوتا ہے۔

دنیا میں مجرم کو چھڑوانے کے مختلف طریقے ہیں:

ایک آدمی اگر جرم کرتا ہے اور وہ اس جرم کی بناء پر پکڑا جائے تو ایک شخص جاتا ہے اہل حکومت کے پاس اور جا کر کہتا ہے کہ جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے وہ ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں جو جرمانہ آپ اس کو کریں جو حق اس پر ثابت ہوتا ہے وہ مجھ سے لے لو اس کو چھوڑ دو، ایک آدمی دوسرے کی طرف سے جا کر وہ حق ادا کر دیتا ہے ادا کرنے کی بناء پر جو پکڑا گیا تھا وہ چھوٹ گیا دنیا میں ایسے ہوتا ہے اور کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک آدمی اہل حکومت کی گرفت میں آ گیا اور کوئی بڑا آدمی سفارشی بن کر چلا گیا تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اہل حکومت اس کی سفارش کو قبول کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اس بڑے آدمی کے دباؤ میں ہوتے ہیں، چاہے جرم صحیح ثابت بھی ہو لیکن اہل حکومت اس بڑے آدمی کے دباؤ کی بناء پر اس کو چھوڑ دیتے ہیں، اور کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ انسان کہتا ہے کہ رشوت لے لو، کوئی رقم لے لو اگرچہ متعین حق ادا نہیں کیا جاتا لیکن ویسے ہی مٹھی گرم کر دی جاتی ہے، بدلے کے

طور پر کوئی چیز لے لی اور لے کر اس کو چھوڑ دیا یوں بھی ہوتا رہتا ہے اور ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ مجرم جو پکڑا گیا اس کے حامی اکٹھے ہو کر زور اور طاقت کے ساتھ چھڑا لیتے ہیں، جلوس نکالا، جیل پر حملہ کر دیا، دیواریں توڑ دیں، دروازے توڑ دیئے اور قیدیوں کو لے بھاگے آئے دن اخبارات میں آپ اس قسم کے واقعات بھی پڑھتے رہتے ہیں کہ ایک آدمی جو پکڑا گیا دوسرے لوگ زبردستی کر کے، حملہ آور ہو کر اسے چھڑا کر لے گئے تو کسی مجرم کے چھڑوانے کے لیے یہی طریقے ہوتے ہیں جو دنیا میں مروج ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں اور اگر ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی کسی شخص کو حاصل ہو تو اس کے اندر جرم کی جرأت ہوتی ہے۔

اگر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میری جگہ فلاں ادا کر دے گا تو بھی وہ آدمی بے باک ہو جائے گا اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ کچھ دے دلا کر چھوٹ جائیں گے تو بھی وہ بے باک ہو جائے گا اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میرا فلاں سفارشی ہے تو اس وقت بھی وہ شرارتیں کرے گا اور کسی سے نہیں ڈرے گا اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا جتھہ مضبوط ہے مجھے کون ہاتھ ڈال سکتا ہے جس دن میں پکڑا گیا اس دن سارے ملک میں ہڑتال ہو جائے گی، سارے ملک میں جلوس نکالے جائیں گے اور لوگ زبردستی کر کے چھڑا لیں گے تو بھی وہ بڑا بے باک ہو جاتا ہے۔

آخرت کے دن کو دنیا کے واقعات پر قیاس نہ کرو:

تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میری عدالت کو اس دن اس طرح نہ سمجھنا جیسے دنیا کے واقعات ہیں کوئی نفس کسی کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا اگر آپ نے ایک نماز نہیں پڑھی اور اس کی بناء پر پکڑے گئے تو آپ کا بھائی، آپ کے دوست، آپ کے بڑے آپ کے چھوٹے اللہ کی دربار میں جا کر یہ نہیں کہیں گے کہ اس کی جو ایک نماز رہ گئی تھی وہ ہمارے نامہ اعمال سے کاٹ کر اس کے نامہ اعمال میں درج کر دو اور اسے چھوڑ دو کوئی نفس اس طرح کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا جو ذمہ داری تم پر ہے اس کا جواب تم نے ہی دینا ہے اس لیے یہ زعم اپنے دل سے نکال دو کہ وہاں کوئی تمہارے کام آ جائے گا اور تمہاری جگہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کوئی دوسرا ادا کر کے تمہیں چھڑا کر لے جائے ایسی بات نہیں ہے۔

پھر اگر تم اس زعم میں مبتلاء ہو کہ ہمارے تعلق والے اللہ کے مقرب ہیں اور جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش رد نہیں کریں گے وہ سفارش کر کے ہمیں چھڑا کر لے جائیں گے یہ بات بھی نہیں ہے اصول وہاں یہی ہے کہ کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی باقی تفصیل دوسری آیات اور روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہو گی کہ کافر کے لیے کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی یعنی وہاں سفارش ہو گی ہی نہیں جو کافر کے

کام آئے باقی اگر کوئی شخص مومن ہے تو مومن کے لیے سفارش ہوگی جس کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں بھی ہے اور روایات میں تو بہت صراحت کے ساتھ آیا ہوا ہے اور بات وہی صحیح ہوا کرتی ہے جو دین کی پوری باتوں کے اوپر نظر رکھ کر سمجھی جائے، ایک ہی آیت کے اوپر مسئلے کا مدار نہیں رکھا جا سکتا روایات کی طرف دیکھتے ہوئے، قرآن کریم کی دوسری آیات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفارش تو ہوگی لیکن مقبول بندے کریں گے مومن کے لیے کریں گے اور جو کافر ہو گیا اس کے لیے کوئی سفارش کرے گا ہی نہیں جب کرے گا کوئی نہیں تو قبولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''لاتقبل'' میں نفی کی جا رہی ہے قبولیت کی لیکن حقیقت کے اعتبار سے جیسے آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سرے سے سفارش ہوگی ہی نہیں اور ایسے ہی یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی فدیہ دے دو کہ کہو دو کلو سونا لے لو اور ہمیں چھوڑ دو جو حق ہمارے ذمے لگا ہوا ہے وہ تو ہم ادا نہیں کر سکتے لیکن یہ فدیہ لے لو، فدیہ لے کر چھوڑ دو وہاں یہ فدیے کا قصہ بھی نہیں ہوگا اور ایسے بھی ممکن نہیں کہ تمہاری پارٹی اور تمہارا جتھہ اکٹھا ہو کر وہاں آ جائے اور جلوس نکال کر، نعرے لگا کر ''نعوذ باللہ'' اللہ تعالیٰ کو مرعوب کرنے کی کوشش کرے اور کوئی آپ کو چھڑا کر بھاگے ایسا بھی نہیں ہوگا، جتنے بھی طریقے ہیں مجرم کو چھڑانے کے سب کی نفی ہوگئی۔

ڈرو اس گھڑی سے جو سر پر کھڑی ہے:

اس دن کا خیال کرو اس گھڑی کا خیال کرو جو گھڑی تمہارے سر پر ہے اور اس میں تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور پکڑے جاؤ گے اور تمہیں چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا تمہارے ذمے جو اللہ کے حقوق ہیں تمہاری جگہ کوئی اور ادا نہیں کرے گا، وہاں فدیے کا کوئی قصہ نہیں، کوئی تمہاری سفارش کرنے نہیں آئے گا، کوئی تمہارا حمایتی کھڑا نہیں ہوگا اس وقت کا تصور کرو اور اپنی آخرت کا خیال کرتے ہوئے حق کو قبول کرو اور باطل کی حمایت چھوڑ دو۔

جیسے کہا کرتے ہیں کہ ڈرو اس گھڑی سے جو سر پر کھڑی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ وہاں جا کر کوئی بچاؤ کی صورت نہیں ہوگی غلط قسم کے خیالات اپنے ذہنوں سے نکال دو جو تم اپنے چھوٹوں بڑوں پر اعتماد کیے بیٹھے ہو یہ سب قصے غلط ہیں اس دن کا خیال کرو جس دن میں یہ واقعات پیش آئیں گے اور فکر آخرت ہی ہے جو انسان کے دل دماغ کو سیدھا کرتی ہے اور جس کے ساتھ انسان کے اندر حق کو قبول کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے وہ صرف فکر آخرت ہے جب انسان یہ سوچتا ہے کہ میں اللہ کے سامنے پیش ہوں گا وہاں میرا کچھ نہیں بن سکے گا میں نے اپنے کردار کی بناء پر

چھوٹنا ہے ورنہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہو جاؤں گا اس طرح تو انسان میں اپنے کردار کو اچھا کرنے کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو یہاں وہی فکر آخرت کی تلقین کی ہے۔

آگے واقعات کی تفصیل شروع ہوگئی یہاں صرف فہرست کے طور پر یہ واقعات ذکر کیے گئے ہیں اور قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ان واقعات کی تفصیل آئے گی چونکہ تفصیل آگے مختلف سورتوں میں آ رہی ہے اس لیے مفصل واقعہ یہاں ذکر نہیں کریں گے۔

آیات کے مفہوم دیکھتے چلے جائیں، قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ واقعات مذکور ہیں سورۃ اعراف سورۃ طٰہٰ اور مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ آئیں گے۔

فرعون کا ظلم اور اللہ تعالیٰ کا احسان:

''اذنجینا کم من آل فرعون'' یہ خطاب اگرچہ سرور کائنات ﷺ کے زمانے میں موجود یہودیوں کو ہے لیکن یہاں سے متعین وہی یہودی مراد نہیں قوم یہود مراد ہے اور قوم یہود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو معاملات تھے چاہے ان کے آباء واجداد کے ساتھ تھے لیکن پھر بھی وہ احسان آج جتلایا جا سکتا ہے۔

یہ فقرہ عام طور پر آپ لوگوں کی زبان پر آیا کرتا ہے ''نعمة علی الآباء نعمة علی الابناء'' کہ اگر کسی کے آباء پر احسان کیا گیا ہے تو بیٹوں پر بھی احسان ہے اگر کسی حکومت نے یا کسی فرد نے علماء دیوبند کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے تو آج ہمیں اس احسان کو جتلا کر کہا جا سکتا ہے کہ دیکھو اس شخص کا تم پر احسان ہے تمہیں چاہیئے کہ تم اس کی رعایت رکھو حالانکہ براہ راست اس کا احسان ہم پر نہیں ہوگا بزرگوں پر ہے لیکن اس کے احسان کا حوالہ دے کر ہم سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ جب اس انسان کا تم پر احسان ہے تو تمہیں اس کی بات کا خیال رکھنا چاہیئے تو تم پر احسان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تمہاری پارٹی پر، تمہاری جماعت پر، تمہارے مسلک پر اس شخص کا احسان ہے تمہیں چاہیئے کہ اس کی رعایت رکھو تو جو آباء واجداد کے اوپر نعمت ہوا کرتی ہے اس کا حوالہ بیٹوں کو بھی دیا جاتا ہے کیونکہ وہ قومی سطح کا ایک احسان ہوتا ہے اور جس کا احساس بعد والے ہر فرد کو کرنا چاہیئے۔

یہ عام طور پر دنیا کے اندر چلا آ رہا ہے اسی کے مطابق یہ احسانات اگر ان کے آباء پر ہیں اور یہ واقعات ان کے سامنے بالکل نمایاں تھے اور یہ ان کے واقعات کو جانتے تھے بلکہ ان واقعات کو اپنے لیے قابل فخر مانتے تھے تو اللہ تعالیٰ یاد دلاتے ہیں کہ دیکھو تمہارے اوپر یعنی تمہاری قوم یہود کے اوپر ہمارے کیسے کیسے احسان ہیں تمہیں ان احسانات سے متاثر ہو کر راہ حق اختیار کرنی چاہیئے۔

فرعون بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی تعداد سے مرعوب ہوگیا:

اس میں اشارہ ہے اس واقعے کی طرف کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں سارے اسرائیلی مصر میں منتقل ہو گئے تھے وہیں رہائش پذیر ہو گئے تھے اور مصر کا جو بادشاہ ہوتا تھا وہ فرعون کہلاتا تھا تو ایک وقت ایسا آیا کہ اس کو کسی نے پیشین گوئی کر دی کہ حالات کے تحت یہ اسرائیلی تیرا تختہ الٹ دیں گے اور یہ اقتدار کے زائل ہونے کا تصور ایک ایسا تصور ہوتا ہے کہ جس کو حاکم کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے پھر وہ آگ اور خون کا کھیل بھی کھیلتا ہے تو فرعون کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا، یا تو ان کی قومی ترقی کو دیکھ کر کہ یہ جو اتنے بڑھتے جا رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو افرادی قوت حاصل ہو جائے اور افرادی قوت حاصل ہونے کے بعد ایک دم میرا تختہ الٹ دیں یہ ایک استدلال ظاہری حالات سے ہو سکتا ہے۔

پھر چاہے پیشین گوئی کسی نے نہ ہی کی ہو کیونکہ پیشین گوئی کے قصے کہ اگر کسی نے ایسا کہا تھا اور ایسا ہو گیا پھر خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ یہ پیشین گوئی کتنی صحیح نکلی؟ کیا واقعی ایسی کوئی پیشین گوئی کی بھی تھی کہ نہیں کی تھی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ان واقعات کے ثبوت مہیا کرنے کی کہ ہم زور لگائیں ایسا ہو گیا، ہو تو بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے کیونکہ پیشین گوئی کرنا، آنے والے حالات کا اندازہ کر لینا یہ ہوتا رہتا ہے اور کافر بھی اس قسم کے فن جانتے ہیں جن کے ساتھ ظنی طور پر یہ اندازہ لگ جاتا ہے کہ واقعہ یوں ہونے والا ہے۔

سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آنے والے واقعات معلوم کرنے کے لیے دنیا کے اندر تقریباً چھتیس علوم مروج ہیں جن کے اندر لوگ مہارت حاصل کر کے آنے والے واقعات کو معلوم کرتے ہیں لیکن وہ سارے کے سارے ظنی ہیں اور ان میں سے کوئی قطعی نہیں قطعی صرف وحی کا ذریعہ ہے جو اللہ کی طرف سے آجائے جس میں کہہ دیا جائے کہ ایسا ہو جائے گا یہ ہے قطعی جس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے، باقی غیبی طور لوگ معلوم کرتے ہیں ظنی کوائف کے تحت اور وہ کبھی صحیح بھی ہوتا ہے اور کبھی غلط بھی نکل آتا ہے اس میں مسلمان اور کافر کی بھی کوئی قید نہیں ہے ستاروں کے اندر غور و فکر کر کے لوگ آنے والے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

دست شناسی کے ساتھ لوگ آنے والے واقعات کی نشاندہی کرتے ہیں، رمل کے ذریعہ سے کرتے ہیں، جفر کے ذریعہ سے کرتے ہیں، اسی طرح کشف ہے، الہام ہے اسی طرح اور بہت سارے علوم ہیں جن میں مہارت پیدا کر لینے کے ساتھ آنے والے واقعات کا کچھ انعکاس انسان کے قلب کے اوپر پیدا ہو جاتا ہے ایسا ہوتا رہتا ہے لیکن وہ سب ظنی ہیں، کسی پر یقین نہیں کیا جا سکتا کبھی بات غلط بھی ہو گی اور کبھی بات صحیح بھی ہو گی۔

اس لیے اگر کسی نجومی نے یہ پیشین گوئی کر دی ہو آنے والے حالات کے متعلق تو کوئی بڑی بات نہیں، اور پھر وہ صحیح بھی نکل آئے ایسا ہو سکتا ہے لیکن یہ چیزیں یقینی نہیں ہوتیں کبھی صحیح نکلے گا اور کبھی غلط۔

قطعی ذریعہ جس کے اوپر یقین کیا جا سکتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے ورنہ ولی کو بھی الہام ہو جائے تو اس پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ہو جائے گا اس میں بھی غلطی ہو سکتی ہے اور ظاہری بات جو میں کہہ رہا ہوں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ حاکم تھا وقت کا بادشاہ تھا اور بادشاہوں کا ذہن بادشاہوں جیسا ہوتا ہے اور وہ حالات پر نظر رکھا کرتے ہیں جب انہوں نے دیکھا کہ ایک غیر قوم یہاں آباد ہے اور ان کے بارہ خاندان ہیں اور دھڑا دھڑ بچے پیدا ہو رہے ہیں اور افرادی قوت بڑھ رہی ہے اگر ان کی رفتار اسی طرح بڑھتی رہی اور یہ قدرتی بات ہے کہ غریبوں کی اولاد زیادہ ہوتی ہے اور وہ بادشاہ خود بے اولاد تھا۔

سیدھی سی بات ہے جب آپ غور کریں گے اور ارد گرد نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ غریبوں کی اولاد زیادہ ہوتی ہے، امیروں کی اتنی نہیں ہوتی اس کی وجوہ چاہے کچھ بھی ہوں لیکن واقعہ یہی ہے کہ جتنے لوگ عیاش ہوتے ہیں جتنے لوگ آرام طلب قسم کے ہوتے ہیں جن کی زندگی لذت پرستی میں گزرتی ہے ان کی اولاد زیادہ نہیں ہوتی غریبوں کی اولاد زیادہ ہوتی ہے۔

اب بارہ خاندان اسرئیلیوں کے جو وہاں غلامی کی زندگی گزار رہے تھے ان میں دھڑا دھڑ اولاد ہو رہی تھی اور فرعون کے خاندان میں اتنی پیداوار نہیں تھی تو یہ اس نے خطرہ محسوس کر لیا ہو کہ افرادی قوت ان کی بڑھ رہی ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ اس افرادی قوت کے نتیجے میں یہ کسی دن میرا تختہ الٹ دیں، یہ ایک ایسی بات ہے جس کے لیے ہمیں کوئی ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ظاہری حالات کے مطابق ہے سیاست دان اس قسم کی باتیں سوچا کرتے ہیں اور جو اقتدار میں ہوتا ہے وہ اس قسم کی نظر رکھا کرتا ہے کہ کون میرے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔

اگر یہ صورتحال پیدا ہو گئی ہو کہ فرعون ان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے مرعوب ہو گیا کہ اگر ان کی افرادی قوت اسی طرح بڑھتی چلی گئی تو ایک دن یہ میرا تختہ الٹ دیں گے تو یہ عین سیاست دانوں کے مزاج کے مطابق بات ہے یہ ایسے حالات پر نظر رکھا کرتے ہیں۔

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی:

دوسری جماعت کو کمزور کرنے کے لیے توڑنے کے لیے، ان کے اندر افراتفری پیدا کرنے کے لیے،

کوئی نہ کوئی خفیہ راستے وہ تلاش کرتے ہیں، اور وہ زمانہ چونکہ ترقی یافتہ زمانہ نہیں تھا اگر اس قسم کا ترقی یافتہ زمانہ ہوتا جیسے آج ہے تو زبردستی کوئی خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام بھی بنالیا جاتا، ایسے ٹیکے لگانے شروع کردیتے کہ اولاد نہ ہو، گولیاں دینی شروع کردیتے، خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام چلتا لیکن وہ زمانہ ایسا ترقی یافتہ نہیں تھا کہ کوئی ایسی سکیم بنائی جاتی کہ لوگوں کے ذہن اور دل ودماغ پلٹ دیئے جاتے اور وہ فرعون کے گن گاتے اس قسم کی تعلیم وتربیت کا انتظام بھی اس دور میں نہیں ہوسکتا تھا جیسا کہ اکبر الٰہ آبادی نے انگریز کے طرز تعلیم پر چوٹ کی ہے۔

انگریز نے یہاں رہتے ہوئے فرعون سے کوئی کم کردار ادا نہیں کیا لیکن اس نے طریقہ ترقی یافتہ اپنایا اس نے قتل کرنے کی بجائے دل، دماغ کو بدل دیا کہ رنگ ونسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور دل ودماغ کے اعتبار سے انگریز، ہندوستانیوں کی اولاد کو اس نے اپنا مطیع اور فرمانبردار بنالیا اور اسی مطیع اور فرمانبردار بنانے کی وجہ سے اس خطے میں سو سال حکومت کر گئے۔

یہ اگر اس وقت چند درویش نہ ہوتے اس کے ساتھ ٹکرانے والے تو اس کے قدم کہاں ہلتے اس کو تو ان درویشوں کی آہیں لگیں اور انہی کی کوششیں تھی جو انقلاب لائیں ہیں اور سب سے پہلے انقلاب ہندوستان میں آیا تب جاکر دنیا کے مختلف ملک دھڑا دھڑ آزاد ہونا شروع ہوگئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا اس وقت تک سارے مشرقِ وسطیٰ کے اوپر انگریزوں کا تسلط رہے گا اور کسی کی جان نہیں چھوٹے گی، یہاں سے قدم اکھڑے تو پھر اکھڑتے ہی چلے گئے اب وہ صرف اپنے چھوٹے سے ملک کے اندر بند ہوگئے باقی سب جگہ سے سمٹ گئے، ان کے قدم اکھڑنے ہندوستان سے شروع ہوئے، بات یہیں سے چلی ہے تو اکبر الٰہ آبادی نے اس طرز تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے ایک بات کہی، اور بہت پیاری بات کہی، اکبر کہتا ہے خود یہ گریجویٹ ہے جج تھا یہ اندر کا آدمی ہے بات صحیح کہتا ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کے فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کہ فرعون بھی اگر کالج کھول دیتا تو اس کو ضرورت ہی نہیں تھی کہ اس قوم کے بچوں کو قتل کرتا، بچے جنتے یہ لوگ اور فوج بنتی فرعون کی جس طرح یہاں انگریز نے کیا کہ بچے جنتے ہندوستانی لیکن وہ معاون بنتے انگریز کے، رنگ کے کالے نسل ہندوستانی لیکن دل ودماغ انگریزوں جیسا، اب اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ کھڑے ہوکر پیشاب کیا جائے، اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ چلتے پھرتے ہوئے کھایا جائے ان سے وجہ پوچھی جائے تو سوائے

اس کے کہ ان کے آقا کا طریقہ ہے کوئی اور وجہ ان کے سامنے نہیں تو یہ اتنا مطیع اور فرمانبردار ہوگئے کہ اپنی چھوٹی موٹی عادات کے اندر بھی ان کا طریقہ اپنالیا یہ تو بنے بنائے بچے انگریز کے لیے فوج مہیا ہوتی چلی جائے گی، اس فوج نے اگر ضرورت پیش آئی تو ''کعبة الله'' پر بھی گولی چلانے سے دریغ نہ کیا، اسی فوج نے جہاں ضرورت پیش آئی اپنوں کے ساتھ غداری کرنے میں بھی کسی قسم کا دریغ نہیں کیا۔

اس لیے اکبرالٰہ آبادی کہتے ہیں کہ فرعون سے غلطی ہوئی کہ جو بچوں کو قتل کر کے بدنام ہوا اگر اس کو کالج سسٹم سوجھ جاتا اور وہ بھی کالج کھول لیتا تو اسرائیلوں کے بچے فرعونیوں کے کام آتے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کتنی بڑی چوٹ ہے یہ کالج کے نظام تعلیم پر کہ انگریز نے قوم کو قتل کر کے رکھ دیا لیکن ظاہری طور پر گردنوں پر چھری نہیں چلائی، نظام تعلیم کے ساتھ بدل کر رکھ دیا اپنے دین سے نفرت ہوگئی حب الوطنی ختم ہوگئی، قومی جذبہ ختم ہوگیا اور انگریز کے گن گانے لگ گئے اور اسی کے معاون بن گئے، کتنی بڑی چالاکی ہے، کتنی بڑی چستی ہے اور فرعون نے بچے قتل کیے تو بھی کچھ نہ بنا اور بدنام ہوگیا، یہ ترقی یافتہ صورتیں تھی نہیں اس لیے اس نے اس قوم کی انفرادی قوت کو کمزور کرنے کے لیے یہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا۔

فرعون لڑکوں کو قتل کرتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا:

چونکہ وہ محکوم تھے، غلام تھے جس گھر کے اندر بچہ پیدا ہوتا وہ اپنے سپاہیوں کو بھیج کر اس کو اٹھوالیتا اور اسے قتل کرا دیتا، خطرہ چونکہ انقلاب لانے کا مردوں سے ہی ہوتا ہے اور پرانے زمانے میں خاص طور پر اس قسم کے سیاسی امور میں دلچسپی لینا، لڑائی بھڑائی میں لگ جانا، اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنا، کسی کا تختہ الٹنے کی کوشش کرنا یہ کام ہی مردوں کا تھا۔

اب تو ''ماشاء الله'' حوا کی بیٹیاں بھی کسی سے پیچھے نہیں، کسی کا اقتدار الٹنے کے لیے اب یہ بھی جلوس نکالتی ہیں، جلسے کرتیں ہیں، کرسی کے لیے یہ بھی جنگ کرتی ہیں، کتنے ملک آپ کے سامنے پچھلے دنوں میں ایسے گزرے ہیں کہ جہاں حکومت ہے ہی عورتوں کی اور گھریلو زندگی پر تو قبضہ ''ماشاء الله'' بیگمات کا ہو ہی گیا اس کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔

اب یہ حواء کی بیٹیوں کا زمانہ آ گیا اگر یہ زمانہ اس وقت ہوتا کہ لڑکیاں بھی یوں ہی جلوس نکالتیں اس طرح سے کرتیں تو فرعون ان کو بھی نہ چھوڑتا ان کو بھی مروادیتا لیکن اس نے لڑکیوں کو کچھ نہیں کہا اس کو پتہ تھا کہ اقتدار پہ قبضہ کرنا لڑکیوں کا کام نہیں ہے اور اگر وہ لڑکوں کو بھی مار دیتا اور لڑکیوں کو بھی مار دیتا پھر گھروں میں کام کرنے کی ضرورت پڑتی وہ کون کرے ان کو تو گھروں میں خادمہ رکھتے ان سے کام لینا ہوتا تھا، اس لیے لڑکیوں کو قتل کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، صرف لڑکوں کو قتل کرتا تھا نسل کشی جو ہوئی لڑکوں کی وساطت سے ہوئی اور لڑکیوں کو خدمت کے لیے رکھا۔

چنانچہ مفسرین کہتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ جہاں ذبح کا ذکر کیا وہاں ابناء کا لفظ بولا کہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتا تھا، بیٹا بولنے میں باپ کی شفقت پدری ابھرتی ہے، اور آگے جہاں زندہ چھوڑنے کا ذکر آیا وہاں نسآء کا لفظ بولا جو عام طور پر بالغ عورتوں کے لیے بولا جاتا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ تمہاری لڑکیوں کو چھوڑتا جو جوان ہو کر ان کے کام آتیں اور اس میں غیرت کو چیلنج کرنا مقصود ہے۔

اللہ نے تمہیں فرعون کے ظلم سے نجات دی:

وہ ظالم ایسا تھا کہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتا تھا اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتا جو جوان ہو کر ان کے خاندان میں کام آتیں یہ تو حال اس نے تمہارا کر رکھا تھا، بیٹوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا اور لڑکیوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا اس طرح تم مصیبت اور عذاب میں آئے ہوتے تھے اور ہم نے تمہیں نجات دی، اس احسان کو تم بھول گئے ہو کتنا بڑا قومی احسان ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا تھا۔

"اذنجینکم من ال فرعون" جب کہ ہم نے تمہیں نجات دی فرعون کے لوگوں سے۔

"یسومونکم سوء العذاب" بڑا عذاب پہنچاتے تھے، ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو "نسآء" کا ترجمہ عورتیں ہے بیٹیوں کے ساتھ نہیں یوں نہیں کہا "یستحیون بناتکم" کیونکہ بنت جو ہے وہ تو ایک چھوٹی بچی پر بھی بولا جائے گا لیکن وہ اس چھوٹی بچی کو قتل نہیں کرتا تھا وہ بنتی تھی پوری عورت اور ان کا زندہ چھوڑنا جبکہ ساتھ سرپرستی کرنے والے اپنے خاندان کے آدمی نہ ہوں یہ تو غیرت کے خلاف ہے گویا کہ عورتوں کو وہ گھروں میں کام میں لاتے تھے اس لیے زندہ چھوڑتے تھے بیٹوں کو قتل کرتے تھے تو یہ بات غیرت کے بھی منافی تھی اور نسل کشی کے اعتبار سے ماں باپ کے بیٹے قتل ہوتے ہوں گے تو ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اتنا بڑا عذاب اس کو "سوء العذاب" کے ساتھ تعبیر کیا، ہم نے تمہیں اس عذاب سے نجات دی اور اس میں مصیبت ہے

تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی یا اس نجات میں انعام تھا یا ان مجموعی حالات میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی ۔

بنی اسرائیل کے لیے سمندر کو پھاڑنے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ:

''واذ فرقنابکم البحر'' واقعات کے سلسلے میں یہ دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا، یہ اس وقت پیش آیا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اسرائیلیوں کو لے کر راتوں رات مصر چھوڑ جایئے ملک شام کی طرف چلے جایئے تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ساتھ رات کو سفر شروع کر دیا اور فرعونیوں کو پتہ چلا تو فرعون اپنی فوجیں لے کر ان کے پیچھے ہولیا، جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں سمیت سمندر کے کنارے پر پہنچ گئے اور پیچھے سے فرعون کی فوجیں بھی نظر آنے لگ گئیں تو قوم نے گھبرا کر اس وقت کہا تھا۔

''مدد کون'' بے شک ہم پکڑ لیے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

'' کلاان معی ربی سیھدین '' ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ فرعون اور فرعون کی فوجیں ہمیں پکڑ لیں میرے ساتھ میرا اللہ ہے وہ مجھے ضرور راستہ دے گا تو پھر اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا کہ اپنا عصاء سمندر کی سطح پر مارو جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی سمندر کی سطح پر ماری تو سمندر پھٹ گیا، کہتے ہیں کہ بارہ راستے اس کے اندر بن گئے۔

انتظامی امور میں چونکہ اسرائیلیوں کے بارہ قبیلے تھے ان کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا، چشمے جب پھوٹیں گے تو بارہ ہی پھوٹیں گے ہر قبیلہ اپنے علیحدہ علیحدہ چشمہ پر قبضہ کر لے، علیحدہ علیحدہ چشمے سے پانی لے تاکہ آپس میں یہ لڑائی جھگڑا نہ کریں ایک دوسرے کے ساتھ یہ رواداری نہیں کرتے تھے معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑائی فساد ہو جاتا تھا اس لیے انتظامی امور میں ان بارہ کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا تو بارہ راستے بن گئے، پانی اس طرح سے کھڑا ہو گیا جیسے دیواریں ہیں اور درمیان سے راستے بن گئے۔

قرآن کریم میں لفظ آئے گا ''فکان کل فرق'' بڑے بڑے ٹیلوں کی طرح اور بڑے پہاڑوں کی طرح پانی کا ہر ٹکڑا منجمد ہو گیا، دیواریں کھڑی ہو گئیں بڑے بڑے ٹیلوں اور پہاڑوں کی طرح پانی نمایاں ہونے لگ گیا اور اندر سے راستے بن گئے۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سمیت ان راستوں میں داخل ہو گئے اور فرعون جس وقت اپنی فوجوں کو لے کر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سمندر میں راستے بنے ہوئے ہیں تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ گزرنے کی جگہ ہے تو وہ بھی انہی سڑکوں میں اپنی فوجوں سمیت پیچھے ہولیا۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ اسرئیلیوں کا آخری آدمی سمندر سے باہر ہوا اتنے میں فرعونیوں کا آخری آدمی سمندر کے

اندر آ گیا یعنی اتنا فاصلہ تھا دونوں میں آگے آگے اسرائیلی جا رہے تھے پیچھے پیچھے فرعونی، موسیٰ علیہ السلام باہر نکل گئے اسرائیلیوں کا آخری آخری بندہ جس وقت سمندر سے باہر نکلا تو فرعونیوں کا آخری آخری بندہ سمندر کے اندر آ گیا اور جس وقت وہ اندر آ گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہو گیا اور سمندر آپس میں مل گیا سمندر کا پانی اکٹھا ہو گیا، اکٹھا ہونے کے ساتھ ہی اب اسرائیلی سمندر کے کنارے پر کھڑے نظارہ دیکھ رہے ہیں اور فرعونی جتنے بھی تھے سارے ڈوب گئے اور غوطے کھا کھا کر وہیں غرق ہو گئے۔

بڑے آدمی کی موت کا جلدی یقین نہیں آتا:

فرعون کی ہیبت چونکہ اسرائیلیوں پر بہت زیادہ تھی ان کو ظاہری طور پر یہ یقین آنا مشکل تھا کہ فرعون ڈوب گیا کیا فرعون بھی ڈوب سکتا ہے؟ جس طرح سے آپ دیکھ رہے ہیں آج کے فرعون کو پھانسی ہوئی اور لوگوں کو اب تک یقین نہیں آتا کہ اس کو پھانسی ہوئی وہ کہتے ہیں کہ بھٹو اور پھانسی یہ کیسے ہو سکتا ہے، پہلے کہتے تھے کہ اس کو پکڑ کوئی نہیں سکتا، جب پکڑا گیا تو کہتے ہیں یہ تو اس کی سیاسی چال ہے ضیاء الحق تھوڑے دنوں کے بعد چھوڑ دے گا اور جب مقدمہ ہو گیا تو لوگ کہنے لگے کہ ہائیکورٹ سزا دے ہی نہیں سکتی وہ چھوڑ دے گی۔

جب ہائیکورٹ نے سزا دی تو کہتے ہیں کہ جب سپریم کورٹ میں اپیل ہوگی تو چھوٹ جائے گا، جب اپیل میں بھی خلاف فیصلہ ہو گیا تو کہتے ہیں کہ جب بیرونی دنیا کا دباؤ پڑے گا تو ممکن ہی نہیں کہ بھٹو کو پھانسی دے دی جائے اور جس وقت لٹکا دیا گیا غریب اس کے بعد بھی کہتے ہیں کہ پھانسی تو کسی اور کو دی ہے اس کو کہیں اور چھپایا ہوا ہے یہ تو ڈھونگ رچایا ہوا ہے وہ کہیں باہر ملک میں چلا گیا ہے اس طرح افواہیں اڑتی رہیں کہ اس کو پھانسی دی ہی نہیں گئی جب ایک آدمی لوگوں کے اوپر اپنی ہیبت کچھ زیادہ ہی ڈال دے تو لوگوں کو اس کی موت کا جلدی سے یقین نہیں آیا کرتا۔

پچھلی جنگ عظیم میں ہٹلر نے یورپ کو جو ناچ نچوایا وہ بالکل واضح ہے، یہ جرمن کا صدر تھا، امریکی دربرطانوی وغیرہ جتنے تھے سب اس کے خلاف تھے اتنا پریشان کیا اس نے ان کو کہ وہ ہٹلر اس جنگ میں مارا گیا تھا لیکن برس ہا برس تک یورپ کو یقین نہیں آیا کہ ہٹلر مر گیا ہے وہ ہر وقت اس کے نام سے بدکتے تھے ان کے دل دھڑکتے تھے کہ پتہ نہیں وہ کہاں چھپا ہوا ہے کسی وقت کہیں سے نکل نہ آئے، پتہ نہیں کتنی مدت کے بعد جا کر ان کو یقین آیا ہوگا کہ وہ مر گیا ورنہ بہت مدت تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ زندہ ہے اور کہیں چھپا ہوا ہے خطرہ ہے کہ پھر نکلے گا اور اسی طرح سے پھر کوئی فتنہ کھڑا کر دے گا۔

جب کسی آدمی کی ہیبت زیادہ ہو جایا کرتی ہے، اس کی عظمت قلوب کے اوپر زیادہ اثر انداز ہو جائے

تو پھر اس کی موت کا جلدی سے یقین نہیں آیا کرتا تو اسرائیلیوں کا بھی کچھ اسی طرح سے حال تھا کہ فرعون کے متعلق ان کو یقین آنا مشکل تھا کہ فرعون بھی ڈوب سکتا ہے اور وہ بھی پانی میں مر جائے گا۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے سارے فرعونیوں میں سے صرف فرعون کی لاش کو سمندر سے باہر پھینکا جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۃ یونس میں آئے گا ''الیوم ننجیك ببدنك الخ'' اس کی لاش کو نجات دی گئی اور اس کے بدن کو باہر پھینکا گیا تاکہ اسرائیلیوں کو بھی یقین آجائے اور ہمیشہ ہمیشہ فرعون کی ذلت کا سامان بھی ہو جائے، اس وقت بھی فرعون کی لاش قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے گوشت تو جھڑ گیا باقی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ موجود ہے اس طرح سے اس کی ذلت کا سامان بھی ہو گیا اور اسرائیلیوں کے لیے یقین کا باعث بھی ہو گیا۔

اس لیے جب قرآن کریم احسان جتلاتا ہے تو جہاں یہ احسان جتلاتا ہے کہ ہم نے تمہاری وجہ سے سمندر کو پھاڑا اور تمہیں نجات دی اور فرعون کے لوگوں کو غرق کیا، آگے لفظ ہیں ''وانتم تنظرون'' ہم نے فرعون کو اور فرعون کے لوگوں کو غرق کیا تمہاری آنکھوں کے سامنے، یہ منظر تم دیکھ رہے تھے۔

احسانات کو ذکر کرنے کا مقصد:

یہ سارا نظارہ تم نے دیکھا تو کتنا بڑا اللہ کا احسان ہے کہ ایک معجزانہ طریقے سے اتنے بڑے عظیم الشان دشمن کو پانی کے اندر ڈبو دیا گیا اور غرق کر دیا گیا، اور ایک معجزانہ طریقے ہی سے سمندر کے اندر تمہارے لیے راستے بنائے گئے تمہیں تو چاہیئے تھا کہ ان احسانات کو یاد کرتے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں لگے رہتے اور کبھی اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرتے۔

قومی طور پر اللہ تعالیٰ کے تم پر اس قدر احسانات ہیں کہ تمہاری طرف سے نافرمانی ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے ''وانتم تنظرون'' یہی مفہوم ہے کہ تم دیکھ رہے تھے اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے یعنی تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ سارا کھیل کھیلا گیا کہ تمہارے سامنے دریا کو پھاڑا گیا، تمہیں دریا میں سے گزارا گیا اور فرعونیوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا گیا یاد کرو اس احسان کو، جب اس قسم کے احسانات کو یاد کرو گے تو تمہارے اندر اطاعت کا مادہ پیدا ہوگا اس واقعے کا یہ حاصل ہے میں نے عرض کیا تھا کہ یہ واقعات کی فہرست دی جا رہی ہے، ان واقعات کی تفصیل دوسری سورتوں کے اندر آئے گی ''سورۃ الشعراء'' اور ''سورۃ طٰہٰ'' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ مفصل آئے گا۔

بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت کرنا اور اللہ تعالیٰ کا احسان:

" واذواعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ" جب کہ ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چالیس راتوں کا پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد۔

"وانتم ظلمون" اور تم بہت ہی ظلم ڈھانے والے ہو تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا، یا تم مشرک ہو گئے، کیونکہ شرک یہ ظلم عظیم ہے، ظلم کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ ظلم حق تلفی کو کہتے ہیں اور جس وقت کوئی شخص کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں شریک کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے حق کو تلف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ واحد عظیم الشان کا حق یہ ہے کہ اس کو واحد قرار دیا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے اس لیے "ان الشرک لظلم عظیم" میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا۔

اس واقعہ کی تفصیل بھی آپ کے سامنے آئے گی سورۃ اعراف میں کہ جس وقت اسرائیلی نجات پا گئے اور دشمن سے چھوٹ گئے تو ان کو کچھ اطمینان ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اب ہمارے سامنے کوئی قانون آ جائے، شریعت آ جائے ہم اس قانون کی پابندی کریں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قانون مانگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کوہ طور پر آؤ اور اس پر آکر تیس دن کا اعتکاف کرو اس کے بعد آپ کو توراۃ دی جائے گی تو تیس دن کے لیے بلایا تھا "ثلثین لیلۃ واتممنا ھا بعشر" پھر ہم نے اس تیس کا تتمہ دس کو بنا دیا۔

"فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ" اس کے رب کا وعدہ جو چالیس رات کا تھا وہ پورا ہو گیا، تام ہو گیا پہلے تیس راتیں، پھر دس راتیں اس کا تتمہ بنادی گئیں، تیس روزے رکھے اعتکاف کیا تیس دن کے بعد توراۃ کا نزول شروع ہوا دس دن میں وہ پورا ہوا، چالیس دن پورے ہوئے تو توراۃ مکمل مل گئی، لکھی لکھائی الواح کے اوپر یہ موسیٰ علیہ السلام کے اوپر نازل ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر جا رہے تھے تو پیچھے حضرت ہارون علیہ السلام **کو انتظامی** امور میں اپنا خلیفہ بنا گئے تھے واقعہ مفصل ذکر کرنا مقصود نہیں ہے سورۃ طٰہٰ اور اعراف کے اندر یہ واقعہ مفصل آئے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد ایک اسرائیلی نے جس کو قرآن کریم نے سامری کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس نے سونے چاندی کے زیورات ڈھال کر جس طرح سنار کھلونے بنایا کرتے ہیں اس نے

ایک بچھڑا بنا کر کھڑا کردیا اور کسی وجہ سے جس کی تفصیل سورۃ طٰہٰ میں آئے گی اس کے اندر کچھ ایسے حیات کے آثار پیدا ہو گئے کہ "لہ خوار" وہ اس طرح بولنے لگ گیا جس طرح گائے کا بچھڑا بولا کرتا ہے بس اتنی سی بات تھی۔

"اخذ العجل لہ خوار" خوار کہتے ہیں گائے کی آواز کو۔ گائے کی آواز کی طرح اس میں آواز پیدا ہو گئی اور اس نے ساتھ ہی نعرہ لگا دیا اور کہا "ھٰذا الٰھکم والٰہ موسیٰ" تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا یہی ہے "ونسی موسیٰ" موسیٰ بھول گیا اور کوہ طور پر ملاقات کرنے کے لیے چلا گیا، تو ھٰذا الٰھکم والٰہ موسیٰ یہ نعرہ سامری نے لگایا اس بچھڑے کو بنانے کے بعد جس وقت اس میں گائے جیسی آواز پیدا ہو گئی تو بہت سارے لوگ اس کی بات سے متاثر ہو گئے، اصل یہ ہے کہ یہ جو فرعون کے زیر اثر رہے تھے، فرعونیوں کے طریقوں میں گاؤ پرستی بھی تھی گائے کی پوجا کرنا جس طرح ہندو آج بھی گائے کو پوجتے ہیں معلوم یہ ہوتا ہے کہ پرانے زمانے ہی سے لوگوں کا نظریہ گاؤ (گائے) کے متعلق کچھ تبرک کا رہا ہے، اس وقت بھی ہندوستان میں ہندو جتنے ہیں سب گائے کو معبود سمجھتے ہیں، یہ متبرک جانور ہے ان کے نزدیک تو اسرائیلی بھی فرعونیوں کی تہذیب سے متاثر تھے ان کے دل میں بھی گائے کی عظمت تھی، جہاں گائے کی شکل سامنے آئی اور اس قسم کا کرشمہ اس میں نمایاں ہوا تو بہت جلدی انہوں نے اس کی عظمت کا اعتراف کرلیا۔

اب اسرائیلی تین حصوں میں تقسیم ہو گئے، بعض ایسے تھے جو کہ شدت کے ساتھ ممانعت کرنے والے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ مل کر انہوں نے سمجھایا، سب کچھ کیا، یعنی شرک میں مبتلاء بھی نہیں ہوئے اور مشرکین کو روکا بھی۔

بعض ایسے تھے جنہوں نے سکوت اختیار کرلیا، جس طرح صلح کیے ہوتے ہیں کہ ہر کسی سے صلح رکھو، کیا کسی سے بگاڑنی ہے وہ نہ ان کے ساتھ ہوئے نہ ان کے ساتھ ہوئے، خاموشی اختیار کرلی، اور ایک طبقہ تھا جو سامری کے ساتھ مل کر بچھڑے کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا، اور شرک کے اندر مبتلاء ہو گیا، اس واقعہ کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر دے دی کہ تیری قوم کو سامری نے گمراہ کر دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تو اتنا غصہ نہ آیا لیکن جس وقت واپس آئے اور قوم کو شرک میں مبتلا دیکھا تو جس قسم کے غصے کا اظہار کیا اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ سورۃ طٰہٰ اور اعراف میں کھینچیں گے کہ واپس آنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام پر کیا گزری اور کس طرح غصے کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور اپنی قوم کے ساتھ معاملہ فرمایا۔

بہر حال یہ واقعہ پیش آ گیا، واقعہ پیش آنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام آئے اور تنبیہ کی، اس بچھڑے کو بھی ریزہ ریزہ کیا، اور اس کو سمندر میں ہواؤں کے اندر اڑا دیا، اور اس کو اس طرح نیست و نابود کر دیا، سامری بھی

دنیاوی عذاب میں مبتلاء ہوگیا، وہ پاگل سا ہوگیا، اور آبادیوں سے بھاگا پھرتا تھا اس کے قریب کوئی آتا تھا تو کہتا تھا لامساس، لامساس مجھے ہاتھ مت لگانا مجھے ہاتھ نہ لگانا، وحشی جانوروں کی طرح وہ پاگل سا ہوکر بھاگنے پھرنے لگ گیا باقی قوم کو تنبیہ ہوئی تو وہ بھی تائب ہونے لگی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت توبہ کا قانون یہ اترا کہ یہ جو مشرک ہوگئے تھے، جنہوں نے شرک کیا ہے ان کو قتل کیا جائے قتل کرنا یہ قومی سطح پر توبہ ہے، یعنی توبہ ان کی تب قبول ہوگی کہ یہ اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کریں اور دوسرے لوگ ان کو قتل کریں۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے لکھنے کے مطابق قتل کرنے کا حکم ان کو دیا گیا جنہوں نے سکوت اختیار کیا تھا، تاکہ من وجہ ان پر بھی تنبیہ ہوجائے اور ان کو قتل کیا گیا جنہوں نے اس شرک کا ارتکاب کیا تھا، یعنی قتل ہونا توبہ قرار دیا گیا، جس طرح ہماری شریعت میں بعض گناہوں کی یہی سزا ہے کہ اگر لفظی طور پر توبہ کی جائے تو توبہ قبول نہیں ہے بلکہ ساتھ جان بھی دینی پڑتی ہے جب جان دے گا تو توبہ قبول ہوگی، شادی شدہ آدمی زنا کرتا ہوا پکڑا جائے اور شہادتیں اس کے اوپر گزر جائیں تو اس کی قبولیت توبہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے لیے پیش کردے جس وقت اس کو رجم کردیا جائے گا، اور جان سے ماردیا جائے گا تو اس وقت اس کی توبہ قبول ہوگی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ گناہ معاف کردیں گے۔

اور اسی طرح ''قتل عمد'' اس جرم کا ارتکاب کرنے والا قاتل اگر پکڑا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ اس کا توبہ کرلینا، استغفار کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کو قتل کیا جاتا ہے یہی اس کی توبہ ہے کہ جب آپ اس کو قتل کردیں گے وہ اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کردے گا اس کی جان چلی جائے گی یہی اس کے لیے قبولیت توبہ کا نشان ہے۔

اسی طرح ان مرتدین کے لیے بھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں گویا مرتد ہوگئے تھے شرک میں مبتلاء ہوگئے ان کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا گیا، پھر ان کو قتل کیا گیا بہت سارے لوگ مارے گئے تو قومی سطح پر جو اس جرم کا ارتکاب ہوا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا۔

یہاں دونوں باتیں جتلائی جارہی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کتاب دینے کے لیے بلایا اور پیچھے تم یہ حرکت کر بیٹھے اور اس حرکت کرنے کے بعد جو قومی سطح پر اس جرم کا ارتکاب کیا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے معاف کیا اور تمہاری توبہ قبول کی جس کی صورت یہ تھی کہ تم سے ایک دوسرے کو قتل کروایا گیا اور اس واقعے کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے، اس کی تفصیل دوسری سورتوں میں آرہی ہے۔

تبلیغی جماعت والے چلہ کا ثبوت:

یاد کیجیے جس وقت ہم نے وعدہ کیا موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا، یہاں پورا عدد ذکر کر دیا گیا، دوسری جگہ آئے گا کہ پہلے تیس راتیں تھیں اور پھر ''اتممنٰھا بعشرٍ'' دس راتوں کو ان کا تتمہ بنا دیا گیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا چالیس راتوں والا وعدہ پورا ہو گیا، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو چالیس راتیں کوہ طور پر گزاری تھیں یہ صوفیاء کے ہاں اصلاح باطن کے لیے جو چلہ کشی کا رواج ہے یہ واقعہ بھی اس کے لیے حصر دلیل بنتا ہے اور تبلیغی جماعت والوں نے جو چلہ رکھا ہے اس کی تائید بھی یہاں سے حاصل ہوتی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے چالیس دن تک اپنے ماحول کو چھوڑ کر کسی دوسرے ماحول میں چلے جانا جس میں انسان کی طبیعت کے اندر یکسوئی پیدا ہو جائے، یہ روحانی کیفیات حاصل کرنے کے لیے ایک بہت بڑا مجرب ذریعہ ہے، چلہ کشی، خلوت نشینی اس کے لیے اسی قسم کے واقعات دلیل ہیں۔

جیسے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے قبل غار حرا کے اندر یہی چلہ کشی کی، یہی خلوت اختیار کی تو اس طرح تنہائی میں بیٹھ کر جو غور وفکر کیا جاتا ہے انسان اپنے حالات کو سوچتا ہے، اس ماحول سے کٹ کر جو ایک نیا ماحول اختیار کرتا ہے تو اکثر و بیشتر چالیس دن تک اگر ان حالات کی رعایت رکھی جائے تو انسان کی طبیعت کے اوپر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ چلہ کھینچوایا اور اس کے بعد یہ کتاب موسیٰ علیہ السلام پر اتاری، پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو معبود، مفعول ثانی محذوف ہے جسے ترجمے میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود

''من بعدہٖ'' من بعد ذھابہٖ موسیٰ علیہ السلام کے چلے جانے کے بعد۔

''وانتم ظٰلمون'' اور تم بہت ظلم ڈھانے والے ہو۔

''ثم عفونا عنکم'' پھر ہم نے تم سے درگزر کیا ''من بعد ذٰلک'' اس کے بعد ''لعلکم تشکرون'' تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ، تاکہ تم احسان مانو۔

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تمہاری ہدایت کے لیے دی:

''اذ اٰتینا موسیٰ الکتٰب والفرقان'' اور یاد کیجیے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور فرقان دی فرقان فارق بین الحق والباطل چیز کو کہتے ہیں جس کا مصداق خود یہ کتاب بھی ہو سکتی ہے یہ عطف تفسیری ہے گویا کہ کتاب وہی فرقان ہے کیونکہ اس کتاب کے ذریعے سے حق و باطل میں فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن کریم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن کریم کے اندر فرقان کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے "تبارك الذي نزل الفرقان علي عبده" حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز، اور اس سے معجزات بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

"لعلکم تهتدون" تاکہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔

اے میری قوم! اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو:

"واذقال موسیٰ لقومه یا قوم" اور یاد کیجئے جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! تم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا بچھڑے کو معبود بنا کر، یہ وہی واقعہ ہے جس کی کچھ تفصیل میں نے آپ کے سامنے عرض کی تھی، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنے آپ پر ظلم کیا۔

"فتوبوا الیٰ بارئکم" اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، تم لوٹو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کا مفہوم آپ کی خدمت میں عرض کر دیا تھا حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں کہ اصل میں اس کا معنی ہوتا ہے لوٹنا، رجوع کرنا، بندہ معصیت کا ارتکاب کر کے اللہ تعالیٰ سے روگردانی کرتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے یہ اس کی توبہ ہے اللہ تعالیٰ بندے سے اس کی معصیت کی بناء پر اپنی شان کے مطابق اعراض کر لیتا ہے تو جب بندہ کے رجوع کرنے پر پھر اللہ تعالیٰ متوجہ ہوتا ہے تو یہ توبہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس لیے اس کو بھی تاب کہا جاتا ہے۔ "تاب علیه تواب" یہ لفظ اللہ کی صفتوں میں بھی آتا ہے اصل مفہوم اس کا رجوع والا ہے۔

"فاقتلوا انفسکم" توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کو قتل کر دو یہاں انفسکم کا مصداق اپنی ذات نہیں ہے اپنے لوگوں کو قتل کرو کیونکہ قاتل اور ہیں مقتول اور ہیں "قتل کرو تم اپنے لوگوں کو یہ بہتر ہے تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے نزدیک" بہتر اس طرح ہے کہ جب گناہ کی اس طرح سزا دے دی جائے اور گناہ گاروں کو یوں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تو قومی طور پر تنبیہ ہو جاتی ہے جس کی بناء پر آئندہ کوئی ایسی جرأت نہیں کرے گا، گناہ کی سزا کے اندر جو سختی ہوتی ہے یہ امن عالم کے لیے ضروری ہے گناہ گار کے اوپر رحم کرنا یہ امن عالم کو تباہ کرنا ہے کیونکہ جس وقت ایک آدمی جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور آپ لوگ اس کے اوپر ترس کھا کر اس کو چھوڑ دیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خود بھی آئندہ جرأت کرے گا اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی بھی ہمت بڑھے گی کہ کیا ہوتا ہے فلاں پکڑا گیا تھا یوں کر لیا چھوٹ گیا، سفارش سے چھوٹ گیا، رشوت سے چھوٹ گیا چھوڑنے سے اس کی جرأت بڑھے گی اس طرح اگر مجرم کی سرپرستی شروع کر دی جائے تو سارے کا سارا امن تباہ ہو جاتا ہے، امن عالم کے لیے ضروری ہے کہ مجرم کے اوپر سختی ہو اس سختی کے ساتھ جرم کو مٹایا جائے اور مجرم کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے تو آئندہ

دوسرے لوگ بھی جرأت نہیں کریں گے، یہی وجہ ہے کہ جس وقت قرآن کریم نے یہ قصاص کا حکم ذکر کیا تو کہا ''ولکم فی القصاص حیٰوۃ یااولی الالباب'' عقل والو! تمہارے لیے اس قانون قصاص میں زندگی ہے، یہ تمہاری زندگی کو بچانے والی چیز ہے، ایک قاتل کو مارو گے سارے انسان امن میں ہو جائیں گے اور اگر تم اس قانون قصاص کی خلاف ورزی کرو گے اور قاتل کو چھوڑ دو گے تو خود تمہاری اپنی جانوں کو امن نہیں رہے گا، جس طرح آپ آج دیکھ لیں کہ چوروں پر رحم ہے کہ چوروں کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے تو مالی طور پر امن تباہ ہے اور قاتلوں پر رحم ہے کہ قاتلوں کو برسر بازار اڑایا نہیں جاتا تو اس طرح جانی طور پر بھی امن تباہ ہو گیا۔

آج جو آپ کہتے ہیں کہ نہ جان محفوظ ہے نہ مال محفوظ ہے یہ مجرموں کے اوپر شفقت کا نتیجہ ہے اور اگر مجرموں کے اوپر شفقت نہ ہو بلکہ چور پر بھی سختی کی جائے اور قاتل پر بھی سختی کی جائے تو سارے لوگوں کی جان بھی محفوظ ہو جائے گی اور مال بھی محفوظ ہو جائے گا مال و جان کی حفاظت کے لیے مجرموں پر سختی ضروری ہے قصاص میں حیات ہونے کا یہی معنی ہے یہ آیت آگے آئے گی وہاں اس کی تفصیل آ جائے گی۔

قانون قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو، اور اسی طرح چور پر جس وقت سختی کریں گے تو مال محفوظ ہو گیا اور زانی جو ہے یہ دوسروں کی عزت کو نقصان پہنچاتا ہے، عصمت لوٹتا ہے اس کے اوپر بھی سختی کی گئی، آج یہ تین لفظ ہی بولے جاتے ہیں کہ نہ مال محفوظ، نہ جان محفوظ، نہ عزت محفوظ، اور تینوں قانون اگر نافذ کر دیے جائیں اور شریعت کے مطابق مجرموں کو سزا ہونی شروع ہو جائے تو تینوں چیزیں محفوظ ہو جائیں گی نہ کوئی کسی کی عزت کی طرف نظر اٹھائے گا اور نہ کسی کے مال کی طرف اور نہ کسی کی جان کی طرف۔

رجم کی سزا اس وقت قرآن کریم میں مذکور نہیں، روایات صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا پہلے قرآن کریم میں تھی لیکن اس کی تلاوت منسوخ ہے اور باجماع اُمت یہ سزا نافذ ہے، تلاوت اس کی منسوخ ہوئی لیکن قانون باقی ہے اور کوڑوں کی سزا قرآن کریم میں مذکور ہے اور کوڑوں کی سزا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم نے یہاں بھی یہی لفظ بولا ہے۔

'' لا تاخذ کم بھمارافۃ فی دین اللہ '' (النور) '' فی دین اللہ '' سے یہاں قانون مراد ہے کہ اللہ کے اس قانون کو نافذ کرنے میں تمہیں اس زانی اور زانیہ کے اوپر شفقت نہ آئے ان کے اوپر نرمی نہ دکھانا '' لا تاخذ کم بھما '' تمہیں پکڑ نہ لے ان دونوں کے متعلق '' فی دین اللہ '' اللہ کے قانون کے بارے میں، ان کے متعلق تمہارے دل میں کوئی رحم اور شفقت پیدا نہ ہو بلکہ امن عالم اور دوسری ساری مخلوقات کے اوپر شفقت کا تقاضہ ہے کہ ان مجرموں کو فنا کر دیا جائے اور ان کو سزا دیتے ہوئے مؤمنوں کے گروہ کو موجود ہونا چاہیے برملا

علی الاعلان سزا دوتا کہ دوسروں کو تنبیہ ہو تو اسی طرح یہ جو سختی ہے یہ تمہارے حق میں بہتر ہے جب اس طرح سے سختی کر کے مجرموں کو صفحہ ہستی سے مٹا دو گے تو آئندہ کے لیے تنبیہ ہو جائے گی کہ قوم پھر اس قسم کے گھناؤنے جرم کا ارتکاب نہیں کرے گی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس طرح ترغیب دی کہ قتل کرنا اپنے بندوں کو تمہارے لیے بہتر ہے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک۔

اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی:

''فتاب علیکم ''اس فاء سے پہلے یہ مضمون مقدر ہوگا پھر غیر مجرموں نے مجرموں کو قتل کیا اور ان مشرکوں کو یہ سزا دی گئی'' فتاب علیکم ''اور پھر اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی جب انہوں نے اس قسم کا واقعہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم سب پر رجوع کر لیا اور توبہ قبول کر لی'' ھو التواب الرحیم ''وہ تو توبہ کو قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے''تـواب ''چونکہ توبہ جب اللہ کی طرف منسوب ہے تو اس کا معنی ہے قبولیت توبہ، اور مجرم کی طرف رجحان کرنا، مجرم پر متوجہ ہو جانا، اس لیے'' تـواب ''کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے''توبہ کو قبول کرنے والا'' ورنہ لفظی معنی یہ ہوگا کہ وہ تو بہت رجوع کرنے والا ہے، بہت متوجہ ہونے والا ہے، بہت رحم کرنے والا ہے۔

آزادی کمالات کو جنم دیتی ہے اور غلامی؟

''واذقلتم یاموسیٰ لن نؤمن لك حتی نری الله جهرة''چونکہ یہ واقعات کی فہرست ہے کہ کوئی مسلسل مضمون نہیں یہ واقعہ اس وقت پیش آیا کہ قوم نے توبہ کر لی اور مرتدوں کو قتل کر دیا گیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ قوم کے سامنے پیش کی تو غلامی کی زندگی گزارنے کے ساتھ اسرائیلیوں کا مزاج بہت ہی گھٹیا قسم کا ہو گیا تھا یہ بھی ہمیشہ یاد رکھیے جتنا انسان آزادی کی فضاء میں سانس لیتا ہے اور ارد گرد اپنی عزت محسوس کرتا ہے تو اس کے اندر کمالات اجاگر ہوا کرتے ہیں، اچھی عادتیں اختیار کر لیا کرتا ہے اور جو شخص اپنے ارد گرد اپنی ذلت محسوس کرتا ہے کہ ہر کوئی اس کو دباتا ہے ہر کوئی اس کو ذلیل کرتا ہے جو دیکھتا ہے اسے اپنے بے کار میں پکڑ لیتا ہے۔

ایسی صورت میں ایک طبعی سی بات ہے کہ انسان میں رذائل پرورش پاتے ہیں کمالات اور فضائل مردہ ہو جاتے ہیں۔

جہاں حوصلہ افزائی کا ماحول ہو انسان کو تعریف کر کر کے چلایا جائے، اور آزادی کے ماحول میں وہ سانس لے، ایسے وقت میں جب اس کو معاشی طور پر بھی پستی نہیں ہے اور اپنے ارد گرد وہ عزت بھی محسوس کرتا ہے تو ہمیشہ انسان کے اندر کمالات اجاگر ہوتے ہیں، اور جہاں معاشی تنگی ہو، معاشی طور پر بھی انسان دوسرے کا دست نگر ہو

اور ٹکڑے ٹکڑے کے لیے دوسرے کے سامنے ذلیل ہوتا پھر رہا ہو اور اسی طرح اس کی حیثیت معاشرے میں ایسی ہے کہ ہر کوئی اسے نوکر اور غلام سمجھتا ہے، جو چاہتا ہے اس کو بے کار میں پکڑ لیتا ہے جو چاہتا ہے گالی دے کر بلاتا ہے، ایسے وقت میں ان کے جتنے کمالات ہوتے ہیں وہ مخفی ہو جاتے ہیں، اور رذائل ابھر آیا کرتے ہیں۔

آپ کے سامنے معاشرے میں اس قسم کی مثالیں ہیں جس وقت چاہیں دیکھ سکتے ہیں، جو بچے اچھے ماحول میں نشو ونما پاتے ہیں ان کا دل و دماغ اور قسم کا ہوتا ہے اور جن کی محلے کے اندر حیثیت یہ ہوتی ہے کہ ہر کوئی ان پر رعب ڈالتا ہے، اور معاشی طور پر وہ بہت پست ہوتے ہیں، جو کوئی چاہے ان کو بے کار میں بلا لیتا ہے جس طرح سے چاہتے ہیں لوگ ان کو کھینچے پھرتے ہیں باوجود اس بات کے کہ یہ غلام نہیں ہیں اس کے باوجود بھی ان کی طبیعتیں بڑی پست پست سی اور ذرا ذرا سی چیز کے پیچھے لڑ پڑنا، پیسے پیسے کے پیچھے جھگڑا ڈالنا اس قسم کا مزاج ان کا بن جایا کرتا ہے۔

یہ تو غلامی کی زندگی گزار کر آئے تھے اور غلامی کی زندگی کے اندر انسان میں اسی قسم کے رذائل نشو ونما پاتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر اڑ جانا، معمولی معمولی چیز کے اندر تنگی دکھانا۔

بنی اسرائیل کی ضد اور اللہ کی پکڑ:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جس وقت کتاب ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے اپنی فطرت کے مطابق اس میں بھی بات بنالی، کہنے لگے کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آئی ہے ہمیں کیا یقین ہے کہ آپ یہ صحیح کہہ رہے ہیں، یہ اپنے نبی کے ساتھ ان کی گفتگو ہے ہمیں کس طرح سے یقین آئے ہم تو تب مانیں گے کہ اللہ تعالیٰ کہہ دیں کہ واقعی یہ میری کتاب ہے اس کی اطاعت کرو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ سے اجازت لی اور ان کے ستر نمائندے لے کر کوہ طور پر پہنچ گئے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کہہ دیں گے کہ یہ کتاب میری ہے اور اس کی اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کو کہلوانے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر آدمی لے کر کوہ طور پر چلے گئے،

کہتے ہیں کہ غیب سے آواز آگئی اور انہیں کہا گیا کہ یہ میری اتاری ہوئی کتاب ہے اور تمہیں اس کی اطاعت کرنی چاہیے لیکن وہاں جا کر انہوں نے کہا کہ یہ آواز تو آ رہی ہے نظر تو کوئی نہیں آ رہا، اب ہمیں کیا معلوم کون بول رہا ہے جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں اس وقت تک یقین نہیں کریں گے، اب آپ جانتے ہیں کہ نافرمانی کسی کی ہو تو ایک حد تک ہوتی ہے اور جب انسان آگے گستاخ در گستاخ ہوتا چلا جائے تو آگے سے

کڑکی اور جس کے ساتھ یہ حقیقتاً مر گئے یا بے ہوش ہو گئے دونوں قول ہیں تفسیروں میں ان کے حواس خطاء ہو گئے یا مر گئے کیونکہ موت کا لفظ بے ہوشی کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور نیند کے لیے بھی موت کا لفظ بولتے ہیں جس طرح ہمارے لیے وہ دعا تلقین کی گئی ہے حدیث شریف میں '' الحمد لله الذی احیانا بعد ماامانتنا والیه النشور'' سو کر اٹھنے کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے، شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی دے دی، موت سے وہاں نیند مراد ہے کیونکہ ''النوم اخ الموت'' سویا ہوا مرا ہوا ایک برابر آپ بھی کہا کرتے ہیں تو نیند موت کے برابر ہے اور نیند سے بیدار ہونا یہ جی اٹھنے کی طرح ہے تو اس لیے یہاں تفسیروں میں دونوں قول موجود ہیں یا تو یہ بالکل بے ہوش ہو گئے یا ہوش وحواس ان کے ختم ہو گئے لیکن تھے زندہ، بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ ہوش وحواس دیئے، یہ بات موت کے بعد اٹھانے کے مشابہ ہوئی یا حقیقتاً یہ مر گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اللہ کا احسان:

جس وقت یہ حال موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے پھر گریہ وزاری کرنے لگ گئے کہ یا اللہ! گستاخی انہوں نے کی اور سزا ان کو مل گئی لیکن اس سزا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ تو میرے بھی مخالف ہو جائیں گے کہ ہمارے سرداروں کو لے کر گیا پتہ نہیں کہاں مار آیا، کیا حال گزرا اور یہ قوم جو بگڑ جائے گی تو میرے قابو میں بھی نہیں آئے گی جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ہلاکت میری ہلاکت پر منتج ہوگی، اس لیے تو ان پر رحم کر، ان کی غلطی معاف کر دے اور تو انہیں دوبارہ صحیح کر دے، ان کو زندگی دے دے تاکہ ان کے ہوش وحواس صحیح ہو جائیں جب موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ان کو دوبارہ زندگی حاصل ہوئی یہ واقعہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، دیکھنے کے بعد جس وقت یہ قوم کے پاس آئے۔

اب شرافت تو یہ تھی کہ کہہ دیتے کہ ہم جس چیز کی تحقیق کے لیے گئے تھے وہ ہم دیکھ آئے واقعہ صحیح ہے، یہ اللہ کا بنایا ہوا قانون ہے، اللہ کی دی ہوئی کتاب ہے، ہمیں اس کے ساتھ فرمانبرداری کا تعلق رکھنا چاہیے، اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہیئے لیکن یہاں آکر پھر پھیر لگا دیا اپنی فطرت کے مطابق اور آکر کہنے لگے کہ ہے تو یہ اللہ کی کتاب، اتاری تو اللہ نے ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس میں جو مشکل بات معلوم ہو بے شک اس پر عمل نہ کرنا یہ ذکر آگے آ رہا ہے واقعات کے سلسلے میں کہ کس طرح سے انہوں نے اللہ کی کلام کو بدلا اور بگاڑا کہ آکر ساتھ اس قسم کی بات کہہ دی جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوہ طور کا اٹھانا

اور پھر کتاب کے اوپر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کا معاہدہ کیا آگے آیات کے اندر آئے گا وہاں اس واقعے کو ذکر کیا جائے گا۔

اس طرح یہ واقعات کا سلسلہ ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ جتایا جا رہا ہے کہ تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہرگز ایمان نہیں لائیں گے ہم تجھ پر، تیری بات کا یقین نہیں کریں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔

''نریٰ اللہ جھرۃً'' جھرۃً یہ اعیاناً کے معنی میں ہے رؤیۃً ذات جھرۃً ایسی رؤیت جو کہ بالکل معائنے والی ہو کہ آمنے سامنے کھلم کھلا، جب تک نہ دیکھ لیں ہم نہیں مانیں گے۔

''فاخذتکم الصّٰعقۃ'' پھر تمہیں بجلی نے پکڑ لیا۔

''وانتم تنظرون'' اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے دیکھتے دیکھتے تمہارے اوپر بجلی گری۔

''ثم بعثنٰکم'' پھر ہم نے تمہیں اٹھا دیا ''من بعد موتکم'' تمہاری موت کے بعد اس موت کے مصداق میں آپ کے سامنے دو قول نقل کیے ہیں کہ یا تو وہ حقیقتاً مر گئے تھے یا ان کے اوپر موت جیسی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور ''بعث'' یہ بھی دونوں پر بولا جاتا ہے حقیقتاً مرنے کے بعد زندہ کیا جائے وہ بھی بعث کا مصداق ہے سونے کے بعد اٹھتے ہیں تو وہ بھی بعث کا مصداق ہیں بے ہوشی، غشی کی کیفیت کے بعد جب ہوش سنبھالا جائے تو اس کو بھی بعث سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ تم احسان مانو۔

بنی اسرائیل وادی تیہ میں:

آگے جو واقعہ ذکر کیا ہے اس کا تعلق وادی تیہ کے ساتھ ہے کہ جب انہیں حکم دیا گیا تھا جہاد کرنے کا اس کی تفصیل سورۃ المائدۃ میں آئے گی شام کے علاقے پر جہاد کرنے کا حکم دیا گیا کہ وہ علاقہ تمہارا ہے چلو تم جہاد کرو اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی اور علاقہ فتح ہو جائے گا لیکن جب ان کو پتہ چلا کہ وہاں بڑی جفاکش اور بہت بہادر قسم کے لوگ عمالقہ قوم آباد ہے تو یہ اکڑ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا۔

''اذھب انت وربك فقاتلا'' سورۃ المائدۃ میں تفصیل آئے گی ''یاموسیٰ ان فیھا قوماً جبارین'' وہاں بہت سخت قسم کے لوگ موجود ہیں ہم وہاں نہیں جا سکتے ہم تو یہیں بیٹھے ہیں، تو جا اور تیرا رب جائے اور جا کر علاقہ خالی کروا لو اس کے بعد ہم آجائیں گے جس وقت وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو جائیں گے یہ آیات سورۃ المائدۃ میں آئیں گی تو جس وقت انہوں نے جہاد کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ

نے وہ علاقہ چالیس سال تک ان کے اوپر حرام ٹھہرا دیا تھا کہ اب یہ اس علاقے کو فتح نہیں کر سکتے اور پھر یہ حیران وپریشان پھرتے رہے۔

اس جگہ میں جس کو آپ آج صحراء سینا کہتے ہیں یہ نہر سویز سے گزر کر علاقہ جو اسرائیل کے ساتھ آج کل لگتا ہے اس کے اوپر پہلے اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا اور اب انوار السادات نے واپس لے لیا ہے یہ ریتلا علاقہ ہے انتہائی مہلک قسم کا جسے صحراء سینا کہتے ہیں یہی علاقہ ہے جس کے اندر اسرائیلی چالیس سال تک محصور رہے اور یہاں پریشان پھرتے رہے ایک قسم کا یہ تربیتی کیمپ لگ گیا ان کے لیے، حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں موجود تھے تا کہ ان کی اصلاح کریں کہ بڑے بڑے پاپی مر جائیں نئی نسل پیدا ہوگی تو پھر ان کو آگے چلایا جائے گا لیکن ہارون علیہ السلام کا انتقال بھی وہیں وادی تیہ میں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال بھی وہیں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ بنے یوشع بن نون علیہ السلام اور پرانے پرانے اسرائیلی جتنے تھے سب فوت ہو گئے پھر حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں جہاد ہوا تو بیت المقدس فتح ہوا۔

چالیس سال تک یہ اسی علاقے کے اندر محصور رہے، وہاں نہ کوئی درخت تھا جس کے سائے میں بیٹھیں اور نہ وہاں کوئی کھانے پینے کا انتظام تھا تو باوجود اس بات کے کہ سزا کے طور پر اس علاقے میں محصور کیا گیا تھا لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے کتنے ناز اٹھائے ہیں سزا کے طور پر وہاں رکھا ہے لیکن پھر دھوپ کی تکلیف ہوئی تو اللہ نے پتلے پتلے بادل بھیج دیئے جو ان کے اوپر سایہ رکھیں تا کہ دھوپ کی تکلیف نہ ہو، کھانے کی دقت پیش آئی تو من وسلویٰ اتار دیا لو کھاؤ اور مزے اڑاؤ، پانی مانگا تو ''اذاستسقیٰ موسی لقومہٖ فقلنا اضرب بعصاك الحجر'' موسیٰ سے کہا کہ پتھر پر اپنی لاٹھی مارو ''فانفجرت منہ اثنتاعشرۃ عینا'' بارہ چشمے اس میں سے پھوٹ پڑے اور اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ کھاؤ پیو، زمین کے اندر فساد نہ مچاؤ، مطلب یہ تھا کہ اسی غذا کے اوپر کفایت کرتے ہوئے تمہیں چاہیئے کہ تم اپنی روحانی تربیت حاصل کرو۔

فرعونیوں کی صحبت میں آ کر تم سے جو کوتاہی ہوگئی تھی اس کی تلافی ہو جانی چاہیئے لیکن وہاں جو انہوں نے گڑبڑ کی اس کی یاددہانی کروائی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسے کیسے احسانات تھے اور ان کی طرف سے کس قسم کی آگے سے حرکتیں ہوتیں۔

واعظوں کی قصہ گوئی:

''وظللنا علیکم الغمام'' یہ وادی تیہ کا واقعہ ہے ''ہم نے سایہ فگن کر دیا تمہارے اوپر بادل کو'' ہم نے سائبان بنا دیا تمہارے اوپر بادل کو ''وانزلنا علیکم المن والسلویٰ'' اور ہم نے تمہارے اوپر من وسلویٰ اتارا۔

سلویٰ یہ بٹیر جیسا ایک پرندہ ہے عام طور پر مترجمین نے اس کو بٹیر کے ساتھ تعبیر کیا ہے یا کوئی بٹیر جیسا پرندہ ہے یہ کثرت کے ساتھ آجاتے تھے باوجود اس بات کے کہ پرندے انسان سے بدکتے ہیں لیکن یہ بدکتے نہیں تھے زندہ پاس آجاتے تھے جتنی ضرورت ہو ان کو پکڑو اور پکڑ کر کھالو، یہ جو کہا کرتے ہیں کہ پکے پکائے اترا کرتے تھے یہ واعظوں کا اضافہ ہے واعظ ایک مستقل قوم ہے جو بات کو بگاڑنے میں، نئے سرے سے بنانے میں، اور ادھر ادھر کی مارنے میں خوب مہارت رکھتے ہیں، ایک ہی واقعے کو جب ذکر کریں گے ایسے ہی کوئی کدھر کی لگادیں گے، کوئی کدھر کی لگادیں گے، اس لیے محدثین کی اصطلاح ہے جہاں روایت کے اندر کوئی غلط بات داخل ہو جائے ان کو کہتے ہیں یہ واعظ لوگوں کی گھڑی ہوئی بات ہے محدثین بھی اسی طرح کہا کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ گوئی لوگوں کی پرانی عادت ہے کہ جب وہ بات بنانے لگتے ہیں تو اس کو مزین کرنے کے لیے، لوگوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے ہی رہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس طرح یہ وعظ کیا کرتے ہیں یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے جب جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کر رہے تھے تو یہ پاس کھڑے سن رہے تھے اللہ نے کہا اور جبرائیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا، جبرائیل علیہ السلام نے یوں کہا، آپ نے یوں کہا، اس قسم کے مکالمے جن کا روایت کے اندر کہیں کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور یہ یوں گھڑ لیتے ہیں جس طرح جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو یہ پاس کھڑے تھے، نقشے کچھ اس قسم کے کھینچتے ہیں، یہ بات کی تزئین ہے کہ بات کو بنانے کے لیے وہ یہ انداز اختیار کرتے ہیں جو شرعاً جائز نہیں ہے اور اس میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ بھی ''کذب علی النبی یا کذب علی اللہ، افتراء علی اللہ'' میں داخل نہ ہو جائے جو بات اللہ نے نہیں کی ہم وہ بات بنا کر اللہ کی طرف منسوب کریں، اور جو بات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی ہم وہ بات بنا کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کریں، یہ بہت بڑی بات ہے اس لیے یہ انداز غلط ہے یہ انداز صحیح نہیں ہے پرانے بزرگوں کا یہ طریقہ قطعاً نہیں تھا یہ پنجابی واعظوں کی عادت ہے اور پرانے زمانے میں اگر کسی سے کوئی ایسا لفظ ثابت ہو جاتا تھا تو اس کو معاشرے میں بے وقعت کر دیا جاتا تھا، لوگ اس کی باتوں کا اعتبار نہیں کرتے تھے، اس لیے تو مذمت کے عنوان سے ذکر کیا ہوا ہے کہ جہاں روایت کے اندر کوئی لفظ اس قسم کا آجائے کہتے ہیں ''ھذا مختلف القصاص'' یہ تو واعظوں کی، قصہ گو لوگوں کی گھڑی ہوئی بات ہے اس انداز کے ساتھ ذکر کرتے تھے کہ جس کا مطلب یہ ہوا کہ قصاص کی حیثیت معاشرے میں کچھ نہیں تھی جہاں قصہ گو کی طرف بات منسوب ہوئی

تو اس کا مطلب ہے یہ کہانی ہے جس کا واقعہ کچھ نہیں، پکے پکائے کا ذکر کہیں نہیں ہے یوں تھا کہ وہ اتنی کثرت کے ساتھ آجاتے تھے کہ ان کو پکڑنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی تھی اور رات کو "مـــن" یہ اوس (شبنم) کی طرح برستا جس طرح گھاس کے اوپر شبنم کے قطرے ہوتے ہیں اور منجمد ہو جاتا تھا وہ میٹھی چیز تھی جس کو اکٹھا کر کے وہ استعمال کرتے تھے تو زندگی گزارنے کے لیے یہ غذا ان کے لیے کافی تھی، پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اگلے رکوع میں ذکر آئے گا کہ بارہ چشمے جاری کر دیے گئے ایک ہی پتھر سے، پانی کی ضرورت اس طرح پوری کر دی گئی۔

من وسلویٰ کے اترنے کا ذکر:

" وانزلنا علیکم المن والسلویٰ" اس کو انزلنا کے ساتھ جو تعبیر کیا کہ ہم نے اتارا کیونکہ جو بغیر اسباب کے اس قسم کی ظاہری نعمتیں حاصل ہوتی تھیں وہ یوں ہی ہیں جیسے کہ آسمان سے اتاریں، ان کی ظاہری کوشش کے بغیر، ظاہری اسباب کے بغیر یہ نعمتیں حاصل ہو رہی تھیں اس لیے ان کی نسبت براہ راست اللہ کی طرف ہے قرآن کریم میں حیوانات کے لیے بھی انزلنا کا لفظ آیا ہے" انزلنا ثمانیۃ ازاوج" ہم نے حیوانات کی آٹھ قسمیں پیدا کیں بکری اور بکرا، بھیڑ اور بھیڑا، اور اس طرح گائے اور اونٹ جن کا ذکر کرتے ہوئے" انزلنا" کا لفظ ہے، زمین کے اندر لوہا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا زمین سے لوہا نکلتا ہے" وانزلنا الحدید" یہاں لوہے کے ساتھ بھی انزلنا کا لفظ استعمال کیا کہ لوہا ہم نے اتارا۔

انسان کی کوشش کے بغیر جو چیز پیدا ہوتی ہے براہ راست اللہ کی تخلیق سے تو اس کو انزلنا کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، اور ہم نے کہا کہ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔

" وماظلمونا" انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا یعنی پھر وہی کجیاں اختیار کر کے، کمیاں اختیار کر کے، گڑبڑ کر کے جو یہ رزق بند کروالیا اس میں ہمارا انہوں نے کیا نقصان کیا؟

" ولکن کانوا انفسھم یظلمون " اپنے ہی نفسوں پر ظلم کرنے والے تھے، اپنے ان کرتوتوں کے ساتھ نقصان اپنا ہی کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے قولی اور عملی طور پر حکم ربانی کی مخالفت کی:

اگلے رکوع میں آئے گا جب انہوں نے کہا تھا کہ ہم اس کھانے پر صبر نہیں کر سکتے ہمیں تو پیاز چاہیے، لہسن چاہیے، تر چاہیے، گندم ہو اس قسم کی چیزیں ملیں مسور کی دال ہو، جس سے آج کل آپ تنگ آجاتے ہیں یہ نعمت اسرائیلیوں کی مانگی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کسی شہر میں جا کر آباد ہو جاؤ وہاں تمہیں یہ ساری کی ساری چیزیں مل جائیں گی۔

جہاں ان کو ٹھہرایا ہوا تھا وہاں تو چونکہ اس قسم کی پیداوار نہیں تھی اور جہاں آبادی تھی وہاں یہ پیداوار تھی، وادی تیہ مصر کا علاقہ ہے یہاں ان کو سزا کے طور پر گویا کہ محصور کر دیا گیا تھا وہاں اس قسم کی آبادی نہیں تھی اور پھر یہ حکم دیا کہ جس وقت جاؤ متواضعانہ طور پر جانا، عبادت خانہ کے اندر سر کو جھکاتے ہوئے جانا اور حطۃ کہتے ہوئے جانا حطۃ یہ لفظ ایسے ہے جیسے ہمارے ہاں توبہ توبہ کہتے ہوئے جائے کہ یا اللہ! میری توبہ، میری توبہ میرے گناہ معاف کر دے تو حطۃ کا مطلب یہ تھا "مسئلتنا حطۃ" ہمارا سوال یہی ہے کہ ہمارے گناہ جھاڑ دیئے جائیں، ہم سے جو قصور اور خطائیں اور غلطیاں ہوگئیں وہ معاف کر دی جائیں، اس طرح زبان سے توبہ توبہ کہتے ہوئے، سر جھکاتے ہوئے، اور تواضع کے ساتھ دروازے کے اندر داخل ہونا لیکن یہاں پھر انہوں نے شرارت کی، مزاج جس وقت بگڑا ہوا ہوتا ہے تو قدم قدم پر ہی گڑبڑ ہوتی ہے کہ نفع کی بات کہی جائے، سمجھانے کے لیے کہی جائے لیکن شرارت کے طور پر کوئی نہ کوئی الٹا کام کرنا ہے کہتے ہیں کہ وہ اس طرح سے اکڑ کر چلے، سینے نکال کر، اور چوتڑ باہر کو نکال کر، جس وقت انسان بتکلف اکڑتا ہے آپ جس وقت چاہیں تجربہ کر کے دیکھ لیں جس وقت یوں کر کے چلتا ہے جس وقت سینے کو یوں (آگے) کرے گا تو چوتڑ پیچھے کو ہو جاتے ہیں اور پھر اکڑ کر انسان چلتا ہے تو چوتڑں کو ہلاتا ہوا چلتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ چوتڑوں کے بل چل رہا ہے۔

تفسیر کے اندر یہ لفظ آتا ہے کہ چوتڑوں کے بل وہ چلتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے تو اس کا یہ معنی نہیں کہ وہ زمین پر رگڑتے ہوئے داخل ہوئے، عام طور پر جس طرح سمجھا جاتا ہے یہ بات نہیں ہے اس طرح داخل ہونا یہ متکبرین کی حالت نہیں ہے بلکہ یہ تو بہت ذلیل حرکت ہے قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ متکبر تھے اور بات کو بگاڑتے تھے تو چوتڑوں کے بل چلنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بچوں کی طرح زمین پر گھیسی کرتے ہوئے جا رہے تھے، چوتڑ رگڑتے ہوئے، اور سر پیچھے کو ہٹا کر چوتڑوں کے بل چلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان متکبرانہ طور پر یوں (آگے) سینہ کھولتا ہے تو یہ سینہ آگے کو بڑھے گا اور چوتڑ پیچھے کو جائیں گے اور پھر جب انسان یوں اکڑ کر چلتا ہے تو اس کے چوتڑوں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ عام حالت کے مطابق نہیں ہوتی تو یہ چلنا بھی چوتڑوں کے بل چلنا ہے اس کو بھی محاورے میں چوتڑوں کے بل چلنا کہتے ہیں یعنی ایک تو وہ اکڑے اور چوتڑ ہلاتے ہوئے گئے۔

دوسرا انہوں نے حطۃ کو بگاڑ کر حنطۃ بنا دیا یا کوئی اور لفظ بنا دیا جس سے مہمل سی بات بن گئی اکڑے بھی جا رہے ہیں، اور حنطۃ حنطۃ کرتے جا رہے ہیں جس سے ایک مذاق بن گیا۔

اب حطۃ جو تھا کہ ہمارے گناہ گرا دیے جائیں اس کو بگاڑ کر حنطۃ بنا دیا اور حنطۃ کہتے ہیں گندم کو اب یہ گندم گندم کرتے ہوئے جائیں تو اس میں کیا ہوتا ہے یعنی لفظی طور پر بھی مذاق اڑایا اور اکڑ کر جو داخل ہوئے تو عملی طور پر بھی مخالفت کی۔

بنی اسرائیل پر عذاب الٰہی کا نزول:

جب یہاں تک نوبت آئی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا، آسمان کی طرف نسبت اس لیے کی کہ یہ وباء براہ راست اللہ کی طرف سے آئی ہے، ایک ہے دشمنوں سے پٹائی کروادی اور وہ آپس میں لڑ پڑے جس سے نقصان ہوگیا یہ بھی ایک عذاب کی صورت ہے لیکن آسمان سے عذاب اترنے کا مطلب یہ ہے کہ من جانب اللہ ان کے اوپر وباء آئی۔

کہتے ہیں کہ طاعون کے اندر مبتلاء ہوئے اور پھر بہت کثرت کے ساتھ یہ لوگ مرے، اس تکبر اور اس بدزبانی کا نتیجہ ان کے سامنے پھر یہ آیا، تو یہ احسانات اللہ تعالیٰ یہاں ذکر کرتے ہیں ساتھ ساتھ ان کی کجیاں ذکر کر کے جو انہوں نے ماریں کھائیں ہیں وقتاً فوقتاً ان کو یہ بھی یاد دلایا جارہا ہے کہ اب آئندہ کے لیے بھی سنبھل جاؤ اگر یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی مخالفت اسی طرح کرتے رہے اور ہدایت کو نہ مانا جیسے وقتاً فوقتاً تمہارے بڑے پٹے تھے اسی طرح تمہارے پٹنے کا وقت بھی آگیا ہے، ان واقعات کے ضمن میں ان کو یہ نصیحت کرنی مقصود ہے۔
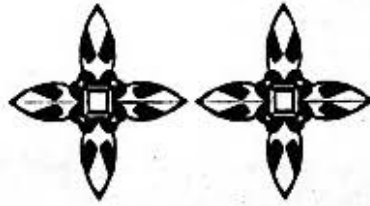
وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ط

جب طلب کیا موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر کو مار (تو انہوں نے لاٹھی ماری)

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ط قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ط

پھر پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے، تحقیق جان لیا ہر انسان نے اپنے گھاٹ کو

كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۶۰﴾

(پھر ہم نے کہا) کہ کھاؤ اور پیو اللہ کا رزق اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو ﴿۶۰﴾

وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ

اور قابل ذکر ہے وہ وقت جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے تو دعا کر ہمارے لیے اپنے رب سے

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا

کہ نکالے ہمارے لیے ان چیزوں میں سے جن کو زمین اگاتی ہے یعنی اس کی سبزی اور کھیرا اور گیہوں

وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ط قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ

اور مسور اور پیاز، موسیٰ نے کہا کیا تم بدلنا چاہتے ہو اس چیز کو جو گھٹیا ہے اس چیز کے بدلے

هُوَ خَيْرٌ ط اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ط وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

جو کہ بہتر ہے، اتر جاؤ تم کسی شہر میں تو بے شک تمہارے لیے وہ چیز ہوگی جو تم نے مانگی اور ماردی گئی ان کے اوپر

الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ق وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا

ذلت اور مسکنت، مستحق ہوئے وہ اللہ کے غضب کے یہ اس سبب سے ہوا کہ وہ

يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط ذٰلِكَ

انکار کیا کرتے تھے اللہ کی آیات کا اور قتل کرتے تھے نبیوں کو ناحق، اور یہ اس لیے کہ

بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھتے تھے ﴿۶۱﴾

لغوی وصرفی تحقیق:

''واذاستسقٰی موسیٰ لقومه'' استسقٰی، سَقٰی یَسْقِی سیراب کرنا، یہ لفظ قرآن میں حرث کے قصے میں آئے گا ''ولاتسقی الحرث سَقٰی یَسْقِی ''سیراب کرنا، استسقٰی باب استفعال سیرابی کا مطالبہ کرنا اس لیے پانی طلب کرنے کے معنی میں، بارش طلب کرنے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

فقہ کی کتابوں میں آپ صلوٰۃ استسقاء پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے بارش نہیں ہو رہی اور آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بارش دے دی جائے تو بارش کی طلب یہ بھی استسقٰی ہے کیونکہ اس میں بھی سیرابی کا مطالبہ ہوتا ہے، جب طلب کیا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی، استسقٰی کا معنی پانی طلب کرنا ''فقلنا'' پھر ہم نے کہا کہ'' اضرب بعصاك الحجر '' مار تو اپنی لاٹھی پتھر پر، اپنی لاٹھی کے ساتھ پتھر کو مار ''الحجر '' اس کے اوپر الف لام عہد کا ہے، اس علاقے میں کوئی ممتاز پتھر کو جا کر اپنی لاٹھی مارو۔

''فانفجرت منه اثنتاعشرۃ'' فاء سے پہلے کچھ کلام محذوف ہے۔

''فضرب فانفجرت منه اثنتاعشرۃ عیناً'' تو موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی ماری پھر پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے ''انفجار'' پھوٹ پڑنا، پھوٹ پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے۔

''قد علم کل اناس مشربھم'' اناس انسان کے معنی میں جیسا کہ عرض کیا تھا کہ اس کے اوپر الف لام داخل ہو جائے الاناس تو اس کو الناس پڑھتے ہیں تو الف لام کے داخل ہونے کے ساتھ الاناس نہیں پڑھا جائے گا بلکہ الناس پڑھا جائے گا۔

الناس اصل میں الاناس ہی تھا، جان لیا ہر انسان نے اپنے گھاٹ کو، مشرب پانی پینے کی جگہ، ہر انسان سے مراد یہ ہے کہ ان اسرائیلیوں کے جو بارہ قبیلے تھے ان بارہ میں سے ہر قبیلے کے لیے ایک چشمہ متعین ہو گیا پھر پانی لینا ہوتا تو وہیں سے لیتے، علیحدہ علیحدہ ان کی گھاٹ متعین کر دی گئی تا کہ پانی کے پینے میں، پانی کے استعمال کرنے میں آپس میں جھگڑنے کی نوبت نہ آئے، انتظامی امور میں ان بارہ قبیلوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا جاتا تھا۔

'' کلواواشربوا، قلنا کلواواشربوا'' پھر ہم نے کہا کہ کھاؤ اور پیو'' من رزق الله '' اللہ کا رزق۔

'' ولاتعثوافی الارض مفسدین '' اور زمین کے اندر فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو ''لاتعثوا '' عثا یَعْثُوا فساد کرنے کے معنی میں ہوتا ہے اس لیے'' مفسدین لاتعثوا '' کی ضمیر سے حال مؤکدہ ہے جو معنی پہلے موجود ہے'' مفسدین '' نے آ کر اسی کی تفصیل کی ہے کہ زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو۔

''واذ قلتم یاموسیٰ''اور قابل ذکر ہے وہ وقت جب تم نے کہا اے موسیٰ!''لن نصبر علی طعام واحد'' لن مضارع مستقبل کی نفی کے استغراق کے لیے ہوتا ہے اس میں تاکید والا معنی ہوتا ہے جیسے''لن یضرب''وہ ہرگز نہیں مارے گا یہ ہرگز کا لفظ آپ بطور تاکید کے استعمال کیا کرتے ہیں۔

''لن نصبر'' ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے، یعنی مستقبل کی نفی کا استغراق ہے ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ''علی طعام واحد''ایک کھانے پر ایک کھانے سے مراد ہے ایک قسم کا کھانا کہ ہر روز ہمیں ایک ہی قسم کا کھانا ملے ہم صبر نہیں کریں گے ہم اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے، ہر روز ایک ہی طرح کا کھانا آئے ہم اس کو برداشت نہیں کریں گے۔

''لن نصبر علی طعام واحدٍ'' یہاں واحد سے وحدت نوع مراد ہے کہ ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے۔

''فادع لنا ربك ''ان کا طرز کلام ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ گستاخانہ ہی رہا ہے ایک تو سامنے درخواست کرنے کی بجائے فیصلہ سنا دیا، ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ ہماری یہ عرض ہے کہ اس بات میں کچھ ترمیم کردی جائے نیازمندی کے ساتھ ذکر کریں اس میں کوئی حرج نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی جناب میں بندے اپنی نیازمندی کے ساتھ کوئی عرض کردیں ضرورت پیش کردیں، یہ عرض نہیں کرتے یہ فیصلہ سناتے کہ ہم یوں کریں گے، ہم یوں نہیں کریں گے، یہ ایک فیصلہ سنانے والی بات ہے، اور پھر آگے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کرنے کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمے لگایا کہ تو دعا کر اور کس کے سامنے؟ تو فادع لنا ربنا نہیں کہا فادع لنا ربك کہا جیسے ان کا کوئی تعلق ہی نہیں، تو دعا کر اپنے رب سے ہمارے لیے، یخرج لنا کہ نکالے وہ ہمارے لیے، پیدا کرے وہ ہمارے لیے۔

''مما تنبت الارض ''ان چیزوں میں سے جن کو زمین اگاتی ہے یعنی زمین کی نباتات میں سے، نکالے ہمارے لیے زمین کی نباتات میں سے، اس چیز میں سے جس کو زمین اگاتی ہے۔

''من بقلها ''مما تنبت الارض میں جو ما ہے اس کا بیان آگے مِنْ کے ساتھ کیا جا رہا ہے'' بقل'' کہتے ہیں ہر قسم کی سبزی کو اس لیے سبزی فروش عربی میں بقال کہلاتا ہے، ہر قسم کی سبزی میں شلغم بھی آگئے، ٹماٹر بھی آگئے، بینگن بھی آگئے یا عام طور پر جو آپ سبزی کے طور پر کھایا کرتے ہیں آلو، اروی، گوبھی، کدو، ٹینڈے یہ ساری کی ساری چیزیں بقل کے اندر آگئیں۔

''وقثائها'' پھران سبز چیزوں میں سے خاص خاص چیزوں سے ان کو خصوصی رغبت تھی ان کو پھر علیحدہ کر کے بھی ذکر کر دیا'' قثاء '' کہتے ہیں ککڑی اور کھیرے کو ککڑی جس کو ہم تر کہتے ہیں یہ قثاء کا لفظ ککڑی اور کھیرا دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، کھیرا یہ موٹا سا ہوتا ہے اگرچہ اندر سے اس کی بناوٹ تر جیسی ہوتی ہے، بیج اور گودا وغیرہ تر جیسا ہی ہوتا ہے وہ چھوٹا سا اور موٹا سا ہوتا ہے اور تر لمبی لمبی ہوتی ہے۔

''وفومها'' فوم کا ترجمہ یہاں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے گیہوں کے ساتھ کیا ہے اور بیان القرآن میں بھی اس کا ترجمہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے گیہوں کے ساتھ کیا ہے فوم گیہوں کو کہتے ہیں لیکن دوسرے مفسرین اس فوم کو ثوم قرار دیتے ہیں کہ فاء اور ثاء دونوں عربی کے اندر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں جیسے حافظ صاحب نے کل ہی پڑھا حدیث شریف میں یتحنث کا لفظ ہے اس روایت میں بعض نے یتحنف پڑھا ہے تو یتحنف اور یتحنث دونوں کا مصداق ایک ہے کہ وہ دین حنیف کو اختیار کرتے تھے یتحنث اصل میں یتحنف تھا تو فاء کو ثاء سے بدل دیا، یعنی دین حنیف کو اختیار کرتے تھے، تو فاء اور ثاء آپس میں بدلتے رہتے ہیں۔

فوم اصل کے اعتبار سے ثوم ہے اور فوم عربی میں کہتے ہیں لہسن کو اور اسی ثوم کو سرائیکیوں نے بگاڑ کر تھوم بنالیا یہ تھوم جو کہتے ہیں لہسن کو یہ لفظ ثوم کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جیسے بصل کو وصل کہنے لگ گئے تو ان دونوں کا ماخذ یہ عربی لفظ ہی ہے تو ثوم سے لہسن مراد لے لیں کہ زمین کی ککڑیاں اور زمین کا لہسن ھا ضمیر ارض کی طرف لوٹ گئی۔

''وعدسها'' عدس کہتے ہیں مسور کو یہ مسری کی دال جو آپ کھایا کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے ان کی بہت ہی مرغوب فیہ چیز تھی تو ان کو مسری چاہیے۔

''وبصلها'' اور اس کا پیاز، بصل یہ پیاز آ گیا، اسی کو تھوڑا سا بدل کر لوگ وصل کہتے ہیں، اصل لفظ بصل ہے۔

ان چیزوں کا ذکر خصوصیت سے کر دیا، زمین کی سبزیاں اور زمین کی ککڑیاں اور زمین کا لہسن، زمین کا مسور وبصلها اور زمین کا پیاز اپنے رب سے کہہ کہ ہمارے لیے یہ چیزیں نکالے ہم ایک قسم کی چیز پر صبر نہیں کر سکتے۔

''قال'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ''اتستبدلون'' کیا بدلنا چاہتے ہو تم ''الذی هو ادنی'' اس چیز کو جو کہ گھٹیا ہے'' بالذی هو خیر'' اس چیز کے بدلے جو کہ بہتر ہے، بدلے میں لینا چاہتے ہو تم ادنیٰ کو اس چیز کے جو کہ بہتر ہے، بہتر چیز کو چھوڑ کر تم گھٹیا چیز کو لینا چاہتے ہو؟ یہ استفہام انکاری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ

تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے جو کچھ تمہیں مل رہا ہے وہ ''بالذی ھو خیر'' کا مصداق ہے اور تم جو کچھ لینا چاہتے ہو وہ ''ھو ادنیٰ'' کا مصداق ہے۔

تم الذی خیر کے بدلے میں الذی ادنیٰ لینا چاہتے ہو، گھٹیا چیز لینا چاہتے ہو اتستبدلون یہ استفہام انکاری ہے، کیا بدلے میں لینا چاہتے ہو تم ادنیٰ چیز کو اس چیز کے جو کہ بہتر ہے؟ یعنی بڑھیا چیز دے کر گھٹیا چیز لینا چاہتے ہو۔

''اھبطوا مصراً'' نازل ہو جاؤ کسی شہر میں، اترو کسی شہر میں ''مصراً'' یہ نکرہ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے ملک مصر مراد نہیں ہے کیونکہ ملک مصر کے طور پر یہ لفظ جہاں بھی آیا ہے وہاں غیر منصرف آیا ہے۔

جہاں ملک مصر مراد لیا جائے وہاں یہ غیر منصرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جہاں یہ نکرہ کے طور پر آیا منصرف کے طور پر اس سے غیر معین شہر مراد ہے ملک مصر مراد نہیں، اترو کسی شہر میں۔

''فان لکم ماسالتم'' بے شک تمہارے لیے وہ چیز ہوگی جو تم نے مانگی۔

''وضربت علیھم الذلۃ'' ماردی گئی ان کے اوپر ذلت اور مسکنت ضرب کا لفظی معنیٰ ہے مارنا اور یہاں ذلت اور مسکنت ان کے اوپر ماردی گئی اس کا مطلب یوں ہوتا ہے جس طرح آپ کوئی گارا لیں اور دیوار کے اوپر ماردیں اس لیے جدید مترجمین نے اس لفظ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بہت مفہوم خیز ہے کہ تھوپ دی گئی ان کے اوپر ذلت اور مسکنت جب کسی کے اوپر کثرت کے ساتھ کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف چڑھا دی جائے اس کو کہتے ہیں کہ اس کے اوپر تھوپ دی گئی ''یہ بات کی کس نے تھی اور تھوپ دی میرے سر'' عام طور پر یہ محارہ استعمال ہوتا ہے، ضُربت کا یہی مطلب ہے کہ چمٹا دی گئی، تھوپ دی گئی ان کے اوپر ذلت اور مسکنت۔

ذلت اور مسکنت دو لفظ بولے، ذلت تو ذلیل ہونے کے معنیٰ میں ہو گیا کہ عزت نہ رہی اور مسکنت میں عجز اور بے چارگی آ گئی تو ذلت کا مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے ہاں بھی عزت نہ رہی اور مسکنت کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی نظروں میں بھی ذلیل ہو گئے، مسکین ہو گئے اور کوئی اولوالعزمی اور ہمت باقی نہ رہی، اپنی نظروں میں بھی ذلیل ہوئے یہ مسکنت ہے اور دوسروں کی نظروں میں بھی ذلیل ہو گئے یہ ذلت ہے، چمٹا دی گئی ان پر، تھوپ دی گئی ان پر ذلت اور مسکنت نہ لوگوں کی نظر میں عزت رہی نہ اپنی طبیعت میں حوصلہ رہا۔

''وبآء وبغضب من اللہ'' اور لوٹے وہ اللہ کا غضب لے کر، مستحق ہوئے وہ اللہ کے غضب کے، لوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ یہی چیز لے کر وہ لوٹے، یہی چیز ان کے پلے پڑی، مستحق ہوئے وہ اللہ کے غضب کے۔

''ذلك بانهم كانوا يكفرون بايت الله'' یہ اس سبب سے ہوا کہ وہ انکار کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیات کا۔

''ويقتلون النبيين'' اور وہ قتل کیا کرتے تھے نبیوں کو۔

''بغير حق'' ناحق، انبیاء علیہم السلام کا قتل تو ناحق ہی ہوتا ہے لیکن اس کی صراحت اس لیے فرمائی کہ ان کے نزدیک بھی ان کو قتل کرنا ناحق تھا، اس کے جواز کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اور پھر ان کے قتل پر کوئی ندامت بھی نہیں ہوتی تھی۔

''ذلك بما عصوا'' یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اللہ اور اس کے رسول کی، اطاعت نہیں کرتے تھے'' وكانوا يعتدون '' اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے، اعتداء حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کے لیے پتھر سے بارہ چشمے جاری کر دیے:

بنی اسرائیل کے متعلق واقعات کا تذکرہ چلا آ رہا ہے ان واقعات کے سلسلے میں یہ استسقیٰ کا واقعہ جو ذکر کیا یہ بھی وادی تیہ سے تعلق رکھتا ہے، جہاں ان کو جہاد کے چھوڑنے کے نتیجے میں یا جہاد کرنے سے انکار کے نتیجے میں پریشانی میں ڈالا گیا تھا، محصور کر دیا گیا تھا، وہاں دھوپ کی تکلیف ہوئی تو بادلوں کو سائبان بنا دیا گیا، کھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو من وسلویٰ اتار دیا گیا اور پھر پیاس لگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا، تو اللہ تعالیٰ نے مہربانی کرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فلاں پتھر پر اپنا عصاء مارو تو اس سے چشمے پھوٹ پڑیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پتھر پر اپنا عصاء مارا تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے پانی ان کو بہتات کے ساتھ مہیا کر دیا۔

بارہ چشمے دیئے کہ بارہ خاندان تھے ہر خاندان نے اپنا ایک ایک چشمہ متعین کر لیا ایک ہی دفعہ متعین کر لیا ہو بغیر کسی قرینے کے یا ہو سکتا ہے کہ چشموں میں پانی تھوڑا یا زیادہ بہتا ہو اور بڑے چھوٹے قبیلے کے اعتبار سے اس کی تعیین ہو گئی ہو کہ جس چشمے سے پانی زیادہ نکلتا ہے وہ بڑے قبیلے نے لے لیا ہو اور جس چشمے سے پانی تھوڑا نکلتا ہو وہ چھوٹے قبیلے نے لے لیا ہو کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔

بہر حال ایک ایک چشمہ انہوں نے متعین کرلیا، پتھر سے پانی نکل آنا یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا پتھر سے پانی نکل آنا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس کو تعجب سے دیکھا جائے، اب بھی چلے جائیں پہاڑوں سے چشمے پھوٹ رہے ہیں پہلے نہ ہوں اور بعد میں پھوٹ جائیں ایسے بھی ہوتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ پانی نکالتا رہتا ہے تو ایسے ہی وہ ایک پتھر تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر عصاء مارا تو اس نے معجزۃً زمین کا پانی کھینچ کھینچ کر اوپر بہانا شروع کر دیا تو پانی ابل ابل کر باہر نکلنے لگ گیا ایسے ہی جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چشمے ہیں ان کے اوپر سے تو پانی نہیں نکلتا بلکہ نیچے سے پانی جا کر اوپر سے نکلتا ہے وہاں پتھروں کے اندر کچھ اس قسم کی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ زمین کے پانی کو کھینچتے ہیں، کھینچ کر اوپر سے نکال دیتے ہیں۔

اسی طرح اس پتھر نے بھی زمین کا پانی کھینچا اور کھینچ کر اوپر سے نکالا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، پتھر اس طرح پانی نکالتے رہتے ہیں اور عصاء مارنے کے ساتھ اس پتھر سے چشموں کا پھوٹ پڑنا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے اور معجزہ ہوا ہی وہی کرتا ہے جو عام طور پر انسان کے بس کی بات نہیں ہے، ظاہری اسباب کے خلاف ایک واقعہ پیش آ گیا تو اسی طرح ظاہری اسباب کے خلاف لاٹھی مارنے کے ساتھ پتھر سے چشمے پھوٹ پڑے تو اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ قرار دیا، ان کا معجزہ ہے اور اسرائیلیوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے ورنہ اگر پانی نہ ملتا تو پانی کی خاطر یہ لوگ پریشان ہوتے پیاس میں مرتے اور تھوڑی سی مقدار میں ملتا تو یہ آپس میں لڑتے اور ان کی تلواریں نکلتیں کیونکہ شرافت تو ان میں تھی نہیں جو آپس میں رواداری کرتے۔

آپ کے سامنے ہی ہے اگر تھوڑا پانی ملتا تو اس کے پیچھے آپس میں لڑتے مرتے، تلواریں نکلتیں اس طرح خراب ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر یہ احسان فرمایا کہ پانی پیدا فرمایا اور کثرت سے پیدا فرمایا اور بارہ چشمے نکالے تاکہ ہر قبیلہ اپنے چشمے سے پانی لے کوئی کسی کے ساتھ مزاحمت نہ کرے یہ احسان ہے۔

''فانفجرت'' کا معنی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصاء مارنا ہی تھا کہ اس پتھر میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، تمام لوگوں نے اپنے مشرب کو معلوم کرلیا، مشرب گھاٹ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی پیا جاتا ہے۔

کلوا واشربوا اب جس وقت من وسلویٰ کا ذکر تھا چونکہ وہ کھانے کی چیز تھی وہاں لفظ آیا تھا۔

''کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم'' وہاں صرف کھانے کا ذکر تھا، اب کھانے کے ساتھ ساتھ چونکہ پانی بھی مل گیا اس لیے کلوا واشربوا یہاں دو لفظ آ گئے کہ اللہ کے رزق سے کھاؤ اور پیو۔

''ولا تعثوا فی الارض مفسدین'' زمین میں علاقے میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھرو۔

فساد مچانا اللہ تعالیٰ کے قوانین کو توڑنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے خلاف جو بھی تصرف کیا جائے کسی علاقے کے اندر وہ سب فساد میں داخل ہوتا ہے زمین میں فساد نہ مچاؤ۔

روکھی سوکھی کھا کر اپنے وقار کو بحال رکھنا عظیم لوگوں کا شیوہ ہے:

اب ان کو چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے معاشی طور پر ان کو بے فکر کر دیا، کھانے پینے کی فکر نہیں رہی اب وہ اپنی قومی حیثیت بحال کرتے، جہاد کی تیاری کرتے، فرعون کی غلامی کی بناء پر ان کے اندر جو پستی آگئی تھی اس کو زائل کرتے اور مجاہدانہ طریقہ اختیار کرتے، اپنے مخالفوں پر حملہ کرتے اور اپنے چھینے ہوئے علاقے واپس لے لیتے، جس وقت تک اپنے قومی وقار کو بحال نہ کر لیتے اور اپنا شام کا علاقہ دشمنوں سے واپس نہ لے لیتے اس وقت تک ان کی زبان ان چٹخاروں کے پیچھے نہیں پڑنی چاہیے تھی۔

جس طرح لوگ کہا کرتے ہیں کہ سوکھی روٹی کھاؤ، چنے چباؤ، پانی کا گھونٹ پیو لیکن اپنی عزت بحال کرنے کی کوشش کرو، ان کو تو اللہ تعالیٰ نے گوشت دیا من وسلوی دیا اور وافر مقدار میں ان کو پینے کے لیے پانی دے دیا، ان کو تو چاہیے تھا کہ اپنے معاشی حالات سے بے فکر ہو کر جہاد کی تیاری کرتے اور اپنی پچھلی کوتاہیوں پر معافی چاہتے اور اپنے قومی وقار کو بحال کرنے کی کوشش کرتے لیکن جس وقت انسان کی طبیعت میں پستی آجاتی ہے تو اس پستی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان زبان کے چسکوں کو چھوڑ نہیں سکتا، وہ کہتا ہے کہ کھانے پینے کے لیے اچھا ملنا چاہیے، چاہے کسی کے جوتے چاٹ کر ہی ملے، اس لیے وہ ایسی حالت کو ترجیح دیں گے جہاں کھانا پینا اچھا ہو، عزت ہو یا نہ ہو، ذلت ہی ذلت ہو، دوسرے کی غلامی ہو، دوسرے کے دسترخوان پر بیٹھنا پڑے، لوگ انتہائی ذلت کی نگاہ سے دیکھیں لیکن چونکہ کھانے پینے کو اچھا ملتا ہے اس لیے انسان ادھر ہی کو جھکتا ہے یہ ان لوگوں کا حال ہوا کرتا ہے جن کی قسمت میں عزت کی زندگی نہیں۔

عزت کی زندگی ایسے شخص کو ملا کرتی ہے جو اپنے وقار کی رعایت رکھے، عزت کی رعایت رکھے اور اگر اس کو سوکھا کھانا پڑے تو سوکھا کھا لے، اگر روکھا کھانا پڑے تو روکھا کھا لے، پھٹے ہوئے کپڑوں پر گزارہ کرنا پڑے تو پھٹے ہوئے کپڑے پر گزارہ کر لے وہ اچھے لباس کے لیے اور اچھی خوراک کے لیے کسی دوسرے کی غلامی اور اس کے سامنے ذلت اختیار نہ کرے۔

بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی:

یہی ان کو سبق دینا مقصود تھا کہ اب یہ چٹخارے وغیرہ چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاشی طور پر بے فکر کر دیا ہے، کھاؤ اور مجاہدانہ زندگی اختیار کرو اور مجاہدانہ زندگی اختیار کر کے اپنے گرے ہوئے قومی وقار کو بحال کرو

لیکن وہ ایسے عیاش تھے کہنے لگے جی ہم تو ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے ہر روز صبح بھی گوشت اور شام کو بھی گوشت ہر روز من وسلویٰ پر گزارا کریں یہ ہم سے نہیں ہو سکتا ہم تو عادی ہیں، پیاز ہو، لہسن ہو، سبزیاں ہوں، کبھی ان کو شور بے دار بنا کر کھایا جائے، کبھی ان کو بھونا کر کھایا جائے، کبھی کس طرح کبھی کس طرح خوب زبان کے چٹخارے پورے کیے جائیں، ہم تو اس طرح سے نہیں کر سکتے کہ روز گوشت کھائیں ہم سے تو نہیں ہوتا یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انہوں نے اس طرح سے جواب دے دیا۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو ایک فوجی چھاؤنی کے اندر رکھا ہوا تھا اور سارے کے سارے وظائف ان کو دیے جاتے تھے تاکہ وہ جہاد کی تیاری کریں، اب لوٹ کر پھر آئیں اسی طرح سے ہل جوتیں، زمین کی خاک چھانیں اور زمین سے نکال نکال کر پھر ان چیزوں کو کھائیں، اور جب ایک انسان اس طرح بیلوں کی دمیں دبانے لگ جائے اور ان کے خصیتین ملنے لگ جائے اور صبح شام وہ زمین کی مٹی چھانے تو وہ کہاں مجاہدانہ زندگی اختیار کرے گا اس لیے تو سرور کائنات ﷺ نے ابتداء ابتداء میں مسلمانوں کو جہاد پر برانگیختہ کیا تھا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ کے سامنے سے آلات زرع میں سے کوئی چیز گزری جس طرح ہل وغیرہ ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا جس گھر کے اندر یہ چیزیں داخل ہو جائیں اس گھر میں ذلت آ جاتی ہے، مقصد یہی تھا کہ جو لوگ ان چیزوں کے پیچھے لگ جائیں گے اور جہاد کو چھوڑ دیں گے جبکہ قوم کی تعمیر کا وقت ہے تو ایسی صورت میں نتیجتاً دشمن غالب آ جائے گا، وہ کاشت کار ہر وقت خاک چھانتے ہیں، ہر وقت بیلوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، کھاد سر پر اٹھائی ہے، بکھیر رہے ہیں یہ حال ہوتا ہے کاشتکار کا، خاص طور پر اس وقت جب ایک قوم کی تعمیر ہو رہی ہو تو ان کاموں میں مگن ہو جانا دشمن کے غلبے کا سبب بن سکتا ہے، اور پھر ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ تم ان چیزوں کو چھوڑ دو اور جہاد کی تیاری کرو، دشمن سے اپنے علاقے واپس لو۔

وہ کہتے ہیں نہیں جی ہم تو وہی زندگی اختیار کریں گے جو پہلے اختیار کر رکھی تھی پھر یہی کہنا تھا کہ جاؤ جا کر پھر خاک چھانو اور زمین چھانو اور اس طرح بیلوں کے پیچھے لگو کماؤ اور کھاؤ تو یہ اعلیٰ حالت سے پست حالت کی طرف ان کا نزول ہو گیا صرف ان کو ان کے اس زبان کے چسکے اور چٹخارے نے خراب کیا کہ جو لذت کی عادت پڑی ہوئی تھی ان کو مجاہدانہ زندگی گزارنے پر اس نے باقی نہ رکھا اور اس طرح یہ زندگی ان کو ذلت کی طرف لے گئی۔

اور یہ سبزیاں پہلے ان کے عام استعمال میں آتی ہوں گی، سبزیاں عام ہو گئیں کہ ساگ ہو گیا، ککڑی ہو گئی، تھوم یا لہسن ہو گیا یا گندم ہو گئی عدسها یہ مسور ہو گئی، وبصلها یہ پیاز ہو گئے یہ عدس بھی اسرائیلیوں کی مرغوب فیہ چیز ہے، جس طرح پیاز لہسن ہیں اس طرح مسور بھی ہے۔

یہ تو وہ نعمت ہے جو اسرائیلیوں کو ترس ترس کر ملی:

طالب علموں کو مدرسے میں اکثر و بیشتر دال کی شکایت ہوتی ہے، اس کے متعلق عجیب و غریب قسم کے لطیفے بناتے رہتے ہیں سنا ہے کہ ایک دفعہ دیوبند میں یہ مسور کی دال ہی پکی ہوئی تھی اور طالب علم حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو دکھانے کے لیے گئے پیالہ بھر کر لے گئے تو اس میں نمک مرچ کم ہوگا، پانی کچا ہوگا، جس طرح عام طور پر ہوتا ہے، اتنے آدمیوں کا کھانا پکتا ہے اس میں ایسے ہوتا رہتا ہے، شکایت کرنے کے لیے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے، کہتے ہیں کہ جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیالہ رکھا تو آپ سمجھ گئے کہ یہ شکایت کرنے کے لیے آئے ہیں فوراً وہ پیالہ پکڑا اور پورا پیالہ پی گئے اور کہنے لگے الحمد للہ! یہ تو وہ نعمت ہے جو اسرائیلیوں کو ترس ترس کر ملی، جب آگے سے یہ بات سنی تو طالب علم کیا شکایت کریں اس طرح عدس یہ اسرائیلیوں کی مرغوب فیہ چیز ہے اور انہوں نے مانگی تھی، پہلے کھانے کے عادی ہوں گے اب زبان ترس رہی تھی اس چیز کے کھانے کو جہاں اور چیزوں کو ذکر کیا وہاں اس مسور کی دال کا بھی ذکر کر دیا۔

بنی اسرائیل نے اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کیا:

''قال اتستبدلون الذی ھو ادنی'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تنبیہ کی کہ اعلیٰ اور خیر چیز کو چھوڑ کر تم اس کے بدلے میں ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو، اب یہ معاشی طور پر جو کچھ تمہیں مل رہا ہے بے فکری کے طور پر مل رہا ہے، آزادی کے ساتھ مل رہا ہے، بغیر کسی قسم کی ذلت اٹھائے ہوئے مل رہا ہے، یہ رزق بہر حال تمہارے لیے بہتر ہے اور جو تم لینا چاہتے ہو وہ تمہارے لیے ادنیٰ ہے اور تمہاری محنتیں اسی رزق پر لگ جائیں گی، اور پھر تمہیں شہر میں جا کر اسی قسم کی زندگی اختیار کرنا پڑے گی جس طرح مزدوروں والی زندگی تم نے پہلے اختیار کر رکھی تھی تو ایک اچھی حالت کو چھوڑ کر تم ادنیٰ حالت کی طرف کیوں جاتے ہو؟ یہ رزق تمہارے لیے بہتر ہے اس لیے بہتر ہے کہ آزادی سے مل رہا ہے چاہے اس میں نمک مرچ والے مصالحوں والی لذت نہیں ہے لیکن پیٹ بھرنے کے لیے اور زندگی گزارنے کے لیے کافی ہے عزت سے مل رہا ہے، وقار سے مل رہا ہے، بغیر کسی محنت و مشقت کے مل رہا ہے تو یہ حالت تمہارے لیے بہر حال بہتر ہے۔

اگر دوسری حالت اختیار کرو گے تو تم پھر اپنی ساری صلاحیتیں زمین میں کھپا دو گے اور وہی محنت مزدوری تمہیں کرنی پڑے گی جس طرح پہلے کرتے تھے تمہاری توجہ تو درجہ علیا کی طرف لگائی گئی ہے کہ تم مجاہدانہ زندگی اختیار کر کے اپنے علاقے واپس لو اور پھر تم وہی خاک چھاننے میں لگ جاؤ گے یہ حالت تمہارے لیے اچھی نہیں ہے

شہروں میں جاؤ گے لوگ تمہیں اسی طرح مزارع رکھیں گے اسی طرح تم کاشتکاری کرو گے اور وہی مٹی چھاننی ہو گی اور پھر اپنے لیے تم یہ لذتیں پیدا کرو گے، جدہر ہم تمہیں لے جانا چاہتے ہیں، جس حالت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اس کے یہ بات منافی ہے کہ تم زبان کی لذت کے پیچھے لگ کر اس قسم کی زندگی اختیار کرو۔

''اهبطوا مصراً'' جب وہ نہیں باز آئے ہوں گے تو پھر انہیں کہہ دیا کہ چلو اچھا کوئی شہر یا کوئی بستی ہو گی صحراء سینا کے اندر ہی کسی کنارے پر جس میں کوئی آباد علاقہ ہو گا جہاں کوئی پیداوار ہوتی ہو گی، اترو، نازل ہو جاؤ شہر میں اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے مانگی۔

ذلت اور رسوائی بنی اسرائیل کا مقدر بن گئی :

''وضربت علیهم الذلة والمسكنة'' ان کے اوپر ذلت لازم کر دی گئی، اور مسکنت ان کے اوپر چمٹا دی گئی، تھوپ دی گئی ان پر ذلت اور مسکنت، نہ تو لوگوں کی نظر میں اس قوم کی عزت رہی جو بار بار پٹ رہی تھی اور بار بار اللہ کی گرفت میں آ رہی تھی اور خود مار کھاتے کھاتے اپنی نظر میں بھی ان کی کوئی عزت نہیں رہی اپنی نظر میں بھی یہ حقیر اور ذلیل ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹے اور یہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹنا اور ذلت و مسکنت کا ان کے اوپر تھوپا جانا اس وجہ سے تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت کوئی بلاوجہ اور دفعۃً نہیں تھوپ دی گئی بلکہ ان کی تاریخ تسلسل کے ساتھ کفر بآیات اللہ کی حامل ہے اور جو ان کو سمجھانے کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے تھے ان کو یہ قتل کرنے سے باز نہیں آتے تھے ان کی یہی حرکتیں تھیں جن کی بناء پر یہ قومی سطح پر ذلیل ہو گئے اور مسکنت ان پر لازم کر دی گئی اور اللہ کے غضب کا نشانہ بن گئے، مسلسل ان کی یہ حرکات ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنا اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا، کتنے انبیاء علیہم السلام تھے جو یہود کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

ان قومی حرکات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ ان کے اوپر ذلت لازم کر دی گئی چمٹا دی گئی اور اللہ کے غضب کا یہ نشانہ بن گئے اور یہ کفر بآیات اللہ اور یہ قتل انبیاء علیہم السلام اس کی نوبت اس لیے آئی کہ ان کو نافرمانی کی عادت ہے، عصیان انہوں نے اختیار کر رکھا تھا اور حد سے نکلنے کی عادت تھی اور عصیان اور اعتداء یہ سبب بنا اللہ تعالیٰ کی آیات کے انکار کا اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کا اور کفر بالآیات اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا یہ سبب بنا ہے ان کے لیے اللہ کے غضب کے مستحق ہونے کا اور ذلت و مسکنت کے نشانہ بننے کا، یہ ترتیب ہوئی اس میں کہ طبیعت کے اندر سرکشی ہے فرمانبرداری نہیں ہے یہ عصیان ایک جذبہ ہے، نافرمانی ہے کہ جب کہو الٹا چلنا ہے، بعض طبیعتوں کے

اندر یہ جذبہ ہوتا ہے کہ جب ان کو نصیحت کی جائے تو اس کے مطابق چلنے کی بجائے ان کی طبیعت میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ جو کوئی کچھ کہے اس کے الٹ چلنا ہے ان کی طبیعت میں یہ عصیان ہے۔

حد میں رہنے کی ان کو عادت نہیں، حد سے یہ تجاوز کرتے ہیں یہی تو طبیعت کا جذبہ تھا کہ نصیحت قبول نہیں کرنی بلکہ اس نصیحت کے مقابلے میں الٹی راہ اختیار کرنی ہے اسی نے ان کو کفر بالآیات تک پہنچایا، اسی نے ان کو قتل انبیاء علیہم السلام تک پہنچایا یہ عصیان اور نافرمانی کی عادت تھی اسی کے ساتھ یہ یہاں تک پہنچے اور جس وقت کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء علیہم السلام کا ارتکاب کیا تو اللہ کے غضب کا نشانہ بن گئے، ذلت اور مسکنت ان کے اوپر تھوپ دی گئی۔

اسرائیل میں یہودیوں کی حکومت قائم ہونے پر اعتراض:

قرآن کریم کی آیات کا مفہوم تو یہی ہے باقی رہی یہ بات کہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اس کا مطلب کیا ہے؟

ائمہ تفسیر میں سے بعض علماء کا یہ قول آتا ہے کہ ذلت اور مسکنت ان کے اوپر تھوپ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ یہ دوسری قوموں کے باجگزار رہیں گے، ان کے مطیع رہیں گے اور کہیں بھی ان کی پرشوکت باوقار آزاد حکومت قائم نہیں ہوسکتی یہ آج سے تیرہ سو سال پہلے کے اقوال تفسیروں کی کتابوں کے اندر موجود ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی نقل کیا ہے اور آپ نے سنا ہوگا عام طور پر یہ لوگوں کی زبان پر ہے کہ یہود کی کہیں حکومت نہیں ہوسکتی پھر ان لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ جب یہود کی کہیں حکومت نہیں ہوسکتی پھر یہ اسرائیل جو بن گیا وہاں تو یہود کی حکومت ہے پھر یہ بات کس طرح سے بنی؟۔

جس وقت پہلے پہلے اسرائیل کا وجود ہوا اس وقت یہ اشکالات بہت کثرت سے ہوتے تھے اور ہمارے سامنے بھی یہ بات کئی دفعہ ہوئی، یہ اسرائیل، اسرائیل جو سنتے رہتے ہیں آپ، اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے، پاکستان پہلے بنا ہے اسرائیل کا وجود بعد میں ہوا ہے، پاکستان کی عمر اسرائیل سے زیادہ ہے یہ اسرائیلی مملکت بعد میں بنی ہے، یعنی دنیا میں صرف دو ملک ہیں جو کہ مذہب کے نام پر رونما ہوئے اِدھر پاکستان بنا اسلامی نعرے کے ساتھ کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے یہاں اسلام ہوگا اور اُدھر اسرائیل کا وجود آیا یہودیت کے نعرے کے ساتھ ساری دنیا کے اندر یہ دو مملکتیں ہیں جن کا وجود اس نقشے کے اوپر مذہبی جذبے کے تحت رونما کیا گیا اسرائیل یہودی جذبہ کے تحت آیا اور پاکستان اسلامی جذبہ کے تحت آیا۔

پاکستان پہلے بنا ہے، فلسطین تقسیم ہوکر یہودی ریاست بعد میں قائم ہوئی ہے، جس طرح پاکستان پہلے

بنا ہے اور چائنہ بعد میں آزاد ہوا ہے، یہ چین جو آپ کے قریب مملکت ہے یہ پاکستان سے دو سال چھوٹی ہے، پاکستان سے دو سال بعد چین آزاد ہوا ہے اور ہم ان سے پہلے آزاد ہوئے ہیں۔

جس وقت اسرائیلی حکومت قائم ہوگئی کیونکہ بظاہر تو وہ یہودیوں کی حکومت ہے پھر یہ سوالات ہوتے تھے اور لوگ یوں کہا کرتے تھے قرآن میں تو آتا ہے کہ یہود کی کہیں حکومت نہیں ہوگی قیامت تک پھر یہ حکومت کیسے بن گئی؟ لوگوں کے سوال کرنے کا انداز یہی ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ ان کی حکومت کہیں نہیں ہوگی اور یہ حکومت ان کی کس طرح بن گئی؟ اس وقت سے علماء اس بات کی وضاحت کرتے چلے آرہے ہیں اور میں بھی اسی کی وضاحت چند لفظوں میں آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔

جواب :

پہلے تو آپ یہ بات جان لیں کہ قرآن کریم میں یا حدیث میں کسی جگہ یہ لفظ نہیں آتے کہ یہود کی حکومت قیامت تک نہیں آسکتی قرآن وحدیث میں یہ لفظ کسی جگہ موجود نہیں ہیں یعنی حضور ﷺ نے فرمایا ہو کہ یہود کی کہیں حکومت قائم نہیں ہوگی یا قرآن کریم کی کسی آیت کا ترجمہ یہ ہو کہ قیامت تک ان کی کہیں حکومت قائم نہیں ہوگی یہ بات غلط ہے نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں، البتہ قرآن کریم کی یہ آیت ’’ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ‘‘ اس سے استنباط کرتے ہوئے بعض ائمہ تفسیر نے یہ بات لکھی ہے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی طرف سے یہ اقوال آئے ہیں کہ ان کے اوپر ذلت اور مسکنت چمٹا دینے کا مطلب یہ ہے کہ ذلت لازم ہوگئی ہے، اب ان سے جدا نہیں ہوگی جس طرح درہم کے اوپر مہر لگا دی جاتی ہے تو ضرب درہم مہر لگانا اس کے اوپر لازم کردیا گیا نقش ونگار اسی طرح یہ ذلت اور مسکنت ان کے اوپر چمٹا دی گئی کہ اب ان سے کبھی جدا نہیں ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قوموں میں سے ذلیل قوم ہوگی، حقیر قوم ہوگی، کسی بھی جگہ پر پر شوکت طریقے سے، پروقار طریقے سے، آزادانہ زندگی یہ لوگ نہیں گزار سکتے، اس آیت کی تفسیر کے طور پر ائمہ تفسیر کے یہ اقوال کتابوں کے اندر موجود ہیں، یہ تفسیری درجے کی بات ہے، قرآن کریم کے الفاظ کا یہ ترجمہ نہیں ہے کہ قیامت تک ان کی کہیں حکومت نہیں آئے گی۔

باقی یہ تفسیر کہاں تک صحیح ہے؟ جب یہ ائمہ تفسیر کی بات ہے تو ہم اس کو بھی تو غلط نہیں کہہ سکتے، یہ بات پھر کہاں تک صحیح ہے کہ قیامت تک ان کی حکومت نہیں آسکتی اور پھر یہ جو حکومت بن گئی ہے اس کا اس بات کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟ یہ کہنے کی ضرورت پیش اس لیے آئی کہ ہمارے سامنے ایک مملکت کا وجود ہوگیا ورنہ تیرہ سو سال قبل سے لے کر آج سے تیس سال قبل تک یہ بات بالکل واضح تھی کہ ان کی کہیں حکومت نہیں تھی دربدر کے یہ دھکے کھاتے پھر رہے تھے، کبھی کسی ملک میں جاتے وہاں سے ان کو دھکے دے کر نکال دیا جاتا کیونکہ یہ سازشی قوم ہے، سازشیں

کرتی ہے، شرارتیں پھیلاتی ہے، دوسرے نمبر پر سودخور ہیں جہاں بیٹھتے ہیں معاشیات پر قبضہ کر کے سود کے رنگ میں سارا مال اکٹھا کرنا شروع کر دیتے ہیں، سرمایہ داری کو جنم دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے خلاف ہمیشہ شورشیں ہوتی رہتی ہیں اور ان کو اتنا مارا گیا اور اتنا قتل کیا گیا اور اتنا ذلیل ہوئے قومی سطح پر آج تک ایسے حالات کسی قوم کے ساتھ پیش نہیں آئے جیسے حالات یہودیوں کے ساتھ مسلسل پیش آتے رہے حتیٰ کہ جنگ عظیم میں جرمن کے اندر یہ اتنے پٹے ہیں اور اتنا ان کو ذلیل کیا گیا کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ ہوٹلوں کے اوپر لوگوں نے تختیاں لکھ کر لٹکائیں ہوئی تھیں کہ ہوٹل کے اندر کتا اور یہودی داخل نہیں ہو سکتے یعنی ممانعت اس طرح کر دی کہ ہوٹل کے اندر کوئی کتا اور یہودی نہیں آسکتے، کتے کے آنے کی بھی ممانعت اور یہودی کے آنے کی بھی ممانعت اس طرح لوگ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے کہ ان کی سازشوں کے نتیجے میں عموماً دنیا میں لڑائیاں ہوئیں ذلیل یہ ہمیشہ رہے۔

اس وقت تک تو کوئی اشکال نہیں تھا اور ساری دنیا یہ ایک نقشہ پیش کر رہی تھی کہ واقعی یہ قوم ذلیل ہے اور قیامت تک یہ قوم ابھر نہیں سکتی پھر جس وقت یہ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور برائے نام ایک حکومت سی بن گئی اس وقت پھر یہ اشکال ہوا تو پھر اس اشکال کی وضاحت کے لیے یہ بات کہنی پڑی کہ قرآن کریم میں یہی مسئلہ دوسری جگہ بھی مذکور ہے سورۃ آل عمران میں ایک آیت آئے گی "ضربت علیھم الذلۃ این ما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس" ان کے اوپر ذلت لازم کر دی گئی ہاں اگر یہ ذلت سے بچ سکتے ہیں تو "بحبل من اللہ وحبل من الناس" تو اللہ کی رسی تھام کر یا لوگوں کی رسی تھام کر، حبل کہتے ہیں رسی کو الا بحبل من اللہ" یا تو اللہ کی رسی تھام کر" وحبل من الناس" یا لوگوں کی رسی تھام کر یہ لفظ قرآن کریم میں موجود ہیں یا نہیں؟ (موجود ہیں)۔

"حبل من اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے تحت ان کو تحفظ ہو جائے جس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ بچہ جو ہے اس کو ذلیل نہیں کیا جا سکتا، نہ قتل کیا جا سکتا ہے، نہ اس پر جزیہ رکھا جا سکتا ہے، عورت جو ہے نہ اس کو قتل کیا جا سکتا ہے، نہ اس پر جزیہ رکھا جا سکتا ہے، بوڑھا جو ہے نہ اس کو ذلیل کیا جا سکتا ہے، نہ جزیہ رکھا جا سکتا ہے، نہ قتل کیا جا سکتا ہے اسی طرح ان کے عالم" احبار ورھبان" جو کہ صرف اپنے خیال کے مطابق دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں جہاد میں شرارتوں میں حصہ نہیں لیتے ان کو بھی تحفظ حاصل ہے کہ نہ ان کے اوپر جزیہ رکھا جائے گا نہ ان کو قتل کیا جائے گا یہ تو "حبل من اللہ" ہے کہ جس کو اللہ کے قانون نے تحفظ دے دیا وہ کسی درجے میں ذلت سے بچ جائے گا۔

"حبل من الناس" کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کے زیر سایہ وقت گزار لیں قرآن کریم میں جب یہ "حبل من الناس" کے الفاظ موجود ہیں تو یہ اشکال سرے سے ہی ختم کیونکہ دنیا میں یہ ایک بین حقیقت ہے، وضاحت کے درجے میں ہے کہ یہود قوم اپنے پاؤں پر خود نہیں کھڑی ہوئی، برطانیہ نے

اور امریکہ نے ان کی سرپرستی کرتے ہوئے اپنے لیے ان کو ایک چھاؤنی بنا کر دی ہے تاکہ وہ مشرق وسطیٰ میں، عرب ممالک کے اوپر اپنا کنٹرول رکھ سکیں تو یہ ایسا کر دیا گویا کہ ایک فوجی چھاؤنی بنادی اور یہود کے نام پر ایک مملکت بنا کر دنیا سے یہودیوں کو لالا کر وہاں بسانا شروع کر دیا۔

اور آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے اندر جتنی بے چینی اور جتنی پریشانی ہے وہ صرف اسی کے وجود کی بناء پر ہے اور آج بھی ان کے سر کے اوپر امریکہ کا ہاتھ ہے، اسلحہ وہ دیتا ہے، اور امداد ہر قسم کی وہ دیتا ہے آج بھی اگر یہ لوگ ان کے ساتھ تحفظ کے معاہدے ختم کر دیں تو یہ اپنے وجود کو اس وقت بھی باقی نہیں رکھ سکتے یہ ''حبل من الناس'' کی ایک مثال ہے کہ لوگوں کے سہارے کے ساتھ وہ زندہ ہیں اور ان کی سرپرستی میں زندہ ہیں۔

یہ واقعہ ہے جس میں کسی قسم کا کوئی خفاء نہیں ہے جب بھی کسی طرف سے ان کے ساتھ لڑنے کی کوئی نوبت آتی ہے تو مقابلے میں امریکہ آجاتا ہے، امریکا ان کو دھڑا دھڑ اسلحہ اور ساری کی ساری امداد دیتا ہے، معاشی طور پر ان کو وہ سنبھالتا ہے آج بھی اگر وہ ان کی سرپرستی چھوڑ دے تو یہ قوم اس حیثیت میں قطعاً نہیں ہے کہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔

تو اس قسم کی چھوٹی سی مملکت اب یہ اسرائیل جو ہے اس کا رقبہ اس کا حدود اربعہ ہمارے ایک ضلع کے برابر بھی نہیں ہے یہ پنجاب کے جس طرح ضلعے ہیں ان ضلعوں کے برابر بھی نہیں ہے، یہ چھوٹے چھوٹے ملک ہیں عرب کے اندر، تو یہ فلسطین چھوٹا سا ملک تھا جس کو آدھا تقسیم کر دیا گیا اور آدھے کے اندر ان کی ریاست بنادی گئی، یہ تھوڑی سی جگہ ہے اور بہت کم اس کی آبادی ہے یوں سمجھئے کہ امریکہ کی ایک فوجی چھاؤنی ہے، اپنے قدموں پر وہ قطعاً نہیں ہیں۔

اسرائیل میں یہودیوں کی حکومت ڈاکوؤں کے قبضہ کی طرح ہے:

دوسری بات یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ جہاں یہ نفی کی گئی ہے کہ باوقار آزادانہ ان کی حکومت نہیں ہوگی اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی قوموں کی طرح نہیں ہوگی اب دنیا کا رقبہ کتنا وسیع ہے اور اس کے اوپر دہریوں کی حکومتیں ہیں، بت پرستوں کی حکومتیں ہیں، عیسائیوں کی بہت بڑی بڑی حکومتیں ہیں، اس گئے گزرے زمانے میں مسلمانوں کی بھی بڑی بڑی حکومتیں ہیں لیکن اگر اس کے مقابلے میں یہود کی اس مملکت کو دیکھا جائے تو ایک نقطے کی طرح ہے اور اتنی قلیل جگہ پر کچھ لوگ ڈاکوؤں کی طرح اکٹھے ہوگئے اور دوسروں کے حقوق غصب کر کے اس پر مسلط ہوگئے تو ڈاکوؤں کا یہ قبضہ کوئی باعزت زندگی نہیں ہوتی۔

دس ڈاکو اکٹھے ہو کر کسی شریف آدمی کی کوٹھی پر حملہ کریں اور اس پر قدم جما کر بیٹھ جائیں اس کو کوئی باوقار حکومت نہیں کہتا یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک عربوں کے ساتھ ان کا مسلسل تصادم ہے اور ان کو یوں ہی سمجھا جاتا

ہے کہ ان مغربی اقوام نے اکھٹے ہو کر عربوں پر ظلم کیا پھر ان کی جائیدادیں چھین چھین کر یہودیوں کو دے دیں اور ان کو یہاں آباد کر دیا، ان کی حیثیت اس طرح ہے جیسے ڈاکو کسی جگہ جا کر کسی کی جگہ پر قبضہ کر لیں، مزاحمت اس طرح جاری ہے اور اگر دوسری قومیں ان کو سہارا نہ دیں تو یہ اپنا وجود قطعاً باقی نہیں رکھ سکتے یہ اشکال جو پیدا ہوتا ہے ان کی سلطنت کا تو'' حبل من اللہ وحبل من الناس'' کے الفاظ کے ساتھ اس اشکال کو دور کیا جا سکتا ہے اور یہ آیت قرآن میں موجود ہے۔

اللہ کے قانون کے تحت ان کو تحفظ ہو جائے یا یہ ہے کہ لوگوں کے سہارے یہ اپنے آپ کو سنبھال لیں ایسا ممکن ہے تو اس تقریر کے بعد یہ اشکال باقی نہیں رہتا کہ یہود کی حکومت ہوگئی اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہود کی حکومت کہیں نہیں ہوگی اور یہ کہا جو جاتا ہے یہ بھی ائمہ کے اقوال ہیں باقی قرآن وحدیث کے اندر اس قسم کی کوئی آیت اور حدیث نہیں ہے جس کے اندر صراحۃً ثابت کیا جائے کہ یہود کی حکومت نہیں ہو سکتی اور روایات میں اتنی بات ثابت ہے کہ وہ جو دجال اکبر کا زمانہ ہے اس زمانے میں ان کی حکومت ہوگی اور یہ ایک شورش سی برپا ہوگی اور پھر مقابلہ ہوگا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، مقابلہ ہونے کی صورت میں وہ دجال بھی قتل ہو جائے گا اور یہودی بھی سارے کے سارے ختم ہو جائیں گے۔

اور پھر ان کا نام ونشان بھی مٹ جائے گا تو یہ بھی ایک شورش ہے جس طرح ایک بغاوت سی برپا ہو جایا کرتی ہے اسرائیل کے حالات بھی اسی طرح ہیں جیسے کسی دوسرے علاقے والے کے مقابلے میں ایک سرکشی ہے، باغیانہ زندگی ہے، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دجال کے زمانے میں یہ چیز اپنے عروج کو پہنچ جائے گی اور عروج پر پہنچنے کے بعد مقابلہ ہوگا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں نیست ونابود ہو جائے گا۔

تو'' ضربت علیھم الذلة والمسکنة'' کا مطلب یہ ہوا کہ رہیں گے یہ ذلیل اور مسکین باقی کسی وقت کسی کے سہارے وقتی طور پر ڈاکوؤں کی طرح کسی علاقے پر غالب آ جائیں تو اس کو دیگر اقوام کے مقابلے میں کوئی باوقار حکومت قرار نہیں دیا جا سکتا اور اتنی بڑی دنیا کے اندر اتنے چھوٹے سے علاقے پر وہ قابض ہو بھی گئے تو ساری دنیا کے مقابلے میں ایک نقطے کے برابر ہیں اور اتنی سی سلطنت کو باوقار سلطنت قرار نہیں دیا جا سکتا، اس کے باوجود حالات یہ ہیں کہ اگر مغربی اقوام ان کی سرپرستی نہ کریں تو اس وقت بھی اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے اس طرح بات صاف ہوگئی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور جو نصرانی ہوئے اور جو لوگ صابی ہوئے

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ

ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے پس ان کیلئے ان کا

أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ ان کے اوپر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے ﴿۶۲﴾

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ

اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے تم سے لیا پختہ عہد اور اٹھایا ہم نے تمہارے اوپر طور کو (اور ہم نے کہا) پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی

بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ

مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں تا کہ تم متقی بن جاؤ ﴿۶۳﴾ پھر تم نے پیٹھ پھیر لی

بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ

اس کے بعد پس اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو البتہ ہو جاتے

الْخَاسِرِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

تم خسارہ پانے والے ﴿۶۴﴾ البتہ تحقیق جان لیا تم نے ان لوگوں کو جنہوں نے حد سے تجاوز کیا تم میں سے ہفتہ کے بارے میں

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ

پس کہہ دیا ہم نے کہ ہو جاؤ تم ذلیل بندر ﴿۶۵﴾ پس بنا دیا اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کے لیے جو اس کے

يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ

سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے اور نصیحت متقین کے لیے ﴿۶۶﴾ اور یاد کیجئے جس وقت کہا موسیٰ نے

لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا

اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم ایک بقرہ ذبح کرو انہوں نے کہا کیا آپ ہمارے ساتھ

هُزُوًا ۗ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا ادْعُ

مذاق کرتے ہیں موسیٰ نے کہا میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں (۶۷) وہ کہنے لگے تو پکار

لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۗ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا

ہمارے لیے اپنے رب کو کہ وہ بیان کرے ہمارے لیے کہ وہ (گائے) کیسی ہونی چاہیئے، موسیٰ نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو کہ جو نہ

فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۗ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۗ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾

تو بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی ہو ان دو عمروں کے درمیان ہو پس تم کر دو اس چیز کو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے (۶۸)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۗ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا

وہ کہنے لگے کہ تو پکار اپنے رب کو ہمارے لیے کہ وہ ہمارے لیے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو، موسیٰ نے کہا بے شک اللہ کہتا ہے

بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا

کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہو جو دیکھنے والوں کو خوش کر دے (۶۹) وہ کہنے لگے کہ تو پکار اپنے

رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۗ وَاِنَّآ اِنْ

رب کو ہمارے لیے کہ وہ بیان کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو بے شک وہ گائے ہم پر کچھ مشتبہ سی ہو رہی ہے اور بے شک

شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ

اگر اللہ نے چاہا تو ہم البتہ سیدھی راہ پا جائیں گے (۷۰) موسیٰ نے کہا بے شک اللہ کہتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو کہ جو صحیح سالم ہو

تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۗ قَالُوا

نہ زمین کو پھاڑتی ہو اور نہ کھیتی کو سیراب کرتی ہو بے عیب ہو اس میں کوئی داغ نہ ہو انہوں نے کہا

الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۗ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧١﴾

اب آپ نے ٹھیک طرح بیان کیا ہے پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور قریب نہیں تھا کہ وہ یہ کام کرتے (۷۱)

لغوی وصرفی تحقیق:

''ان الذین امنوا'' بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے،'' والذین ھادوا '' ھَادَ یھود تھوّدا، یہودی ہونا، سورۃ جمعہ میں بھی خطاب اسی طرح آئے گا۔

''یاایھاالذین ھادوا'' اور ھَادَ یَھُوْدُ کا اصل معنی ہوتا ہے رجوع کرنا، سورۃ اعراف میں یہ لفظ اس معنی میں آئے گا''انا ھدنا الیك'' ہم نے تیری طرف رجوع کیا'' والذین ھادوا'' اور جو لوگ یہودی ہوئے۔

''والنصاریٰ ''نصاریٰ نصران کی جمع ہے اور نصران اس شخص کو کہتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا ان کو نصران کہنے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس بستی کے رہنے والے تھے اس بستی کا نام تھا ناصرہ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح ناصری کہتے ہیں تو ان کی طرف نسبت رکھنے والے نصران تھے جس کی جمع یہ نصاریٰ آ گئی، ناصرہ بستی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام رہتے تھے اس لیے آج کل جو توراۃ کا ترجمہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس میں ان کے لیے لفظ ناصری استعمال کیا گیا ہے۔

اور نصاریٰ، یعنی وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے جو اپنے آپ کو عیسیٰ علیہ السلام کی امت کہلاتے ہیں نصاریٰ جمع ہے نصران کی جس طرح نَدامیٰ جمع ندمان کی آجاتی ہے۔

''والصابئین'' صابئین یہ صابی کی جمع ہے یہ بھی اس وقت ایک فرقہ تھا جس کی صحیح کیفیات متعین نہیں ہیں، عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ زبور کی طرف منسوب تھے اور ستارہ پرستی اختیار کر لینے کی وجہ سے ان کے مسلک میں بھی شرک داخل ہو چکا تھا'' بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے'' والنصاریٰ کا عطف والذین امنوا کے اوپر ہے'' والنصاریٰ'' اس لیے یہ بھی نصب کی حالت میں ہے والصابئین کا عطف بھی اس پر ہے اس لیے یہ بھی منصوب آیا ہوا ہے۔

'' من آمن باللہ والیوم الاخر '' جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور یوم آخرت کے ساتھ۔

''وعمل صالحا'' اور نیک عمل کرے۔

'' فلھم اجرھم عند ربھم '' پس ان کے لیے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس۔

''ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون'' نہ ان کے اوپر خوف ہے اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔

خوف اور حزن کے درمیان فرق حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے اندر آ گیا کہ خوف آنے والے کسی خطرے سے ہوتا ہے اور حزن کسی گزرے ہوئے واقعہ پر ہوتا ہے۔

"واذاخذنا میثاقکم "اور یاد کیجئے جس وقت لیا ہم نے تم سے تمہارا پختہ عہد، میثاق پختہ عہد کو کہتے ہیں، وثوق اس کا مادہ ہے جس کے اندر اعتماد اور پختگی والا معنی پایا جاتا ہے۔

"ورفعنا فوقکم الطور "طور سے پہاڑ مراد ہے اور اٹھایا ہم نے تمہارے اوپر طور کو۔

"خذوا ما اتینٰکم "یہاں خذوا سے پہلے قلنا والا مفہوم ہے اور کہا ہم نے پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی "بقوۃ" پکڑ وقوت کے ساتھ بقوۃ کا تعلق خذوا کے ساتھ ہے خذوابقوۃ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس کو پوری مضبوطی سے تھام لو، پوری قوت کے ساتھ پکڑلو، اور "ما آتینا کم " کا مصداق یہاں توراۃ ہے، واذکروامافیہ اور یادرکھوان باتوں کو جو اس میں ہیں۔

"لعلکم تتقون "تا کہ تم متقی بن جاؤ تا کہ تم اللہ کے غضب سے بچ جاؤ، تا کہ تم اللہ کے عذاب سے بچ جاؤ۔

"ثم تولیتم من بعد ذلك "تم نے پھر پیٹھ پھیرلی سارے حال کے بعد ذلك کا اشارہ پچھلے واقعے کی طرف ہے، کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے جلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے طور پہاڑ معلق کر کے تمہیں توراۃ کے متعلق تاکید کی تھی کہ اس کے احکام پر مضبوطی سے عمل کرو اور اس ساری کاروائی کے بعد تم نے پھر پیٹھ پھیرلی۔

"فلولافضل اللہ علیکم ورحمتہ "اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت۔

"لکنتم من الخاسرین "تو البتہ ہو جاتے تم خسارہ پانے والے، اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ جس نے تمہیں بچالیا ورنہ تمہارے کرتوت تو اس طرح کے تھے کہ تمہیں دنیا کے اندر ختم کردیا جاتا اور تمہارا خسارہ اور گھاٹا نمایاں ہو جاتا، البتہ ہو جاتے تم خسارہ پانے والے۔

"ولقد علمتم الذین اعتدوامنکم فی السبت "ولقد کے اوپر جو لام ہوتا ہے یہ دال بر قسم ہوتا ہے، فوقیت للقسم اس لام کو داخل کر دیتے ہیں گویا اس میں قسم والا مفہوم پیدا ہو گیا۔

تحقیق جان لیا، تمہیں معلوم ہے، جان لیا تم نے ان لوگوں کو جنہوں نے حد سے تجاوز کیا تھا تم میں سے ہفتہ کے بارے میں، سبت ہفتہ یہ جمعہ سے اگلا دن جو آیا کرتا ہے اس کو سبت کہتے ہیں، ہفتہ کے بارے میں جنہوں نے تم میں سے حد سے تجاوز کیا تھا تم نے ان کو جان لیا، تمہیں وہ معلوم ہیں۔

قلنا لھم کونواقردۃ "پھر ہم نے کہہ دیا ان کے متعلق، یہ کہنا تکوینی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی، ہم نے کہہ دیا ان سے کونوا ہو جاؤ تم، قردۃ قِرَدۃٌ قِرْدٌ کی جمع ہے قِرْدٌ بندر کو کہتے ہیں۔

"خاسئین "ہو جاؤ تم ذلیل بندر۔

''فجعلناھانکالالمابین یدیھا'' تو یہ حکم چونکہ تکوینی ہے کن کے ساتھ تو فیکون جو اللہ کہہ دے وہی ہو جاتا ہے تو اللہ کے اس حکم دینے کے ساتھ یعنی اس کُن کے ساتھ واقعہ پیش آ گیا کہ وہ بندر ہو گئے نہایت ذلیل قسم کے فجعلناھا ہم نے بنا دیا اس واقعہ کو'' نکالالمابین یدیھا'' نکال عبرت، گناہوں سے روکنے والی چیز یعنی اس واقعہ کی یہ حیثیت تھی کہ لوگ اس کو دیکھیں تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے رکیں، پس بنا دیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت "لمابین یدیھا" ان لوگوں کے لیے جو اس واقعہ کے سامنے تھے۔

''وماخلفھا'' اور ان لوگوں کے لیے جو اس واقعہ سے پیچھے تھے۔

ہم نے بنا دیا اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کے لیے جو اس واقعہ کے سامنے تھے یعنی اس وقت موجود تھے، ماخلفھا اور ان کے لیے جو کہ پیچھے تھے۔

''وموعظة للمتقین'' موعظ یہ مصدر میمی ہے وعظ سے، وَعَظَ یعظ اس کا معنی ہوتا ہے نصیحت کرنا یعنی کسی کے ساتھ ایسی رقت آمیز باتیں کرنا جس کے ساتھ وہ متاثر ہو کر کسی بات کو قبول کر لے اس کو کہتے ہیں وعظ، قرآن کریم میں یہ لفظ موعظة کے طور پر کئی جگہ آیا ہے ویسے یہ مضارع کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔

'' واذقال لقمان لابنہ وھو یعظہ'' جب لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا اس حال میں کہ اس کو وعظ کہہ رہے تھے اس کا حاصل معنی نصیحت کر دیا جاتا ہے۔

وَاعِظ ہوتا ہے وعظ کہنے والا موعظہ نصیحت، وعظ متقین کے لیے، تو موعظہ اور نکال کے درمیان میں فرق یوں کیا جا سکتا ہے کہ یہ جو سزا کا واقعہ پیش آیا اس کے دو پہلو ہیں، گناہ گار دیکھیں تو گناہ سے باز آ جائیں اور صالحین دیکھیں تو ان کو اطاعت کی طرف زیادہ رغبت پیدا ہو، فرمانبرداروں کے لیے زیادہ رغبت کا باعث بنے گا اور نافرمانوں کے لیے نافرمانی سے رکنے کا ذریعہ بنے گا، نافرمانی سے رکنے کا ذریعہ بننے کی وجہ سے وہ واقعہ نکال ہے اور نیکی کی زیادہ ترغیب دینے کے اعتبار سے وہ واقعہ موعظة ہے اس طرح دونوں لفظوں کے درمیان فرق کر دیا گیا ہے۔

'' واذقال موسیٰ لقومہ '' یاد کیجئے جس وقت کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔

''ان اللہ یأمرکم ان تذبحوا بقرة '' کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک بقرہ ذبح کرو، بقرہ کا ترجمہ گائے کے ساتھ بھی کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ گائے کے ساتھ کیا ہے اور بقرہ کا ترجمہ بیل کے ساتھ بھی کیا گیا ہے جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں لفظ بیل استعمال کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بقرہ کا لفظ اس نوع کے لیے بولا جاتا ہے جس میں مذکر اور مؤنث دونوں آسکتے ہیں اور قرائن دونوں قسم کے آگئے کہ وہ مذکر تھا یا مؤنث دونوں کے قرینے آگے موجود ہیں۔

بہر حال بقرہ کا اطلاق دونوں پر ہے مذکر بھی ہوسکتا ہے اور مؤنث بھی ہوسکتا ہے اس نوع کو کہتے ہیں جس طرح شاۃ نوع کو کہتے ہیں بکری جس میں مذکر اور مؤنث دونوں آسکتے ہیں، بیان القرآن میں ترجمہ بیل کے ساتھ کیا گیا ہے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے گائے کے ساتھ کیا ہے۔

''قالوا اتتخذنا ھزوا'' اسرائیلیوں نے کہا، موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل انہوں نے کہا اذقال موسیٰ کا تعلق قالوا کے ساتھ بھی لگا سکتے ہیں تو پھر اذکر محذوف نکالنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے شروع میں جو اذ آیا تھا وہاں ذکر کیا تھا کہ اس کا تعلق مابعد والے قالوا کے ساتھ لگ سکتا ہے یہاں بھی اسی طرح ہے جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنی قوم کو بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے وہ کہنے لگے'' اتتخذنا ھزواً، ھزوا مھزواً'' جن کا مذاق اڑایا جائے کیا آپ بناتے ہیں ہمیں ٹھٹھہ کئے ہوئے، ہمارے ساتھ آپ مذاق کرتے ہیں، ٹھٹھہ کرتے ہیں'' قالوا اتتخذنا ھزوا'' انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھہ کرتے ہیں آپ ہمیں بناتے ہیں ٹھٹھہ کیا ہوا، یہ انہوں نے کب کہا تھا؟ '' واذقال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ'' جب موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا اپنی قوم کو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو تو اب اس کا تعلق'' قالوا اتتخذنا ھزوا '' کے ساتھ ہو گیا، یعنی ان کی قوم نے'' اتتخذنا ھزوا'' کب کہا جب موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا تھا کہ گائے ذبح کرو اللہ حکم دیتا ہے، اب یہاں ان کا وہی مزاج کمینہ پن گفتگو سے کس طرح ظاہر ہے، موسیٰ علیہ السلام جن کو وہ اللہ کا پیغمبر مانتے ہیں اور ان کے معجزات صبح و شام دیکھتے تھے اب وہ اللہ کا پیغمبر کہتا ہے اور کہتا بھی اللہ کی طرف نسبت کر کے کہ'' ان اللہ یامرکم ''اور وہ آگے سے کہتے ہیں تو ہم سے مذاق کرتا ہے'' اتتخذنا ھزوا'' کیا تو ہم سے کوئی ٹھٹھہ کرتا ہے، بناتا ہے تو ہمیں ٹھٹھہ کیے ہوئے۔

''قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین ''موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

جاہل یہ لفظ جہل سے لیا گیا ہے، جہل کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے، ایک جہل علم کے مقابلے میں ہوتا ہے علم کا معنی جاننا اور جہل کا معنی نہ جاننا جس کو آپ نادان کہتے ہیں اس کے مطابق ترجمہ یہ ہوگا کہ میں اللہ کی پناہ

مانگتا ہوں کہ میں نادانوں میں سے ہو جاؤں جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بات کہی نہ ہو اور اس کی طرف منسوب کر کے کہہ دی جائے کہ اللہ نے یوں کہا ہے یہ تو نادانوں کا کام ہے میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں نادانوں میں سے ہو جاؤں اور اللہ نے ایک بات نہ کہی ہو اور میں اس کی طرف منسوب کر کے کہہ دوں پھر اس کا مفہوم اس طرح سے ہوگا۔

''اعوذباللہ ان اکون من الجاھلین'' اللہ کی طرف غلط بات منسوب کرنا اللہ نے بات کہی نہ ہو اور اس کی طرف منسوب کر دی جائے کہ اللہ نے کہا ہے، یہ تو نادانوں کا کام ہے، جاہلوں کا کام ہے، میں جاہلوں میں ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس کا مطلب ہے کہ اللہ مجھے بچائے میں جاہلوں میں سے نہیں ہوں، ایک بات اللہ نے کہی نہ ہو اور میں منسوب کر دوں کہ اللہ نے یوں کہا تو پھر یہ جہل علم کے مقابلے میں ہے اور ایک جہل آیا کرتا ہے حلم کے مقابلے میں، حلم، بردباری، سنجیدگی، وقار کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے حلم کے مقابلے میں بھی جہل آتا ہے، دیوان حماسہ میں ہے۔

بعض الحلم عند الجهل للذلة اذعان

کہ جس وقت بعض لوگوں کی طرف سے ہمارے ساتھ جہالت کی جائے اور ہم ان کے مقابلے میں حلم سے کام لیں یہ حلم جہل کے مقابلے میں آیا، حلم کا معنی بردباری سنجیدگی اور وقار، اور جہل کا مطلب ہوگا اشتعال انگیزی اور غیر سنجیدہ باتیں کرنا، وقار کے خلاف باتیں کرنا، تو جاہل وہ ہوگا جو باوقار نہ ہو سنجیدہ نہ ہو بلکہ اُوچھی قسم کی اور اشتعال انگیزی کی باتیں کرے وہ ہوگا جاہل اور اس کے مقابلے میں آئے گا حلم تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ نبی انتہائی سنجیدہ انسان ہوتا ہے بہت باوقار ہوتا ہے اور اللہ کی طرف ایسی جھوٹ موٹ باتیں منسوب کرنا یہ تو اوچھے لوگوں کا کام ہے یہ تو غیر سنجیدہ لوگوں کی حرکت ہے یہ کسی باوقار آدمی کا کام نہیں ہوتا میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں کہ میں ایسے لوگوں میں ہو جاؤں جو کہ غیر سنجیدہ ہیں اور بے وقعت ہیں اور بغیر سوچے سمجھے اللہ کی طرف باتیں منسوب کرتے ہیں ان لوگوں میں ہونے سے میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں مطلب یہ کہ میں ایسا نہیں، میں کوئی ہنسی مذاق کے طور پر بات نہیں کرتا۔

ہنسی مذاق کے طور پر بات اور اللہ کی طرف غلط بات کو منسوب کر دینا یہ تو جاہلوں کا کام ہے میں بالکل سنجیدگی سے بات کرتا ہوں اور باوقار ہونے کی حیثیت میں بات کرتا ہوں، ہنسی مذاق نہیں ہے اب یہ مقصد ہوگا ان الفاظ کے استعمال کرنے کا، اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

''قالو ادع لنا ربك'' وہ کہنے لگے تو پکار ہمارے لیے اپنے رب کو۔

''یبین لنا ماھی'' کہ وہ رب بیان کرے ہمارے لیے، واضح کرے ہمارے سامنے، ماھی کہ وہ گائے کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، وہ کیسی ہونی چاہیئے؟ یہ وہی ماھی جس کو منطق میں ماھو کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کسی چیز کی حقیقت وماہیت پوچھنی ہو تو ماھو کہتے ہیں۔

اب یہاں گائے کی ماہیت اور حقیقت کوئی مخفی تو نہیں تھی اس لیے یہاں جو ماھی کا سوال کیا گیا ہے، ماھُوَ ماھی ایک ہی چیز ہے تو یہ حقیقت پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ اس سے اس کی کیفیات پوچھنی مقصود ہیں کہ گائے کیا ہونی چاہیئے اس کی کیفیات کیسی ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ

''انه یقول انها بقرة'' بے شک وہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

انها بقرة کہ وہ بقرہ جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ھا ضمیر اُدھر لوٹ رہی ہے وہ ایسی گائے ہو۔

''لافارض'' نہ تو بوڑھی ہو۔

''ولابکر'' نہ بالکل بچی ہو جس کو بکر باکرہ کنواری سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

''عـوان بيـن ذالك'' عـوان متوسط کو کہتے ہیں ان دونوں عمروں کے درمیان میں ہو، متوسط ہو ان دونوں عمروں کے'' بین ذالك عوان '' درمیانے درجے کی ہو'' بین ذالك مذکورین'' یہ دو عمریں جو ذکر کردی گئیں کہ نہ فارض ہو اور نہ بکر ہو اس کے درمیان درمیان میں ہو۔

'' عوان بین ذالك'' متوسط ہو ان دونوں عمروں کے درمیان جس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے کہ ان دونوں عمروں کے درمیان میں پٹھی ہو یا پٹھا ہو جب مذکر استعمال کریں گے تو پٹھا کا لفظ اور جس وقت مؤنث استعمال کریں گے تو پٹھی، پٹھی ہو نہ بالکل بچی ہو اور نہ بوڑھی، یا مذکر کے طور پر اگر تعبیر کریں گے تو یوں ہو جائے گا کہ نا بالکل بچہ ہو اور نہ بوڑھا بلکہ پٹھا ہو۔

''فافعلوا ما تؤمرون '' حضرت موسیٰ علیہ السلام پھر انہیں کہتے ہیں کہ زیادہ اونچ نیچ نہ کرو جو تمہیں کہا جا رہا وہ کام کرلو، فافعلوا کرو اس چیز کو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔

''قالوا'' وہ کہنے لگے۔

''ادع لنا ربك یبین لنا مالونها'' اپنے رب کو پکار ہمارے لیے کہ ہمارے لیے واضح کرے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔

''یبین لنا مالونها'' اس کا رنگ کیسا ہو۔

''قال'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

''انه یقول'' بے شک اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔

''انها بقرة صفرآءُ'' کہ وہ گائے ہو زرد رنگ کی۔

''فاقع لونها'' اور اس کا رنگ خوب گہرا ہو، فاقع کا لفظ عربی زبان میں صفراء کی تاکید کے لیے آتا ہے، اصفر فاقع یہ ایسے لفظ ہیں جیسا کہ ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں پیلا زرد، اب یہ پیلا اور زرد دونوں کا مفہوم ایک ہے ہم دوسرا لفظ بطور تاکید کے بولتے ہیں۔

کالا سیاہ اب کالا بھی وہی ہے اور سیاہ بھی وہی ہے لیکن ایک لفظ کو دوسرے کی تاکید کے لیے بول دیا جاتا ہے، عربی میں بھی اس کو کہتے ہیں غرابیب سود یہ لفظ قرآن کریم میں آئے گا تو اس کا یہی معنی ہوگا کالا سیاہ یہ دوسرا لفظ بطور تاکید کے لیے ہے۔

لال سرخ تو لال اور سرخ دونوں کا مفہوم ایک ہے، اس طرح سے عربی میں بھی دو لفظ بولے جاتے ہیں، احمر قانی، یہ لال سرخ کے معنی میں ہے اور چٹا سفید یہ چٹا سفید دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے لیکن وہی سفیدی والے مفہوم کو بیان کرنے کے لیے ہم اس قسم کے لفظ بول دیتے ہیں۔

تو اسی طرح سے یہاں ''صفراء فاقع لونها'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رنگ تیز زرد ہو اس کا رنگ بہت پختہ ہو ''تسر النظرین'' دیکھنے والے کو خوش کر دیتی ہو یعنی ایسی خوشنماء ہو کہ اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے۔

''قالوا ادع لنا ربك یبین لنا ماهی'' وہ کہنے لگے پکار تو اپنے رب کو ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو یعنی پہلے سوال کی ذرا وضاحت اور کر دے۔

''ان البقر تشبه علینا'' بے شک وہ گائے ہم پر کچھ مشتبہ سی ہو رہی ہے ابھی ہم پوری طرح سے سمجھے نہیں کہ گائے کیسی ہونی چاہیے؟

''ان البقر تشبه علینا'' بے شک وہ گائے ہم پر کچھ متشابہ سی ہو رہی ہے، ہمیں اس کی پہچان میں کچھ شبہ سا پڑ رہا ہے اس لیے اس کی کچھ وضاحت اور کر دیں۔

''وانا ان شاء الله لمهتدون'' اور بے شک اگر اللہ نے چاہا تو البتہ سیدھی راہ پا جائیں گے یعنی گائے کے پہچاننے میں ابھی ہمیں کچھ شبہ سا ہے ذرا تھوڑی سی اور وضاحت کر دیں پھر ہم ٹھیک اس گائے کو پہچان

جائیں گے اھتداء یہاں فی معرفۃ البقرہ مراد ہے کہ بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہم گائے کے پہچاننے میں سیدھی راہ اختیار کر جائیں گے اچھی طرح سے پہچان جائیں گے تھوڑی سی اور وضاحت کر دو۔

''قال '' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

''انہ یقول انھا بقرۃ'' بے شک اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو،

'' لاذلول تثیر الارض ولاتسقی الحرث'' سَقٰی یَسْقِیْ سیراب کرنا حرث کھیت کو کہتے ہیں لاتسقی الحرث کھیتی کو سیراب نہ کرتی ہو یعنی کنویں میں نہ جوتی گئی ہو پانی نہ کھینچا گیا ہو اس کے ذریعے سے اور اثار کہتے ہیں اثارۃ الارض، زمین کو گہنا، زمین میں ہل جوتنا، لا تثیر الارض وہ زمین کو گہتی نہ ہو یعنی ہل میں نہ جوتی گئی ہو اور ذلول کہتے ہیں مطیع کی ہوئی، کام میں لگائی ہو، مذال، ذلول مطیع کی ہوئی،

''ھوالذی جعل لکم الارض ذلولا'' جس نے تمہارے لیے زمین کو ذلول بنادیا وہ روندی ہوئی ہے وہ ذلیل ہے تمہارے سامنے یہاں بھی وہی ذلول کا لفظ ہے'' لاذلول تثیر الارض'' اب یہاں ذلول کے ساتھ تثیر الارض یہ بطور وصف کے آیا ہوا ہے اور ذلول کے اوپر لا داخل ہے اس لا کے ساتھ اس وصف کی نفی کرنا مقصود ہے۔

وہ ایسی کام میں لگائی ہوئی نہ ہو کہ گہتی ہو زمین کو اور نہ ایسی ہو کہ وہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو یوں اس کا ترجمہ ہوگا وہ گائے ایسی ذلول نہ ہو کہ زمین گہتی ہے اور نہ ایسی ہو کہ کھیت کو سیراب کرتی ہو'' لاتسقی الارض '' میں جو لا ہے وہ لاذلول کے اندر جو لا ہے اس کی تاکید ہے ایسی ذلول نہ ہو جو گہتی ہو زمین کو اور نہ ایسی ہو کہ وہ سیراب کرتی ہو زمین کو اثارۃ الارض زمین کو گہنا، اور'' لاتسقی الارض'' کھیت کو سیراب کرنا۔

مسلمۃ، بے عیب ہو اس میں کسی قسم کا عیب نہ ہو، لاشیۃ فیھا بے داغ ہو اس میں کسی قسم کا داغ نہ ہو لاشیۃ کہتے ہیں ایک رنگ کے خلاف دوسرا رنگ جو نمایاں ہو جائے اس کو شیہ کہتے ہیں، اگر وہ ساری سفید تھی اس میں ایک سیاہ داغ آ گیا وہ شیہ ہے ساری زرد ہو اور اس میں تھوڑی سی سفیدی آ گئی یہ شیہ ہے لاشیۃ فیھا اس میں کوئی داغ نہ ہو مسلمۃ بے عیب ہو لاشیۃ فیھا اور اس میں کوئی کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

''قالوا الئٰن جئت بالحق ''اب آپ نے ٹھیک بات کی ہے'' الئٰن جئت بالحق ''حق سے یہاں مراد ہے کہ واقعے کے مطابق بالکل ٹھیک بات، حقیقت اب ہمارے سامنے واضح ہوگئی۔

''فذبحوھا'' پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا۔

''وما کادوا یفعلون'' اور قریب نہیں تھا کہ وہ یہ کام کرتے۔

نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح ہے :

سلسلہ واقعات کا چلا آرہا ہے اور اس ایک آیت کو چھوڑ کر جو رکوع کی ابتدائی آیت ہے۔

''واذاخذنا میثاقکم'' سے پھر وہی واقعات ہیں یہ درمیان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک قانون کی وضاحت کی ہے اور اس قانون کا حاصل یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ یہ اپنے آپ کو انبیاء علیہم السلام کی اولاد سمجھنے کی وجہ سے بے جامفاخرت میں مشغول تھے اور یہ کہتے تھے چونکہ ہمارے بڑے اللہ کے مقبول تھے اللہ کے نبی تھے ہم جو کچھ بھی کریں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں یہ جو صاحبزادگی کا زعم تھا یہ ان کے لیے سرکشی کا باعث بنا ہوا تھا۔

''نحن ابناء الله واحباءہ'' یہ نعرہ ان کا اسی صاحب زادگی کی بناء پر تھا کہ ہم اللہ کے بیٹوں کی طرح ہیں اللہ کے محبوب ہیں۔

جس طرح سے کوئی شخص اپنے بیٹے کو اپنے محبوب کو عذاب نہیں دیا کرتا ہے اس طرح سے اللہ تعالیٰ ہمیں بھی عذاب نہیں دے گا اور اگر ہم اپنی غلطیوں کی بناء پر جہنم میں چلے بھی گئے۔

''لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ'' ایسے ہی چند گنتی کے دنوں کے لیے جائیں گے پھر واپس آجائیں گے یہ ان کو زعم تھا، یہود اپنے یہود ہونے کے اوپر نازاں تھے اور نصاریٰ اپنے نصرانی ہونے کے اوپر نازاں تھے اللہ تعالیٰ نے یہاں وضاحت کے ساتھ اعلان کر دیا ان واقعات کے ضمن میں کہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی فرقہ کی فرقہ ہونے کی حیثیت سے کوئی قدر نہیں ہے چاہے وہ اپنے آپ کو مؤمن کہلوائے، مسلمان کہلوائے اور چاہے کوئی یہودی ہو، چاہے کوئی نصرانی ہو، چاہے کوئی صابی ہو، فرقہ ہونے کی طور پر کوئی فرقہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت ہے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے اگر مسلمان کہلوانے والے بدکردار ہیں اور ان کا ایمان صحیح نہیں ہے تو ان کا مسلمان کہلوانا نجات کے لیے کافی نہیں ہے، اگر اپنے آپ کو یہودی کہلوانے والے بدکردار ہیں اور ان کے عقیدے صحیح نہیں ہیں تو یہودی ہونا یہ کوئی باعث کمال نہیں ہے، اور اپنے آپ کو نصرانی کہلوانے والے اگر عقیدہ صحیح نہیں رکھتے اور نیک عمل نہیں کرتے تو نصرانی ہونا ان کے کوئی کام نہیں آئے گا، اور صابی کہلوانے والے اگر کوئی عقیدہ صحیح نہیں رکھتے یا ایمان اور اعمال صالحہ کا ارتکاب کرنے والے نہیں ہیں تو صابی کہلوانا ان کے کوئی کام نہیں آئے گا۔

چاہے کوئی اپنے آپ کو صابی کہلوائے، ان عنوانات کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت نہیں ہوتی جس طرح سے تم اپنے فرقے پر اور اپنی اس گروہ بندی کے اوپر ناز کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر تو ایمان اور عمل صالح کی ہے لہٰذا جس کے پاس بھی ایمان اور عمل صالح کی دولت ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا اور آخر میں چھوٹ جائے گا۔

ماننے اور نہ ماننے والوں کے لئے قانون ایک ہی ہے :

اور جو ''الذین آمنوا '' کا مصداق ہیں یقیناً وہ ایمان اور عمل صالح کی دولت سے مالا مال تھے لیکن ان کو بھی اس فہرست میں شامل کرلیا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ اللہ کے ہاں مقبول ہوں گے اپنے گروہ کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے اللہ کے ہاں مقبول ہوں گے۔

اب اس طرح سے ہم لوگ مسلمان کہلاتے ہیں اور کتنی آبادی ہے کروڑوں کے حساب سے جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتی ہے لیکن عقیدے خراب عمل تباہ اب اگر وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے گروہ میں شامل سمجھتے ہیں تو مسلمان کہلانے سے اور اس گروہ میں شامل ہونے سے ان کو کیا فائدہ ہوگا اور آخر میں کیا چھوٹیں گے؟ ان عنوانات سے کوئی فرق نہیں پڑتا دیکھنا یہ ہے کہ ایمان صحیح کس کے پاس ہے اور عمل صالح کس کے پاس ہے لہٰذا ان عنوانات کو اختیار کر کے تم اس فخر کو چھوڑ دو، اور ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرو جو متعین ہیں اس وقت سرور کائنات ﷺ کی اتباع میں اور اللہ کی اس بھیجی ہوئی کتاب کی اتباع میں، ان عنوانات کے اوپر ناز کرنا اور ان ناموں کے اوپر ناز کرنا یہ بالکل بے سود ہے اور ان کے ساتھ کچھ نہیں ہوگا جب ایمان اور عمل صالح کی دولت نہیں ہوگی۔

تو مؤمنین کو بھی ساتھ شامل کرلیا گیا جس طرح سے یوں کوئی اعلان کرے کہ کوئی مخالف ہو کوئی موافق ہو ہمیں نہیں پرواہ جو ہمارے قانون کی پابندی کرے گا ہم تو اس پر نوازش کریں گے جو قانون کی پابندی نہیں کرے گا وہ رگڑے میں آجائے گا چاہے وہ ہمارا موافق ہے چاہے ہمارا مخالف ہے موافق تو ہوتا ہی وہی ہے جو قانون کی پابندی کرے لیکن یہ مخالف کے بارے میں اس بات کو پختہ کرنے کے لیے ساتھ موافق کا ذکر بھی کردیا جاتا ہے بات اسی انداز سے ہوتی ہے کہ کوئی ہمارا فرمانبردار ہو کوئی ہمارا نافرمان ہو ہمیں اس کی پرواہ نہیں جو ہمارے بتائے ہوئے قاعدے کی پابندی کرے گا ہم تو اس پر خوش ہیں۔

اب اصل میں تنبیہ تو نافرمانوں کو کرنی مقصود ہے لیکن فرمانبردار کا ذکر ساتھ اس لیے کردیا جاتا ہے کہ ان پر اگر ہماری عنایت ہوگی تو اس وجہ سے ہوگی کہ وہ ہمارے قاعدے کے پابند ہیں اسی طرح سے ان گروہوں کی فہرست میں مؤمنوں کا ذکر بھی کردیا حالانکہ مومن تو قاعدے کے پابند تھے لیکن بات میں قوت پیدا کرنے کے لیے زور پیدا کرنے کے لیے کہہ دیا کہ یہ جو مؤمن کہلاتے ہیں یہ ہوں یا دوسرے فرقے ہوں ہم نے آخرت میں پرکھنا ایمان اور عمل صالح پر ہے جس کے پاس ایمان اور عمل صالح ہوگا ہمارے ہاں وہ مقبول ہے نجات پاجائے گا جس کے پاس یہ دولت نہیں ہے وہ ہمارے ہاں مقبول نہیں ہے۔

اب یہود اگر ایمان اور عمل صالح اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے اتباع کتاب ضروری ہے نصرانی اگر ایمان اور عمل صالح کی دولت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے بھی اسی کتاب کی اتباع ضروری ہے اور صابئین اگر ایمان اور عمل صالح اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ان کو حضور ﷺ پر ایمان لا کر اس قانون کی پابندی کرنی چاہیے یہ اس قانون کی وضاحت ہے واقعات درمیان میں اس لیے ذکر کر دیے کہ یہود اور نصاریٰ یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے لیے مقبول ہونے کا کوئی راستہ نہیں رہا یا وہ ان عنوانات کے اوپر فخر نہ کرتے رہیں یہ حاصل ہے اس پہلی آیت کا جو رکوع کی ابتداء کے اندر ہے آگے پھر وہی واقعات کا سلسلہ شروع ہوا۔

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور یہودی ہوئے اور نصرانی جو عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کا دعویٰ رکھتے ہیں اور صابئین جو بھی ایمان لائے گا اللہ کے ساتھ اور یوم آخرت کے ساتھ اور نیک عمل کرے گا پس ان کے لیے اجر ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ خوفزدہ ہوں گے مطلب ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے کیونکہ ''لاخوف علیھم ولاھم یحزنون'' یہ زندگی جنت میں جا کر نصیب ہوگی۔

اسلام کو قبول کرنے کے بعد انکار کرنا بغاوت ہے :

''واذاخذنا میثاقکم ورفعنا فوقکم الطور'' اس میں آگے جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کا ذکر آپ کے سامنے ضمناً پہلے ہوا تھا کہ وہ ستر آدمی جو کوہ طور سے آئے تھے اور انہوں نے آکر اپنی قوم کے سامنے ذکر کیا کہ واقعی یہ کتاب تو اللہ کی ہے لیکن ہمیں کہہ دیا ہے کہ اگر تمہیں کوئی حکم مشکل معلوم ہو تو اس کو بے شک چھوڑ دیا کرو یہ درمیان میں انہوں نے تحریف کر دی تھی تو جس کے بعد قوم کی قوم اپنے فاسد مزاج کی بناء پر شرارت پر اتر آئی جب یہ پابندی احکام کی خوانخواہ ان کو مشکل معلوم ہونے لگی ویسے بھی تورات میں بمقابلہ ہماری شریعت کے کچھ سختی تھی اب انہوں نے اجتماعی طور پر کہہ دیا کہ یہ کتاب تو بہت مشکل ہے اس پر ہم سے تو عمل ہو نہیں سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ پہلے تو شوق کے ساتھ مطالبہ کر کے کتاب لی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی صورت میں کتاب پر ایمان لائے اور ایمان لے آنے کے بعد پھر جانا یہ ارتداد کہلاتا ہے کوئی کافر ہو ایمان لائے یا نہ لائے اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، مسلمانوں کی سلطنت میں کافر، کافر ہوتے ہوئے رہ سکتا ہے جیسے فقہ میں ذمیوں کا باب ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ کافر شرارت نہ کرے مسلمانوں کے ساتھ مطیع ہو کر رہنا چاہے تو اپنے کفر کے دین پر رہ سکتا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ کافر کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمان ہو۔

اس لیے مملکت اسلامیہ میں کافر کے رہنے کی گنجائش ہے لیکن ایک شخص مسلمان ہو جاتا ہے کلمہ پڑھ لیتا

ہے کلمہ پڑھنے کے بعد، ہماری جماعت میں شامل ہونے کے بعد اب بھاگنا چاہتا ہے کفر کی طرف جاتا ہے یہ ارتداد ہے یہ ایسے ہے جیسے کہ کسی حاکم کی رعایا کا کوئی فرد باغی ہوجائے باغی کو کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جاسکتا، مخالف کو برداشت کرسکتے ہیں باغی کو برداشت نہیں کرسکتے کافر مخالف ہے اور مرتد باغی ہے باغی کی سزا قتل ہے اور باغی جس حالت میں بھی ہو اس کی سزا گولی ہے، یہی وجہ ہے کہ مرتد کو نہیں چھوڑا جاتا اس کو صرف تین دن کی مہلت دی جاتی ہے کہ باز آجاؤ جو تمہارے شک وشبہات ہیں ان کو دور کروالو ہم سے دلائل سے بحث کرلو اور اگر تم اڑے ہوئے ہو اور باز آنے والے نہیں تو روئے زمین پر تمہارے لیے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں، تین دن کے بعد اس کو قتل کردیا جاتا ہے۔

''من بدل دینہ فاقتلوہ'' (مشکوۃ ۳۰۷) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا اور اسی پر خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم سے لے کر اس وقت تک امت قائم ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے مرتد زندہ نہیں رہ سکتا اس کو آپ جبر نہیں کہہ سکتے کیونکہ دین کا قبول کرنا اختیاری ہے، قبول کرنے کے بعد اس سے نکلنے کی اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مثال سے وضاحت :

حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ مثالیں دینے میں اور مثالوں کے ساتھ بات کے سمجھانے میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، مثال کے ساتھ بات کی وضاحت کرنے میں ان کو بہت مہارت حاصل تھی، اسی مسئلے کو ایک دفعہ ذکر کررہے تھے کہ دیکھو تم کسی لڑکی کو نکاح کا پیغام دیتے ہو جس وقت نکاح کا پیغام دیتے ہو اس وقت اس کو اختیار ہے کہ وہ قبول کرے یا نہ کرے تم زبردستی تو اس کے اوپر نکاح مسلط نہیں کرسکتے جب وہ تمہارے نکاح میں آگئی اور جس وقت تمہاری بیوی بن کر تمہارے گھر میں ایک دفعہ گھس گئی اب وہ نکلنا چاہے تو اس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لو کہ اب کہاں جارہی ہے، اب اگر اس کو اس طرح سے گھسیٹ لیں تو اخلاقی اور قانونی ہر طرح سے جواز ہے، اور جس وقت تک اس نے نکاح قبول نہیں کیا آپ اس کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاسکتے۔

لیکن جب اس نے ایک دفعہ قبول کرلیا اور بیوی بن گئی، بیوی بننے کے بعد اب اگر وہ بھاگنا چاہے تو اب بھاگنے نہ دو بے شک اس کو بالوں سے پکڑلو، اب تمہیں حق پہنچتا ہے کہتے ہیں بالکل اسی طرح سے ہے کہ کوئی ایمان نہ لائے بڑی خوشی سے نہ لائے ہم اس کو مجبور نہیں کرتے وہ ملک میں زندہ رہ سکتا ہے، ملک میں ذمی بن کر رہ سکتا ہے، اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرسکتا ہے لیکن اگر ایک دفعہ وہ آگیا اب اس کو نکلنے کی اجازت نہیں ہے نکلے گا

تو بغاوت ہے اب اس کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ اب اپنے اس عہد کے اوپر قائم رہو جو تم نے اسلام قبول کر کے کیا ہے اس لیے مرتد باغی ہے اور اس باغی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

بنی اسرائیل کی بغاوت اور اللہ کی طرف سے تنبیہ :

تو یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد اور تورات قبول کر لینے کے بعد اب انہوں نے جان چھڑانے کی کوشش کی تو اب درجہ ہے ارتداد کا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ایسے حالات طاری کیے جس کے بعد ان کو مجبور کر کے اس راستے پر لایا گیا، ان کے اوپر کوئی اس قسم کی مشکل مسلط ہوگئی جیسے قضاء معلق ہے اور انہیں کہا گیا کہ بندے بن جاؤ ابھی پہاڑ گرا کر تمہیں پیس کر رکھ دیا جائے گا جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس کو مضبوطی سے تھام لو، ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں کے ساتھ اور کمزور ارادوں کے ساتھ کتاب کو نہ پکڑو، مضبوطی کے ساتھ عزم وہمت کے ساتھ اس کتاب کو لو اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اس کو یاد رکھو اور پہاڑ اوپر معلق کر کے اپنی شان جلال کا مظاہرہ کر دیا کہ تم ایسے نہ سمجھو کہ تم نے عہد معاہدہ کسی کمزور کے ساتھ کیا ہے کہ جب چاہا مان لیا جب چاہا انکار کر دیا۔

جس کے ساتھ تم نے عہد معاہدہ کیا ہے وہ ایسی طاقتوں والا ہے کہ اگر چاہے تو جیسے دو چکی کے پاٹوں کے درمیان دانے پیس دیئے جاتے ہیں تم بھی اسی طرح پیس کر رکھ دیئے جاؤ گے اس طرح سے یہ ان کے اوپر مظاہرہ کیا گیا تو تب سیدھے ہوئے اور ان کے دماغ ٹھکانے پر آئے کہ ٹھیک ہے جی ہم اس کے اوپر عمل کریں گے لیکن پھر جس وقت دوبارہ کوئی موقع ملا پھر روگردانی کر گئے، یہ تو اس قوم کی فطرت تھی کہ ڈنڈا سر پر دیکھتے تھے تو ہوش ذرا ٹھکانے پر آجاتے تھے اور جہاں ذرا سا معاملہ نرمی میں آجاتا پھر یہ بگڑ جاتے ان کی بگڑی ہوئی فطرت کا یہ حال تھا کیونکہ فرعونیوں کے ہاں مار کھا کھا کر وہ کام کرتے تھے تو اس لیے مار کھانے کی عادت پڑ گئی اب اگر ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا جائے تو وہ سیدھے نہ ہوتے۔

یہ کسی گدھے کو تم دیکھ لو کمہار کے ڈنڈے کے سامنے تو اس طرح شرافت کے ساتھ چلتا ہے کہ ایک کمہار چالیس گدھے سنبھال لے گا اور وہ ان کے اوپر اینٹیں لادتے ہیں جس کے اوپر اینٹیں لاد دی جاتیں ہیں وہ آگے کو چلا جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آگے آجاتا ہے اور جب تک اس کی طرف سے چلنے کا حکم نہیں ہوتا سارے وہیں بوجھ اٹھا کر کھڑے رہیں گے اور جب اس کی طرف سے حکم ہوگا چلیں گے اور وہ ایک دفعہ راستہ دکھا دے گا سیدھے اس گھر پہنچیں گے جہاں اینٹیں گرانی ہیں اور وہاں اینٹیں گرا کر سیدھے وہاں جائیں گے جہاں سے اینٹیں اٹھائی تھیں اور تم سے ایک گدھا نہیں سنبھالا جائے گا یعنی اس کے پیچھے لگ جاؤ اور اس کو کہو کہ سیدھا ہو کر چل لیکن وہ سیدھا نہیں جائے گا کبھی ادھر کو بھاگے گا کبھی ادھر بھاگے گا۔

وجہ کیا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں وہ کمہار والا ڈنڈا نہیں ہے اور یہ قوم ایسی ہے کہ بغیر ڈنڈے کے سیدھی نہیں ہوتی، تو اسی طرح جب کسی کو عادت پڑ جائے کہ ہمیشہ مار کھا کر سیدھا ہوا کرتا ہے تو نرمی کا اس کے اوپر اثر نہیں ہوا کرتا جب بھی اس کو نرم آدمی سے واسطہ پڑے گا وہ اسی طرح سے کبھی بائیں بھاگے گا کبھی دائیں بھاگے گا سیدھے راستے پر کبھی نہیں جائے گا اور جہاں پیچھے سے ڈنڈا دیا وہ بالکل سیدھا ہو جائے گا تو اسرائیلی فرعونیوں کے پاس چونکہ اسی طرح ذلیل ہوتے ہوئے مار کھاتے ہوئے کام کرنے کے عادی ہو گئے تھے جب ان کو ڈرایا دھمکایا جاتا تو ان کی فطرت سیدھی ہو جاتی اور جہاں ذرا نرمی آتی پھر بگڑ جاتے ان سارے واقعات کے اندر ان کا یہ مزاج اچھی طرح سے نمایاں ہے یاد کیجیے جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور تمہارے اوپر طور کو اٹھایا کہا ہم نے پکڑو اس چیز کو مضبوطی کے ساتھ جو ہم نے تم کو دی ہے۔

مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا مطلب ہے کہ مضبوط ہاتھوں اور مضبوط ارادے کے ساتھ اس کتاب کو تھامو ڈھیلے ڈھالے ارادے کے ساتھ اس کتاب پر عمل نہیں ہوگا یاد رکھو ان باتوں کو جو اس میں ہیں تا کہ تم اللہ کے غضب سے بچ جاؤ تا کہ تم متقی ہو جاؤ اس واقعہ کے بعد تم نے پھر پیٹھ پھیر لی۔

"فلولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ" اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی، یہ اس کا فضل ورحمت ہے کہ تمہاری اتنی سرکشی کے بعد پھر تمہیں اتنی مہلت دیتا ہے ورنہ تمہارا یہ کردار اس قسم کا ہے کہ تمہیں فوراً تباہ کر دیا جائے اور اس دنیا کے اندر تمہیں باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے یہ اس کا فضل ورحمت ہے کہ اس نے تمہیں مہلت دے دی، پھر تمہیں سنبھلنے کا موقع دے دیا اگر یہ فضل ورحمت نہ ہوتی تو البتہ تم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاتے۔

بنی اسرائیل کا ہفتہ کے دن کے بارے میں تجاوز کرنا اور بندر بننا :

"ولقد علمتم الذین اعتدو امنکم فی السبت" البتہ تحقیق جان لیا تم نے ان لوگوں کو جنہوں نے ہفتہ کے بارے میں تجاوز کیا تم میں سے۔

اس میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے یہ واقعہ سورۃ اعراف میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے کا قصہ ہے، ایک بستی تھی جس کو حاضرۃ البحر کے ساتھ قرآن نے ذکر کیا، سمندر کے کنارے پر ایک بستی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ہفتہ کا دن معظم تھا اور اس کی تعظیم اس طریقے سے تھی کہ یہ دن بالکل عبادت کے لیے رکھا جائے اس میں شکار وغیرہ یا دوسرے معاشی مشاغل اختیار نہ کیے جائیں۔

یہ لوگ سمندر کے کنارے پر آباد تھے اور ان کی معاشیات کا زیادہ تر تعلق مچھلی پکڑنے کے ساتھ تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمائش میں ڈال دیا کہ ہفتہ کے روز مچھلی اس کثرت کے ساتھ آتی پانی کے اوپر تیرتی ہوئی اچھلتی ہوئی نظر آتی اور ہفتہ کے علاوہ باقی دنوں میں اس کی اتنی آمد نہ ہوتی، اب یہ قوم ویسے ہی حیلہ جو تھی جب انہوں نے دیکھا کہ ہفتہ کے روز تو مچھلی بہت ملتی ہے اور دنوں میں اتنی نہیں ملتی تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے کے لیے ان لوگوں نے مختلف حیلے بہانے شروع کر دیے۔

ابتداء ابتداء میں حیلہ یہ کیا کہ سمندر کے کناروں پر تالاب بنا لیے، گڑھے کھود لیے ہفتہ کے دن اس میں پانی چھوڑ دیتے مچھلی ادھر آجاتی تو ان کے منہ بند کر دیتے تو مچھلی ادھر گھیرے میں آجاتی یا کوئی مچھلی پکڑتے اور اس کی دم میں رسی ڈال کر اس کو پانی میں چھوڑ دیتے گویا کہ شکار نہیں کیا جب ہفتے کا دن گزر جاتا پھر اس کو کھینچ کر اپنے کام میں لے آتے اس طرح انہوں نے گویا کہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم اپنے مفاد کو بھی حاصل کر لیں اور اللہ کے حکم کی بھی خلاف ورزی نہ ہو۔

یہ حیلہ حکم شریعت کے لیے ابطال تھا، حکم کی خلاف ورزی ہوئی حکم تو تھا کہ یکسو ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگے رہو اور دیگر مشاغل اختیار نہ کرو انہوں نے اپنے لیے اس طرح سے مصروفیات پیدا کر لیں تو ابتداء ابتداء میں اس طرح حیلہ کرتے تھے پھر آہستہ آہستہ گناہ پر جرأت ہوگئی، شکار کرنے لگ گئے۔

اس بستی میں تین قسم کے لوگ ہو گئے، ایک شکار کرنے والے، دوسرے وہ جنہوں نے ابتداء میں ان کو سمجھایا انہوں نے انکار کیا بعد میں خاموشی اختیار کر لی کہ جب یہ مانتے نہیں ہیں تو ہم کیا کریں اور ایک طبقہ تھا جو آخری وقت تک ان کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا، وعظ و نصیحت کرتا رہا لیکن وہ باز نہ آئے۔

یہ جو شکار کرنے والے تھے ان کے متعلق قرآن کریم میں ذکر کر دیا گیا کہ یہ بندر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے اور جو منع کرنے والے تھے ان کی نجات کا ذکر ہے اور جو خاموش تھے ان کے ذکر سے قرآن خاموش ہے لیکن ظاہر یہی ہے وہ بھی نجات پانے والوں میں سے تھے لیکن اتنے قابل تعریف نہیں تھے جتنے وہ لوگ قابل تعریف تھے جو آخری وقت تک سمجھانے کے لیے کوشش کرتے رہے یہ تفصیل آپ کے سامنے سورۃ اعراف میں آئے گی۔

ان واقعات کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ یہ یاد دلاتے ہیں کہ ان لوگوں کو تم جانتے ہو، وہ تمہیں معلوم ہی ہیں تمہاری قوم کا ایک حصہ تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے کے لیے مختلف قسم کے حیلے کیے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل بندر بنا دیا، اور پھر یہ واقعہ لوگوں کے لیے نکال اور موعظة بن گیا، گناہ گاروں کے لیے گناہ سے روکنے والی چیز بنا اس اعتبار سے وہ نکال ہے اور نیکوں کے لیے مزید اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی ترغیب کا ذریعہ بنا اس اعتبار سے یہ واقعہ موعظہ ہے۔

ان کو یاد دلانا اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے توڑنے میں تم لوگوں نے حیلے کیے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح عذاب آیا، اپنے ان تاریخی واقعات کو یاد رکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو اب بھی اگر باز نہیں آ ؤ گے اور اسی طرح حیلے بہانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی وہ قدرتیں اب بھی باقی ہیں اور اسی طرح سے تمہیں اب بھی عذاب میں مبتلاء کر سکتا ہے۔

البتہ تحقیق کہ جان لیا تم نے ان لوگوں کو یعنی تمہیں وہ لوگ معلوم ہیں، تمہارے علم میں ہیں، جنہوں نے تم میں سے حد سے تجاوز کیا ہفتہ کے بارے میں، پس ہم نے ان کو کہہ دیا یہ کہنا تکوینی ہے، کُنْ فَیَکُوْنُ اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی یہ حکم تشریعی نہیں ہے کہ تم اپنے اختیار کے ساتھ کرو یا نہ کرو ہماری طرف سے حکم یہ ہے جس طرح سے اللہ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا کہ نماز پڑھو لیکن یہ حکم تشریعی ہے اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو سزا ہوگی لیکن جو تکوینی احکام ہوا کرتے ہیں اس میں کائنات مسخر ہے اس کی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی جیسے اللہ تعالیٰ کسی کو کہہ دے مر جا تو وہ فوراً مر جائے گا یہ نہیں کہ اب اختیار ہے مرے یا نہ مرے اس طرح سے یہ کونوا حکم تکوینی ہے، بندر ہو جاؤ اور کن ہو جا اور اس کے ساتھ فیکون واقعہ فوراً پیش آ جاتا ہے، جب اللہ کی طرف سے کہہ دیا گیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ وہ ہو گئے۔

”فجعلنها“ ہم نے اس واقعہ کو بنا دیا عبرت، گناہوں سے روکنے والی چیز، ان لوگوں کے لیے جو اس واقعہ کے سامنے ہیں یعنی اس زمانے میں موجود تھے اور ان لوگوں کے لیے جو کہ اس واقعہ سے پیچھے ہیں یعنی بعد میں آنے والے اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہم نے اس کو موعظہ بنا دیا وعظ، نصیحت بنا دیا جس سے ان کو نیکی کی طرف زیادہ ترغیب ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف زیادہ رغبت ہو۔

ذبح بقرۃ کا حکم اور بنی اسرائیل کا طرز عمل :

”واذقال موسیٰ لقومه ان الله یامرکم ان تذبحوا بقرۃ “اس میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس واقعہ کا ابتدائی حصہ اگلے رکوع کے شروع میں آئے گا دو حصوں میں یہ واقعہ ہے، قصہ یہ ہوا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص قتل ہو گیا قاتل معلوم نہیں تھا، جب اس قسم کا واقعہ پیش آ جائے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا اور قاتل معلوم نہیں تو ہمیشہ لوگ ایک دوسرے پر الزام دھرا کرتے ہیں ایک دوسرے کے متعلق شبہات پیدا ہو جاتے ہیں کہ فلاں نے قتل کیا ہوگا وہ کہے گا نہیں انہوں نے قتل کیا ہوگا، جن کے متعلق یہ شبہ کیا گیا کہ قتل انہوں نے کیا وہ لوٹ کر بات دوسروں پر ڈالیں گے، ہمیں کیا کہتے ہو، ہو سکتا ہے تم ہی نے قتل کیا ہو ایک دوسرے پر بات ڈالنا یہ پیش آ جایا کرتا ہے جس وقت کہ مجرم

کا پتہ نہ چلے ہر کسی کا ذہن دوسرے کی طرف جاتا ہے اور وہ بات کو اپنے سے ٹال کر کسی اور کی طرف پھینکنا چاہتا ہے یہ ہے وہ تدارء کی کیفیت جس کو قرآن کریم ذکر کرے گا۔

'' واذقتلتم نفساً فادّٰرء تم فیھا '' کہ ایک نفس کو تم نے قتل کیا تھا پھر تم اس نفس کے بارے میں ایک دوسرے پر بات ڈالنے لگ گئے یہ تدارء کی کیفیت ہے اور جب یہ قصہ ہو جائے کہ قاتل معلوم نہیں اور ہر ایک دوسرے پر شبہ کر رہا ہے اور جس پر شبہ کیا جا رہا ہے وہ ڈالتا ہے دوسرے پر ایسے موقع پر اندیشہ ہوا کرتا ہے کہ ساری قوم، سارا قبیلہ افراتفری میں مبتلاء ہو کر کہیں خانہ جنگی میں مبتلا نہ ہو جائے۔

ایک دوسرے پر جب بات ڈالیں گے تو ایک دوسرے کے متعلق بدگمانی ہو گی تو یقینی طور پر آپس میں خانہ جنگی ہو سکتی ہے آخر وہ اسرائیلی تھوڑے سے تو نہیں تھے جو ایک جگہ آباد تھے بارہ قبیلے تھے جیسے تفصیل آپ کے سامنے آ گئی۔

اب اگر ان میں قتل واقع ہو جائے اور آپس میں بدگمانی ہو کسی وقت بھی جھگڑے کی صورت اختیار ہو سکتی ہے خانہ جنگی ہو سکتی ہے قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس واقعے کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ یا اللہ کوئی قاتل کا سراغ لگا دیا جائے ہمیں کوئی قاعدہ قانون ایسا بتا دیا جائے کہ جس کے ذریعے سے ہم قاتل کو پہچان لیں کم از کم یہ قبائلی جنگ جو آپس میں ہونے والی ہے، خانہ جنگی کے جو اندیشے پیدا ہو گئے یہ تو ٹل جائیں، ایک دوسرے پر بدگمانی کی بناء پر افراتفری ہو گئی ہر ایک دوسرے کا دشمن معلوم ہوتا ہے، ہر ایک دوسرے پر بدگمان معلوم ہوتا ہے، یہ واقعہ ایک فتنہ کی صورت اختیار کر گیا اس کے ازالے کے لیے ہمیں کوئی قاعدہ قانون بتا دیا جائے جس سے ہم پہچان لیں کہ قاتل فلاں ہے۔

جب مجرم متعین ہو جائے گا تو کم از کم باقی لوگوں کی ایک دوسرے پر بدگمانی باقی نہیں رہے گی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ ایک گائے لے کر ذبح کرو اور اس گائے کا ایک ٹکڑا لے کر اس مقتول کو لگا دو، مقتول کی لاش کے ساتھ اس کو مَس کر دو تو وہ مقتول زندہ ہو جائے گا اور زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دے گا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے یہ تلقین ہوئی۔

باقی اس میں کیا مصلحت ہے کہ گائے کو ذبح کیا جائے، پھر اس میں کیا مصلحت ہے کہ گائے کے ٹکڑے کو اس قتیل کے ساتھ مس کیا جائے تو وہ قتیل زندہ ہو گا یہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی مصلحت اللہ جانتا ہے یا اللہ کا رسول سمجھتا ہو گا۔

بہر حال کسی وجہ سے گائے ان کے ہاں محترم تھی تو اس کو ذبح کروانا اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کے دل میں جو گائے کا احترام ہے وہ نکل جائے جس طرح سے ان کے اندر جو شرک کے جذبات ہیں یہ بچھڑے کو پوجنا وغیرہ اور فرعونیوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے گائے کی عظمت ان کے قلب میں ہے وہ ختم ہو جائے گی یا جو بھی حکمت اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی اسی حکمت کے تحت یہ حکم دیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم قوم کے سامنے ذکر کر دیا، اگر اب وہ قوم اللہ اور رسول پر صحیح طریقے سے ایمان رکھتی اور اللہ کے رسول کی عظمت ان کے دل میں ہوتی تو بلا چوں چراں اس کو تسلیم کر لیتے اسی وقت ایک گائے لیتے جس طرح سے ہمیں حکم ہے کہ قربانی کے طور پر ایک گائے ذبح کرو تو ہم ایک متوسط گائے لیتے ہیں گائے لے کر اللہ کے نام پر ذبح کر دیتے ہیں پھر وہ سفید رنگ کی لے لیتے، سیاہ رنگ کی لے لیتے، بڑی عمر کی لے لیتے کیسی لے لیتے وہ ذبح کرتے ان کا مقصد حل ہو جاتا کوئی کسی قسم کی پیچیدگی پیش نہ آتی اس حکم کے سامنے آجانے کے بعد کوئی متوسط قسم کی گائے لے لیتے ذبح کر دیتے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔

لیکن جب ان کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت ہے ہی نہیں وہ ہر بات کو اپنی عقل پر پرکھتے ہیں اور اللہ کے رسول کی بات کو عام انسان کی بات کی طرح سمجھتے ہوئے اس کے اندر شبہات نکالنا حیلے کرنا یہ ان لوگوں کی فطرت تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے ذکر کیا تو کہنے لگے موسیٰ! ہم تو تجھ سے قاتل پوچھتے ہیں کہ تو اس قتیل کا قاتل بتا تو کہتا ہے کہ گائے ذبح کرو قاتل کا پتہ چل جائے گا یہ کیا مذاق بنایا ہوا ہے یہ کوئی جوڑ ہے دونوں باتوں کا کہ ہم قاتل پوچھتے ہیں کہ اس قتیل کا قاتل کون ہے اور آپ کہتے ہیں کہ گائے ذبح کرو اور گائے کے ذبح کرنے کے ساتھ قاتل کا پتہ چل جائے گا۔

یہ ہم سے مذاق کر رہے ہو یہ کوئی تک کی بات ہے آپ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں کیا؟ ہم کچھ کہہ رہے ہیں اور آپ کچھ کہہ رہے ہیں، اب یہ بات تب ہی کہی جاتی ہے نا جب اللہ کے رسول کی عظمت ہی نہیں ہے، اللہ کے رسول کا مقام ہی ذہن میں نہیں ہے جب ایک اللہ کا رسول اللہ کی طرف نسبت کر کے ایک بات کہتا ہے تو اس میں شک و شبہ کی گنجائش کیسے ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے بات غلط کہنا کہ اللہ یوں کہتا ہے یہ تو بالکل جاہلوں کا کام ہے اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ تو جاہلوں کا طریقہ ہے غلط بات اللہ کی طرف منسوب کر کے کہہ دی جائے اور اللہ کے احکام میں ہنسی مذاق کو داخل کر لیا جائے یہ تو جاہلوں کا طریقہ ہے میں جاہل نہیں ہوں میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔

جاہل کا مطلب یہاں یہ ہوگا کہ غیر سنجیدہ آدمی بے وقعت آدمی جس کے اندر حلم، بردباری سنجیدگی نہ ہو

یہاں جاہل کا یہ مفہوم ہے رسول انتہائی سنجیدہ ہوتا ہے انتہائی باوقار ہوتا ہے، انتہائی متحمل مزاج ہوتا ہے، وہ جو بات کہے گا باوقار طریقے سے کہے گا، سنجیدہ کہے گا اور اس کی بات کے اندر کوئی استہزا کا پہلو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اندر بالکل نہیں ہوا کرتا، اللہ کے احکام ذکر کرتے ہوئے اس طرح سے مذاق اور ٹھٹھے کو شامل کر لینا یہ جاہلوں کا کام ہے نبی جاہلوں جیسی حرکتیں نہیں کیا کرتا، اس طرح سے موسیٰ علیہ السلام نے یہ تو ثابت کر دیا کہ واقعی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

لیکن پھر وہی بداعتمادی وہ کہتے ہیں کہ قاتل کی تحقیق کے لیے جو گائے ذبح کرنی ہے آخر وہ گائے بھی پتہ نہیں خاص قسم کی ہوگی؟ یہ سارے کے سارے قصے بداعتمادی سے پیدا ہو رہے ہیں ورنہ جس وقت ان کو پتہ چل گیا کہ واقعی حکم اللہ کی طرف سے ہے تو وہی بات ہے کہ گائے لیں اور ذبح کر دیں اب وہ اس جستجو میں پڑ گئے وہی شکی مزاج وہمی مزاج کہ گائے کیسی ہوگی کہ جس کے ذبح کرنے کے ساتھ قاتل کی تحقیق ہو جائے گی تو سوال کر دیا کہ وہ گائے کیسی ہو، ہمیں بتا دو اب سوالات وہ جو کر رہے ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سوالات کرنے کے نتیجے میں ان پر زیادہ پابندیاں لگتی چلی جا رہی ہیں جس کی خلاف ورزی کرنے کے نتیجے میں اللہ کا حکم ادا نہیں ہوگا جیسے جیسے وہ صراحت کرواتے ہیں ویسے ویسے پابندیاں ان پر زیادہ لگتی چلی جا رہی ہیں ایک لڑکے سے استاد یہ کہہ دے کہ جاؤ بھائی باہر بیٹھ کر سبق یاد کرو اور وہ چپ کر کے کتاب اٹھا کر باہر جا کر اس برآمدے میں بیٹھ جائے، اس برآمدے میں بیٹھ جائے، درخت کے نیچے بیٹھ جائے، مسجد میں جا کر بیٹھ جائے اس میں بہت وسعت ہے، اتنا حکم سننے کے بعد کتاب لے کر وہ باہر نکل گیا اور کہیں بیٹھ جائے، اب وہ پوچھتا ہے جی کہ میں مسجد میں بیٹھوں یا درخت کے نیچے، استاد کہہ دے گا کہ درخت کے نیچے بیٹھو، اب مسجد میں جانے کی گنجائش نہیں رہی۔

پھر کہتا ہے کہ میں سبق کھڑا ہو کر یاد کروں یا بیٹھ کر، استاد کہہ دے کہ کھڑے ہو کر، اب بیٹھنے کی گنجائش نہیں رہی جس طرح سے صراحت ہوتی چلی جائے گی اسی طرح سے پابندیاں زیادہ لگتی چلی جائیں گی۔

اب ایک آدمی کو کہا جائے کہ بازار جاؤ اور جلدی آ جانا اب جلدی کا مفہوم کیا ہے کہ جائے اور اطمینان سے کام کر کے آ جائے پندرہ منٹ میں آ جائے بیس منٹ میں آدھے گھنٹے میں آ جائے اس لفظ میں وسعت ہے وہ کہے کہ بتا دیں کہ کتنے منٹ تک واپس آ جاؤں تو کہہ دیا جائے کہ دس منٹ تک واپس آ جاؤ اب اگر وہ دس منٹ تک واپس نہیں آئے گا تو مجرم ہے ان سوالات کے نتیجے میں جتنی اور پر صراحت ہوتی چلی جائے گی اتنی ہی پابندیاں زیادہ لگتی چلی جائیں گی اب اگر وہ یہ سوال نہ کرتے اور انہیں ''لافارض ولابکر'' کی صراحت نہ کی جاتی تو بڑی عمر کی گائے لے کر ذبح کر دیتے تو بھی ٹھیک تھی کوئی چھوٹی عمر کی لے کر ذبح کر دیتے تو بھی ٹھیک تھی، کہا کہ گائے کیسی ہو

تو پہلی دفعہ صراحت ہوگئی کہ نہ بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچی ہو متوسط عمر کی ہو، ایک پابندی لگ گئی، اس پر کفایت کرتے تو بھی بات بن جاتی، پھر کہتے ہیں کہ بتادو کہ اس کا رنگ کیسا ہو، اب جتنے بھی گائے کے رنگ ہوسکتے ہیں سارے ہی اختیار کرنے کی گنجائش تھی لیکن اب صراحت ہوگئی کہ پیلے رنگ کی ہو اور گہرے قسم کا اس کا رنگ ہو جو دیکھنے والوں کو اچھی لگے اب یہ ایک قید اور بڑھ گئی، آگے تیسرا سوال جو کیا اس کے جواب میں کہہ دیا گیا کہ اس میں کوئی کسی قسم کا عیب نہ ہو کوئی کسی قسم کا اس میں داغ نہ ہو اور کسی کام میں نہ لگائی گئی ہو، نہ ہل میں جوتی گئی ہو اور نہ پانی کھینچنے پر لگائی گئی ہو اس قسم کی گائے ہو۔

دیکھو پابندیاں در پابندیاں لگتی جارہی ہیں آخر اس قسم کی گائے کو تلاش کیا گیا، محنت ومشقت کے ساتھ تلاش کیا گیا، بہت زیادہ سرمایہ خرچ کرکے اس کو تلاش کیا گیا پھر اس کو ذبح کیا گیا تو اس طرح اس حکم پر عمل کرنے کی نوبت آئی، اس واقعہ کو یہاں ذکر کرکے ان کے اس قومی مزاج کی نشاندہی کرنی مقصود ہے کہ یہ کسی بیان کرنے والے پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ اپنے شکی مزاج کے تحت، اپنے وہمی مزاج کے تحت شبہات پیدا کرکے اپنے لیے خود مشکلات پیدا کرتے ہیں اور پھر اس گائے کے ذبح ہونے کے بعد اس قاتل کی تحقیق کیسے ہوئی، اس کا ذکر اگلے رکوع میں آرہا ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ذبح کرو ایک گائے، بقرہ کا اطلاق مذکر مؤنث دونوں پر ہوتا ہے وہ کہنے لگے کہ کیا آپ ہمیں ٹھٹھہ کرتے ہیں، ھُزُواً مَھْزُواً کے معنی میں ہے کہ آپ بناتے ہیں ہمیں ایسا جس کے ساتھ مذاق کیا ہوا ہوتا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہوجاؤں، وہ کہنے لگے پکار ہمارے لیے اپنے رب کو انداز ان کا یہی ہے ہمیشہ جیسے رب کے ساتھ ان کا اپنا تعلق کوئی نہیں، ہمارے لیے اپنے رب کو پکار کہ واضح کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو، موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ بے شک وہ گائے ایسی ہو۔

''انھا'' ھا ضمیر اس بقرہ کی طرف لوٹ رہی ہے جس کو ذبح کرنا مقصود ہے وہ ایسی گائے ہو نہ بوڑھی ہو نہ بالکل چھوٹی عمر کی تو ان دونوں عمروں کے درمیان میں متوسط ہو پھر موسیٰ علیہ السلام نے تاکید کی کہ کرو اس کام کو جس کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے بہت زیادہ چوں چراں کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں جیسے کہا جارہا ہے ویسے کرلو وہ کہنے لگے کہ ہمارے لیے دعا کیجئے بلائیں ہمارے لیے اپنے رب کو کہ واضح کرے ہمارے لیے کہ اس کا رنگ کیسا ہو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بے شک اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ گائے ہو زرد رنگ کی۔

''فاقِعٌ لونھا'' جس کا رنگ خوب گہرا ہو۔

''تسر النظرین '' دیکھنے والوں کو وہ خوش کر دے، وہ کہنے لگے کہ دعا کر اپنے رب سے کہ وہ واضح کرے ہمارے لیے کہ وہ گائے کیسی ہو؟ یہ وہی پہلا سوال ہے جو انہوں نے اس وقت کیا تھا مطلب یہ تھا کہ اس کی کچھ اور وضاحت کر دیجئے۔

''ان البقرۃ تشبہ علینا'' بے شک گائے ہم پر متشابہ ہوگئی ہم اس کو ابھی پوری طرح سے پہچان نہیں سکے اس کے پہچاننے میں کوئی شبہ سارہ گیا، ذرا کچھ اور وضاحت کر دیجئے۔

''وانا ان شاء اللہ لمھتدون'' اور ہم بے شک اگر اللہ نے چاہا تو ہدایت پانے والے ہیں یعنی لمھتدون کا یہاں معنی ہے'' اھتداء الی معرفت البقرۃ'' کہ کچھ اور تھوڑی سی وضاحت ہو جائے تو پھر ہم مطلوبہ گائے کے پہچاننے کی طرف راہ پا جائیں گے پھر ہمیں اچھی طرح سے پتہ چل جائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بے شک وہ اللہ کہتا ہے کہ گائے ایسی ہو کہ وہ کام میں لگائی ہوئی نہ ہو۔

''لاذلول'' کام میں لگائی ہوئی نہ ہو کہ کھیتی ہو وہ زمین کو اور نہ وہ ایسے کام میں لگائی ہوئی ہو کہ وہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو، ذلول مذللہ کام میں لگائی ہوئی اس سے محنت نہ کروائی جاتی ہو وہ گائے ایسی نہ ہو جس سے کام لیا جاتا ہو، گائے بیل دونوں چونکہ اس کا مصداق ہوتے ہیں بیل وغیرہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ ہل سے جوت لیا جائے اگر مذکر مراد لیا جائے ایسا نہ ہو کہ جس کو ہل پر جوتا گیا ہو، وہ ایسا نہ ہو کہ اس کو کنویں پر جوتا گیا ہو کھیتی کو سیراب کرنے اور زمین کو کھینے کے لیے استعمال نہ کیا گیا ہو مسلمۃ بے عیب ہو''لاشیۃ فیھا'' اس میں کوئی کسی قسم کا نقص اور عیب نہ ہو۔
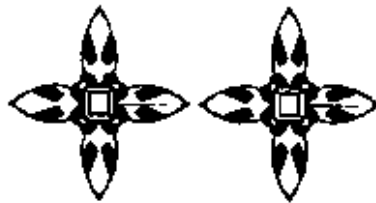
وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ

یاد کیجئے جب تم نے ایک جان کو قتل کردیا پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر ڈالنے لگے اور اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس کو ظاہر

تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ

فرمائے جس کو تم چھپا رہے ہو ﴿۷۲﴾ پس ہم نے حکم دیا کہ اس کا ایک حصہ اس میں مارو ، ایسے ہی اللہ تعالیٰ زندہ فرماتا ہے

الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ

مردوں کو اور دکھلاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں تاکہ تم عقل سے کام لو ﴿۷۳﴾ پھر تمہارے دل سخت ہوئے

مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ

اس کے بعد سو وہ ایسے ہوگئے جیسے پتھر ہوں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور بے شک ان میں سے بعض

الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ

پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور بے شک ان میں بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں پھر نکلتا ہے

مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا

ان سے پانی اور بے شک ان میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ

ان کاموں سے بے خبر نہیں جن کو تم کرتے ہو ﴿۷۴﴾ کیا تم لوگ یہ امید رکھتے ہو کہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ

اور حال یہ ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو اللہ کا کلام سنتے رہے ہیں پھر اس میں تحریف کرتے رہے ہیں

مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

بعد اس کے کہ وہ اس کو سمجھتے تھے اور جانتے تھے ﴿۷۵﴾ اور جب ملاقات کرتے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے

قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ

تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب آپس میں ایک دوسرے کے پاس تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان کو وہ چیزیں بتاتے ہو

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا

جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں تاکہ یہ لوگ ان کے ذریعے اللہ کے پاس حجت میں تم کو مغلوب کر دیں کیا تم

تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا

سمجھ نہیں رکھتے ہو ﴿۷۶﴾ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو

يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ

کچھ ظاہر کرتے ہیں ﴿۷۷﴾ اور ان میں ایسے لوگ ہیں جو ان پڑھ ہیں کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے آرزوؤں کے

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ

اور وہ لوگ صرف گمانوں میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۷۸﴾ سو بڑی خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب کو لکھتے

بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ

ہیں اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعے خرید لیں

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ

تھوڑی سی قیمت سو بڑی ہلاکت ہے ان کے لیے بوجہ اس کے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا ہے، اور بڑی ہلاکت ہے

مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ

ان کے لیے اس کی وجہ سے جسے وہ کسب کرتے ہیں ﴿۷۹﴾ اور انہوں نے کہا کہ ہم کو ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن گنتی کے

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ

آپ فرما دیجیے کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد لے لیا ہے سو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف نہ کرے گا یا اللہ کے ذمہ

اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً

ایسی بات لگا رہے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے ﴿۸۰﴾ ہاں جس نے گناہ کیا

وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

اور اس کے گناہ نے اس کو گھیر لیا تو ایسے لوگ دوزخ والے ہیں وہ

فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ
اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۸۱﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾
یہ لوگ جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۸۲﴾

لغوی وصرفی تحقیق:

''واذ قتلتم نفساً فادٰرء تم فیھا'' یاد کیجئے جس وقت تم نے قتل کیا ایک نفس کو، فادٰرء تم فیھا پھر تم اس نفس کے بارے میں بات ایک دوسرے پر ڈالنے لگ گئے، مادہ اس لفظ کا دَرَءَ ہے دَرَءَ یَدْرَءُ دفع کرنا قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے۔

''فادرؤا عن انفسکم الموت ان کنتم صٰدقین'' اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو دور ہٹا کر دکھاؤ اور اِدّٰرَءَ اصل میں تھا تَـدَارَءَ تا کو دال کر کے دال کو دال میں ادغام کیا ہوا ہے، ایک دوسرے کی طرف دفع کرنا۔

ایک شخص کہتا تھا تم نے قتل کیا دوسرا کہتا تھا نہیں تم نے قتل کیا اس طرح سے ایک دوسرے پر بات ڈالنے لگ گئے جیسے ایک جرم پیش آ گیا مجرم کا پتہ نہیں ایک دوسرے پر بات یوں ڈالی جایا کرتی ہے ایک دوسرے پر شبہ کرتے ہوئے یوں کہا جاتا ہے، ایک گروہ نے دوسرے پر بات ڈال دی اس نے اس پر ڈال دی تدارء کا یہی معنی ہے۔

تدارء بعد میں تا کو دال کر کے دال کو دال میں ادغام کیا تو اِثَّـقَـلَ کی طرح اِدّٰرء پر باب اِفّعال بن گیا، فادّٰرء تم فیھا تم اس کے بارے میں ایک دوسرے پر ڈالنے لگ گئے۔

''واللہ مخرج ما کنتم تکتمون'' اور اللہ نکالنے والا ہے اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے، نکالنے والا مراد اس سے ظاہر کرنے والا ہے۔

''فقلنا اضربوہُ ببعضھا'' پھر ہم نے کہا۔

''اضربوہ ببعضھا'' اضربوہ کی ہ ضمیر تو اس قتیل کی طرف لوٹ رہی ہے بظاہر تو لوٹے گی نفس کی

طرف کیونکہ لفظ نفس عربی میں مؤنث استعمال ہوتا ہے، اس لیے اس کو قتیل کی تاویل میں کر کے ہ ضمیر ادھر لوٹا دیں گے، ببعضھا کی ھا ضمیر بقرہ کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا ذکر پچھلے رکوع میں آیا۔

پھر ہم نے کہا کہ تم مارو اس قتیل کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ یعنی گائے کا بعض حصہ لے کر اس قتیل کو لگا دو مارنے سے مطلب یہ کہ اس طرح سے اس کو لگا دو۔

''کذلك یحی الله الموتیٰ'' یہ لفظ دلالت کرتے ہیں کہ پیچھے ایک بات محذوف ہے کہ پھر تم نے ایسا کیا ہم نے اس قتیل کو زندہ کر دیا۔

کذلك یحی الله الموتیٰ اسی طرح سے زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ مُردوں کو، موتیٰ میت کی جمع۔

''ویریکم اٰیٰتہٖ'' اور دکھاتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں۔

''لعلکم تعقلون'' تاکہ تم سمجھو۔

''ثم قست قلوبکم'' ثم اثبات کے لیے ہے پھر تمہارے دل سخت ہو گئے یعنی اتنا کچھ دیکھنے کے بعد پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔

''من بعد ذلك فھی کالحجارۃ'' پس وہ دل پتھر کی طرح ہے۔

''او اشد قسوۃ'' یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ازروئے قساوت کے۔

''وان من الحجارۃ لما یتفجر منه الانھار'' بے شک پتھروں میں سے بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ البتہ پھوٹتی ہیں اس سے نہریں، انہار نہر کی جمع ہے اور یتفجر پھوٹنا۔

''وان منھا لما یشقق'' اور بے شک پتھروں میں سے بعض پتھر وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں۔

''فیخرج منه الماء'' اور پھر اس سے پانی ٹپکتا ہے، پانی نکلتا ہے۔

ماء چونکہ لفظوں میں مفرد ہے اس لیے منه کی ضمیر اور یشقق کی ضمیر یہ مفرد لوٹ رہی ہے ترجمہ اگر جمع کے ساتھ کر دیا جائے تو عین موقع محل کے مطابق ہے کیونکہ کسی ایک پتھر کا ذکر نہیں ہے، پتھروں میں سے بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں پھر ان میں سے پانی نکلتا ہے۔

''وان منھا لما یھبط من خشیة الله'' اور بے شک پتھروں میں سے بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو گر پڑتے ہیں اللہ کے خوف سے ھَبَطَ ھبوط اوپر سے نیچے کو اتر آنا۔

''اھبطوا مصراً'' پیچھے یہ لفظ آیا تھا۔

''وما الله بغافل عما تعملون'' اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

''افتطمعون ان یومنوا لکم '' تطمعون یہ خطاب اہل ایمان کو ہے اور فاء سے پہلے اگر اس کا معطوف علیہ نکالنا ہو تو عبارت یوں نکل آئے گی'' اتسمعون احوالھم فتطمعون ان یومنوا لکم '' اے ایمان والو! تم ان یہودیوں کا حال سنتے ہو پھر امید رکھتے ہو کہ یہ تمہارے کہنے کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے۔

'' ان یومنوالکم '' ان یومنوا لاجل دعوتکم کہ تم انہیں دعوت دو گے ایمان کی اور یہ تمہاری دعوت کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے تم امید رکھتے ہو، ان کا حال بھی سن رہے ہو کہ یہ کیسے لوگ ہیں، کس قسم کے دھوکے باز، دنیادار قسم کے لوگ ہیں ان کا حال سننے کے بعد پھر تم امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے لاجل دعوتکم جب لام کا ترجمہ یوں کر دیا لاجل دعوتکم تو اس ایمان سے ایمان شرعی مقصود ہے کہ اللہ پر اللہ کے رسول پر قرآن پر ایمان لائیں گے تمہاری دعوت کی وجہ سے اور اگر ایمان سے لغوی مفہوم مراد لے لیا جائے تو ترجمہ یوں بھی کر سکتے ہیں کیا تم پھر امید رکھتے ہو کہ یہ یقین کر لیں گے تمہاری باتوں کا۔

''وقد کان فریق منھم یسمعون کلام اللہ'' حالانکہ ان میں سے ایک گروہ تھا جو اللہ کی کلام کو سنتے تھے،

''ثم یحرفونہ'' پھر اس کو بدل دیتے تھے، حرف کا معنی ہوتا ہے کہ صحیح مفہوم سے بات کو ہٹا دینا کسی حرف کو گرا دیا حذف کر دیا جس سے بات بگڑ گئی، کوئی محذوف نکال لیا اس محذوف کے نکالنے سے بات بگڑ گئی یا لفظ کے معنی میں تاویل غلط کر لی، کوئی حقیقت مجاز کا قصہ چھیڑ کر مفہوم خراب کر دیا تو باتیں سب اس طرح سے ہوتی ہیں۔

''پھر وہ بدلتے تھے اللہ کی کلام کو''۔

'' من بعد ماعقلوہ''اس کو سمجھنے کے بعد ما عقلوہ میں ما مصدریہ ہے اس کو سمجھ لینے کے بعد اس بات کو بدل دیتے تھے۔

''وھم یعلمون'' حالانکہ وہ جانتے تھے، حالانکہ وہ صاحب علم تھے۔

''واذالقواالذین امنوا''یہ لفظ پہلے گذر گیا آپ کے سامنے یہ لَقُوْا اصل میں لَقِیُوْا تھا جس وقت ملتے ہیں یہ لوگ ایمان والوں کو۔

''قالوا امنا'' کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔

'' واذاخلابعضھم الی بعض ''اور جب تنہائی میں چلا جاتا ہے ان کا بعض بعض کی طرف، خلا خلوت سے ہے، جب تنہائی میں چلا جاتا ہے ان کا بعض بعض کی طرف قالوا تو کہتے ہیں۔

''اتحدثونھم بمافتح اللہ علیکم '' کیا بیان کرتے ہو تم ان ایمان والوں کے سامنے، تحدثون یہ بعض یہودی دوسروں کو کہتے ہیں کیا بیان کرتے ہو تم اہل ایمان کے سامنے۔

''بمافتح اللہ علیکم ''وہ باتیں جو اللہ نے تم پر کھول دی ہیں؟۔

" لیحاجو کم بہ" لیحاجو کم کے اندر لام لامِ عاقبت ہے تمہاری اس تحدیث کا انجام یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم پر غالب آ جائیں گے یحاجو کم بہٖ انہی باتوں کے ذریعے سے " مافتح الله علیکم " جو تم ان پر جا کر بیان کرتے ہو ان کی وجہ سے وہ لوگ غالب آ جائیں تم پر اللہ کے سامنے۔

'' افلاتعقلون '' کیا تم سوچتے نہیں ہو۔

'' اولایعلمون ان الله یعلم مایسرون ومایعلنون '' کیا وہ لوگ جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اس چیز کو جس کو وہ چھپاتے ہیں اور جس چیز کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔

'' ومنهم امیون '' امیون یہ جمع ہے اُمی کی یہ لفظ ام کی طرف منسوب ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

'' لایعلمون شیئا '' نہیں جانتے کسی شئی کو، لکھنا نہیں سیکھا، پڑھنا نہیں سیکھا کوئی اور اس قسم کے کام نہیں سیکھے جیسے ماں کے بطن سے آئے تھے ویسے کے ویسے ہی رہے تو یہ ان پڑھ کے معنی میں ہے۔

پہلے ذکر تھا یہودیوں کے اہل علم کا، پہلے جیسے هم یعلمون آیا اور یہاں ذکر ہے ان پڑھ جاہل قسم کے لوگوں کا۔

'' منهم امیون '' ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں جاہل ہیں۔

'' لایعلمون الکتاب الاامانی '' نہیں مانتے وہ کتاب کو، کتاب کا علم نہیں رکھتے، کتاب سے مراد تورات ہے یہ کتاب کا علم نہیں رکھتے الاامانی امانی اُمْنِیة کی جمع ہے اُمْنِیة کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے اس خواہش کو جو انسان اپنے دل کے اندر بنالیتا ہے، خیالی پلاؤ پکاتا ہے میں ایسا ہوں، یوں ہو جائے گا اس طرح سے خیالات جو پکا لیے جاتے ہیں خیالی پلاؤ ان کو امانی کہا جاتا ہے اگر ان کا علم ہے کتاب کے متعلق تو اتنا ہی ہے کہ وہ بھی اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

'' وان هم الایظنون '' نہیں ہیں مگر وہ خیالات کرتے ہیں، اپنے دل و دماغ میں خیالات بناتے رہتے ہیں باقی کتاب کے متعلق ان کو کوئی علم نہیں۔

'' فویل للذین یکتبون الکتب بایدیهم '' پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو لکھتے ہیں کتاب کو اپنے ہاتھوں کے ساتھ، کتاب سے یہاں مکتوب لکھی ہوئی بات مراد ہے جس طرح سے مفتی فتویٰ لکھا کرتا ہے تو وہ فتویٰ کتاب کا مصداق ہے، جو لوگ اپنے ہاتھوں کے ساتھ کچھ باتیں لکھ لیتے ہیں۔

'' ثم یقولون هذا من عندالله '' پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہیں۔

''لیشتروابہٖ ثمناقلیلا'' تاکہ اس لکھی ہوئی بات سے حاصل کرلیں ثمن قلیل، ثمن قلیل سے دنیا کا مال ومتاع مراد ہے، اپنے ہاتھوں سے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خودساختہ بات ہوتی ہے اور خودساختہ بات لکھنے کے بعد اس کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کردیتے ہیں اور اپنی ان باتوں کو جو خود گھڑتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کردیتے ہیں دنیا کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں تاکہ حاصل کرلیں اس کے ذریعے سے ثمن قلیل۔

''فویل لھم مما کتبت ایدیھم'' پس خرابی ہے ان کے لیے اس بات کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور خرابی ہے ان کے لیے اس چیز کے سبب سے جو انہوں نے کمائی۔

دوہری خرابی ہوگئی لکھنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا یہ مستقل خرابی کا باعث ہے چاہے اس کے اوپر پیسے لیں یا نہ لیں اور اگر لکھنے کے بعد پھر انہوں نے اس کو کمائی کا ذریعہ بھی بنالیا تو جو مال انہوں نے کمایا ہے وہ مال ان کے لیے مستقل بربادی کا باعث ہے جھوٹ موٹ لکھنا شریعت کی بات اور اللہ کی طرف منسوب کردینا یہ مستقل خرابی اور اس کے ذریعے سے پھر جو مال کمایا وہ مستقل بربادی کا ذریعہ۔

''وقالوا'' اور یہ لوگ کہتے ہیں۔

''لن تمسنا النار الاایامامعدودۃ'' ہرگز نہیں چھوئے گی ہمیں آگ مگر چند گنتی کے دن، ایاما معدودۃ چند گنتی کے دن، قل آپ کہہ دیجیے، فرمادیجیے، ان سے پوچھ لیجیے، قل کا اطلاق اسی مفہوم میں ہوتا ہے۔

''اتخذتم عنداللہ عھدا'' اتخذتم اصل میں تھا أَاِتَّخَذْتم پہلا ہمزہ استفہام ہے اور دوسرا ہمزہ وصل تھا جو ہمزہ استفہام کے داخل ہونے کی وجہ سے گرگیا اتخذتم کیا تم نے لیا ہے اللہ سے کوئی عہد، تم نے اختیار کیا ہے اللہ کے پاس کوئی وعدہ۔

''فلن یخلف اللہ عھدہٗ'' پھر ہرگز خلاف نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے، تم نے اس سلسلے میں اللہ سے وعدہ لے لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عہد کے خلاف نہیں کرے گا۔

''ام تقولون علی اللہ مالا تعلمون'' یا تم بولتے ہو اللہ پر ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کچھ علم نہیں، بے علمی کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرتے ہو یا بولتے ہو تم اللہ پر ایسی باتیں جو تم جانتے نہیں،

''بلیٰ'' کیوں نہیں تمہیں آگ لگے گی۔

''من کسب سیئۃً'' جو کوئی شخص برائی کرے، جو کوئی برائی کمائے۔

''واحاطت بہ خطیئتہ ''اس کے خطیئہ، اس کے گناہ اس کا احاطہ کرلیں، گھیر لیں کہ اس کے اندر خیراور نیکی کی بات باقی نہیں رہی۔

''فاؤلئك اصحٰب النار ''یہی لوگ جہنم والے ہیں۔

''ھم فیھا خٰلدون''اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

''والذین امنوا وعملوا الصلحٰت ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔

''اولئك اصحٰب الجنۃ''یہی جنت والے ہیں۔

''ھم فیھا خٰلدون''اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

گذشتہ سبق کا تتمہ :

رکوع کی ابتدائی آیات اس واقعہ کا ابتدائی حصہ ہیں جس کا ذکر پچھلے رکوع کی آخری آیات میں گزرا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو گائے ذبح کرنے کے لیے کہا تھا تو یہ کہنے کی کیا وجہ تھی؟ اس واقعہ کی طرف اس رکوع کی ابتدائی آیات میں اشارہ ہے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اسرائیلیوں میں ایک قتل ہو گیا قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا اور جس وقت قاتل کا پتہ نہ چلے تو لوگ ایک دوسرے پر تہمتیں لگاتے ہیں، بدگمانیاں کرتے ہیں، ہر کوئی دوسرے کے اوپر بات ڈالنے کی کوشش کرتا ہے کہ فلاں نے قتل کیا ہوگا نہیں جی فلاں نے قتل کیا ہوگا، اس قسم کے حالات پیدا ہو گئے اور اندیشہ تھا کہ بدگمانیوں کی وجہ سے یہی قتل آپس میں خانہ جنگی کا باعث نہ بن جائے کہ مختلف لوگ ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نہ نکال لیں کہ تو مجھے کیوں کہتا ہے، میرا نام کیوں بتاتا ہے وہ کہتا کہ تو نے مارا ہے وہ کہتا ہے کہ تو نے مارا ہے اس طرح سے آپس میں لڑائی جھگڑا ہو جائے گا اور بنی اسرائیل آپس میں خانہ جنگی کے اندر مبتلا ہو جائیں گے یہ ایک قتل فتنے کا باعث ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان حالات کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ قاتل کی پہچان کے لیے کوئی طریقہ بتا دیا جائے، قاتل ظاہر ہو جائے تاکہ یہ خانہ جنگی کی کیفیت ختم ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اگرچہ براہ راست وحی کے ذریعے سے بھی اطلاع دے سکتے تھے کہ فلاں قاتل ہے اور بغیر کسی قسم کی تدبیر اختیار کرنے کے اس مقتول کو زندہ کر دیا جاتا اور مقتول بتا دیتا کہ میرا قاتل فلاں ہے اللہ کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں لیکن اپنی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انہیں کہو کہ گائے ذبح کریں گائے ذبح کرنے کے

بعد اس کا ایک ٹکڑا لے کر اس قتیل کے ساتھ لگا دیں تو وہ قتیل زندہ ہو جائے گا اور زندہ ہونے کے بعد وہ اپنا قاتل بتا دے گا کیونکہ یہ سارے کا سارا کام معجزہ کے طور پر ہونے والا تھا اس لیے اکیلے مقتول کا بیان قاتل کی شناخت میں حجت سمجھا گیا ورنہ اگر ایک آدمی کہہ دے کہ مجھے فلاں نے مارا ہے وہ کافی نہیں ہوتا لیکن یہاں جو کچھ پیش آ رہا تھا وہ معجزۂ پیش آ رہا تھا اس لیے سب کو یقین تھا کہ قتیل زندہ ہونے کے بعد جس کا نام لے گا وہ صحیح بتائے گا تو ان کو جو حکم دیا گیا انہوں نے اس حکم کے مقابلے میں حیل وحجت اور مختلف قسم کی بہانہ بازی کی وہ پچھلی آیات میں پہلے آ چکیں ہیں جدل وبحث کے بعد لیکن کر کرا کر انہوں نے گائے ذبح کر لی۔

جب گائے ذبح کر لی تو اسی تدبیر کے ساتھ ایک ٹکڑے کو جس وقت قتیل کے ساتھ لگایا گیا تو وہ قتیل زندہ ہو گیا تو زندہ ہو کر اس نے اپنا قاتل بتا دیا تو معلوم ہو گیا کہ وہ قاتل اس قتیل کا بھتیجا تھا اور اس قتیل کی لڑکی سے اس نے نسبت کا مطالبہ کیا تھا کہ اس کی شادی مجھ سے کر دو اور اس نے انکار کیا اس انکار کرنے کی وجہ سے اس نے اس کو قتل کر دیا۔

عورتوں کے فتنوں سے ہوشیار رہو :

اس لیے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا اپنی امت کو تلقین کرتے ہوئے کہ عورتوں کے فتنوں سے ہمیشہ بچ کر رہنا بنی اسرائیل میں جو سب سے پہلے فتنہ پیش آیا تھا وہ عورت کے سبب سے ہی تھا یہی نکاح کی باتیں اور عورتیں حاصل کرنا آج بھی اگر آپ اخبارات اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ زیادہ تر جھگڑوں کی باعث ایسی باتیں ہی ہوتی ہیں تو بنی اسرائیل میں جو پہلا فتنہ پیش آیا تھا وہ اسی عورت کے سبب سے تھا وہ قتیل زندہ ہوا اس نے زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دیا اس قاتل کے سامنے آ جانے کے بعد وہ خانہ جنگی کی کیفیت اور ایک دوسرے پر بات ڈالنے کی وجہ سے جو آپس میں بدگمانیاں بڑھ رہیں تھیں اور اندیشہ تھا کہ یہ کہیں کسی بڑی لڑائی کا پیش خیمہ نہ ہو جائے وہ کیفیت ختم ہو گئی تو یہ اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا احسان تھا کہ بنی اسرائیل کو اس پیچیدگی سے نکال دیا۔

بعث بعد الموت کی دلیل :

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی یہ عادت مبارکہ ہے کہ جس وقت ایک بات بیان کرتے ہیں درمیان میں اگر اس واقعے سے کوئی جدید فائدہ حاصل کیا جا سکے تو فوراً اس کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں، اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے بعث بعد الموت مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھایا جانے کا، ہم سب مریں گے مرنے کے

بعد پھر ایک وقت آئے گا کہ ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور زندہ کر کے ہماری تمام زندگی کا محاسبہ کیا جائے گا یہ اسلام کے بنیادی عقیدوں میں سے ہے آخرت کا عقیدہ جیسے کہ ابتدائی آیتوں میں سامنے آ گیا تھا کہ ''بالاخرۃ ھم یوقنون'' تین عقیدے بنیادی ہیں ① توحید ② رسالت ③ معاد

بعث بعد الموت کا عقیدہ وہی ہے معاد والا کہ اللہ تعالیٰ لوٹائے گا ہمیں زندگی کی طرف اور مشرکین جس طرح توحید کا انکار کرتے تھے تو توحید کے ساتھ ساتھ ان کو معاد پر بھی بے انتہاء اشکالات تھے۔

''من یحی العظام وھی رمیم'' ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو ان کو زندہ کون کرے گا، جسم ہڈیاں ہو جائیں گے چورا چورا ہو جائیں گے، تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے اس قسم کے اشکالات آگے قرآن کریم کی مختلف آیات میں مشرکین کی طرف سے ذکر کیے گئے ہیں اب یہاں چونکہ ان لوگوں کے سامنے واقعہ پیش آیا کہ ایک آدمی مرا قتل کر دیا گیا اور مرنے کے بعد اس کو لوگوں کے سامنے زندہ کیا گیا اس نے اپنا قاتل بتایا قاتل بتانے کے بعد پھر اس پر دوبارہ موت کی کیفیت طاری ہو گئی۔

یہ ایک نمونہ پیش آ گیا واقعہ پیش آ گیا اس واقعہ کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمادیا کہ دیکھو جس طرح ہم نے اس مردے کو زندہ کر کے دکھایا ہے سارے کے سارے مردے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے ہی زندہ کریں گے اور یہ سب اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تم اسی سے سمجھ جاؤ کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے دیکھو ہم نے زندہ کر کے دکھا دیا، یہ واقعہ چونکہ پیش آیا تھا یہ پہلو تھا وعظ ونصیحت کا تو اس کو بھی نمایاں کر دیا گیا کہ '' کذالك یحی اللہ الموتیٰ'' اللہ تعالیٰ مردوں کو ایسے زندہ کرے گا۔

اسرائیلیوں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں :

اس واقعہ کو گویا کہ نظر بنالیا گیا آخرت کے عقیدے کی اور اس کے ساتھ ہی تلقین کر دی گئی کہ جیسے یہ موت کے بعد زندہ ہوا تو باقی انسان بھی موت کے بعد زندہ کیے جائیں گے درمیان میں بات اس طرح سے آ گئی اب بنی اسرائیلیوں کو چاہیے تھا کہ اللہ کی قدرت کے اتنے نمونوں کو دیکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار ہوتے، اور ایسے واقعات دیکھنے کے بعد انسان کے قلب میں رقت پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے انسان ڈرتا ہے، رقت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرتے ہوئے انسان اللہ سے ڈرے اور قساوت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معصیت کا ارتکاب کرے اور دل کے اندر کوئی ندامت کوئی پریشانی محسوس نہ ہو تو کہتے ہیں فلاں شخص کے دل

میں بہت قساوت ہے بڑا شقی القلب انسان ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ برائی کرتے ہوئے اس کی طبیعت میں کوئی جھجک پیدا نہیں ہوتی اور اس کے دل میں کوئی تاثر نہیں آتا نیکی کا اس کے دل میں شوق نہیں اور فلاں بڑا رقیق القلب ہے رقت کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ نیکی کا شوق ہے اور برائی کرتے ہوئے انسان کے قلب کے اندر پریشانی کی کیفیت آئے۔

بات بات پر رونے لگ جائے یہ کوئی رقت کی علامت نہیں ہوتی یا کسی واقعہ کو دیکھ کر رونا نہ آنا یہ قساوت کی علامت نہیں کہ فلاں کا دل بڑا سخت ہے جیسا بھی واقعہ پیش آ جائے وہ روتا نہیں ہے یہ کوئی شرعی قساوت نہیں جس کی مذمت کی گئی ہے، قلب قاسی جس کی مذمت آتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے شرعی طور پر سخت دل اس کو نہیں کہتے۔

قساوت قلبی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کا دل اتنا سخت ہو گیا کہ اللہ کے خوف سے متاثر نہیں ہے اس لیے اس کو اگر کوئی برائی کرنی پڑ جائے اس کو گراں نہیں گزرتی اس کے دل میں کسی قسم کی پریشانی اور اس قسم کے حالات پیدا نہیں ہوتے جس کی بناء پر وہ اس برائی کو چھوڑ دے نیکی کا شوق اور برائی کا ترک یہ دونوں علامتیں ہیں رقت قلب کی اور نیکی کا شوق نہ ہونا اور برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے دل کے اندر کسی قسم کی فکر کا پیدا نہ ہونا یہ علامت ہے کہ قلب کے اندر قساوت ہے۔

اسرائیلیوں کے دل بہت قساوت کی طرف چلے گئے پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھر میں جتنی بھی سختی ہے جس مقصد کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کے وہ سختی منافی نہیں ہے باوجود اس سختی کے پھر بھی اس میں سے چشمے پھوٹتے ہیں، نہریں نکلتی ہیں اور بعضے پتھر پھٹتے ہیں تو ان میں سے پانی رستا ہے قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے، پہاڑوں میں جا کر آپ بھی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح پہاڑوں سے چشمے پھوٹتے ہیں کس طرح ان سے پانی ٹپکتا ہے باوجود اس بات کے کہ یہ انتہائی سخت ہوتے ہیں لیکن پھر بھی جس مقصد کے لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا وہ مقصود ان سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں اس قسم کا تاثر ہے کہ وہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے پانی کو جذب کرتے ہیں اور پھر اس طرح سے ٹپکاتے ہیں اور بعضے پتھر اسی طرح سے اللہ کی ہیبت اور خوف کی وجہ سے بلندی سے پستی کی طرف گر جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ہیبت کے ساتھ جیسا کہ اسرائیلیوں کے سامنے واقعہ پیش آیا کوہ طور کا کہ اللہ کی تجلی ہوئی تو اس تجلی سے متاثر ہو کر وہ پتھر بھی خاکستر ہو گیا لیکن یہ لوگ ہیں ان کے سامنے کیسے ہی واقعات ظاہر ہوتے چلے جائیں یہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، بالکل متاثر نہیں ہوتے، یہ دل کی قساوت ہے یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عدم تاثر کا شکوہ کیا کہ اتنے واقعات دیکھنے کے بعد بھی وہ متاثر نہیں ہوتے۔

''ثم قست قلوبکم'' پھر تمہارے دل سخت ہو گئے یعنی یہ واقعہ دیکھنے کے باوجود۔

''من بعد ذلك'' پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے پس وہ پتھروں کی طرح ہیں یا پتھر سے بھی سخت ہیں اور پتھروں میں سے بعض پتھروں سے البتہ پھوٹتی ہیں نہریں اور بے شک ان پتھروں میں سے بعض پھٹ جاتے ہیں نکلتا ہے ان سے پانی، اور بے شک ان پتھروں میں سے بعض پتھر وہ ہیں جو گر جاتے ہیں اللہ کے خوف سے اور نہیں اللہ بے خبر ان کاموں سے جو تم کرتے ہو یعنی پتھروں کے اندر پھر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کے تأثر ہیں کہ جس مقصد کے لیے ان کو پیدا کیا گیا وہ مقصد بھی ان سے حاصل ہے اور اتنا سا شعور ان جمادات کے اندر بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلال سے، اللہ تعالیٰ کی عظمت سے یہ متأثر ہوتے ہیں، ہمارے سامنے یہ ساری کی ساری چیزیں بے جان ہیں لیکن ان کا شعور اس درجہ کا ہے کہ جو تکوینی احکام ان سے متعلق ہیں ان کو سمجھتے ہیں اور ان کے مطابق ان کے اوپر اثر ظاہر ہوتا ہے اگر چہ ہمارے سامنے یہ بے حس بے جان ہیں۔

اللہ کے نبی کا حکم تو پتھروں نے بھی مانا ہے :

حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری نبوت سے پہلے جس وقت میں نے نبوت کا اظہار نہیں کیا تھا اس وقت بھی وہ مجھے سلام کیا کرتا تھا پتھر سے آواز آتی تھی۔

''السلام علیك یا رسول الله!'' یا اس قسم کے لفظوں کے ساتھ پتھر سے آواز آتی تھی سلام کرتا تھا پتھر، اور اُحد پہاڑ پر آپ ایک مرتبہ تھے کہ زلزلہ آیا تو آپ ﷺ نے اپنا پاؤں مبارک مار کر کہا کہ ٹھہر جا تیرے اوپر ایک نبی ہے ایک صدیق ہے دو شہید ہیں یہ سارے کے سارے واقعات اس قسم کے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجہ میں پتھر کے اندر بھی تأثر ہے اگر چہ اس درجہ کی عقل نہیں کہ اس کو احکام شرعیہ کا مکلّف کہا جا سکے لیکن اس درجہ کا شعور ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کے ساتھ متأثر ہوتا ہے اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

اہل ایمان کو تسلی اور یہود کی مکاریوں کا ذکر :

''افتطمعون ان یؤمنوا لکم '' یہ آیت مسلمانوں کو، اہل ایمان کو تسلی دینے کے لیے ہے کہ وہ بہت زیادہ فکر کرتے تھے کہ یہودی مانتے کیوں نہیں، ان کو ہر وقت فکر لگی رہتی تھی کہ کسی طرح سے یہ مان جائیں، اور جس وقت تک یہ امید اور یہ فکر لگی رہے تو قلب کے اندر پریشانی ہوتی ہے۔

ایک لڑکا بگڑا ہوا ہے میری طبیعت ادھر متوجہ ہے اور میں ہر وقت اس کو سمجھاتا ہوں جس وقت تک مجھے یہ امید لگی رہے گی کہ یہ سمجھ جائے گا میں اس کے پیچھے رہوں گا میرے دل و دماغ میں اس کے بارے میں پریشانی

رہے گی لیکن اگر ایک وقت میں مایوسی ہو جائے کہ اس کے پیچھے نہ پڑو، اس کے پیچھے لگنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ سمجھنے والا نہیں ہے، کسی صورت میں نہیں مانے گا تو یہ مایوسی کی کیفیت ایک سبب میں راحت کا باعث ہو جایا کرتی ہے اور وہ فکر اور وہ لگن کسی درجے میں ختم ہو جاتی ہے اسی طرح اہل ایمان جو ہر وقت یہود یوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے کہ ان کے شکوک وشبہات کو دور کرو جس طرح بھی ہو ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں یہ مان جائیں ایمان لے آئیں ہر وقت فکر تھی تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی کاروائیاں تو تم سن رہے ہو۔

ان کے احوال تو تمہارے سامنے ہیں کہ یہ کیسے ہوشیار لوگ ہیں، کس قسم کے فریب کار ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا کیا معاملہ ہے تو کیا ایسے لوگوں سے بھی تم امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے، جو براہ راست اللہ کی بات سن کر اس کو بھی بگاڑ دیتے ہیں تو تمہاری بات سننے کے بعد یقین لے آنا کیسے متوقع ہے؟ یہ بات کہہ کر ایک تو یہود کی مذمت بیان کرنی مقصود ہے۔

جب ایک آدمی سمجھانے والے کو کہے گا کہ بھائی چھوڑو یہ تو ایسا لُچا آدمی ہے اس نے تو یہ کیا، یہ کیا، یہ خطاب چاہے اس سمجھانے والے کو ہے کہ اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں لیکن اس سے مذمت تو اسی کی نکل رہی ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

یہاں بھی اسی طرح یہود کی مذمت بھی ہے اور اہل ایمان کو کسی درجے میں تسلی بھی وہ اس طرح ہے کہ اگر یہ سمجھتے نہیں، مانتے نہیں تو ان کی فکر نہ کرو، زیادہ ان کے پیچھے نہ پڑو یہ تو اس قسم کے چالاک لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بات براہ راست سن کر بھی اس میں گڑبڑ کر دیتے ہیں یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو ستر آدمی کوہ طور پر گئے تھے اور اللہ تعالیٰ سے تورات سنی تھی اور بعد میں آ کر لوگوں کے سامنے ذکر کر دیا تھا کہ تورات کلام تو واقعی اللہ کی ہے اتاری تو اسی نے ہے لیکن ساتھ اللہ نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو حکم مشکل معلوم ہو اس پر عمل نہ کیجئے یہ واقعہ پیچھے آیا تھا ان لفظوں میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"افتطمعون" اے اہل ایمان تم ان کے احوال سنتے ہو پھر امید رکھتے ہو کہ یہ ایمان لے آئیں گے تمہارے کہنے کی وجہ سے یا تمہاری باتوں پر یقین کر لیں گے، یہ دو ترجمے آپ کے سامنے کیے ایک ایمان لغوی کے تحت، ایک ایمان شرعی کے تحت، تمہاری دعوت کی وجہ سے تمہارے کہنے کی وجہ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے یہ تو ایمان شرعی ہے، اور یہ کہ تم امید رکھتے ہو کہ تمہاری باتوں کا یقین کر لیں گے یہ ایمان لغوی ہے، حالانکہ ان میں سے ایک فریق سنتا تھا اللہ کی کلام کو اور پھر اس کو بگاڑ دیتا تھا پھر اس کو بدل دیتا تھا تو اس کے

مفہوم سے تحریف کا یہی معنیٰ ہے اس کو سمجھ لینے کے باوجود حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اللہ کی کلام ہے اور اللہ کی کلام کو بگاڑنا اور بدلنا ٹھیک نہیں، صاحب علم ہونے کے باوجود وہ اس قسم کی حرکتیں کرتے تھے تو جس جماعت کے اہل علم اس قسم کے ہوں، وہ جان بوجھ کر اللہ کی باتوں کو بگاڑتے ہیں ان کے متعلق آپ کیسے توقع رکھیں گے کہ وہ اپنے مفاد کو ختم کر کے، اپنی خواہشات کے خلاف تمہاری بات مان لیں یہ ایسے لوگ نہیں ہیں یعنی صاحب علم لوگوں کا یہ حال ہے کہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے اللہ کی بات ہے، لیکن پھر بھی بگاڑ دیتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کی باتوں کے ساتھ صاحب علم کا یہ معاملہ ہے تو تمہاری باتوں کی ان کے نزدیک کیا اہمیت ہے اس لیے ان سے امید نہ رکھو کہ یہ ہوشیار لوگ یہ چالاک لوگ تمہارے قابو میں آجائیں گے۔

یہود کے اہل علم لوگوں کی ذہنیت :

اور پھر فریب کار ایسے ہیں کہ جب مؤمنوں کے سامنے آتے ہیں تو کہتے ہیں امنّا ہم ایمان لائے اور جب ان کا بعض بعض کی طرف خلوت میں چلا جاتا ہے تو ان الفاظ کا مطلب سمجھ لیجئے کہ ''قالوا اتحدثونھم'' جب وہ منافقت کے طور پر آگئے اہل ایمان میں، ایمان کا اظہار کرتے تو بسا اوقات اپنی صداقت ثابت کرنے کے لیے بعض باتیں جو توراۃ میں آئی ہوتیں جو سرور کائنات ﷺ کی صداقت پر دلیل بنتیں کوئی پیش گوئی ہوتی وہ اہل ایمان کے سامنے ظاہر کرتے تھے کہ ہاں تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے توراۃ میں یوں آیا ہوا ہے اس قسم کی باتیں کرتے تاکہ اہل ایمان کو یقین آجائے کہ یہ مخلص مسلمان ہیں۔

آپ اپنے معاشرے میں بھی یوں دیکھتے ہو کہ میرا ایک شخص کے ساتھ اختلاف ہے، دو کے درمیان میں لڑائی ہے ایک تیسرا آدمی حقیقت کے اعتبار سے ہے تو دوسرے فریق کا، میرے مدمقابل فریق کا ہے لیکن وہ منافقت کے طور پر میرے ساتھ دوستی کو ظاہر کرتا ہے اور آکر میری مجلس میں بیٹھتا ہے مجھ سے کچھ مفاد حاصل کرنے کے لیے تو جس وقت وہ آئے گا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں ان کے خلاف ہوں تو وہ لازماً ایسی باتیں کرے گا جس میں اس دوسرے فریق کی شکایت کا پہلو ہوگا اور جس میں اس قسم کی بات آئے گی کہ آپ حق پر ہیں وہ غلط ہے فلاں بات آپ نے کی وہ ٹھیک ہے انہوں نے جا کر اس طرح کیا، اس طرح سے جا کر کیا، وہ یہ باتیں اس لیے کرے گا کہ مجھے یہ یقین آجائے کہ واقعی یہ شخص میرے حق میں مخلص ہے اور ان کا مخالف ہے۔

جب تک اس قسم کی باتیں دوسرے فریق کے متعلق نہ کی جائیں تو یہ فریق مطمئن نہیں ہوگا کہ یہ ان کا مخالف اور میرے موافق ہے یہ تاثر دینے کے لیے انسان کو اس پارٹی کے موافق باتیں کرنی پڑتی ہیں اسی طرح

یہ یہودبھی جو اپنے کسی مقصد کے تحت مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوتے اور ظاہر کرتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو بعض باتیں آکر ذکر کردیتے کہ توراۃ میں واقعی یوں آیا قرآن کریم نے یہ بات ٹھیک کہی ہے، توراۃ میں واقعی یہ علامت موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سچے رسول ہیں اس لیے تو ہم نے اس کو جان لیا اس قسم کی باتیں کرتے تاکہ اہل ایمان کو یقین آجائے لیکن جب خلوت میں چلے جاتے تو دوسرے یہودی وہ ان کو ملامت کرتے کہ تم وہاں جا کر جو وہ باتیں بیان کرنا شروع کردیتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر کھولی ہیں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہیں جھوٹا ثابت کردیں گے، کل کو کوئی بحث ہوگئی کوئی مناظرہ ہوگیا، کسی قسم کی ان کی ساتھ جھگڑنے کی نوبت آگئی تو عند اللہ وہ تمہیں کاذب ثابت کردیں گے ان باتوں کے ذریعے سے جو تم ان کو بتاتے ہو۔

قیامت کے روز بھی الزام قائم کریں گے اللہ کے سامنے کہ ان کو معلوم تھا کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول تھے، معلوم تھا کہ یہ کتاب صحیح ہے پھر بھی انہوں نے نہیں مانا اللہ کے سامنے قیامت کے روز بھی تمہیں رسوا کریں گے اور دنیا کے اندر بھی تمہیں اللہ کے نزدیک جھوٹا ثابت کردیں گے۔

دنیا میں اللہ کے نزدیک جھوٹا ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری کتاب سے دلیل پیش کر کے کہیں گے کہ اللہ کے نزدیک بات اس طرح سے ہے تم جو کہتے ہو وہ غلط ہے یہ "عند اللہ، عند ربکم" اس کا معنی دنیا کے اندر بھی پیش آسکتا ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص اللہ کے نزدیک جھوٹا ہے کیا مطلب کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی دلیل اس کو جھوٹا ثابت کررہی ہے جب اللہ کی کتاب کی دلیل اسے جھوٹا ثابت کرے گی تو وہ شخص عند اللہ جھوٹا ہی ہوا اور قیامت کے روز بھی تم اللہ کے سامنے جھوٹے ثابت ہوجاؤ اور ان کے سامنے مغلوب ہوجاؤ ایسا بھی ہوجائے گا دنیا کے اندر کوئی مناظرہ پیش آگیا تو تب بھی تمہیں جھوٹا ثابت کریں گے تو تم یہ بے عقلی کیوں کرتے ہو گھر کی باتیں دوسروں کو جا کر کیوں بتایا کرتے ہو دوسرے وقت میں وہ تمہیں الزام دیں گے۔

اس طرح یہودی ملامت کرتے ان دوسروں کو جو سرور کائنات ﷺ کی مجلس میں جا کر یا مسلمانوں کی مجلس میں جا کر بعض باتیں ظاہر کردیتے تو یہ سارے کا سارا فریب اور یہ ساری کی ساری چالبازی اور کتمان حق ان لفظوں سے نمایاں ہے تو ان کا بعض بعض کو کہتا ہے کہ کیا تم بیان کرتے ہو ان مسلمانوں کے سامنے وہ بات جو اللہ نے تم پر کھول دی یعنی جس کا ذکر تمہاری کتاب میں آیا ہوا ہے۔

"لیحاجوکم بہ" یہ لام، لام عاقبت ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم پر غالب آجائیں گے انہی باتوں کے ذریعہ سے اللہ کے سامنے یعنی دنیا میں بھی وہ اللہ کے نزدیک جھوٹا ثابت کرسکتے ہیں اور قیامت کے روز بھی اللہ کے سامنے جھگڑے میں تم پر غالب آجائیں گے۔

"افلا تعقلون" کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے گھر کی باتیں دوسروں کو جا کر بتاتے ہو۔

اب اس طرح ایک کا دوسرے کو ملامت کرنا یہ سب ان کی فریب کاری ہے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ایسے ان کے اہل علم کے احوال ہیں پھر تم ان سے امید رکھتے ہو کہ تمہارے کہنے سے وہ اپنی خواہشات کو چھوڑ دیں گے، اپنے مفاد کو چھوڑ کر سیدھے راستے پر آجائیں گے یہ امید نہ رکھو اس لیے ان کے پیچھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

"افلا یعلمون" یہ ان کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ظاہر نہیں کرو گے اور تم ان باتوں کو چھپاؤ گے تو کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتے ہیں ان باتوں کو جو یہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور چھپی ہوئی باتیں جو اللہ کے علم میں ہیں اللہ ظاہر کردے گا تمہارا یہ جھوٹ کب تک چھپا رہے گا یہ تو اہل علم کی بات ہے، اب ان کے ان پڑھ لے لیجئے۔

"ومنهم امیون" ان یہودیوں میں سے کچھ لوگ ان پڑھ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا باعث فخر ہے:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا "النبی الامی" سورۃ اعراف میں وہاں بھی یہی معنیٰ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے نہیں ہیں جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ویسے ہی رہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اُمّی کا لقب باعث فخر ہے اور دوسرے لوگوں کو جب اُمّی کہا جاتا ہے تو ان کے لئے مذمت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فخر اس لیے ہے کہ اس میں تو کوئی شک وشبہ ہی نہیں رہا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اور آپ کے بیان کیے ہوئے حقائق اور معارف کے سامنے بڑے بڑے عقلمند عاجز آگئے اور دنیا نے متفق علیہ طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بڑا عقلمند، بہت بڑا علم والا اور بہت بڑے حقائق ظاہر کرنے والا مان لیا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کے علوم ظاہر فرمائے ان علوم کے بارے میں کسی کو کوئی شک شبہ نہیں ہے، ایک شخص نے پڑھا کچھ نہ ہو جیسے ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہو ویسے ہی تھا کسی کے سامنے شاگردی کے لیے اس نے گھٹنے نہیں ٹیکے اور اس کے باوجود علوم کے دریا بہادیے یہ ایک فخر ہے۔

مدرسوں میں پڑھ کر یونیورسٹیوں میں پڑھ کر اور یہ (پی۔ایچ۔ڈی) کر کے اگر کوئی تقریر کرتا ہے کوئی مضمون لکھتا ہے یا کوئی تحقیق پیش کرتا ہے تو یہ کوئی قابل تعجب نہیں یہ ساری دنیا کرتی ہے اور ایک شخص پڑھا بالکل نہ ہو کسی صاحب فن کے سامنے جا کر بیٹھا نہیں اور وہ حقائق اس قسم کے پیش کرے کہ اچھے بھلے عقلمند اس کے سامنے

عاجز آگئے تو یہ بات اس کے لیے باعث فخر ہے اور دوسروں کے لیے چونکہ اس قسم کے علم لدنی کا اہتمام نہیں کہ اللہ تعالیٰ براہ راست دل و دماغ کے اندر علم ڈال دے عام لوگوں کے لیے قاعدہ اور ضابطہ یہی ہے کہ جس وقت تک کسی کے سامنے شاگرد بن کر نہیں بیٹھیں گے اور محنت نہیں کریں گے، کسی کے جوتے سیدھے نہیں کریں گے اس وقت تک کوئی علم و فن آیا نہیں کرتا اس لیے کسی شخص کا اُمی رہ جانا اور پڑھنا لکھنا نہ سیکھنا یہ ایک عام انسان کے لیے عیب ہے اور سرور کائنات ﷺ کے لیے اُمی ہونا فخر ہے کہ پڑھا کہیں نہیں، شاگردی کسی کی اختیار نہیں کی، کسی علمی ماحول میں نہیں رہے، مطالعہ کتب نہیں کیا لیکن اس کے باوجود علوم کے دریا بہا دیے اس لیے امی کا لفظ یہ آپ کی عظمت کے منافی نہیں بلکہ عظمت کا نشان ہے اور جب عام لوگوں کو کہا جائے امی ان پڑھ قسم کے لوگ تو یہ جاہل کے مفہوم میں ہوتا ہے جو لکھے نہ پڑھے یہاں امیین سے یہی جہلاء مراد ہیں۔

یہود کے جاہلوں کی ذہنیت :

''لا یعلمون الکتاب الا امانی'' وہ سوائے خواہشات کے کتاب کو جانتے ہی نہیں ان کے سامنے صرف اپنی خواہشات ہیں ان خواہشات میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ چونکہ سمجھتے ہیں کہ ہم توارۃ کے حامل ہیں، انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں، آخرت میں اللہ تعالیٰ ہمیں پوچھے گا ہی نہیں ہم بخشے بخشائے ہیں اور اگر چلے بھی گئے جہنم میں تو تھوڑے سے دنوں کے لیے جائیں گے دوبارہ ہمارے بڑوں کی سفارش کے ساتھ پھر ہم نکل جائیں گے بس اس قسم کی خواہشات انہوں نے اپنے دلوں میں بسا رکھی ہیں باقی وہ اللہ کے احکام کو کچھ نہیں سمجھتے، ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں نہیں جانتے کتاب کو سوائے خواہشات کے اور نہیں ہیں مگر وہ خیالات پکا رہے ہیں۔

غلط مسئلہ لکھ کر دنیاوی مفاد حاصل کرنے والوں کے لئے دوہری خرابی ہے :

پس خرابی ہے ان لوگوں کے لیے جو کہ حکم شرعی لکھتے ہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ خود جھوٹا فتویٰ بنا کر لکھ لیتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے یعنی اللہ کی بتائی ہوئی باتوں کے مطابق ہے چاہے صراحۃً کتاب میں ہو، چاہے کتاب کی دلیل سے ثابت ہو جیسے کوئی ہم سے آکر استفتاء کرتا ہے، ایک مسئلہ پوچھتا ہے ہم اس کو حکم شرعی لکھ کر دیں گے چاہے وہ حکم شرعی اجتہادی ہو لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہوگا کہ شریعت کا حکم یہی ہے اسی طرح مسئلہ خود بنا لیا جس کی دلیل شرعی موجود نہیں ہوتی تھی اور مقصد ان کا ہوتا تھا دنیا کا مفاد حاصل کرنا اپنی بنائی ہوئی بات کو کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک بات ایسے ہی ہے پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ حاصل کر لیں اس کے

ذریعے سے ثمن قلیل، پس خرابی ہے ان کے لیے اس بات کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور خرابی ہے ان کے لیے اس چیز کی وجہ سے جو انہوں نے کمائی۔

دوہری خرابی ہوگئی ایک غلط حکم لکھ کر شریعت کی طرف منسوب کرنا یہ ایک مستقل خرابی کا باعث ہے پھر اس سے دنیاوی مفاد حاصل کرنا یہ ایک مستقل خرابی کا باعث ہے، ان کی خواہشات میں سے ایک خواہش یہاں ذکر کی گئی ہے۔

لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ کی دل نشین تشریح:

"لن تمسنا النار" ہمیں ہرگز آگ نہیں چھوئے گی "الا ایاما معدودۃ" مگر چند گنتی کے دن۔

ان چند گنتی کے دنوں سے کیا مراد ہے؟

مفسرین کے یہاں اقوال مختلف ہیں بعض کہتے ہیں کہ یہودی صرف چالیس دن تک جہنم میں جائیں گے جتنے دن تک اس قوم نے بچھڑا پوجا تھا یا بعض کہتے تھے کہ جتنے سال اس کی زندگی دنیا میں گزری ہے اتنے سال زیادہ سے زیادہ جہنم میں جائے گا اس سے زیادہ نہیں جائے گا یا اتنے دنوں تک جائے گا جب تک کہ سفارش وغیرہ کا قصہ پیش نہیں آتا، یہ اقوال مفسرین نے ایاما معدودۃ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔

لیکن سب سے اچھی توجیہ اس بارے میں وہی ہے جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے بیان القرآن میں بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہودی یہ کہتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ہمارا ایمان کے بارے میں ہمیشہ سے یہ حکم شرعی چلا آیا ہے اور یہ عقیدہ شرعیہ ہے کہ اول تو یہ جہنم میں جائیں گے نہیں اور اگر جائیں گے تو تھوڑی سی سزا بھگتنے کے بعد نکل آئیں گے یہود کہتے تھے ہم بھی مؤمن ہیں اس لیے اول تو ہم جہنم میں جائیں گے نہیں اور اگر گئے بھی تو عارضی طور پر جائیں گے کچھ اپنی غلطیوں کی سزا بھگتیں گے بھگتنے کے بعد چھوٹ آئیں گے بہر حال ہم دائمی جہنمی نہیں ہیں اور آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے متعلق اپنا عقیدہ بھی یہی ہے کہ جس وقت ہم اہل ایمان ہیں اول تو اہل ایمان جہنم میں جائیں گے نہیں اور اگر گئے بھی تو اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتیں گے سزا بھگتنے کے بعد چھوٹ آئیں گے آخر کار جنت میں چلے ہی جانا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل ایمان کا بھی اپنے متعلق عقیدہ یہی ہے۔

"لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ" کہ اول تو ہم جائیں گے نہیں اگر گئے بھی تو کچھ سزا بھگتنے کے بعد نکل آئیں گے تو پھر ہمارے عقیدے میں اور یہود کے عقیدے میں کیا فرق ہوا؟

یہ عقیدہ فی حد ذاتہ بالکل صحیح ہے کہ اہل ایمان اول تو جہنم میں جائیں گے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ویسے ہی بخش دے گا اگر نہیں بخشے گا تو ان کی بداعمالیوں کی بناء پر ان کو عارضی طور پر جہنم میں ڈالا جائے گا اور جب ان کے گناہوں کی سزا پوری ہو جائے گی تو ان کو جہنم سے نکال کر جنت میں ڈال دیا جائے گا، یہ عقیدہ حق ہے اور آج اہل ایمان کا اپنے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے لیکن یہ بات خواہش کے درجہ میں ہے یا واقعہ! اس کا ثبوت دینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ یہ ثابت کریں کہ جس دین کو ہم قبول کیے بیٹھے ہیں یہی دین حق ہے اور یہ دین منسوخ نہیں ہے بلکہ قیامت تک باقی رہنے والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے عیسیٰ علیہ السلام کے نہ ماننے سے کافر نہیں ہوئے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ ماننے سے کافر نہیں ہوئے، انجیل یا قرآن کریم کا انکار کرنے کی بناء پر کفر لازم نہیں آیا جس وقت تک وہ یہ ثابت نہ کریں تو اس وقت تک ان کا یہ عقیدہ غلط ہے۔

”لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ“ اور اگر دلیل کے ساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنے سے یہ کافر ہو گئے تو دائمی جہنمی اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا انکار کرنے سے یہ کافر ہو گئے تو دائمی جہنمی اب ان کا یہ کہنا ”لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ“ یہ محض ایک غلط خیال ہے جو انہوں نے اپنے دماغ میں پکا رکھا ہے یہ کافر ہیں اور ان کا دائمی جہنم میں جانا انہی کی کتابوں سے ثابت ہے۔

• مشرک اور کافر کی بخشش نہیں ہوگی یا اپنے کو ”لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ“ کا مصداق تب بنا سکتے ہیں جب یہ ثابت کریں کہ موسیٰ علیہ السلام خاتم النبیین ہیں اور توراۃ یہ خاتم الکتب ہے قیامت تک کے لیے دین موسوی باقی ہے اور توراۃ کی اتباع باقی ہے اگر وہ یہ ثابت کر دیں تو پھر یہ یہود صاحب ایمان ہوں گے پھر ان کا یہ عقیدہ صحیح ہے پھر یہ محض خواہش نفس نہیں بلکہ صحیح عقیدہ ہے۔

لیکن ہم اپنی دلیل سے ثابت کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام خاتم النبیین نہیں اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے رسول آئے اور توراۃ یہ خاتم الکتب نہیں بلکہ اس کے بعد انجیل بھی آئی تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے قبل جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا وہ کافر ٹھہرے، انجیل کا انکار کیا وہ کافر ٹھہرے تو اب ان کا یہ کہنا کہ ہم عارضی طور پر جائیں گے یہ غلط خیال ہے اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ماننا یہ کفر ٹھہرا، قرآن کریم کو نہ ماننا یہ کفر ٹھہرا اب چاہے کوئی عیسائی ہو، چاہے کوئی یہودی ہو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے آنے کے بعد کافر ہے جب کافر ہے تو یہ عقیدہ اس پر صادق نہیں آتا کہ عارضی طور پر جہنم میں جائیں گے۔

کفر کی سزا میں کافر کے لیے دائماً جہنم میں جانا یہ کتب سابقہ سے بھی ثابت ہے اور ہم جو کہتے ہیں ''لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ'' ہماری یہ خواہش نہیں بلکہ واقعہ ہے اس کی وجہ کیا ہے کہ ہم اس کو دلیل صحیح کے ساتھ جانتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ خاتم النبیین ہیں، قرآن کریم خاتم الکتب ہے جس وقت تک یہ دنیا آباد ہے، باقی ہے اس وقت تک آپ ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے جو شخص حضور ﷺ کو اور قرآن کریم کو مانے گا یہ مؤمن ہے اور مؤمن دائمی جہنمی نہیں اول تو اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے معاف کر دیں گے لیکن اگر بداعمالیوں کی بناء پر پکڑا بھی گیا تو عارضی طور پر جہنم میں جائے گا دائمی جہنمی نہیں۔

اس لیے اپنے متعلق ہمارا عقیدہ بھی یہی ہے اور یہودی بھی اپنے متعلق یہی کہتے تھے لیکن ہمارے عقیدے کی صحت دلیل کے ساتھ ثابت ہے اور یہودیوں کا یہ عقیدہ محض ایک خواہش نفس ہے جس کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں ہے، دلیل یہی ہے کہ اس اپنے دین کو باقی ثابت کریں، نجات کا مدار ثابت کریں، موسیٰ علیہ السلام کو اور تورات کو قیامت تک کے لیے ثابت کریں کہ موسیٰ علیہ السلام خاتم النبیین ہیں اور تورات قیامت تک قابل عمل ہے جس وقت تک دلیل کے ساتھ اس بات کو ثابت نہیں کیا جائے گا اس وقت تک مؤمن عاصی والا عقیدہ اپنے اوپر چسپاں کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

یہی بات ہے جس کا ذکر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ ان سے پوچھیے کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے تو وہ عہد یہی ہے کہ تمہاری کتاب میں دلیل موجود ہے کہ تم قیامت تک کے لیے اسی کے مکلف ہو، تمہاری کتاب میں دلیل ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خاتم النبیین اور خاتم الرسل ہیں جس کا ماننا قیامت تک کے لیے ضروری ہے اگر کتاب کے اندر یہ بات آچکی ہے تو اللہ تعالیٰ کا تمہارے ساتھ عہد یہی ہے پھر اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا کہ اگر تم اسی عقیدہ پر مر گئے مؤمن ہونے کی صورت میں تو اللہ تعالیٰ تمہیں دائمی جہنم میں نہیں بھیجے گا تو بتاؤ تمہاری کون سی دلیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خاتم النبیین ہونا ثابت ہے، اور اس کتاب کا خاتم الکتب ہونا کس دلیل سے ثابت ہے؟ کون سی دلیل ہے کہ قیامت تک کے لیے یہ دین باقی ہے یہ منسوخ نہیں اس لیے ہمارا اللہ کے ساتھ عہد ہے اللہ تعالیٰ اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

یہود سے پوچھا جا رہا ہے کہ کیا تمہارے پاس کوئی عہد ہے؟ کیا تمہارے پاس اس قسم کی کوئی دلیل ہے جس سے تم یہ بات ثابت کرسکو پھر دوسری شق یہاں ہے کہ تم اللہ پر ایسی باتیں بولتے ہو جس کی تمہارے پاس کوئی

علمی دلیل نہیں ہے اور ہم وہی بات کہیں گے کہ ہم اللہ پر کوئی بات بے علمی کے ساتھ نہیں کہتے بلکہ اس بات کے لیے علمی دلیل موجود ہے، بیان القرآن میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے جس سے مسئلہ بالکل بے غبار ہو جاتا ہے جس میں کوئی شک کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

مؤمنوں اور کافروں کا انجام :

بلیٰ آگے اللہ تعالیٰ نے یہی قانون بیان کیا کیوں نہیں جاؤ گے تم جہنم میں ہمیشہ کے لیے؟ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہی ہے کہ جو کوئی برا کام کرے اور برائی اس کا احاطہ کر لے، احاطے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں ایمان بھی باقی نہیں رہا اس کے دل میں بھی برائی ہی برائی آ گئی ایمان بھی باقی نہیں ہے کیونکہ قلب میں ایمان باقی ہو تو برائی نے احاطہ نہیں کیا۔

جو کوئی شخص برا کام کرے اور برائی اس کا احاطہ کر لے تو '' اولئك اصحاب النار '' یہ لوگ جہنم والے ہیں '' هم فيها خلدون '' اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور یہ ضابطہ تم پر صادق آتا ہے، اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں یہ جنت والے ہیں'' هم فيها خلدون '' اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ

قابل ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے لیا بنی اسرائیل سے پختہ عہد کہ نہ عبادت کرو تم مگر اللہ کی

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا

اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور کہو

لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا

لوگوں کو اچھی بات اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو پھر تم میں سے

قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ

کچھ لوگوں کے علاوہ باقی پیٹھ پھیر گئے اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے ﴿۸۳﴾ اور یاد کیجئے جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ تم آپس میں

دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ

خون ریزی نہ کرو گے اور نہیں نکالو گے تم اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے پھر تم نے اقرار کیا

وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ

اور تم گواہ ہو ﴿۸۴﴾ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنے ہی لوگوں کو اور نکالتے ہو تم

فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ

اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے گھروں سے مدد کرتے ہوئے ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کے ساتھ

وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ

اور اگر وہ لوگ تمہارے پاس قید ہو کر آجائیں تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ بات یہ ہے کہ تم پر ان کا نکالنا بھی حرام کیا گیا ہے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ

کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے منکر ہوتے ہو، تو کیا بدلہ ہے

مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ

اس شخص کا جو تم میں سے یہ کام کرے سوائے اس کے کہ دنیاوی زندگی میں رسواء ہو، اور

الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

قیامت کے دن اس کو سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۸۵﴾

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی کو اختیار کرلیا آخرت کے مقابلہ میں پس

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے ﴿۸۶﴾

لغوی وصرفی تحقیق:

"واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل" قابل ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے لیا بنی اسرائیل سے پختہ عہد اس عہد کی تفصیل یہ ہے "لا تعبدون الا اللہ" لا تعبدون یہ صورۃً خبر ہے اور معناً انشاء ہے یعنی اس میں نہی والا معنی ہے ترجمہ یوں کرلیں کہ نہیں عبادت کروتم مگر اللہ کی تو بھی بات ٹھیک ہے، اور اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ نہ عبادت کروتم مگر اللہ کی اس طرح بھی ٹھیک ہے۔

"وبالوالدین احسانا" احساناً یہ مصدر ہے اور اس کا عامل فعل محذوف ہے اگر لا تعبدون کی طرف دیکھتے ہوئے اس کو بھی آپ صورۃً خبر بنانا چاہیں تو پھر تقدیر عبارت یوں ہوگی "وتحسنون بالوالدین احسانا" اور اگر معنی کی رعایت رکھتے ہوئے اس کو انشاء کی شکل میں لانا چاہیں جیسا کہ آگے "قولوا للناس حسنا" یہ صورۃً بھی انشاء آیا ہوا ہے تو پھر یہاں امر کا صیغہ محذوف نکال لیجئے "واحسنوا بالوالدین احسانا" اور تم والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، "اِحسان اَحْسَنَ" کسی کام کو اچھی طرح سے کرنا "احسان فی المعاملات" یہی ہوا کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ معاملہ اچھا کیا جائے والدین کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کرو، ان کے ساتھ بھی اچھی طرح سے پیش آؤ، ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔

" وذی القربی " اس کا عطف والدین کے اوپر ہے " واَحسِنوذوی القربی " اور قرابت داروں کے ساتھ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، قربیٰ یہ مصدر کی جمع ہے قرابت کے معنیٰ میں ہے ذوی القربیٰ ذی قرابت رشتہ دار جن کے ساتھ تمہیں نسبی قرب حاصل ہے درجہ بدرجہ ماں باپ، ماں باپ کی شاخیں بہن بھائی، اور پھر جانب اعلیٰ دادا دادی، نانا، نانی، دادا، دادی کی اولاد، چچے، پھوپھیاں، نانا نانی کی اولاد، ماموں خالہ، یہ درجہ بدرجہ اسی طرح نیچے کو بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے، بھانجیاں، پوتے پوتیاں، نواسے، نواسیاں تو یہ سب ذی قرابت میں داخل ہیں۔

اور پھر ان میں سے کوئی ذی محرم ہوتا ہے اور کوئی ذی محرم نہیں ہوتا، ذی محرم وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ نکاح حرام ہو جس کے ساتھ حرمت ابدی ہے اور غیر ذی محرم وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ نکاح حرام نہیں ہے، ذی محرم جیسے، بہن، بھانجی، پوتی، پھوپھی، بھتیجی، خالہ یہ تو محرم ہیں یہ ذی محرم بھی ہیں، ذی قرابت بھی ہیں ان کا تو بہت حق ہوتا ہے ان سے تو حجاب بھی نہیں اور چچا کی بیٹی، پھوپھی کی بیٹی، خالہ کی بیٹی، ماموں کی بیٹی، یہ ذی قرابت ہیں مگر ذی محرم نہیں ہیں۔

جیسے جیسے دوری ہوتی چلی جائے گی اسی طرح حقوق کم ہوتے چلے جائیں گے، جیسے جیسے قرب ہوتا جائے گا حقوق بڑھتے چلے جائیں گے تو " بالوالدین احسانا " کی مناسبت سے یہاں احسنوا والا معنیٰ بھی پیدا کیا جاسکتا ہے اور قرآن کریم میں ایک جگہ ذی القربیٰ کے اوپر فعل بھی ظاہر کیا ہوا ہے، وآت ذی القربی حقه ذی القربیٰ کو حق دیا کرو، اس قسم کا مفہوم اگر پیدا کر لیا جائے تو بھی بات بن سکتی ہے لیکن یہاں چونکہ ذی القربیٰ یہ جری حالت ہے اس لیے والدین کے اوپر اس کا عطف مناسب ہے، مفہوم یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ ذی القربیٰ کا حق ادا کرو، وبذی القربیٰ ترکیب اس طرح سے ہوگی اور احسنوا بالوالدین، احسنوا بذی القربی اس طرح اس کو ادا کرنا ہے والدین کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو اور رشتے داروں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرو۔

" والیتمیٰ " یہ یتیم کی جمع ہے، یتیم اس نابالغ کو کہتے ہیں جس کا والد مر گیا ہو بالغ ہو جانے کے بعد اس کو اصطلاح میں یتیم نہیں کہتے " لایُتمیٰ بعد احتلام " جس طرح حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت بچہ محتلم ہو جائے اس کے بعد بچہ یتیم نہیں رہتا " لایتمیٰ بعد احتلام " احتلام کے بعد یتیم نہیں ہوتا بلوغ پر آ کر یتمیٰ والا عنوان ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اگر بلوغ پر ختم نہ کریں اور بالغ ہو جانے کے بعد بھی بڑے ہو جانے کے

بعد بھی اس کو یتیم کہیں جس کا باپ فوت ہو جائے تو پھر یا آپ خود یتیم ہوں گے یا آپ کا باپ یتیم ہو گا یا آپ کا دادا یتیم ہو گا پھر تو کوئی بھی نہیں بچتا۔

جیسے میں خود یتیم ہوں اور آپ میں سے بعض اگر یتیم نہیں ہیں تو ان کا باپ یتیم ہو گا تو آپ یتیم کی اولاد ٹھہرے اگر باپ بھی یتیم نہیں تو دادا یتیم ہو گا پھر تو ساری دنیا ہی یتیم بن جائے گی اگر اس کی کوئی حد نہ متعین کی جائے، تو حد اس کی یہی ہے کہ نابالغی کے زمانے میں یہ عنوان ہوا کرتا ہے کہ یہ بچہ یتیم ہے اور جس وقت بالغ ہو جائے تو بالغ ہو جانے کے بعد وہ یُتمْ والا مفہوم ختم ہو جاتا ہے " لایتمٰی بعد احتلام " حدیث شریف میں آتا ہے، بچے کے محتلم ہو جانے کے بعد یُتمْ نہیں ہوتا، تو یتامیٰ یتیم کی جمع آ گئی کہ احسان کرو یتیموں کے ساتھ۔

والمساکین مساکین مسکین کی جمع آ گئی مسکین کہتے ہیں محتاج کو یہ لفظ سکون سے لیا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو شخص اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے حرکت سے عاجز ہے، اپنی حاجات پوری نہیں کر سکتا اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہیں مسکنت اور مسکین اس کا مفہوم ہوتا ہے محتاج اس کا حاصل ترجمہ ہے " اور مسکینوں کے ساتھ "

" وقولوا للناس حسنا " اب یہ للناس میں الناس کو عام کر دیا گیا اور لوگوں کے لیے بولو اچھی بات قولوا لوگوں کو کہو " قولا ذا حسن " اچھی بات کہو یعنی عام لوگوں سے بھی جس وقت تمہیں کوئی معاملہ پیش آئے، گفتگو کی نوبت آئے تو تمہاری اس گفتگو کے اندر حسن ہونا چاہیئے، بات اس انداز سے کی جائے، خوبصورتی کے ساتھ کہ جس میں بلا وجہ دوسرے کی دل آزاری نہ ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف بھیجا تھا تو وہاں بھی کہا تھا، تم دونوں پیغمبر اس کو جا کر نرم بات کرنا، نرم لب و لہجے میں بات کرنا، لوگوں کے لیے اچھی بات بولو تو حسنا یہ صفت ہو جائے گی مفعول مطلق کی قولا ذا حسن کی تاویل کے ساتھ۔

" واقیموا الصلوٰۃ " اور نماز قائم کرو نماز قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے آداب، اس کی شرائط اور اس کے حقوق کی رعایت رکھتے ہوئے وقت پر پابندی کے ساتھ ادا کرنا یہ اقامت ہے۔

" واٰتوا الزکوٰۃ " اور زکوٰۃ دو " ثم تولیتم " پھر تم نے پیٹھ پھیری " الا قلیلا " سوائے تم میں سے کچھ لوگوں کے " ثم تولیتم الا قلیلا " کا اکٹھا ترجمہ کریں گے تم میں سے کچھ لوگوں کے علاوہ باقی پیٹھ پھیر گئے، کچھ لوگوں کے علاوہ تم سب پیٹھ پھیر گئے، " وانتم معرضون " اس کو جملہ اسمیہ کے طور پر ذکر کر دیا یا یہ ثانیہ

جملہ اسمیہ کے اندر دوام والا معنی ہوتا ہے تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میثاق سے بھی تم نے پیٹھ پھیر لی " وانتم معرضون" اور تم ہو ہی اعراض کرنے والے یعنی تمہاری یہ دائمی عادت ہے کہ بات کرتے ہو بعد میں اعراض کر جاتے ہو اپنی کسی بات پر پکے رہتے نہیں، اپنے کسی میثاق کا خیال کرتے ہی نہیں " وانتم معرضون " کے اندر ان کی دائمی عادت کی طرف اشارہ کر دیا، ان کی عادت بیان کر دی۔

" واذاخذنا میثاقکم " اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے تم سے عہد لیا پختہ عہد " لا تسفکون دماء کم " یہ اس میثاق کا بیان ہے، تسفك الدم خون بہانا یسفك الدماء یہ لفظ آدم علیہ السلام کے واقعہ میں آپ کے سامنے آچکا، سفاک کہتے ہیں خونریز کو جو بہت خون بہاتا ہے، بہت ظالم آدمی ہے، بہت سفاک ہے، کتابوں کے اندر یہ لفظ پڑھوگے تو اس کا معنی یہی ہوتا ہے خونریز "لا تسفکون دماء کم " نہیں بہاؤ گے تم اپنے خون یعنی اپنی برادری کو، اپنی قوم کو، اپنے قبیلے والوں کو قتل نہیں کرو گے، آپس میں ایک دوسرے کی جان نہیں لو گے خونریزی نہیں کرو گے۔

" ولا تخرجون انفسکم " اور نہیں نکالو گے تم اپنے لوگوں کو " من دیارکم " ان کے گھروں سے " ثم اقررتم " پھر تم نے اقرار کیا " وانتم تشھدون " اور تم گواہ ہو، اس وقت بھی تم شہادت دیتے ہو کہ واقعی ہم نے اقرار کیا یا اس کا مطلب ہے کہ تم نے اقرار کیا اور وہ اقرار کوئی ایسا نہیں تھا کہ دوسرا آدمی سمجھ جائے جو آپ کی گفتگو سے ضمناً سمجھ میں آرہا ہے کہ آپ نے اقرار کیا تمہارا اقرار ایسا تھا کہ تم اس بات کے اوپر گواہی دے رہے ہو، شہادت کی طرح واضح اقرار تھا تمہارا، دونوں مفہوموں میں فرق سمجھ لیجئے۔

ایک تو یہ ہے کہ اس وقت موجود تم لوگ اقرار کرتے ہو شہادت دیتے ہو اس بات پر کہ تم نے اقرار کیا تھا اور ایک یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا ایسے حال میں گویا کہ تم شہادت دیتے ہو یعنی شہادت کی طرح واضح اقرار تھا یہ نہیں کہ تمہاری گفتگو سے ضمناً سمجھ میں آگیا کہ تم نے اقرار کر لیا، بالکل واضح اقرار تھا جس طرح سے شہادت واضح ہوتی ہے۔

" ثم انتم ھؤلاء تقتلون انفسکم " پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنے لوگوں کو۔

" وتخرجون فریقاً منکم " اور نکالتے ہو تم اپنے میں سے ایک گروہ کو " من دیارھم " ان کے گھروں میں سے۔

" تظاھرون بالاثم والعدوان " ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو ان کے خلاف گناہ کے ساتھ اور ظلم کے ساتھ۔

عدوان تعدی اور اثم گناہ ، گناہ اور ظلم کے ساتھ یعنی گناہ اور ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے تم ان کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔

" وان یاتوکم اسٰرٰی " اور اگر وہ لوگ تمہارے پاس قید ہو کر آجائیں۔

اساریٰ اسیر کی جمع ہے، اَسْرٰیٰ اُسَارٰیٰ دونوں طرح سے آتا ہے اَسِیْر کی جمع اگر آجائیں وہ تمہارے پاس قید ہوکر "تفدوھم" تو تم ان کو فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو۔

"وھومحرم علیکم اخراجھم" حالانکہ بات یہ ہے ھُوَ یہ ضمیر شان ہے، حالانکہ بات یہ ہے کہ تم پر ان کا نکالنا بھی حرام کیا گیا ہے، وھو محرم علیکم اخراجھم میں اخراجھم یہ محرم کا نائب فاعل ہے حالانکہ حرام کیا گیا ہے تمہارے پر ان کا نکالنا۔

"افتؤمنون ببعض الکتاب" فاء کا اگر معطوف علیہ نکالنا ہو تو عبارت ہوگی" اتفعلون ھذا فتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض " کیا تم ایسی حرکتیں کرتے ہو پھر ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے کے ساتھ اور کفر کرتے ہو بعض حصے کا۔

"فماجزاء من یفعل ذلك منکم " کیا بدلہ ہے اس شخص کا جو تم میں سے یہ حرکت کرے۔

"الاخزیٌ فی الحیوٰۃ الدنیا " دنیوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن لوٹائے جائیں گے وہ سخت عذاب کی طرف خـــزیٌ رسوائی کو کہتے ہیں یعنی دنیوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کے علاوہ ایسے شخص کی اور کیا سزا ہوسکتی ہے یعنی اس کی یہی مناسب سزا ہے کہ دنیا میں بھی ذلیل ہو اور آخرت میں بھی اس کو سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

" اولئك الذین اشتروا الحیوٰۃ الدنیا بالآخرۃ " یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کو اختیار کرلیا آخرت کے مقابلے میں " فلایخفف عنھم العذاب " ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا۔

" ولاھم ینصرون " اور نہ یہ مدد دیے جائیں گے۔

تفسیر:

بنی اسرائیل سے پختہ عہد لینے کا ذکر:

سلسلہ واقعات وہی ہے جو اسرائیلیوں کے متعلق چلا آرہا ہے، پہلی آیت کا مفہوم واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں موجود یہودیوں کو یاد دہانی کرواتے ہیں کہ تم سے پختہ عہد لیا گیا تھا ان باتوں کا اور آج ماننے کے باوجود کہ توراۃ کے اندر یہ احکامات دیے گئے، توراۃ کے اوپر تم نے عمل کرنے کا وعدہ کیا ان احکام کو قبول کیا، ان کے اوپر ایمان لائے اور اس کے باوجود تم ان کی خلاف ورزی کررہے ہو اتنے واضح واضح احکام اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیئے تھے جن کا تم نے اقرار کیا ان کو ماننا ان کے اوپر عمل کرنے کا وعدہ کیا پھر اس کو توڑ دیا۔

اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو:

جس میں پہلی بات ذکر کی گئی کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور دوسری بات ذکر کی گئی کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اللہ کی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا قرآن کریم کی کئی آیات میں ذکر کیا گیا ہے جس سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ اللہ کے حقوق کے بعد مخلوق میں سب سے بڑا حق انسان کے اوپر والدین کا ہے لیکن والدین کا جب ذکر کیا تو لفظ احسان کے ساتھ ذکر کیا ان کے ساتھ برتاؤ اچھا کرو، ان کو عبادت والے فعل کے ضمن میں ذکر نہیں کیا کہ والدین کی بھی عبادت کرو۔

عبادت والدین کی بھی نہیں کی جاسکتی:

والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا ذکر کیا ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص جس کا آپ پر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑا حق ہے اور سب سے زیادہ اس کے حقوق آپ کے ذمے ہیں جب عبادت اس کی نہیں جاسکتی تو دوسروں کے متعلق کیا خیال کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کے سامنے آپ کی پیشانی جھک جائے جب یہ رب مجازی جو دنیا کے اندر تمہارے پیدا ہونے تمہاری تربیت اور پرورش کے اندر واسطہ بنے جب ان کو سجدہ کرنا جائز نہیں، جب ان کے سامنے جھکا نہیں جاسکتا تو کسی دوسرے کے سامنے جھکنے کا کیا معنی؟ اللہ تعالیٰ کے بعد جس کے سب سے زیادہ حقوق انسان کے ذمے ہیں وہ والدین ہیں۔

توحید ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جس میں والدین کو شریک تو کیا کرنا ہے اس سلسلے میں والدین کی بات ماننا بھی جائز نہیں ہے توحید کے عقیدے کے خلاف اگر وہ بات کریں تو قرآن میں والدین کے حقوق ذکر کرنے کے بعد سورۃ لقمان میں، سورۃ عنکبوت میں یہ بات ذکر کی گئی ہے۔

"وان جٰھداك علیٰ ان تشرك بی مالیس لك بہ علم "اگر یہ تیرے ماں باپ تجھے مجبور کریں اس بات پر کہ میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا جس کے شریک ہونے کا تجھے کوئی علم نہیں "فلا تطعھما"

تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی، اور ان کا کہنا نہیں ماننا لیکن دنیا کے اندر ان کے ساتھ اچھی طرح سے رہنا ہے شرک میں ان کا کہنا نہیں ماننا، کہنا کس کا ماننا ہے تو فرمایا۔

"واتبع سبیل من اناب الیّ" کہنا اسی شخص کا مانو جس کا رجوع میری طرف ہے اتباع اس کی کرنی ہے تو والدین کے ساتھ اچھے معاملہ کا مطلب یہ ہے کہ ان کی عزت کرو، احترام کرو، ان کی خدمت کرو، ان کو راحت پہنچاؤ، اور جس قسم کے احکام وہ دیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے ساتھ ان کا ٹکراؤ نہ ہو تو ان احکام کی تعمیل کرو یہ

سب والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ہے، ان کے دل کو خوش رکھو، بدنی خدمت، مالی خدمت، جس سے ان کا اعزاز واکرام ہو، جس سے ان کا دل ودماغ خوش رہے اور آپ پر مطمئن رہیں ایسا معاملہ والدین کے ساتھ کرو لیکن حد بندی ہے کہ جہاں ان کا حکم عبادت کے مفہوم میں آ جائے وہ نہیں ماننا اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے ساتھ ان کی کوئی بات ٹکرا جائے تو پھر اللہ کا حق مقدم ہے کیونکہ اللہ ان پر بھی حاکم ہے اور ہم پر بھی حاکم ہے۔

جس طرح اگر ماں باپ کا حکم آپس میں ٹکرا جائے تو باپ کا حکم مانا جائے گا کیونکہ باپ کا حکم ماں پر بھی چلتا ہے اور ہم پر بھی چلتا ہے اس لیے اگر دونوں کے حکم میں تعارض آ جائے تو باپ کا حکم مانا جائے گا کیونکہ ہماری ماں بھی ہمارے باپ کی محکوم تو اسی طرح یہاں بھی ہے کہ جب خالق اور مخلوق کی بات ٹکرا جائے گی تو خالق کی مانیں گے کیونکہ دوسرا حکم دینے والا بھی مخلوق ہے وہ بھی اس خالق کے حکم کا پابند ہے تو ہم بھی اس کے حکم کے پابند ہیں تو مخلوق کے حکم کو خالق کے حکم کے مقابلے میں کس طرح سے لے آئیں؟۔

مخلوق کی اطاعت میں خالق کی نافرمانی حرام ہے:

جو مخلوق اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف حکم جاری کردے وہ تو اللہ کی باغی ہے تو ہم اس باغی کے ساتھ کس طرح ہو جائیں" لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق "ایک واضح ہدایت دے دی گئی کہ جہاں خالق کی نافرمانی لازم آئے وہاں مخلوق کا کہنا نہیں مانا جا سکتا تو والدین کے ذکر کے ساتھ لفظ احسان لایا گیا یعنی ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم ہے عبادت ان کی نہیں کرنی تو جس کے سب سے زیادہ حقوق انسان کے اوپر ہیں جو اس دنیا کے اندر پیدا ہونے کا واسطہ بنے، پیدا کرنے والا اللہ ہے۔

لیکن واسطہ تو والدین بنے اور رب اللہ ہیں پرورش کرنے والے، رزق دینے والے، تربیت دینے والے اللہ ہیں لیکن واسطہ تو ظاہری طور پر والدین ہیں تو جن کے اتنے حقوق ہیں جب ان کی عبادت نہیں کی جا سکتی تو کسی دوسرے کو اللہ کی عبادت میں کس طرح سے شریک کیا جائے۔

رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ادا کرو:

"ذوي القربى" رشتے داروں کے حقوق ادا کرو، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور یتیموں کے ساتھ چاہے وہ رشتے داروں میں سے ہوں چاہے وہ رشتے داروں میں سے نہ ہوں اور اسی طرح مسکینوں کے ساتھ چاہے وہ مسکین رشتے داروں میں سے ہوں چاہے رشتے داروں میں سے نہ ہوں ان سب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اچھے برتاؤ کا مطلب یہی ہے کہ ان کی ضرورت کا خیال رکھو، ان کی سرپرستی کرو، ان کو نفع کی

بات بتاؤ، اور نقصان سے بچانے کی کوشش کرو، بھوکے ہیں تو کھانا دو، ننگے ہیں تو کپڑا پہناؤ، جیسی ان کی ضروریات ہیں ان کا خیال رکھو۔

گفتار میں نرمی پیدا کرو:

" وقولوا للناس حسنا " عام لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، بات جب کرو اچھے انداز سے کرو، زبان تمہاری اچھی ہونی چاہیئے اور حسن فی القول یہی ہے کہ دوسرے کے ساتھ نرم لب و لہجے کے ساتھ بات کی جائے، اس کی عزت کا خیال کیا جائے، اس کے مرتبے کا خیال کیا جائے، دل آزاری کی گفتگو نہ کی جائے جس طرح کسی یتیم نے، مسکین نے آپ سے کوئی مطالبہ کرلیا آپ اس کا مطالبہ پورا نہیں کرسکتے تو آپ نرم لب و لہجے کے ساتھ جواب دے دیجئے " قولٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى " اچھی بات کہہ دینا اور درگزر کرلینا یہ اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے تکلیف پہنچائی جائے تو یتیم مسکین کے ساتھ بھی اچھا قول اختیار کرو اور عام لوگوں کے ساتھ بھی اچھا قول اختیار کرو کہ جب بھی گفتگو کرو نرم لب و لہجے کے ساتھ کرو اس میں کوئی دل آزار لفظ نہ ہو، استہزاء نہ ہو، ہتک آمیز اور بے عزتی پر مشتمل کوئی بات نہ ہو جس سے دوسرے کے دل کو تکلیف پہنچے یہ عام لوگوں کے متعلق نصیحت ہوئی۔

واعظوں کو، مبلغوں کو، ہر کسی کو اس بات کی رعایت رکھنی چاہیئے کہ ان کی بات میں حسن ہو، اس لیے ہمارے بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ مسلمان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو فرعون جیسا نہیں ہے فرعون اس سے بدتر ہے اور مبلغ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو موسیٰ علیہ السلام جیسا نہیں ہے جب موسیٰ علیہ السلام کو نصیحت کی جارہی ہے کہ فرعون کو جاکر بھی نرم لب و لہجے میں بات کرنی ہے تو دوسرے افراد کو کس طرح اپنے مخاطبین کی دل آزاری کرنے کی اجازت ہوگی۔

تبلیغ کا ایک اصول ہے موعظة حسنه کا لفظ جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا موعظة حسنه اچھی نصیحت نرم لب و لہجے، دلیل قوی ہو لب ولہجہ نرم ہو دوسرے کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ہوں یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں جو تبلیغ کے اندر حسن پیدا کرتی ہیں۔

اور یہ زبان ہی ایک ایسی چیز ہے اگر یہی " قولوا للناس حسنا " اچھی طرح سے اختیار کرلی جائے تو انسان کی دوستیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اسی زبان کو اگر غلط استعمال کیا جائے تو دوستوں کے مقابلے میں دشمنوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے اندر راحت دوستوں کے ذریعے سے ہوتی ہے اور پریشانی دشمنوں کے ہاتھوں آیا کرتی ہے اور اس دوستی اور دشمنی کے حلقے کے اندر سب سے مؤثر کردار زبان کا ہے۔

کہ کسی سے میٹھا بول بولو گے تو اس کا دل آپ کی طرف کھنچے گا اور آپ کو وہ کم از کم نقصان نہیں پہنچائے گا جو آپ کی باتوں سے متاثر ہے، جس طرح کہتے ہیں کہ میٹھے بول میں جادو ہے انسان میٹھی باتیں کر کے دوسرے کو متاثر کر لیتا ہے اور اگر ہر کسی کے ساتھ تنگی کے ساتھ، ترشی کے ساتھ، دل آزاری کے ساتھ پیش آؤ گے تو لفظ آپ نے زبان سے نکالے دو چار لیکن دوسرے کے جذبات آپ کے خلاف ہو جائیں گے وہ کہیں بھی آپ کے ساتھ ہمدردی کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔

عزت، احترام، دل جوئی جتنی زبان کے ذریعے سے انسان کر سکتا ہے جس میں خرچ کچھ نہیں ہوتا جس میں زور کچھ نہیں لگتا، اللہ تعالیٰ نے یہ بنائی ایسی ہے کہ نہ اس میں تیل ڈالنا پڑے نہ کچھ اور کرنا پڑے، نہ یہ گھستی ہے اگر اس کو اچھی طرح استعمال کرنا آجائے تو انسان بہت سارے نقصانات سے بچ سکتا ہے، تو قولو اللناس حسنا یہ معاشرت کا ایک بہت بڑا اچھا اصول ہے کہ جب کسی سے بات کرو اچھے انداز سے کرو۔

"اقیموا الصلوٰۃ" نماز قائم کرو، زکوٰۃ دیتے رہو۔

بنی اسرائیل کا اعراض:

"ثم تولیتم" یہ واضح میثاق ہم نے تم سے لیا تھا لیکن تم پھر پیٹھ پھیر گئے ہر چیز کو ختم کر دیا، نہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ محفوظ رکھا نہ انسانوں کے حقوق پہچانے، اور نہ وعظ و تبلیغ اور دوسرے معاملات میں لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، یتیموں مسکینوں کا مال تم کھانے لگ گئے۔

"ان کثیر امن الاحبار والرھبان لیا کلون اموال الناس بالباطل" قرآن کریم نے جس طرح کہا اور خود کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنالیا کہ خود کو ایسا مطاع بنالیا اور لوگوں کے سامنے ایسے احکام جاری کرنا شروع کر دیئے اللہ کے احکام پیچھے رہ گئے تمہارے پیروں فقیروں کے احکام آگے آگئے۔

"اتخذو احبارھم ورھبانھم اربابامن دون اللہ" جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان احبار و رھبان کا نقشہ کھینچا ہے کہ ان یہودیوں نے احبار و رھبان کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا، احبار و رھبان رب بن کر بیٹھ گئے، رب بننے کا وہاں بھی مطلب یہی ہے کہ اللہ کے احکام نہیں بتاتے بلکہ اپنی ہدایات جاری کرتے ہیں اللہ کے احکام کے خلاف، اور لوگ ان کے اتنے عقیدت مند ہو گئے ہیں کہ اگر یہ اللہ کے احکام کے خلاف بھی حکم جاری کر دیں تو لوگ ان کی مانتے ہیں اللہ کی نہیں مانتے احبار و رھبان کو رب بنانے کا یہی معنی ہے۔

قرآن مجید کا انصاف:

کچھ یہودی جن کا توراۃ پر صحیح ایمان تھا اس کو الا قلیلا کے ساتھ مستثنیٰ کر لیا یہ قرآن کریم کا انصاف

ہے کہ عین ایسے موقع پر کہ جب اپنے فریق مخالف کے اوپر تنقید کر رہا ہے تو بھی انصاف کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا جو ان میں سے اچھے ہیں ان کو اچھا کہتا ہے، جو ان میں سے برے ہیں ان کو برا کہتا ہے، یہ نہیں کہ جہاں کسی جماعت کے ساتھ ٹکراؤ ہوا جب اس پر تنقید شروع ہوئی تو ایک ہی طرف سے رگڑا لگا دیا، اچھے برے سب ہی ایک ڈنڈے سے ہانک دیئے، صرف ایک جماعتی عنوان سے کہ اس جماعت سے ہمارا اختلاف ہے جتنے افراد اس جماعت میں شامل ہیں وہ سارے ہی ہمارے مغضوب معتوب، بالکل بات غلط ہے، ایک فریق ہونے کی حیثیت سے آپ کا مدمقابل اگر ہے تو اس میں سے بعض مثبت مزاج بھی ہوتے ہیں، بعض اعتدال پسند بھی ہوتے ہیں چاہے ان کی نسبت اسی جماعت کی طرف ہے تو سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا نہیں جایا کرتا اچھوں کو اچھا کہو، بروں کو برا کہو تو یہاں قرآن کریم یہودیوں پر، نصرانیوں پر اپنے مخالفین پر تبصرہ کرتا ہے ان میں سے جو اچھے ہیں ان کو اچھا کہتا ہے، ساروں نے اس میثاق کو نہیں توڑا تھوڑے سے بچے جو تورات پر صحیح عمل کرنے والے تھے اور اکثر پیٹھ پھیر گئے۔

" وانتم معرضون " تمہاری تو عادت ہی ہے اعراض کرنا، ایک بار نہیں کرتے ہو بار بار کرتے ہو جس وقت تمہیں کوئی نصیحت کی جاتی ہے دوسرے وقت میں منہ موڑ جاتے ہو وانتم معرضون میں ان کی دائمی عادت ذکر کر دی۔

کوئی جماعت بھی اپنے عنوان کے لحاظ سے بری نہیں ہے:

کوئی جماعت بھی اپنے عنوان کے لحاظ سے بری نہیں ہوتی اس کا اچھا برا ہونا اس کے نظریات، اس کے کردار پر ہوتا ہے آپ کے سامنے جماعتوں کے مختلف عنوانات ہیں!

ایک پیپلز پارٹی ہے، ایک جمعیت علماء اسلام، ایک جمعیت علماء پاکستان ہے، ان عنوانوں میں کیا رکھا ہے۔

ایک سوشلسٹ دہریا آ کر فارم پر کر دیتا ہے جمعیت علماء اسلام کا تو کیا جمعیت علماء اسلام کا ٹھپہ لگ جانے سے وہ بہت محترم و مکرم ہو گیا جب وہ آئے ہم اس کو منبر پر چڑھالیں اور مصلے پر کھڑا کر دیں جب کہ ہمیں پتہ ہے کہ وہ سوشلسٹ دہریا ہے۔

یہ الیکشن کے دنوں میں کتنے مطلب پرست قسم کے لوگ آ کر فارم پر کر دیتے ہیں اور ایک شخص اپنی رشتہ داری کی مجبوری سے، یا ایک علاقائی مجبوری سے یا کسی مصلحت کے تحت پیپلز پارٹی کا فارم پر کر دیتا ہے جس طرح غلط غرض کے تحت آدمی جمعیت علماء اسلام میں آ سکتے ہیں تو اسی طرح بعض اچھے آدمی پیپلز پارٹی میں بھی تو جا سکتے ہیں کوئی

رشتے داری کی مجبوری ہے، کوئی علاقائی مسئلہ ہے، وہاں تسلط ہے ہی ان کا تو وہاں ان سے ٹکرانے کا فائدہ کوئی نہیں سوائے اس کے کہ ہم اپنا دنیا کا نقصان کریں سیاست میں یہ سب چلتا ہے ایک اچھے عقیدے کا آدمی جمعیت علماء اسلام میں نہیں ہے مجلس احرار میں ہے اور مجلس احرار مثال کے طور پر الیکشن میں جمعیت علماء اسلام کے مقابلے میں آجاتی ہے تو آپ کی دیوبندیوں کی جماعت ہے، اہل علم کی جماعت ہے، کیا اس طرح ممانعت ہو جانے کے بعد جتنے آدمی ہیں ان سب کو برا کہنا شروع کر دیں اختلاف کی بھی حدود ہوتی ہیں ان حدود کی رعایت رکھنی چاہیئے جہاں تک مقابلہ ہو وہاں تک مقابلہ کیجئے اور سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانک دینا۔

یہی تو بے اعتدالی ہے جس کے ساتھ سارے کا سارا معاملہ خراب ہوتا ہے جب مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ جمعیت علماء اسلام میں تھے تو ہم ان کی ذات کے توسل سے دعائیں کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وقت کا ابوذر غفاری ہے اٹھا کر دیکھو پرانے ترجمان الاسلام اور اپنے حضرات کے رسائل جو ان کے بارے میں ہوتے تھے۔

جس وقت ذرا سیاسی اختلاف ہوا تو پھر جو کچھ آپ نے ان کے ساتھ کیا اور جو کچھ نظریات ان کے متعلق تھے وہ بھی آپ کے سامنے ہیں یہ بے اعتدالی ہے سیاسی اختلاف کو سیاسی سطح تک رکھنا چاہیئے جہاں تک کسی کے ذاتی شخصی کمالات ہیں ان کا اعتراف کرنا چاہیئے اب جس میں ذاتی قباحت ہوا کرتی ہے وہ بھی کسی دوسرے وقت اچھا بنتا ہے۔

کپڑا عارضی طور پر ناپاک ہے دھولیں گے پاک ہو جائے گا، پھر پلیدی لگ جائے گی پھر ناپاک ہو جائے گا، اس کو ہم کبھی اتاریں گے، کبھی پہنیں گے، کیونکہ اس میں نجاست ذاتی نہیں ہے اور جس چیز کے اندر ذاتی نجاست ہے اس کو ہزار دفعہ دھولو پاک نہیں ہوتا یعنی کوئی مصالحہ آپ کے پاس ہے کہ جس کے ساتھ پاخانہ دھونے سے پاک ہو جائے؟ تو اس لیے سیاسی نظریات میں ذاتی قباحت کوئی نہیں ہوتی یہ ہوتے ہیں مصلحت کے تحت، ایک وقت میں آپ کو روس اچھا معلوم ہوتا ہے آپ روس کی حمایت میں بولتے پھرتے ہیں اور ایک وقت میں آپ کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ روس کے مقابلے میں امریکہ کی سیاست اچھی ہے تو آپ امریکہ کی حمایت کرنی شروع کر دیں گے تو پھر اختلاف کو اختلاف کے درجے پر رکھا جائے تو ٹھیک ہے۔

ان سیاسی نظریات کے طور پر کسی کا ذاتی طور پر دشمن بن جانا یہ بے اعتدالی ہے اس میں نقصان ہوتا ہے کہ پھر نہ کسی کی شرافت کی قدر رہے، نہ کسی کی دیانت کی قدر رہے، نہ بزرگی کی قدر رہے پھر اس طرح سے ہو جائے کہ گویا

وہ مرتد عن الاسلام ہوگیا تو اسلام اور موجودہ ملکی سیاست یہ مترادف لفظ نہیں ہیں کہ جو شخص آپ کے ساتھ سیاست میں متحد نہیں وہ مسلمان ہی نہیں اور کوئی آپ سے سیاسی متحد ہونے کے بعد آپ سے کچھ مختلف ہوگیا تو مرتد ہی ہوگیا یہ بات غلط ہے۔

اختلاف کو اختلاف کی حد تک رکھتے ہوئے اس کے شخصی اوصاف کی رعایت رکھنی چاہیئے اب یہودیوں سے جس طرح سے ٹکراؤ تھا کسی سے مخفی نہیں ہے اب سارا قرآن کریم ان کے مقابلے میں ہے لیکن اس مخالف جماعت کا ذکر کرتے ہوئے ان میں بھی جو اچھے آدمی ہیں ان کو ہمیشہ نکال لیا جاتا ہے اور ان کی تعریف کی جاتی ہے کہ سارے برابر نہیں ہیں قرآن کریم میں ایک جگہ ان کی تعریف بھی ذکر کی گئی ہے۔

بنی اسرائیل سے لیے گئے دوسرے عہد کا ذکر:

"واذاخذنا میثاقکم لاتسفکون دمائکم" اس میں دوسرے میثاق کا ذکر ہے اس دوسرے میثاق کا حاصل یہ ہے کہ یہود سے اللہ تعالیٰ نے یہ میثاق لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کی جان کی رعایت رکھنی ہے ایک دوسرے کو قتل نہیں کرنا۔

یہودی یہودی کو قتل نہ کرے، اور ایک یہودی دوسرے کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرے کہ دوسرا یہودی تنگ آ کر اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوجائے تمہارے پڑوس سے تنگ آ کر علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوجائے گھروں سے نہیں نکالنا ایک دوسرے کو، یہ دو باتیں تھیں۔

تیسرا میثاق ان سے یہ لیا گیا تھا کہ اگر کبھی کوئی یہودی دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے تو ساری قوم مکلّف ہے اس بات کی کہ فدیہ دے کر اس کو چھڑائے، آزاد کروائے گویا کہ یہ جماعتی نظم کے تحت تین عہد ان سے لیے گئے تھے۔

ایک تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہیں کرنا دوسرا آپس میں ایک دوسرے کو تنگ کر کے علاقے سے نہیں نکالنا اور تیسری بات یہ تھی کہ اگر کوئی یہودی کسی غیر کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے تو قومی طور پر تم مجبور ہو، مکلّف ہو اس بات کے کہ اس کو فدیہ دیکر چھڑوانا ہے یہ تین عہد لیے گئے تھے اور اس میں دیکھو سارا قومی فائدہ ہے قوم کا مفاد ہے جماعت کی تنظیم ہے۔

بنی اسرائیل کی عہد شکنی:

اب مدینہ منورہ کے اردگرد یہود کے قبائل تھے ایک بنو نضیر اور ایک بنو قریظہ اور مدینہ منورہ میں دو قبیلے مشرکوں کے تھے ایک اوس اور دوسرا خزرج، یہ دونوں مشرک تھے۔

اوس اور خزرج ان میں قبائلی جنگ رہتی تھی بنو قریظہ اور بنو نضیر کا ان کے ساتھ معاہدہ تھا، بنو نضیر کا معاہدہ خزرج کے ساتھ اور بنو قریظہ کا معاہدہ اوس کے ساتھ تھا، سیاسی معاہدے جس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ ہو جاتے ہیں اب جس وقت یہ اوس اور خزرج آپس میں لڑتے تو یہ اپنے حلیفوں کو بلاتے تو خزرج کے ساتھ بنو نضیر لڑائی میں شریک ہو جاتے اور اوس کے ساتھ بنو قریظہ شریک ہو جاتے تو بنی نضیر اور بنو قریظہ بھی بالواسطہ لڑائی میں شریک ہوتے یہ بھی ایک دوسرے کو قتل کرتے یوں خونریزی ہوتی۔

جس وقت ایک فریق دوسرے پر غالب آجاتا تو دوسروں کے گھر بھی برباد کرتا اور وہ اپنے علاقے چھوڑنے پر بھی مجبور ہو جاتے، اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگ جاتے، اور پھر آتے اور مقابلے اس طرح سے ہوتے یہ دو باتیں ایسی تھیں جو یہود نے ختم کر دی تھیں لڑتے بھی تھے، ایک دوسرے کے ساتھ خونریزی بھی کرتے تھے اور گھر بھی اجاڑتے تھے لیکن اگر ایک قبیلے کا یہودی پکڑا گیا، مخالفوں نے پکڑ لیا مثلاً بنو نضیر کا پکڑ لیا اوس والوں نے تو بنو قریظہ اپنے حلیفوں کو کچھ دے دلا کر راضی کر کے اس یہودی کو آزاد کروا دیتے، اور اگر اسی طرح بنو قریظہ کا کوئی آدمی خزرج نے پکڑ لیا تو بنو نضیر کا معاہدہ تھا خزرج کے ساتھ تو وہ ان کو کچھ دے دلا کر آزاد کروا دیتے۔

جب ان سے کہا جاتا کہ یہ تو تمہارے مخالف ہیں تم اس طرح سے فدیہ دے کر کیوں چھڑاتے ہو وہ کہتے ہمیں ہماری کتاب کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ کا ہماری کتاب کے اندر حکم ہے کہ اگر کوئی یہودی پکڑا جائے تو اس کو فدیہ دیکر چھڑایا جائے اس لیے ہم فدیہ دیکر اس کو چھڑواتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا کہ پھر حکم تو یہ بھی ہے کہ آپس میں لڑو نہیں پھر آپس میں لڑتے کیوں ہو اور ایک دوسرے کے گھر نہ اجاڑو تو آپس میں گھر کیوں اجاڑتے ہو کہتے کہ کیا کریں دوستوں کی دوستی کی بھی تو رعایت رکھنی پڑتی ہے دوست ہمارا پٹتا ہے، تو ہم اس کو پٹتے ہوئے کیسے دیکھ سکتے ہیں، تو دوستی کی رعایت میں ایک دوسرے کے ساتھ عہد معاہدے کی رعایت میں اللہ تعالیٰ کے بعض احکام کو یوں ترک کرتے تھے، اور اپنی دین داری اور تقدس کو باقی رکھنے کے لیے کسی کسی حکم میں بڑے پیش پیش ہوتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس لیے ہم یوں کر رہے ہیں اور جب دوسرا موقع آتا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو پس پشت ڈال کر دوستوں کے تقاضے مقدم ہو جاتے تو کسی کسی حکم میں اس تقدس کی رعایت رکھی جائے اور کسی کسی حکم کو یوں مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا جائے یہ یہودیوں کا کردار تھا۔

فرائض سے لاپرواہی اور مستحبات کی پابندی:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کے کردار کے لیے لفظ بولا کرتے ہیں کلابی تقویٰ کلاب یہ کلب کی جمع ہے، کلب کتے کو کہتے ہیں کتوں والا تقویٰ کہ کتے کی خصلت ہے کہ جس وقت یہ پیشاب کرنے لگتا ہے تو ٹانگ اٹھا لیتا

ہے کہ کہیں چھینٹیں نہ پڑ جائیں اگر پاخانہ مل جائے تو سارا کھا جاتا ہے، مردار مل جائے تو شوق سے کھائے گا لیکن جب پیشاب کرنے لگے گا تو ٹانگ اٹھالے گا کہ کہیں چھینٹیں نہ پڑ جائیں منہ کو گندگی سے بچاتا نہیں اور ٹانگ کو بچاتا ہے تو کہتے ہیں بعض لوگوں کا تقویٰ ایسے ہی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے احکام کو ترک کر دیں گے ان کی پرواہ نہیں کریں گے مستحبات اور سنن پر لوگوں سے لڑ پڑیں گے کہ یوں کیوں کرلیا کہ دایاں پاؤں مسجد میں پہلے کیوں نہیں رکھا، بایاں پاؤں مسجد سے پہلے کیوں نہیں نکالا تو لڑیں گے اس قسم کی باتوں پر، تشدد کریں گے اس قسم کی باتوں پر لیکن حرام کا ارتکاب کرتے ہوئے ڈریں گے نہیں، ظلم کرتے ہوئے بچیں گے نہیں۔

دوسروں کے حقوق تلف کرتے ہوئے ڈریں گے نہیں، جو فرائض ہیں ان کو چھوڑ دیں گے، محرمات کا ارتکاب کریں گے اور مستحبات کے اوپر یہ تشدد، ایک دوسرے کی عزت کو ہاتھ ڈالتے ہیں جیسے کہ آج کل ہمارے ہاں چل رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو چیزیں اباحت کے درجے میں ہیں، مستحبات کے درجے میں ہیں، دیوبندیوں اور بریلویوں کی اکثر لڑائیاں ایسے ہی مسئلوں پر ہیں کوئی نماز نہیں پڑھتا اس سے کسی کو نفرت نہیں اس سے کوئی لڑتا نہیں ہے اور روٹی پر ختم نہ دے تو ڈنڈے نکل آتے ہیں، جنازے کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگیں تو فساد ہو جاتا ہے سب کو پتہ ہے کہ زانی ہے، شرابی ہے۔

زانی سے کوئی نفرت نہیں، شرابی سے نفرت نہیں ہے، بے نمازی سے نفرت نہیں ہے لیکن ایسی باتیں جنہیں دلائل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اباحت کے درجے میں استحباب کے درجے میں لایا جاسکے اور ان کی پابندی اس طرح سے ہے جس طرح اعلیٰ فرائض ہوتے ہیں اور ان کے چھوڑنے والے سے نفرت اس طرح سے ہے جیسے کوئی بالکل خدا کا باغی ہو گیا ہو یہ کلابی تقویٰ ہوتا ہے کہ پیشاب کے چھینٹوں سے تو بچیں اور پاخانہ سارا کھا جائیں۔

اس طرح یہ بھی اپنی دین داری کی دھونس رچانے کے لیے گرفتار یہودی کو تو فدیہ دیکر چھڑاتے لیکن جب قتل کی نوبت آتی تو بے دریغ گردنیں اڑا دیتے اور گھر اجاڑ دیتے تو جب انہیں یاد دہانی کرائی جاتی تو کہتے کیا کریں کہ دوستوں کی بات ہے دوستی کے تقاضے سے یہ بات کرنی پڑتی ہے اپنے دوستوں کو اکیلا کیسے چھوڑ دیں پھر اس قسم کے جو احکام شرعیہ تھے پھر ان کو وہ اس قسم کی مصلحتوں کے بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر یہی ملامت کی کہ یہی دین داری ہے تمہاری کہ جہاں تمہاری مصلحت کے خلاف اللہ کا حکم ہو تو تم ان کی پرواہ نہیں کرتے مصلحت کی رعایت رکھتے ہو اور پھر دین داری بچانے کے لیے اس قسم کی باتوں پر عمل

کر کے لوگوں کو یہ بھی دکھاتے ہو کہ کتاب پر ہمارا عمل ہے تو بعض باتوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا کفر کرتے ہو جو اس قسم کا طریقہ اختیار کر لے کہ اپنی مصلحت کے طور پر اللہ کے بعض احکام کو چھوڑتا ہے اور جہاں کوئی مصلحت حکم کے اختیار کرنے میں ہوتی ہے تو اختیار کرتا ہے ان کی سزا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے اور آخرت میں بھی " اشد العذاب " کی طرف ان کو لوٹایا جائے گا تو یہی دھمکی ان کو دی گئی ان کے تقدس کو پاش پاش کرنے کے لیے کہ تم جو اپنے آپ کو سمجھتے ہو کہ ہم بڑے توراۃ کے حامل ہیں اور بڑے شریعت موسوی کے پابند ہیں اس آئینے میں تم اپنا منہ دیکھو کہ تمہارا کردار کیا ہے۔

یاد کیجئے کہ جب تم سے عہد لیا گیا کہ نہیں بہاؤ گے تم آپس میں خون اور نہیں نکالو گے تم اپنے لوگوں کو اپنے گھروں سے پھر تم نے اقرار کیا اور تم گواہ ہو اور تم ہی وہ لوگ ہو کہ قتل کرتے ہو اپنے لوگوں کو یہ انہی قبائلی جنگوں کی طرف اشارہ ہے جو کہ مدینہ منورہ میں اوس اور خزرج کے ساتھ شامل ہو کر یہ لڑتے تھے۔

تظاھرون ایک دوسرے کی مدد کرنا، مدد کرتے ہو ایک دوسرے کی ان کے خلاف یعنی اپنے لوگوں کے خلاف بالاثم گناہ کا ارتکاب کرتے ہوئے، گناہ ہو گیا اللہ تعالیٰ کا حق تلف کرنے کی وجہ سے والعدوان اور ظلم کا ارتکاب کرتے ہوئے، ظلم ہو گیا حقوق العباد تلف ہونے کی وجہ سے تمہاری ان حرکتوں سے اپنے بھائیوں کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں یہ عدوان ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے یہ اِثْم ہے تمہارا یہ اقدام اثم اور عدوان پر مشتمل ہے اللہ کا حکم ختم کرتے ہو یہ اِثْم ہو گیا اور آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کو تلف کرتے ہو یہ عدوان ہو گیا اگر تمہارے پاس کوئی گرفتار ہو کر آ جائے تو تم ان کو فدیہ دیکر چھڑوا لیتے ہو، حالانکہ حرام کیا گیا ہے تم پر ان کا نکالنا بھی اور قتل کرنا بھی، گھروں سے نکالنا بھی حرام اور قتل کرنا بھی حرام تو ادنیٰ کو ذکر کر دیا اعلیٰ خود آ گیا ان کا نکالنا بھی حرام کیا گیا اور ان کا قتل کرنا بھی حرام کیا گیا۔

لفظ کفر کا استعمال تغلیظاً ہے:

کیا پھر ایمان لاتے ہو بعض کتاب پر اور کفر کرتے ہو بعض کے ساتھ یہاں لفظ کفر کا استعمال کیا گیا ہے لیکن جو تقریر آپ کے سامنے کی گئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مانتے تھے کہ اللہ کے احکام ہیں لیکن مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہوئے ان کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے مانتے تھے کہ اللہ کے احکام ہیں، ہم ان کے مکلف ہیں ہم سے ان کا عہد لیا گیا ہے لیکن مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہوئے ان پر عمل نہیں کرتے تھے اس کو یہاں لفظ کفر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ اگر ایک شخص اللہ کے ایک حکم کو مانتا ہے لیکن وہ اپنی مجبوری یا کسی مصلحت کے ساتھ اس حکم پر عمل نہیں کرتا وہ فاسق ہے کافر نہیں۔

نماز کو فرض مانتا ہے لیکن اپنی سستی ہے یا اس قسم کی دوسری بات ہے، دکانداری کی مصلحت ہے پڑھنے کے لیے نہیں آیا تو ایسی صورت میں اس کو فاسق کہیں گے کافر نہیں کہیں گے۔

اور یہی صورت یہاں ہے، یہاں جو کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہ کفر عملی ہے، یہ لفظ تغلیظاً استعمال کیا گیا ہے جیسے ہماری شریعت میں بھی یوں کہہ دیا جاتا ہے ''من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر'' ترک صلوٰۃ کافروں والا فعل ہے اس کے اوپر کفر کا اطلاق کیا گیا۔

حج کے ذکر کے بعد ہے'' ومن كفر فان الله غني عن العالمين '' کہ اگر کوئی حج نہیں کرتا حج نہ کرنے کو بھی کفر کے ساتھ تعبیر کیا تو اللہ کو کیا پرواہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

عملی کفر کے طور پر اس کو کفر قرار دے دیا گیا یہ تغلیظاً ہوتا ہے یہ کافروں والی حرکت ہے یہ ایسے لوگوں کی حرکت ہے جو سرے سے اللہ کا حکم مانیں ہی نہ ورنہ حکم کو تسلیم کرتے ہوئے عملاً اس کی خلاف ورزی یہ کفر نہیں بلکہ فسق ہے اور فسق کو تغلیظاً کفر کہہ سکتے ہیں، کیا بدلہ ہے ان لوگوں کا تم میں سے جو یہ کام کرتے ہیں سوائے دنیوی زندگی کی رسوائی کے یعنی دنیوی زندگی میں رسوائی کہ تمہیں ذلیل کیا جائے تمہاری یہ برائیاں ظاہر کی جائیں اور پھر ان کوتاہیوں کے نتیجے میں تمہیں دنیا میں پٹوا دیا جائے، ذلیل کر دیا جائے اس کے علاوہ تمہاری اور کیا سزا ہو سکتی ہے یعنی یہی سزا تمہاری شان کے لائق ہے یہی تمہیں ملنی چاہیے دنیا میں رسوائی اور قیامت کے روز لوٹائے جائیں گے اشد العذاب کی طرف اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔

ان سے خطاب ختم کر کے ان کا ایک حال واضح کیا جا رہا ہے گویا کہ مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے یہی لوگ ہیں دنیا دار جو دنیا کو مقدم رکھتے ہیں آخرت کے مقابلے میں ان کو آخرت کی فکر نہیں، دنیوی مصلحتیں دیکھتے ہیں یہ گویا کہ ان کا غائبانہ حال واضح کیا جا رہا ہے، یہی تو ہیں جنہوں نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کو اختیار کر رکھا ہے کہ اگر اللہ کا حکم مانیں تو آخرت آباد ہوتی ہے اور یہ دنیوی مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہیں اللہ کے احکام کی رعایت نہیں رکھتے ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ مدد دیئے جائیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز

البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دے دی اور ان کے بعد پے در پے رسول بھیجے

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا

اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو واضح دلائل دیے اور ہم نے قوت پہنچائی عیسیٰ کو پاکیزہ روح کے ساتھ کیا پھر

جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ج فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ز

جب بھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول اس چیز کو لے کر جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے تو تم نے تکبر کیا پھر ایک فریق کی تم نے تکذیب کی

وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ

اور ایک کو تم قتل کرتے تھے ﴿۸۷﴾ اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کو اللہ نے ملعون قرار دے دیا

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

سو بہت کم ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے آ گئی کتاب وہ تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو ان

مَعَهُمْ لا وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ج فَلَمَّا جَآءَهُمْ

کے پاس ہے اور حال یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ کافروں کے مقابلہ میں فتح طلب کرتے تھے پس جب ان کے پاس وہ چیز آ گئی جس کو انہوں نے

مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ز فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ

پہچان لیا تو اس کے منکر ہو گئے پس اللہ کی لعنت ہے انکار کرنے والوں پر ﴿۸۹﴾ بری چیز ہے وہ جس کو اختیار کر کے

اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

اپنی جانوں کو خرید لیا یہ کہ کفر کریں اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اتارا حسد کرتے ہوئے اس بات پر کہ اللہ

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ج فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ط

اپنے فضل سے اپنے بندوں میں جس پر چاہے نازل فرمائے پس وہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ

اور کافروں کے لیے عذاب ہے ذلیل کرنے والا ﴿۹۰﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا

اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ

تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو اتارا گیا ہم پر، اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ

الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ

حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اس کی جو ان کے پاس ہے آپ فرما دیجیے سو تم کیوں اللہ کے نبیوں کو اس

قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ

سے پہلے قتل کرتے رہے ہو اگر تم مؤمن ہو ﴿۹۱﴾ اور بلا شبہ موسیٰ تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے پھر

اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا

تم نے ان کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا حالانکہ تم ظالم تھے ﴿۹۲﴾ اور جب ہم نے تم سے پختہ

مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ

عہد لیا اور بلند کر دیا تمہارے اوپر طور کو، لے لو جو کچھ ہم نے تم کو دیا قوت کے ساتھ اور سن لو،

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ

وہ کہنے لگے ہم نے سن لیا اور مانیں گے نہیں، اور پلا دیا گیا ان کے دلوں میں بچھڑا (کی محبت) ان کے کفر کے سبب،

قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ

آپ فرما دیجیے کہ بری ہیں یہ باتیں جن کا تمہیں حکم دیتا ہے تمہارا ایمان اگر تم مؤمن ہو ﴿۹۳﴾ آپ فرما دیجیے اگر

كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ

آخرت والا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے ہی لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ

تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو ﴿۹۴﴾ اور وہ ہرگز کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو انہوں نے

اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ

آگے بھیجے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ﴿۹۵﴾ اور یہ واقعی بات ہے کہ تم ان لوگوں کو زندہ رہنے پر سب لوگوں سے زیادہ حریص پاؤ گے

وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا

ان لوگوں سے بھی زیادہ جنہوں نے شرک کیا ان کا ایک ایک فرد یہ آرزو رکھتا ہے کہ اس کو ہزار سال کی عمر دے دی جائے اور حال یہ ہے

هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

کہ اسے یہ بات عذاب سے بچانے والی نہیں ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہو جائے اور اللہ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو وہ کرتے ہیں (۹۶)

لغوی صرفی تحقیق:

"ولقد آتینا موسیٰ الکتاب" البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، کتاب سے توراۃ مراد ہے۔

" وقفینا من بعدہٖ بالرسل " قف کسی کے پیچھے بھیجنا، قفاء کہتے ہیں سر کے پچھلے حصے کو جس کو ہم گدی کہتے ہیں کسی کے پیچھے کسی دوسرے کو لگا دینا یہ قف ہے اور اِقْتفیٰ یہ باب افتعال سے ہے کسی کے پیچھے چلنا اقتداء کے معنی میں، موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہم نے پے در پے رسول بھیجے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے ایک دوسرے کے پیچھے بھیجے۔

"من بعدہٖ" موسیٰ علیہ السلام کے بعد۔

پے در پے کا لفظی معنی بھی یہی ہے کہ ایک دوسرے کے پیچھے ہم نے رسول بھیجے۔

"واتینا عیسی ابن مریم البینٰت" البینٰت یہ اتینا کا مفعول ہے اور ہم نے مریم علیہا السلام کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح دلائل دیئے، واضح معجزات جو ان کی نبوت کے دلائل تھے، وایدنہ اید تائید ایدً قوت کو کہتے ہیں ایَّدَ قوت پہنچانا۔

یہ جو لوگ ایک دوسرے کی بات کی تائید کیا کرتے ہیں تو وہاں بھی مراد یہی ہوتی ہے کہ میں اس کی بات کے ساتھ اپنی رائے شامل کر کے اس کو قوت پہنچاتا ہوں میں اس بات کی تائید کرتا ہوں تو تائید کا یہی معنی ہوتا ہے کہ اپنی رائے اس کے ساتھ شامل کر کے آپ اس کو قوت پہنچاتے ہیں یہ دعویٰ مؤید بالدلیل ہے عام طور پر آپ گفتگو میں استعمال کرتے ہوں گے تو مؤید بالدلیل کا مطلب یہی ہے کہ اس دعوے کو دلیل کے ساتھ قوت پہنچائی ہوئی ہے۔

" اید نا " ہم نے قوت پہنچائی، ہم نے تائید کی عیسیٰ علیہ السلام کی، ہم نے قوت پہنچائی عیسیٰ علیہ السلام کو۔

"بروح القدس" پاکیزہ روح کے ساتھ، قدس یہ مصدر ہے مُقَدَّس کے معنی میں الروح المقدس پاکیزہ روح کے ساتھ ہم نے اس کو قوت پہنچائی اور روح القدس کا مصداق حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

"افکلماجاء کم رسول " کیا پھر جب کبھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول۔

"بمالاتھویٰ انفسکم "ایسی چیز لے کر جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے۔

"لا تھویٰ انفسکم " ھَوِیَ یَھْوٰی چاہنا، ھَوٰی خواہش لاتھویٰ انفسکم تمہارے دل اس کو نہیں چاہتے بِما کے اوپر باء تعدیہ کی ہے، جاءَ فعل لازم ہے، آیا اس کا معنیٰ ہے اور باء تعدیہ کی آ گئی تو اب اس کا ترجمہ ہوگا لایا اس لیے میں ترجمہ یوں کرر ہاہوں "ایسی چیز لے کر" یہ جاء کے اندر تعدیہ کر دیا با نے، کیا پھر جب کبھی لائے تمہارے پاس رسول ایسی چیز جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے جس کے اوپر تم اکڑ گئے، تم نے تکبر کیا حق کو قبول نہ کیا چونکہ تکبر کی حقیقت یہی ہے کہ حق بات کو قبول نہ کیا جائے۔

"ففریقا کذبتم " پھر ایک فریق کی تم نے تکذیب کی، ایک فریق کو تم نے جھوٹا بتلایا اور ایک کو تم قتل کرتے تھے۔

"وقالوا " اور یہودی کہتے ہیں۔

" قلوبنا غلف " غلف یہ اغلف کی جمع ہے، اغلف اس چیز کو کہتے ہیں جس کے اوپر غلاف چڑھا ہوا ہو، قلوبنا غلف کا معنی ہے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے دلوں پر حجاب طاری ہے، ہمارے دل پردے میں ہیں ان کے اوپر غلاف چڑھا ہوا ہے۔

" بل لعنھم الله "بل کا مطلب یہ ہے کہ غلاف نہیں چڑھا ہوا بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے ان کے کفر کے سبب سے۔

"فقلیلامایو منون" قلیلا ما بہت کم اور یہ نفی کا مفہوم ادا کرتا ہے پھر یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں جس کا مفہوم یہی ہے کہ ایمان نہیں لاتے یا کم ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ باتیں تو مان لیتے ہیں جو ان کی خواہشات کے مطابق ہیں اور جو باتیں ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہیں ان کو نہیں مانتے اور ایمان میں تجزی نہیں ہے کہ تھوڑا سا ایمان لایا جائے اور تھوڑا سا نہ لایا جائے ایمان تو مکمل ہوتا ہے اگر اس میں کسی ایک جزء کا بھی انکار آ جائے تو کفر آ جاتا ہے۔

"ولماجاء ھم کتٰب من عند الله "اور ان کے پاس جب کتاب آ گئی اللہ کی طرف سے (اس کتاب کا مصداق قرآن کریم ہے)

"مصدقالمامعھم "وہ کتاب سچ بتلانے والی ہے اُس کتاب کو جوان کے پاس ہے، تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جوان کے ساتھ ہے۔

" وکانوا من قبل " قبل مبنی برضم ہے کیونکہ اس کا مضاف الیہ منوی محذوف ہے، وکانوامن قبل ، اس کتاب کے آنے سے قبل۔

"یستفتحون "فتح طلب کیا کرتے تھے۔

"علی الذین کفروا" کافرلوگوں کے مقابلے میں، اوراس کتاب کے آنے سے قبل یہ فتح طلب کیا کرتے تھے ان لوگوں کے مقابلے میں جنہوں نے کفر کیا۔

" فلماجاء ھم ماعرفوا"جب آ گئی ان کے پاس وہ چیز جس کو یہ پہچانتے ہیں جس کوانہوں پہچان لیا۔

" وکفروابہٖ"اس کاانہوں نے انکار کر دیا۔

" فلعنة الله علی الکفٰرین "اوران انکار کرنے والوں پر اللہ کی لعنت۔

"بئسمااشتروابہ انفسھم " اشتراء اصل کے اعتبار سے تو خرید وفروخت کے مفہوم میں ہوتا ہے ایک چیز کو چھوڑ کر اس کے بدلے میں دوسری چیز کو لے لینا اس کے لیے بھی اشتراء کا لفظ استعمال ہوتا ہے، بری ہے وہ چیز جس کے ساتھ خریدا انہوں نے اپنی جانوں کو یا بری ہے وہ چیز جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنی جانوں کو۔

" ان یکفروابماانزل الله " وہ چیز کیا ہے یہ ہے مخصوص بالذم یعنی کفر کیا انہوں نے اس چیز کا جو اتاری اللہ نے، کفر کیا بغیا آپس میں ضد کی وجہ سے، ضد اس بات پر۔

" ان ینزل الله من فضلہٖ " کہ اتارے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے۔

"علی من یشاء "جس پر چاہے۔

"من عبادہٖ" اپنے بندوں میں سے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کوئی چیز اتارے اس بات پر انہیں ضد ہے کہ ایسے کیوں ہوا ہماری مرضی کے مطابق کیوں نہیں اتری جس پر ہم چاہتے وہاں اترتی اس بات پر حسد کرتے ہوئے، ضد کرتے ہوئے انہوں نے کفر اختیار کیا۔

" فباء وابغضب علیٰ غضب "پس لوٹے وہ غضب بالائے غضب کے ساتھ، مستحق ہو گئے وہ غضب بالائے غضب کے، غضب پر غضب آ گیا جس طرح سے نور علی نور کہتے ہیں، اس طرح سے ان کا کفر یہ بھی

اللہ کے غضب کا باعث، اور حسد یہ بھی اللہ کے غضب کا باعث یا وہ پہلے توراۃ کے اندر میثاق لیے گئے تھے ان کی مخالفت کرنے کی بناء پر بھی مغضوب تھے اب اللہ کی طرف سے جو نئی کتاب اتری ہے اس کا انکار کر کے اب مزید مغضوب ہو گئے تو یہ غضب علیٰ غضب ہو گیا۔

لوٹے وہ غضب علیٰ غضب کے ساتھ اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ مھین کے معنیٰ ذلیل کرنے والا۔

" واذاقیل لھم امنوا" اور جس وقت انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ۔

"بماانزل اللہ "اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اتاری۔

"قالوانؤمن بما انزل علینا" وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز کے ساتھ جو ہم پر اتاری گئی۔

"و یکفرون بماوراءہ" اور یہ انکار کرتے ہیں اس چیز کا جو اس کے علاوہ ہے، جو ان پر اتاری گئی اس پر تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔

"وھوالحق مصدقالمامعکم " حالانکہ وہ حق ہے واقعے کے مطابق ہے جو کچھ اللہ نے اتارا اور تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو ان کے ساتھ ہے۔

"قل " آپ کہہ دیجئے۔

" فلم تقتلون انبیاء اللہ " پھر تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے۔

" من قبل "اس کتاب کے آنے سے پہلے قرآن کریم کے آنے سے قبل تم انبیاء علیہم السلام کو کیوں قتل کرتے رہے،"ان کنتم مؤمنین "اگر تم ایمان والے ہو۔

"ولقد جاء کم موسیٰ بالبینٰت "البتہ تحقیق موسیٰ علیہ السلام آئے تمہارے پاس واضح دلائل لے کر۔

"ثم اتخذتم العجل من بعدہٖ " پھر موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اتخذتم کا دوسرا مفعول محذوف ہے، بنا لیا تم نے بچھڑے کو معبود،

"وانتم ظلمون "اور تم ظلم کا ارتکاب کرنے والے تھے شرک کا ارتکاب کرنے والے تھے، کیونکہ " ان الشرک لظلمٌ عظیم "میں شرک کو ظلم قرار دیا گیا ہے تم بہت ہی ظلم ڈھانے والے تھے، بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے بڑا ہی ظلم ڈھایا۔

"واذ اخذنا میثاقکم "اور یاد کیجئے جس وقت ہم نے تمہارا پختہ عہد لیا۔

" ورفعنا فوقکم الطور "اور تمہارے اوپر پہاڑ کو اٹھایا۔

"خذو اماآتینکم "اور کہا ہم نے کہ لو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے۔

" بقوۃ"خذوا کے متعلق ہے پکڑو اس چیز کو قوت کے ساتھ جو ہم نے تمہیں دی ہے۔

" واسمعوا"اور سنو۔

"قالوا سمعنا "انہوں نے کہا ہم نے سن لیا۔

"وعصینا "اور ہم نے نہ مانا عصینا نافرمانی کرنا ہم نے سن لیا اور نہ مانا۔

"واشربوا فی قلوبھم العجل " عجل بچھڑا ہو گیا اشربوا پلائے گئے وہ اپنے دلوں میں حب العجل بچھڑے کی محبت ، پلائے گئے کا مطلب یہ ہے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں سرایت کر گئی جس طرح سے زمین پر آپ پانی گرا دیں زمین کو آپ پلاتے ہیں سیراب کرتے ہیں تو وہ پانی چوس لیتی ہے پانی اندر سرایت کر جاتا ہے اسی طرح بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں سرایت کر گئی پلائے گئے وہ اپنے دلوں میں بچھڑے کی محبت بکفرھم ان کے کفر کے سبب سے۔

" قل بئسما یأمرکم بہ ایمانکم " آپ کہہ دیجئے کہ بری ہے وہ بات جس کا حکم دیتا ہے تمہیں تمہارا ایمان۔

" ان کنتم مؤمنین "اگر تم مومن ہو۔

"قل " آپ یہ فرما دیجئے۔

" ان کانت لکم الدار الاخرۃ "اگر تمہارے لیے آخرت کا گھر ہے اللہ کے نزدیک۔

" خالصۃً" خالص۔

"من دون الناس "دوسرے لوگوں کے علاوہ ،اگر آخرت کا گھر خالص تمہارے لیے ہی ہے۔

"فتمنوالموت "پھر تم موت کی تمنا کرو۔

" ان کنتم صٰدقین "اگر تم سچے ہو۔

"ولن یتمنوہ ابداً "اور ہرگز نہیں تمنا کریں گے یہ موت کی کبھی بھی۔

" ابدالن یتمنوہ " "لن "بھی مستقبل کی نفی کے استغراق کے لیے آیا کرتا ہے لیکن ابداً نے اس کی اور بھی زیادہ تاکید کر دی ، ہرگز تمنا نہیں کریں گے اس موت کی کبھی بھی۔

"بما قدمت ایدیھم" بسبب ان کرتوتوں اوران اعمال کے جوان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں اوراللہ تعالیٰ ظالموں کوخوب جاننے والا ہے۔

"ولتجدنھم احرص الناس علی حیٰوۃ" البتہ ضرور پائے گا توان کوسب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر،احرص الناس سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر۔

" ومن الذین اشرکوا "اوران لوگوں سے بھی زیادہ جومشرک ہیں،مشرکوں سے بھی زیادہ ان کوزندگی کی حرص ہے۔

" یودُّ احدھم "ان میں سے ہرکوئی چاہتا ہے۔

" لو یعمر الف سنۃٍ " کہ وہ دے دیا جائے عمر ہزار سال یہ لو مصدر یہ ہے ان میں سے ہرکوئی چاہتا ہے کہ اس کو ہزار سال عمر دے دی جائے ہزار سال عمر دیا جانا ان میں سے ہرکوئی چاہتا ہے۔

" یوداحدھم " چاہتا ہے ان میں سے ہرکوئی "لو یعمر الف سنۃ" کہ دے دیا جائے عمر ہزار سال اور ہزار سال یہ محاورہ ہے کثرت کے ساتھ لمبی عمر، باقی ہزار سال ہی مطلوب نہیں ہوتا مطلب ہے کہ عمر لمبی ہو جیسے دعاؤں کے اندر ذکر کیا کرتے ہیں۔

مرزا غالب کا شعر بھی ہے، بادشاہ کو دعا دیتے ہوئے اس نے کہا تھا

تم زندہ رہو ہزار برس اور
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ ہزار سال کا لفظ مبالغے کے طور پر ہے کہ ایک تو عمر ہزار سال ہو اور ہر برس کے دن پچاس ہزار سال ہوں ویسے تو سال تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے لیکن تجھے جو ہزار برس زندگی ملے تو ہر سال پچاس ہزار سال کا ہو تو ہزاروں کا لفظ مبالغۃً بولا جایا کرتا ہے تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے چاہتا ہے ان میں سے ہرکوئی کہ دیا جائے عمر ہزار سال۔

" وماھو بمزحزحہٖ " ھو ضمیر راجع ہے اس ہزار سال عمر کی طرف، یہ ہزار سال عمر کا دیا جانا اس شخص کو عذاب سے دور ہٹانے والا نہیں، وماھو بمزحزحہٖ من العذاب ان یعمر ان یعمر یہ ھو کا بیان ہے، نہیں اس کو بچانے والا عذاب سے، ان یعمر عمر کا دیا جانا اس کو عذاب سے دور ہٹانے والا نہیں " واللہ بصیر بما یعملون " اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو یہ کرتے ہیں۔

تفسیر:

بنی اسرائیل کی قباحتوں کے ذکر سے مقصود:

واقعات چلے آرہے ہیں بنی اسرائیل کے متعلق جیسا کہ ترجمے میں آپ نے دیکھ لیا انہی کی قباحتیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں، ان کی سنگ دلی، حسد، تکبر اہل حق کے ساتھ ان کی مخالفت، ضد ان واقعات کے اندر نمایاں کی گئی، پچھلے رکوع میں دو دفعہ ذکر آیا تھا کہ بنی اسرائیل سے اللہ نے میثاق لیا تھا، پہلے اخلاق عالیہ اور اچھے عقائد کا اور پھر ان کے بعد اپنے قبائل کے متعلق کہ آپس میں ''سفك الدماء'' نہیں کرنا ایک دوسرے کا اخراج نہیں کرنا کوئی گرفتار ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑانا یہ دو دفعہ میثاق کا ذکر پچھلے رکوع میں آیا ہے۔

اگلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ اسی میثاق کو یاد دلانے کے لیے جس طرح سے ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب اتاری تھی جس کے اندر ان میثاقوں کا ذکر تھا اس کے بعد بھی ہم رسولوں کو پے در پے بھیجتے رہے جو ان کو اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو یاد دلاتے رہے، لیکن یہ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی پرواہ کی نہ توراۃ کے اندر مندرج ان مواعظ کا خیال رکھا اور نہ انبیاء علیہم السلام کی تنبیہات سے یہ متنبہ ہوئے بلکہ انہوں نے بد عملی اختیار کی اور جس وقت اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آکر ان کو ان کی خواہشات نفس سے روکتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام ان کے سامنے ذکر کرتا جو ان کے ھویٰ نفس کے مطابق نہ ہوتے ان کی خواہشات کے خلاف ہوتے تو یہ اتنے دلیر ہیں کہ یا تو ان انبیاء علیہم السلام کو جھٹلاتے اور بعض انبیاء علیہم السلام کو انہوں نے قتل ہی کر دیا اور وہ انبیاء علیہم السلام ایسے تھے جو حامل توراۃ تھے اور توراۃ کے وعظ ان کے سامنے کہتے تھے، توراۃ کے اندر درج میثاق کی ان کو یاد دہانی کرواتے تھے تو یہ ایسے چور ہیں اور ایسے دلیر چور ہیں۔

جو انبیاء علیہم السلام کے وعظوں سے متاثر نہیں ہوئے خاص طور پر وہ انبیاء علیہم السلام جو انہی کے قبیلے کے تھے، انہی کی کتاب کے حامل تھے ان سے تم کیا توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان جائیں گے اس طرح سے ان کی قباحت کو ظاہر کیا جا رہا ہے جس سے ان کو ایک طرح سے دنیا کے سامنے بھی رسوا کرنا مقصود ہے تا کہ ان کی وہ علمی ریاست ختم ہو تا کہ لوگوں کے اوپر سے ان کے اثرات ختم ہوں۔

اگر یہ نہیں مانتے تو کم از کم ان کا حلقہ یاراں تو کم ہو جائے جب لوگوں پر ان کے اثرات کم ہوں گے اور ان کی بدمعاشیاں ظاہر ہوں گی تو پھر کم از کم عوام تو سمجھانے سے سمجھ جائیں گے۔

جیسے ایک پیر ہو اور مرید اس کے پیچھے اندھا دھند لگے ہوئے ہیں تو اس پیر کے کردار پر تنقید کی جاتی ہے بظاہر اس کو سمجھایا جاتا ہے کہ تو باز آجا اب اس میں دو مقصد ہوتے ہیں کہ اگر یہ باز آجائے گا تو بہتر پھر بھی سارے

مرید ٹھیک ہو جائیں گے اور اگر یہ باز نہیں آئے گا تو کم از کم اس تنقید کے ساتھ اس کے اخلاقی احوال کھلیں گے تو لوگوں کی عقیدت میں فرق آ جائے گا تو لوگ اس کے پیچھے نہیں لگیں گے، جب لوگ اس کے پیچھے نہیں لگیں گے تو وہ سمجھانے سے سیدھے راستے پر بھی آ سکتے ہیں۔

تو ان اہل کتاب کی جو قباحتیں ظاہر کی جارہی ہیں اس میں دونوں باتیں ہیں کہ ایک تو ان کو بھی ذہنی مار دینی مقصود ہے کہ تم اس تکبر کو چھوڑ دو، یہ بدکرداریاں تمہارے لیے اچھی نہیں ہیں لیکن اگر وہ باز نہیں آئیں گے تو کم از کم عوام کے سامنے تو ان اہل علم کا حال آ جائے گا، جب ان اہل علم کا حال عوام کے سامنے آ جائے گا تو عوام پر سے ان کے اثرات ختم ہو جائیں گے اور پھر دوسرے کے سمجھانے سے ان کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول پے در پے بھیجے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ہم نے واضح معجزات دیئے اور عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے روح القدس کے ساتھ قوت پہنچائی پھر تمہارا یہ حال تھا یعنی تم پر یہ حال طاری ہوا۔

حق کو قبول نہ کرنا تمہارے ملعون ہونے کی علامت ہے:

”کلما“ کہ جب کبھی آتا تمہارے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر جس کو تمہارے دل نہیں چاہتے۔

”استکبرتم“ تم اکڑ گئے، تمہارا معمول ہی یہی ہے کہ جب بھی تمہاری خواہش کے خلاف کوئی حکم دیا گیا تم نے تکبر اختیار کیا، پھر ایک فریق کو تم نے جھٹلایا جھوٹا بتلایا اور ایک فریق کو تم نے قتل ہی کر دیا اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے یہ بات بطور فخر کہتے تھے کہ ہمارے دل تو اس طرح سے غلاف میں ہیں کہ جو باہر کی بات ہمارے مذہب کے، ہمارے مسلک کے خلاف ہے ہمارے دلوں پر اثر انداز ہی نہیں ہوتی ہمارے دل اس طرح سے پردے میں ہیں کہ تم جو کچھ کہتے رہو تمہاری بات ہمارے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

وہ فخر اس طرح سے کرتے تھے گویا کہ ہم اپنے مذہب پر اس طرح سے پکے ہیں اور اپنے خیالات پر اتنے ٹھوس ہیں کہ ہمارے خیالات اور ہمارے نظریات کے خلاف جو کچھ آئے گا ہمارے دل کی اپنے نظریات پر اتنی مضبوطی ہے کہ باہر کی کوئی بات اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ مضبوطی نہیں یہ تو لعنت کا اثر ہے جو حق تمہارے دل قبول نہیں کرتے یہ لعنت پڑنے کی وجہ سے حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے یہ کونسی فخر کی بات ہے؟ کوئی شخص حق کو قبول نہ کرے اور اپنے

غلط نظریے کے اوپر ڈٹا رہے تعصب میں مبتلا ہو یہ کون سی دل کی مضبوطی ہے یا یہ دل کے مضبوط ہونے کی علامت ہے؟ یہ تو مردود ہونے کی علامت ہے، یہ تو اللہ کی طرف سے لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے جس کی وجہ سے اپنی خواہشات کے خلاف حق بات انسان قبول نہیں کرتا۔

ان کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ تو تمہارے ملعون ہونے کی علامت ہے اتنی اتنی واضح باتیں تمہارے سامنے بیان کی جارہی ہیں اور اتنے دلائل کے ساتھ مدلل کیا جا رہا ہے وہ بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتیں اور پھر تم فخر کرتے ہو کہ ہمارے دل مضبوط ہیں اور ہم اپنے نظریات پر اتنے پکے ہیں کہ ہر بات سے متاثر نہیں ہوتے یہ فخر کی بات نہیں ہے۔

کہتے ہیں " قلوبنا غلف " ہمارے دل پردوں میں ہیں غلف اغلف کی جمع ہے " بل " کا مطلب پردے میں نہیں اور نہ ہی فخر کی بات ہے بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے ان کے کفر کے سبب سے۔

" وقلیلا ما یؤمنون " اور پھر یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں اور کم وہی ہے جو ان کی اپنی خواہشات کے موافق ہو لیکن اس قسم کا کم ایمان کسی کام کا نہیں جس کی بناء پر قلیلا ما یہ نفی کے لیے ہو گیا کہ یہ ایمان نہیں لاتے ان کو ایمان نصیب ہی نہیں ہوتا۔

جس نبی کے طفیل فتح مانگتے تھے اسی کے منکر ہو گئے:

آگے بھی ان کی وہی ضد بیان کرنی مقصود ہے اس میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ یہود کے علم میں تو تھا کہ ایک پیغمبر آخر الزمان آنا ہے اور ایسی کتاب اس کے اوپر اترنی ہے اور یہ یہود منتظر ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جب اس قسم کا پیغمبر آئے گا اور کتاب آئے گی ہم اس پر ایمان لائیں گے کیونکہ اس کے آنے کے ساتھ ہی ہمارے بدبختی کے دن تبدیل ہونے ہیں اور ارد گرد کے مشرکین سے یہ کہا کرتے تھے۔

اب تو تم ہم پر زیادتیاں کر لو جو تم کر سکتے ہو جس وقت وہ پیغمبر آجائے گا ہم ان پر ایمان لے آئیں گے اور ان کے ساتھ مل کر ہم تمہارا مقابلہ کریں گے اس طرح سے لوگوں کے سامنے بیان کرتے رہتے تھے اور تاریخی واقعات میں یہ بات لکھی ہے کہ انصار مدینہ نے سنتے ہی فوراً بغیر کسی تأمل کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کر لیا مکہ معظمہ میں جا کر ایمان لے آئے ان کے فوراً ایمان لانے کی وجہ یہی لکھی ہے کہ یہ یہود سے اکثر اس قسم کے تذکرے سنتے رہتے تھے جب وہ حج کے لیے آئے جاہلیت کے زمانے میں بھی لوگ حج کرتے تھے جب حج کے لیے آئے اور یہاں آکر ان کے حالات دیکھے تو فوراً ان کے ذہن نے کام کیا کہ یہ تو وہی پیغمبر معلوم ہوتے ہیں جس کے یہود منتظر ہیں۔

ایسا نہ ہو کہ یہود پہلے آکر قبول کر لیں اور ان کو ساتھ لے کر پھر وہ ہمارے اوپر غالب آئیں کیوں نہ ہم پہلے

قبول کرلیں ان کو ہم اپنے ساتھ شامل کرلیں یہود کو موقع ہی نہ ملے کہ وہ ان کو لے لیں اس لیے انصار نے سنتے ہی فوراً سبقت کی اور ان کو قبول کرلیا اور ان کے قبول کر لینے کی وجہ سے پھر وہ یہود ضد میں آگئے یہ باتیں انصار نے پہلے سنی ہوئیں تھیں جاہلیت کے زمانے میں سنتے رہتے تھے اس لیے جب اس پیغمبر کے حالات معلوم ہوئے تو فوراً قبول کرلیا یعنی نبی علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔

اس لیے استفتاح کا معنی یہ بھی ہے کہ کھول کھول کر بیان کرتے تھے بیان القرآن میں ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے کہ اس سے قبل وہ کھول کھول کر بیان کرتے تھے ان لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا کہ ایسا پیغمبر آنے والا ہے دوسرا ترجمہ جسے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا کہ فتح طلب کرتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے عربی تفاسیر میں لکھا ہے کہ وہ جب کبھی دعا کرتے دشمنوں کے مقابلے میں یوں کہتے کہ اے اللہ نبی آخر الزمان اور اس پر اترنی والی کتاب کے وسیلے سے اور اس کے طفیل ہمیں فتح نصیب فرما۔

اپنی دعا کے اندر کسی کے ساتھ توسل کرنا وسیلہ پکڑنا یہ علامت ہے اس بات کی کہ ان کے دلوں کو یقین تھا کہ ایک نبی برحق آنے والا ہے اور اللہ کے ہاں اتنا مقبول ہوگا کہ اگر اپنی دعاؤں کے اندر ہم اس کا تذکرہ کریں تو ہماری دعا قبول ہوگی، تو استفتاح کا یہاں معنی کہ فتح طلب کرتے تھے یعنی اس کتاب کے توسل سے آنے والے پیغمبر کے طفیل وہ فتح طلب کیا کرتے تھے اور ان کی یہی دعائیں عربی تفاسیر میں نقل کی گئی ہیں۔

اے اللہ! ہمیں اس آنے والے پیغمبر کے طفیل اترنے والی کتاب کے وسیلے سے ہمیں ہمارے دشمنوں پر فتح نصیب فرما تو جب وہ ان دعاؤں کے اندر ذکر کرتے تھے تو ان کو کتنا یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے اور ایک کتاب اترنے والی ہے اور جب ان کی جانی پہچانی ہوئی چیز ان کے سامنے آگئی تو حسد کی بناء پر انکار کر بیٹھے اس سے ان کا اخلاقی زوال معلوم ہوتا ہے یہ کتنی حق پرستی ان کے اندر ہے کہ لوگوں کے سامنے بڑے اللہ والے اور حق پرست بن کر پیش ہوتے ان کی حق پرستی کا یہ حال ہے۔

یہ ان کا کردار اس طرح سے واضح کیا جارہا ہے، ان کے پردے کھولے جارہے ہیں جس سے ممکن ہے کہ یہ خود بھی متاثر ہوں اگر خود متاثر نہیں ہوں گے تو کم از کم لوگوں کے سامنے تو ان کا اخلاقی زوال آئے گا۔

جب آئی کتاب ان کے پاس اللہ کی جانب سے جو تصدیق کرنے والی ہے اس کی جو ان کے پاس ہے اور وہ اس کے آنے سے قبل فتح طلب کیا کرتے تھے اس کے ساتھ کافروں کے مقابلے میں یعنی اس کتاب کے

توسل سے یا کافروں پر اس کو کھول کھول کر بیان کرتے تھے اس کے بڑے کھل کھل کے تذکرے کیا کرتے تھے آنے والی کتاب کے اور آنے والے پیغمبر کے دونوں طرح سے مفہوم ہے کھل کھل کے تذکرے کرتے تھے واضح طور پر بیان کرتے تھے یہ مفہوم اختیار کیا ہے بیان القرآن میں اور فتح طلب کرتے تھے یہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے اور عربی تفاسیر میں زیادہ تر فتح طلب کرنے والے معنی کو ترجیح دی گئی ہے۔

اور اس کا مطلب یہی بیان کیا گیا ہے کہ اپنی دعاؤں کے اندر اس کتاب کا اور آنے والے پیغمبر کا وسیلہ پکڑتے تھے دشمنوں کے مقابلے میں فتح طلب کیا کرتے تھے۔

"فلما جاء هم ما عرفوا" جب ان کی جانی پہچانی چیز ان کے پاس آگئی یہ نہیں کہ کوئی انجانی چیز تھی پتہ نہیں تھا کہ کیا آگئی یا اس کے متعلق پہلے کوئی اشارہ موجود نہیں ماعرفوا جانی پہچانی چیز جس کو انہوں نے پہچان لیا۔

"کفروا به" اس کے منکر ہو گئے اس کا انکار کر دیا۔

"فلعنة الله علی الکفرین" ایسے کافروں پر اللہ کی لعنت جو جان بوجھ کر آنکھیں بند کرتے ہیں اور جانی پہچانی چیز کا بھی انکار کر دیتے ہیں سارے کافر موجب لعنت ہیں مگر ایسے کافر دیدہ دلیری کرنے والے کہ جن کے تذکرے کرتے تھے، اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے جب وہ چیز سامنے آئی تو فوراً انکار کر دیا لعنت پھٹکار، اللہ کی رحمت سے دوری ہے۔

بُری ہے وہ چیز جس کو یہودی اختیار کرتے ہیں:

"بئسما اشتروا به انفسهم" بری ہے وہ چیز جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپا دیا، محاورے کے طور پر ترجمہ یہ ہوگا کیونکہ جب انسان اپنی استعداد صرف کرتا ہے اور مقابلے میں ایک چیز کماتا ہے تو یوں سمجھو کہ اپنی جان صرف کر کے یہ چیز کمائی انہوں نے اپنی جانوں کو صرف کر کے کیا کمایا؟ کفر، یا جس چیز کے ذریعے سے یہ اپنی جانوں کو اللہ کے عذاب سے چھڑانا چاہتے ہیں وہ چیز بہت بری ہے وہ کون سی چیز ہے؟ وہ کفر ہے، یہ کفر کر کے اللہ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہیں یعنی داعیہ تو ان کے دل میں یہ ہے کہ ہمیں عذاب نہ ہو اس عذاب سے بچنے کے لیے اپنی جانوں کو چھڑانے کے لیے کیا اختیار کیا؟ کفر بھلا کفر کے ذریعے سے بھی کبھی کوئی اللہ کے عذاب سے بچا ہے اور یہ اپنی جانوں کو چھڑا سکتے ہیں؟۔

بری ہے وہ چیز جس کے ذریعے سے چھڑاتے ہیں یہ اپنی جانوں کو وہ بری بات یہ ہے کہ کفر کیا انہوں نے اس چیز کا جو اللہ نے اتاری اور کفر بھی کس بناء پر کیا حسد کی بناء پر ضد کی بناء پر ضد اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اتارے اس بات پر ان کو ضد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا کیوں اتار دیا، اس سے ان کو آگ لگ گئی کہ اگر یہ کتاب دینی تھی تو ہمیں دیتے، پیغمبر اٹھانا تھا تو ہم میں سے اٹھاتے، اب وہ اللہ پر پابندی لگانا چاہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کتاب کیوں اتارتا ہے اس بات پر ان کو ضد ہے۔

یا ترجمہ والے مفہوم کے ساتھ تفسیر یوں کر لیجئے بری ہے وہ چیز جس میں کھپایا انہوں نے اپنی جانوں کو اور وہ چیز یہ ہے کہ کفر کیا انہوں نے اس چیز کے ساتھ جو اتاری اللہ نے ضد کی وجہ سے۔

" فباء وابغضب علی غضب " تو ان کے انہی کردار اور انہی جذبات کی وجہ سے ان کے اوپر مسلسل غضب کی بارش ہوئی یہ غضب علیٰ غضب کے مستحق ہو گئے کفر بھی غضب کا باعث اور پھر حسد یہ بھی غضب کا باعث یا پہلے توراۃ کی مخالفت اس سے بھی اللہ کے مغضوب ٹھہرے اور آنے والی جانی پہچانی کتاب ان کے سامنے آئی تو اس کا انکار کیا تو اس سے مزید غضب میں اضافہ ہوا تو غضب علی غضب کے ساتھ یہ لوگ لوٹے مستحق ہو گئے یہ غضب علی غضب کے اور ان کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

اس سے بڑھ کر یہود کی ضد اور کیا ہوگی؟

" واذا قیل لھم امنوا بما انزل اللہ " اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اتاری تو یہ کہتے ہیں ہم ایمان لائیں گے اسی چیز کے ساتھ جو ہم پر اتاری گئی اور وہ انکار کرتے ہیں اس کے علاوہ ہر چیز کا۔

وہ کہتے ہیں ناں بھئی ہم پر جو کتاب اتری ہوئی ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے ہمارا ایمان تو اسی پر ہے ہم تو اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کو مانیں گے اور جو کتاب ہم پر نازل کی گئی تھی ہم تو اسی کو ہی مانیں گے اور اس کے علاوہ ہم کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

" یکفرون بما وراءہ " یہ خود ان کے حسد کا اظہار ہے۔

" وھو الحق " حالانکہ جو چیز آئی وہ حق ہے، واقعے کے مطابق ہے حق اور واقعے کے مطابق ہونا یہ خود تقاضہ کرتا ہے کہ اس کو قبول کیا جائے۔

" مصدقا لما معھم " جو کتاب ان کے پاس ہے یہ اُس کی مصداق ہے اس کو سچا قرار دیتی ہے یہ بھی تقاضہ کرتی ہے کہ اس کتاب کو تسلیم کیا جائے کیونکہ اس کتاب کو تسلیم کریں گے تو ان کی کتاب توراۃ سچی ثابت ہوتی

ہے ورنہ ان کی کتاب توراۃ بھی ثابت نہیں ہوتی یہ تو مقتضی ہیں کہ جو اللہ نے اتارا یہ مانیں لیکن اس چیز کو وہ تسلیم نہیں کرتے اس حق کو چھوڑے بیٹھے ہیں اور جو کتاب ان کی کتاب کی مصدق ہے اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں اور کہتے ہیں پس ہمارا تو توراۃ پر ایمان ہے۔

یہود کے ایمان کی حالت:

اب اگلی بات کا انداز سمجھ لیجیے، گفتگو جب ہوا کرتی ہے تو دو پہلو ہوا کرتے ہیں کہ تم اس بات کو کیوں نہیں مانتے جب یہ حق ہے اور جب یہ جو تمہارے پاس کتاب ہے اس کا مصداق ہے پھر تم کیوں نہیں مانتے یہ تو ایک پہلو ہوگیا پھر تم جو کہتے ہو کہ ہمارا توراۃ پر ایمان ہے تو ہم بتائیں تمہارے ایمان کی کیا شان ہے یہ تو تم نے محض ضد کی وجہ سے دعویٰ کر رکھا ہے کہ ہمارا توراۃ پر ایمان ہے تمہارے ایمان کا حال ہم تمہیں بتاتے ہیں اگر تم اتنے ہی پکے ہو توراۃ پر تو کم از کم جو انبیاء علیہم السلام اس توراۃ کے مبلغ تھے تو بدبختو ان کو تو قتل نہ کرتے جب انبیاء علیہم السلام کو بھی تم نے قتل کر دیا تو تمہارا کیا ایمان ہے توراۃ پر اگر تم اسی بات پر ڈٹے ہوئے ہو کہ تمہارا توراۃ پر ایمان ہے، تم بڑے پکے سچے مؤمن ہو تو جو اس سے قبل توراۃ کے مبلغ آئے تھے تم نے ان کو قتل کیوں کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ تم خواہشات کے متبع ہو توراۃ پر بھی تمہارا کوئی ایمان نہیں ہے اور آج تم اس توراۃ پر اتنے ڈٹے ہوئے ہو کہ اس کے مقابلے میں اللہ کی کتاب کی پرواہ کرنے کے لیے تیار نہیں اور وہ حال نہیں معلوم کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھوڑے سے غائب ہوئے اور تم نے پیچھے بچھڑے کو معبود بنالیا تمہارے ایمان کی یہی شان ہے کہ ذرا نبی آنکھوں سے دور ہوا اور تم بچھڑے کی پوجا کرنے لگ گئے ظالمو تمہیں خیال نہیں آیا کہ کس طرح تم یہ باتیں کہتے ہو اور پھر کہتے ہو کہ ہم مؤمن ہیں اگر تم مومن ہو تو یہ کردار ہے تمہارا اور پھر کہا اگر تم دعویٰ ایمان میں سچے ہو تو واقعی تمہارا یہ ایمان تمہیں بہت بری باتیں سکھاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بری باتیں جو تم کرتے ہو یہ علامت ہے اس بات کی کہ تمہارے دل میں ایمان ہے ہی نہیں اگر واقعی ایمان ہے، جس طرح سے تم کہتے ہو تو تمہارا ایمان بہت بری باتیں سکھاتا ہے، یہ ان کے سامنے آئینہ رکھ کر ان کے ایمان کی حالت ان کو دکھائی جا رہی ہے کہ جس پر تم آج ڈٹے ہو آنے والے پیغمبر کو مانتے نہیں اترنے والی کتاب کو مانتے نہیں یہ حال ہے تمہارے اس ایمان کا۔

آپ کہہ دیجیے کہ کیوں قتل کرتے تھے تم اللہ کے انبیاء علیہم السلام کو جو اس کتاب سے پہلے آئے وہ اسی کتاب توراۃ کے حامل تھے، توراۃ کے مبلغ تھے اگر تم مومن ہو اگر تمہارا اس کتاب پر ایمان ہے تو کم از کم اس کتاب کے حاملین انبیاء علیہم السلام کو تو تم قبول کرتے ان کا انکار کر کے ان کی تکذیب کر کے ان کو قتل کیوں کیا؟ اور موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس

واضح معجزے لے کر آئے تھے پھر تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا موسیٰ علیہ السلام کے بعد تم بالکل صریح ظلم ڈھانے والے تھے اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا یہ تورات جس پر آپ جمے ہوئے ہو اس کے بھی منکر ہوئے بیٹھے تھے، تو پہاڑ تمہارے سر پر کھڑا کر کے منوایا تھا کہ اس کو مانو اور اس وقت مان لیا، اور اس کے بعد پھر کہتے تھے اور آج کہتے ہو کہ ہم اللہ کی کتاب قرآن کریم کو تسلیم نہیں کریں گے اس تورات پر ہی ہم پکے ہیں۔

جب ہم نے تمہارا میثاق لیا اور تم پر طور کو اٹھایا اور کہا کہ پکڑو مضبوطی کے ساتھ اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے اور سنو اللہ کے احکام کو تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا تم نے زبان سے تو کہا لیکن حال تمہارا اس وقت بھی یہی تھا حال کے درجے میں اس وقت بھی تم کہہ رہے تھے مانیں گے نہیں، قال اور حال میں ایسے فرق ہوتا ہے۔

ایک لڑکے کو سامنے بٹھا کر میں ایک بات کہوں کہ اس طرح کرنا ہے وہ زبان سے تو کہے گا اچھا جی لیکن اس کی آنکھیں اور اس کی ہیئت بتا رہی ہے کہ یہاں تو کہہ رہا ہے اچھا جی لیکن باہر نکل کر کرے گا نہیں، پتہ چل جایا کرتا ہے سامنے جس وقت حال معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان اس کے دل کے مطابق نہیں ہے اور اس کا کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ زبان سے تو تم کہہ رہے ہو سمعنا لیکن تمہارا حال بتا رہا ہے عصینا ایسا نہیں ہوگا کیونکہ تم نے اس طرح سے ماننا تو ہے نہیں اس وقت تم نے سمعنا کہہ دیا کہ ہم سن رہے ہیں لیکن تمہارا حال اس بات پر دلالت کر رہا تھا کہ تم جو سمعنا کہہ رہے تھے یہ اصل کے اعتبار سے عصینا تھا کہ ہم نہیں مانیں گے یہ عصینا دلالت حال ہے اتنے ڈھیٹ اور اتنے بے غیرت تم ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی سختیاں دیکھ کر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنے دلائل دیکھنے کے بعد بھی تم نہیں مانتے اور آج بڑے پکے مومن بنے بیٹھے ہو کہ ہمارا تو بس تورات پر ایمان ہے ہم تو کچھ اور کرنے کے لیے تیار نہیں۔

کہا انہوں نے کہ سن لیا اور ہم نے نہ مانا اور پلا دیئے گئے وہ اپنے دلوں میں بچھڑے کی محبت ان کے کفر کے سبب، یہی کافرانہ جذبات تھے جس کی وجہ سے بچھڑے کی محبت میں مبتلاء ہوگئے یہ ہے تمہارا حال۔

کیا تمہارا ایمان تمہیں انہی چیزوں کا حکم دیتا ہے؟:

تو آپ کہہ دیجیے کہ بہت بری چیز ہے وہ جس کا حکم دیتا ہے تمہارا ایمان اگر تم دعویٰ ایمان میں سچے ہو یہ جو کہتے ہو ہمارا اپنی کتاب پر ایمان ہے اگر یہ دعویٰ سچا ہے تو تمہارا ایمان تمہیں بہت بری حرکتیں سکھاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ایمان تو بری حرکتیں سکھاتا نہیں تو یہ بری حرکتیں کرنا یہ خود علامت ہے اس بات کی کہ تم

دل میں ایمان سے خالی ہو، تمہارے دلوں میں ایمان نہیں ہے، الزام دینے کے ساتھ دل کی کیفیت کی نفی کے اوپر دلیل قائم کی جاتی ہے۔

ایک شخص آپ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے اور بڑی پرانی محبت ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ ہاں جی بڑی محبت ہے فلاں وقت پانچ روپے کی ضرورت پیش آئی تھی پتہ ہے منہ توڑ جواب دیا تھا اور فلاں وقت فلاں شخص نے میری ساتھ دشمنی کی تھی اس وقت تو اس کی حمایت کر رہا تھا بڑی سچی محبت ہے تجھے میرے ساتھ۔

اب عنوان تو یہ ہوگا کہ بڑی سچی محبت ہے لیکن الزام دے کر ثابت کیا جائے گا کہ تیری باتیں صرف باتیں ہی باتیں ہیں باقی دل میں تیرے کوئی محبت نہیں اگر محبت ہوتی تو ایسی حرکتیں کیوں کرتے یہ انداز گفتگو اسی طرح کا ہے کہ تم کہتے ہو کہ ہمارا توراۃ پر ایمان ہے توراۃ پر ایمان ہے، تو بچھڑا پوجنا تھا اور تم اتنے پکے ہو موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تو موسیٰ علیہ السلام کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے طریقوں پر چلنے والے نبیوں کو قتل کیوں کر دیا اور یہی توراۃ جس پر جمے بیٹھے ہو اس کو ڈنڈے دکھا دکھا کر تمہیں منوایا جا رہا تھا تو بھی تم نہیں مانتے تھے اور آج اللہ کی کتاب کے مقابلے میں اسی توراۃ پر ڈٹے بیٹھے ہو، بڑا اچھا ہے تمہارا ایمان، بڑی اچھی حرکتیں سکھاتا ہے تمہارا ایمان، یہ ان کو الزام دیا جا رہا ہے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ تم ہو ضدی، ضد میں آ کر اس طرح کے دعوے کیے بیٹھے ہو ورنہ تمہارے دل میں ایمان کوئی نہیں۔

اگر تم اپنے دعووں میں سچے ہو تو آخرت کو ترجیح کیوں نہیں دیتے؟

پھر تمہارے یہ دعوے "نحن ابناء الله و احباءہ، لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں جنتی تم ہی ہوگے۔

اللہ کا محبوب کوئی دوسرا ہے ہی نہیں تمہارے یہ دعوے ہیں جن کے ساتھ تم عوام کو دھوکہ دیے بیٹھے ہو کیا آخرت میں نجات انہی کی ہوگی جو یہودی ہوگا۔

"لن یدخل الجنة الا من کان هودا" ہرگز جنت میں نہیں جائے گا مگر وہی جو یہودی ہوگا نصاریٰ کہتے تھے کہ جو نصرانی ہوگا وہی جنت میں جائے گا دوسرا کوئی نہیں جائے گا اگر تم اتنے ہی قائل ہو اس بات کے کہ تم اللہ کے محبوب ہو آخرت میں تمہارے لیے جنت ہے تو پھر تمہاری اس زندگی کے اندر آخرت کو ترجیح دینے کا نقشہ نظر کیوں نہیں آ رہا؟ تمہیں آخرت کا شوق ہونا چاہیئے دنیا کی محبت نہیں ہونی چاہیئے۔

دیکھو مجھے آج معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں میرے لیے بڑی بڑی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں، مجھے بالکل سزا نہیں ہوگی، جاتے ہی جنت مل جائے گی اور بڑا اللہ کا مقبول بندہ ہوں تو آج ہی شوق پیدا ہو جائے گا کہ اس مصیبت بھری زندگی کا کیا فائدہ آخرت میں ہی چلنا چاہیے تو اپنی حرکتوں سے اپنی باتوں سے اپنے چلنے پھرنے سے ہر چیز سے آخرت کی محبت ٹپکے اور ایسے معلوم ہو کہ یہاں تو جس طرح ہے ہم مصیبت میں مبتلاء ہیں اصل شوق تو ہمیں آخرت کا ہے اور اپنی زبان سے بھی یہ ظاہر کرو کہ اس دنیا میں کیا رکھا ہے اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم آخرت کے نام سے بدکتے ہو اور موت کے تصور سے تمہیں ڈر لگتا ہے چونکہ تمہیں پتہ ہے کہ ہم نے نظریات کیسے کیسے اختیار کیے اور آخرت میں جا کر ڈنڈے پڑیں گے اس لیے دنیا میں جینے کی، دنیا اکٹھی کرنے کی تمہارے اندر بڑی ہوس ہے یہ دنیا کی محبت اس بات پر دال ہے کہ آخرت کے بارے میں تم جو کچھ اپنے متعلق کہتے رہتے ہو یہ تمہارے نظریات صرف زبان پر ہیں حقیقت میں دل کے اعتبار سے یہ نہیں سمجھتے کہ آخرت میں ہم مقبول ہیں ورنہ تمہیں چاہیئے کہ تم موت کی تمنا کرو اور آخرت کی زندگی کو دنیا کے مقابلے میں ترجیح دو لیکن اللہ تعالیٰ نے پیشین گوئی کردی کہ ہرگز کبھی بھی یہ موت کی تمنا نہیں کر سکتے کیونکہ انہیں اپنے کرتوت معلوم ہیں کہ ہم نے کیا کچھ کیا ہوا ہے۔

دنیوی زندگی پر سب سے زیادہ حریص یہودی ہیں:

اسی لیے تو زندگی کے اتنے حریص ہیں کہ مشرک بھی اتنے حریص نہیں کیونکہ مشرکوں کو تو اتنا خیال ہے کہ مریں گے تو مٹی ہو جائیں گے اس کے بعد نہ عذاب کا ڈر ہے نہ ثواب کی توقع اس لیے اگر وہ اس دنیا کی زندگی کو زیادہ چاہیں تو کسی درجے میں کوئی بات بھی ہے کہ ان کے نزدیک تو دنیا ہی دنیا ہے یہاں لذت اٹھا لو جو چاہو کر لو آخرت کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں اور ان کو عذاب کا ڈر بھی کوئی نہیں اور یہ تو آخرت کے قائل ہیں اور آخرت کے عذاب کا تصور ان کے سامنے ہے جس کی وجہ سے مشرکوں کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کی تمنا ان کے ہاں زیادہ ہے یہ تمنا ان کی ذکر کرنے کے بعد پھر کہا جا رہا ہے کہ کرلیں کیا ہوتا ہے ہزار سال کی عمر مل جائے گی آخر جانا کہاں ہے؟ آخر پانی نے انہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے۔

اگر ہزار سال بھی زندہ رہو گے ہزار سال زندہ رہنے کے بعد بھی عذاب سے تو نہیں بچ جاؤ گے یہ اسی محاورے کے مطابق بات ہے کہ جتنی دیر زندہ رہ لو لیکن آخر آنا تو ادھر ہی ہے۔ جس طرح سے ہمارا محاورہ ہے کہ آخر پانی نے انہی پلوں کے نیچے سے گزرنا ہے جاؤ گے کدھر ہزار سال زندہ رہنے سے بھی تم عذاب سے نہیں بچو گے۔

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے لیے دار آخرت ہے اللہ کے نزدیک خالص بغیر دوسرے لوگوں کے۔

"فتمنوا الموت" موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو ہرگز یہ تمنا نہیں کریں گے اس موت کی کبھی بھی۔

"بما قدمت ایدیھم" بسبب ان کاموں کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہیں اپنے اعمال اور اپنے کردار کے سبب سے۔

" واللہ علیم بالظلمین "اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

البتہ ضرور پائے گا تو انہیں سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر ان لوگوں کے مقابلے میں بھی جنہوں نے شرک کیا، چاہتا ہے ان میں سے ہر کوئی کہ دیا جائے ہزار سال عمر اور نہیں ہے یہ بات اس کو عذاب سے دور ہٹانے والی کون سی بات یعنی عمر کا دیا جانا۔

" ان یعمر "یہ ھو کی تفسیر ہے ھو گویا کہ ضمیر مبہم ہے یہ عمر کا دیا جانا اس کو عذاب سے دور ہٹانے والا نہیں یہ ویسے مفہوم ہے جیسے سورۃ جمعہ میں آئے گا" قل ان الموت الذی تفرون منه "انہیں کہہ دیجئے کہ موت سے جو بدکتے پھرتے ہو موت سے بچ نہیں سکتے" ان الموت الذی تفرون منه "جس موت سے بدکتے ہو، بھاگتے ہو وہ تمہیں ملنے والی ہے تم سے ملاقات کرنے والی ہے آخر جانا اللہ کے سامنے ہے ہزار سال زندہ رہو گے تب بھی پہنچنا وہیں ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

آپ فرما دیجئے کہ جو شخص دشمن ہو جبرائیل کا سو اس نے اتارا ہے قرآن تمہارے قلب پر اللہ کے حکم سے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ

جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو اس سے پہلے ہے ہدایت ہے اور بشارت ہے مومنین کے لیے ﴿۹۷﴾ جو

كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

شخص دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرائیل کا اور میکائیل کا تو بے شک اللہ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ

دشمن ہے کافروں کا ﴿۹۸﴾ اور یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے آپ کی طرف واضح دلیلیں نازل کی ہیں اور ان کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں

اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ

جو حکم عدولی کرنے والے ہیں ﴿۹۹﴾ کیا جب کبھی بھی انہوں نے کوئی عہد کیا اس عہد کو ان میں سے ایک جماعت نے پھینک دیا بلکہ

اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے ﴿۱۰۰﴾ اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول آیا جو تصدیق کرنے والا ہے

لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ

اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو جن کو کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو

وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ

پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں ہیں ﴿۱۰۱﴾ اور انہوں نے اس چیز کا اتباع کیا جسے سلیمان

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا

کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے تھے ، اور نہیں کفر کیا سلیمان نے لیکن شیاطین نے کفر اختیار کیا

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ

وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، اور انہوں نے اس کا بھی اتباع کیا جو نازل ہوا دو فرشتوں پر بابل میں یہ دو فرشتے ہاروت

وَمَارُوْتَ ۗ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ

اور ماروت تھے اور یہ دونوں نہیں سکھاتے تھے کسی کو جب تک یوں نہ کہہ دیتے کہ ہمارا وجود ایک فتنہ ہے

فَلَا تَكْفُرْ ۗ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۗ

لہذا تو کفر اختیار نہ کر، پس یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی کر دیتے تھے

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّ

اور وہ لوگ اس کے ذریعے کسی کو کچھ بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ کے حکم سے اور وہ لوگ وہ چیز سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر دینے والی

هُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۗ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ

ہے اور نفع دینے والی نہیں، اور البتہ تحقیق انہوں نے یہ بات جان لی کہ جس نے اس کو خریدا ہے اس کے لیے آخرت میں

خَلَاقٍ ۖ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۗ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ

کوئی حصہ نہیں، اور بے شک وہ بری چیز ہے جس کے ذریعے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ دیا اگر وہ جانتے ہوتے ﴿۱۰۲﴾ اور اگر وہ

اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۗ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾

ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کی طرف سے اس کا ثواب بہتر تھا، اگر وہ جانتے ہوتے ﴿۱۰۳﴾

لغوی وصرفی تحقیق:

"قل من كان عدوا لجبريل" آپ کہہ دیجئے جو کوئی دشمن ہے جبرائیل علیہ السلام کا، جبرائیل اور جبریل ایک ہی چیز ہے۔

"فانه نزله على قلبك" پس بے شک اس جبرائیل علیہ السلام نے اتارا ہے یہ قرآن، ہ ضمیر قرآن یا کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے کتاب عربی میں چونکہ مذکر ہے اس لیے مذکر کی ضمیر لوٹ سکتی ہے، اور لفظ کتاب اردو میں مؤنث ہے۔

بے شک اتاری وہ کتاب جبرائیل علیہ السلام نے آپ کے دل پر۔

" باذن اللہ "اللہ کے حکم کے ساتھ، جو کوئی دشمن ہے جبرائیل علیہ السلام کا اس کے بعد جزاء محذوف ہے جس کے اوپر اگلے الفاظ دلالت کرتے ہیں ترجمہ جس طرح سے آپ نے سنا اس طرح سے فقرہ پورا نہیں ہوتا، جوڑ نہیں ہے ان دونوں باتوں کا جو کوئی دشمن ہے جبرائیل علیہ السلام کا بے شک اس جبرائیل علیہ السلام نے اتارا اس قرآن کو تیرے قلب پر درمیان میں جزاء محذوف ہے اگلے الفاظ اس کے اوپر دال ہیں۔

اردو میں یوں بھی ادا کیا گیا ہے کہ جو کوئی دشمن ہے جبرائیل علیہ السلام کا تو وہ جان لے، جو کوئی جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے تو اس کو غصے اور غیض کے ساتھ مر جانا چاہیے بے شک اس جبرائیل علیہ السلام نے یہ قرآن تیرے قلب پر اتارا ہے، جو کوئی دشمن ہے جبرائیل علیہ السلام کا تو دشمن رہے لیکن اس کی عداوت کا قرآن کریم کی تکذیب سے کوئی تعلق نہیں بے شک اس جبرائیل علیہ السلام نے اتارا ہے یہ قرآن تیرے قلب پر اللہ کے حکم کے ساتھ اس طرح سے بات پوری ہو جائے گی۔

جلالین شریف میں جیسے جزاء محذوف نکالی ہے" من کان عدوا الجبریل فلیمت غیضاً علی تکذیب القرآن" انہی الفاظ کا وہ ترجمہ ہے جو ماقبل میں بیان کیا ہے جو کوئی شخص جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے تو وہ اپنے غصے میں مرتا رہے جلتا رہے بے شک اس جبرائیل علیہ السلام نے یہ قرآن تیرے قلب پر اللہ کے حکم کے ساتھ اتارا ہے۔

" مصدقالمابین یدیہ " مصدقاً یہ حال واقع ہو رہا ہے نزلہ کی ہ ضمیر سے جو قرآن کریم یا کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے اس حال میں کہ وہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے اُس چیز کی جو اس سے پہلے ہے اور یہ لفظ بار بار ماقبل میں گزر چکا ہے کہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے، سچا بتلانے والی ہے، مصداق بننے والی ہے اور" مابین یدیہ "اس سے مراد توراۃ اور انجیل ہیں ان کتابوں کے اندر جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں ان کا یہ مصداق ہے اور یہ کتاب آکر ان کی صداقت کو ظاہر کرتی ہے مفہوم اس کا ماقبل میں آ چکا۔

اس حال میں کہ وہ تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے ہے وھدیً کا مصدقاً کے اوپر عطف ہے ھدیً یہ مصدر ہے ھدی کا ہدایت ھادیاً کے معنی میں تصدیق کرنے والی ہے اور راہنمائی کرنے والی ہے بشریٰ مبشراً اور بشارت دینے والی ہے ایمان والوں کو۔

" من کان عدواً للہ وملئکتہٖ" جو کوئی شخص دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا۔

" ورسلہٖ "اور اس کے رسولوں کا۔

" وجبریل "اور جبرائیل علیہ السلام کا۔

"ومیکٰل "اور میکائیل علیہ السلام کا پس بے شک اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

" فان اللہ عدوللکفرین " یہاں بھی فان اللہ عدو للکفرین یہ من کان کے جواب کے اوپر دال ہے اب یہاں بات اس طرح سے ہوگی جو بھی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرائیل علیہ السلام کا اور میکائیل علیہ السلام کا وہ کافر ہے پس بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے بات اس طرح مکمل ہوجائے گی کہ "من کان عدواً للہ فھو کافر فان اللہ عدوللکفرین " بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے "فان اللہ عدوللکفرین" یہ دال بر جزاء ہے اور جزاء نکل آئے گی " فھو کافر فھو من الکافرین فان اللہ عدو للکفرین "ایسا شخص کافروں میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسے شخص کا اللہ تعالیٰ دشمن ہے کیونکہ یہ شخص کافروں میں سے ہے۔

"ولقد انزلنا الیك ایت بینٰت "البتہ تحقیق اتارا ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیوں کو۔

" ومایکفربھا "اور نہیں انکار کرتے ان آیات کا۔

" الاالفاسقون " نہیں انکار کرتے ان نشانیوں کا مگر فاسق لوگ، فاسق فسق سے ہے فسق کا معنیٰ "خروج عن الطاعات "فرمانبرداری سے نکل جانا، جو لوگ فرمانبرداری سے نکلے ہوئے ہیں، جو نافرمان قسم کے لوگ ہیں وہی ان آیات کا انکار کرتے ہیں۔

" او کلما عٰھدوا عھداً نبذہ فریق منھم "او کلما کے اوپر جو واؤ ہے اس کا اگر معطوف علیہ نکالنا ہو تو یوں اس کو ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

"أکفروا بالآیات و کلماعٰھد واعھد انبذہ فریق منھم " کیا یہ لوگ واضح آیات کا انکار کرتے ہیں اور جب کبھی بھی یہ کوئی عہد کرتے ہیں تو اس عہد کو پھینک دیتا ہے ان میں سے ایک گروہ۔

" بل اکثرھم لایؤمنون " بلکہ ان میں سے اکثر اس عہد پر ایمان ہی نہیں رکھتے، مانتے ہی نہیں، یقین ہی نہیں کرتے کہ ہم نے کوئی عہد کیا ہوا ہے۔

"ولما جاءھم رسول من عند اللہ "اور جب آ گیا ان کے پاس رسول اللہ کی جانب سے۔

" مصدق لمامعھم "جو مصداق بننے والا ہے اس چیز کا جو ان کے پاس ہے۔

" نبذفریق من الذین اوتوا الکتب کتب اللہ ورآء ظھورھم "الذین اوتو الکتب " وہ لوگ جو کتاب دیئے گئے ان میں سے ایک فریق نے پھینک دیا ہے "کتب اللہ"اللہ کی کتاب کو وراء ظھورھم اپنی پشتوں کے پیچھے۔

"کانهم لایعلمون" گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

پشتوں کے پیچھے پھینک دیا یہ اعراض، لاپرواہی سے کنایہ ہے پس پشت ڈال دی جس طرح سے آپ کہتے ہیں کہ میری بات تو آپ نے پس پشت ہی ڈال دی مجھے تو آپ نے پس پشت ہی ڈال دیا کیونکہ جس کی طرف توجہ ہوتی ہے وہ سامنے ہوتا ہے اور جس کو پس پشت ڈال دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادھر توجہ نہیں رہی ادھر سے منہ موڑ لیا ہے اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پشتوں کے پیچھے ڈال دیا پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے تو کتاب اللہ یہ مفعول ہے نبذ کا، نبذ فریق من الذین اوتوا الکتٰب ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پھینک دیا، ڈال دیا اپنی پشتوں کے پیچھے۔

"واتبعوا" اللہ کی کتاب کو تو پشتوں کے پیچھے ڈال دیا اور پیچھے لگ گئے۔

"ماتتلوا الشیٰطین" اس چیز کے جس کو پڑھتے تھے شیاطین اور شیاطین شیطان کی جمع ہے۔

"علی ملك سلیمٰن" ملک، حکومت، سلطنت۔

"علی عھد ملك سلیمٰن" سلیمان علیہ السلام کی مملکت کے زمانے میں، سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زمانے میں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں شیاطین جو کچھ پڑھا کرتے تھے اس کے پیچھے لگ گئے۔

"وما کفر سلیمٰن" سلیمان نے کفر نہیں کیا۔

"ولکن الشیٰطین کفروا" لیکن شیطانوں نے کفر کیا۔

"یعلمون الناس السحر" تعلیم دیتے تھے لوگوں کو جادو کی، سکھاتے تھے لوگوں کو جادو، سحر کا لفظ تصرف عجیب کے لیے بولا جاتا ہے یعنی ایسی چیز جس کے عجیب وغریب ہونے کے اثرات ظاہر ہوں اس کو سحر کہتے ہیں کوئی مقرر اچھی تقریر کرتا ہے جس کی تقریر سے مجمع بہت متاثر ہو جائے اور جو کچھ وہ سمجھانا چاہتا ہے مجمع کو سمجھا لے جدھر چاہے وہ مجمع کا رخ موڑ دے اس کو کہتے ہیں کہ یہ مقرر بڑا جادو بیان ہے اس کی تقریر کیا ہے جادو ہے۔

عجیب وغریب اثرات جو ظاہر ہوا کرتے ہیں جس کے اسباب کچھ مخفی سے ہوں اس کو سحر سے تعبیر کر دیا جاتا ہے سکھاتے تھے وہ شیاطین لوگوں کو جادو۔

"وما انزل علی الملکین" یہ "واتبعوا کا مفعول ہے اور ما تتلوا الشیٰطین" کے اوپر اس کا عطف ہے پیچھے لگ گئے یہ اس چیز کے جس کو شیاطین پڑھتے تھے اور اس چیز کے جو اتاری گئی دو فرشتوں پر بابل شہر میں، بابل شہر کا نام ہے۔

"ھاروت وماروت" یہ ملکین کا عطف بیان ہے فرشتے کون تھے ہاروت اور ماروت یہ ان کے نام ہیں۔

جیسے نحو کی کتابوں میں آپ پڑھا کرتے ہیں" اقسم ابو حفص عمر" عمر ابو حفص کا بیان ہے اس طرح سے یہاں بھی یہ ہاروت اور ماروت ملکین کا بیان ہیں جو اتارا گیا دو فرشتوں پر بابل شہر میں یعنی ہاروت اور ماروت پر۔

" ومایعلمان من احد" اور وہ ہاروت اور ماروت وہ دونوں فرشتے نہیں سکھاتے تھے کسی کو۔

" حتی یقولا " حتی کے بعد جو مضارع آتا ہے محاورۃً اس کا ترجمہ نفی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے جب تک نہ کہہ دیتے وہ نہیں سکھاتے تھے کسی کو ۔

" انمانحن فتنة "اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم فتنہ ہیں ہم آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

"فلاتکفر " پس تو کافر نہ بن تو کفر نہ کر جب تک آنے والے کو یہ بات نہ کہہ دیتے تھے انما نحن فتنة فلاتکفر اس وقت تک اس کو کچھ سکھاتے نہیں تھے پہلے اس کو یہ بتاتے تھے کہ ہم فتنہ ہیں اور تو کافر نہ بن جانا پھر اگر کوئی اصرار کرتا کہ ہمیں سکھا دو تو وہ سکھا دیتے تھے۔

" فیتعلمون منهما " پس سیکھتے تھے یہ یہودی ان دونوں سے۔

" مایفرقون به بین المرء وزوجه " سیکھتے تھے ان دونوں سے ایسا جادو ایسی چیز جس کے ذریعے جدائی ڈال دیتے تھے انسان اور اس کی بیوی کے درمیان، خاوند بیوی کو آپس میں لڑا دیتے، ان کے درمیان میں جدائی ڈال دیتے اس قسم کا جادو یہ ان فرشتوں سے سیکھتے تھے۔

یفرقون به کی ہ ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے سیکھتے تھے ان دونوں سے وہ چیز کہ فرق ڈالتے تھے تفریق ڈال دیتے تھے اس چیز کے ذریعے سے انسان اور اس کی بیوی کے درمیان۔

"وماهم بضارین به "اور نہیں تھے یہودی نقصان پہنچانے والے اس جادو کے ذریعے سے۔

" من احد "اس سیکھی ہوئی بات کے ذریعے سے بہ کی ضمیر مایتعلمون جو پیچھے آیا ہے یہ ضمیر اس کی طرف لوٹ رہی ہے۔

نہیں تھے یہودی نقصان پہنچانے والے اس جادو کے ذریعے سے اس سیکھی ہوئی بات کے ذریعے سے کسی کو مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جادو میں یہ تاثیر بھی اللہ کی دی ہوئی تھی یہ نہیں

کہ جادو کے اندر کوئی تاثیر ذاتی ہے کہ اللہ نہ بھی چاہے تو جادو اثر دکھادے ایسی بات نہیں ہے اس کی تاثیر بھی اللہ کے حکم کے تابع ہے لہذا جہاں اللہ کی اجازت ہوئی وہاں اثر ظاہر ہوگا، جہاں اللہ کی اجازت نہیں ہوتی وہاں اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

"ویتعلمون" اور سیکھتے تھے یہ یہودی۔

"مایضرھم " وہ چیز جو ان کو نقصان دیتی ہے۔

"ولاینفعھم " اور ان کو نفع نہیں دیتی۔

" ولقد علموا " البتہ تحقیق انہوں نے جان لیا ہے، ان کو علم ہے۔

" لمن اشتراہ " کہ جو شخص اس جادو کو اختیار کرے گا۔

"مالہ فی الاخرۃ من خلاق" اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں" خلاق " حصے کو کہتے ہیں اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

" ولبئس ماشروابہ انفسھم " البتہ بری چیز ہے وہ جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپادیا جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ دیا، جس میں انہوں نے اپنے آپ کو کھپادیا وہ بری چیز ہے۔

" لو کانو ایعلمون " کیا ہی اچھا ہوتا کہ یہ جان لیتے۔

"ولو انھم امنوا " اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے۔

"واتقوا " اور تقویٰ اختیار کرتے۔

" لمثوبۃ من عنداللہ خیر "مثوبۃ" یہ ثواب سے لیا گیا ہے بدلے میں ملی ہوئی چیز کو ثواب کہتے ہیں تو بدلہ اللہ کی جانب سے بہتر ہوتا" لو کانوا یعلمون " کاش کہ ان کو علم ہوتا۔

تفسیر:

ابتدائی آیات کا شان نزول:

"قل من کان عدوا لجبریل " اس آیت کے شان نزول میں مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے۔

یہود جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے مخالفت کا طریقہ اپنالیا تو مخالفت کے لیے وہ مختلف بہانے بناتے رہتے تھے ان میں سے بعض لوگوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ پر وحی

کون لے کرآتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ جبرائیل علیہ السلام لے کرآتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ تو ہماری دشمنی ہے کیونکہ ہمارے اوپر یعنی ہمارے بڑوں پر ہماری قوم کے اوپر جتنے بڑے بڑے واقعات عذاب کے آئے ہیں ان سب میں واسطہ یہی بنا ہے اس لیے ہم اس کی لائی ہوئی بات کو ماننے کے لیے تو تیار نہیں البتہ میکائیل علیہ السلام لے کرآتا جو رحمت لاتا ہے، بارش لاتا ہے، رزق اس کی وساطت سے اترتا ہے پھر ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے جبرائیل علیہ السلام کی لائی ہوئی بات کو ہم نہیں مانتے ہماری اس کے ساتھ دشمنی ہے گویا کہ عادت تو بری اپنی ہوتی ہے لیکن اس کے لیے انسان بہانے تلاش کر ہی لیتا ہے ماننا تو نہیں تھا کیونکہ ان کی سیادت میں فرق آتا تھا، سرداری جاتی تھی، مالی مفاد کو نقصان پہنچتا تھا لیکن نہ ماننے کے لیے یوں تو وہ کہہ نہیں سکتے تھے کہ ہم نہیں مانتے چونکہ ہمیں نقصان پہنچ رہا ہے ہماری سرداری چلی جائے گی، قیادت ختم ہو جائے گی چونکہ یہ بات دین داری کے خلاف ہے ہر آدمی سننے والا اس بات کو برا محسوس کرے گا کہ دیکھو اپنے مالی مفاد کی خاطر یہ حق کو چھوڑے ہوئے ہے تو بہانہ کوئی اس قسم کا تلاش کرو۔

کہتے ہیں کہ یہ ہمارا دشمن ہے ہم اپنے دشمن کی لائی ہوئی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں حضرت میکائیل علیہ السلام وحی لائیں تو پھر ہم اس بات کو قبول کر سکتے ہیں اس طرح انہوں نے عداوت جبرائیل علیہ السلام کو بہانہ بنایا اس قرآن کریم کے چھوڑنے کا اور اس کی تکذیب کا۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی دشمنی کو ایمان قبول نہ کرنے کا بہانہ نہ بناؤ:

تو اللہ تعالیٰ نے یہاں واضح فرما دیا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کسی کو جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ دشمنی ہے تو اس دشمنی کا یہ اثر نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی لائی ہوئی بات کو جھٹلا دیا جائے اس کو قبول نہ کیا جائے دشمنی ہوگی تمہیں جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ لیکن یہ کتاب تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آئی ہے اور جبرائیل علیہ السلام تو سفیر محض ہے اگر سفیر کے ساتھ تمہیں محبت نہیں پیغام لانے والے سے تمہاری دشمنی ہے تو اس کا پیغام پر کیا اثر ہے پیغام کی ذاتی حیثیت دیکھو کیا ہے؟ بھیجنے والا کون ہے؟ اور یہ کیسا پیغام ہے؟ بھیجنے والا ہے اللہ اور وہ اللہ کی اجازت کے ساتھ آیا اور مصدق ہے۔

"لما بین یدیہ" تمہاری اپنی کتاب کا یہ مصداق ہے اس میں ہدایت اور راہنمائی ہے، اس میں بشارت ہے یہ مبشر ہے جو اللہ کی کتاب کی حیثیت ہوا کرتی ہے کہ وہ کتب سابقہ کے لیے مصدق بنے، اچھی باتوں کے لیے راہنمائی کا کام دے اور اچھے انجام کی خبر دے وہ صفتیں ساری اس کے اندر پائی جاتی ہیں اس سے تمہیں کیا بحث کہ

اللہ نے جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ یہ پیغام بھیج دیا یا کسی اور کے ہاتھ بھیج دیا تو تمہاری اس عداوت کو اس کے جھٹلانے سے کوئی تعلق نہیں پہلے تو یہ بات سمجھائی ہے کہ اس کو بہانے نہ بناؤ یہ تمہارا بہانہ ٹھیک نہیں۔

سفیر جو ہوا کرتا ہے اس کی ذاتی حیثیت کوئی نہیں ہوا کرتی ہے چاہے تمہارا دوست ہو چاہے وہ تمہارا دشمن ہو تم نے دیکھنا یہ ہے کہ یہ پیغام بھیجا کس نے ہے اور پیغام آیا کیا ہے تو بھیجنے والا اللہ ہے اور پیغام کی حیثیت یہ ہے کہ مصدقا لمابین یدیہ اور یہ ھُدًی ہے یہ بُشریٰ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم لانے والے کے ساتھ محبت نہ ہونے کو وجہ بنالو کہ ہم اس پیغام کو قبول نہیں کرتے یہ تو حماقت ہے یہ کوئی عقل مندی نہیں ہے، یہ بات عقل کے مطابق نہیں ہے کہ اس کو بہانہ بنایا جائے۔

اور اگر تمہیں عداوت ہے ہی تو تم اس عداوت میں جلتے بھنتے رہو وہ تو اللہ کا سفیر ہے اللہ کی اجازت کے ساتھ لاتا ہے اور لاتا رہے گا پہلے الفاظ کا مفہوم تو یہ ہوا۔

جس نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی رکھی اس نے اللہ سے دشمنی اختیار کی:

آگے اللہ تعالیٰ نے قاعدہ اور ضابطہ بیان کر دیا کہ تم جو کہتے ہو میکائیل علیہ السلام کے ساتھ ہماری دوستی ہے یا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے دعوے کرتے ہو اور پھر اللہ تعالیٰ کے سفیر سے دشمنی بھی رکھتے ہو یہ دو باتیں نہیں ہو سکتیں اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سب چیزیں برابر ہیں کسی شخص کو جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی ہو اس کے فرشتوں سے ہو رسولوں سے ہو میکائیل علیہ السلام سے ہو یا اللہ سے عداوت ہو سب کا درجہ ایک ہی ہے یعنی جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، میکائیل علیہ السلام سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، رسول سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت، فرشتوں سے دشمنی وہ بھی اللہ سے عداوت تو ایک کے ساتھ دشمنی اور دوسرے کے ساتھ دوستی کا دعویٰ یہ دو باتیں جمع نہیں ہو سکتیں کیونکہ جبرائیل علیہ السلام ہمارا قاصد ہے اور ہمارا فرشتہ ہے جو اس سے دشمنی رکھے گا تو اس کی دشمنی ہمارے ساتھ ہے ان سب دشمنیوں کا درجہ اللہ کے ہاں برابر ہے جیسے انسان عداوت الٰہی کے ساتھ کافر ہوتا ہے اسی طرح سے رسولوں کی عداوت سے کافر ہوتا ہے اسی طرح سے فرشتوں کی عداوت سے کافر ہوتا ہے۔

خصوصیت کے ساتھ جبرائیل علیہ السلام کا ذکر کر دیا کیونکہ زیر بحث زیادہ یہی مسئلہ تھا کہ اس کی عداوت سے بھی انسان ایسے ہی کافر ہو گا اور میکائیل علیہ السلام کے ساتھ اگر کسی کی عداوت ہے تو اس کے ساتھ بھی ایسے ہی کافر ہو گا۔

عداوت کفر کا باعث ہے چاہے وہ جبرائیل علیہ السلام سے ہو، چاہے میکائیل علیہ السلام سے ہو، چاہے رسول سے ہو، چاہے دوسرے ملائکہ کے ساتھ ہو، چاہے براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو، اللہ کے فرستادہ کے ساتھ عداوت رکھنا یہ

اللہ کے ساتھ عداوت رکھنا ہے اور اگر تم جبرائیل علیہ السلام سے عداوت کا دعویٰ کرتے ہو تو یہ میرے ساتھ عداوت ہے اور اس عداوت کے ساتھ تم کافر ہو گئے، اگر تمہیں عداوت ان سے ہے تو اللہ کو ایسے کافروں سے عداوت ہے، اگر تم عداوت جبرائیل علیہ السلام کا نعرہ لگاؤ تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تمہارے ساتھ عداوت کا اعلان کرتا ہے، اس میں ان کا دماغ صاف کر دیا کہ اللہ کے ساتھ محبت کا دعویٰ اور اس کے فرشتہ کے ساتھ عداوت کا دعویٰ یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

جو اللہ کے ولیوں سے دشمنی رکھے اللہ کا اس سے اعلان جنگ ہے:

یہاں تو ذکر ہے خصوصیت کے ساتھ جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا اور اجمالاً ذکر آ گیا "ملئکہ" اور رسل کا لیکن حدیث شریف میں سرور کائنات ﷺ نے اس مسئلے کو اور واضح کر کے بیان فرمایا (من عادلی ولیا فقد اذنته بالحرب (بخاری ص ۹۶۳ ج ۲) یہ حدیث قدسی ہے سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھے میں اس کے ساتھ لڑائی کا اعلان کرتا ہوں، میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے۔

شریعت میں دو باتیں ایسی ہیں جن کے اوپر صراحۃً اللہ کی طرف سے اعلان جنگ ہے ایک کا ذکر صراحۃً قرآن کریم میں ہے اور ایک کا ذکر حدیث صحیح میں ہے، قرآن کریم میں تو سود خوروں کے متعلق ہے کہ اگر سود کھانے سے باز نہیں آؤ گے "فاذنوا بحرب من الله ورسوله" تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان پہنچے (سورۃ البقرۃ کے آخر میں) اور حدیث شریف کے اندر عداوت اولیاء پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے ولی کے ساتھ عداوت رکھے گا میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دشمنی کا انجام:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ ہو جائے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان فرمایا جو کسی زمانے میں ترجمان میں چھپا تھا، وہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے تھے جو بانی ہیں جامعہ اشرفیہ کے، مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے تھے مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کے ساتھ یہ اہلحدیث خاندان سے ہیں غزنوی خاندان لاہور میں جن سے ایک داؤد غزنوی بہت بڑے سیاسی لیڈر گزرے ہیں جنہوں نے ہمیشہ ہمارے اکابر کے ساتھ مل کر کام کیا ہے، جمعیت العلماء اسلام میں اور احرار میں کام کیا ہے اس کے والد تھے عبدالجبار غزنوی بہت معتدل قسم کا خاندان ہے اور اہل حدیثوں میں سے یہ پیری مریدی کا کام بھی کرتے ہیں متعصب نہیں ہیں۔

یہ غیر مقلد جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں ان کو حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بہت ہی ضد ہے اوران سے بہت بغض رکھتے ہیں اوران کا زیادہ تر ٹکراؤ ہے ہی حنفیوں کے ساتھ۔

اس وقت شیعہ سنی ٹکراؤ ہے، دیوبندی بریلوی ٹکراؤ ہے، اس سے پہلے دور میں بھی غیر مقلدوں کے ساتھ بہت زبردست ٹکراؤ رہا ہے اسی طرح سے جیسے اب ان کے ساتھ ہے مناظرہ بازی ہوتی تھی رسالہ بازی ہوتی تھی سٹیجوں پر ایک دوسرے کے خلاف تقریریں ہوتی تھیں اس دور میں مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی خیر المدارس ملتان یہ حنفیوں کی طرف سے بہت کامیاب مناظر تھے غیر مقلدوں کے مقابلے میں سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے افراد غیر مقلدوں کے مقابلے میں نکلے تھے تو یہ بڑا زبردست مقابلہ رہا ہے حنفیوں کا غیر مقلدوں کے ساتھ۔

ایک نوجوان غیر مقلد مولانا عبدالجبار غزنوی صاحب کے پاس آیا اور مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے ان کے آپس میں تعلقات تھے تو اس نے اس مجلس میں آکر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر کچھ بدزبانی شروع کر دی جس طرح سے نوجوان ہوتے ہیں جوش میں آکر نہیں دیکھتے کہ منہ سے کیا بات کہنی ہے اور کیا نہیں کہنی بزرگوں کے بارے میں ایسی الٹ پلٹ باتیں کہنی شروع کر دیتے ہیں تو اس نے بھی حضرت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں گستاخانہ جملے استعمال کیے۔

مولانا عبدالجبار صاحب نے اس کو یہ کہہ کر دھتکار دیا کہ چلے جاؤ یہاں سے مجھے تیرے میں سے بے ایمانی کی بو آتی ہے کچھ دن گزرے وہ شخص مرزائی ہو گیا ایمان کھو بیٹھا مرتد ہو گیا تو حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبدالجبار صاحب سے پوچھا کہ آپ نے جو اسے اس وقت کہا تھا کہ مجھے تجھ سے بے ایمانی کی بو آتی ہے یہ آپ کو کیسے معلوم ہو گیا۔

فرمانے لگے جس وقت وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بدزبانی کر رہا تھا تو فوراً میرے قلب پر وہ حدیث وارد ہوئی "من عادلی ولیاً فقد اذنتہ بالحرب" کہ جو میرے ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے اور میں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو بہت بڑا اللہ کا ولی مانتا ہوں اور یہ شخص ان کے ساتھ عداوت سے بھرا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص کسی کے مقابلے میں لڑائی لڑتا ہے تو اس کی قیمتی سے قیمتی چیز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان سے زیادہ قیمتی چیز کوئی اور نہیں ہے تو جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس سے عداوت کرلے تو اس کا ایمان ہی جائے گا قیمتی سے قیمتی چیز

اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہے تو ایمان ہے باقی دنیا اور دنیا کی کوئی چیز اتنی قیمتی نہیں، سونا، چاندی مال و دولت ایمان کے مقابلے میں کیا چیز ہے قرآن کریم میں کتنی آیتیں اس قسم کی ہیں کہ قیامت کے دن جن لوگوں کے پاس ایمان نہیں ہوگا اگر زمین و آسمان کا درمیان ان کو سونے سے بھر کر دے دیا جائے تو وہ یہ دے کر بھی اپنی جان چھڑانا چاہیں گے تو نہیں چھڑا سکیں گے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو ایمان کے ساتھ چیز حاصل ہو سکے گی وہ اتنے سونے کے ساتھ حاصل نہیں ہو سکے گی جس کے ساتھ زمین و آسمان کا مابین سونے سے بھر دیا جائے، سینکڑوں ہزاروں کی بات نہیں ہے زمین و آسمان کا درمیان سونے سے بھر دیا جائے اس وقت اتنا سونا دے کر اپنے آپ کو چھڑانے پر آمادہ ہوگا لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں " ماتقبل منهم "

ان کی طرف سے یہ بات قبول نہیں کی جائے گی جو چیز اتنا سونا دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی وہ ایک کلمہ ایمان کے ساتھ حاصل ہوتی ہے اس سے معلوم کر لیجئے کہ یہ کلمہ ایمان آخرت میں جا کر کتنا قیمتی ہوگا اور اس کی قیمت کتنی نمایاں ہوگی کہ پہاڑوں کے پہاڑ سونا بھی ہو تو وہ کام نہیں آئے گا جہاں یہ کلمہ ایمان کام آئے گا تو یہ جہالت اور حماقت ہے کہ انسان چند ٹکوں کے بدلے اپنا ایمان دے بیٹھتا ہے کیونکہ ابھی اس ایمان کی قیمت کے ظاہر ہونے کا وقت نہیں آیا جب اس ایمان کی قیمت ظاہر ہوگی پھر آنکھیں کھلیں گی کہ ہم نے جو چند ٹکوں کے بدلے ایمان برباد کیا تھا تو کتنی بڑی حماقت کی تھی بہر حال وہ آیات بتاتی ہیں کہ ایمان کی قیمت کتنی ہے۔

دشمن ہمیشہ اپنے دشمن کی قیمتی چیز کو نقصان پہنچاتا ہے کہتے ہیں کہ اس وقت میرا دل ادھر متوجہ ہوا کہ یہ شخص اپنا ایمان گنوا بیٹھے گا چنانچہ آنے والے واقعات میں ایسے نمایاں ہو گیا۔

اللہ والوں کی دشمنی سے بچو:

اس لیے یہ پہلو بہت احتیاط کے قابل ہے کہ جس شخص کے اوپر قبولیت کے آثار ہوں اللہ تعالیٰ کا مقبول نظر آئے نیکی اس کے اوپر نمایاں ہو تو اس کے ساتھ نفرت کا تعلق رکھنا، عداوت کا تعلق رکھنا دل کے اندر بغض و عناد رکھنا بسا اوقات انسان کو ایمان سے محروم کر دیتا ہے کسی کے دل کی کیفیت کیا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے ہم ظاہر کے مکلف ہیں جس شخص کو ظاہری طور پر دیکھیں گے کہ یہ اللہ والا ہے اللہ اللہ کرتا ہے نیک ہے اس پر آثار قبولیت کے ہیں۔

تو ہمیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی نسبت کی بناء پر اس شخص سے محبت رکھنی چاہئے اور اگر قلب آپ کا اس کے ساتھ محبت نہیں کرتا تو کم از کم اس کے ساتھ عداوت کا معاملہ نہیں کرنا چاہئے یہ عداوت نقصان پہنچاتی ہے اس لیے اولیاء اللہ کا ادب اولیاء اللہ کا احترام اولیاء اللہ کے ساتھ محبت کہ یہ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار

اور اللہ اللہ کرنے والے ہیں یہ حقیقت میں محبت الٰہیہ کی علامت ہے اور اللہ اللہ کرنے والوں کے ساتھ اور ان نیک لوگوں کے ساتھ عداوت یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عداوت کی علامت ہے حدیث شریف میں بھی یہ بات آ گئی اور قرآن کریم کے ان الفاظ سے بھی یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی عداوت کو اپنی عداوت قرار دیا ہے کہ جو جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی رکھے میری اس کے ساتھ دشمنی ہے وہ کافر ہے اور میں کافروں کا دشمن ہوں تو عداوت جبرائیل علیہ السلام کو عداوت الٰہیہ کے قائم مقام کر دیا گیا۔

اس سے اشارہ اس بات کی طرف نکلتا ہے کہ مقبول بارگاہ کے ساتھ عداوت رکھنا یہ عداوت الٰہی تک انسان کو پہنچا دیتا ہے جس کے نتیجے میں انسان ایمان گنوا بیٹھتا ہے بہر حال یہود کو یہ کہا گیا کہ تم خوش نہ ہوؤ کہ جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ عداوت رکھ کر ہماری اللہ کے ساتھ دوستی ہے یا جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ عداوت رکھ کر تم یہ سمجھتے ہو کہ میکائیل علیہ السلام سے ہماری دوستی ہے جو جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے وہ میکائیل علیہ السلام کا بھی دشمن ہے، جو جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے وہ اللہ کا بھی دشمن ہے یہ سب عداوتیں اللہ کے نزدیک برابر ہیں اس لیے یہ عداوت تمہیں کفر تک پہنچا دے گی اور ان تمام عداوتوں کی وجہ سے تم کافر ٹھہرے۔

" ان الله عدو للكفرين "اور ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔

واضح آیات اترنے کے بعد ان کا انکار فاسق ہی کر سکتا ہے:

"ولقد انزلنا اليك آيات بينٰت " یہ ان کے اوپر دوسرا الزام ہے کہ ایسے بیہودہ بہانے کر کر کے یہ ایمان سے روگردانی کر رہے ہیں ہم نے تو آپ پر بہت واضح واضح آیات اتار دی ہیں، واضح واضح دلائل اتار دیے ہیں جن کا کوئی فاسق ہی انکار کرے تو کرے اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا جذبہ ہے تو وہ ان آیات و دلائل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا البتہ جس کو عادت ہی فسق و فجور کی ہے جس نے اپنے اندر نیکی کی صلاحیت ختم کر دی وہ ان آیات کا انکار کرتا ہے تو کرے جو ان آیات کے منکر ہیں گویا کہ وہ فاسق ٹھہرے۔

فسق کا لفظ اصل میں بولا جاتا ہے "خروج عن الطاعات" طاعت سے نکل جانا ایک تو یہ ہے کہ عقائد میں بھی اللہ کی اطاعت قبول نہ کی جائے انسان اطاعت سے نکل گیا تو یہ کافر ہے تو فاسق کافر بھی ہو سکتا ہے فسق میں عموم ہے کہ مرتکب گناہ کبیرہ وہ بھی طاعت سے نکل گیا وہ بھی فاسق ہے اور مکذب عقائد ضروریہ وہ بھی طاعت سے نکل گیا وہ بھی فاسق ہے لیکن جو عقائدِ ضروریہ کی تکذیب کرتا ہے وہ فاسق بھی ہوا کافر بھی ہوا اور اگر کوئی عقائد کا حامل ہے لیکن کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے تو وہ کافر نہیں ہے اس کے لیے صرف فاسق کا لفظ بولا جائے گا۔

قرآن کریم میں جہاں فاسق کا لفظ ہے وہ عام مفہوم میں ہے جس کے اندر کافر بھی داخل ہے۔

" اولئك هم الفسقون " فسق کا مفہوم ایسے ہی ہے کہ اطاعت سے نکلنے والے باغی، اللہ تعالیٰ کے احکام سے بھاگ جانے والے، خروج عن الطاعات کرنے والے لہٰذا کافروں کو بھی یہ لفظ شامل ہے۔

یہود کی عہد شکنی اور ہٹ دھرمی کا شکوہ:

" او کلما عٰھدوا عھداً " یہ دوسری ملامت ان یہودیوں کو کہ یہ آیات بینات کا انکار کرتے ہیں اور ان کی عادت ہی ایسی ہے کہ جس وقت بھی یہ کوئی عہد باندھتے ہیں تو ان میں سے عہد کی پابندی کرنے والے تھوڑے ہوتے ہیں جیسے پیچھے بھی آیا تھا۔

"الاقلیل " کم لوگ ہوتے ہیں اس قسم کے، باقیوں کی تو عادت یہی ہے کہ اس عہد کو پھینک دیتے ہیں۔

"نبذ" پھینک دینا، لاپرواہی کے ساتھ اس کو چھوڑ دینا، پھینکنے کا مطلب یہ ہوتا ہے۔

"نبذہ فریق منھم " ان میں سے ایک فریق اس عہد کو پھینک دیتا ہے بلکہ اکثر تو ایمان ہی نہیں لاتے کہ ہم نے کوئی عہد کیا ہوا ہے سرے سے ہی مکر جاتے ہیں، انکار ہی کر دیتے ہیں، اس بات پر ایمان ہی نہیں رکھتے اس طرح سے اس عہد کو فراموش کر دیتے ہیں۔

عام عہد کے بارے میں بھی اور پھر یہ اللہ کا رسول آیا جس کے متعلق ان کی کتاب میں عہد موجود ہے اس رسول کی صداقت کی علامت متعین ہے۔

"مصدق لما معھم "اس رسول کو ماننا اپنی کتاب کو ماننا تھا کیونکہ جب کتاب کے اندر علامات ذکر کی گئیں ہیں جب وہ علامات اس رسول پر صادق آئیں گی تو اس رسول کو ماننا اپنی کتاب کو ماننا ہے لیکن حسب عادت ان میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دیا، پشت کے پیچھے پھینک دیا یعنی اس طرح سے لاپرواہی کر لی کہ جیسے ان کو معلوم ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

" اوتو الکتاب " ان لوگوں میں سے جو کتاب دیئے گئے کہ اہل کتاب میں سے ایک فریق نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

" کانھم لایعملون " گویا کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے یہ وہی ان کا عہد سے اعراض اور ان کا اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کرنا گویا کہ اس کو بطور شکوے کے ذکر کیا گیا ہے کہ رسول کی

مخالفت انہوں نے کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت پھینک آئے پس پشت پھینکنا یہ کنایہ ہوتا ہے اعراض سے کہ پرواہ ہی نہیں کی، جب کسی بات کو پشت کے پیچھے پھینک دیا جائے تو اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی اس طرح سے انہوں نے بھی اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا، اللہ کی بات کی پرواہ نہیں کی البتہ شیاطین کے سکھائے ہوئے جادو کے پیچھے پڑ گئے۔

سحر کی اقسام اور حکم:

"واتبعوا ماتتلوا الشیٰطین علیٰ ملك سلیمٰن" یہود میں جہاں اور بہت ساری خرابیاں آ گئی تھیں ان میں ایک خرابی سحر و ساحری کی بھی تھی، جادوگری کا پیشہ انہوں نے بہت اختیار کر لیا تھا اور یہ جادو ان کے اندر پھیلا کس طرح سے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چونکہ جنوں پر بھی تھی اور انسانوں پر بھی، جنوں کے اندر جو شیاطین قسم کے جن تھے وہ یہی جادو کا کام جانتے تھے۔

سحر کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ عجیب قسم کے اثرات پیدا کر دینا ایسے مخفی اسباب کے ذریعے سے جو ہر کسی کے علم میں نہیں ہوتے بعض کلمات کے دہرانے کے ساتھ اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں بعض چیزوں کو بعض چیزوں کے ساتھ ملانے سے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں جادو کے مختلف شعبے ہیں جن کی تفصیل کتابوں کے اندر موجود ہے۔

بہر حال جس سے ان کی مذمت آتی ہے شریعت میں اس سحر سے مراد ایسا سحر ہوتا ہے کہ جس میں ارواح خبیثہ کے ساتھ تعلق قائم کر کے استعانت حاصل کی جائے، کفریہ کلمات بولے جائیں یا حرام اور ناجائز اور ناپاک چیزوں کا استعمال کر کے کچھ اثرات ظاہر کیے جائیں یہ جادو کہلاتا ہے۔

اگر تو اس میں شرکیہ کلمات ہوں پھر تو اس کا کرنا کرانا سب یہ کفر و شرک ہوا اور اگر اس میں کفریہ شرکیہ کلمات تو نہیں ہیں ناپاک ناجائز اور گندی چیزوں کا استعمال ہے یا کسی غلط مقصد کے لیے اس کو استعمال کیا جا رہا ہے برے اثرات پیدا کرنے کے لیے تو پھر گناہ کبیرہ ہے، حرام ہے۔

اور اگر کوئی ناجائز چیز بھی استعمال نہ کی جائے اور کسی ناجائز مقصد کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے اور ارواح خبیثہ سے استعانت نہ ہو تو پھر یہ منتر، پھونک مارنا، تعویذ گنڈا یہ جواز کے درجے میں ہیں چاہے اس میں قرآن کریم کی آیات استعمال کی جائیں چاہے کچھ اور الفاظ استعمال کیے جائیں جس قسم کے تعویذات کتابوں میں لکھے ہوئے

ہیں ہمارے اکابر کے استعمال میں بھی رہے تو اس میں ضروری نہیں ہوتا کہ ہر جگہ قرآن کریم کی آیات ہی لکھی جاتیں ان میں الفاظ اور بھی ہوتے ہیں قرآن کریم کے علاوہ کہ جن کے استعمال کے ساتھ کچھ اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں وہ پھر جائز ہیں وہ ناجائز نہیں۔

اللہ کا نام استعمال کیا جائے اللہ کی کلام کا کوئی جز استعمال کیا جائے، حدیث شریف میں جو اوراد آئے ہیں ان میں سے کوئی ورد استعمال کیا جائے یا ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کا معنی غلط نہیں پھر ان کو ایسے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جو مقصد غلط نہیں کسی بیمار کی شفاء کے لیے بچھو سانپ کے کاٹنے کے بعد جو یہ دم کیا کرتے ہیں تکلیف کے دور کرنے کے لیے اچھے مقاصد کے تحت اگر ان کو استعمال کیا جائے تو پھر ان کا جواز ہے۔

یہود کا جادو سیکھنا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف پروپیگنڈہ:

تو شیاطین اس قسم کا جادو کرتے تھے جو کفر اور شرک کے درجے تک پہنچا ہوا تھا انہی سے یہود نے سیکھا یہود کے اندر اس کا رواج ہوا اور شیاطین نے پروپیگنڈہ کیا اپنے اس جادو کی اشاعت کے لیے یا یہود نے اس مقصد کے تحت تاکہ لوگ اس پیشے کو برا نہ سمجھیں اس پیشے کا تقدس قائم کرنے کے لیے شیاطین نے یا یہودیوں نے خود یہ پروپیگنڈہ کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بھی جادوگر تھے اور ان کی یہ جو عجیب وغریب حکومت تھی ہوا پر وہ اڑتے تھے وغیرہ یہ تصرفات حضرت سلیمان علیہ السلام کے اسی جادو کے ذریعے سے تھے یہ انہوں نے پروپیگنڈہ کیا حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں، اور اس طرح انہوں نے اپنے اس فن کا تقدس قائم کرنے کی کوشش کی، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ان میں جادو کا رواج تھا، اور حدیث شریف میں ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مدینہ منورہ کے یہودیوں نے جادو کر دیا تھا اور کچھ اثرات ظاہر ہو گئے تھے جس کے ازالے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے یہ آخری سورتیں معوذتین اتاری ہیں اور ان کے پڑھنے کے ساتھ وہ اثرات زائل ہوئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہود کا شکوہ کیا ہے کہ ہم نے تمہیں کتاب دی تھی، چاہیئے یہ تھا کہ اپنی آخرت کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب کی اتباع کرتے، کتاب پر عمل کرتے، دنیا میں بھی اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے ساتھ سرخرو ہوتے لیکن ان کی طبیعت ایسی پست ثابت ہوئی کمینہ پن ان میں اس قسم کا آیا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات جو کتابی شکل میں ان کے پاس موجود تھیں وہ تو انہوں نے ترک کر دیں پس پشت ڈال دیں اور ایسے تعویذ گنڈے

منتر جن میں فساد ہی فساد اور جنات اور خبیث روحوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر کے عجیب وغریب قسم کے شعبدے دکھانے کے مشغلے کے اندر لگ گئے اس کو انہوں نے خوش کن مشغلہ بنالیا، یہ شکوہ اس طرح سے ہے۔

پہلی اشاعت ان کے اندر انہی جنات اور شیاطین کی وجہ سے ہوئی، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنات بھی انسانوں کے ساتھ خلط ملط رہتے تھے دوسرا لفظ قرآن کریم میں آ رہا ہے۔

"وماانزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت" ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں بابل شہر میں ان کے اوپر جو کچھ اتارا گیا، یہودی ان کے پیچھے لگ گئے۔

ہاروت و ماروت پر جادو کا علم کیوں اتارا گیا؟

اب یہاں سوال ہے کہ ہاروت اور ماروت پر جو چیز اتاری گئی تھی وہ کیا چیز تھی؟ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہاروت ماروت سے مراد فرشتے ہی ہیں جیسے قرآن کریم کا ظاہر دلالت کرتا ہے یہاں آ کر ہمارے حضرات کی تقریریں دو طرح کی ہیں بیان القرآن میں، معارف القرآن (مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہاروت و ماروت پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ جادو کے اصول اتارے تھے لوگوں کو سکھاتے تھے۔

ہاروت و ماروت پر جادو کا علم کیوں اتارا گیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام آتے اور لوگوں کو معجزات دکھاتے معجزات میں بعض لوگوں کے سامنے عجیب وغریب واقعات پیش آتے جس کا وہ سبب نہیں سمجھتے تھے اور عام طور پر جاہل یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح باقی جادوگر ہیں یہ انبیاء علیہم السلام کے معجزے بھی شاید جادو کا اثر ہیں، تو جادوگروں سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا امتیاز لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادوں گروں کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، ان شعبدہ بازیوں کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ساتھ قرآن کریم میں مذکور ہے ہوسکتا ہے کہ یہی چیز زور پکڑ گئی ہو اور آگے انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے ساتھ ان کے شعبدے چشم بندی یہ کچھ مشابہ ہو گئے ہوں تو عوام کو پہچاننا مشکل ہو گیا تو اب یہ پہچاننا کہ یہ معجزہ ہے یا جادو کا اثر ہے ان دونوں باتوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جادو کے اصول واضح کیے جائیں تاکہ پتہ چلے کہ جو ان اصولوں کے تحت کام ہوتا ہے وہ جادو ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا ان اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان اصولوں کی اشاعت انبیاء علیہم السلام سے کروائی جاتی کہ انبیاء علیہم السلام کہتے کہ جادو یوں کیا جاتا ہے اور جو اس قسم کا کام کرے وہ جادوگر ہوتا ہے، لیکن جادو کے اندر چونکہ کفریہ کلمات کا استعمال آتا ہے،

ارواح خبیثہ کے ساتھ تعلق قائم کرنا پڑتا ہے تو اس قسم کا کام انبیاء علیہم السلام سے جو سراپا مظہر ہدایت ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکمت نہ ہوئی کہ چاہے نقل کفر کفر نباشد کہ کفریہ کلمہ صرف اس کا کفر ظاہر کرنے کے لیے ذکر کیا جائے تو یہ کفر نہیں ہے لیکن انبیاء علیہم السلام لوگوں کو اگر جادو سکھاتے کہ دیکھو جادو یوں ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے سراسر کفر، تو بعض لوگ انبیاء علیہم السلام سے سن کر اس جادو کو استعمال کرتے تو ان کے کفر میں مبتلا ہونے کا ذریعہ انبیاء علیہم السلام بنتے اور یہ بات انبیاء علیہم السلام کی شان سے بعید ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان امتیاز کرنے کے لیے دو فرشتے بھیجے انسانی شکل میں اور ان کو جادو کی تعلیم دی تاکہ وہ لوگوں کو جاکے جادو سکھائیں اور اس لیے سکھائیں تاکہ اس فن سے واقف ہونے کے بعد وہ فرق کرسکیں کہ یہ جادوگر ہے یہ جادوگر نہیں ہے۔

شر سے بچنے کیلئے شر کا پہچاننا ضروری ہے:

جب تک میں یہ سمجھتا نہیں کہ جادو کسے کہتے ہیں اور جادوگر کی صفات کیا ہیں اس وقت تک اگر میرے سامنے کوئی شخص آجائے تو میں فرق نہیں کرسکتا کہ اس کا تعویذ گنڈا جائز ہے یا اس کا تعویذ گنڈا ناجائز ہے؟ جائز اور ناجائز کے درمیان میں فرق تب ہی کرسکوں گا کہ جائز کے اصول بھی معلوم ہوں، ناجائز کے اصول بھی معلوم ہوں، اگر میں ناجائز کے اصول نہیں سمجھتا اور ان کا طریقہ کار نہیں سمجھتا تو میں کیسے فیصلہ کرسکوں گا کہ یہ ناجائز ہے اور یہ جائز ہے جیسے عربی میں کہتے ہیں "عرفتُ الشرَ لاللشر ولکن لتوقیہ" کہ میں شر کو بھی پہچانتا ہوں لیکن وہ شر پر عمل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے تاکہ میں شر سے بچ سکوں کہ "من لم یعرف الشرمن الخیر" جو شخص خیر سے جدا کرکے شر کو نہیں پہچانتا یوشك ان یقع فیہ بہت قریب ہوتا ہے کہ اس شر میں واقع ہو جائے۔

تو شر سے بچنے کے لیے بھی شر کا پہچاننا ضروری ہے، کرنے کے لیے بھی پہچاننا ضروری، بچنے کے لیے بھی پہچاننا ضروری ہے اب یہ فرشتے جو تعارف کراتے تھے جادو کا یہ اس لیے نہیں کراتے تھے کہ تم بھی یوں کرو بلکہ اس لیے کراتے تھے کہ تم یہ جانو کہ جو یوں کرتا ہوگا وہ جادوگر ہے، اور اس سے بچنا چاہیے، اسی لیے جب کوئی ان کے پاس جادو سیکھنے کے لیے آتا تو فرشتے اسے کہتے کہ دیکھو بھائی ہم تمہیں سکھا تو دیں گے لیکن اتنا یاد رکھنا کہ ہماری حیثیت فتنہ کی ہے، ہم آزمائش کے لیے آئے ہیں اس لیے ہم سے سیکھ کر کہیں کفر میں مبتلا نہ ہو جانا بلکہ جادوگروں کا مقابلہ کرنے کے لیے، جادوگروں کے جادو کو باطل کرنے کے لیے، جادو کو انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے ممتاز کرنے کے لیے سیکھو اور اگر تم ہم سے سیکھ کے اس کو غلط استعمال کرنے لگ جاؤ گے تو ہم تمہارے لیے فتنہ بن جائیں گے اور تم کفر میں مبتلا ہو جاؤ گے یہ سب کچھ پہلے ان کو سمجھا دیتے تھے پھر انہیں تعلیم دیتے تھے۔

باطل کی تعلیم حق و باطل میں فرق کرنے کیلئے ہوتی ہے:

آپ اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک آدمی ہے مثال کے طور پر ہمارے مولانا محمد حیات صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں ختم نبوت والے وہ مرزائیت کے ماہر ہیں اب کوئی شخص ان کے پاس جائے اور جا کر کہے کہ مجھے مرزا کی کتابیں پڑھاؤ وہ کہیں گے ہاں میں پڑھاتا ہوں اس نیت کے ساتھ پڑھوتا کہ تم مرزے کی حقیقت سے واقف ہو جاؤ مرزائیت کی تردید کرو اور ان کی فتنہ بردازیاں تمہارے سامنے آجائیں یہ ان کے اصول ہیں اور ان کا یہ جواب ہے۔

ہم پر وہ یہ اعتراض کرتے ہیں وہ سارے کے سارے اس کو پڑھائیں گے اس لیے پڑھائیں گے تاکہ ان کی تردید اس کے لیے آسان ہو جائے، اگر کوئی بدبخت ان کے پاس پڑھ کے مرزائی ہو جائے اور وہی اعتراضات جو مرزائیوں کی طرف سے انہوں نے اس کو سکھائے ہیں وہی اعتراض وہ اسلام پہ کرتا پھرے تو اس میں مولانا حیات صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تو کوئی قصور نہیں یہ اس کا استعمال غلط ہو گیا، پڑھانے والے نے صحیح نیت کے ساتھ پڑھایا لیکن پڑھنے والے نے اس کا استعمال غلط کر لیا یا کفریہ کلمات کسی زمانہ میں لوگوں کی زبان پر رائج ہو جائیں اور لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ یہ کلمہ کفریہ ہے تو ایک عالم ایک کتاب لکھتا ہے کلمات کفریہ اور اس میں وہ لکھتا ہے کہ یہ کہنا کفر ہے یہ کہنا کفر ہے۔

اب اس کا مقصد اس کی اشاعت سے یہ ہے کہ لوگ ان سے واقفیت حاصل کر کے ان کو استعمال کرنے سے بچیں لیکن اگر کوئی شخص وہی باتیں یاد کر لے اور وہی باتیں اپنی زبان سے نکالنا شروع کر دے تو یہ اس کتاب کا استعمال غلط ہے، پرانے فلسفہ کا کوئی ماہر ہو اب وہ فلسفہ پڑھاتا ہے، فلسفیوں کے غلط عقیدے آتے ہیں غلط نظریات آتے ہیں ایک آدمی اس کے پاس فلسفہ پڑھنے جائے اور کہے کہ مجھے فلسفہ پڑھا دو وہ کہیں گے کہ ہاں میں پڑھاتا ہوں لیکن اس نیت سے پڑھاتا ہوں تاکہ تم ان کے باطل نظریات سے واقف ہو جاؤ اور اسلام کے ساتھ ان کا جو تصادم ہے اس تصادم میں تم اسلام کی طرف سے ان کا دفاع کر سکو وہ کہے کہ ہاں میں اسی نیت سے پڑھتا ہوں تو استاد پڑھا دے گا لیکن کل کو فلسفہ پڑھ کے اسلام پر ہی اعتراض کرنے لگ جائے تو گویا کہ اس استاد کا پڑھانا اس کے لیے فتنہ بن گیا اور وہ اس کفر میں مبتلا ہو گیا۔

لیکن اس میں استاد کا قصور کوئی نہیں تو اسی طرح کفر کے اصول بھی ہمارے ہاں پڑھائے جاتے ہیں، عیسائیت کے اصول بتائے جاتے ہیں، مرزائیت کے اصول بتائے جاتے ہیں، یہودیت کے اصول بتائے جاتے

ہیں، قدیم فلسفہ پڑھایا جاتا ہے جس میں شریعت کے خلاف ان کی باتیں ہوتی ہیں وہ پڑھائے اس لیے جاتے ہیں تاکہ باطل نظریات سمجھنے کے بعد آپ ان کا ابطال کر سکیں، لیکن اگر اس مدرسہ میں کوئی پڑھ کر یہی عیسائیت، یہی فلسفہ پڑھ کر اگر کوئی اسلام کے خلاف کام کرنا شروع کر دے اور اپنے اس علم کو اسلام کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دے وہ اعتراض جو آپ کو پڑھائے تھے کہ مرزائیت کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض ہے یہی شائع کرنے شروع کر دے تو اس میں استعمال کرنے والے کی غلطی ہے پڑھانے والے کی غلطی نہیں ہے تو یہ تعلیم اس لیے دی جاتی ہے تاکہ حق و باطل کے درمیان میں فرق ہو جائے۔

یہ فرشتے جو اپنے آپ کو "نحن فتنة" کہتے تھے تو اس کا معنیٰ یہی تھا کہ اس کو صحیح نیت کے ساتھ پڑھنا، ہم صحیح نیت کے ساتھ تمہیں پڑھائیں گے تاکہ تمہیں پہچان ہو جائے کہ یہ جادو ہے یہ معجزہ ہے اور یہ جادوگر ہے اور یہ نبی ہے ان کے درمیان تم فرق کر سکو اور ایسا نہ ہو کہ ہم سے تم جادو سیکھ لو اور سیکھنے کے بعد تم خود جا کر جادو کرنا شروع کر دو تو تم کافر ہو جاؤ گے اس لیے کہا "نحن فتنة فلا تكفر" ہم سے سیکھ کے کہیں کافر نہ ہو جانا فرشتے یہ نصیحت کرتے تھے لیکن اس نصیحت کے باوجود یہودی ان سے جادو کے اصول سیکھتے اور جادوگروں کی طرح خود بھی شرارت کرنے لگ جاتے نتیجۃً یہ کفر میں مبتلا ہو جاتے۔

جادو کے ساتھ چیز کی ماہیت بدلی جا سکتی ہے یا نہیں؟:

ان کے کفر کو اور ان کی بدعملی کو نقل کرتے ہوئے قرآن کریم نے جو لفظ بولا ہے وہ یہ ہے کہ ان ہاروت و ماروت سے یہ ایسی چیز سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے یہ خاوند اور اس کی بیوی کے درمیان میں فرق ڈال دیتے، خصوصیت کے ساتھ ان کا یہ کردار قرآن کریم میں یہاں نقل کیا گیا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھیے کہ جادو کا اثر صرف اتنا نہیں ہوتا کہ خاوند اور بیوی کو لڑا دے جادو کے اثرات اس سے زائد بھی ہو سکتے ہیں جادو کے ذریعہ سے کسی انسان کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے، جادو کے ذریعہ سے کسی انسان کو بیمار بھی کیا جا سکتا ہے، جادو کے ذریعہ سے اور بھی مختلف تکلیفیں پہنچائی جا سکتی ہیں۔

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ جادو کے ساتھ کسی چیز کی ماہیت بدلی جا سکتی ہے یا نہیں انسان کو پتھر بنا دیا جائے، انسان کو گدھا بنا دیا جائے، یا لاٹھی کو سانپ بنا دیا اور واقعی وہ سانپ بن جائے، تو کیا اس قسم کی ماہیت تبدیل ہو سکتی ہے یا نہیں، یا صرف نظر بندی اور چشم بندی ہوتی ہے حقیقت اس میں کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن بعض حضرات نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ جادو کے ساتھ ماہیت بھی تبدیل کی جا سکتی ہے جیسا کہ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ کا قول مشکوٰۃ شریف باب الاستحاضہ میں آتا ہے اور یہ یہودی تھے بعد میں مسلمان ہوئے ہیں اور چونکہ یہود کے مزاج کو جانتے تھے کہ

اپنے مخالفین پر وہ کس قسم کا جادو کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں اپنے تحفظ کے لیے چند کلمات رات کو پڑھتا ہوں نہ پڑھتا ہوتا تو یہ یہودی مجھے جادو کے زور سے گدھا بنا دیتے جس سے اس بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے کہ انسان پر جادو کے زور سے اس قسم کے اثرات بھی پڑ جاتے ہیں۔

اور کچھ کلمات شرعیہ بھی ایسے ہیں کہ اگر ان کو پڑھا جائے تو جادو کے اثرات سے انسان بچ بھی جاتا ہے وہ کلمات اس روایت کے اندر مذکور ہیں۔

شیطان اور یہود کا محبوب ترین مشغلہ:

تو اثرات اور بھی واقع ہوتے ہیں اور وہ دوسرے اثرات بھی واقع کرتے تھے لیکن خصوصیت کے ساتھ جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جن کے ذریعے خاوند اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے تھے یہ ان کے اخلاق کے زوال کا انتہائی نکتہ ہے جو قرآن کریم نے واضح کیا اس کو آپ اس طرح سمجھ لیجیے کہ مشکوٰۃ شریف میں باب الوسوسۃ میں روایت ہے کہ ابلیس اپنے لشکروں کو صبح وشام لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے بھیجتا ہے، جن کو صبح کو بھیجتا ہے وہ شام کو آ کر ابلیس کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا شرارتیں کیں اور کرائیں اور جن کو شام کو بھیجتا ہے وہ صبح آ کر رپورٹ دیتے ہیں کہ رات کو ہم نے کیا کیا اور کیا کیا کرایا، تو جس وقت اس کے وہ چیلے چانٹے آتے ہیں اور آ کر بتاتے ہیں کہ ہم نے فلاں شرارت کی، فلاں شرارت کی وہ کہتا ہے مافعلتَ شیئاً تو نے کچھ نہیں کیا، یہ بھی کوئی شرارت ہے جو تو کر کے آیا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہر شرارت کو تھوڑی قرار دیتا ہے اور برانگیختہ کرتا ہے کہ اور زیادہ کر۔

ایک آ کر کہتا ہے کہ جی میں فلاں شخص کے پیچھے لگا اور میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان لڑائی نہیں کرا دی تو سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ اسے وہ کہتا ہے نعم انتَ تو بڑا اچھا آدمی ہے اور اس کو قریب کرتا ہے، فیلتزمہ اور سینہ سے لگاتا ہے، یعنی اسے کہتا ہے کہ تو صحیح کام کر کے آیا ہے جس کا مطلب یہ ہوا ابلیس کی نظر میں سب سے بڑی شرارت یہ ہے کہ خاوند اور بیوی کے درمیان بگاڑ کرا دیا جائے۔

اس لیے ایسا کام کرنے والے کی وہ تعریف کرتا ہے تو شیطان کا لذیذ ترین مشغلہ اور سب سے بڑا مقصود خاوند اور بیوی کے درمیان پھوٹ ڈالنا ہے اب یہ شیطانوں والا کام ان یہودیوں نے شروع کر دیا ہے کہ ان کا مشغلہ بھی یہی ہے کہ خاوند اور بیوی کے درمیان لڑائی کرا دی جائے۔

انسانی تمدن کی اصلاح خاندانی اصلاح پر موقوف ہے:

خاوند بیوی کے درمیان لڑائی کرانا یہ اخلاقی زوال کا انتہائی نکتہ کیوں ہے؟

اس کو اس طرح سمجھیے کہ انسانی تمدن کا دارومدار اور اس کی اصلاح خاندانی حالات کی اصلاح پر ہے اور اس تمدن کا بگاڑ خاندانی حالات کے بگاڑ پر ہے خاوند بیوی کی آپس میں محبت ہو تو گھروں میں سکون ہوتا ہے، خاندانوں میں سکون ہوتا ہے اور اس سکون کے نتیجہ میں ہر شخص کا اخلاق محفوظ ہوتا ہے عورتوں کا اخلاق بھی محفوظ، مردوں کا اخلاق بھی محفوظ، نسب نامے محفوظ، گھروں میں سکون ہوگا تو اطمینان سے آپ کھائیں گے، پئیں گے، اور باہر کے کام بھی آپ اطمینان سے کریں گے، اور پورا معاشرہ آپ کو پرسکون نظر آئے گا، تو تمدن کا بگاڑ اور معاشرے کا بگاڑ گھروں کی لڑائی سے شروع ہوتا ہے جس گھر کے اندر خاوند بیوی کا آپس میں اتفاق نہ ہو اس گھر کے اندر کبھی بھی سکون نہیں ہوگا، عورتوں کے اخلاق بھی محفوظ نہیں رہ سکتے، مردوں کے اخلاق بھی محفوظ نہیں رہ سکتے، پھر نسب نامے محفوظ نہیں رہ سکتے، گھروں کا نظم ٹھیک نہیں رہ سکتا ان کے بگاڑ کے نتیجہ میں دو خاندان بگڑتے ہیں، ان کی آپس میں لڑائی ہوتی ہے، دو قبیلے آپس میں لڑتے ہیں، دو قومیں آپس میں لڑتی ہیں۔

ذرا اخبار اٹھا کر دیکھا کرو تمہیں پتہ چلے کہ عورتوں کی وجہ سے دنیا میں کتنی لڑائیاں ہوتی ہیں، اگر خاوند بیوی کے تعلقات اچھے رہیں تو سارے کے سارے فساد ختم ہو جائیں گے، اور خاوند بیوی کے تعلقات خراب ہونے کی صورت میں ہی فتنہ پھیلتا ہے، اس لیے شریعت میں اس کی بہت اہمیت ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے، چند ایک مواقع ایسے بتائے کہ جہاں اگر انسان خلاف واقعہ بات کہہ لے تو شرعاً اس کو جھوٹا نہیں کہیں گے، شریعت میں گناہ نہیں ہے، ان میں سے ایک موقع یہ بھی بتایا کہ خاوند اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لیے کوئی خلاف واقعہ بات کہہ دے یا بیوی اپنے خاوند کو خوش رکھنے کے لیے کوئی خلاف واقعہ بات کہہ دیتی ہے تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔

اس سے آپ اندازہ کیجیے کہ جھوٹ جیسا گھناؤنا جرم بھی خاندانی محبت کو برقرار رکھنے کے لیے برداشت ہے تو کتنی مطلوب ہے خاندان میں خاوند اور بیوی کی محبت، وجہ اس کی یہ ہی ہے کہ اس سے ہی انسانی زندگی میں سکون آتا ہے، اور اس محبت سے ہی انسانی اخلاق محفوظ ہوتے ہیں، اس محبت کے ساتھ ہی خاندان اچھی نشوونما پاتے ہیں اور جس وقت ان کی آپس میں لڑائی شروع ہو جائے تو خاندانی زندگی برباد، خانگی زندگی برباد گھر میں سکون نہیں ہوگا تو انسان کو باہر کی زندگی میں بھی کبھی سکون نصیب نہیں ہوگا، نہ بچوں کی تربیت صحیح ہوگی،

نہ اولاد صحیح پیدا ہوگی، اخلاق برباد ہو جائیں گے، خاندانوں میں لڑائیاں ہوں گی، برادریاں ٹوٹ جائیں گی اور آپس میں قتل وقتال، گالی، گلوچ سب اسی سے شروع ہوتا ہے اس لیے انسانی تمدن کی اصلاح اگر ہے تو خاندانی اصلاح پر ہے اور بگاڑ اگر ہے تو اسی خاندانی بگاڑ پر ہے تو یہ ایسے ذلیل اور کمینے تھے کہ ان کا مشغلہ یہی تھا کہ جہاں زوجین میں محبت دیکھی برداشت نہ کر سکے اس بیوی کو خاوند کے خلاف کیا اپنے پیچھے لگا لیا بس عورتوں کو ایک سے توڑنا دوسروں سے جوڑنا یہ ان کا مشغلہ ہو گیا تھا۔

اور پھر آپ سمجھتے ہی ہیں کہ یہ اخلاقی زوال کا انتہائی ذلیل درجہ ہے، باقی چیزیں ذکر کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے یہ جو واضح کیا ہے کہ اس قسم کی باتیں سیکھتے تھے اس سے ان کا اخلاقی نقشہ اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تو ہاروت و ماروت نے جادو کے اصول اس لیے سکھانے شروع کیے تھے تاکہ جادوگروں اور انبیاء علیہم السلام میں فرق کیا جا سکے اور جادو کو پہچان کے اس کو رد کیا جا سکے لیکن انہوں نے سیکھ کر اس کو اسی طرح استعمال کیا جس طرح باقی جادوگر استعمال کرتے تھے اور یوں یہ کفر میں استعمال ہوئے۔

ما انزل علی الملکین کی دوسری تفسیر:

عام طور پر مفسرین نے ما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت کی یہی تقریر کی ہے اور بیان القرآن میں یہی تقریر مذکور ہے، اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معارف القرآن میں اسی پر مدار رکھا ہے لیکن سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ایک اور تفسیر مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے قصص القرآن میں نقل کی ہے اور یہی قول جو سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے اسی قول کو اختیار کیا ہے امین احسن اصلاحی نے اپنی کتاب تدبر القرآن میں مدار اسی پہ رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ شیطان تو سکھاتے تھے جادو جو کفریہ کلمات پر مشتمل، شرکیہ کلمات پر مشتمل تھا اور جس کے کرنے کے ساتھ وہ لوگ کافر ہوتے تھے اور اپنا تقدس جمانے کے لیے انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اس کو منسوب کر دیا جیسے آج کل بھی تعویذ کرنے والوں کے پاس جو کتابیں ہوتی ہیں وہ نقش سلیمانی کہلاتی ہیں یہ وہی یہودیانہ ذہن ہے کہ جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یہ بات انہی باقیات سیئات میں سے ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ جس وقت کوئی غلط فن یا کوئی غلط قسم کا علم لوگوں کے اندر رائج ہو جائے تو رد کے لیے اللہ تعالیٰ صحیح علم کو لاتے ہیں اور اس کے ساتھ اس علم کا رعب اتارا جاتا ہے تو یہاں بھی ایسے ہی ہوا کہ

لوگوں میں جادو رائج ہوا جس میں کفریہ کلمات تھے کہ تعویذ کرتے تو عجیب وغریب اثرات پیدا ہوجاتے، پھونک مارتے تو عجیب وغریب اثرات پیدا ہوجاتے۔

اب ان کے اس علم وفن کے ساتھ اہل حق کی عوام کے اوپر غلط اثرات پیدا ہوسکتے تھے کہ ان جادوگروں کی عظمت ان پر قائم ہوجائے اور پھر یہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر ان کے پیچھے لگ جائیں اس کے توڑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیجے انسانی شکل میں اور ان کو صحیح تعویذ گنڈا سکھایا، اللہ تعالیٰ کی کلام کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ صحیح کلمات کے ساتھ کہ جو اثرات وہ غلط تعویذوں سے پیدا کرتے ہیں تم اسی طرح یہ نام استعمال کرو، یہ لفظ استعمال کرو تو اس میں یہ اثر آجائے گا وہ کسی خبیث روح کا نام لے کر سر پر پھونک مارتے ہیں تو درد ٹھیک ہوجاتا ہے تم بسم اللہ پڑھ کے پھونک مارنا تو یہ درد ٹھیک ہوجائے گا، وہ ارواح خبیثہ سے استعانت کر کے ایک کرتب دکھاتے ہیں تم سورۃ فاتحہ پڑھ کے دم کرو گے تو وہی اثرات پیدا ہوجائیں گے (مثال دے رہا ہوں) عوام کے اندر دو علم مشہور ہیں کالا علم اور نوری علم کالا علم یہ جادو کو کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں نوری علم یہ ہے جو صحیح تعویذ گنڈا ہے تو گویا کہ اس کالے علم کو توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہاروت وماروت کو نوری علم کی تعلیم دے کر بھیجا۔

آج ہمارے ہاں بھی جو تعویذ گنڈے اور اس قسم کی چیزیں منقول ہیں اس کا اصل یہی ہاروت وماروت کی تعلیم ہے جس میں الفاظ کی تاثیرات بتائی جاتی ہیں کہ اس لفظ کو اتنی مرتبہ دہراؤ گے تو اس میں یہ اثرات پیدا ہوجائیں گے اس بات کو اتنی دفعہ لکھو گے تو اس میں یہ اثرات پیدا ہوجائیں گے یہ کلمات صحیحہ کے ساتھ اگر کیا جائے گویا کہ اس جادو کے توڑ کے لیے یہ تعلیم دی گئی ہے۔

اب صورتحال یہ ہوگئی چاہیے تو یہ تھا کہ جادوگروں کا پیچھا چھوڑتے اور یہی تعویذ گنڈا جو صحیح طریقہ سے ان کو سکھایا گیا تھا اس کو اختیار کرتے اور ان کو صحیح مقاصد کے لیے استعمال کرتے سانپ ڈس گیا تو صحیح لفظ بول کر اس پر دم کرو تو جائز ہے، بچھو کاٹ گیا تم قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھ کر اس پر دم کرو تو یہ جائز ہے، خاوند بیوی کے درمیان بگاڑ ہے ان کے درمیان محبت پیدا کرنے کی ضرورت ہے تم تعویذ محبت دے دو، بچہ کسی کا باغی ہوا پھر رہا ہے، ماں باپ کا نافرمان ہے تم ماں باپ کے تابع کردو، مسخر کردو، کسی کو تکلیف ہے تو پھونک مار کے اس کو ٹھیک کردو تو ان گندے لوگوں کو چھوڑو، ان کافروں کو چھوڑو، اس تعلیم کو چھوڑو جو کفر کی طرف لے جاتی ہے، اور صحیح طریقہ کے ساتھ ان مقاصد کو حاصل کرو، تعلیم تو اس لیے دی گئی تھی لیکن ان بدبختوں نے اس صحیح علم کو بھی غلط کردیا۔

اب یہ واقعہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات میں یہ تاثیر ہے کہ اگر ان کو خاص طریقہ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو دو آدمیوں میں لڑائی ہو جائے گی۔

"القینا بینهم العداوة والبغضاء الی یوم القیامة" یہ آیت ہے اس کا ورد کرنے کے ساتھ اس کو خاص طریقہ سے لکھ کے دو قبروں کے درمیان دفن کرو، دو آدمیوں میں اختلاف ہو جائے گا اور آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی اور یہ پھوٹ ڈالنے کی کہیں ضرورت پیش آسکتی ہے کہ فتنہ برداز اکھٹے ہوئے ہیں اور ان کا آپس میں اتفاق ہے اور اس اتفاق نے دنیا کو تنگ کر رکھا ہے اگر ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی جائے تو کئی آدمیوں کی جان چھوٹتی ہے، ایسے مقصد کے تحت اگر دو کے درمیان پھوٹ ڈالی جائے تو شرعاً جائز ہے اور اس آیت کے یہ اثرات ہیں، دو آدمیوں کی آپس میں نفرت ہے محبت پیدا کرنے کے لیے قرآن کریم کی آیت آپ استعمال کیجئے" الّف بین قلوبهم ، لو انفقت مافی الارض جمیعاً والقیت علیك محبة منی، ولتصنع علی عینی" یہ آیات محبت پیدا کرنے والی ہیں، اب خاوند بیوی کی آپس میں اگر محبت نہیں تو وہاں اس کو استعمال کرو، اولا د والدین میں محبت نہیں وہاں اس کو استعمال کرو یہ بالکل ٹھیک ہے۔

اور اگر کسی لونڈے کو قابو کرنے کے لیے یہی تسخیر شروع کر دی، کسی پرائی عورت کو پیچھے لگانے کے لیے یہی تسخیر شروع کر دی، کالے علم والا فائدہ تم نے نوری علم سے حاصل کرنا شروع کر دیا تو یہ پہلے سے بھی زیادہ خباثت ہوگی کہ اللہ کے نام کو غلط کام کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، جن کا جوڑنا مقصود ہے ان کو توڑنا شروع کر دو، اور جن کا توڑنا مقصود ہے ان کو جوڑنا شروع کر دو تو یہ پہلے سے زیادہ خباثت ہے، ایک آدمی نے ناجائز مقصد حاصل کیا ناجائز طریقہ سے اور ایک آدمی ناجائز مقصد حاصل کرتا ہے اللہ کا نام لے کر تو یہ کتنی بڑی خباثت ہے؟ اس طرح انہوں نے صحیح علم کو غلط راستہ پر ڈال دیا تو آج بھی مسئلہ اسی طرح ہے ان روحانی اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا دم کرنا ٹھیک ہے، تعویذ لکھنا ٹھیک ہے، لیکن صحیح بات ہو صحیح مقصد کے لیے استعمال کی جائے تو اس میں کوئی کسی قسم کی کراہت نہیں ہے، صراحتاً اس کا حدیث شریف میں ذکر بھی آتا ہے اور امت کے اندر پہلے دن سے ہی یہ چیز رائج چلی آرہی ہے۔

لیکن اس کو دکان داری کا ذریعہ بنالینا کوئی صحیح مقصد کے لیے لے، غلط مقصد کے لیے لے، تو یہ دکان داری پھر کتاب اللہ سے برگشتہ کرنے والی ہے اور پھر یہ یہودیانہ پیشہ ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، چاہے کوئی اللہ کا نام استعمال کرے چاہے کوئی غیر اللہ کا نام استعمال کرے پھر یہ سارا علم وفن حرام ہو جائے گا اور جو اس سے

کمائیں گے وہ حرام ہوگا اگر جائز اور ناجائز میں تمیز نہیں کرتے کہ لینے والا صحیح مقصد کے لیے لے رہا ہے یا غلط مقصد کے لیے لے رہا ہے تو تعویذ محبت اور تعویذ عداوت میں صحیح مقاصد بھی ہوتے ہیں اور غلط مقاصد بھی ہوتے ہیں اگر صحیح غلط کی تمیز کیے بغیر تعویذ دینا شروع کردو گے تو یہ کمائی حرام ہے، اور یہ فعل حرام ہے۔

اور اگر اس میں جائز اور ناجائز کی تمیز کی جائے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے تو فائدہ پہنچائے تو " ما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت " سے صحیح علم مراد ہوگیا، جس طرح آج بھی یہ دونوں علم برابر سرابر چلتے ہیں۔

کالا علم بھی چلتا ہے اور صحیح تعویذ بھی چلتے ہیں، یہ رائے اس لیے بھی کچھ راجح معلوم ہوتی ہے کہ فرشتوں کے اوپر اہتمام کے ساتھ اس علم کو اتارا گیا اس زمانہ میں جبکہ جادو کا زور تھا تو اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق ایک غلط بات کو رد کرنے کے لیے صحیح راستہ دکھلایا گیا تو یہودیوں کو چاہیئے تھا کہ صحیح راستہ کو اختیار کرتے۔

اور اس غلط بات کو چھوڑ دیتے لیکن انہوں نے ان فرشتوں سے صحیح بات سیکھنے کے بعد پھر ان کا استعمال غلط کیا جس کے ساتھ وہ کفر اختیار کرتے تھے اس طرح صحیح بات کو غلط راستہ پر ڈال کر انہوں نے کافرانہ راستہ اختیار کرلیا تو یہ ان کی خباثت اور طبیعت کی پستی گویا کہ ان آیات کے اندر دکھائی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو پتہ ہے کہ جو اس قسم کی باتوں کے پیچھے لگ جائے ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور جس چیز میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپا دیا یہ بہت بری چیز ہے۔

اگر یہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے، اللہ کی کتاب کی اتباع کرتے، اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرتے تو یہ ان کے لیے بہت بہتر تھا، اس طرح جادو کا نقشہ ان آیات کے اندر ذکر کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت کردی گئی کہ یہ کافرانہ کام حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہیں کیا یہ سارے کا سارا شغل شیاطین کا ہے، آج اگر کوئی شخص اس قسم کے جادو کرتبوں کی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرتا ہے تو یہ انہی یہودیوں اور شیطانوں والا عقیدہ ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اس قسم کے کاموں کو منسوب کرنا کفر ہے یہ اسی یہودیوں اور شیطانوں کے پروپیگنڈہ کا اثر ہے جس قسم کے تعویذوں کو لوگ اب بھی نقش سلیمانی کہتے ہیں تو یہ نقش سلیمانی کے نام سے جن کتابوں کی اشاعت ہو رہی ہے یہ سب کفر ہے جیسا کہ اس آیت کے اندر ذکر کردیا گیا۔

نفع ونقصان اللہ کے ہاتھ میں ہے:

" وما ھم بضارین " ان الفاظ میں توحید کا تحفظ ہے کہ تعویذ میں اثرات ہیں کالے علم کے ساتھ بھی

اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں لیکن یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیے کہ یہ اللہ کی اجازت اور اس کے اذن کے ساتھ ہیں اگر اللہ نہ چاہے تو کسی چیز میں اثر ظاہر نہیں ہوسکتا اس لیے موحد آدمی کا دل مضبوط ہونا چاہیئے کہ نفع نقصان سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جس وقت تک اللہ کی مشیت نہ ہو، یہ وہی عقیدۂ توحید کی حفاظت ہے تاکہ ان کے اثرات کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہ سمجھنے لگ جائے کہ ستاروں اور دوسری چیزوں میں بھی کوئی مستقل اثرات ہیں، نہیں بلکہ یہ سب اللہ کے اذن سے ہے اور اس کی مشیت کے تحت ہے۔

سوال ولقد علموا کے اندر ان کے لیے علم کو ثابت کیا ہے اور لو کانوا یعلمون سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کو علم ہی نہیں۔

جواب یہاں مختصر المعانی والا قاعدہ چلتا ہے کہ جس علم کے اوپر اثر مرتب نہ ہو تو اس کو جہل کے قائم مقام اتار لیا جاتا ہے۔

جیسے ایک شخص اپنے باپ کی شان میں گستاخی کر رہا ہو کوئی سمجھانے والا اسے کہتا ہے کہ تجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ تیرا باپ ہے اگر تجھے معلوم ہوتا کہ یہ تیرا باپ ہے تو تو ایسا ہرگز نہ کرتا حالانکہ باپ ہونے کا علم تو اس کو ہے لیکن جب باپ ہونے کے متعلق علم ہونے کے بعد اس پر وہ اثرات مرتب نہیں ہوئے تو پھر یوں ہی کہا جاتا ہے کہ گویا کہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ یہ اس کا باپ ہے۔

اسی طرح سے یہاں ہے کہ وہ جانتے تو ہیں کہ یہ کفر ہے اس کے اختیار کرنے کے ساتھ آخرت برباد ہوجائے گی، آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے لیکن چونکہ اس پر عمل نہیں تھا جاننے کے باوجود وہ اس جادو کو اختیار کرتے تھے اور اپنی آخرت کو برباد کرتے تھے تو یوں سمجھو کہ یہ جاہل ہیں۔

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول۔

علمے کہ راہ حق ننماید جہالت است

اس کا معنی یہ ہے کہ جو علم حق کی طرف راستہ نہیں دکھاتا وہ علم جہالت کے قائم مقام ہے، گلستان میں آپ نے پڑھا ہوگا۔

علم چنداں کہ بیشتر خوانی
چوں عمل در تو نیست نادانی

علم جتنا بھی پڑھ لو اگر اس کے اوپر عمل نہیں ہے تو تم نادان کے نادان ہو۔

نہ محقق بود نہ دانش مند

چار پائے برو کتابیں چند

اگر گدھے کے اوپر چند کتابیں لاد دی جائیں تو نہ وہ محقق بنتا ہے نہ وہ دانشمند بنتا ہے چار پائے کے اوپر اگر چند کتابیں رکھ دی جائیں تو وہ دانشمند نہیں ہو جایا کرتا۔

بے عقل کو تو اتنا معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اوپر ایندھن لدا ہوا ہے یا کتابیں لدی ہوئی ہیں تو اسی طرح اگر کتابوں کا بنڈل تو سر پر اٹھایا ہوا ہے پڑھتے ہیں علم سب کچھ ہے لیکن اس کے مطابق عمل نہیں تو جہالت ہی جہالت ہے ''علمے کہ راہِ حق ننماید جہالت است '' یہاں اسی محاورے کے مطابق '' ولقد علموا'' میں اگرچہ ان کے لیے علم کا اثبات کیا گیا ہے لیکن ''لو کانوا یعلمون ''میں اس علم کی نفی کی گئی ہے۔

ان کو معلوم ہے کہ جو شخص اس جادو کو اختیار کرے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، بری ہے وہ چیز جس میں انہوں نے اپنی جانوں کو کھپا دیا کاش کہ ان کو معلوم ہوتا اب اس علم کی یہاں نفی ہوگئی۔
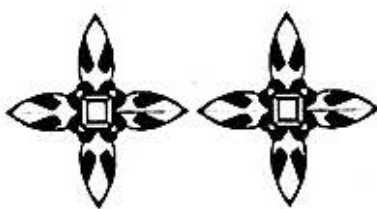
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا

اے ایمان والو! تم راعنا مت کہا کرو اور کہا کرو انظرنا

وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ

اور سنو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے (۱۰۴) جو لوگ کافر ہیں خواہ

أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ

اہل کتاب میں سے ہوں خواہ مشرکین میں سے ہوں وہ نہیں چاہتے کہ اتاری جائے تم پر کوئی بھلائی

رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ

تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ فضل

الْعَظِيمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ

عظیم والا ہے (۱۰۵) جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا اس کو بھلا دیں لے آتے ہیں ہم اس سے بہتر یا

مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۰۶﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ

اس جیسی کیا تو جانتا نہیں بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (۱۰۶) کیا تو جانتا نہیں کہ بے شک

اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ

اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے علاوہ

مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۰۷﴾ أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ

کوئی خیر خواہ نہ کوئی مددگار (۱۰۷) کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے

كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ

جیسا کہ سوال کیے گئے موسیٰ اس سے قبل اور جو کوئی شخص ایمان کا تبادلہ کرے کفر کے ساتھ

فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ

پس وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا (۱۰۸) اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ لوٹا دیں تمہیں

مِّنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِكُمۡ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِهِمۡ مِّنۡۢ

تمہارے ایمان کے بعد کفر کی طرف حسد کی وجہ سے جو ان کے دلوں کی گہرائیوں سے پیدا ہونے والا ہے

بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الۡحَـقُّ ۚ فَاعۡفُوۡا وَاصۡفَحُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ

بعد اس کے کہ ان کے لیے حق واضح ہو گیا معاف کر دو در گزر کر جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ

بِاَمۡرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ

اپنا حکم لے آئے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے (۱۰۹) نماز کو قائم رکھو

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ

اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو بھلائی تم اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجو گے پاؤ گے اس کو

اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوۡا لَنۡ يَّدۡخُلَ الۡجَـنَّةَ

اللہ کے پاس بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے (۱۱۰) اور یہ لوگ کہتے ہیں ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں

اِلَّا مَنۡ كَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ تِلۡكَ اَمَانِيُّهُمۡ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ

مگر وہی شخص جو یہودی ہوا یا وہی جو نصرانی ہوا یہ ان کی خواہشات ہیں آپ کہہ دیجیے کہ لے آؤ تم اپنی برہان اگر تم

صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ

سچے ہو (۱۱۱) کیوں نہیں؟ جو شخص تابع کر دے اپنی ذات کو اللہ کے اس حال میں کہ مخلص ہو پس اس کے لیے اس کا اجر ہے اس کے

رَبِّهٖ ۖ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

رب کے پاس نہ ان کے اوپر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے (۱۱۲)

تفسیر:

یا ایھا الذین آمنوا کے ساتھ خطاب کرنے کی وجہ:

قرآن پاک کی ابتداء سے آپ دیکھتے چلے آرہے ہیں کہ یا ایھا الذین آمنو ا کا خطاب یہ پہلی دفعہ آیا ہے اور پھر یہ پورے قرآن میں تقریباً اٹھاسی مرتبہ آئے گا اور یہ پہلا موقع ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو

اس لفظ کے ساتھ خطاب کیا ہے الـذیـن آمـنـوا کے لفظ کے ساتھ خطاب کر کے جو احکام دیئے جاتے ہیں تو ان احکام کی اہمیت مقصود ہوتی ہے اس کی ترغیب دو طرح سے ہے، ایک تو اس طرح کہ ایمان لانا یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ ہے ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اللہ کو الٰہ مان لیا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ہمیں ملیں گے۔

اور ہم ان احکام کے مطابق زندگی گزاریں گے، یہ کلمہ کے الفاظ جو اپنی زبان سے آپ ادا کرتے ہیں یہ اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا وعدہ ہے صرف یہی نہیں کہ چند کلمات ادا کر لیے بے حقیقت سے اور انسان کفر کی صف سے نکل کر ایمان کی صف میں آ گیا یہ باقاعدہ ایک معاہدہ ہے جس کے ضمن میں تمام ضروریات دین کو ماننا شامل ہے۔

اور اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد ہو گیا کہ ہم الٰہ آپ ہی کو سمجھتے ہیں، معبود آپ ہی کو سمجھتے ہیں، ہمارا بندگی کا تعلق آپ ہی کے ساتھ ہوگا، کسی اور کے ساتھ نہیں ہوگا اور پھر اللہ تعالیٰ کی عبادت جو کرنی ہے اس کے ساتھ جو بندگی کا معاملہ کرنا ہے تو طریقہ ہم کہاں سے سیکھیں گے؟ اپنی عقل کے ساتھ معلوم نہیں کریں گے، کوئی اور ذریعہ اختیار نہیں کریں گے، سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم آپ کا قاصد سمجھتے ہیں اس لیے جو یہ بتائیں گے ہم انہی کو آپ کے احکام سمجھ کر تسلیم کریں گے یہ ہے اس کلمہ کا حاصل اور اس میں عہد ہو گیا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا جس میں سارا دین ہے۔

اب ایک شخص میرے ساتھ عہد کر لیتا ہے یہ کہتا ہے کہ آج سے میں آپ کے ساتھ دوستی لگاتا ہوں میرا آپ کے ساتھ معاہدہ رہا آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہوں کہ آپ جو کچھ کہا کریں گے میں اس کو تسلیم کروں گا، دوسری طرف یہ بات ہے کہ جب وہ تسلیم کرے گا تو میری طرف سے انعام، اکرام ہوگا۔

اب ایک کام پیش آ گیا اور میں نام لے کر کہوں کہ فلاں کام کر دو اب اس میں ترغیب نہیں ہے، جذبات کا ابھارنا نہیں ہے اور ایک یہ ہے کہ میں کہوں کہ جس نے میرے ساتھ اطاعت کا معاملہ کیا ہے آؤ آج یہ ضرورت پیش آ گئی یہ کام کرو، اب یہ عنوان جذبات کو برانگیختہ کرنے والا ہے کہ جن کو کہا جا رہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ ہم ہر بات مانیں گے جب اس عنوان کے تحت ان کو بلایا جائے گا تو پھر ان کے اندر انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کو یاد آ جائے گا کہ جو ہم نے وعدہ کیا ہوا ہے اس کی وجہ سے ہم پابند ہو گئے کہ اب اس کام کو اس طرح کریں گے ایک تو اس میں ترغیب اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ ایمان یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اطاعت کا عہد ہے

تو" الذین آمنوا" کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اے وہ لوگو! جنہوں نے میرے ساتھ یہ عہد کرلیا ہے کہ میرے احکام مانو گے تو میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ یہ کام کرو تو نام لے کر حکم دینے میں ترغیب کا پہلو نہیں ہوتا، صفت کے ذریعہ حکم دینے میں ترغیب کا پہلو ہوتا ہے اس سے انسان کے جذبات ابھرتے ہیں" یا ایھا الذین آمنوا " کے ساتھ خطاب کرنے میں اطاعت کی ترغیب ہے۔

یا ایھاالذین آمنوا کے ساتھ خطاب کرنے کی دوسری وجہ:

اور دوسرا پہلو بھی ہے وہ اس طرح کہ آپ کے سامنے دوسرے پارے میں ایک لفظ آئے گا" والـذيـن آمنوا اشد حباً للّٰہ" کہ وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں بڑے سخت ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی شدید محبت ہوتی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت لفظ عشق تو استعمال نہیں کیا قرآن کریم میں عشق کا مادہ مستعمل نہیں ہے لیکن عشق کا مفہوم کیا ہے؟

شدت حب، محبت جس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے کہ اس کے اندر بے چینی کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اس کو عشق کہہ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کہتا ہے "والذين آمنوا اشد حباً للّٰہ "مؤمنوں کو اللہ کے ساتھ محبت بڑی سخت ہوتی ہے۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کے لیے اپنی کتاب کے اندر یہ اعلان کیا کہ مؤمن میرے عاشق ہوتے ہیں اور جو بھی مؤمن ہوگا اس کو میرے ساتھ بہت سخت محبت ہوگی تو جس وقت اللہ تعالیٰ نے محبت کا اعتراف کرلیا کہ مؤمن کو اللہ کے ساتھ بہت محبت ہوتی ہے اور بات بھی اسی طرح ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایمان کا معیار حدیث شریف میں ذکر فرمایا ہے، اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ساری کائنات کے مقابلہ میں زیادہ ہونی چاہیئے تب جاکے انسان کا ایمان کامل ہوتا ہے۔

عاشق صادق کے نزدیک محبوب کی رضا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی:

محبت اور عشق یہ جانثاری اور سرفروشی کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جس کے ساتھ عشق اور محبت کا دعویٰ کردیا جائے تو پھر اس دعویٰ کے ساتھ نافرمانی جوڑ نہیں کھاتی عاشق اپنے معشوق کا اور محب اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے ناز برداری کے درجہ تک اس کی اطاعت کی جاتی ہے اس کے حکم کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے سب سے بڑی حکمت اس میں یہ ہوتی ہے کہ ہمارے محبوب کا حکم ہے اگر ہم اس کے مطابق چلیں گے تو خوش ہو جائے گا اگر ہم اس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ناراض ہو جائے گا۔

اور جو محب خالص ہوتا ہے اس کے نزدیک محبوب کی ناراضگی سب سے بڑی سزا ہے اور محبوب کی رضامندی اس کے لیے سب سے بڑی بشارت ہے کہ اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب مجھ پر خوش ہے اور میری یہ ادا اس کو پسند ہے تو وہ اس ادا پہ جان دیتا ہے اور اگر اس کو پتہ چل جائے کہ اگر یہ کام میں نے کیا تو میرا محبوب مجھ سے ناراض ہو جائے گا تو سچا محبّ کسی صورت میں بھی اس فعل کے قریب نہیں جاسکتا عاشق صادق کے نزدیک محبوب کی رضا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے اور عشق و محبت یہ بھی انسان کو اطاعت پر مجبور کر دیتا ہے، یہ جذبہ ایسا ہے کہ اس کے پیدا ہو جانے کے بعد نافرمانی، سرکشی، بغاوت وغیرہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، محبت وعشق کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ پھر انسان اپنا قلب معشوق کے سپرد کر بیٹھتا ہے۔

اور جس کی حکومت قلب پر ہوگئی سمجھو کہ صدر مقام قابو آ گیا، دارالخلافہ قابو آ گیا ایک ایک قریہ اور بستی پر تو کوئی بادشاہ قبضہ نہیں کیا کرتا جس نے مرکز پہ قابو پالیا اس نے ساری حکومت لے لی تو اسی طرح محبت کے ساتھ دل پہ قبضہ ہو جاتا ہے دل پہ حکومت قائم ہو جاتی ہے تو اب باقی اعضاء میں کیسے جرأت ہوسکتی ہے کہ اس کی فرمانبرداری نہ کریں اور اس کے خلاف چلیں، عشق اور محبت کا یہ تقاضہ ہے، اطاعت تو انسان کرتا ہی ہے لیکن جو عشق و محبت کے جذبہ سے ہوا کرتی ہے یہ اطاعت لذیذ ہے۔

ضابطہ کی اطاعت اور محبت کی اطاعت میں زمین وآسمان کا فرق ہے:

اور جو صرف حاکمیت کے درجہ میں اطاعت ہوتی ہے اس میں انسان کے قلب میں وہ سرور نہیں ہوتا، ضابطہ کی اطاعت میں اور عشق و محبت کی اطاعت میں زمین وآسمان کا فرق ہے، ایک طالب علم استاذ سے محبت نہیں رکھتا اور کسی دن استاذ اس طالب علم کو کام کے لیے بلا لے تو استاذ کے کہنے کی وجہ سے وہ کام کرے گا ضرور لیکن دل میں کڑھ رہا ہوگا، بہت جلدی تھک جائے گا، وہ کام تو کرے گا لیکن دباؤ میں آ کر اور اس کام میں جان نہیں ہوگی اور ایک طالب علم استاذ سے محبت رکھتا ہے وہ متلاشی رہتا ہے کہ استاد مجھے خدمت کا موقع دے اور جب استاذ اس کو کام کے لیے بلا لے تو کام بھی کرے گا اور دل میں سرور اور خوشی بھی محسوس کرے گا اور اس کا دل یہ چاہے گا کہ جتنی دیر میں کام کرتا رہوں اتنا ہی اچھا ہے اور کام سے فارغ ہو کر پوچھے گا کہ کوئی اور کام بتایئے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی خدمت کے اندر گزارنے کا موقع ملے یہ محبت کے کچھ آداب ہیں اور محبت کے کچھ تقاضے ہیں۔

تو جب ایمان والے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت لگالیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عشق کا دعویٰ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے تسلیم کر لیا کہ واقعی جو مؤمن ہیں وہ میرے عاشق ہیں وہ میرے ساتھ بڑی محبت رکھتے ہیں

تو "یا ایھا الذین آمنوا" کا خطاب ایسا ہی خطاب ہے کہ کوئی کہے اے عاشقو! جنہوں نے ہمارے ساتھ عشق کا دعویٰ کیا ہے جو محبت کے مدعی ہیں اب ہم انہیں یہ حکم دیتے ہیں اب محبّ کہہ کر، عاشق کہہ کر، چاہنے والے کہہ کر جس وقت کسی کو حکم دیا جائے تو کیسے توقع ہے کہ وہ نافرمانی کرے گا۔

یا ایھا الذین آمنوا کہہ کر مؤمنین کو ان کی حیثیت یاد دلا دی:

اس لیے "یا ایھا الذین آمنوا" کے ساتھ جب خطاب کیا جائے تو آپ کی حیثیت یاد دلا دی جاتی ہے کہ تم ہو کون جن کو کہا جا رہا ہے؟ تم وہ ہو جنہوں نے عشق کا دعویٰ کیا ہوا ہے اور محبت ہمارے ساتھ لگالی اب محبت اور عشق کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم یوں کہتے ہیں اب اس طرح سے چلو اب اگر اس طرح چلو گے تو آپ اپنے محبت کے دعویٰ میں سچے ہو اور اگر اللہ تعالیٰ کا حکم آنے کے بعد کسی اور طرف جھانکو اور کسی دوسرے کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرو تو پھر گویا کہ اپنے دعوی عشق کے اندر جھوٹے ہو، عشق ہو جانے کے بعد معشوق کے علاوہ عاشق کے سامنے کسی دوسرے کی رضا مقدم نہیں ہوتی، معشوق کی رضا سب سے مقدم ہوتی ہے، اس کے لیے انسان اپنی دولت بھی برباد کر دیتا ہے، اپنا خاندان بھی چھوڑ دیتا ہے، ماں باپ سے فرار ہو جاتا ہے، استاذ سے فرار ہو جاتا ہے، برادری سے فرار ہو جاتا ہے، عزت ذلت اس کے نزدیک کوئی چیز نہیں رہتی، معشوق کی رضا سب سے مقدم ہوتی ہے تو جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کی محبت لگالی جائے گی، تو اس میں بھی وہی جذبات ابھارے جائیں گے اس لیے جب بھی خطاب کیا جائے "یا ایھا الذین آمنوا" تو اس وقت چوکنا ہو جانا چاہیئے کہ دیکھو ہماری حیثیت ہمیں یاد دلا کے ہم کو یہ حکم دیا جا رہا ہے معلوم ہو گیا کہ حکم اہم ہے اور اس کا پورا کرنا اور اس کے مطابق چلنا ہمارے منصب کا تقاضہ ہے اور اگر ہم اس کے مطابق نہیں چلیں گے تو ہم لفظوں میں محبت کے دعوے کرتے ہیں اور لفظوں میں ہی اطاعت کے نعرے لگا رہے ہیں اور اس کے مطابق ہمارا عمل نہیں ہے اس لفظ کو جب اس حیثیت سے سنا جائے گا تو یقیناً انسان کے دل کے اندر اطاعت کا جذبہ ابھرتا ہے، اس تقریر میں دونوں پہلو آ گئے، ایک میں حاکمیت والا پہلو ہے اور دوسرے میں محبوبیت والا پہلو ہے۔

گفتگو میں لفظی حسن قائم رکھنا چاہیئے:

تو "یا ایھا الذین آمنوا" کے ساتھ یہاں آپ کو ایک حکم دیا جا رہا ہے اس حکم کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیجئے کہ بسا اوقات دو لفظ ہوتے ہیں اور دونوں کا مفہوم ایک ہوتا ہے لیکن لفظی ادب کے طور پر ایک لفظ کا استعمال کرنا اچھا ہے اور ایک لفظ کا استعمال کرنا اچھا نہیں چاہے مفہوم دونوں کا ایک ہے جیسے سرور کائنات ﷺ

نے فرمایا کہ کسی کا جی متلانے لگ جائے، طبیعت خراب ہو تو یوں نہ کہا کرو خَبُثَتْ نفسی یوں کہا کرو لَقِسَتْ نفسی اب دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے کہ میرا دل خراب ہو رہا ہے۔

اب اس کو ظاہر کرنے کے لیے عربی میں دو لفظ ہیں سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''خبثت نفسی'' نہ کہا کرو ''لقست نفسی'' کہا کرو ترجمہ دونوں کا ایک ہے لیکن خبثت میں اپنے دل کی طرف خبیث ہونے کی نسبت جو کردی یہ خبث کی نسبت لفظی ادب کے خلاف ہے اگرچہ مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی یہ لفظی حسن ہے کہ جب لفظ استعمال کرو تو اچھے لفظ استعمال کرو ایسا لفظ استعمال میں نہ آئے جس میں عرفاً یا لغۃً کوئی قباحت کا معنیٰ پیدا ہو جائے اس سے بھی واضح مثال سے آپ کو سمجھا دوں کہ والد صاحب، ابا جی، ماں دا خصم، ان کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اب اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ کے والد صاحب تشریف لا رہے ہیں یا کوئی کہتا ہے کہ آپ کے ابا جی آگئے تو اس کا آپ کی طبیعت پہ کتنا اچھا اثر پڑتا ہے اور اگر کوئی کہہ دے کہ تیری ماں کا خصم آگیا اب اس کا کتنا برا اثر پڑتا ہے یعنی لفظوں کا مفہوم ایک ہے لیکن مفہوم ایک ہونے کے باوجود دیکھو لفظوں کے اثرات کیسے ہیں، اس لیے ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ والد صاحب کہیں اور اگر ماں کا خصم کہیں گے تو بے ادبی ہے چاہے لغوی طور پر مفہوم دونوں کا ایک ہی ہے۔

دیکھو آپ کے پاس ایک مہمان آتا ہے آپ اسے کہیں گے کہ یہ کھانا کھا لیجئے تناول فرمالیجئے، یہ چیز نوش فرمالیجئے ایک طریقہ تو یہ ہے جس میں ادب کا پہلو ہے اور ایک آدمی کو ناراض ہو کر یوں کہا جائے کہ اس کو نگل لے، اب دونوں میں لغوی حیثیت سے تو کوئی فرق نہیں ہے مفہوم تو ایک ہے لیکن ایک لفظ میں جو محبت، شفقت، ادب نمایاں ہے دوسرے لفظ میں وہ بات نہیں ہے تو بسا اوقات دو لفظ ہوتے ہیں چاہے ان کا مفہوم ایک جیسا ہو لیکن ایک لفظ کے اندر کسی نہ کسی پہلو سے کوئی قباحت موجود ہو تو اس لفظ کو استعمال نہیں کرنا چاہیئے اور دوسرا لفظ جس میں کسی حیثیت سے کوئی قباحت موجود نہیں ہے اس لفظ کو استعمال کرنا چاہیئے۔

لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا:

یہاں بھی دو لفظ آپ کے سامنے آرہے ہیں اس لیے ان کا ترجمہ نہیں کیا گیا یہاں بحث صرف لفظی ہے مفہوم سے بحث نہیں ہے ایک لفظ ''راعنا'' ہے اور ایک انظرنا ہے ''راعِ'' یہ مراعات سے امر کا صیغہ ہے معنی ہوگا تو ہماری رعایت رکھ، ہمارا لحاظ کیجئے۔

اور دوسرا لفظ ''انظرنا'' ہے، ہماری طرف نظر فرمائیے، نظر شفقت فرمائیے، ہماری طرف دیکھئے،

ہمارے حال پہ نظر کیجئے، مفہوم دونوں کا ایک جیسا ہے لیکن یہود کی زبان میں "راعنا" کا لفظ احمق کے معنی میں ہے یا "راعنا" اصل میں عین کا کسرہ ہے اور اگر اس عین کے کسرہ کو کھینچ کر "راعینا" پڑھے تو اس کا معنی ہو گیا ہمارا چرواہا۔

یہود کی عادت تھی کہ وہ شرارت کرتے تھے سرور کائنات ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے تو آپ ﷺ بات کرتے اگر کسی بات کو دوہرانا مقصود ہوتا کہ یہ بات دوبارہ کہہ دیجئے اس وقت وہ لفظ استعمال کرتے "راعنا" اور ان کی طرف دیکھتے ہوئے چونکہ عربی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ بہت شاندار ہے کہ کسی کو متوجہ کرنا ہو تو "راعنا" کہہ دیا کہ ہمارا خیال فرمایئے، ہمیں سمجھا دیجئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس لفظ کو استعمال کرنے لگ گئے چونکہ اس لفظ کے اندر بظاہر کسی قسم کی کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی۔

لیکن یہودی اپنی مجلسوں میں جا کے ہنستے کہ دیکھو ہم نے سب کو بے وقوف بنا دیا ہم راعنا 'احمق' کہتے ہیں اور ہماری طرف دیکھ کے انہوں نے بھی اپنے رسول کو احمق کہنا شروع کر دیا، یا وہ مجلس کے اندر بیٹھتے اور 'راعنا' کی بجائے دل میں خباثت کی بنا پر عین کے کسرہ کو کھینچ کر "راعینا" کہتے بظاہر معلوم یہ ہوتا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا خیال فرمایئے حالانکہ وہ توہین آمیز جذبہ کے ساتھ یہ لفظ کہتے اے ہمارے چرواہے!

حضور ﷺ کی مجلس میں وہ اپنی خباثت کا اظہار کرتے اور اپنی مجلسوں میں جا کر ہنستے جیسے حدیث شریف کے اندر واضح طور پر آیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت یہ یہود تمہارے پاس آتے ہیں یہ السلام علیکم نہیں کہتے تم خیال کیا کرو بلکہ یہ دبی زبان سے السام علیکم کہتے ہیں اور لام کھا جاتے ہیں اور لام کے حذف کے ساتھ اس میں بددعا والا معنی پیدا ہو جاتا ہے۔

اس لیے تم ان کو وعلیکم السلام نہ کہا کرو بلکہ علیکم کہہ دیا کرو یعنی ان کی بددعا ان کی طرف ہی رد کر دی تو اس قسم کی وہ شرارتیں کرتے تھے اور ان کی شرارتوں کی نشاندہی قرآن کریم میں مختلف الفاظ سے کی گئی ہے سب سے واضح لفظ اس سلسلہ میں جو آیا ہے وہ سورۃ مجادلہ میں ہے، "اذاجاؤك حيوك بمالم يحيك به الله ويقولون فى انفسهم لو لا يعذبنا الله بمانقول"

جب یہ آپ کی مجلس میں آتے ہیں تو آپ کو سلام ایسے طریقہ سے کرتے ہیں کہ جس طریقہ سے سلام اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا اور پھر اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کی وجہ سے ہمیں عذاب کیوں نہیں ہوتا اگر یہ اللہ کا سچا رسول ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا جب ہم اس کے لیے اس طریقہ سے لفظ بولتے

ہیں، تو یہ ان کی عادت تھی اس قسم کی شرارت کرنے کی تو یہ لفظ جو تھا اس میں اس اعتبار سے قبیح مفہوم آ گیا کہ اس میں دوسری زبان کے اعتبار سے احمق والا معنیٰ ہے یا اس لفظ کے پردے میں کسی شخص کو اپنی خباثت ظاہر کرنے کا موقع ملتا ہے کہ وہ ”راعنا“ کو امر کا صیغہ بنانے کی بجائے ”راعینا“ اسم فاعل کا صیغہ بنا کے معنیٰ خراب کر لیتا ہے اور لفظ ”انظرنا“ کے اندر اس قسم کی خباثت نہیں کی جا سکتی۔

جب یہود نے اس لفظ کو غلط جذبے کے ساتھ استعمال کرنا شروع کیا تو یہ آداب نبوی ﷺ کے خلاف ہے اور مجلس نبوی ﷺ کے اندر اس لفظ کا استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممنوع قرار دے دیا گیا تاکہ کسی خبیث کو اس لفظ کے استعمال کرنے سے اپنے قلب کے جذبات کے اظہار کا موقع ہی نہ ملے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو بالکل اخلاص کے ساتھ کہتے تھے اور بالکل صحیح مفہوم تھا لیکن اگر یہ لفظ مستعمل رہے تو اس لفظ کے استعمال کے اندر وہ لوگ بھی اپنی خباثت ظاہر کر سکتے ہیں تو اس کی بجائے ”انظرنا“ کی تلقین کر دی گئی۔

اب یہاں جس وقت ہم ترجمہ کریں گے تو چونکہ یہ بحث لفظی ہے مفہوم تو دونوں کا ایک جیسا ہے تو ہم ترجمہ میں یوں نہیں کہیں گے کہ اے ایمان والو! نہ کہا کرو کہ تو ہماری رعایت رکھ بلکہ کہا کرو کہ تو ہم پر نظر فرما کیونکہ ان دونوں میں فرق واضح کرنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا یہ مفہوم کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے یہ لفظی رعایت ہے اس لیے ترجمہ یوں ہوگا کہ نہ کہا کرو ”راعنا“ بلکہ کہا کرو ”انظرنا“ یہ لفظوں کی تلقین ہے۔

راعنا تو پڑھا کر لیکن ترجمہ دیکھنا چھوڑ دے!:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں ایک لطیفہ بھی آتا ہے کہ وہاں کا ایک مؤذن تھا وہ ایک دفعہ حضرت سے ذکر کرنے لگا کہ میں جس وقت تلاوت کرتا ہوں تو میں ”راعنا“ کا لفظ چھوڑ جایا کرتا ہوں تو آپ نے فرمایا کیوں؟ اس نے کہا میں نے ایک دفعہ ترجمہ والا قرآن مجید دیکھا تھا اس میں لکھا ہوا تھا کہ اے ایمان والو! ”راعنا“ نہ کہا کرو تو میں نے اس وقت سے راعنا کہنا چھوڑ دیا آپ نے فرمایا کہ ”راعنا“ تو پڑھا کر لیکن ترجمہ دیکھنا چھوڑ دے کیونکہ بغیر استاد کے اپنے طور پر جس وقت انسان بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو بسا اوقات خرابی کر بیٹھتا ہے تو یہاں آپ کو روکنا مقصود نہیں کہ آپ تلاوت کرتے ہوئے بھی ”راعنا“ نہ پڑھیں بلکہ اس مجلس کے اندر اس لفظ کے استعمال پر پابندی لگا دی تو جس سے یہ اصول نکل آیا کہ اگرچہ ایک بات ٹھیک ہو لیکن اگر سننے والے یا بولنے والے اس کا غلط مفہوم لیتے ہیں تو ایسے لفظ کا استعمال کرنے سے احتیاط کرنی چاہیے۔

یہاں یہی بات ہے کہ ”راعنا“ نہ کہا کرو بلکہ ”انظرنا“ کہا کرو اب ”انظرنا“ کے پردے میں چونکہ یہود اس قسم کی خباثت نہیں کر سکتے لہٰذا جو بھی لفظ ”انظرنا“ بولے گا وہ صحیح مفہوم میں بولے گا اور ”راعنا“ کے لفظ

کے اندر وہ گڑبڑ کر سکتے تھے اس لیے اس لفظ کے استعمال پر پابندی لگادی اور'' واسمعوا '' کا مطلب یہ ہوا کہ توجہ سے سنا کرو، خیال کر کے سنا کرو تا کہ بار بار متوجہ کرنے کی، دوہرانے کی، پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

'' وللکافرین عذاب الیم '' اور جو یہ لفظ استعمال کرتے تھے برے ارادے کے ساتھ وہ کافرین کا مصداق ہیں ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے کہ آج یہ دل کی بھڑاس اس طرح نکالتے ہیں اور سرور کائنات ﷺ کے سامنے توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے ضمن میں اپنے دلوں کی خباثت کو پورا کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہوگا۔

کافروں کو یہ پسند نہیں کہ تم پر اللہ کی رحمت نازل ہو:

''مایود الذین کفروا '' کافر لوگ نہیں چاہتے اور آگے'' من اھل الکتاب والمشرکین '' یہ ''کفروا '' کا بیان ہے خواہ وہ کافر لوگ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین میں سے ہوں، اور '' لاالمشرکین '' کے اوپر جو ''لا'' ہے یہ'' مایود'' میں جو نفی کا معنی ہے اس کی تاکید کے لیے ہے کہ جو لوگ کافر ہیں اہل کتاب میں سے وہ نہیں چاہتے اور نہ مشرکین چاہتے ہیں لفظوں کے تحت ترجمہ اس طرح ہوگا تو اس نہ کے ساتھ اس نفی کی تاکید کرنی مقصود ہے جو'' مایود '' کے اندر آئی ہوئی ہے، نہیں چاہتے کہ اتاری جائے تم پر کوئی بھلائی تمہارے رب کی طرف سے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو اہل کفر کی طرف سے ہوشیار کیا ہے کہ یہ لوگ تم سے ضد رکھتے ہیں اور کسی صورت میں پسند نہیں کرتے کہ تمہیں کوئی خیر اور بھلائی اللہ کی طرف سے مل جائے اور اللہ کی طرف سے وحی کا آجانا، کتاب کا اترنا، نبوت کا مل جانا یہ بہت بڑی خیر ہے جو بنی آدم کو نصیب ہوتی ہے اور اہل کتاب پہلے سے اس کے اجارہ دار چلے آرہے تھے تو وہ کیسے پسند کرتے کہ تم پر کوئی کتاب اترے، تمہیں دین ملے، اور تم میں کوئی نبی آجائے اور ان کی ریاست اور سرداری ختم ہو جائے، اور ایسے ہی مشرکین وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر قرآن اترتا تو ہم میں سے کسی رئیس پر اترتا، کسی سردار پر اترتا، یہ کیا ہوا کہ مفلسوں کا گروپ اس قرآن کا وارث بن گیا اور وحی ان کے اوپر آگئی ہم ان کی اطاعت کیسے کر سکتے ہیں ہم ان کے ساتھ کیسے مل سکتے ہیں؟

تو مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب یہ کسی صورت میں بھی تمہاری بھلائی نہیں چاہتے اس لیے ان کو دشمن سمجھا کرو، اور ہمیشہ ان کی طرف سے ہوشیار رہا کرو، ان کی حرکتوں پہ نظر رکھا کرو، مختلف چالوں کے ساتھ یہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بسا اوقات اپنے آپ کو خیر خواہ ظاہر کریں گے لیکن یہ تمہارے

خیر خواہ نہیں ہیں، تمہارے دشمن ہیں اس لیے ان کی چالوں پہ نظر رکھا کرو اور کبھی بھی ان کے فریب میں نہ آنا، جیسے پیچھے آیا کہ اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے لفظ "راعنا" استعمال کرتے تھے اور مسلمانوں میں بھی اس لفظ کو چلتا کر دیا اور حقیقت کے اعتبار سے وہ مذاق اڑاتے تھے تو اس قسم کی چالیں وہ اپنی خباثت کے تحت کرتے تھے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر ہوشیار کیا ہے۔

اللہ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے جس کو چاہے:

" واللہ یختص برحمتہ من یشاء" یہاں اللہ نے یہ فرمایا کہ اہل کتاب کی کوئی اجارہ داری نہیں کہ جس کو یہ کہیں وہیں نبوت آئے، وہیں کتاب نازل ہو، اور انہی کو دینی ریاست ملے، ایسی کوئی بات نہیں ہے اللہ تعالیٰ مالک ہے، مختار ہے، جس کو چاہے وہ اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرلے، وہ فضل عظیم والا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل پر، اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یہ اہل کتاب یا مشرکین کوئی ڈپو ہولڈر نہیں ہیں کہ ان کے پرمٹ کے ساتھ ان کو جاری کیا جائے جس کو یہ چاہیں ادھر اس کو رواں کیا جائے ایسی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے خاص کرتا ہے۔

اگر ایک وقت میں بنی اسرائیل کو اس نے نوازا تھا اور دوسرے وقت میں بنی اسماعیل پہ نوازش ہوگئی تو وہ فضل عظیم والا ہے، جس کو چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کردے، اس میں اہل کتاب اور مشرکین کے لیے جواب ہے ان کے اس جذبہ کا کہ ان لوگوں کو یہ خیر کیوں نصیب ہوئی ہے؟ اللہ کہتا ہے میں رحمت، فضل والا ہوں جس کو چاہوں دوں۔

نسخ کے متعلق یہود و نصاریٰ کے شبہات کا جواب:

"مانسخ من آیۃ اوننسھانات بخیر منھا اومثلھا" اور یہ مسلمانوں میں خیر خواہی کے جذبہ سے شبہات پیش کرتے تھے اور اس طرح وہ ایمان سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے، اللہ کے رسول سے اہل ایمان کو جدا کرنے کی کوشش کرتے، ان اعتراضات میں ایک اعتراض یہ بھی تھا جس کا دفعیہ اس آیت کے اندر پیش کیا گیا۔

وہ یوں کہتے تھے کہ اگر تمہیں کوئی اچھا دین مل جائے ہمیں اس پہ کیا اعتراض ہے؟ ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن کیا کریں ہماری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں کہ ادھر تو تم کہتے ہو کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں، تمہاری کتاب بھی مانتی ہے اور تم بھی تسلیم کرتے ہو، اور توراۃ کو تم کہتے ہو کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اور عیسائیوں کی طرف سے یہ بات ہوسکتی تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تم اللہ کا رسول کہتے ہو، اور ان پہ نازل شدہ انجیل کو تم اللہ کی کتاب مانتے ہو، اور پھر

تم یہ بھی کہتے ہو کہ اس کے بہت سارے حکم منسوخ ہو گئے، وہ شریعت بدل گئی اگر وہ اللہ کے احکام تھے، اللہ کی کتاب تھی، تو اس کے بدلنے کا کیا مطلب؟

یہ موجودہ قرآن اس کی بعض چیزوں کو منسوخ کرتا ہے اگر وہ اللہ کے احکام تھے تو بدل کیسے گئے، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے پتہ نہیں تھا کہ جواب قانون بنا رہا ہوں یہ آگے نہیں چلے گا، اور اب تجربہ کے ساتھ ثابت ہوا کہ قانون ٹھیک نہیں ہے اب نیا قانون دے دیا معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ کی کتاب ہے تو یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے، اور اس کو اللہ کی کتاب تمہاری کتاب بھی کہتی ہے۔

تو پھر یہ نئی چیز جو آ رہی ہے اور یہ رسول اللہ کے احکام کو کیسے بدل سکتا ہے؟ اللہ کی باتیں تو اٹل ہوتی ہیں تو پہلی شریعتوں کے اوپر قرآن کریم کے اترنے کے ساتھ جو نسخ آیا اس کے ذریعے سے بھی لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرتے تھے اور پھر قرآن کریم میں بھی بعض آیات ایسی آئیں جن کو بعد میں اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دیا خاص طور پر مدینہ منورہ میں جانے کے بعد سب سے پہلا نسخ جو آیا جس پر یہود و نصاریٰ نے شور مچایا تھا وہ تحویل قبلہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے گئے تو پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے سولہ یا سترہ مہینوں کے بعد رخ بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف بدل گیا کہ یہ اگر اللہ کا دین ہے تو کل کچھ تھا آج کچھ ہے یہ اللہ کی باتیں کیسے بدل رہی ہیں تو نسخ کے مسئلہ کو لے کر اہل اسلام کے اندر شبہات پھیلاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ کی باتیں ہوں تو پھر وہ بدلنی نہیں چاہئیں کہ آج کچھ قانون ہو کل کو کچھ ہو جائے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اندر نسخ کے متعلق وضاحت فرمائی ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ کسی حکم کا بدلنا کبھی تو اس وجہ سے ہوتا ہے کہ حکم دینے والے نے ایک حکم تو دے دیا لیکن چونکہ اس کا علم تام نہیں اور اس کی حکمت تام نہیں اس کے علم میں جہالت کا شائبہ ہے اور پوری حکمت پر بھی اس کو احاطہ نہیں جس وقت اس کو نافذ کیا گیا تو نافذ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حکم ٹھیک نہیں ہے۔

اور اس کے چلانے میں رکاوٹیں ہیں، یا عوام نے اس کو قبول نہیں کیا ہے، انہوں نے آگے سے احتجاج کر دیا اس وقت ان رکاوٹوں کو دور نہ کر سکنے پر اور عوام کو مطمئن نہ کرنے کی وجہ سے حاکم کو اپنا قانون بدلنا پڑ گیا یا اس کے نافذ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں تو یہ یہ خامیاں ہیں اور ان خامیوں کی بناء پر اس آئین میں ترمیم کرنی پڑی ایک تو حکم کا بدلنا اس وجہ سے ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس کا منشاء جہالت ہے کہ قانون بناتے وقت پورے قانون کا احاطہ نہیں تھا اور آنے والے حالات کا پتہ نہیں تھا جس کی بناء پر ایک حکم دے دیا گیا لیکن جب اس کو

عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو اس میں رکاوٹیں معلوم ہوئیں اس کی خامیاں سامنے آئیں جس کی بناء پر اس کو بدلنا پڑا جس طرح پارلیمنٹ آئین میں اس قسم کی ترمیم کرتی رہتی ہے، اور وہ ترمیمات اسی وجہ سے ہوتی ہیں کہ نافذ کرنے کے بعد اس کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں اس قسم کی ترمیم یا اس قسم کی تنسیخ اللہ کے احکام میں ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم دیں اور ان کو پتہ نہ ہو کہ اس حکم میں کیا خرابی ہے اور جب نافذ کیا گیا تو معلوم ہو گیا کہ اس میں یہ خامی ہے۔

یا ایک حکم دیا اور آگے ایسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں کہ اس حکم کو چلایا نہ جا سکا نافذ نہ کیا جا سکا یا آگے جمہور نے ماننے سے انکار کر دیا جس کی بناء پر اس کو بدلنا پڑا اس قسم کی تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کے احکام میں نہیں آتیں اور ایک تبدیلی ہوتی ہے ایسی کہ ایک مریض طبیب کے پاس جاتا ہے اور اس کو نبض دکھاتا ہے، اپنے حالات بتاتا ہے، اور وہ ماہر طبیب اس وقت اس کے مزاج کے مطابق ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، آٹھ دن مریض وہ نسخہ استعمال کرتا ہے، پھر طبیب کے پاس جاتا ہے، طبیب اس کی نبض دیکھتا ہے، نسخہ کو لے کے بعض چیزیں اس میں سے کاٹ دے گا اور بعض چیزوں کا اضافہ کر دے گا۔

اب اگر وہ جاہل مریض وہاں اس طبیب سے الجھ جائے کہ یہ کیا ہوا کہ آٹھ دن پہلے آپ نے ایک نسخہ لکھا تھا اور آج اس کے بعض اجزاء کاٹے جا رہے ہیں اور بعض بڑھائے جا رہے ہیں کیا پہلا صحیح نہیں تھا یا دوسرا صحیح نہیں ہے اور پہلے بات آپ کو سمجھ نہیں آئی تھی یا اب بے سمجھی کی بات کر رہے ہو یہ نسخہ کیوں بدلا گیا؟ آپ جانتے ہیں کہ یہ اعتراض جہالت سے ناشی ہے اور جو طب کے فن سے واقف ہو وہ کہے گا کہ نہیں مریض کے حالات کے ساتھ ساتھ نسخہ میں تبدیلی ہوا کرتی ہے اور ماہر طبیب وہی ہوا کرتا ہے کہ ایک ہی ڈنڈے کے ساتھ سب کو نہ ہانکتا چلا جائے بلکہ جیسے جیسے مریض کے حالات بدلتے چلے جائیں اس کے مطابق نسخہ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی انسان کو جو احکام دیے جاتے ہیں وہ اسی قسم کے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے انسانیت کا جو دور شروع ہوا پہلے حالات کچھ اور تھے عقل بھی خام، تجربہ بھی خام، آبادی بھی تھوڑی، ضرورت بھی کم جیسے جیسے انسان تجربات کی دنیا میں چلتا گیا مزاج بدلتا چلا گیا آبادی بڑھتی چلی گئی، آبادی کے تقاضے مختلف ہوتے چلے گئے عین حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایات بھی آتی رہیں یہ ہدایات انسان کی تربیت سے تعلق رکھتی ہیں اور تربیت ہمیشہ ایک ہی نہج سے نہیں ہوا کرتی بلکہ جس طرح انسان بڑھتا جاتا ہے اس کی عقل جوان ہوتی جاتی ہے اس کے تجربات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام آتے

رہتے ہیں حتی کہ ایک وقت ایسا آ گیا کہ انسان اپنے کمال کو پہنچ گیا اور آنے والے حالات کا ماقبل سے زیادہ اختلاف نہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جامع قانون نافذ کر دیا گیا کہ اب قیامت تک انسانی دنیا کے اندر اس میں ترمیم کی ضرورت نہیں ہے اور اس میں بھی اتنی لچک رکھدی کہ بعض احکام عزیمت کے درجہ میں دے دیے، بعض رخصت کے درجہ میں دے دیے جس قسم کے اعذار پیش آ سکتے تھے ان کو بنا بنا کر پہلے ہی بتا دیا کہ اگر اس قسم کا عذر پیش آ جائے تو اس میں یہ رخصت ہے تو دین تو مکمل ہے لیکن حالات کے مطابق اس کو منطبق کیا جا سکتا ہے رخصت وعزیمت کی بحث جو ہے وہ اس قانون میں لچک ہے یہ نہیں کہ ایک لکیر کھینچ دی کہ اب اس میں کوئی کسی قسم کی ترمیم نہیں ہو سکتی بلکہ عذروں کے پیش آنے کے ساتھ، حالات کے بدلنے کے ساتھ جو اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے وہ بھی پہلے بتا دی گئی، اب اس کو ہم تبدیلی نہیں کہیں گے بلکہ کہیں گے قانون یہی ہے جس طرح تندرست آدمی کو ایک حکم دیا گیا اور ساتھ یہ لکھ دیا گیا کہ بیمار ہونے کی صورت میں یوں کر لو۔

اب جس وقت دس سال کے بعد تندرست آدمی بیمار ہوگا تو بیمار ہونے کے بعد جب وہ اس حکم کو بدلے گا تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ تبدیلی اب ہوئی ہے بلکہ قانون اسی طرح ہے جس کے مطابق عمل ہوتا آیا ہے اب یہ لچک جو رکھ دی گئی ہے تو اس کے بعد ضرورت ہی نہیں کہ کسی کو منسوخ کریں اور اس کی جگہ کسی دوسرے کو لائیں علت اور اسباب کو واضح کر دیا گیا کہ جب یہ علت آ جائے گی اس وقت یوں کر لینا، اور جب یہ علت نہیں ہوگی اس وقت یوں کر لینا یہ ساری چیزوں کی وضاحت ہو جانے کے بعد اب اس میں حذف واضافہ کی گنجائش نہیں رہی، اس قسم کی تبدیلی یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ ہے اللہ تعالیٰ کے علم کا تقاضہ ہے اور انسانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ہمدردی کا تقاضہ ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ انسان کے ساتھ ہمدرد ہے، اس کا خیر خواہ ہے، اس کا مربی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم بھی تام ہے، اور وہ حکیم مطلق ہے، اس لیے حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ احکام بدلنا یہ عین فطرت کے مطابق ہے تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے احکام میں جہاں کہیں بھی نسخ آیا تو وہ نسخ اس قسم کا ہے جس طرح کہ حالات کے تقاضہ کے تحت طبیب کا نسخہ بدلتا ہے تو یہ حکمت کے عین مطابق ہے اس پر کوئی اعتراض کی بات نہیں اس آیت کے اندر اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا کہ جو لوگ نسخ کو لے کر شبہات پھیلاتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے احکام میں تبدیلی نہیں آ سکتی اور یہ کتاب چونکہ تبدیلی کو ثابت کرتی ہے اور اس کتاب میں بھی بعض آنے والے احکام منسوخ ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کلام نہیں اگر اللہ کی کلام ہوتی تو آئے دن بدلتی کیوں؟ تو یہ شبہ جو پیش کرتے تھے اس کا ازالہ یہاں کر دیا۔

نسخ کا مفہوم اور اس کی حقیقت:

نسخ کا لغوی معنی ہوتا ہے زائل کرنا اور شرعی طور پر نسخ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یا اللہ کے رسول نے ایک حکم دیا اب اللہ کے علم میں ہے کہ یہ اتنے وقت کے لیے ہے، لیکن اس کی **میعاد** بتائی نہیں گئی کہ کتنے وقت کے لیے ہے اور جب اللہ کے علم میں اس کی **میعاد** ختم ہوگئی تو نیا حکم آ گیا چاہے نیا حکم یہی آ گیا کہ اب اس کو ترک کر دو یا اس کی جگہ اور نیا حکم نافذ کر دیا تو بندہ چونکہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ حکم دائماً ہے اس لیے اس کی نظر میں یہ تبدیلی ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ تبدیلی نہیں بلکہ ایک حکم کی میعاد ختم ہونے کے بعد نیا حکم دیا گیا ہے، فقہ، اصول فقہ میں آپ نسخ کی یہی بحث پڑھیں گے کہ یہ تبدیلی بندوں کے علم میں ہے اللہ کے علم میں یہ تبدیلی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ حکم میں نے سو سال کے لیے دیا تھا اب بعد میں نیا پیغمبر بھیجوں گا اس وقت نیا حکم دوں گا تو اس کی مدت ہی سو سال تھی جب سو سال پورے ہوگئے تو اس کی میعاد ختم ہوگئی آگے نیا حکم آ گیا لیکن چونکہ انسانوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ یہ حکم کتنی دیر کے لیے ہے اس لیے انسان یہ سمجھتے ہیں کہ حکم تبدیل ہوگیا، یہ تبدیلی انسان کے علم کے اعتبار سے ہے اللہ کے علم کے اعتبار سے یہ تبدیلی نہیں ہے ''ما ننسخ من آیة'' جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں او ننسها یا بھلا دیں، فراموش کرا دیں جیسے انسان کے دماغ سے ایک چیز نکال دی جیسے امم سابقہ کے اندر بھی لوگوں نے اپنی غفلت کے ساتھ بہت ساری چیزوں کو چھوڑا انسانیت نے ان کو فراموش ہی کر دیا یا قرآن کریم کی کوئی آیت اللہ نے اتاری بعد میں اس کا لفظ اور مفہوم نبی کے ذہن سے نکال دیا ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ سورۃ اعلیٰ کے اندر بھی یہی لفظ ہیں ''سنقرئك فلا تنسى الا ما شاء الله'' ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ بھولیں گے نہیں مگر جو اللہ چاہے تو یہ بھی نسخ کی ایک صورت ہے کہ احکام کو سرے سے ذہنوں سے ہی نکال دیا جائے، اور ایک ہے کہ اس کے الفاظ پڑھے جا رہے ہیں لیکن کہہ دیا کہ اس کے اوپر عمل نہیں کرنا جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں ہم اس سے بہتر لے آتے ہیں یا کوئی اسی جیسا لے آتے ہیں جو حکمتوں میں، مصلحتوں میں اسی جیسا ہوتا ہے برابر سرابر یا اس سے بہتر ہوتا ہے اس قسم کی تبدیلی ہم کرتے رہتے ہیں، گویا کہ نسخ یہ ایک تدریجی ترقی ہے بہتر سے بہترین کی طرف اس کے ذریعہ سے عروج کیا جاتا ہے۔

''الم تعلم'' اس کا خطاب اسی معترض کو ہے جس کے ذہن میں بھی یہ اعتراض پیدا ہوا اے معترض! تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے اور تجھے علم نہیں کہ زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ ہی کی سلطنت ہے اور تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار و مددگار نہیں ہے، تو جب اللہ کی یہ شانیں تجھے معلوم ہیں تو احکام کی تبدیلی

پر تیرے ذہن میں کیوں اشکال آتا ہے اللہ تعالیٰ قادر بھی ہے، ایک حکم کو مٹادے دوسرا لے آئے اس کو قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ کی سلطنت ہے وہ حاکم ہے جو حکم چاہے اپنی سلطنت میں دے، وہ تمہارا ولی ہے، مددگار ہے، تمہاری مصلحت کی رعایت رکھتا ہے جو چیز تمہارے لیے مفید پاتا ہے تمہیں اس کا حکم دیتا ہے ان صفات پر اگر نظر ہو تو پھر نسخ کے اوپر کوئی کسی قسم کا اعتراض نہیں ہوسکتا۔

قرآن کریم میں آیات منسوخہ کی تعداد:

باقی یہ مسئلہ اپنی جگہ آپ اصول تفسیر میں پڑھیں گے اور الفوز الکبیر میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل کے ساتھ یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم میں بھی کچھ آیات منسوخ ہیں یا نہیں؟ جلالین کے اندر تو آپ اکثر پڑھیں گے کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی، یہ منسوخ ہوگئی نسخ کا لفظ بہت عام استعمال کیا ہوا ہے اصل یہ ہے کہ متقدمین کی اصطلاح میں نسخ کا مفہوم مطلقاً تبدیلی ہے چاہے حکم کو سرے سے ختم کردیا جائے اور چاہے اس کے اندر کوئی کسی قسم کی قید لگادی جائے جیسے مطلق تھا اس کو مقید کردیا، عام تھا اس میں کوئی خصوص لگادیا، سب کو وہ نسخ سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے وہ آیات منسوخہ کی تعداد پانچ سو تک پہنچادیتے ہیں، جہاں بھی عفو اور درگزر کا ذکر آئے گا علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہہ دیں گے کہ یہ آیات جہاد سے منسوخ ہوگئیں تو نسخ کا مفہوم چونکہ ان کے ہاں عام ہے اس لیے وہ بہت ساری آیات کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔

لیکن متاخرین نے نسخ کے مفہوم کو خاص کردیا صرف احکام کی تبدیلی کے ساتھ اور وہ حکم بھی یہی کہ جو سرے سے بدل دیا گیا ہو اور عموم کے اندر خصوص آجانا، یا مطلق کو مقید کردینا اس کو وہ اصطلاحی نسخ کے ساتھ تعبیر نہیں کرتے اگرچہ اس سے بھی تبدیلی ہوتی ہے۔

لیکن اصطلاحاً وہ اس کو نسخ نہیں کہتے اس تحدید کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ متاخرین نے بیس آیتوں کو قرآن کریم میں منسوخ قرار دیا لیکن اس بیس میں سے انہوں نے پندرہ کی پھر توجیہ کردی کہ اگر اس کی ایسی توجیہ کردی جائے تو پھر کسی نہ کسی درجہ میں آیت معمول بہ رہ سکتی ہے اور پانچ آیتوں کو انہوں نے منسوخ قرار دیا ہے اور ان پانچ آیتوں کے متعلق بھی بعض علماء کا قول ہے کہ اگر اس کی کوئی تاویل ایسی کردی جائے کہ جس سے کسی نہ کسی صورت میں آیت معمول بہ رہ جائے تو ایسے اقوال بھی موجود ہیں۔

بہرحال شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق قرآن کریم میں پانچ آیتیں ایسی موجود ہیں جن کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی ان کا حکم روک دیا گیا اور ان کے اوپر عمل کی اجازت نہیں ہے پانچ آیتوں کو انہوں نے منسوخ

مانا ہے جو آپ کے سامنے موقع بموقع آتی چلی جائیں گی اور بعض علماء نے ان پانچ کے اندر بھی توجیہ کردی جس کا پھر مطلب یہ ہوگا کہ جو احکام منسوخ ہوئے وہ قرآن کریم کے الفاظ سے بھی نکال دیئے گئے اور جو الفاظ قرآن کریم کے اندر باقی ہیں وہ سب معمول بہ ہیں کسی کو ہم منسوخ قرار نہیں دیتے مثلاً ایک مسئلہ آپ کے سامنے آئے گا کہ پہلے پہلے ورثاء کے لیے وصیت کرنے کا حکم تھا والدین، اولاد، عزیز و اقارب کے لیے وصیت کی جائے اور جس وقت آیات وراثت اتر آئیں تو آیاتِ وراثت اترنے کے بعد " وصیت للوالدین " منسوخ ہوگئی جس کی وضاحت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی کہ " لاوصیة لوارث " کہ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے حصے متعین کردیئے اب آپ کچھ کہہ بھی جائیں تو اس کا اعتبار نہیں بس اللہ کا جو حکم ہے وہی نافذ ہوگا والد کے لیے اتنا، بیوی کے لیے اتنا وہ حصے متعین ہوگئے، اب متعین ہوجانے کے بعد مرنے والے کو اپنی طرف سے متعین کرنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے اس وصیت والی آیت کو منسوخ قرار دیا جائے گا۔

لیکن حضرت سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے معمول بہ ہونے کی ایک صورت ہے مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے والدین کافر ہیں تو کافر وارث تو ہوتے نہیں ایسی صورت میں مرنے والا اگر ان کے لیے وصیت کرجائے تو نافذ ہوگی۔

کیونکہ وصیت کرنے کے لیے تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس کے لیے وصیت کی جائے وہ مؤمن ہو مؤمن کا کافر وارث نہیں ہوسکتا لیکن وصیت نافذ ہوسکتی ہے مثلاً مرنے والا مسلمان ہو اور اس کے والدین کافر ہوں اگر ایسا ہوجائے اور مرنے والا وصیت کردے کہ میری ماں کو اتنا دے دینا، میرے باپ کو اتنا دے دینا یہ وصیت نافذ ہے اور ایسا کرنے کی صورت میں اس پہ عمل کیا جاسکتا ہے کیونکہ اب ان والدین کے اندر وارث ہونے والا معنیٰ باقی نہیں رہا اس طرح حضرت سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بعض آیتوں کے اندر توجیہ کردی کہ اگر ان کی ایسی صورت نکال لی جائے تو ان آیات کو معمول بہ قرار دیا جاسکتا ہے البتہ وہی معروف جو ترجمہ ہے اس کے مطابق وہ آیات منسوخ بھی قرار دی جاسکتی ہیں۔

حکم شرعی منسوخ ہونے کی صورتیں:

بہر حال نسخ واقع ہوا ہے قرآن کریم میں بھی ہوا اور حدیث شریف کے بعض احکام میں بھی ہوا باقی قرآن کا حکم قرآن سے منسوخ حدیث کا حکم حدیث سے منسوخ یہ تو متفق علیہ ہے اور قرآن کریم کا حکم حدیث سے منسوخ

ہوسکتا ہے یا نہیں یا حدیث شریف میں بیان کردہ حکم قرآن سے منسوخ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ائمہ فقہ کے اندر یہ چیز مختلف فیہ ہے اصول فقہ میں اس کی تفصیل آئے گی، احناف رحمہم اللہ کے نزدیک یہ صورتیں بھی واقع ہیں اور بعض ائمہ کے نزدیک یہ دو صورتیں واقع نہیں ہیں صرف دو صورتیں ہیں کہ قرآن کو قرآن سے منسوخ کردیا جائے، اور حدیث کو حدیث سے منسوخ کردیا جائے۔

ام تریدون ان تسئلوا کے مخاطب یہود اور اہل اسلام دونوں ہیں:

"ام تریدون" اس کا خطاب یہود کو ہے یا اہل اسلام کو دونوں توجیہیں ہیں اگر یہود کو ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اے یہودیو! تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ٹیڑھے سوال کر کے موسیٰ علیہ السلام کو تنگ کیا اور اس طرح تم نے کافرانہ روش اختیار کی اور وہ موسیٰ علیہ السلام پہ کیسے کیسے سوال کرتے تھے وہ قرآن میں متعدد جگہ موجود ہیں کہ ان کی بات صاف ستھری ہوتی اس کو ماننے کی بجائے خوامخواہ اعتراضات کرنا شروع کردیتے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت بھی ہوتی اور اس کے نتیجہ میں اس امت پر احکام بھی سخت ہوتے چلے گئے، ذبح بقرۃ میں ایک نمونہ آپ کے سامنے آچکا ہے۔

اب تم یہ چاہتے ہو کہ جس طرح تم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ضد کرتے تھے اور سوالات کر کے ان کو تنگ کرتے تھے اپنے اس موجودہ رسول کو بھی تم یوں ہی تنگ کرنا چاہتے ہو یہ ایک تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اپنی اس روش سے تم باز نہیں آتے؟ یہ کافرانہ طریقہ کب تک چلے گا؟ اپنے رسول کو بھی تنگ کیا اور اب موجودہ رسول کو بھی اسی طرح تم سوالات کر کے تنگ کرنا چاہتے ہو تو پھر یہ تنبیہ ہوجائے گی یہود کو اور اگر تریدون کا خطاب اہل ایمان کو ہو تو پھر ان کو تنبیہ اسی طرح ہوگی کہ موسیٰ علیہ السلام کے امتیوں نے جیسے موسیٰ علیہ السلام کو سوالات کر کے تنگ کیا تھا تم بھی ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسے ہی پوچھا کرو خبردار یہ ادب کے خلاف ہے، عظمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے بلا وجہ محض تنگ کرنے کے لیے یا خوامخواہ ایک پریشانی پھیلانے کے لیے اعتراضات نہ اٹھایا کرو پھر ان کو اس طرح تنبیہ کرنی مقصود ہے۔

مثال سے وضاحت:

اور اس واقعہ کو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ ہمارے پاس رہتے ہیں، اور زندگی ایک طرز کے مطابق گزار رہے ہیں اور کوئی مخالف بھی اپنا ادارہ بنا کر ایک طریقہ کے مطابق زندگی گزار رہا ہے تو محض یہاں کے منتظمین کو

پریشان کرنے کے لیے وہ آپ لوگوں سے ملیں اور کہیں کہ ہمارے ہاں یہ چیز ہے تمہارے ہاں یہ کیوں نہیں ہے؟ اور ہم یوں کرتے ہیں تمہارے استاد اس طرح کیوں نہیں کرتے؟ اور وہ طالب علم اگر سمجھ دار ہو تو وہ سمجھ جائے گا کہ تمہارا طریقہ اور ہمارا طریقہ اور اس طرح کی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں وہ اپنے طرز پہ مطمئن ہے تو ٹھیک چلتا رہے گا۔

دوسرا آدمی اس کے ذہن میں اعتراض پیدا بھی کرے گا تو اس کا ذہن اس اعتراض کو قبول ہی نہیں کرے گا یہ ہوتی ہے اپنے مسلک کے اوپر پختگی اور اپنے طور طریقہ کے اوپر اطمینان اور اگر یقین پختہ نہ ہو تو وہ کہے گا کہ بات تو تیری ٹھیک ہے پوچھنا چاہیے کہ ہمارے استاد ایسا کیوں نہیں کرتے؟ آج آیا سوال لایا اس کا جواب دے دیا گیا، کل کو آیا نیا سوال لے آیا تو اس کا جواب دے دیا تو یہ مستقل دھندہ بن جاتا ہے، تو یہی کہا جائے گا کہ عقل مندو تم ان کے پاس بیٹھتے کیوں ہو؟ جو تمہارے ذہن میں اس قسم کے شبہات پیدا کرتے ہیں اور پھر تم خود بھی پریشان ہوتے ہو اور ہمیں بھی پریشان کرتے ہو تو یہ سلسلہ جو ہوتا ہے یہ پریشانی کا باعث ہوا کرتا ہے پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ تمہیں پتہ ہے کہ ان کا مسلک اور ہے ہمارا مسلک اور ہے، ہمارا طرز اور ہے ان کا طرز اور ہے تم ان کے پاس جاتے کیوں ہو کہ وہ تمہارے ذہن میں شکوک پیدا کریں اور تم یہ اعتراض اپنے اساتذہ کے سامنے کرتے ہو تو یہ عظمت اساتذہ کے خلاف ہے آپ کے منتظمین کی عظمت کے خلاف ہے، شکوک وشبہات تو کبھی ختم نہیں ہوتے۔

لیکن جو آدمی یہ شبہات پھیلائے اس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے تو یہاں یہی پابندی ہے کہ تم یہود کے پاس اٹھتے بیٹھتے ہو اور وہ غلط باتیں تمہارے ذہن میں ڈالتے ہیں اور پھر تم وہی سوال اپنے رسول پہ کرتے ہو تو تمہارا کیا ارادہ ہے کہ جیسے یہودی ہر وقت اپنے رسول سے الجھتے رہتے تھے اسی طرح تم بھی الجھنا چاہتے ہو جیسا کہ آگے صراحتاً منع کر دیا جائے گا "لاتسئلوا عن اشیاء" بلاضرورت سوال ہی نہ کیا کرو تو پھر "تریدون" کا خطاب مسلمانوں کو ہو جائے گا اے اہل ایمان! کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ تم پوچھو اپنے رسول سے پھر "رسولکم" میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں پھر تمہارا رسول وہی ہے جس پر تم ایمان لائے ہو اور اگر "تریدون" کا خطاب یہود کو ہو تو "رسولکم" سے مراد رسول وقت ہے جو تمہاری طرف مبعوث ہو کے آیا تم نے اس کو مانا یا نہیں مانا، بہر حال اس وقت کے لحاظ سے تمہارا رسول وہی ہے پھر "رسولکم" کے لفظ میں تاویل کی جائے گی۔

یہود ونصاریٰ خیر خواہ بن کر شکوک پھیلاتے ہیں:

" ودّ کثیرٌ من اھل الکتاب " اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی شخص شبہ ڈالا کرتا ہے تو خیر خواہ بن کے ڈالتا ہے، دشمن اگر دشمن بن کے آئے تو کبھی انسان کے دماغ کو خراب نہیں کر سکتا، خراب جب کرتا ہے خیر خواہ بن کے کرتا ہے جیسا کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو جو چکمہ دیا تھا تو خیر خواہ بن کے دیا تھا، تو جس وقت بھی کسی دوسرے کو پھسلایا جاتا ہے تو خیر خواہ بن کر ہی پھسلایا جاتا ہے۔

پہلے انسان اس کے دل ودماغ میں یہ بات ڈالتا ہے کہ میں تیرا خیر خواہ ہوں اس میں میری کوئی غرض نہیں ہے اچھا آدمی بھی یہی بنیاد بنائے گا اور غلط آدمی بھی اسی اچھے عنوان کو اختیار کرے گا، کسی کو متاثر کرنے کے لیے بنیاد یہی ہے کہ پہلے تم اس پر یہ ثابت کردو کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں پھر وہ تمہاری بات بھی مان لے گا تو اچھا آدمی بھی یہی طریقہ اختیار کرے گا اور برا آدمی بھی یہی طریقہ اختیار کرتا ہے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تو اس کو خیر خواہ نہ سمجھ یہ تیرا خیر خواہ نہیں ہے تو یہود ونصاریٰ مسلمانوں کے خیر خواہ بن کے ان کے اندر شکوک وشبہات پھیلاتے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں ان سے محتاط رہا کرو یہ حاسد ہیں اور یہ تمہاری اچھی حالت پر جلتے ہیں۔

یہود ونصاریٰ کو اپنا خیر خواہ نہ سمجھو:

تمہیں اس قسم کے مشورے دیں گے خیر خواہ بن کر کہ جس سے تم متاثر ہو جاؤ اور پھر اپنی اس فضیلت اور شرافت سب کو ختم کر دو اس آیت میں دشمنوں کی نشاندہی کی ہے کہ یہ تمہارے خیر خواہ نہیں ہیں ان کو خیر خواہ نہ سمجھا کرو اور ہر وقت آپ اس بات پہ نظر رکھیں جس وقت بھی کوئی آدمی آپ کو اپنے پیچھے لگانا چاہے گا تو بنیاد یہی بنائے گا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں، بھلائی اسی میں ہے کہ تم میری بات مانو اور یہ نازک موڑ ہوتا ہے کہ انسان صحیح اور غلط میں فرق کر سکے جو فرق کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے اپنی زندگی سنبھال لی اور جو فرق کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تو وہ پھر دوسرے کے رحم وکرم پر زندگی گزارتا ہے قرآن کریم سے یہی اصول نکلتے ہیں کہ ان کو اپناؤ، ورنہ بظاہر تو یہ یہود ونصاریٰ کے قصے ذکر کیے جا رہے ہیں لیکن زندگی کے اصول انہی سے نکلتے ہیں۔

ان کی دشمنی کے باوجود درگزر سے کام لو:

"فاعفوا واصفحوا " جب یہ نشاندہی کر دی گئی کہ یہ تمہیں کافر بنانا چاہتے ہیں حالانکہ حق ان کے سامنے واضح ہو چکا ہے۔

اب تمہیں غصہ چڑھے گا جب پتہ چل جائے کہ تھا بدخواہ اور خیر خواہ بن کے آیا ہے جب یہ حقیقت سامنے آجائے گی تو پھر انسان کو غصہ آتا ہے تو اب غصہ میں آ کر ان پہ ہاتھ نہ اٹھانا ابھی صبر کرو "فاعفوا واصفحوا" یعنی سزا بھی نہ دو اور نظر انداز بھی کر جاؤ جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم نہ لے آئے اس میں اشارہ ہو گیا اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آئے گا جس سے ان موذیوں کا انتظام ہو جائے گا۔

چنانچہ بعد میں اللہ کا حکم آیا جس کے ساتھ اہل کتاب سے جہاد بھی کیا گیا اور ان کو جلاوطن بھی کیا گیا ان کو قتل بھی کیا گیا یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہوا بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے تم اپنی کمزوری پہ نظر نہ رکھو کہ ان وڈیروں کو ہم کس طرح سنبھالیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف دیکھو جس وقت اللہ کا حکم آئے گا تو وہ تمہارے لیے اسباب بھی مہیا کر دے گا، اور جب تک یہ جہاد کا حکم نہیں اس وقت تک اپنے نفس کی تہذیب میں لگے رہو اپنے معاشرے کو بناؤ اور اپنے نفس کی تہذیب کرو، نماز کو قائم رکھو، اس سے آپ کی طبیعت بنے گی، جذبات سدھریں گے زکوٰۃ دو، مال کو خرچ کرنے کی عادت ڈالو، اس سے معاشرہ بھی سدھرتا ہے اور آپس میں ربط بھی قائم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس گنجائش ہے، دوسرے کے پاس گنجائش نہیں تو جس کو ضرورت پیش آجائے تو گنجائش والا اس کی ضرورت پوری کرے، نماز پڑھو زکوٰۃ دو اور جو کچھ بھی تم اپنے نفسوں کے لیے بھیجو گے اس کو اللہ تعالیٰ کے پاس پاؤ گے، جو خیر بھی تم اپنے نفسوں کے لیے بھیجو گے اس کو اللہ کے پاس پاؤ گے، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

یہود و نصاریٰ کے خیالی پلاؤ:

"وقالوا لن یدخل الجنة" یہ بھی ایک شبہ تھا جس کو وہ پھیلاتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا کوئی بھی مگر وہ جو یہودی ہوا یا نصرانی ہوا، گویا کہ یہود و نصاریٰ باوجود اس بات کے کہ ان کا آپس میں اختلاف تھا مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیا، وہ کہتے تھے کہ مسلمان تو جنت میں جائیں گے ہی نہیں ہاں یہودی ہو تو جائے گا نصرانی ہو تو جائے گا۔

دونوں طرف سے یہ نعرہ لگتا تھا، یہود کہتے ہوں گے کہ یہودی ہوں تو جنت میں جائیں گے اور نصرانی کہتے ہوں گے کہ نصرانی ہوں گے تو جنت میں جائیں گے مطلب تھا اہل اسلام کو برگشتہ کرنا کہ اگر تم جنت کے ہی طالب ہو تو جنت بھی اسی راستہ پر چلنے سے ملے گی، یہ جو نیا طریقہ سامنے آ گیا یہ جنت کا طریقہ نہیں ہے، تلك امانيهم قرآن کریم کہتا ہے یہ ان کے خیالی پلاؤ ہیں، یہ ان کے دل کی خواہشات ہیں جو انہوں نے بنا رکھی ہیں ان کی بنیاد کچھ نہیں ہے۔

یہود ونصاریٰ سے برہان کا مطالبہ:

اور انہیں کہو اگر تم سچے ہو تو برہان پیش کرو، برہان کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب وہی ہوگا جس کی تفصیل آپ کے سامنے ”لن تمسنا النار الا ایاماً معدودۃً“ کے تحت ذکر کردی گئی ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اس دعویٰ کو برہان سے ثابت کرو، برہان یہ ہوگا کہ یہودیت کا دین غیر منسوخ ہے اور قیامت تک کے لیے نجات اسی میں منحصر ہے تم یہ کہتے ہو کہ جنت میں صرف نصرانی جائیں گے اس عقیدے کے اوپر برہان پیش کرو کہ یہ نصرانیت دائمی دین ہے غیر منسوخ ہے اللہ کا مقبول ہے قیامت تک یہی دین باقی ہے۔

اگر برہان کے ساتھ تم اس بات کو ثابت کردو تو تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہے لیکن اگر تم اس بات پہ برہان پیش نہیں کرسکتے بلکہ دوسری طرف یہ برہان قائم ہے کہ ہر وقت اللہ کے احکام کی پابندی جنت میں لے جانے والی ہے اخلاص کے ساتھ اللہ کے احکام کو مانو اگر ایک وقت میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا جنت کا راستہ ہے تو دوسرے وقت میں عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا جنت کا راستہ ہے اور تیسرے وقت میں حضور ﷺ پر ایمان لانا جنت کا راستہ ہے، اللہ کی طرف سے برہان کے ساتھ جو ثابت ہوتا چلا جائے اس کو قبول کرلینا یہی اسلام ہے اور اسلام ہی جنت کا راستہ ہے اس لیے تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو یہود یا نصاریٰ کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جاسکتا؟ ہم تو کہتے ہیں جو اللہ کا فرمانبردار ہے اخلاص کے ساتھ اللہ کی طرف سے آنے والے احکام کو جو مانے گا وہ جنت میں جائے گا۔

ایک وقت میں یہودیت کو اختیار کرنا ہی اسلام کا تقاضہ تھا اور ایک وقت میں نصرانیت کو اختیار کرنا ہی اسلام کا تقاضہ تھا لیکن اب برہان اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ دونوں دین منسوخ ہیں اور منسوخ دین اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے، لہٰذا اب جو یہودیت کو اختیار کرے گا یا نصرانیت کو اختیار کرے گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اب اسلام کا تقاضہ یہی ہے کہ آنے والے پیغمبر کو مانا جائے اور اس کے اوپر اتری ہوئی کتاب کے مطابق عمل کیا جائے، اس لیے موجودہ وقت کے پیغمبر پر ایمان لانے والے لوگ جنت کے راستہ پر چل رہے ہیں تو ”قل ھاتو ابرھانکم“ کا یہ مفہوم ہے۔

”بلیٰ من اسلم“ کیوں نہیں کوئی اور جنت میں جائے گا جبکہ ضابطہ یہ ہے کہ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے تابع کردیا اس حال میں کہ مخلص بھی ہو، دل سے اللہ کے احکام کو مان لے جس سے منافق خارج ہوگئے، فلہ اجرہ عند ربہ اس کے لیے اس کا اجر ہے اس کے رب کے پاس نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہوں گے، ”لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون“ یہ جنت کی زندگی کا عنوان ہے کیونکہ جنت کی زندگی ہی ایسی ہے جس میں ”لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون“ صادق آئے گا۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ

اور کہا یہود نے نہیں ہیں نصاریٰ کسی شی پر (ان کے مذہب کی کوئی بنیاد نہیں) اور نصاریٰ نے کہا کہ

الْيَهُودُ عَلٰى شَىْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا

یہود نہیں ہیں کسی شی پر حالانکہ یہ سارے ہی کتاب پڑھتے ہیں اور ایسے ہی کہا ان لوگوں نے جو

يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا

علم نہیں رکھتے (مشرکین) اللہ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن اس چیز میں

فِيْهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا

جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ کون بڑا ظالم ہے اس شخص کے مقابلہ میں جو روکے اللہ کی مسجدوں کو کہ ان میں ذکر کیا جائے

اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ

اللہ کا نام اور کوشش کرے ان کی ویرانی میں یہ لوگ نہیں مناسب تھا ان کے لیے کہ داخل ہوتے ان مسجدوں میں

اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں

عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ

بڑا عذاب ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ ہی کے لیے ہے مشرق و مغرب ، جس طرف بھی تم پھرو وہیں اللہ کی ذات ہے

اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ

اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں علم والے ہیں ﴿۱۱۵﴾ اور لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کی، اللہ پاک ہے

بَلْ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ

بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمینوں میں ہے ہر چیز اسی کے لیے فرمانبردار ہے ﴿۱۱۶﴾ نئے طریقہ سے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ

آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور جس وقت وہ فیصلہ کرتا ہے کسی امر کا پس سوائے اس کے نہیں کہ اس امر کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا

فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ

پس وہ ہو جاتا ہے ﴿۱۱۷﴾ اور کہا ان لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس

اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ

کوئی نشانی ایسے ہی کہا تھا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں بالکل ان کی بات کی طرح، ملتے جلتے ہیں آپس میں

قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ

ان کے دل تحقیق ہم نے واضح کیں بہت ساری نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں ﴿۱۱۸﴾ بے شک بھیجا ہم نے آپ کو حق کے ساتھ

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ

بشیر اور نذیر بنا کر اور نہیں پوچھا جائے گا تو جہنم والوں کے متعلق ﴿۱۱۹﴾ اور کبھی بھی نہیں

تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ

راضی ہوں گے تجھ سے یہود نہ نصرانی جب تک کہ تو ان کے طریقہ کا متبع نہ ہو جائے آپ کہہ دیجیے

اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے اور اگر تو نے اتباع کی ان کی خواہشات کی بعد

الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو نہیں ہوگا تیرے لیے اللہ کی طرف سے کوئی یار نہ کوئی مددگار ﴿۱۲۰﴾

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی اس حال میں کہ وہ تلاوت کرتے ہوں اس کتاب کی جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے تو یہی لوگ اس کتاب

بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کتاب (قرآن) کا انکار کرے پس یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں ﴿۱۲۱﴾

تفسیر

یہود ونصاریٰ اسلام کے مقابلے میں متحد ہیں:

پچھلے رکوع کی آخری آیت میں ذکر کیا گیا تھا کہ یہ لوگ یعنی یہود ونصاریٰ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جنت میں جانے کے لیے یہودی یا نصرانی ہونا ضروری ہے جس کا مفہوم یہ تھا کہ اسلام کے مقابلہ میں یہ یہودیت اور نصرانیت کو طریقہ نجات قرار دیتے ہیں، اور جب ان کو اکٹھا کر کے قالوا میں ذکر کر دیا اگرچہ یہودیت کا نعرہ یہودی لگاتے تھے اور نصرانیت کا نعرہ نصرانی لگاتے تھے ان کو اکٹھا کر کے ذکر کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں انہوں نے آپس میں ایک متحدہ محاذ بنا لیا ہے اس لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی شخص مسلمان نہ ہو یہودی ہو جائے یا نصرانی ہو جائے۔

اسلام کے مقابلہ میں یہودی نصرانیوں کو گوارا کیے ہوئے تھے اور نصرانی یہودیوں کو برداشت کیے ہوئے تھے اور تیسرے ان کے ساتھ مشرکین مکہ ملے ہوئے تھے باوجود اس بات کے کہ ان کے عقائد میں تضاد تھا لیکن اسلام کے مقابلہ میں یہ سب متحد تھے، اسلام سے پھیرنا مقصود تھا چاہے وہ مشرک ہو جائے، چاہے نصرانی ہو جائے، چاہے یہودی ہو جائے اس سے ان کو کوئی بحث نہیں تھی یہ ان کا مذہبی تعصب ان کی ضد گویا کہ ان الفاظ میں ذکر کی گئی تھی اور رد کے لیے صرف اتنا لفظ بول دیا گیا تھا کہ صرف زبانی دعویٰ کر دینا کہ ہمارا طریقہ ہی نجات کا طریقہ ہے کافی نہیں ہوتا اس کو ثابت کرنے کے لیے کوئی قطعی دلیل لاؤ۔

برہان پیش کرو کہ تمہارا نبی خاتم النبیین ہے اور تمہاری کتاب خاتم الکتب ہے جس وقت تک اس بات کو برہان اور دلیل کے ساتھ ثابت نہیں کرو گے تو زبانی دعویٰ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا تو یہ ان کا متحدہ محاذ تھا جو ذکر کیا گیا۔

آپس میں دست وگریباں ہیں:

اب اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ یہ ان کی ضد اور تعصب ہے اسلام کے مقابلہ میں ورنہ جس وقت یہ اسلام سے مقابل نہ ہوں آپس میں ہوں تو پھر آپس میں یہ گتھم گتھا ہیں، آپس میں یہ دست وگریباں ہیں، وہ ان کا گریبان پکڑتے ہیں، یہ ان کا گریبان پکڑتے ہیں، وہ کہتے ہیں تم جھوٹے، یہ کہتے ہیں تم جھوٹے، صرف اسلام کی ضد میں انہوں نے آپس میں اتحاد کر لیا ہے ورنہ ان کا آپس میں کوئی کسی قسم کا اتفاق نہیں ہے، یہودیوں سے پوچھو کہ نصرانیوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے تو کہتے ہیں بالکل بے کار ہیں غلط ہیں نہ کوئی بنیاد نہ کوئی دلیل ایسے

ہی پھر رہے ہیں، اور نصرانیوں سے پوچھو کہ یہودی کیسے ہیں تو کہتے ہیں ان کا کیا پوچھنا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ نہیں مانتے، انجیل کو یہ نہیں مانتے ان کا مذہب بالکل بے بنیاد ہے، آپس میں ایک دوسرے کے متعلق ان کے جذبات ایسے ہیں حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھتے ہیں اور کتاب اللہ یعنی انجیل وتوراۃ کے اندر یہ پڑھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام بھی اللہ کے سچے پیغمبر اور توراۃ بھی اللہ کی سچی کتاب تو یہودیت کی بھی بنیاد صحیح اور یہودیوں کی کتاب کے اندر آنے والے نبی عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ اور انجیل کا ذکر جس سے معلوم ہوگیا کہ نصرانیوں کی بھی بنیاد صحیح ہے غلط نہیں ہے غلط اگر ہوا ہے تو پہلا مسلک دوسرے مسلک کے آنے سے منسوخ ہوا اور دوسرا مسلک تیسرے مسلک کے آنے سے منسوخ ہوگیا۔

باصلہ ان کو باطل نہیں کہا جاسکتا، یہودیت باصلہ باطل نہیں ہے، صحیح بنیاد پہ قائم ہے، نصرانیت باصلہ باطل نہیں ہے، صحیح بنیاد پہ قائم ہے، تو اس قسم کا تعصب اور ضد ایک دوسرے کے مقابلہ میں برتنا کہ کچھ بھی نہیں ہے، ان کی تو بنیاد ہی صحیح نہیں ہے، یہ بات ان کے تعصب سے ناشی ہے، اگر یہ اسلام کے مقابلہ میں اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں تو آپس میں بھی ان کا اسی طرح کا معاملہ ہے، ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق نہیں ہے، یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی صحیح بنیاد پر نہیں، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی صحیح بنیاد پر نہیں، حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں، کتاب کے اندر دونوں کو دونوں کی اصلیت معلوم ہے، چاہیئے تو یہ تھا کہ یہودی اپنی کتاب کو پڑھتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتے، اور انجیل کو قبول کرتے اور عیسائی جس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، انجیل پڑھی تو ان کو چاہیئے تھا کہ توراۃ کو اللہ کی کتاب سمجھتے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا پیغمبر مانتے اس طرح ایک دوسرے کا احترام کرتے آنے والے نبی پہ ایمان لاتے، کتابوں کو تسلیم کرتے۔

دنیا میں ہر ایک اپنی گا رہا ہے فیصلہ قیامت کے دن ہوگا:

اب تیسرے جاہلوں کی بات سن لیجئے جن کے پاس نہ کوئی کتاب، نہ کسی نبوت کے قائل وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی حق پر ہیں باقی ان میں سے کوئی بھی حق پر نہیں یہ مشرکین ہیں کذلك لايعلمون یہ اس متحدہ محاذ کا تیسرا فرد ہے، یہ سب اپنی اپنی گا رہے ہیں اپنی اپنی کہہ رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے جس وقت جائیں گے تو اللہ تعالیٰ عملاً ان کے درمیان فیصلہ کردے گا کہ کون حق پر تھا کون باطل پر تھا، عملی فیصلہ یہاں مراد ہے ورنہ دلائل اور برہان کے ساتھ فیصلہ تو دنیا میں بھی ہوجاتا ہے لیکن ہر شخص دلیل کو مانا نہیں کرتا اور دلیل سے متاثر ہو کے اپنی ضد کو چھوڑا نہیں کرتا عملاً فیصلہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کان سے پکڑ پکڑ کر ایک طرف کردیں گے کہ یہ اہل باطل ہیں یہ اہل حق ہیں ''وامتازوا اليوم ايها المجرمون'' جس وقت یہ اعلان ہوگا اس وقت صف بندی

ہو جائے گی مجرم ایک طرف ہو جائیں گے اور اچھے لوگ ایک طرف ہو جائیں گے اس وقت عملاً سب کے سامنے آ جائے گا کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون تھا کیونکہ دلیل اور برہان ہر شخص تسلیم نہیں کیا کرتا اگر دلیل اور برہان ہر شخص تسلیم کرے تو کبھی دنیا کے اندر اختلاف نہ رہے سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔

" فالله یحکم بینهم " اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ان باتوں میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں تینوں ہی اپنے لیے حق پر ہونے کے مدعی ہیں اور دوسروں کو باطل قرار دیتے ہیں، آگے اللہ تعالیٰ نے تینوں کا ہی تھوڑا سا کردار دکھایا ہے کہ ان کو چاہیے جو اہل حق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ اپنے کردار کے آئینہ میں اپنا منہ دیکھیں کہ حق والے کیا ایسے ہوتے ہیں؟

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے متحدہ محاذ کا نمونہ:

پہلی بات جو کہی جا رہی ہے وہ مشترکہ تینوں کے متعلق ہے کہ وہ مسجدوں کی ویرانی میں کوشش کرتے ہیں، یہود، نصاریٰ اور مشرکین سب کا کردار ایک جیسا تھا، یہود نے سرور کائنات ﷺ پر تحویل قبلہ کے وقت جو شور مچایا اس کا نتیجہ بھی یہی تھا کہ ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لوگ اسلام سے پھر جائیں، حضور ﷺ کے قبلہ کو تسلیم نہ کریں اس طرح مسلمانوں کی مسجدوں کو یہ لوگ ویران کریں، یا یہود و نصاریٰ کی پہلے زمانہ میں آپس میں جو لڑائیاں رہیں ان لڑائیوں میں یہ ایک دوسرے کے معابد کا احترام نہیں کرتے تھے یہ ان کی عبادت گاہ کو ویران کرتے وہ ان کی عبادت گاہوں کو برباد کرتے حتیٰ کہ بیت المقدس تک کا احترام باقی نہ رہا تاریخ کے اندر اس قسم کے واقعات لکھے ہوئے ہیں اور مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روکا، بیت اللہ کے قریب نہ جانے دیا حالانکہ یہ مسجد سب کی مشترکہ تھی۔

حتیٰ کہ مسلمان مکہ سے نکلنے پہ مجبور ہو گئے بعد میں عمرہ کرنے کے لیے تشریف لائے تو بھی میدان حدیبیہ میں روک دیا تھا یہ ساری صورتیں ایسی ہیں جو اللہ کی مسجدوں کو ویران کرنے والی ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق صحیح ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو ویران نہیں کیا کرتے وہ تو مسجدوں کی تعمیر میں کوشش کرتے ہیں اور یہ مدعی اپنی اپنی جگہ دعوی تو کرتے ہیں۔

لیکن اللہ کا احترام کسی کے دل میں نہیں ہے "من اظلم ممن منع مساجد الله" یہ بظاہر اگرچہ انہی کی تردید ہے کہ وہ ظالم تھے اور اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام لینے سے روکتے تھے، اس سے اصول نکل آیا کہ مسجد کی تعمیر میں کوشش کرنا پسندیدہ عمل ہے اور ایمان کی نشانی ہے اور مسجد کی ویرانی میں کوشش کرنا یہ ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی دلیل ہے۔

مسجد کو ویران کرنے کی مختلف صورتیں:

ویرانی میں کوشش کرنا یہ بھی ہے کہ مسجد کو بلاوجہ گرادیا جائے ،لوگوں کو وہاں نماز پڑھنے سے روکا جائے یا مسجد کے آس پاس اس قسم کا شوروغوغا برپا کردیا جائے کہ لوگوں کے لیے وہاں نماز پڑھنی اور اللہ کا ذکر مشکل ہوجائے اور کسی نہ کسی درجہ میں یہاں وہ بات بھی آسکتی ہے کہ جو آپس میں معمولی معمولی اختلاف کے بعد تعصب پیدا ہونے کی صورت میں ایک فرقہ کو دوسرے کی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی۔

یعنی ایک مسجد پہ بریلویوں نے قبضہ کرلیا اور ان کو پتہ چل جائے کہ یہ دیوبندی ہے تو اس کو مسجد میں نہیں گھسنے دیتے اور ایک جگہ تعصب شروع ہوا دیوبندی قابض ہیں اور ان کو پتہ چل جائے کہ یہ بریلوی ہے تو اس کو مسجد میں نہیں گھسنے دیتے ، اپنے عموم کے ساتھ یہ مذمت ان لوگوں کی بھی ہوسکتی ہے۔

اور مسجد میں اس قسم کا شوروغوغا برپا کرنا کہ لوگ نماز نہ پڑھ سکیں ،اللہ کا ذکر نہ کرسکیں ،یا مسجد کے اردگرد اس قسم کے حالات پیدا کردینا کہ لوگوں کے لیے مسجد میں آنا مشکل ہوجائے اور مسجد میں آکے اللہ کی عبادت نہ کرسکیں وہ سب اس ظلم کے اندر داخل ہیں، اسلام نے ہمیں عبادت گاہوں کا احترام سکھایا ہے اس لیے فقہ میں کتاب الجہاد کے اندر آپ پڑھتے ہیں کہ جس وقت مسلمان کسی علاقہ پر قابض ہوجائیں تو ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے کوئی فرقہ ہو اس کی عبادت گاہ کو نقصان نہ پہنچاؤ، ہاں البتہ وہ خود مسلمان ہوجائیں مسلمان ہونے کے بعد اپنے گرجے کو خود گرادیں اور مسجد بنالیں اس کی اجازت ہے۔

لیکن اگر وہ لوگ اپنے مسلک پہ قائم رہنا چاہتے ہیں تو نہ ان کو ان کی عبادت سے روکا جاسکتا ہے نہ ان کے عبادت خانہ کو ویران کیا جاسکتا ہے چنانچہ ذمی اسی طرح اپنی عبادت گاہوں میں جاتے ہیں اور جا کے عبادت کرتے ہیں اور ان کی عبادت گاہوں کا احترام ہم نے بھی کرنا ہے۔

آداب مسجد کی رعایت رکھتے ہوئے مسجد میں داخل ہوا کرو:

" اولئك ما كان لهم " ان لوگوں کے لیے تو یہ ٹھیک ہی نہیں تھا ان کی شان کے لائق نہیں کہ ویرانی میں کوشش کریں بلکہ ان کو چاہیئے تھا کہ ڈرتے ہوئے ان میں داخل ہوں ، جب بڑے آدمی کی مجلس میں کوئی جایا کرتا ہے تو اس کے اوپر ایک خوف وہراس کی کیفیت ہوتی ہے ، یہ اصل میں صاحب خانہ کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے ، جس کو آپ ملنے کے لیے جارہے ہیں اس کی عظمت اگر آپ کے قلب میں ہے تو وہاں جاتے ہوئے یقیناً آپ کے اوپر اثرات ہوں گے اور مسجد یہ اللہ کا گھر ہے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اثر بھی انسان پر ظاہر ہونا چاہیئے جس وقت

مسجد میں داخل ہو تو ادب کے ساتھ داخل ہو، سنجیدہ ہیئت میں داخل ہو، آداب کی رعایت رکھتے ہوئے داخل ہو وہاں جا کے اونچی آواز سے نہ بولو، اِدھر اُدھر کی باتیں نہ کرو، اللہ کی طرف دھیان رکھو، ذکر میں مشغول رہو یہ ہے اصل کے اعتبار سے مساجد کا ادب۔

اور جو شخص اس طرح مسجد میں جاتا ہے تو گویا کہ اس کے قلب کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے اور وہ اس دربار کو دربارِ الٰہی سمجھتا ہے اور اس طرح جاتا ہے جس طرح بڑے کے دربار میں جایا جاتا ہے پھر وہاں جا کے وہی تعظیم کبھی ہاتھ باندھ لیے، کبھی ناک زمین پہ رگڑ دیا، کبھی اس کے سامنے بیٹھ کے توبہ، استغفار اپنی معذرت پیش کرنا سب کچھ ایسے ہی ہے جو بڑے کے دربار میں ہوا کرتا ہے۔

اور وہاں جا کے دنیا کی باتیں کرنا یہ بھی اس مسجد کے ادب کے خلاف ہے جس طرح روایات کے اندر صراحتاً منع کیا گیا کہ مسجد میں جا کر اس طرح وقت گزارو کہ دیکھنے والا مسجد اور باہر کے حال میں فرق محسوس کرے کہ جس وقت آپ باہر کھیل کے میدان میں پھرتے ہیں، یا بازاروں میں پھرتے ہیں، دوست احباب کی مجلس میں بیٹھتے ہیں جو حال آپ کا اس وقت ہوتا ہے مسجد میں جانے کے بعد اس حال میں فرق یقیناً نمایاں ہو تب تو ہم سمجھیں گے کہ واقعی آپ مسجد کو اللہ کا گھر سمجھتے ہیں اور اگر آپ کی حالت و کیفیت میں کوئی فرق ہی نہیں میدان کھیل میں بھی وہی حال ہے اور مسجد میں بھی وہی حال ہے۔

جیسے یہاں دندناتے ہو وہاں بھی دندناتے ہو، جیسے یہاں قہقہے لگاتے ہو وہاں بھی ایسے ہی کرتے ہو تو یہ سب چیزیں مسجد کے آداب کے منافی ہیں ایسا کرنے والے کے قلب میں یوں سمجھو کہ اللہ کی عظمت نہیں یا کم از کم اس کو یہ استحضار نہیں کہ میں اللہ کی دربار میں آیا ہوا ہوں تو جو مسجدوں کا احترام نہیں کرتے، مسجدوں کے ویران کرنے میں کوشش کرتے ہیں اور اللہ کا نام لینے میں مانع بنتے ہیں، مسجد میں جاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت کو محسوس نہیں کرتے، ان کے اوپر خوف کے آثار نہیں ہوتے، ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور یہ بات ان یہودیوں پر بھی صادق آتی تھی، نصاریٰ پر بھی صادق آتی تھی اور مشرکوں پر بھی صادق آتی تھی۔

تحویل قبلہ کی بنیاد:

”وللّٰہ المشرق والمغرب“ اللہ ہی کے لیے ہے مشرق و مغرب، یہ دو جہتیں ذکر کر دیں ورنہ شمال و جنوب بھی ایسا ہی ہے ساری جہتیں اللہ ہی کے لیے ہیں جدھر بھی تم منہ کرو ادھر اللہ کی ذات موجود ہے یہ بنیاد ہے تحویل

قبلہ کی جس کے اوپر یہود نے شور مچایا تھا جس کا ذکر آگے شروع ہونے والا ہے کہ نماز پڑھنے کے لیے کوئی خاص جہت مطلوب ومقصود نہیں ہے کہ اگر اُدھر ہی منہ کرو گے تو اللہ کی عبادت ہوتی ہے اگر کسی اور طرف منہ کرلو گے تو اللہ کی عبادت نہیں ہوتی، بیت المقدس کی طرف منہ کرو تو عبادت ہے بیت اللہ کی طرف منہ کرلو تو عبادت نہیں جیسے انہوں نے شور مچایا تھا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ کی ذات کوئی ایک جہت میں بند نہیں ہے اللہ تعالیٰ ساری کائنات پر محیط ہے جدھر منہ کرو اُدھر ہی اللہ کی ذات موجود ہے۔

ہاں اللہ تعالیٰ حکمت کے تحت اگر ایک جہت کو متعین کردیں یہ محض ایک انتظامی چیز ہے تا کہ اجتماعیت اور سکون کی شکل وصورت سامنے آجائے کہ جب مل کے لوگ عبادت کریں گے اور سب کا منہ ایک طرف ہوگا تو اجتماعیت معلوم ہوگی اگر کوئی جہت متعین نہ کی جائے تو کسی کا منہ کسی طرف ہوگا اور کسی کا منہ کسی طرف ہوگا اور انتشار معلوم ہوگا۔

اور جب اکٹھے بیٹھ کے عبادت کریں گے تو یہ انتشار قلوب پر بھی اثر انداز ہوگا اس لیے جتنی صف سیدھی ہو جتنا رخ سیدھا ہوا اتنا ہی نماز کے اندر سکون واطمینان نصیب ہوگا، یہ ایک انتظامی چیز ہے یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ کعبہ سے مشرق کی طرف ہیں اور ہمارا قبلہ مغرب کی جانب ہے، اور جو کعبۃ اللہ سے مغرب کی جانب ہیں ان کا قبلہ مشرق کی جانب ہے اور جو شمال کی طرف ہیں ان کا جنوب کی جانب ہے اور جو جنوب کی طرف ہیں ان کا قبلہ شمال کی جانب ہے تو کوئی ایک جہت متعین نہیں ہے کہ شمال ہی قبلہ ہے یا جنوب ہی قبلہ ہے یا مشرق ہی قبلہ ہے یا مغرب ہی قبلہ ہے کوئی جہت، جہت ہونے کی حیثیت سے مطلوب نہیں وہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک مقام قائم کر کے اپنی طرف منسوب کردیا کہ رخ ادھر کرنا ہے اگر کوئی شمال میں ہے تو جنوب کی طرف منہ کرے گا، جنوب میں ہے تو شمال کی طرف منہ کرے گا، مشرق میں ہے تو مغرب کی طرف منہ کرے گا، مغرب میں ہے تو مشرق کی طرف منہ کرے گا اس میں جہت کی کوئی بات نہیں ہے۔

کعبہ جہت سجدہ ہے، مسجود لہ نہیں ہے:

اور یہ جو کعبۃ اللہ کو متعین کیا گیا ہے تو ہمارا سجدہ کعبہ کو نہیں ہے کعبہ جہت سجدہ ہے مسجود لہٗ نہیں ہے اس لیے اگر کوئی بت پرست اعتراض کرے کہ ہم پر تو مسلمان اعتراض کرتے ہیں کہ بتوں کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں خود بھی تو کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں تو یہ اعتراض بھی جہالت پر مبنی ہوگا۔

ہم کعبہ کو سجدہ نہیں کرتے یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک رخ متعین کردیا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت

خدانخواستہ یہ کعبہ گرادیا جائے اور یہاں کوئی پتھر کا نشان باقی نہ رہے تو بھی ہمارا منہ ادھر ہی ہوگا یہ عمارت ہو تب بھی ہم ادھر منہ کریں گے نہ ہو تب بھی ہم ادھر منہ کریں گے یہ ایک انتظامی معاملہ ہے تاکہ اجتماعیت کی شکل پیدا ہو جائے ورنہ یہ عمارت مسجود لہٗ نہیں ہے، اس لیے اللہ کے حکم کے تحت بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو جائے تو کوئی بات نہیں کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو جائے تو کوئی بات نہیں اسی سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکال لیا کہ جب اللہ تعالیٰ ہر جہت میں موجود ہے اگر کوئی شخص ایسے وقت میں نماز پڑھنے والا ہو کہ اس کو متعین طور پر معلوم نہیں کہ کعبہ کدھر ہے اپنے دل کے ساتھ فیصلہ کر کے کہے یہ جہت قبلہ ہے نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی چاہے بعد میں معلوم ہو جائے کہ اس کی پشت قبلہ کی طرف تھی تو بھی اس کی نماز صحیح ہے اور سفر کی حالت میں اسی سے ایک عموم نکال لیا کہ جب انسان سفر میں ہو اور کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا مشکل ہے تو جدھر کو منہ ہو ادھر ہی کو منہ کر کے نماز پڑھ لے۔

البتہ فرض نماز کے لیے اترنا ضروری ہے اگر اترنا ممکن ہو اگر اترنا ممکن نہ ہو تو پھر فرض نماز بھی سواری پر ادا ہو جاتی ہے ممکن نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا بیمار ہے کہ سواری سے اتر نہیں سکتا اس کو پتہ ہے کہ اگر میں اتر گیا تو دوبارہ چڑھ نہیں سکوں گا یا جہاد میں ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں اور اترنے کی گنجائش نہیں ہے تو ایسے وقت میں سواری پر نماز ادا کی جاسکتی ہے رخ چاہے جدھر کو بھی ہو البتہ جن سواریوں پر بیٹھا ہوا انسان اپنا رخ بدل سکتا ہے ان میں رخ بدلنا ضروری ہے اس لیے ریل، کشتی میں نماز پڑھیں تو قبلہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے اس کو گدھے، گھوڑے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا یہ سارے احکام فقہاء نے اسی آیت کے تحت لکھے ہیں اور جاہلوں میں یہ بات بہت زیادہ کوتاہی کی ہے کہ ریل میں جدھر کو سیٹ کا رخ ہو ادھر ہی منہ کر کے نماز پڑھ لیں گے حالانکہ کھڑے ہونے کی گنجائش ہے رخ بدلنے کی گنجائش ہے یہ طریقہ بالکل غلط ہے اس طرح نماز ادا نہیں ہوگی۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب نے اللہ کے لیے اولاد کا قول کیا:

" وقالو اتخذ الله ولدا " یہ بھی ایک مشترکہ عیب ہے جس کو یہاں ذکر کیا جارہا ہے کہ یہ یہود، نصاریٰ اور مشرکین کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد اختیار کی ہے یہود نے کہا تھا" قالت الیہود عزیر ابن الله "اور نصاریٰ کا عقیدہ ہے" وقالت النصاریٰ المسیح ابن الله "اور مشرکین مکہ ملائکہ کو بنات اللہ قرار دیتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں" جعلوا بینہ وبین الجنۃ نسبا "اللہ اور جنوں کے درمیان انہوں نے رشتہ داری قائم کر دی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جنوں کے ہاں شادیاں کرتا ہے اور پیدا فرشتے ہوتے ہیں یہ مشرکین مکہ کا فلسفہ تھا۔

اس عقیدہ اولاد کے اندر بھی یہ سارے مشترک تھے "سبحانہٗ" اللہ پاک ہے اس کے لیے اولاد کی نسبت ایک عیب ہے اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے اور اس کی طرف اولاد کی نسبت کیوں نہیں ہو سکتی؟۔

اولاد کی خواہش مختلف وجوہ کی بناء پر ہوتی ہے:

اس کو اس طرح سے سوچئے کہ اولاد کیوں مطلوب ہے؟ ہمارے دل میں اگر اولاد کی خواہش ہے تو اس کی منشاء کیا ہے؟ اولاد یا تو انسان اس لیے چاہتا ہے کہ میں اس وقت تو جوان ہوں اپنی ضروریات پوری کر رہا ہوں آخر طبعی رفتار کے تحت ایک وقت بوڑھا ہونا ہے جس وقت اپنی قوتیں جواب دے جائیں گی اور پھر ہم اپنی ضرورتیں پوری نہیں کر سکیں گے اٹھنا بیٹھنا ہمارے لیے مشکل ہوگا، کھانا پکانا ہمارے لیے مشکل ہوگا، چلنا پھرنا مشکل ہوگا، ایسے وقت میں پھر اولاد سہارا بنتی ہے کہ بوڑھے ماں باپ چارپائی پر سوار ہو کے بیٹھ جاتے ہیں۔

اولاد کماتی ہے انہیں کھلاتی ہے ان کی خدمت کرتی ہے تو آخر وقت انسان کا کچھ آرام سے گزر جاتا ہے تو جو بڑھاپے کا خوف انسان پر مسلط ہے اس کے تدارک کے لیے انسان اولاد چاہتا ہے کہ میرے محتاج ہونے کے زمانہ میں میری خدمت کرے گی اور اگر اس وقت اولاد نہ ہوئی تو پھر مجھے کون سنبھالے گا آپ جانتے ہیں کہ اس کے اندر احتیاج ہی احتیاج والا معنیٰ ہے، یا اولاد اس لیے مطلوب ہوتی ہے کہ میں نے جائیداد بنالی میرا کاروبار ہے، دوکان ہے، زمین ہے، مکانات ہیں، اب یہ محنت کر کے میں نے سارے کے سارے جمع کیے ہیں اگر اولاد نہ ہوئی تو میرے مرنے کے بعد پرائے لوگ لے جائیں گے تو میری محنت سے پرائے لوگ فائدہ اٹھائیں گے اس لیے اولاد حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے تاکہ وہی دولت اپنے ہی کام آئے کیونکہ اولاد کے جو کام آئے گی تو انسان یہی سمجھتا ہے کہ گھر کی چیز گھر میں ہی رہ گئی اور جب اولاد نہ ہو اور دور والے رشتہ دار اس وراثت کو سنبھال لیں تو پھر اس تصور کے ساتھ انسان کو تکلیف ہوتی ہے کہ محنت میری، مشقت میری، کمائی میری اور فائدہ دوسرے اٹھالیں تو اپنی موت کا تصور کرتے ہوئے اور اپنی وراثت کا خیال کرتے ہوئے انسان کے دل میں اولاد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی ایک قسم کی خود غرضی اور احتیاج ہی ہے اور یا اولاد کا جذبہ اس لیے ہوتا ہے کہ اکیلے آدمی سے کاروبار سنبھالا نہیں جاتا اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نوکر رکھتا ہوں تو وہ بھی خراب کرتے ہیں۔

اور اگر اپنی اولاد ہو تو میرے کاروبار میں شریک ہو جائے گی اور میرے کام میں ہاتھ بٹائے گی تو اپنے لیے معاون چاہتا ہے اس لیے اولاد مطلوب ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اولاد اختیار کرنے کی تمام وجوہ سے پاک ہیں:

اب آپ بتایئے کہ ان تینوں میں سے کونسی بات ایسی ہے کہ جس کی نسبت اللہ کی طرف کر کے یہ کہا جائے کہ اللہ کو بھی اولاد کی ضرورت ہے، کیا (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو موت کا اندیشہ ہے کہ میرے فنا ہونے کے بعد میری اس کائنات کو کون سنبھالے گا؟ کیا اللہ تعالیٰ سے اس وقت یہ کائنات سنبھالی نہیں جاتی کہ اس کو معاون اور مددگار کی ضرورت ہے؟ کیا کوئی ایسا وقت بھی اللہ تعالیٰ کے متعلق تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی قوتیں جواب دے جائیں گی اور وہ کمزور ضعیف ہو جائے گا تو اس وقت بچوں کی ضرورت ہوگی تاکہ بڑھاپے میں سہارا بنیں؟ آخر اولاد کی ضرورت جن وجوہات کی بناء پر ہوا کرتی ہے ان میں سے کوئی وجہ بھی اللہ تعالیٰ پر صادق نہیں آتی اس لیے اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا یہ اللہ کی طرف احتیاج کی نسبت ہے اور اللہ تعالیٰ احتیاج سے پاک ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اولاد کسی گھر میں خلاف جنس پیدا ہو جائے تو یہ مستقل عیب ہے انسان کی اولاد میں بندر آجائیں تو یہ عیب ہے، خوبی یہ ہوتی ہے کہ اولاد ہم جنس ہو اور ہم جنس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو خصوصیات ماں باپ کی ہیں وہی خصوصیات اولاد میں ہوں، مثال کے طور پر باپ اگر حیوان ناطق ہے تو اولاد بھی حیوان ناطق ہونی چاہیئے تب جا کے یہ خوبی بنے گی ورنہ اگر وہ حیوان ناہق پیدا ہو گیا تو یہ ایک عیب ہے، بھینس کے ہاں بھینس ہی پیدا ہو تو یہ خوبی ہے اور گھوڑی کے ہاں گھوڑا ہی پیدا ہو تو خوبی ہے جو بھی نوع ہو بچہ بھی اسی نوع کا ہونا چاہیئے تب تو یہ خوبی ہوگی اور اگر خلاف جنس بچہ پیدا ہو جائے تو ہم بھی اس کو عیب سمجھتے ہیں۔

اب اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں اولاد کا تصور ہو تو اگر آپ اس کو اللہ تعالیٰ کے خلاف جنس قرار دیں اور اللہ تعالیٰ کی خصوصیات اس میں موجود نہ ہوں تو یہ تو ہمارے معاشرہ میں بھی عیب ہے اور اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی خصوصیات کا حامل بنایا جائے تو شرک لازم آ گیا، اور شرک ظلم عظیم ہے کیونکہ پھر اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہیں تو اس کو بھی واجب الوجود ہونا چاہیئے اور جس قسم کی صفات اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں وہی صفات اس کو بھی حاصل ہونی چاہئیں اور اگر ایسا تصور کر لیا جائے تو پھر توحید باقی نہیں رہتی شرک لازم آ گیا اور شرک ایک مستقل ظلم عظیم ہے، اس لیے کسی نہج سے سوچو اولاد کا فلسفہ جو بھی آپ کے سامنے آئے گا اس فلسفہ کے تحت اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف عیب ہی عیب ہے اس میں کوئی خوبی کا پہلو نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بنی آدم مجھے گالی دیتا ہے اور اس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے اس کی گالی یہ ہے کہ مجھے کہتا ہے کہ میرے بچے ہیں میں تو پاک ہوں اس بات سے کہ میں بیوی

یا بچے اختیار کروں تو میری طرف اولاد کی نسبت کرنا یہ گالی دینے کے برابر ہے اور گالی اس طرح بنتی ہے کہ عیب کی نسبت گالی ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' انی یکون له الولد ولم تکن له صاحبة'' اس کے لیے اولاد کہاں سے ہوگی اس کی تو کوئی بیوی ہی نہیں ہے اور اگر اللہ کے لیے کوئی بیوی ثابت کرو گے تو جیسے خاوند اور بیوی کے آپس میں تعلقات ہوتے ہیں کیا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے اس لیے اولاد کی نسبت اللہ کی طرف عیب ہے اور اس عیب کی نسبت یہود نے بھی کی، نصاریٰ نے بھی کی، اور مشرکین مکہ نے بھی کی تو ہر ایک اپنے لیے جنت کا مدعی ہے ہر ایک اپنے لیے حق پہ ہونے کا مدعی ہے لیکن نظریات یہ ہیں۔

ایک بھڑ بھونجے نے عیسائی پادری کو خاموش کرا دیا:

جس وقت ہندوستان میں ابتداءً انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی آپ اس زمانہ کی تاریخ دیکھیں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آئے گی کہ انہوں نے ظاہری حکومت کو قائم کرنے کے ساتھ ہندوستانیوں کے مذہب کو تبدیل کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی اس لیے پادریوں کا ایک ریلہ آیا تھا جو عیسائیت کی تبلیغ کرتا اور اہل اسلام کو عیسائیت کی دعوت دیتا تھا جس کا مقابلہ اس وقت کے علماء نے کیا اور الحمدللہ اس مقابلہ میں عیسائی پادری ہر جگہ شکست کھا گئے اور فتنہ ارتداد آگے بڑھ نہ سکا بلکہ رک گیا اس دور کے عجیب وغریب حالات ہیں اسی زمانہ میں ایک دفعہ ایک پادری دہلی میں کھڑا تقریر کر رہا تھا اور ثابت کر رہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

مجمع میں ایک بھڑ بھونجا بیٹھا تھا (دانے بھوننے والا) وہ کھڑا ہو کے پادری پر ایک سوال کرتا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے تو کیا عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کوئی اور بیٹا بھی ہے؟۔

تو اس پادری نے کہا کہ نہیں یہ اکلوتا بیٹا ہے تو بھڑ بھونجا کہتا ہے کہ پادری صاحب کوئی اور ہونے کی توقع ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں اور ہوگا بھی نہیں بس ایک ہی ہے دوسرے کی توقع بھی نہیں وہ کہتا ہے کہ کیا خوبی ہوئی تیرے خدا میں کہ اتنی میری عمر ہے اور میرے بارہ بچے ہیں اور اللہ نے اتنی عمر میں ایک ہی بنایا ہے اس بات کو سن کے وہ عیسائی پادری خاموش ہو گیا، یہ بات مشہور ہوگئی چلتی چلتی یہ بات دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب (صدر مدرس دارالعلوم) کے پاس پہنچی وہ سن کے عش عش کرا اٹھے اور کہنے لگے کہ پادری کا باپ بھی آ جائے تو اس اعتراض کا جواب نہیں دے سکتا، کہتے ہیں کہ اس بھڑ بونجے کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کا ہونا خوبی

ہے یا عیب اگر عیب ہے تو ایک بھی عیب اور اس کی نسبت بھی اللہ کی طرف نہیں کی جاسکتی اور اگر یہ خوبی ہے تو جس طرح اللہ کے کمالات لامتناہی ہیں کوئی مخلوق کمالات میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تو یہ کمال بھی اللہ میں سب سے زیادہ ہونا چاہیئے ، یہ کیا ہے کہ کمال بھی کہیں اور مخلوق اس کمال میں اللہ سے بڑھ بھی جائے؟۔

ساری کائنات اللہ کی مملوک ہے:

بہر حال جس حیثیت سے بھی آپ اولاد کے نظریے کو سوچیں گے اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف عیب ہے اس لیے فرمایا " سبحانہ " اللہ اس عیب سے پاک ہے اللہ کی اولاد نہیں بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، ساری کائنات اس کی مملوک ہے اور بیٹا مملوک نہیں ہوتا ، اور اگر بیٹا ہو بھی جائے تو اس کو بھی اللہ کی صفات کا مالک ہونا چاہیئے کہ وہ بھی کائنات کا مالک ہو ایسے بھی نہیں ہوسکتا ، ملک اللہ ہی کے لیے قائم ہے اور بیٹا مملوک نہیں ہوتا ، اور جب ساری کائنات اللہ کی مملوک ہے تو اس میں کسی دوسرے کے شریک ہونے کی بھی گنجائش نہیں۔

" کل لہ قانتون " سارے کے سارے اللہ کے فرمانبردار ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی کی سرکشی اور بغاوت کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو سنبھالنے کے لیے اللہ کو سہارے کی ضرورت ہو سارے کے سارے اللہ کے مطیع ہیں۔

" بدیع السمٰوٰت والارض " زمین وآسمان کو وہ نئے نمونہ سے پیدا کرنے والا ہے اور قدرت اس کی ایسی ہے اس کو کیا ضرورت ہے کسی معاون اور مددگار کی کہ اذاقضیٰ امراً جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس امر کے لیے کہہ دیتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہوجاتا ہے، تو جس کی قدرت " کن فیکون " ہو اس کو اپنے معاون اور مددگار کی کیا ضرورت ہے؟۔

اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا:

" وقال الذین لایعلمون " یہ بھی ایک مشترک اعتراض ہے جو یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی طرف سے تھا جاہل لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی واضح نشانی کیوں نہیں آتی؟ یہ بات یہود بھی کہتے تھے، نصاریٰ بھی کہتے تھے، مشرکین بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہم سے کلام کرلے اور ہمیں کہے کہ یہ ہمارا رسول ہے یا اس قسم کی کوئی نشانی بھیجے جس کے سامنے ہم اس کو ماننے کے لیے مجبور ہوجائیں

جیسے کوئی فرشتہ آجائے یا ان کے اشاروں کے ساتھ پہاڑ چل پڑیں، یا ہماری زمین کے اندر چشمے جاری ہو جائیں، یا آسمان پہ چڑھ کے دکھائے یا آسمان سے عذاب ہم پر گرا کے دکھائے، اس قسم کے ان کے مطالبے ہوتے تھے جو سورۃ بنی اسرائیل میں آئیں گے۔

اس قسم کی باتیں کرتے تھے اور یہ باتیں چونکہ جاہلانہ ہیں اس لیے یہود، نصاریٰ مشرکین سب کو لایعلمون کے اندر لپیٹ لیا کہ بظاہر اگرچہ وہ علم والے تھے لیکن جس وقت کوئی شخص اپنے علم سے فائدہ نہ اٹھائے اور علم کے مقتضیٰ پر نہ چلے تو وہ لایعلمون کا مصداق ہوتا ہے ایسے علم کا کوئی فائدہ نہیں کہ جس سے انسان ہدایت حاصل نہ کر سکے وہ جہالت کے برابر ہے۔

سب کا فر صفت طغیان میں مشترک ہیں:

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''کذلك قال الذین من قبلھم'' یہ ان کا اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو انبیاء علیہم السلام کے مخاطبین اکثر و بیشتر ایسے ہی اعتراض کرتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام سابقین پر بھی لوگوں نے اسی قسم کے اعتراض کیے ہیں'' تشابھت قلوبھم ''ان سب کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں ان کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔

جیسے اعتراضات پہلے لوگوں نے اٹھائے تھے اسی قسم کے اعتراض یہ بھی اٹھاتے ہیں سورۃ الذاریات کے دوسرے رکوع میں یہ الفاظ آئیں گے'' کذلك ما اتی الذین من قبلھم من رسول الا قالوا ساحر او مجنون'' ان سے پہلے بھی لوگوں کے سامنے جب بھی کوئی رسول آیا تو انہوں نے یا جادوگر کہا یا دیوانہ کہا، اس بات کو نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' اتواصوا بہ '' کیا یہ جاتے ہوئے ایک دوسرے کو وصیتیں کر جاتے ہیں کہ جب رسول آئے تو تم نے یہی اعتراض کرنا ہے یعنی ان کے اعتراضات میں اتنی یگانگت ہے اتنا اتحاد ہے کہ جو پہلوں نے اعتراض کیا وہی اعتراض پچھلے کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جاتے ہوئے ایک دوسرے کو وصیت کر جاتے ہیں کہ جب بھی کوئی رسول آئے گا تو تم نے یہی اعتراض کرنا ہے ''بل ھم قوم طاغون'' وصیت تو کیا کرنی ہے کیونکہ بعض امتوں کی بعض امتوں کے ساتھ ملاقات ہی ثابت نہیں ہے بس یہ صفت طغیان کے اندر مشترک ہیں جس وقت ان سب کے اندر سرکشی اور بغاوت والا معنی پایا جاتا ہے تو سرکشی اور بغاوت والے ذہنوں سے ایک ہی قسم کے اعتراض سامنے آیا کرتے ہیں۔

یہاں بھی اسی طرح ہے "تشابھت قلوبھم " ان کے قلوب آپس میں ملتے جلتے ہیں ان کی ذہنیت ایک جیسی ہے اور آپ بھی جس وقت چاہیں اس کا تجربہ کر سکتے ہیں، اگر آپ کی مناسبت کسی ایک شخص کے ساتھ ہوگئی آپ کا ذہنی اتحاد اس کے ساتھ ہوگیا اور آپ میں محبت وانس ہوگیا، آپ ایک دوسرے کے خیالات سے متفق ہوگئے تو ایک کراچی میں بیٹھا ہے ایک پشاور میں بیٹھا ہے، ایک اعتراض کراچی والے پر کوئی کرے اور وہی اعتراض پشاور والے پر کوئی کرے تو جواب دونوں کا ایک جیسا ہوگا، اور ذہن میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ ایک ہی نہج کے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی نہج کے ان کے جوابات ہوتے ہیں، یہ جماعتوں کا اتحاد اسی بناء پر تو ہوتا ہے خوش قسمت وہ شخص ہوتا ہے جس کی ذہنی مناسبت کسی اچھے سے ہو جائے تو اس کے خیالات اچھائی کی طرف جائیں گے اور بدقسمت ہے وہ انسان جس کی ذہنیت کسی برے انسان کے ساتھ ہو جائے تو اس کے ذہن کے اندر برائی کے طریقے سوجھیں گے، اس لیے مشرق میں بیٹھنے والے اور مغرب میں بیٹھنے والے جو برائی کی لائن پر چل رہے ہیں تو برائی کا طریقہ ایک ہے، اور مشرق ومغرب میں بیٹھنے والے جو نیکی کے راستہ پر چل رہے ہیں تو نیکی کا طریقہ ایک ہے، کوشش کرنی چاہیئے کہ ذہنی مناسبت اچھے لوگوں کے ساتھ ہو۔

ذہنی مناسبت پیدا کرنے والی چیزیں:

اور ذہنی مناسبت پیدا کرنے کے اندر دو چیزیں سب سے زیادہ دخیل ہوتی ہیں ایک صحبت اور دوسرا لٹریچر کا مطالعہ، جیسے لوگوں کی کتابیں آپ پڑھیں گے آہستہ آہستہ آپ کا ذہن ویسا ہی ہوتا چلا جائے گا، جیسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں گے آپ کا ذہن ویسا ہی بنتا چلا جائے گا، سینما دیکھنے والے، ناول پڑھنے والے شرارتوں کے وہی انداز سوچتے ہیں جس قسم کے ان کو وہاں سمجھائے جاتے ہیں، ڈاکہ اور اغواء کی وارداتیں یہ جو آئے دن ڈرامائی انداز میں آپ کے سامنے آتی ہیں یہ کوئی ماں کے بطن سے سیکھ کر نہیں آتے یہ اس تربیت کا نتیجہ ہے کہ پھر اس قسم کی چیزیں خود بخود سوجھتی ہیں۔

اور اگر آپ اچھی کتابیں پڑھیں گے اچھا مطالعہ کریں گے تو پھر آپ کے ذہن سے نیکی کی عجیب وغریب صورتیں پھوٹیں گی اور نیکی کی طرف آپ کی رفتار تیز ہوتی چلی جائے گی جن لوگوں سے محبت رکھو گے جن کی صحبت میں بیٹھو گے اسی قسم کی ذہنیت بنتی چلی جائے گی اور آگے آپ کا عمل، کردار سب کچھ اسی سانچہ میں ڈھلتا چلا جائے گا، یہ مشابہت قلوب بہت بڑا اصول ہے زندگی کو ایک نہج پہ ڈالنے کا اور تشابہ پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ صحبت اختیار کرنا محبت پیدا کرنا اور اس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کرنا اس سے ذہنیت بنتی ہے۔

اس لیے جہاں تک ہوسکے کوشش کرنی چاہیئے اپنے مسلک کے اکابر کی کتابیں دیکھنے کی، ان کے ملفوظات پڑھنے کی اس سے انسان کے جذبات ان کے مطابق بنتے ہیں تو مشابہت قلوب کے بعد ضروری نہیں کہ بدمعاش کو بدمعاشی سکھائی جائے بدمعاش خود بدمعاشی کے اصولوں پر چلتا ہے اسی طرح مشابہت قلوب کے بعد ضروری نہیں کہ آپ کو ایک ایک نیکی کی تلقین کی جائے جب آپ کا مزاج بن جائے گا تو پھر نیکی کی صورتیں آپ کے سامنے خود بخود کھلتی چلی جائیں گی۔

تو ان کے بھی آپس میں دل ملتے ہیں، ان کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں جس کی بناء پر ان کے ذہن میں سوالات بھی ایک ہی طرح کے آئے۔

کفار کے اعتراض کا جواب:

" قد بینا الآیات لقوم یوقنون " پہلے لوگوں کے سوال دو تھے کہ ہم سے اللہ کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ؟ ہم سے اللہ کلام کیوں نہیں کرتا یہ تو ایسا اعتراض ہے جس کا جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں اس سے تو صرف نظر کر لی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی نہیں ہے کہ ہر کسی سے بات کرے اور اس پر وحی اتارے "اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" اللہ زیادہ جانتا ہے کہ اپنے پیغام کو کہاں اتارتا ہے، ہر کسی کی یہ حیثیت نہیں ہے، اللہ چنتا ہے فرشتوں میں سے، انسانوں میں سے اپنا رسول جو پیغام پہنچانے کا کام دیتا ہے، دنیا کا حاکم جس کو تھوڑی سی حکومت مل جائے وہ بھی ایسا نہیں کرتا کہ ہر کسی کو اپنا پیغام براہ راست پہنچاتا پھرے تو یہ ان کی عظمت کے بھی خلاف ہے وہ بھی اپنا ایک منادی متعین کر دیتے ہیں جو لوگوں میں اس کے پیغام کو پہنچاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جو مالک الملک ہیں اور تمام بادشاہوں کے بادشاہ ہیں ان کی عظمت کے منافی ہے کہ ہر کسی سے بات کریں وہ اپنی شان کے لائق اپنے نمائندے منتخب کرتا ہے فرشتوں میں سے بھی، اور انسانوں میں سے بھی اور ان کے ذریعہ سے اپنے پیغام پہنچاتا ہے اور دوسرا سوال کہ نشانی کیوں نہیں آتی یہ ان کا اندھا پن ہے، نشانیاں تو ہم نے بہت ساری واضح کر دیں اور ان نشانیوں کی تبیین قرآن کریم کی مختلف آیات کے اندر کی گئی ہے۔

جہنم والوں کے متعلق آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا:

" انا ارسلناك بالحق بشیراً ونذیراً " یہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کا پہلو ہے کہ یہ شرارتیں کرتے ہیں، مختلف قسم کے اعتراض کرتے ہیں، آپ کو تنگ کرتے ہیں آپ پرواہ نہ کیجئے آپ کی حیثیت تو ایک رسول کی ہے ماننے والوں کو آپ بشارت دینے والے ہیں اور نہ ماننے والوں کو ڈرانے والے ہیں، اگر کوئی شخص آپ کی باتوں

سے متاثر نہیں ہوتا اور اپنی بدکرداری کی بناء پر جہنم کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہے تو کل قیامت کے دن آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ جہنم میں کیوں چلا گیا، اور یہ سیدھے راستہ پہ کیوں نہیں چلا، آپ کا کام ہے اچھائی اختیار کرنے والوں کو بشارت دینا، برائی کرنے والوں کو محبت کے ساتھ سمجھانا اور اس کے انجام سے ڈرانا یہ ہے آپ کا فرض آپ اس کو ادا کریں اور اگر کوئی شخص آپ سے متاثر نہیں ہوتا اور وہ جہنم کے راستہ پر چلتا ہے پھر نتیجتاً وہ جہنم میں پہنچ جاتا ہے، تو آپ کو فکر کیوں ہے کل کو آپ سے تو نہیں پوچھیں گے یہ جہنم میں کیوں چلا گیا "لاتسئل عن اصحٰب الجحیم" جہنم والوں کے متعلق تجھ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

کافر کبھی آپ سے خوش نہیں ہوسکتے:

باقی آپ کوشش کریں کہ یہ خوش ہو جائیں اس کی ان سے توقع نہ رکھیں یہ اتنے متعصب ہیں کہ جب تک آپ ان کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے اس وقت تک یہ لوگ کسی صورت میں آپ پر راضی نہیں ہوسکتے اور ایسا کرنا ممکن نہیں۔

کیونکہ اگر بالفرض ایسا کریں گے تو آپ بھی اللہ کی گرفت میں آجائیں گے، دلائل قطعیہ قائم ہیں اس بات پر کہ آپ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں اور آپ اللہ کے غضب اور ناراضگی کا راستہ اختیار نہیں کرسکتے، یہ اتفاق آپ لوگوں میں ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے پاس آگیا علم قطعی اور ان کے نظریات سب شہوانی ہیں علم کے آجانے کے بعد جاہلوں کی خواہشات کے پیچھے لگنا یہ علم کی توہین ہے اور اگر علم کے آجانے کے بعد آپ ان کی خواہشات کے پیچھے لگیں گے تو خبردار اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آگئے تو کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔

یہ خطاب ظاہری طور پر اگرچہ سرور کائنات ﷺ کو ہے لیکن سمجھانا دوسروں کو مقصود ہے اور اس بارے میں غصے کا اظہار یہود و نصاریٰ پر ہے کہ ایک آدمی پر ناراضگی کے اظہار کا یہ بھی طریقہ ہوتا ہے کہ مجھے پتہ ہے کہ اس شخص کا اس کے ساتھ اتفاق نہیں اور یہ کبھی بھی اس کی بات نہیں مان سکتا لیکن میں سنا کے کہوں کہ خبردار اگر اس کی بات مانی تو ساتھ تجھے بھی سزا ہوگی جس میں سنانا اس کو مقصود ہوتا ہے کہ وہ سزا کے قابل ہے اگر آپ اس کے ساتھ ہو جائیں گے تو آپ بھی گرفت میں آجائیں گے یہاں بھی اسی طرح ہے۔

اللہ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے:

"قل ان ھدی اللہ ھوالھدیٰ" آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی حقیقت میں ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی آئے اس کا قبول کرنا ہدایت ہے لہٰذا اگر آپ لوگ ہدایت یافتہ ہونا چاہتے

ہیں تو ہمارے طریقہ پر چلو کیونکہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی یہ آئی ہے اور جو دین اللہ تعالیٰ نے منسوخ کردیا وہ اب اللہ کی ہدایت نہیں رہی اس کے اوپر چلنا گمراہی ہے آپ انہیں کہہ دیجئے کہ یہودیت ہدایت نہیں، نصرانیت ہدایت نہیں۔

بلکہ جس وقت اللہ کی طرف سے جو احکامات آجائیں ان کو ماننا ہی ہدایت ہے اور اگر آپ نے اتباع کی ان کی خواہشات کی، ان کے غلط خیالات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا دیکھو اس میں یہ اصول واضح کردیا گیا کہ علمی طور پر اگر ایک بات ثابت ہوجائے اور دوسری طرف جاہلانہ بات ہو تو پھر اگر اہل علم اپنے موقف کو چھوڑ کے جہالت کے پیچھے لگ جائیں گے تو یہ قلب موضوع ہوگیا کیوں کہ متبوع علم ہے اور جہالت تابع ہے اور ہم نے اپنی غلط کاری کے ساتھ علم کو جہالت کے تابع کردیا کہ اپنے علم کے ساتھ ثابت شدہ چیزوں کو ہم چھوڑ دیں اور جاہلانہ نعروں کے پیچھے لگ جائیں، جاہلانہ کردار ہم بھی اپنالیں تو یہ علم کی بدترین قسم کی توہین ہے اور اہل علم کو اجازت نہیں کہ علم کو جہالت کے پیچھے لگائیں۔

اتباع علم کی ہے، جہالت کی نہیں:

اور اگر اہل علم ہوکر جاہلوں کے پیچھے لگے تو اس کے لیے یہی وعید ہے جو یہاں ذکر کی گئی ہے، قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ سورۃ مریم میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو خطاب کرکے سمجھاتے ہیں وہاں بھی یہی ذکر کیا ہے "یاابت انی قدجاء نی من العلم مالم یأتك فاتبعني اهدك صراطاً سویاً" "اے ابا! میرے پاس علم آگیا جو تیرے پاس نہیں ہے اب یہ بات ٹھیک ہے کہ تیری عمر زیادہ اور میری کم اور تو باپ میں بیٹا لیکن باپ اور بیٹا کا اصول یہ اتباع کا اصول نہیں ہے، بڑی عمر اور چھوٹی عمر کا اصول اتباع کا اصول نہیں ہے اتباع کا اصول یہ ہے کہ جس کے پاس علم ہو اس کے پیچھے لگو، جاہل کو عالم کے پیچھے لگنا چاہئے، اس لیے میرے پاس علم آگیا تیرے پاس علم نہیں ہے تو باپ ہونے کے باوجود میرے پیچھے چل۔

کہاں یہ اصول کہ جو ماں باپ کرتے ہیں وہی کرتے چلے جاؤ، اور کہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ اسوہ کہ باپ کے پاس اگر علم نہیں ہے تو باپ ہونے کے باوجود اس کو بیٹے کے پیچھے چلنا پڑے گا، میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا جو سیدھا راستہ دکھائے چاہے باپ ہو تو باپ کے پیچھے لگ جاؤ، بیٹا ہو تو بیٹے کے پیچھے لگ جاؤ کیونکہ اتباع علم کی ہے اتباع جہالت کی نہیں، اتباع عمر کی نہیں، اتباع بڑے چھوٹے ہونے کے اصول سے نہیں ہے۔

اتباع علم کی ہے اس لیے جس کے پاس علم ہو اس کے پیچھے لگو گے تو سیدھا راستہ تمہیں مل جائے گا اور اگر تم یہ کہتے رہو کہ یہ میرا بڑا ہے میں اس کے پیچھے چلوں گا چاہے وہ جاہل ہی ہو پھر یہ مشرکانہ اصول ہے، اس لیے اہل علم کے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جہلاء کے کردار سے مرعوب ہو کر اپنے علم کے تقاضوں کو چھوڑ نہ دیا کریں اور جاننے کے باوجود جاہلانہ طریقوں کو نہ اپنایا کریں یہ علم کی بدترین قسم کی توہین ہے علم متبوع ہے علم تابع نہیں ہے اس لیے اہل علم کو بھی متبوع بننا چاہیے، جاہلوں کے پیچھے نہیں لگنا چاہیے۔

یہاں یہی بات ہے کہ اگر تو نے اتباع کی ان کی خواہشات کی، ان کا کردار، ان کا عمل، ان کا جذبہ سب کو خواہشات کہہ دیا کیونکہ ان کا دین منسوخ ہو چکا ہے اب ان کے اوپر اڑنا یہ محض خواہش نفس ہے، بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو نہیں ہے تیرے لیے اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے کوئی یار اور نہ مددگار۔

منصف مزاج اہل کتاب کا ذکر:

"الذین اٰتینا ھم الکتاب" اب بعض اہل کتاب جو منصف تھے اس میں ان کی تعریف آ گئی کہ جن کو ہم نے کتاب دی اس حال میں کہ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے وہ لوگ اس قرآن پر بھی ایمان لے آئیں گے، حق تلاوت یہ ہے کہ صحیح طور پر پڑھو، اس کا ترجمہ صحیح کرو، ترجمہ کرنے کے بعد اس کو صحیح سمجھنے کی کوشش کرو، پھر اس کے مطابق عمل کرو، جو ان درجات کا خیال رکھتے ہوئے اللہ کی کتاب کو پڑھتا ہے اس نے تلاوت کا حق ادا کر دیا ہے، الفاظ صحیح، معنیٰ صحیح، فہم صحیح، پھر ان کے مطابق عمل کا جذبہ تو تورات و انجیل کے حامل جو اس طرح اپنی کتابوں کو پڑھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لے آئیں گے۔

کیونکہ وہ ہیں نیک دل اور وہ کتاب کا حق ادا کرتے ہیں اور کتاب کا حق یہ بھی ہے کہ جو اس میں سے سمجھ میں آئے اس کی اتباع کی جائے، ومن یکفر بہ اور جو اس قرآن کا انکار کرے فاولئک ھم الخاسرون یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں بنی اسرائیل کے متعلق بحث جو چلی تھی ان کے معائب ظاہر کیے جا رہے تھے، اور ان کا کردار نمایاں کیا جا رہا تھا اب وہ اختتام کو پہنچ گئی۔

يٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّیۡ

اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے احسان کو جو میں نے تم پر کیا اور یاد کرو اس بات کو کہ میں نے

فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـئًا

تمہیں فضیلت دی جہانوں پر ﴿۱۲۲﴾ اور ڈرو اس دن سے کہ جس دن کوئی نفس کسی نفس کی طرف سے کچھ ادا نہیں کرے گا

وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ

اور نہ کسی نفس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی نفس کو کوئی سفارش کام دے گی اور نہ ہی وہ مدد کیے جائیں گے ﴿۱۲۳﴾ جب

ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ‌ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا‌ؕ

آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کلمات کے ساتھ، پھر ابراہیم نے ان احکام کو پورا کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک میں بنانے والا ہوں تجھے لوگوں کے لیے امام

قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ‌ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذۡ

حضرت ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے بعض کو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں پہنچے گا میرا عہد ظالموں کو ﴿۱۲۴﴾ اور یاد کرو جب

جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ

بنایا ہم نے بیت کو لوگوں کے لیے لوٹنے کی جگہ (معبد) اور جائے امن (اور ہم نے حکم دیا کہ) بنایا کرو مقام

اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى‌ ؕ وَعَهِدۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا

ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ اور ہم نے ابراہیم کی طرف ایک پختہ حکم بھیجا اور اسماعیل کی طرف کہ تم دونوں پاک رکھو

بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذۡ قَالَ

میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے ﴿۱۲۵﴾ اور یاد کیجیے جب کہا

اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

ابراہیم نے اے میرے رب! بنا دے اس جگہ کو امن والا شہر اور رزق دے اس شہر کے رہنے والوں کو پھلوں سے

مَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ قَالَ وَمَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ

یعنی ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائیں اللہ اور یوم آخر کے ساتھ ، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اور اس شخص کو بھی جس نے کفر کیا میں فائدہ پہنچاؤں گا

قَلِيلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۲۶

تھوڑا زمانہ پھر میں اس کو کھینچ کر لے جاؤں گا جہنم کے عذاب کی طرف اور یہ نار بہت برا ٹھکانہ ہے ۝۱۲۶

وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ

اور یاد کیجیے جس وقت اٹھا رہے تھے ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں (وہ کہہ رہے تھے) اے ہمارے پروردگار! قبول کر

مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

ہماری طرف سے بے شک تو سننے والا ہے جاننے والا ہے ۝۱۲۷ اے ہمارے پروردگار! بنا تو ہمیں اپنے لیے فرمانبردار

وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ

اور بنا تو ہماری اولاد میں سے ایک فرمانبردار جماعت اپنے لیے اور بتا تو ہمیں حج کے احکام اور توجہ فرما

عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۲۸ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ

ہم پر بے شک تو بہت توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۝۱۲۸ اے ہمارے پروردگار! بھیج ان میں

رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ

رسول انہی میں سے جو پڑھے ان پر تیری آیات اور تعلیم دے ان کو کتاب و حکمت کی

وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۲۹

اور ان کو صاف ستھرا کرے بے شک تو زبردست ہے حکمت والا ہے ۝۱۲۹

تفسیر

کلام کا حسن:

جس آیت کے ساتھ اس مضمون کی ابتداء کی گئی تھی آخر میں وہی آیت دوبارہ دہرادی گئی یہ بھی فصاحت و بلاغت کا ایک اصول ہے کہ ایک چیز پر آپ بحث کرنا چاہتے ہیں تو اس کو عنوان کے طور پر بھی ذکر کرو گے پھر اس کی وضاحت کرتے کرتے آخر کلام کو وہیں جا کے ختم کردیا جاتا ہے مثلاً یوں کہیں کہ بھائی تکبر نہ کیا کرو، تکبر بری بات ہے، بات یہاں سے شروع ہوئی پھر ہوگا کہ تکبر میں یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے، یہ خرابی ہے، اس دلیل کے خلاف ہے

اس میں یہ نقصان ہوگا، یہ نقصان ہوگا، لہذا ہم آپ کو کہتے ہیں کہ تکبر نہ کیا کرو تکبر بری بات ہے دیکھو جہاں سے بات شروع ہوئی تھی انہی الفاظ پر لا کے ختم کردی اسی طرح بنی اسرائیل کے بارے میں کلام جیسے شروع ہوئی تھی ساری کی ساری تاریخ ان کے سامنے دہرانے کے بعد انہی لفظوں کے ساتھ پھر انہیں خطاب کیا جا رہا ہے۔

ابتدائے مضمون میں آیت انہی الفاظ کے ساتھ آئی تھی اور اسی کو اختتام کے اندر ذکر کر کے بنی اسرائیل کی تاریخ کو یہاں ختم کیا جا رہا ہے اور آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ شروع کیا جا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختصر تاریخ اور تحویل قبلہ کی تمہید:

انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مرکزیت حاصل ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تشریف لے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت آپ کی اولاد میں ہی رکھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معروف دو صاحبزادے تھے ویسے تو تاریخ میں دس کا تذکرہ ہے لیکن معروف و مشہور جن کا ذکر قرآن و حدیث میں آتا ہے وہ دو ہی ہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام بڑے ہیں اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے ہیں اور حضرت اسحاق علیہ السلام چھوٹے ہیں اور حضرت سارہ علیہا السلام کے بطن سے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کر کے اپنا مرکز شام میں بنایا تھا، اصل عراق کے رہنے والے تھے جہاں نمرود کی حکومت تھی اور وہاں سے ہجرت کر کے شام میں تشریف لے گئے، شام مہاجر ابراہیم کہلاتا ہے۔

آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام ساتھ تھے ان کو اپنے سے تھوڑی دور صدوم شہر میں مرکز بنا دیا کہ آپ نے یہاں تبلیغ کرنی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بچپن میں ہی حجاز میں اس جگہ لا کے آباد کیا جس کو آج آپ مکہ کہتے ہیں (تاریخی واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں) جس کے نتیجہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کا ایک مرکز حجاز میں بن گیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد یہاں پھیلی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے واسطہ سے تھی وہ شام میں پھیلی، اب عبادت کے دو مرکز بن گئے ایک مرکز عبادت کے لیے بیت المقدس کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا مرکز عبادت کے لیے بیت اللہ کے نام سے موسوم ہوا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے قبل علمی ریاست حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں تھی اور بیت المقدس کو مرکزیت حاصل تھی عبادت کے لیے مرکز بیت المقدس تھا ادھر منہ کر کے یہود و نصاریٰ نماز پڑھتے تھے اور علم و ہدایت کی وراثت حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں چلی آرہی تھی، جن کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لے آئے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت

اب علم وہدایت کی وراثت منتقل ہورہی تھی بنی اسرائیل سے بنو اسماعیل کی طرف جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہی دوسری شاخ ہے، تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں پچھلے انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے اپنی نماز کے لیے قبلہ بیت المقدس ہی منتخب فرمایا، ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے تھے۔

مدینہ منورہ میں جا کر بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا تو صراحتاً ثابت ہے مکہ معظمہ میں بھی عام روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے لیکن ایسے طور پر نماز پڑھتے تھے کہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور مکہ معظمہ کے اندر رہتے ہوئے یہ ممکن تھا لیکن جس وقت آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں بالکل مقابل آ گیا کہ مدینہ منورہ درمیان میں ہے اور کعبۃ اللہ مدینہ منورہ سے جنوب میں ہے اور بیت المقدس شمال میں ہے اب اگر بیت اللہ کی طرف منہ کرتے ہیں تو پشت بیت المقدس کی طرف ہوتی ہے اور بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہیں تو پشت بیت اللہ کی طرف ہوتی ہے اب یہاں دونوں کو اکٹھا نہیں کیا جا سکتا تھا پھر آپ نے مدینہ میں منہ بیت المقدس کی طرف کیا ہے اور اپنی پشت بیت اللہ کی طرف کی ہے طبعی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شوق تھا کہ اگر ہمارے لیے قبلہ وہی بن جائے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے جداعلیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے تو کیا ہی اچھی بات ہے سولہ یا سترہ مہینے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے آپ کو شوق تھا کہ قبلہ بیت اللہ بن جائے اس شوق میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے کہ کب اللہ کا حکم آتا ہے؟ آخر اللہ کا حکم آ گیا کہ امت مسلمہ کے لیے قبلہ بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ متعین کر دیا گیا ہے اور آپ نے اپنا رخ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا جس وقت آپ کا رخ بیت اللہ کی طرف پھرا ہے تو یہود ونصاریٰ نے شور مچا دیا کیونکہ پہلے سلسلہ میں وہ اپنے ساتھ کچھ مطابقت سمجھتے تھے کہ یہ بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

اور ہم بھی ادھر ہی منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن جس وقت آپ نے رخ دوسری طرف کو بدل لیا تو ان کو کہنے کا موقع مل گیا کہ دیکھو یہ ضد میں آ کر یوں کرتے ہیں کبھی کدھر کو منہ کرتے ہیں اور کبھی کدھر کو منہ کرتے ہیں یہ کوئی آسمانی شریعت ہے؟ اس قسم کے اعتراضات کرنے شروع کر دیے تو یہ علمی طور پر پہلا فتنہ تھا جو مدینہ منورہ میں جانے کے بعد پیش آیا کہ ایک متعین حکم کے اوپر نسخ آیا اللہ کی طرف سے نیا حکم آیا تو اس وقت کے اہل علم لوگوں نے اس پر اعتراضات شروع کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اندر اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی اور اس مسئلہ کی

بنیاد ان آیات سے اٹھائی جو آپ کے سامنے تلاوت کی گئیں ہیں اور چار رکوع تک یہی مسئلہ جار ہا ہے، اور یہاں سے اس مسئلہ کی تمہید اٹھائی جارہی ہے، بنی اسرائیل کے تذکرے کو ختم کر کے اب بنی اسماعیل کو جو مرکزیت مل رہی ہے اب اس کی تفصیل شروع ہورہی ہے، پہلے تو یہ ثابت کیا کہ بیت اللہ بھی ملت ابراہیمی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

اگر بیت المقدس کی آبادی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی تو بیت اللہ کی آبادی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہی ہوئی ہے ،اسرائیلی اگر اپنے آپ کو ملت ابراہیمی پر کہتے ہیں تو اسماعیل علیہ السلام بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اس لیے جیسا شرف اس کا ہے ویسا شرف اس کا ہے، جیسا کہ تم اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو تو یہ پیغمبر جو آیا ہے یہ بھی نسلی طور پر، نسبی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہی منسوب ہے تو نبوت اگر ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں چلی گئی تو خاندانی شرافت کے طور پر کوئی فرق تو نہیں ہے وہ بھی تو خاندان نبوت ہے اور پھر جس طرح بیت المقدس کی آبادی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کی اولاد کے ہاتھوں ہوئی، بیت اللہ کی آبادی بھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس کی اولاد کے ہاتھوں ہوئی ہے تو اس میں کیا فرق ہوا تو یہ تاریخ بیان کی کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بیت اللہ کے ساتھ بھی ہے۔

کیونکہ اس وقت یہود و نصاریٰ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اس جگہ کے ساتھ بھی ہے تو قرآن نے ساری تاریخ واضح کی جس میں بتایا کہ وہاں بھی انہوں نے اپنے ایک بیٹے کو آباد کیا اور وہ بھی انہی کی اولاد کا آباد کردہ ہے جس طرح اُس مرکز کی آبادی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب اسی طرح اس مرکز کی آبادی بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔

باقی یہ جو امت مسلمہ پیدا ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں سے اس کا ظہور ہوا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں یہ جماعت پیدا ہو، ان کی دعا کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جماعت کو پیدا فرمایا اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اسی جماعت میں سے جو اسماعیل علیہ السلام وابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو ایک رسول مبعوث کیا جائے اب تم بتاؤ کہ جو ابراہیم علیہ السلام واسماعیل علیہ السلام دونوں کی اولاد میں سے ہو وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کون ہوسکتا ہے؟ اس لیے ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ شدید تعلق ثابت ہوگیا کہ صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے تھے جن کی نسبت اسماعیل علیہ السلام کی طرف بھی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھی تو جو دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانگی تھی کہ ہماری اولاد میں سے رسول مبعوث فرما اور ہماری کا مصداق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے کہ ہماری اولاد میں سے ایک

جماعت اٹھائی جائے اور انہی میں سے ہی ایک رسول مبعوث کیا جائے تو اس کا مصداق اب ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان اور کامیابی:

"واذابتلیٰ ابراهیم ربه بکلمات" جب اس مرکز کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ثابت ہوگیا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور اس جماعت کا تعلق بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوگیا اور روحانی نسبت قائم ہوگئی (پھر آگے ملت ابراہیمی کی تفصیل اگلے رکوع میں آئے گی) سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ومرتبہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا آزمائش میں ڈالنے کے لیے یہاں لفظ یہ استعمال ہوا کہ اس کے رب نے اس کو آزمائش میں ڈالا، اللہ کے اسماء میں سے رب کا لفظ جو استعمال کیا گیا تو رب کا معنیٰ ہوتا ہے تربیت کرنے والا جس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو آزمائش میں ڈالا گیا تھا تو اس لیے ڈالا گیا تھا تاکہ ان کی تربیت ہو، اور ان کی صلاحیتیں نمایاں ہوں اور مجاہدے برداشت کرنے کی وجہ سے ان کی استعداد بڑھتی چلی جائے اور آخر وقت میں ایک بہت بڑا اہم کام ان کے سپرد کردیا جائے تو آزمائشوں میں ڈال کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے تربیت فرمائی، اور آپ جانتے ہیں کہ انسان کا مزاج ہی اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ ٹھوکریں کھا کر، آزمائش میں مبتلا ہو کے اس کی صلاحیتیں بڑھتی ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی آزمائش میں ڈالا گیا چند احکام دے کر وہ احکام کیا تھے؟ آپ کی کتاب میں لکھے ہوئے ہوں گے یا تو وہی سنن ہیں عادات کے متعلق کہ یوں داڑھی رکھنی ہے، یوں مونچھیں رکھنی ہیں، یوں مسواک کرنی ہے، یوں ناخن کاٹنے ہیں، یوں بغلیں صاف کرنی ہیں، یہ سنن مرسلین کے نام سے جو کتابوں میں ذکر کیے جاتے ہیں۔

اور اسی طرح دیگر احکام عبادت کے متعلق، اور پھر واقعات جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ڈالے گئے سب سے پہلے قوم سے ٹکر ہوئی، ساری قوم سے بگاڑ ہوا ماں باپ کے ساتھ بگاڑ ہوا، پھر علاقہ چھوڑنا پڑا اور ہجرت کی مشکلات برداشت کیں حتی کہ اولاد کی جدائی برداشت کرنی پڑی پھر اپنے بچہ کو ذبح کرنے کا حکم آگیا، یہ بہت کٹھن منزلیں تھیں جن میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو گزارا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام امتحان کے اندر کامیاب ہوئے کلمات کی تفصیل کے اندر یہ ساری باتیں آگئیں ان واقعات کی تفصیل مقصود نہیں کیونکہ یہ مجلس وعظ نہیں اس میں اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں تو کلمات کا مصداق یہ سارے واقعات ہوگئے "فاتمهن" کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

سارے احکام جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیے گئے ابراہیم علیہ السلام نے ان کو علی وجہ التمام ادا کیا، کامل طریقہ سے ان کو ادا کیا جب کامل طریقہ سے ادا کیا تو گویا کہ امتحان میں پاس ہوئے جہاں اللہ تعالیٰ پہنچانا چاہتا تھا، اس طرح ان کی استعداد نمایاں ہوگئی۔

کامیابی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام:

" قال انی جاعلك للناس اماماً " پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام ملا کہ میں بنانے والا ہوں تجھ کو لوگوں کے لیے امام اس آیت کے ترجمہ میں بیان القرآن میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں کہ میں تجھ کو لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں نبی بنا کر یا امت بڑھا کر یعنی اگر یہ بات نبوت سے قبل کی ہے تو بشارت ہے کہ میں تجھے نبی بنا کر لوگوں کا امام بنا رہا ہوں اور اگر یہ نبوت کے بعد کی ہے تو مطلب یہ ہے کہ تیری امامت ایک مرکزی حیثیت اختیار کر جائے گی کہ تیری امت اور جماعت کو بہت بڑھاؤں گا۔

اور دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً درخواست کر دی کہ یہ امامت کا عہدہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو ملنا چاہیئے یہاں امامت سے نبوت مراد ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ظالموں کو تو یہ عہدہ بالکل نہیں پہنچے گا جو گناہ گار ہوں گے، باغی ہوں گے، سرکش ہوں گے ان کو تو یہ قیادت ملے گی نہیں۔

ہاں البتہ جو ظالم نہیں ہیں، گناہ گار نہیں ہیں ان میں سے جس کو میں پسند کروں گا امامت کے درجہ پہ فائز کر دوں گا، پیچھے آپ کے سامنے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ ذکر کیا تھا جس وقت عصمت انبیاء علیہم السلام کی بحث آیا کرتی ہے تو اس آیت کو بھی استدلال میں پیش کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہدہ امامت اس شخص کو ملتا ہے جو ظالمین کا مصداق نہ ہو اور اگر اس کے کردار میں، اقوال میں، افعال میں ظلم کا شائبہ پایا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس عہدہ پر فائز نہیں کرتا۔

بیت اللہ کی عظمت:

"واذجعلنا البیت مثابة للناس" اس آیت میں اس بیت اللہ کی شرافت آ گئی کہ یاد کیجئے جب ہم نے بنایا بیت اللہ کو لوگوں کے لیے لوٹنے کی جگہ اور جائے امن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی اس کی یہ حیثیت ہوگئی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ اولاد جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے واسطہ سے پھیلی اور جو لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تبلیغ سے متاثر ہوئے ان کے لیے مرجع اور معبد بیت اللہ تھا، ان کا تعلق اس کے ساتھ تھا اسی کا احترام کرتے تھے، اور اس کا امن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی نمایاں ہوگیا کہ لوگوں کے دلوں میں

تکوینی طور پر بات ڈال دی گئی کہ بیت اللہ اور اس کے ارد گرد کا علاقہ جو حرم کہلاتا ہے ہمیشہ سے وہ پرامن جگہ سمجھی گئی یہاں قتل وقتال جاہلیت کے زمانہ میں بھی نہیں ہوتا تھا حتی کہ اگر کسی کے باپ کا قاتل بھی حرم میں سامنے آجائے تو کوئی اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا حرم کے اندر لڑائی نہیں ہوتی تھی یہ امن کی جگہ ہونا اس وقت سے ہی نمایاں ہوگیا۔

مقام ابراہیم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں آنے کی واضح دلیل ہے:

اور پھر ”واتخذوامن مقام ابراھیم مصلی“ میں مقام ابراہیم کا تذکرہ کر کے مکمل طور پر نشاندہی کردی گئی کہ ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے ہیں۔

کیونکہ مقام ابراہیم جو اس وقت مشہور تھا اور آج بھی ہے وہ ایک پتھر ہے دیوار بناتے ہوئے اونچا ہونے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے اوپر کھڑے ہوتے تھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معجزۃً یہ تاثیر تھی کہ وہ نرم ہوکر جب اونچا ہونے کی ضرورت ہوتی تو اونچا ہوجاتا، اور جس وقت نیچا ہونے کی ضرورت ہوتی وہ نیچا ہوجاتا تھا، اور اس کی نرمی کی یہ علامت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پاؤں اس کے اوپر یوں لگے ہوئے ہیں جیسے کیچڑ میں آپ کے پاؤں دھنس جاتے ہیں اتنا نشان اس پتھر کے اوپر ہے اور تواتر کے ساتھ جس وقت سے بیت اللہ تعمیر ہوا لوگ اس پتھر کو احترام کی نظر سے نشانی کے طور پر رکھے ہوئے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے اور یہ ان کے قدموں کے نشان ہیں اور آج بھی الحمدللہ وہ پتھر محفوظ ہے۔

تو یہ ایک قوی اور مضبوط دلیل تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں یہاں تک آئے ہیں، جب سے یہ بیت بناءِ ابراہیمی کے تحت ظاہری وجود میں آیا اس وقت سے اس پتھر کا وجود تواتر کے ساتھ موجود ہے اور بیت اللہ کے اندر محفوظ تھا تو حکم دے دیا گیا کہ مقام ابراہیم کو مصلی بناؤ یعنی اس کے پاس نماز پڑھا کرو اس لیے طواف کرنے کے بعد دو رکعات نفل پڑھنا واجب ہے اور اس میں سنت یہ ہے کہ ان کو مقام ابراہیم کے پاس ادا کرلیا جائے اور اگر وہاں جگہ نہ ملے تو پھر جہاں بھی ادا کر لیئے جائیں تو واجب ادا ہوجاتا ہے لیکن سنت یہ ہے کہ ان کو مقام ابراہیم کے پاس ادا کیا جائے پہلے یہ پتھر بیت اللہ کے بالکل قریب تھا اور پھر جب اس کا مطاف وسیع کیا گیا تو بیت اللہ کے قریب سے اٹھا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں رکھوادیا تھا جہاں اب رکھا ہوا ہے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رکھوایا ہوا ہے یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم یہاں تک آئے ہیں۔

”وعھدنا الیٰ ابراھیم واسماعیل“ ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی طرف حکم بھیجا کہ

پاک صاف رکھو یہ حکم دوام کے لیے ہے اگر ہم اپنی زبان میں کہیں کہ پاک کرو تو شبہ پیدا ہوتا کہ شاید پہلے پاک نہ ہو اور ایک ہے اس کو صاف ستھرا رکھنا یعنی جس طرح پہلے صاف ستھرا ہے ظاہری نجاست سے بچا ہوا، باطنی نجاست سے بچا ہوا اسی طرح اس کو صاف ستھرا رکھو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں اور قبولیت کے آثار:

"واذقال ابراهیم رب اجعل هذا بلداامنا" اور یاد کیجئے جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اس جگہ کے متعلق کہ یا اللہ! اس جگہ کو بنادے شہر امن والا یہ دعا اس وقت کی تھی جب آپ اپنی بیوی اور بچہ کو یہاں بٹھا گئے تھے، اوران دونوں کے علاوہ یہاں کوئی آبادی نہیں تھی اور اللہ کے اشارے کے ساتھ یہاں بٹھا کے گئے تھے، پھر دعا کی یا اللہ اب تو یہ جنگل ہے، ویران ہے، اور وادی غیر ذی ذرع ہے، اس میں کوئی پیداوار نہیں ہے، میں اپنی اولاد کو یہاں چھوڑ کے جا رہا ہوں، یا اللہ! تو اس جگہ کو شہر بنادے اور شہر بھی امن والا اور پھر یہاں کے رہنے والے لوگوں کو ثمرات سے خوب رزق دے، اور میری یہ دعا صرف مومنوں کے لیے ہے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک مقام ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو ایک دعا سے نکال دیا تھا کہ عہدۂ نبوت ظالموں کو نہیں ملے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ادب کے طور آئندہ دعا ظالموں کے لیے کی ہی نہیں بلکہ یہ کہا کہ جو مؤمن ہوں گے میں ان کے لیے دعا کر رہا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رزق کا معاملہ عہدۂ نبوت والا نہیں ہے امامت اور نبوت ظالموں کو نہیں ملتی، رزق سب کے لیے عام ہے مومنوں کو بھی دوں گا کافروں کو بھی دوں گا، لیکن کافروں کے متعلق یہ بات ہے کہ تھوڑا سا کھلاؤں پلاؤں گا پھر گھسیٹ کے جہنم میں پھینک دوں گا۔

یعنی آخرت میں فرق ہوگا، مؤمن دنیا میں بھی رزق کھائے گا اور آخرت میں بھی خوشحال ہوگا، اور جو کفر کرے گا روٹی تو اس کو یہاں بھی ملے گی لیکن آخر اس کا انجام جہنم ہے، تو مؤمن اور کافر میں فرق آخرت میں نمایاں ہوگا، دنیا میں رزق دونوں کو ملے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے یہ اثرات ہیں کہ باوجود اس بات کے کہ سبزہ وہاں نہیں ہوتا اور خشک پہاڑ ہیں اب یہ بھی ایک کمال کی بات ہے کہ یہ نہیں کہا کہ پہاڑوں کو ہٹا کر میدان بنادے تاکہ میری اولاد یہاں ہل چلایا کرے اور یہیں پھل پیدا ہوں، اور یہ سارے کاشتکار بن کے بیٹھ جائیں یہ مطلب نہیں ہے کیونکہ ان کو یہاں کاشتکاری کے لیے نہیں بٹھایا تھا وہ تو " اسکنت " میں نے آباد کیا تھا " لیقیموا الصلوۃ" تاکہ یہ تیری نماز پڑھیں اور تیرے گھر کو آباد کریں۔

تیری عبادت کریں اس لیے ان کو اس دھندے میں نہیں ڈالنا کہ یہ خود کاشتکاری کریں " وارزق اهله من

الثمرات " تو رزق دے ان کو ثمرات سے، اب رزق پیدا کہیں ہوگا اور آئے گا مکہ معظمہ میں، اور اس وقت سے دنیا اس نقشہ کو دیکھ رہی ہے کہ جتنی وسعت رزق کی مکہ معظمہ میں ہے شاید دنیا کے کسی خطہ میں نہیں ہے۔

دنیا کے ہر حصہ میں پیدا ہونے والا پھل، اور دنیا کے ہر حصہ میں پیدا ہونے والی سبزی مکہ معظمہ میں آپ کو سب مل جائیں گی اور شاید اتنی کثرت کے ساتھ پھل فروٹ کسی دوسرے ملک میں نہ جاتا ہو جتنا مکہ معظمہ میں جاتا ہے اور تقریباً ہر موسم میں ہر پھل موجود ہے۔

کیونکہ آم یہاں اگر ختم ہوگیا تو افریقہ کے ممالک میں ہے، کیلا اگر ادھر ختم ہوگیا تو لبنان میں ہے، اور ہر چیز سمٹ سمٹ کے مکہ معظمہ میں آرہی ہے اور پھر ایک دعا کی تھی کہ میں اپنی اولاد کو بٹھا کے جارہا ہوں کہیں یہ اکیلے ہی نہ رہ جائیں بلکہ دعا کی کہ لوگوں کے دل بھی ان کی طرف مائل کردے، تو اللہ تعالیٰ نے دل ایسے مائل کیے کہ تڑپ کے لوگ مکہ کی طرف بھاگ بھاگ کے جاتے ہیں، اور جو ایک دفعہ ہو کے آتا ہے اس کا شوق بڑھ جاتا ہے، کم نہیں ہوتا، اور مفسرین، واعظین نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کرتے ہوئے کہا کہ بعض لوگوں کے دل مائل کردے اور اگر سارے کا ہی کہہ دیتے تو ساری دنیا مکہ میں اُمڈ آتی، اب ہر علاقہ، ہر آبادی سے چن چن کے اس طرح لوگ آتے ہیں کہ مکہ کی رونق بحال ہے تو جتنی دعائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیں تھی اللہ نے ساری قبول کرلیں، رزق وسعت سے دیا، دل اس کی طرف مائل کردیے شہر اس کو بنادیا۔

اور پھر ایک دعا تھی کہ ہماری اس تعمیر کو قبول کر وہ بھی ایسی قبول ہوئی کہ لوگوں میں بھی اس کو محبوبیت کا درجہ حاصل ہوگیا اور قیامت تک آنے والی امت کے لیے مرکز بن گیا کہ اس طرف رخ کرکے نماز پڑھیں اسی ضمن میں یہ دعا آئی کہ ہماری اولاد میں سے ایک جماعت اٹھانا جو تیری فرمانبردار ہو اور ان میں سے ایک رسول اٹھانا یہ ہے اصل میں مقصد یہاں کہنے سے کہ یہ جو رسول ہے یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا نتیجہ ہے جس طرح باقی دعاؤں کی قبولیت تم نے آنکھوں سے دیکھ لی اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لو اس لیے یہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کے مطابق ظاہر ہوا ہے اب اس کو مان لینا اور اس کو اپنا لینا اس کے طریقہ پہ چلنا یہی ملت ابراہیمی ہے۔

" ربنا وابعث فیھم رسولا من انفسھم " اور پھر یہ دعا بھی کی اے ہمارے پروردگار! بھیج ان لوگوں میں سے ایک رسول تو اب یہ رسول وہ ہوگا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بھی ہو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بھی ہو اس دعا کا صراحتاً مصداق وہ رسول ہوگا، کیونکہ دعا کرنے والے حضرت ابرہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں تو اس سے معلوم ہوگیا کہ ایک پیغمبر لازماً ایسا آنا چاہیے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام

واسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو اور وہ سوائے اس آمنہ کے لال کے کوئی دوسرا نہیں ہے اور پھر رسول کی صفات ذکر کیں کہ ان پر آیات پڑھے یہ الفاظ کی تلاوت ہے اور پھر اس کتاب کی تعلیم دے تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مطلب سمجھایا جائے۔

کیونکہ صرف ترجمہ کو پڑھ لینا مقصد سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے معلم ساتھ بھیجا تا کہ اس کی تفسیر سمجھ میں آجائے، اس کا مطلب اور مقصد سمجھ میں آئے، جس طرح آپ ڈاکٹری کی کتاب اٹھالیں انگریزی میں اور ایک انگریزی خواں اس کا ترجمہ کرتا چلا جائے تو اس سے آپ ڈاکٹر تو نہیں بن جائیں گے بلکہ استاد ساتھ ہوگا جو آپ کو پریکٹیکل بھی کرائے گا تو تب جا کے وہ فن سمجھ میں آئے گا اور روحانیات میں بھی اسی طرح ہے کہ صرف الفاظ کو پڑھ لینا یا اس کے معانی کا جان لینا یہ ماہر بننے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ معلم کی ضرورت ہوتی ہے جو کتاب کا مفہوم بھی سمجھائے اور اس میں سے راز کی باتیں بھی بتائے جو اجتہاد و استنباط کے ساتھ ثابت ہوتی ہیں جو سنت کی شکل میں ہمارے سامنے جمع ہو گئیں۔

تزکیہ کا مفہوم:

اور آگے فرمایا ویزکیھم اور وہ رسول ان کا تزکیہ بھی کرے۔ اور تزکیہ یہ باب تفعیل کا مصدر ہے جس کا مفہوم دو طرح سے ادا کیا جاتا ہے پاک صاف کرنا اور نشو ونما دینا، بڑھانا جیسا کہ زکوٰۃ کے لفظ میں دونوں مفہوم ذکر کیے جاتے ہیں کہ زکوٰۃ پاکیزگی کو بھی کہتے ہیں اور بڑھنے کو بھی کہتے ہیں تو یزکیھم میں تزکیہ جو رسول کا فعل ذکر کیا گیا ہے یہ ایک عمل سکھانے کی بات ہے کہ صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ عمل بھی کروائے جس کے ساتھ قلوب اور اذہان صاف ستھرے ہوں اس کے پھر دو شعبے ہوا کرتے ہیں ایک ہے تخلیہ اور ایک ہے تجلیہ، تخلیہ کا معنیٰ ہوتا ہے رزائل سے قلوب کو خالی کرنا، گھٹیا قسم کی عادتیں، گھٹیا قسم کے جذبات کینہ، بغض، حب دنیا اور ذکر الٰہی سے غفلت یہ قلوب کے اندر جو رزائل ہوتے ہیں ان کو دور کرنا یہ تخلیہ کہلاتا ہے۔

تجلیہ کا مفہوم ہوتا ہے کہ قلب کو فضائل کا عادی بنانا اس کے اندر للٰہیت اور خلوص پیدا کرنا، شکر اور محبت الٰہی کے جذبات کو ابھارنا یہ تجلیہ کہلاتا ہے، اور جب تخلیہ اور تجلیہ دونوں کام ہو جائیں تو پھر تزکیہ مکمل ہو جاتا ہے تخلیہ گویا کہ صاف ستھرا کرنے کا مفہوم ہے اور تجلیہ اچھی صفات کے نشو ونما کا مصداق ہے۔

امت مجموعی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث ہے:

تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں تین کام ذکر کیے گئے، تلاوت کتاب، تعلیم کتاب وحکمت، تزکیہ، امت مجموعی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وارث ہے۔

اب اللہ تعالیٰ یہ تینوں شانیں بعض افراد میں تو درجہ بدرجہ جمع فرما دیتے ہیں ورنہ یہ تین فن بن گئے اور تین شعبوں میں اس کام کو تقسیم کر دیا گیا، تلاوت کتاب یہ قاریوں اور حافظوں کے حصہ میں آ گئی، اور تعلیم کتاب وحکمت یہ علماء کے حصہ میں آ گئی۔

اور تزکیہ یہ مشائخ اور صوفیاء کے حصہ میں آ گیا، تو یہ خانقاہیں، دارالقرآن، مدرسے، یہ علیحدہ علیحدہ سرورکائنات ﷺ کی ان تینوں شانوں کا مظہر ہیں اور امت مجموعی طور پر حضور ﷺ کی ان چیزوں کی وارث ہے تو صوفیاء کرام جو کام کرتے ہیں وہ بھی حضور ﷺ کی نیابت ہی ہے، یہ تینوں کام سرورکائنات ﷺ کے ہیں اور تینوں کام کرنے والے حضور ﷺ کے وارث ہیں اور جتنا اللہ تعالیٰ جس کو جس صفت میں سے حصہ دے دے اتنا وہ نبی کا وارث سمجھا جائے گا آخر میں صفت ذکر کر دی ''انك انت العزيز الحكيم ''عزیز کا مطلب زبردست، غالب جو ساری کائنات میں زبردست بھی ہے اور اپنی ساری مخلوق پر غالب بھی ہے لیکن غالب ہونے کے باوجود یہ نہیں کہ وہ جو چاہے کرے اور حکمت ودانائی کی رعایت بھی نہ رکھے بلکہ ساتھ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہیں اور ان کا ہر کام حکمت، دانائی اور دانشمندی پر مشتمل ہے ان دونوں صفتوں کو ذکر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دعائیں قبول کرنا تیرے اختیار میں بھی ہے، اور تیری حکمت کا تقاضہ بھی ہے کہ تو اپنی مخلوق کی تربیت کا انتظام کرے جس طرح اس کے لیے ظاہری آسائش اور ظاہری آرام کا انتظام کیا جاتا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

کون اعراض کرتا ہے ابراہیم کے طریقہ سے سوائے اس شخص کے جو اپنی ذات میں ہی جاہل ہے

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾

البتہ تحقیق چن لیا ہم نے اس ابراہیم کو دنیا میں اور بے شک وہ ابراہیم آخرت میں البتہ اچھے لوگوں میں سے ہوگا ﴿۱۳۰﴾

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

جب کہا ابراہیم کو اس کے رب نے کہ تو فرمانبردار ہو جا تو ابراہیم نے کہا میں فرمانبردار ہو گیا رب العالمین کے لیے ﴿۱۳۱﴾

وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی

وصیت کی اسی ملت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے اے میرے بیٹو! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے

لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ

تمہارے لیے ایک دین پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم فرمانبردار رہو ﴿۱۳۲﴾ کیا تم حاضر تھے

اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ

جبکہ یعقوب کے پاس موت حاضر ہوئی تھی جب کہا یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ

یعقوب کے بیٹوں نے کہا تھا کہ ہم عبادت کریں گے تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی

اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا

اور وہ ایک ہی اللہ ہے۔ اور ہم اسی کے لیے فرمانبردار ہیں ﴿۱۳۳﴾ یہ ایک جماعت ہے جو گزر گئی اس جماعت کے لیے وہ چیز ہے جو

كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ

انہوں نے کمائی اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی اور تم پوچھے نہیں جاؤ گے اس چیز کے متعلق جو وہ کرتے رہے ﴿۱۳۴﴾ اور

قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہو جاؤ تم یہودی یا نصرانی تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے آپ انہیں کہہ دیجیے کہ ہم اتباع کریں گے اس ابراہیم

حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا

کے طریقہ کی جو مخلص تھا اور نہیں تھا وہ مشرکوں میں سے (۱۳۵) تم کہہ دو ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور اس چیز پر ایمان لے آئے جو

أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ

ہماری طرف اتاری گئی اور ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ابراہیم پر اتاری گئی اور اسماعیل کی طرف اور اسحاق کی طرف اور یعقوب

وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن

اور اولاد یعقوب کی طرف اور ہم ایمان لے آئے اس چیز پر جو دیے گئے موسیٰ اور عیسیٰ اور جو کچھ بھی انبیاء دیے گئے

رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾

ان کے رب کی جانب سے ہم ان انبیاء میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے (ایمان لانے میں) اور ہم اس اللہ کے لیے فرمانبردار ہیں (۱۳۶)

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا

اگر یہ (یہود و نصاری) ایمان لے آئیں اس جیسی چیز کے ساتھ جس پہ تم ایمان لائے ہو تو یہ ہدایت یافتہ ہوں گے اور اگر یہ پیٹھ پھیریں پس بے شک

هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

یہ لوگ ضد میں ہیں، پس عنقریب کافی ہو جائے گا تیرے لیے اللہ ان کے مقابلہ میں اور وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے (۱۳۷)

صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

ہم تو اللہ کے رنگ کا التزام کریں گے اور کون زیادہ اچھا ہے اللہ سے از روئے رنگنے کے اور ہم اس کے لیے عبادت گزار ہیں (۱۳۸)

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا

آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے معاملہ میں اور وہ ہمارا بھی رب ہے تمہارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال

وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ

اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم سب اس کے لیے مخلص ہیں (۱۳۹) کیا تم کہتے ہو کہ

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ

بے شک ابراہیم اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب

كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ

یہ یہودی تھے یا نصرانی تھے آپ ان سے پوچھیے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے، کون

اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو چھپائے شہادت کو جو اس کے پاس موجود ہو اللہ کی جانب سے، اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ
ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک جماعت ہے جو گزرگئی ان کے لیے وہ چیز ہے جو انہوں نے کمائی
وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾
اور تمہارے لیے وہ چیز ہے جو تم نے کمائی اور نہیں سوال کیے جاؤ گے تم ان چیزوں کے متعلق جو وہ کیا کرتے ہیں ﴿۱۴۱﴾

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ کر کے بیت اللہ کا تعلق ان کے ساتھ واضح کیا گیا اور امت مسلمہ کی نشاندہی کی گئی اور ایک رسول کا ذکر آیا جس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام واسماعیل علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اس رسول کا مصداق وہی ہو سکتا ہے جو ان دونوں کی اولاد سے ہو اس سے تاریخی طور پر مکہ معظمہ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کی اولاد میں سے ہونا ان چیزوں کی وضاحت ہوگئی اب آگے بتایا جارہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ طریقہ جو ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہی ہے اور قیامت تک کے لیے ملت ابراہیمی میں نجات بند ہے اور وہ ملت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ملت ہے۔

ملت ابراہیمی کی اہمیت:

"ومن یرغب عن ملة ابراھیم" یرغب اس کا صلہ فی آئے تو شوق کے معنی میں ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے رغبتُ فیہ مجھے اس میں رغبت ہے، اور جس وقت اس کا صلہ عن آجائے تو اس میں اعراض والا معنی ہوتا ہے قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے "اراغبٌ انت عن آلھتی یا ابراھیم" اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے اعراض کرنے والا ہے، اور یہاں بھی رغب کا صلہ عن ہے۔

پہلے تو اس کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے کہ ملت ابراہیمی سے اعراض کرنا کسی احمق کا کام ہی ہو سکتا ہے، عقل مند آدمی ملت ابراہیمی کو چھوڑ نہیں سکتا، یہی ملت ہے جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فضیلت دی اور آخرت میں بھی وہ اعلیٰ درجہ والے ہوں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام دنیا میں

بھی اللہ کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہیں اور آخرت میں بھی اعلیٰ درجہ کے شائستہ اور لائق لوگوں میں سے ہوں گے تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مقام ہے تو جو ان کا طریقہ ہوگا وہ بھی اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کا ایک ذریعہ ہے اس لیے ملت ابراہیمی میں نجات ہے اور ملت ابراہیمی کو قبول کرنا یہ عقل مندی ہے اور اس سے اعراض کرنا حماقت ہے۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت:

"اذقال له ربه اسلم" اب آگے تفصیل ہے کہ ملت ابراہیمی ہے کیا چیز؟ تو فرمایا کہ ملت ابراہیمی اسلام ہے اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے اس کو مان لینا، ٹھیک ہے ایک وقت میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا اللہ تعالیٰ کا مطالبہ تھا اس وقت اسلام یہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھو اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئے تو ملت ابراہیمی کا تقاضہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو مانو اور اب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے جن کی نبوت ورسالت دلیل کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے تو اب ملت ابراہیمی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو مانو یہودیت کا ایک عنوان متعین کر کے، یا نصرانیت کا ایک عنوان متعین کر کے کہ یہ دین جو کہ اصول وفروع کا مجموعہ ہے یہ کہنا کہ یہی ملت ابراہیمی ہے اور ہمیشہ یہی رہے گی یہ غلط بات ہے۔

یہودیت یہ کوئی عنوان نہیں ملت ابراہیمی کا، نصرانیت یہ کوئی عنوان نہیں ہے ملت ابراہیمی کا، چاہے ایک وقت میں ملت ابراہیمی اس شکل میں متشکل ہوئی جس کو یہودیت کہتے ہیں، نصرانیت کہتے ہیں ایک وقت میں یہودیت حق تھا، ایک وقت میں نصرانیت حق تھا، اور دوسرے وقت میں جو اللہ کا حکم آجائے گا اس کو تسلیم کرنا یہی ملت ابراہیمی ہے اور اپنے قائم کیے ہوئے عنوان پر جمے رہنا یہ غلط بات ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے فرمانبرداری کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آجائے اس کو مان لو اور یہ ماننا ہی اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو کہ رب العالمین ہے، رب العالمین ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے جو احکام ہیں ہماری تربیت کے وہی مطابق ہیں، ہماری پرورش کے لائق وہی ہیں، ان کو تسلیم کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہی واضح طریقہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام نے اسی ملت کی وصیت کی تھی:

"ووصّٰی بها ابراهیم بنیه ویعقوب" اور اسی ملت کی انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی تو تمہارے جد اعلیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام یا جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا تھا کہ کچھ

ہو جائے تم نے یہودی ہی رہنا ہے انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ زمانہ کیسا ہی آجائے تم نے نصرانی ہی رہنا ہے انہوں نے تو یہ وصیت کی تھی کہ اللہ کے فرمانبردار بن کے رہنا۔

اگر ایک وقت میں یہودیت قبول کرنا فرمانبرداری ہے تو یہودیت ہی قبول کرنا گویا کہ وصیت ہے اور ایک وقت میں نصرانیت اگر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے تو نصرانیت کو ہی قبول کرنا ان کی وصیت کا تقاضہ ہے لیکن ان عنوانوں کے اوپر جمے رہنے کی وصیت کوئی نہیں اللہ کی طرف سے جو حکم آجائے اس کو قبول کرنے کی ان کی طرف سے وصیت ہے اسی ملت کی حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی اور ان الفاظ کے ساتھ کی تھی کہ اے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہارے لیے ایک دین پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم صاحب اسلام ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ مرتے دم تک تم نے اسلام کے اوپر جمے رہنا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے بھی ملت ابراہیمی پر قائم رہنے کا عہد کیا:

"ام کنتم شهداء اذ حضر یعقوب الموت" اور عیسائی یہودی جو کہتے تھے کہ ہمیں وصیت یہودیت کی ہے اور نصرانیت کی ہے اس کی تردید کے لیے یہ لفظ بولے جا رہے ہیں کہ کیا تم اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس موت آئی تھی جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد تم کس چیز کی عبادت کرو گے۔

عبادت کا مفہوم پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ بندگی کا تعلق رکھنا اور بندگی کے تعلق کا حاصل بھی یہ ہے کہ جو حکم آئے اس کو بندوں کی طرح مان لیا جائے، تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے کہا تھا کہ ہم عبادت کریں گے تیرے الٰہ کی اور تیرے بزرگوں کے الٰہ کی اور بزرگوں سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام ہیں جو کہ ایک ہی الٰہ ہے یہ بدل ہو گیا ما قبل سے تو اس کا معنیٰ ہوگا "نعبد الٰهاً واحداً" کیونکہ مبدل منہ کو ہٹا کر بدل کو وہاں رکھ دیا جائے تو مفہوم صحیح رہتا ہے کہ ہم الٰہ واحد کی عبادت کریں گے اور اس کا تعارف یہ ہے کہ وہی تیرا خدا ہے اور وہی تیرے بڑوں کا خدا ہے تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یہ معاہدہ کیا تھا۔

قیامت کے دن سوال عمل کے متعلق ہوگا نسب کے متعلق نہیں:

"تلك امة قد خلت" اب تم اپنے آپ کو منسوب تو ان کی طرف کرتے ہو لیکن ان کا طریقہ تم نے چھوڑ دیا اور اسی نسبت کے اوپر تم فخر کرتے ہو کہ ہم ان کی اولاد ہیں اور پھر آخرت میں اسی نسبت کی بناء پر نجات کے متمنی ہو کہ چونکہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں اس لیے آخرت میں ضرور بخشے جائیں گے اس پر اللہ تعالیٰ نے ضرب لگائی ہے کہ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی وہ اپنا کردار ساتھ لے گئی تمہارے لیے تمہارا کردار ہوگا۔

تمہارے سامنے تو ان کے کاموں کا تذکرہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ کیا کیا کرتے تھے اس لیے ان کے کارناموں پر تمہارا فخر آخرت میں نجات کے لیے کافی نہیں ہے، آخرت میں نجات ہوگی اپنے کارناموں کی بناء پر جیسے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے گلستان میں ایک بدوی کی نصیحت اپنے بیٹے کو ذکر کی ہے کہ "یا بنیّ انك مسئولٌ یوم القیامۃ ماذا کسبت ولا تسئل عن نسبہ "بیٹا تجھ سے قیامت کے دن یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے کیا کیا ہے؟ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تو کس کی نسل سے ہے عملوں کے متعلق سوال ہوگا، نسب و نسل کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔

فخر بالآباء کی حقیقت:

اس لیے یہ فخر ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں مختصر سی بات ہے کہ اگر اولاد اپنے آباء کے ساتھ عقائد قطعیہ میں اختلاف رکھتی ہے جس اختلاف کے نتیجہ میں کفر و اسلام کا فرق پڑ گیا تو یہ نسب قطعاً مفید نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے عقائد ضروریہ میں اختلاف رکھتے تھے تو باپ ہونے والی نسبت کام نہیں آئے گی، نوح علیہ السلام کا بیٹا نوح علیہ السلام سے اختلاف رکھتا تھا تو یہ بیٹا ہونا کام نہیں آئے گا، حضرت لوط علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کی بیویاں اپنے خاوندوں سے اختلاف رکھتی تھیں تو یہ بیوی ہونا کام نہیں آئے گا، ابو طالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے ابولہب چچا تھا لیکن نسبی تعلق کام نہیں آئے گا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اعلان نبوت فرمایا تو صاف اعلان کر دیا تھا کہ اپنے آپ کو عذاب سے بچالو میں اللہ کے مقابلہ میں تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا، یہ تو بنیادی طور پر بات ہے کہ اگر اولاد کا اپنے آباء کے ساتھ عقائد ضروریہ میں اختلاف ہوگیا تو پھر نسب مفید نہیں نہ اوپر سے نہ نیچے سے یعنی بیٹے کا اچھا ہونا باپ کے کام نہیں آئے گا باپ کا اچھا ہونا بیٹے کے کام نہیں آئے گا، خاوند کا اچھا ہونا بیوی کے کام نہیں آئے گا بیوی کا اچھا ہونا خاوند کے کام نہیں آئے گا۔

جیسا کہ سورۃ التحریم کے اندر دوسری مثال یہ بھی دی کہ فرعون کی بیوی بخشی جائے گی لیکن فرعون کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر وہ عقائد ضروریہ میں متبع ہے یعنی مؤمن ہے تو ایسی صورت میں فائدہ پہنچ سکتا ہے کہ اگر ماں باپ بھی جنت میں ہوئے اور اولاد اپنے اعمال کی بناء پر جنت میں چلی گئی تو ماں باپ کی سفارش کے ساتھ اولاد کے درجات بھی بلند ہوسکتے ہیں جیسا کہ سورۃ الطور میں ہے "الحقنابھم ذریتھم وماالتناھم من عملھم من شئی" ہم ان مؤمنین کی اولاد کو ان کے ساتھ لاحق کردیں گے اور ان کے عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں کریں گے یعنی ان میں برابری کردی جائے گی۔

لیکن اس طرح نہیں کہ ماں باپ کے عمل کو کم کر کے اولاد کا عمل بڑھا دیا جائے ایسا نہیں ہوگا، بلکہ وہ اپنے عمل کے مطابق اونچے درجہ میں رہیں گے اور اولاد کو ترقی دے کے ان کے برابر کر دیا جائے گا، مؤمن ہونے کی صورت میں ماں باپ کا اچھا ہونا اولاد کے لیے مفید ہو سکتا ہے " الحقنا بهم ذريتهم " کے اندر پھر یہ تعمیم بھی کی ہے کہ جس طرح ماں باپ کا اچھا ہونا اولاد کے لیے مفید ہو سکتا ہے اسی طرح اساتذہ مشائخ کے ساتھ تعلق یہ بھی دونوں طرف سے مفید ہو سکتا ہے یہ اگرچہ نسب نہیں ہے۔

لیکن نسبت ہے اس لیے یہ نسبت آخرت میں مفید ہو سکتی ہے، لیکن اس بات کو یاد رکھیں کہ یہ مفید ہونا موقوف اس بات پر ہے کہ خاتمہ ایمان پر ہو لیکن کس کے پاس یہ ڈگری ہے کہ میرا خاتمہ ایمان پر ہوگا؟ جب یہ سرٹیفکیٹ نہیں ہے تو پھر دنیا کے اندر رہتے ہوئے اس نسبت پر فخر کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ملت ابراہیمی کی تفصیل:

" وقالوا كونوا هودا " اور یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے اسی مضمون کی آیتیں آپ کے سامنے پہلے بھی گزر چکی ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہدایت یا یہودیت میں بند ہے یا نصرانیت میں بند ہے آپ کہہ دیجئے کہ نہیں بلکہ ہدایت ملت ابراہیمی میں بند ہے اس لیے ہم تو ملت ابراہیمی کو لیں گے اور ابرہیم علیہ السلام کی ملت کے امتیازات میں سے یہ امتیاز ہے کہ اس میں شرک کی آمیزش نہیں ہے اور تمہارے طریقوں میں شرک آچکا ہے اس لیے یہ ہدایت کیسے ہوئی جن میں شرک کی آمیزش آگئی اس کا ملت ابراہیمی سے کیا تعلق ہے؟ ملت ابراہیمی کی تفصیل تو یہ ہے جو ہم نے اختیار کر رکھی ہے آگے اس کی تفصیل ہے کہ ہم اللہ پہ ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہم پر اتارا گیا ہم نے وہ بھی مانا، اور جو انبیاء علیہم السلام سابقین پر اتارا گیا ہم نے اس کو بھی مانا ہمیں کسی کے ساتھ ضد نہیں کہ چونکہ ہم فلاں پر ایمان لائے ہیں اس لیے فلاں پر نہیں لائیں گے یہ ملت ابراہیمی نہیں ہے اسلام کا تقاضہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو آجائے سب مانو جو ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر اتارا گیا ہم سب پر ایمان لائے اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام پر اتارا گیا ہم اس پر بھی ایمان لائے ہم محمدی کہلا کر موسوی ہونے کے مخالف نہیں ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی ویسے ہی مانتے ہیں جیسے اپنے پیغمبر کو مانتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایسے ہی مانتے ہیں اور یہ تمہاری ضد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو مان لیا تو عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانا، عیسیٰ علیہ السلام کو مان لیا

تو حضور علیہ السلام کو نہیں ماننا اس قسم کی ضد ہمارے اندر نہیں ہے ہم تو ملت ابراہیمی پر ہیں اور یہ سارے ملت ابراہیمی کے تقاضے ہیں جو کچھ بھی نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان نبیوں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں ڈالتے کہ فلاں ہماری پارٹی کا ہے اور فلاں ہماری پارٹی کا نہیں ہے ہم ان کے فرقے بنالیں اور کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ ہماری عادت نہیں، ہم سب کو مانتے ہیں، یہاں فرق سے مراد ایمان لانے میں فرق کرنا ہے کہ کسی پر ایمان لائیں کسی پر ایمان نہ لائیں، فرق مراتب مراد نہیں ہے فرق مراتب منصوص ہے اور حاصل سب کا یہی ہے" نحن له مسلمون " یہی ملت اسلامیہ ہے جو مختلف عنوانات کے ساتھ آپ کے سامنے چلی آ رہی ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم معیار حق ہیں:

" فان اٰمنوا " اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں اس طرح جس طرح تم ایمان لائے ہو تو یہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے یعنی جدھر یہ تم کو بلاتے ہیں وہ ہدایت کا راستہ نہیں، ہدایت کا راستہ یہ ہے جس کی تفصیل اوپر ذکر کر دی گئی ہے اور یہ اٰمنتم کا خطاب صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضور علیہ السلام کو ہے جس میں ایمان کا ایک معیار بھی بیان کر دیا گیا کہ ایمان صحیح وہی ہے اس طرح لاؤ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت لائی ہے اور اگر ایمان لانے کی یہ صورت اختیار نہیں کریں گے تو پھر وہ ایمان بھی مقبول نہیں ہے، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان میں معیار ہیں، جنت کو کس طرح ماننا ہے؟ دوزخ کو کس طرح ماننا ہے؟ قیامت کو کیسے تسلیم کرنا ہے؟ برزخ کو کس طرح تسلیم کرنا ہے؟ ان سب معاملات میں معیار صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم ایمان لائے ہیں یہ بھی اگر اسی طرح ایمان لائیں گے تو ہدایت یافتہ ہوں گے یعنی ہدایت کا معیار صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت ہے۔

"وان تولوا فانما هم في شقاق" اور اگر اعراض کریں، اس معیار کو قبول نہ کریں، اپنی خواہشات نفس کے پیچھے چلیں تو آپ پریشان نہ ہوں یہ ضد میں پڑے ہوئے ہیں اور ضد کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے ، حق سے اعراض کرتے ہیں دنیا کے اندر اللہ نے ان کو تھوڑی سی ڈھیل دی ہوئی ہے عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے ان کو کافی ہو جائے گا اور ان کے مکر و فریب کو تم سے دور کر دے گا، یہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہوں گے، آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے ان کے یہ مکر و فریب اللہ سے مخفی نہیں ہیں وہ ان کی باتوں کو سنتا اور جانتا بھی ہے اور اللہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرے گا، گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس آیت کے اندر تسلی

دی گئی ہے کہ ان کے نہ ماننے کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر یہ ایمان لائیں گے تو ان کا اپنا فائدہ ہے یہ ہدایت والے ہو جائیں گے اور اگر نہیں مانتے تو ان کا اپنا نقصان ہے آپ پریشان نہ ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو پکڑے گا اور وہ ان کی حرکتوں سے خوب واقف ہے۔

صبغة اللہ ومن احسن من اللہ صبغة کا شان نزول:

آیت کے شان نزول میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ نصاریٰ کا طریقہ تھا کہ جب بچہ سات دن کا ہوتا تھا تو اس کا ختنہ کرنے کی بجائے اس کو پانی میں رنگ دیتے تھے اور اس پانی کو معمودی کہتے تھے، اور اس عمل کو وہ ختنہ کے قائم مقام قرار دیتے تھے۔

مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ بچہ اب پاک ہو گیا اور پکا نصرانی ہو گیا جیسا کہ آج کل بھی جس کو نصرانی بناتے ہیں اس کو بپتسمہ کے نام سے ایک خاص پانی میں نہلاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کے اس باطل نظریہ کی تردید فرمائی اور کہا اصل رنگ تو وہی ہے جس میں اللہ نے اپنے مؤمن بندوں کو رنگ دیا ہے اور کون ہے وہ شخص جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ کے رنگنے کی حالت سے اچھی ہو اور اس رنگ سے ایمان اور اعمال صالحہ کا رنگ مراد ہے۔

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ:

جیسا کہ اسی صبغہ کے لفظ کے اوپر حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر بیان فرمایا کرتے تھے اور ان کے ملفوظات میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ رنگساز ہے، علماء رنگ فروش ہیں، اور صوفیاء رنگ ریز ہیں کہ دین بنایا تو اللہ نے، علماء رنگ بیچتے ہیں، ان کی دوکانوں سے دین کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے باقی طبیعت کے اندر اس کو رچا دینا اور دین کا رنگ چڑھا دینا یہ مشائخ کا کام ہے، اور رنگ چڑھانا یہی تزکیہ ہے جس کا تذکرہ پیچھے آیا ہے اس کی وضاحت فرماتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ میرے پاس فارغ التحصیل علماء پڑھنے کے لیے آتے ہیں، اگر انہیں یہ کہہ دیا جائے کہ تہجد کی فضیلت پر تقریر کرو تو وہ دو گھنٹے تک لچھے دار تقریر کر دیں گے لیکن جس وقت تہجد کا وقت آئے گا تو سوئے ہوئے ہوں گے فرض نمازوں تک کے پابند نہیں ہوتے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دوکان سے یہ رنگ تو ملتا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ یہ چیز اچھی ہے یہ چیز بری ہے، لیکن خود رنگے ہوئے نہیں ہوتے تو دوسرے کو کیا رنگ چڑھائیں گے اور پھر وہ تین ماہ میرے پاس رہتے ہیں تو اللہ کے فضل و کرم سے تہجد گزار ہو کے جاتے ہیں پھر دین کا رنگ چڑھتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں مؤمنین کو ایمان پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہمیں ایمان اور اعمال صالحہ کی توفیق دی ہے ہم اس پر جمے ہوئے ہیں، ہم اس رنگ کو نہیں چھوڑ سکتے اور اس کے ساتھ ساتھ نصاریٰ کے باطل نظریہ کی تردید بھی ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں تمہارے رنگنے کی کوئی حیثیت نہیں، اصل رنگ اللہ تعالیٰ کا ہے اور وہ سب سے اچھا رنگنے والا ہے اس سے اچھا رنگنے والا کوئی نہیں ہے اور ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے دعویٰ کی تردید:

"قل اتحاجوننا فی اللہ" ماقبل میں یہود کی اس دعوت کا ذکر ہوا جو وہ دوسروں کو دیا کرتے تھے "کونوا ھوداً او نصاریٰ تھتدوا" یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ، یہودی یہودیت کی دعوت دیتے نصاریٰ نصرانیت کی دعوت دیتے اور یہ کہتے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ" تھتدوا" تو ہدایت پا جاؤ گے اسی طرح ان کا دعویٰ یہ بھی نقل کیا گیا " قالوا لن ید خل الجنۃ الا من کان ھوداً او نصاریٰ" جنت میں صرف اور صرف وہ جائیں گے جو یہودی ہوں گے، یا نصرانی ہوں گے، یہودی اس چیز کے مدعی تھے کہ جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی ہوگا تو ان کے اس دعوے کی تردید کرنی مقصود ہے " اتحاجوننا "کیا تم ہمارے ساتھ جھگڑا کرتے ہو اللہ کے دین کے بارے میں اس سے مراد دین اسلام ہے، اللہ کے چناؤ کے بارے میں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل میں سے نبی کریم ﷺ کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا، تو اسی انتخاب الٰہی کے بارے میں، اللہ کے عطا کردہ دین کے بارے میں، اللہ کی عطا کردہ کتاب کے بارے میں تم ہمارے ساتھ جھگڑا کرتے ہو یہ استفہام انکاری ہے اور اس کے ساتھ ان کے اس دعوے پر رد بھی مقصود ہے اور زجر و توبیخ بھی مقصود ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ایک من دو من کا وزن ہو اور وہ اٹھانا ہو تو آپ کو کہا جائے کسی کو بلا کر لے آؤ جو یہ اٹھائے وہاں تک لے جائے تو بلانے والا بلا کر لے آئے کسی ایسے مریل بیمار کو تو اس کو دیکھ کر وزن اٹھوانے والا کہے، کیا یہ وزن اٹھالے گا؟ تجھے یہی ملا تھا کیا یہ وزن اٹھا سکتا ہے۔

اب بظاہر تو استفہام ہے کہ کیا یہ وزن اٹھا سکتا ہے لیکن مقصود انکار ہے، اور ساتھ ساتھ زجر و توبیخ بھی کہ یہ مریل بیمار اور وزن اٹھا سکتا ہے، کیا یہی ملا آپ کو، یہ انکار مقصود ہے اور زجر و توبیخ بھی تو یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے پر رد بھی فرمایا ساتھ ساتھ زجر و توبیخ بھی کی کہ کیا تم ہمارے ساتھ جھگڑا کرتے ہو اللہ کے دین کے بارے میں، اللہ کے چناؤ کے بارے میں، یعنی تمہیں ہمارے ساتھ اللہ کے دین کے بارے میں جھگڑا نہیں

کرنا چاہیئے " وھوربنا وربکم " یہ جھگڑا نہ کرنے کی ایک وجہ بیان کی کہ وہ ہمارا رب ہے اور تمہارا رب ہے، جب وہ ہمارا بھی رب ہے تمہارا بھی رب ہے، رب کہتے ہیں جس کی شان یہ ہو کہ وہ تمام مربوبین کے نفع نقصان کی تدبیر کرے وہ مدبّر الامور ہو اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ جو اپنے بندوں کے تمام امور کے نفع ونقصان کی تدبیر کرنے والا ہے "وھو ربنا وربکم " وہ صرف تمہارا رب نہیں وہ تمہارا بھی رب ہے ہمارا بھی وہ رب ہے جب وہ ہمارا اور تمہارا مشترکہ رب ہے تو پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مصلحت اور حکمت کا جو تقاضہ ہوگا جن میں سے نبی منتخب کرنے کا، وہ انہی میں سے نبی منتخب کرے گا اسی نبی پر کتاب اتارے گا اسی کے ذریعہ وہ دین اتارے گا، یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کا تقاضہ ہوگا۔

ہاں اگر وہ صرف تمہارا رب ہوتا دوسروں کا رب نہ ہوتا تو پھر تو تم اپنے آپ کو ترجیح دے سکتے تھے کہ جب وہ ہمارا رب ہے تو پھر منصب نبوت کے لیے کسی شخصیت کا انتخاب بھی ہم میں سے ہوا کرے، جب وہ صرف تمہارا رب ہوتا، پھر تم یہ کہہ سکتے تھے کہ رب تو ہمارا ہے اور منصب نبوت کسی اور کو دیتا ہے اور نبوت والا اعزاز دوسروں کو بخشتا ہے۔

لیکن وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے تو اس کی حکمت کا جن میں سے نبی بنانے کا جو تقاضہ ہوگا، وہ ان میں سے نبی منتخب کرے گا تو یہ اعتراض کرنا یہ گویا کہ رب کی ربوبیت پر اعتراض ہے اور یہ اپنے آپ کو نبوت کا مستحق قرار دینا اور دوسری قوموں سے نبی ہونے کا انکار کرنا اور اس پر اعتراض کرنا یہ غلط ہے" وھو ربنا وربکم ولنا اعمالنا ولکم اعمالکم "ہمارے لیے ہمارے اعمال تمہارے لیے تمہارے اعمال۔

یہاں پر مضاف محذوف نکالتے ہیں مفسرین " ولنا جزاء اعمالنا ولکم جزاء اعمالکم "ہمارے لیے ہمارے اعمال کی جزا اور تمہارے لیے تمہارے اعمال کی جزا، ہمارے اعمال کا صلہ ہمیں ملے گا تمہارے اعمال کا صلہ تمہیں ملے گا تو ہمارے اعمال کے اندر ایسے اعمال ہو سکتے ہیں" فنستحق بہ الاکرام " کہ جن کی وجہ سے ہم اس اکرام کے مستحق ہو جائیں ہمارے لیے ہمارے اعمال تمہارے لیے تمہارے اعمال لہٰذا یہ اعتراض بھی بے جا ہے کہ بنو اسماعیل سے نبی کیوں منتخب کیا، ہمارے اندر یہ اعمال ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ عزت دینے کا فیصلہ فرمالیں " اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" اللہ خوب جانتا ہے کہ رسالت والی عزت کس کو بخشے، منصب نبوت کس کو عطا کرے، کس قوم سے نبی بنائے اللہ اس کو خوب جانتے ہیں اسی طرح اس میں یہ تردید بھی ہوگئی جو یہودی کہا کرتے تھے کہ جنت میں جانے کے لیے صرف یہودی ہو جانا کافی ہے آگے اس کا عقیدہ عمل جو بھی ہو" لن یدخل الجنۃ الا

من کان ھوداً اونصاریٰ "بس یہودیت کا ٹھپہ لگ جائے ،نصرانیت کا ٹھپہ لگ جائے کہ ہو یہودی یا نصرانی پس وہ پکا ٹھکا جنتی ،عقیدہ جو بھی ہو عمل جو بھی ہو، جو کرتوت بھی کرے وہ جنت میں جائے گا تو اس کی بھی تردید ہوگئی "لنا اعمالنا ولکم اعمالکم "اللہ کے ہاں جو فیصلہ ہوگا وہ محض قومیت کی بناء پر نہیں ہوگا۔

کہ یہ فلاں قوم کا فرد ہے، لہٰذا یہ جنت میں جائے ،فلاں قوم کا فرد ہے اس کو دوزخ میں ہی ہر حال میں بھیجنا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں جنت اور دوزخ میں جانے کا معیار عقیدہ اور عمل ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا " قالوا لن یدخل الجنة الا من کان ھوداً اونصاریٰ" آگے فرمایا "تلك امانیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین بلیٰ من اسلم وجھه لله وھو محسن فله اجرہ عند ربه ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون "وہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے اسی انداز سے تردید فرمائی کہ جنتی ہونے کا معیار یہودیت یا نصرانیت نہیں جنتی ہونے کا معیار یہ ہے" من اسلم وجھه لله وھو محسن فله اجرہ عندربه ولاخوف علیھم ولا ھم یحزنون، ونحن له مخلصون " یہ لہٗ، مخلصون کے متعلق ہے اور ہم خالص کرنے والے ہیں اس کے لیے ہی عبادت کو جیسے" مخلصین له الدین " ہے، اس کے لیے عبادت کو خالص کرنے والے ہیں۔

جب ہم خالص اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو" قالت الیھود عزیر ابن الله وقالت النصاریٰ المسیح ابن الله" تو یہ شرک کے مرتکب تھے اور ہم موحد ہیں خالص اللہ کی ہی ربوبیت کے قائل، اللہ کی ہی الوہیت کے قائل، اللہ کی ہی عبادت کرنے والے، لہٰذا جب ہم خالص اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں اللہ کے ساتھ ربوبیت میں، الوہیت میں، عبادت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تو یہ اعزاز ان کو ملنا چاہئے جو صرف اور صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اللہ کو ہی الٰہ مانتے ہیں اللہ کی ہی عبادت کرتے ہیں نبوت کے مستحق وہ ہیں۔

یہود ونصاریٰ کے دوسرے دعویٰ کی تردید:

" ام تقولون ان ابراھیم واسماعیل واسحاق ویعقوب "یہاں سے ان کے ایک اور دعوے کی تردید مقصود ہے ایک اصول یہ ہے کہ بعض دفعہ اپنے مذہب کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لیے، اس کو رائج کرنے کے لیے اور اپنے مذہب کو لوگوں کی نظر میں پرکشش بنانے کے لیے جتنی بڑی عظیم شخصیات ہوتی ہیں یہ مذہب ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ یہ خالص ہے کوئی ہمارا اپنا بنایا ہوا نہیں ہے فلاں بھی اسی مذہب پر تھا، فلاں بھی اسی مذہب پر تھا فلاں بھی اسی مذہب پر تھا فلاں بھی یہی کہتا تھا، فلاں کا عقیدہ بھی یہی تھا۔

اس قسم کی باتیں کر کے اپنے مذہب کو پرکشش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہودیوں نے بھی یہی ڈھنگ استعمال کیا کہ یہودی اپنی یہودیت کو پھیلانے کے لیے، لوگوں کی نظر میں مقبول بنانے کے لیے کہا کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، نصرانی کہا کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نصرانی مذہب پر تھے یہ ان کا دعویٰ تھا ان کے اس دعوے کی یہاں پر تردید کرنی مقصود ہے'' ام تقولون ان ابراهیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط کانوا هوداً اونصاریٰ '' کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام اسحاق علیہ السلام یعقوب علیہ السلام اور اولادِ یعقوب '' کانوا هوداً '' یہ یہودی کہتے تھے '' کانوا نصاریٰ '' یہ نصرانی لوگ کہا کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام بھی نصرانی تھے۔

لہٰذا یہ ہمارا مذہب کوئی اپنا خود ساختہ نہیں، اپنا بنایا ہوا نہیں بلکہ یہ ابراہیم علیہ السلام سے ہے کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے اللہ نے اس کی تردید فرمائی ہے '' ءانتم اعلم ام الله '' کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتے ہیں اللہ کا علم تو یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خالص موحد تھے، اللہ کے فرمانبردار تھے یہودی اور نصرانی نہیں تھے تو تم کس طریقے سے ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو کہتے ہو کہ یہ یہودی تھے یا نصرانی تھے یہ اللہ نے تردید فرمائی یہاں پر یہ تردید اجمالاً ہے آگے تیسرے پارے میں اس کی تفصیل ہے اللہ جل شانہ نے فرمایا '' یا اهل الکتاب لم تحاجون فی ابراهیم وما انزلت التوراة والا نجیل الا من بعده '' تم کیوں جھگڑا کرتے ہو ابراہیم علیہ السلام کے دین کے بارے میں، تم جھگڑا کیوں کرتے ہو، کیوں ان کو کہتے ہو کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی تھے، ان کے بارے میں یہ کیوں کہتے ہو کہ وہ یہودیت یا نصرانیت پر تھے '' وما انزلت التورات والا نجیل الا من بعده '' ابراہیم علیہ السلام تو پہلے گزر گئے تورات بعد میں نازل ہوئی انجیل بعد میں نازل ہوئی، اور یہودی مذہب شروع ہوا تورات نازل ہونے سے، نصرانی مذہب شروع ہوا انجیل کے نازل ہونے سے تو ابراہیم علیہ السلام پہلے گذر گئے تورات انجیل بعد میں نازل ہوئی تو جو شخصیت پہلے گزر گئی وہ بعد میں ظاہر ہونے والے مذہب پر کیسے ہو سکتی ہے، اس لیے یہ تمہارا دعویٰ کرنا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصرانی تھے غلط ہے۔

اور آگے فرمایا '' ما کان ابراهیم یهودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفاً مسلما وما کان من المشرکین '' ابراہیم علیہ السلام یہودی نہیں تھے نصرانی نہیں تھے وہ تو تھے خالص موحد اور اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے '' وما کان من المشرکین '' ان ابراهیم کان امة قانتا لله حنیفاً ولم یك من المشرکین '' ابراہیم علیہ السلام مشرک نہیں تھے تمہارا مذہب اس کے اندر تو شرک آ چکا ہے '' قالت الیهود عزیر ن ابن الله وقالت

النصاری المسیح بن اللہ "تو یہ موحد اعظم توحید کا داعی اس کے بارے میں تم کس طرح کہتے ہو کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے جس کے اندر شرک ہے کہ وہ شرکیہ مذہب پر تھے "ء انتم اعلم ام اللہ "تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اللہ نے تو یہ مذہب بتایا کہ وہ یہودی نصرانی اور شرکیہ مذہب نہیں رکھتے تھے وہ تو موحد تھے۔

یہود و نصاریٰ کے تیسرے دعویٰ کی تردید:

" ومن اظلم ممن کتم شھادۃً عندہ من اللہ "اس میں یہود و نصاریٰ کی ایک اور تردید کی گئی، نبی کریم ﷺ کی علامات بلکہ آپ ﷺ کے خلفاء کی علامات توراۃ و انجیل کے اندر لکھی ہوئی تھیں، " ذلك مثلهم في التوراة ومثلهم في الانجيل كزرع اخرج شطأه فازره الخ"

تو آپ ﷺ کے خلفاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی علامات بھی توراۃ و انجیل کے اندر لکھی ہوئی تھیں، اور یہودی علماء بالخصوص نصاریٰ ان علامتوں کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ کو پہچانتے تھے کہ یہی آخری الزمان نبی ہیں اور پہچانتے بھی اس حد تک تھے " یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم "ہزاروں بچوں میں اگر کسی کا بچہ پھر رہا ہو تو وہ فوراً پہلی نظر میں پہچان لے گا کہ یہ میرا بچہ ہے تو وہ نبی ﷺ کو ان علامات کے ذریعہ سے جو آپ میں پائی جاتی تھیں اس طریقے سے پہچانتے تھے، " کمایعرفون ابناء ھم "۔

لیکن ضد و عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے تھے، بلکہ وہ ان علامات کو چھپاتے تھے، اگر وہ ظاہر کرتے اور بتا دیتے کہ آپ کی یہ علامات ہیں اور وہ علامات آپ کے اندر پائی جاتی تھیں تو پھر نبی کریم ﷺ پر ہی ہو سکتا ہے کہ دوسرے یہودی اور نصاریٰ ایمان لے آتے اس لیے نبی کریم ﷺ کی علامات کو وہ چھپاتے تھے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اسی پر رد فرمایا " ومن اظلم " کون بڑا ظالم ہے اللہ کے ہاں یعنی اس سے بڑا کوئی ظالم نہیں " ومن اظلم "کون بڑا ظالم ہے اس سے جو چھپائے شہادت اور ایسی شہادت عندہ جو شہادت اس کے نزدیک ثابت ہے ایک ہے کہ شہادت کے بارے میں کوئی شک و شبہ ہو، کوئی شک و شبہ نہیں، اس شہادت پر ان کو یقین ہے، وہ شہادت ان کے نزدیک ثابت ہے۔

وہی نبی کریم ﷺ کی علامات پر اور آپ ﷺ کے نبی ہونے پر یعنی اس سے بڑی کیا ان کے ہاں نبوت کی صداقت کی دلیل ہوگی کہ ادھر توراۃ میں علامات موجود ہیں اور وہ علامات آپ ﷺ میں پائی جاتی ہیں اور آخر الزمان نبی کی علامات کے ذریعہ سے وہ آپ کو اس طرح سے پہچانتے تھے، " کمایعرفون ابناء ھم " یعنی شہادت ان کے نزدیک ثابت بھی ہے توراۃ میں ہے، انجیل میں ہے اور وہ آپ میں پائی جاتی ہیں " من اللہ "اور وہ

شہادت ہے بھی اللہ کی طرف سے، کیونکہ توراۃ کے اندر انجیل کے اندر وہ موجود ہے توراۃ اللہ کی طرف سے انجیل اللہ کی طرف سے تو گویا یہ شہادت اللہ کی طرف سے ہے لیکن اس کے باوجود وہ شہادت کو چھپاتے زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے دل سے مانتے تھے" وما اللہ بغافل عما تعملون" یہ ان کے لیے وعید ہے اللہ نہیں ہے غافل ان کاموں سے جو تم کرتے ہو لہٰذا اگر اسی دعوے پر چلتے رہے اسی پر قائم رہے تو پھر قیامت والے دن سزا ملے گی اور اسی ضد عناد کی سزا تمہیں جھیلنی پڑے گی۔

یہود ونصاریٰ کے چوتھے دعویٰ کی تردید:

"تلك امة قد خلت" اس سے ایک اور دعوے کی تردید مقصود ہے "تلك امة" یہودی کہا کرتے تھے "نحن ابناء اللہ واحباء ہ" یہاں اصل عبارت ہے" نحن ابناء انبیاء اللہ " ہم تو انبیاء زادے ہیں انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں اور اللہ کے محبوب ہیں، انبیاء زادے ہونے کی وجہ سے ہر حال میں اللہ ہمیں بخش دے گا اور ہم جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ نے اس کی تردید کی،" تلك امة قد خلت " وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی "لھاجزاء ما کسبت" ان کے لیے جزا ہوگی ان کاموں کی جو انہوں نے کمائے " ولکم ما کسبتم ای ولکم جزاء ما کسبتم " تمہارے لیے ان عملوں کی جزا ہوگی جو تم نے کمائے۔

اس لیے یہ دعویٰ کرنا کہ ہم انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہیں اس لیے جو عقیدہ رکھیں اور جو ہم عمل کریں آخر کار ہم بخشے جائیں گے، تو ان کے عقیدے اور ان کے عملوں کا اعتبار کر کے اپنے بخشے ہوئے ہونے کا، جنتی ہونے کا دعویٰ کرنا درست نہیں ہے، ان کے لیے ان کی کمائی تمہارے لیے تمہاری کمائی، تمہارے لیے وہ کمائی کام آئے گی جو تم کرو گے ان کی کمائی تمہارے کام نہیں آئے گی" ولا تسئلون عما کانوا یعملون " اور آگے دوسرا جزء محذوف ہے آگے تقابل سے دوسرا جزء خود سمجھ میں آجاتا ہے " ولا یسئلون عما کنتم تعملون" تم ان کے بارے میں نہیں پوچھے جاؤ گے جو وہ کرتے تھے وہ ان عملوں کے بارے میں نہیں پوچھے جائیں گے جو تم کرتے تھے۔

اس لیے تم اپنے عقیدے عمل کے ذمہ دار وہ اپنے عقیدے عمل کے ذمہ دار ہر ایک اپنے عقیدے عمل کی جزا پائے گا اپنے فعل کی جزا پائے گا ہر ایک اپنے کاموں کا بدلہ پائے گا۔

آیت کے تکرار کی حکمت:

ماقبل میں بھی یہ آیت گزری اور یہاں پر بھی آئی یا تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض دفعہ زجر وتوبیخ کے مقام میں تاکید در تاکید کے لیے اس طرح کے جملے ذکر کر دیے جاتے ہیں زجر وتوبیخ میں زور پیدا کرنے کے لیے، مبالغہ پیدا

کرنے کے لیے بعض دفعہ بات میں اور زیادہ زور پیدا کرنے کے لیے دوبارہ پھر اسی بات کو دہرایا جاتا ہے اور فرق بھی کر سکتے ہیں اس اعتبار سے کہ ماقبل میں " تلك امة " وہاں امت سے مراد ہیں انبیاء علیہم السلام اور یہاں " تلك امة " اس سے مراد ہیں اس امت کے علماء اور اولیاء اس سے فرق ہو جائے گا " تلك امة " یعنی یہ انبیاء علیہم السلام کی جماعت ہے " قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم " تو یہاں امت سے مراد ہے یہود و نصاریٰ کے علماء ان کے عباد و اولیاء وہ بھی ایک جماعت تھی جو گذر چکی " لها ما كسبت ولكم ما كسبتم " اس طرح فرق بھی کیا گیا۔

فائدہ:

اور یہ جو ماقبل میں کہا " قل " کہہ دیجئے " اتحاجوننا في الله " قال یقول جہاں پر آتا ہے وہاں پر تین چیزیں ہوتی ہیں۔

قائل مقول لہ اور مقولہ، کہنے والا، جس کو کہا جائے اور جو بات کہی جائے، تو یہاں پر قائل تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں قل کہہ دیجئے فرما دیجئے کن کو کہا گیا مخاطب یہاں پر ہیں یہود و نصاریٰ، یہود و نصاریٰ کو کہہ دیجئے کیونکہ ماقبل میں یہود و نصاریٰ کے عقائد پر ہی رد آ رہا ہے مضمون یہی چل رہا ہے۔

مقولہ " اتحاجوننا في الله وهو ربنا وربكم " یہ اجمال ہے ماقبل میں تفصیل گذر چکی کہ وہ کہتے تھے " كونوا هودا او نصارىٰ تهتدوا " وہ جو یہودیت نصرانیت کے داعی بنے ہوئے تھے کتاب اللہ کے نازل ہونے کے بعد، قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد، دین اسلام کے عطا ہو جانے کے بعد پھر بھی یہودیت نصرانیت کے داعی بنے ہوئے تھے وہ اپنی یہودیت نصرانیت کو سچا مذہب بتاتے تو راۃ انجیل جو محرف تھی اس کو سچی کتاب بتاتے اور اس کے مقابلہ میں دین اسلام اور قرآن مجید کو جھوٹا بتاتے یہ تھا ان کا جھگڑا یہ ہے ان کا مقولہ اسی کی یہاں تردید کی گئی ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ

عنقریب کہیں گے نادان لوگ کس چیز نے پھیر دیا انہیں ان کے اس قبلے سے

كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

جس پر یہ پہلے تھے ، آپ فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے لئے ہے مشرق اور مغرب ، ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا

صراط مستقیم کی ﴿۱۴۲﴾ اور ایسے ہی ہم نے بنایا تمہیں معتدل امت تا کہ ہو جاؤ تم

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا

گواہ لوگوں پر اور ہو جائے رسول تم پر گواہ ، اور ایسے ہی نہیں

جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ

بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو کہ جس پر آپ تھے مگر اس لئے تا کہ جان لیں ہم جدا جدا کر کے ان لوگوں کو جو رسول کے تبع ہیں

مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى

ان لوگوں سے جو کہ اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں ، بے شک یہ تبدیلی البتہ بوجھل ہے مگر

الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی ، اور نہیں ہے اللہ کہ ضائع کرے تمہارے ایمان کو ، بے شک اللہ تعالیٰ

بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ

لوگوں کے ساتھ نرمی کرنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۴۳﴾ تحقیق دیکھتے ہیں ہم تیرے چہرے کا بار بار اٹھنا آسمان کی طرف ،

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

پس البتہ ضرور پھیر دیں گے ہم تجھے اس قبلہ کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں پس پھیر لیجئے اپنا رخ مسجد حرام کی طرف۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

جہاں کہیں بھی تم ہو، پھیرا کرو اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف ، اور بے شک وہ لوگ جو دیئے گئے

الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہ بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے ، اور اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں ﴿۱۴۴﴾

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ

اور اگر آپ لے آئیں ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیئے گئے ہیں ہر قسم کی نشانی تب بھی وہ تیرے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے اور نہیں ہیں

اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ

آپ اتباع کرنے والے ان کے قبلہ کی ، اور نہیں ہے ان میں سے بعض تابع ہونے والا بعض کے قبلہ کے ، اور اگر

اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ

تو نے اتباع کی ان کی خواہشات کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آگیا ، بے شک آپ تب ہو جائیں گے

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ

ظالموں میں سے ﴿۱۴۵﴾ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی پہچانتے ہیں اس رسول کو جس طرح سے پہچانتے ہیں

اَبْنَآءَهُمْ ۗ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اپنے بیٹوں کو ، اور بے شک ایک فریق ان میں سے البتہ چھپاتا ہے حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۱۴۶﴾

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

کہ حق تیرے رب کی جانب سے ہے پس تو اے مخاطب شک کرنے والوں میں سے نہ ہو ﴿۱۴۷﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے پارے کے آخری رکوع سے قبلہ کے متعلق تفصیلات آرہی ہیں میں نے اس وقت عرض کیا تھا کہ اصل میں تحویل قبلہ کا مسئلہ یہ پہلا نسخ تھا جو مدینہ منورہ کے اندر جا کر ہوا اور اس پر اہل کتاب کی طرف سے اور دوسرے لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کی آوازیں کسی گئیں شور برپا کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی اہمیت کی بناء پر تحویل قبلہ کا حکم دینے سے پہلے ہی جس طرح سے فضا کو سازگار کیا جاتا ہے اسی طرح اہل ایمان کو دماغی طور پر تیار

کیا جا رہا ہے اور جس قسم کے شبہات لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے تھے ان کے جوابات کی تلقین کی جا رہی ہے تو یہ آیات اس قسم کی ہیں اور اس رکوع میں پھر صراحتاً حکم آ رہا ہے اس قبلہ کے تبدیل ہونے کا۔

تحویل قبلہ کے وقت ہونے والے اعتراض کو پہلے ہی بیان کر دیا:

"سیقول" میں یہ سین استقبال کے لئے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں گے جس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا اس وقت بے عقل لوگ نادان لوگ جو سمجھ دار نہیں ہیں وہ اس قسم کے اعتراض کریں گے یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ آیات قبلہ کا حکم آنے سے پہلے اتری ہیں اور پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا کہ اس قسم کی باتیں ہوں گی اور قبل از وقت جب آگاہ کر دیا جائے تو پھر اگر اعتراضات ہوں بھی تو انسان گھبراتا نہیں ہے اور کوئی پریشانی کی بات نہیں ہوتی کہ ہمیں پہلے ہی پتہ ہے کہ ایسا ہونا تھا ویسے ہی ہوا۔

پریشانی ہوا کرتی ہے ہمیشہ خلاف امید معاملہ پیش آنے پر جب امید پہلے ہی ہو کہ ایسے ہونا ہے تو پھر پریشانی نہیں ہوا کرتی تو "سیقول" کے اندر یہی پیش گوئی کی گئی ہے کہ نادان قسم کے لوگ ایسی باتیں کریں گے، نادان انہیں کہا کیونکہ اصل چیز تو اللہ کا حکم ہے اور اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنی تجویز پر اعتماد کرتے ہوئے جو لوگ اعتراضات کرتے ہیں وہ بے عقل ہی ہوتے ہیں، کہیں گے کہ ان مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر پہلے تھے کس چیز نے پھیر دیا؟ یہ کیوں پھر گئے یہود کہیں گے کہ ہماری ضد کی بناء پر یہ ایسا کرتے ہیں یا کہیں گے کہ ان کو اپنے طرز عمل پر اعتماد ہی نہیں کبھی کدھر کو منہ کر لیا، کبھی کدھر کو منہ کر لیا اگر یہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہیں تو یہ کیا ہے کہ اللہ آج کچھ کہہ دیتا ہے کل کچھ کہہ دیتا ہے اور مشرکین مکہ کہیں گے کہ دیکھو ہم سے انہوں نے اختلاف کیا تھا اور ہمارے عبادت خانے کو چھوڑ کر دوسری طرف انہوں نے رخ کر لیا تھا اب پھر ہماری طرف بدلتے آ رہے ہیں اس قسم کے شبہات پیدا ہوں گے۔

اور جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت یہ شبہات پیش کیے گئے، اعتراضات کیے گئے، شور مچایا گیا اور جیسے بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض ضعفاء کمزور ایمان کے لوگ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بددل بھی ہوئے بہر حال یہ قبل از وقت نشاندہی کی جا رہی ہے کہ اس پر شور مچنا ہے کہ کس چیز نے پھیر دیا انہیں اس قبلے سے جس پر یہ تھے۔

معترضین کے اعتراض کا جواب:

جب یہ ایسا کہیں تو آپ جواب میں یوں کہہ دیجئے کہ بھائی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کوئی جہت ذاتی

طور پر متعین نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ ادھر ہی منہ کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوسکتی ہے، ادھر منہ نہ کیا گیا تو اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی ایسی کوئی جہت متعین نہیں ہے، مشرق مغرب شمال جنوب جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لئے ہے جیسے کہ پیچھے بھی یہ لفظ آئے تھے ''این ماتولوافثم وجہ اللہ'' مشرق ومغرب سب اللہ کے لئے ہے جدھر منہ کرو ادھر اللہ کی ذات موجود ہے اصل تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ مشرق کی طرف منہ کرنے کے لئے کہہ دیں وہی قبلہ بن جائے گا، مغرب کی طرف منہ کرنے کے لئے کہہ دیں وہی قبلہ بن جائے گا، کسی اور طرف حکم دے دیں وہی قبلہ بن جائے گا اصل اللہ کا حکم ہے۔

باقی ان جہتوں کے اندر کوئی جہت بھی ایسی نہیں کہ ہم کہیں کہ ذاتی طور پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ منہ ادھر کیا جائے آپ کہہ دیجئے کہ مشرق ومغرب اللہ ہی کے لئے ہے، اب اس میں جو تلقین کی گئی وہ یہ ہے کہ قبلے کی تعیین اصل میں اللہ کے حکم کے تحت ہے جو اللہ کا حکم آجائے اس کو مان لینا چاہیئے یہ مشرق ومغرب کی بحث فضول ہے، یہ اعتدال کا راستہ ہے جو اہل ایمان کو حاصل ہونا چاہیئے ہر وقت اس بارے میں تیار رہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آیا قبول کرلیا جائے اصل یہی ہے یہی صراط مستقیم ہے جس کو اگلی آیت میں ذکر کیا گیا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی راہنمائی کردیتا ہے اور جس کے دل میں، دماغ میں یہ چیز سما گئی کہ اللہ کا حکم ہی واجب التسلیم ہے اس میں جھگڑا کرنا مناسب نہیں یوں سمجھو کہ اللہ کی طرف سے اس کو صراط مستقیم نصیب ہوگیا اور جو اللہ کے احکام کے مقابلے میں اپنی رائے پر جمے رہتے ہیں اور اللہ کا حکم آجانے کے باوجود اس میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں یوں سمجھو کہ یہ صراط مستقیم سے محروم ہیں جس کو اللہ چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

امت وسط کا مصداق امت محمدیہ ہے:

''وکذلک جعلناکم امۃ وسطا'' اور یہ صراط مستقیم امت محمدیہ کو نصیب ہوا، یہ اعتدال انہی میں ہے کہ ہر بات کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد پھر اس کو قبول کر لیتے ہیں اگر تشبیہ والا معنی ذکر کرنا ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح سے ہم نے کعبہ کو جو کہ تمام عمارات سے افضل ہے تمہارا قبلہ بنادیا اسی طرح سے ہم نے تم کو باقی امتوں کے مقابلہ میں ایک معتدل امت بنا کر شرافت بخشی ہے اس امت محمدیہ کی ہی تعریف کرنا مقصود ہے کہ ہم نے تمہیں ایسی ہی امت معتدل بنایا، اعتدال والی جماعت بنایا یہ تعریف انہی کی کرنا مقصود ہے جس طرح کسی بہادر کو دیکھ کر کہا جائے کہ بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں تو اس میں بہادری کا اثبات اسی کے لئے ہوا کرتا ہے کسی دوسرے کو تشبیہ دینا مقصود نہیں ہوتی یہاں بھی ایسے ہی ہوجائے گا کہ ہم نے تمہیں ایسی ہی امت معتدل بنایا تا کہ تمہاری شرافت لوگوں کے سامنے ظاہر ہو آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی۔

انبیاء علیہم السلام کے حق میں امت محمدیہ کی گواہی:

"لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا" اس کی تفسیر اصح روایات میں یوں آئی ہے کہ قیامت کے میدان میں جب اللہ تعالیٰ تمام امتوں کو اکٹھا کرلیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوجائے گا تو کافر لوگ کہیں گے کہ ہمیں آپ کا پیغام کسی نے پہنچایا ہی نہیں، اس لئے ہم غلط راستے پر لگے ہوئے تھے ہم معذور ہیں تو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو مقابلہ میں بلائیں گے انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے عرض کریں گے کہ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا دین پورا پورا پہنچایا تم کیسے کہتے ہو کہ نہیں پہنچایا، اب یہ دو فریق ہوگئے ایک طرف انبیاء علیہم السلام، دوسری طرف ان کی امتیں، تو انبیاء علیہم السلام کے حق میں گواہی دینے کے لئے کافروں کے خلاف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش ہوگی یہ کہیں گے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے دین پہنچایا اور ہمیں اس بات کی پوری پوری تصدیق ہے ہمیں اس بات کا پورا پورا یقین ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب سے اور اللہ کے پیغمبروں کی زبان سے ہم نے ان باتوں کو سنا اور ہم اس کا یقین کیے ہوئے ہیں، یہ کافر لوگ غلط کہتے ہیں، دین ان تک پہنچا ہے اس طرح سے لوگوں کے مقابلہ میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہوگی اور اس امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قابل شہادت ہونے پر پیغمبر کی شہادت ہوگی، میری یہ امت ٹھیک کہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے دین پہنچانے میں کوئی کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ پورا پورا پہنچایا ہے۔

اس شہادت کے بعد انبیاء علیہم السلام کے حق میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوجائے گا گویا کہ ساری مخلوق کے مقابلہ میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور ان کی شرافت ظاہر ہوجائے گی کہ اتنے بڑے مقدمے کے اندر ان کو بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے اور ان کی شہادت کے ساتھ فیصلہ ہوگیا، یہ فضیلت تمہاری نمایاں ہوگی قیامت کے دن اور یہ نتیجہ ہوگا اس اعتدال کا جس اعتدال کے اوپر اللہ تعالیٰ نے تمہیں بنایا ہے، نظریات میں تمہارے اعتدال ہے، عمل میں تمہارے اعتدال ہے، عمل میں ہر چیز کے اندر تم افراط وتفریط سے بچے ہوئے ہو یہی شرافت ہے جس کا ظہور جا کر قیامت کے دن ہوگا تو یہ تفسیر صحیح روایات میں آئی ہوئی ہے۔

شھداء علی الناس کی دوسری تفسیر:

ویسے شہداء ہونے کا ایک یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کا رسول تمہارے سامنے آ کر گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے یہ احکام ہیں اور تمہاری شرافت یہ ہے کہ تم لوگوں کے سامنے گواہی دو کہ اللہ کے یہ احکام ہیں، اللہ کے رسول نے تمہیں احکام پہنچائے اور تم آگے ساری مخلوق کو پہنچاؤ یہ اللہ تعالیٰ نے مقام اور مرتبہ تمہیں دیا ہے جس کا ذکر قرآن

کریم میں دوسری آیت میں بھی ہے ”کنتم خیر امة اخرجت للناس“ تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے نکالی گئی تا کہ لوگوں کو ان کا دین سمجھائیں اور اچھے نظریات کی تلقین کریں تو پھر یہ معنی بھی ہوگا کہ اللہ کا رسول تمہارے سامنے آ کر گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے یہ احکام ہیں اور تم مکلف ہو اس بات کے کہ تم لوگوں کے سامنے یہ گواہی دو لوگوں تک اس دین کو پہنچاؤ یہ منصب بھی اس امت کا سب امتوں کے مقابلہ میں شرافت اور سیادت والا منصب ہے کہ ان کو امامت کا درجہ دیا گیا کہ اب یہ لوگوں کی راہنمائی کریں اور لوگوں کو دین سمجھائیں تو شہداء کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے۔

تحویل قبلہ کے حکم سے مقصود آزمائش ہے:

”وما جعلنا القبلة التی کنت علیها“ اور نہیں بنایا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ پہلے تھے، نہیں بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو جس پر آپ پہلے تھے مگر اس لئے یعنی اللہ کے علم میں تو پہلے یہ چیز متعین تھی کہ آخری امت کا قبلہ کعبہ ہے، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں گے لیکن تھوڑے سے دنوں کے لئے بیت المقدس کی جہت کو متعین کر دیا اس جہت کے متعین کرنے سے لوگوں کا امتحان مقصود ہے کیونکہ عرب کے اندر تعصب بہت زیادہ تھا، نسلی، نسبی، وطنی ہر قسم کا تعصب اب جو مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے مشرکین مکہ اور ارد گرد کے لوگ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اپنے اس وطنی جذبے کے اعتبار سے کہ اپنے وطن کی عبادت گاہ کو چھوڑ کر کسی اور عبادت گاہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں اور یہود و نصاریٰ وہ اپنے تعصب میں مبتلا تھے وہ کسی صورت میں نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ہم اپنے قبلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبلے کو اپنائیں اور پھر اسرائیلیوں سے یہ مرکز منتقل ہونا تھا اسماعیلیوں کی طرف تو یہود و نصاریٰ کے لئے بہت امتحان کی بات تھی۔

تو اللہ تعالیٰ نے پہلے تو حکم دیا کہ عرب والے شام کی طرف متوجہ ہوں، ان کے اندر وطنیت کے جذبے کو کمزور کیا جائے، یہ اپنے قبلے کو چھوڑ دیں، کعبہ کو چھوڑ دیں اور بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں جس میں ظاہری طور پر یہود و نصاریٰ کی موافقت ہے اور بعد میں پھر اس کو منتقل کر دیا گیا بیت اللہ کی طرف تا کہ یہود و نصاریٰ کے لئے بھی امتحان کی صورت پیدا ہو جائے، اللہ کے حکم کے تحت یہ اپنے قبلے سے رخ پھیرتے ہیں یا نہیں پھیرتے؟ بیت المقدس کو چھوڑتے ہیں یا نہیں چھوڑتے؟ تو جو لوگ اللہ کے حکم کے متبع ہیں وہ عربی ہوتے ہوئے حکم مل گیا بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا تو انہوں نے ادہر منہ کر لیا یہ لوگ کامیاب ہیں اور یہ متبع ہیں اور جو بیت المقدس کی طرف حکم ملے تو وہ کہیں، نہیں جی ہم تو اپنے کعبہ کو نہیں چھوڑ سکتے ہم تو منہ ادہر ہی کریں گے

یا بیت المقدس کو چھوڑنے کا حکم دیا جائے تو وہ کہیں کہ نہیں یہ تو ہمارا جدی پشتی چلا آ رہا ہے ہم تو اس کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں تو یوں سمجھ لیجئے یہ لوگ وہ ہیں جو ایڑیوں کے بل پھر گئے اور یہ متبع نہیں ہیں یہ اپنی خواہشات کے مطابق چلنے والے ہیں جب کوئی حکم ان کی خواہش کے مطابق کیا جائے تو اس کو مانیں گے اور جب خواہشات کے خلاف ہو جائے تو نہیں مانیں گے یہ لوگ اس قسم کے ہیں تو یہ دونوں جماعتوں کے اندر امتیاز ہو جائے ہم نے اس لئے تھوڑے دنوں کے لئے جہت دوسری متعین کر دی تھی ورنہ ہمارے علم میں بھی بات یہی تھی کہ آخری امت کے لئے قبلہ جو ہے وہ بیت اللہ ہی ہے کعبہ ہی ہے۔

نہیں بنایا ہم نے قبلہ اس جہت کو جس پر آپ تھے ''الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیہ'' تا کہ ہم جدا جدا کر کے جان لیں ان لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں ان لوگوں سے جو کہ اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے علم قدیم پر ہونے والے شبہ کا جواب:

''الا لنعلم'' مگر تا کہ ہم جان لیں' یہ ترجمہ جس وقت ہم کریں گے تو اس میں بظاہر ایک شبہ سا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے علم کے اندر بھی تجدد ہے، حدوث ہے کہ پہلے اللہ کو معلوم نہیں اور اب معلوم ہوگا یہ کام اس لئے کیا جا رہا تھا کہ ہم جان لیں یعنی ایسا کرنے کے بعد ہمیں پتہ چل جائے کہ متبع کون ہے اور منقلب کون ہے؟ اللہ تعالیٰ کا علم تو قدیم ہے واقعہ پیش آئے یا نہ آئے اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ فلاں متبع ہے اور فلاں منقلب ہے'' تا کہ جان لیں' ہم کو اس سے شبہ حدوث کا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس قسم کے واقعات سے اللہ تعالیٰ کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں یوں ہے اور فلاں یوں ہے ان لفظوں کے ظاہر سے حدوث علم کا شبہ پڑتا ہے۔

اور عام طور پر مفسرین نے اس طرح سے جواب دیا ہے کہ ایک ہے اللہ تعالیٰ کا علم قدیم جس میں یوں ہے کہ ایسا ہوگا ایسا ہو کر رہے گا کیونکہ اللہ کا علم عین واقعہ کے مطابق ہے آپ جانتے ہیں کہ یہ بات تو تبھی ثابت آئے گی جب واقعہ پیش آ جائے گا یعنی ایسا ہوگا یہ علم قدیم ہے پہلے سے اللہ جانتا ہے کہ ایسا ہوگا اور ایک ہے ظاہری طور پر ایسا ہو بھی جائے اور اللہ کا علم اس طرح سے متعلق ہو جائے کہ ایسا ہو گیا یہ جو اللہ کا علم ہے یہ تو تبھی متعلق ہوگا جس وقت کہ وہ واقعہ پیش آ جائے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم علم قدیم کے طور پر جانتے ہیں کہ کون متبع ہیں اور کون منقلب لیکن ہم ایک ایسا امتحانی پرچہ دینا چاہتے ہیں کہ جس کے ساتھ ظاہری طور پر بھی معلوم ہو جائے کہ فلاں متبع ہے اور فلاں منقلب۔

اور جس وقت یہ واقعہ پیش آئے گا دو پارٹیاں بنیں گی تبھی جا کر ہم کہیں گے یہ متبع ہے اور یہ منقلب تو علم قدیم کے طور پر جانتے ہیں اس کا ظہور واقعات کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے اردو ترجموں کے اندر آپ یہ لفظ پڑھیں گے کہ تا کہ ہم ظاہری طور پر بھی جان لیں کہ متبع کون ہے منقلب کون ہے؟ ظاہری طور پر جان لیں تو ظاہری طور پر جان لینے کا مطلب یہی ہوگا کہ ہمارے علم کا ظہور ہو جائے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو ہم جانتے ہیں کہ متبع کون ہے منقلب کون ہے لیکن واقعات کے ساتھ اس علم کا ظہور ہوتا ہے کہ اللہ کے علم میں ہے کہ زید پیدا ہوگا لیکن آپ کو کیسے پتہ چلے کہ اللہ کو علم ہے کہ زید پیدا ہوگا آپ کو پتہ اس وقت چلے گا جب زید پیدا ہوگا اب اللہ کا علم ظاہر ہو گیا کہ اللہ جانتا ہے کہ زید پیدا ہوگا اور اگر یہ زید پیدا نہ ہوتا تو ہمیں پتہ نہ چلتا کہ اللہ کا علم کیا ہے کیا نہیں ہے ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کے علم کا ظہور انہیں واقعات کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

اب ہم کہیں گے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ بعضے متبع ہوں گے اور بعضے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائیں گے اللہ کے علم میں یہ بات تھی پتہ اس کا تب چلا جب یہ واقعہ پیش آ گیا اس لئے اس کا مفہوم یوں ہوگا تا کہ ہم جان لیں، تا کہ ہمارا علم ظاہر ہو جائے، تا کہ ہم ظاہری طور پر معلوم کر لیں کہ کون ان میں سے متبع ہیں اور کون ایڑیوں کے بل پھرنے والا ہے یعنی جس کو ہم اس طرح سے جانتے ہیں کہ ایسا ہوگا ہم ایسے طور پر جان لیں کہ ایسا ہو گیا، اور ایسا ہو گیا تبھی آئے گا جب اس قسم کے واقعات سامنے آئیں گے، اب اس کا مطلب یوں ہوگا کہ ہم نے ایک ایسی چیز بطور امتحان کے چھوڑی جس کے ساتھ ہمارے سامنے امتیاز ہوگا ہم نے جان لیا واقعہ کے اعتبار سے یہ متبع ہے اور یہ منقلب ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ظہور کی صورت ہے۔

ہمارے سامنے جہاں کہیں بھی ایسے لفظ آئیں گے تا کہ اللہ جان لے، تا کہ اللہ کو معلوم ہو جائے تو اس کا مطلب یہی ہے تا کہ اللہ کا یہ علم ظاہر ہو جائے، ظاہری طور پر بھی اللہ جان لیں علم قدیم کے طور پر تو جانتے ہیں اب اللہ کا علم اس طرح سے بھی تعلق پکڑے کہ ایسا واقعہ پیش آ گیا اردو ترجمہ میں تفاسیر میں ان لفظوں کو اس مفہوم میں ادا کیا جائے گا کہ تا کہ ظاہری طور پر ہم جان لیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کے علم کا ظہور ہو جائے کہ کون متبع ہے اور کون منقلب ہے ظاہری طور پر ہم جان لیں اس لفظ کو اس لئے بولا جاتا ہے تا کہ ہم ظاہری طور پر معلوم کر لیں کہ کون متبع رسول ہے ان لوگوں سے جدا کر کے، ان لوگوں سے امتیاز کر کے جو کہ اپنی ایڑیوں کے بل پھرتے ہیں اور علم کا صلہ "مــن" آ گیا تو اس میں امتیاز والا معنی آ گیا ہم اس کو یوں ادا کریں گے تا کہ ہم ممتاز

کر کے جان لیں، تا کہ ہم جدا کر کے جان لیں ان لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں ان لوگوں سے جو کہ ایڑیوں کے بل پھرتے ہیں۔

ہدایت یافتہ لوگوں پر تحویل قبلہ کا کوئی بوجھ نہیں:

"وان کانت لکبیرۃ" اور یہ قبلے کی تبدیلی بڑی بوجھل ہے، اس کا برداشت کرنا بڑا مشکل ہوگا مگر ان لوگوں کے لئے جن کو اللہ ہدایت دے اور اللہ کی ہدایت وہی ہے جو "یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم" میں میں نے بیان کی کہ جس کا یہ ذہن بن جائے کہ اصل حکم اللہ کا ہے بس اس کو قبول کرنا چاہیئے، جنہوں نے یہ نظریہ اپنا لیا ان کو کوئی دشواری نہیں چاہے بیت المقدس کی طرف متوجہ کر دے چاہے کعبہ کی طرف متوجہ کر دے اور جنہوں نے اپنی طبیعت کو سامنے لانا ہے، اپنے تعصبات کی پوجا کرنی ہے ان کو یہ حکم بڑا ناگوار گزرے گا، بے شک یہ تبدیلی بہت گراں ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت دے، اللہ کی ہدایت کا مطلب یہاں یہ ہوا کہ ان کے ذہن میں یہ بات آگئی کہ اصل چیز اللہ کا حکم ہے اس کو ماننا چاہیئے بس جس کے دل میں یہ جذبہ آگیا اس کو کوئی گراں نہیں گزرے گی اور جن کو یہ گراں گزرے گی وہ اللہ کی ہدایت سے محروم ہیں تو وہ گویا کہ اپنے تعصب کو سامنے لاتے ہیں، اپنی طبعیت کو اپنی وطنیت کو اپنی قومیت کو اور اپنے نسلی جذبہ کو مقدم رکھتے ہیں اس لئے اس قسم کی تبدیلیاں ان کے لئے ناگوار ہیں۔

بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہوئی نمازوں کا حکم:

"وما کان اللہ لیضیع ایمانکم" اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں، اگر اس ایمان سے ایمان ہی مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ جو لوگ اعتراض کریں گے کہ ان کے ایمان کا کیا اعتبار ہے کبھی کدھر کو پھر جاتے ہیں اور کبھی کدھر کو پھر جاتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے احکام کے ذریعے سے ہی ایمان ضائع نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی جتنی اتباع نمایاں ہوگی اتنا ایمان اجاگر ہوتا ہے یا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایمان سے نماز مراد ہے کہ بعض لوگوں نے یوں کہا کہ جب اصل قبلہ یہ بیت اللہ ہے تو جن لوگوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھیں ان نمازوں کا پھر کیا درجہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ چونکہ ہمارے حکم کے تحت ہی پڑھی گئیں لہٰذا وہ ضائع نہیں ہیں وہ اللہ کے ہاں مقبول ہیں اس کے اوپر کامل ثواب بھی ملے گا تو ایمان کا لفظ بول کر نماز مراد لے لی چونکہ نماز ایمان کا ایک اہم رکن ہے اور اس کے اوپر ایمان کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہیں ہے اللہ کہ ضائع کرے تمہاری نماز، ایمان کا مصداق نماز، بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ البتہ نرمی کرنے والا ہے، شفقت کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔

حضور ﷺ کی تمنا اور تحویل قبلہ کا حکم:

"قد نریٰ تقلب وجھك فی السماء" یہ سرور کائنات ﷺ کے شوق کا بیان ہے کہ چونکہ آپ ملت ابرہیمی پر تھے، فطری طور پر آپ کو شوق تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بیت اللہ کی طرف متوجہ کر دے، یہ بناء ابراہیمی ہی ہمارا قبلہ قرار پا جائے اس شوق کی بناء پر آپ آسمان کی طرف بار بار چہرہ اٹھاتے کہ جبریل علیہ السلام کب کوئی حکم لے کر آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اسی شوق کو ذکر کیا 'قد نریٰ تقلب وجھك فی السماء" تحقیق دیکھتے ہیں ہم آپ کے چہرے کا تقلب پلٹے کھانا یعنی بار بار اٹھنا "فی جھة السماء" آسمان کی جانب میں "فلنولینك قبلة ترضھا" یہ پختہ وعدہ آگیا کہ البتہ ضرور پھیر دیں گے ہم آپ کو ایسے قبلہ کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں جس کے ساتھ آپ کی رضا ہے ہم ضرور پھیر دیں گے یہ وعدہ آگیا اور اس کے بعد اگلے الفاظ میں اسی وعدے کا ایفاء ہے، پہلے وعدے کے ساتھ خوشی ہوتی ہے پھر جس وقت وہ چیز وعدے کے مطابق واقع ہو جائے تو پھر مستقل خوشی۔

پس پھیر لیجئے آپ اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف، مسجد حرام بیت اللہ کے ارد گرد والی جگہ مسجد کہلاتی ہے اور پھر شطر کا لفظ بول دیا گیا مسجد حرام کی طرف جس سے معلوم ہو گیا کہ جہت کعبہ قبلہ ہے۔

جہت کعبہ ہمارا قبلہ ہے:

فقہ کے اندر آپ مسئلہ پڑھتے رہتے ہیں کہ جو لوگ مکہ معظمہ میں موجود ہیں جن کے سامنے وہ قبلہ ہے ان کو تو منہ اسی کی طرف کرنا چاہئیے اگر تھوڑا سا بھی ادھر ادھر ہو گیا تو ان کی نماز نہیں ہوتی لیکن جو لوگ دور علاقوں کے رہنے والے ہیں جن کے سامنے کعبہ کی عمارت نمایاں نہیں ہے ان کے لئے جہت کعبہ قبلہ ہے کہ اس جہت کو بھی منہ کر لیں گے ادھر منہ کر لیں گے تو نماز ادا ہو جائے گی اب ہم ہزار ہا میل کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہیں یہاں سے اگر بال برابر بھی ہمارا رخ یوں ایک طرف کو تبدیل ہو جائے تو وہاں جاتے ہوئے سینکڑوں میلوں کا فاصلہ بڑھ جائے گا تو خط کی ابتداء میں فاصلہ تھوڑا ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے آگے بڑھاتے چلے جاؤ گے ویسے ویسے فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا تو اگر بال برابر بھی یہاں سے فرق پڑ جائے تو ناک کی سیدھ میں جب خط کھینچا جائے گا تو بیت اللہ سے کتنی میل دائیں یا بائیں نکل جائیں گے اور بالکل بیت اللہ کی طرف منہ کرنا یہ دور رہنے والوں کے لئے ممکن ہی نہیں ہے اس لئے جہت کو ہمارا قبلہ بنا دیا گیا اب عین کعبہ کی طرف منہ کرنا دور والے لوگوں کے لئے ضروری نہیں ہے۔

اپنی طرف سے کوشش کرو کہ ہمارا منہ کعبہ کی طرف ہی رہے ورنہ آپ کا خیال اور آپ کی تحری اور آپ کا مقصد یہی آپ کے لئے جہت قبلہ ہے جس وقت آپ نے سوچ لیا کہ بیت اللہ ادھر کو ہے اور بیت اللہ ادھر تصور کر کے آپ نے ادھر منہ کر کے نماز پڑھنی شروع کر دی تو یہ نماز بیت اللہ کی طرف ہی سمجھی جائے گی جیسے کہ تحری میں ایسے ہی بعد میں چاہے پتہ چل جائے کہ آپ کی پشت ہی بیت اللہ کی طرف تھی منہ آپ نے دوسری طرف کر لیا تو بھی آپ کی نماز صحیح ہے کیونکہ آپ نے اپنے تصور میں اپنے خیالات میں بیت اللہ کو اپنے سامنے تصور کر کے ادھر منہ کر کے نماز پڑھی ہے تو دور رہنے والے کے لئے یہی چیز قبلہ ہے۔

ہمارے لئے کعبہ مغربین کے درمیان میں ہے ایک سردیوں کا مغرب ہے جہاں سردیوں میں سورج غروب ہوتا ہے اور ایک گرمیوں کا مغرب ہے جہاں گرمیوں میں سورج غروب ہوتا ہے تو یہ تقریباً اتنا سا فاصلہ بن جاتا ہے گرمیوں میں سورج یہاں غروب ہوگا اور سردیوں میں یہاں سورج غروب ہوگا دیکھا ہی ہوگا آپ نے سردیوں میں یہاں سے نکلے گا اور یہیں آ کر غروب ہو جائے گا، گرمیوں میں یہاں سے نکلے گا اور آسمان کے وسط سے ہوتا ہوا یہاں غروب ہوگا تو یہ مغربین جو ہیں سردیوں کا مغرب اور گرمیوں کا مغرب اس کے درمیان میں سے جدھر کو منہ کر لیا جائے وہ کعبہ کی طرف ہی سمجھا جائے گا اس لئے تھوڑا سا یوں ہو گیا یوں ہو گیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا جہت ضروری ہے البتہ اتنا انسان نہ پھر جائے کہ کندھا بیت اللہ کی طرف ہو جائے اور سینہ دوسری طرف ہو جائے "شطر المسجد الحرام" میں یہی عموم کر دیا ایک تو مسجد حرام بھی بیت اللہ کے ارد گرد والی جگہ، شطر یہ جانب کے معنی میں ہے مسجد حرام کی جانب اپنے منہ کو پھیر لیجئے۔

"حیث ما کنتم فولوا وجوهکم شطره" جہاں کہیں بھی آپ ہوں آپ اپنے چہرے کو ادھر ہی پھیر لیجئے یعنی مدینہ منورہ میں ہیں سفر میں ہیں حتیٰ کہ اگر بیت المقدس میں بھی نماز پڑھنی پڑ جائے تو بھی آپ اپنا منہ کعبہ کی طرف کیجئے اس میں عموم کر دیا سب امتیوں کے لئے بھی اور حضر اور سفر دونوں کے لئے اس میں عموم آ گیا جہاں کہیں بھی تم ہو تم پھیر لو اپنے چہروں کو مسجد حرام کی طرف، بے شک وہ لوگ جو کتاب دیے گئے البتہ جانتے ہیں کہ یہ بات حق ہے ان کے رب کی طرف سے، وہ جانتے اس اعتبار سے ہیں کہ جو علامات نبی آخر الزمان کی ذکر کی گئی ہیں ان کے اندر یہ علامت ہے کہ وہ ذو قبلتین ہوں گے کہ پہلے کچھ مدت بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے آخری قبلہ اس آخری امت کا بیت اللہ قرار پائے گا ان کے سامنے یہ بات واضح ہے لیکن وہ انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی کاروائیوں سے بے خبر نہیں ہے جس قسم کی ان کی کاروائیاں ہیں وہ سب اللہ کے سامنے ہیں۔

کفار کا تمہارے ساتھ اتحاد نہیں ہو سکتا:

اور آپ ان کو منوانے کی فکر نہ کیجئے، آپ ان کا پیچھا چھوڑ دیئے ان کی ضد کا تو یہ حال ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیے گئے ہیں آپ ہر قسم کی نشانی لے آئیں تو بھی آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے کیونکہ ایک اختلاف ہوتا ہے جہالت کی بناء پر جہالت کا اختلاف تو دلیل کے ساتھ اٹھایا جا سکتا ہے علم کی بات ان کے سامنے کردو جہالت دور ہو جائے گی وہ بات مان جائیں گے۔

لیکن جو تعصب کا اختلاف ہوتا ہے وہاں ہزار ہا دلیلیں پیش کردو لیکن میں نہ مانوں کا تو کوئی علاج نہیں ہے، جہاں تعصب کا اختلاف ہوا کرتا ہے وہ دلائل سے طے نہیں ہوا کرتا وہاں تو ایک انسان کا مسلک یہ ہے کہ میں نہ مانوں بس جو میری بات ہے وہی ٹھیک ہے باقی ہزار ہا دلیلیں لاؤ وہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا ایسی صورت میں پھر اس شخص کو کسی طور پر بھی اپنا ہم مسلک نہیں بنایا جا سکتا ان کا پیچھا چھوڑنا چاہیئے تو یہ لوگ متعصب ہیں، جاننے کے باوجود اختلاف کرتے ہیں وہ جیسے کہتے ہیں کہ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جو جاگتا ہوا سو جائے اس کو کوئی نہیں جگا سکتا، یعنی ہے وہ جاگتا لیکن اس نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں صرف یہ دکھانے کے لئے کہ میں سویا ہوا ہوں وہاں ڈھول پیٹتے رہو جو چاہے کرتے رہو وہ نہیں جاگے گا یہاں یہی بات ہوتی ہے کہ جاہل کو تو سمجھا کر ہم سیدھے راستے پر لا سکتے ہیں اگر وہ جہالت کی بناء پر اختلاف کیے ہوئے ہے تو دلیل کے ساتھ اس اختلاف کو دور کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ایک عالم جاہل بن جائے، جاننے کے باوجود اس بات پر اڑ جائے اس کو کسی دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا یہی بات ہے کہ اگر آپ ان لوگوں کے پاس جو کتاب دیئے گئے ہر قسم کی نشانی لے آئیں تو بھی یہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے۔

یہ آپ کے قبلے کی اتباع نہیں کریں گے اور آپ ان کے قبلے کی اتباع نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ کا حکم آ گیا لہٰذا اتفاق کی کوئی صورت نہیں ہے اس لئے زیادہ ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں "وما انت بتابع قبلتھم" اور نہیں ہیں آپ تابع ہونے والے ان کے قبلہ کے یعنی اتفاق پیدا کرنے کی ایک یہ صورت ہے کہ وہ آپ کا قبلہ مان لیں دوسری صورت یہ ہے کہ آپ بھی ان کا مان لیں وہ تو آپ کا نہیں مانیں گے ضد کی بناء پر اور آپ ان کا مان نہیں سکتے کہ اللہ نے ان کا قبلہ منسوخ کر دیا اور آپ کو حکم دوسرا آ گیا لہٰذا یہ ضد ختم ہی نہیں ہو سکتی، جھگڑا ختم ہی نہیں ہو سکتا، اور یہ صرف آپ کے ساتھ ان کا اختلاف نہیں قبلے کے مسئلے میں ان کا تو آپس میں بھی اختلاف ہے چنانچہ نصاریٰ بیت المقدس کے شرقی کنارے کو قبلہ سمجھتے تھے اور یہود بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے ہیں تو ان کا آپس میں بھی تھوڑا سا فرق ہے، نہیں ہے ان کا بعض تابع ہونے والا اپنے بعض کے قبلہ کے۔

اتباع علم کی ہے جہالت کی نہیں:

"ولئن اتبعت اھواء ھم" اگر چہ ان کا قبلہ اصل کے اعتبار سے ٹھیک تھا لیکن جب وہ منسوخ ہو گیا تب اس کو قبلہ سمجھنا دل کی خواہش ہے اور یہ غلط خیال ہے اگر آپ نے ان کے خیالات کی اتباع کی، ان کی خواہشات کی اتباع کی بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو بے شک آپ اس وقت ظالموں میں سے ہو جائیں گے، حق تلفی کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے گویا کہ اللہ کی وحی کی حق تلفی ہو جائے گی آپ کا اپنے اوپر بھی ظلم ہو گا اپنا بھی نقصان ہو گا لہٰذا آپ اس علم صحیح کے آجانے کے بعد ان کے غلط خیالات کے پیچھے نہ لگیں ان کی خواہشات کے پیچھے نہ لگیں یہ آیت آپ کے سامنے بار بار آتی ہے جس میں یہی بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اتباع کے قابل اصل میں علم کی بات ہے، جہالت قابل اتباع نہیں ہے ان لوگوں کے جو جاہلانہ خیالات ہیں ان کے پیچھے آپ نہ لگیں اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

اہل کتاب کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود انکار کرنا:

اور ان کے تعصب کو نمایاں کیا جا رہا ہے ان الفاظ میں کہ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح سے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں بیٹا چونکہ پیدا ہوتے ہی گود میں ہوتا ہے، عرفان ہوتا ہے ظاہری علامات کو دیکھ کر پہچاننا بالکل نمایاں ہوتا ہے، کتنے سارے بچے کھیل رہے ہوں اور ان کے اندر اپنا بیٹا بھی کھیل رہا ہو تو شکل دیکھ کر فوراً پہچان آجاتی ہے کہ یہ ہمارا بیٹا ہے وہاں انسان کو تردد نہیں ہوتا یہاں پہچاننا ظاہری حلیے سے مراد ہے حقیقتاً بیٹا ہے یا نہیں اس سے بحث نہیں کیونکہ حقیقتاً بیٹا ہونے میں تو شبہ نکالا جا سکتا ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو اور ہم سمجھے ہوں کہ ہمارا بیٹا ہے لیکن حقیقت میں اپنا نہ ہو ایک ہے اس کو ظاہری رخ سے دیکھ کر پہچاننا کہ جس کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لڑکوں کے اندر اس کو پہچاننا آسان ہوتا ہے کہ یہ ہے ہمارا بیٹا تو جتنا وہ نمایاں ہے اللہ کا رسول ان کے سامنے اتنا ہی نمایاں ہے کہ علامات کے ساتھ اس کو پہچانتے ہیں کہ واقعی یہ اللہ کا رسول ہے جس کے متعلق یہ نشانیاں ذکر کی گئی ہیں لیکن ان میں سے ایک فریق البتہ چھپاتا ہے حق کو حالانکہ وہ جانتے ہیں، جان بوجھ کر وہ اس حق کا اخفاء کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات لوگوں کے سامنے نمایاں نہیں کرتے حق تیرے رب کی جانب سے ہے اے مخاطب تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو سچی بات وہی ہے جو تیرے رب کی جانب سے بیان کی گئی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ

اور ہر کسی کے لیے ایک جہت ہے وہ ادھر منہ پھیرنے والا ہے نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلو جہاں کہیں تم ہو گے لے آئے گا

بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کر کے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱۴۸﴾ جہاں سے تو نکلے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ

پھیر لیا کر اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف ، اور بے شک یہ بات حق ہے تیرے رب کی طرف سے ،

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۹﴾ اور جہاں سے آپ نکلیں پھیر لیں آپ

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ

اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف ، اور جہاں کہیں بھی تم ہو پھیرا کرو اپنے چہرے کو

شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ڎ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۤ

مسجد حرام کی طرف ، تاکہ نہ ہو لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی دلیل ، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں ،

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۤ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ۙ

آپ ان سے ڈریے نہیں اور مجھ سے ڈرتے رہو ، اور تاکہ میں پورا کردوں اپنی نعمت تم پر اور تاکہ تم سیدھی راہ پا جاؤ ﴿۱۵۰﴾

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

جیسے کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تمہی میں سے تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہیں پاک کرتا ہے

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ ۭ

اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور سکھاتا ہے تمہیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے ﴿۱۵۱﴾

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

پس تم یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرے شکرگزار رہو اور میری ناشکری نہ کرو ﴿۱۵۲﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

مسئلہ تحویل قبلہ کا چلا آرہا ہے اور یہ سارے کا سارا رکوع اسی مسئلے پر مشتمل ہے چونکہ تحویل قبلہ کے پیش آجانے کے بعد یہود نصاریٰ اور مشرکین نے اس مسئلہ پر بہت شور مچایا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو مخالف پہلو کے ساتھ مقید کر کے ذکر کیا اور اس کی حکمتیں واضح فرمائیں۔

امت محمدیہ کے قبلہ پر اعتراض کیوں؟

''و لکل وجھۃ ھو مولیھا'' ہر کسی کے لیے ایک جہت ہے جس کی طرف وہ منہ کرنے والے ہیں، یہود نے بھی اپنا قبلہ متعین کر رکھا ہے، نصاریٰ نے بھی اپنا قبلہ متعین کر رکھا ہے ہر امت کے لیے اللہ نے کوئی نہ کوئی طرف ایسی بنائی ہے جدھر وہ منہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔

تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت بھی ایک مستقل جماعت ہے، آپ کی شریعت ایک مستقل شریعت ہے اگر ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک جہت متعین کر دی تو اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، ہر کسی کا قبلہ ہے یہود کا بھی ہے، نصاریٰ کا بھی ہے اور اس شریعت کے اندر بھی ایک قبلہ متعین کر دیا گیا یہ چیز الجھنے کی اور بحث کرنے کی نہیں ہے کہ تم اس کے اندر ہی بحث کرتے ہوئے الجھتے ہوئے اپنا وقت ضائع کرو یہ تو اللہ تعالیٰ نے نیکی کرنے کے لیے ایک رخ متعین کیا ہے کہ ادھر کو منہ کر کے تم عبادت کیا کرو۔

اصل مقصود:

باقی اصل مقصد تو عبادت ہے ان جھگڑوں کو چھوڑو، ان فضول بحثوں کے اندر اپنا وقت ضائع نہ کرو ''فاستبقوا الخیرات'' نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو جہت جو متعین ہوگئی وہ تو اس لیے ہے تا کہ عبادت کے لیے ایک رخ ہو جائے اور ہر امت کے لیے ہر جماعت کے لیے کوئی نہ کوئی جہت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے چاہے وہ انہوں نے خود متعین کر لی چاہے اللہ تعالیٰ کے متعین کرنے سے کر لی۔

بہر حال ہر کوئی اپنے لیے ایک طرف کو متعین کرتا ہے تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے پہلے قبلوں کو منسوخ کر کے اس جماعت کے لیے ایک جہت متعین کر دی اصل مقصود اللہ کی عبادت ہے اس میں بحث کرنے کی اور وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے'' فاستبقوا '' ایک دوسرے سے نیکیوں میں آگے نکلنے کی کوشش کرو، نیکیاں کام

آنے والی چیزیں ہیں، اس میں بحث کرتے رہو کہ منہ کدھر کرنا ہے اور نیکی نہ کرو تو اس میں خسارہ ہے، جہاں کہیں تم ہو گے اللہ تعالیٰ آپ سب کو لے آئے گا اور جب اللہ تعالیٰ کے سامنے سارے موجود ہو جاؤ گے تو یہ جہتیں اپنی حیثیت سے ختم ہو جائیں گی۔

وہاں تمہارے اعمال دیکھے جائیں گے اگر کوئی مشرق کی طرف منہ کرتا تھا، کوئی مغرب کی طرف منہ کرتا تھا، کوئی شمال کی طرف کرتا تھا، کوئی جنوب کی طرف کرتا تھا تو جب اللہ کے سامنے آ جاؤ گے تو سارے ایک جیسے ہو جاؤ گے وہاں پھر اللہ تعالیٰ تمہاری نیکیوں کو دیکھیں گے، اعمال کو دیکھیں گے یہ بحثیں اس وقت کام نہیں آئیں گی ساری اطراف کا قصہ ختم ہو جائے گا جس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے موجود ہو جاؤ گے، جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تعالیٰ تم سب کو لے آئے گا'' ان الله علی کل شئی قدیر '' بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اوپر قدرت رکھنے والا ہے۔

سفر میں کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم:

'' من حیث خرجت '' پیچھے جس وقت تحویل کا حکم آیا '' فول وجھك شطر المسجد الحرام '' اس وقت سرور کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں موجود تھے گویا کہ نزول کے اعتبار سے وہ حکم حضر میں آیا اور اب سفر کے بارے میں بھی تاکید کی جا رہی ہے کہ یہ مسئلہ صرف حضر کا نہیں کہ تم نے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا ہے سفر میں بھی کعبۃ اللہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے آپ کے لیے بھی اور آپ کی امت کے لیے بھی، جو حکم حضر کا ہے وہی حکم سفر کا ہے یعنی یہ تاکید اس لیے کر دی کہ قبلے کے مسئلے کو سفر کے معاملے میں مختلف نہ سمجھا جائے۔

بلکہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے حضر اور سفر میں جب بھی نماز پڑھنی ہے ادھر ہی منہ کر کے پڑھنی ہے اگر سفر کے معاملے میں سستی کرو گے تو یہ بھی مناسب نہیں ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ سفر میں اگر قبلہ کے پہچاننے میں دقت پیش آ جائے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اپنی قوت علمیہ کو صرف کرو اور آثار دیکھ کر جاننے کی کوشش کرو کہ کدھر قبلہ ہے جدھر آپ کا دل شہادت دے دے ادھر کو منہ کر لو۔

بہر حال کیف ما اتفق منہ نہیں کرنا، سفر کرتے ہوئے قبلہ کی طرف منہ کرنا ہے قصد یہ ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کرو تحری کا معنیٰ یہی ہوتا ہے کہ صواب معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ درست بات کون سی ہے اپنے طور پر جو تم کر سکتے ہو وہ کرو آثار دیکھ کر علامات دیکھ کر اپنے دل کے اندر سوچ کر جدھر تمہارا دل شہادت دے کہ کعبہ ادھر ہے بس ادھر کو منہ کر کے نماز پڑھ لو۔

بہر حال قبلے کا اہتمام کرنا ہے، بغیر اہتمام کے نہیں، جہاں سے تو نکلے یعنی ابتداء کے ہوتے ہی جہاں سے

نکلے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیرا کرے بے شک یہی بات حق ہے تیرے رب کی طرف سے'' وما الله بغافل عما تعملون '' اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو اس میں سفر کا حکم آ گیا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے خصوصیت کے ساتھ سفر کے متعلق حکم دیا۔

مکرر حکم کی حکمت:

پھر اس کو عام کیا جا رہا ہے آگے ایک حکمت واضح کرنے کے لیے جہاں سے آپ نکلیں آپ اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں تم موجود ہو، یہ عموم آ گیا حضر میں ہو سفر میں ہو، مسجد نبوی میں ہو، بیت اللہ میں ہو، مسجد حرام میں ہو، بیت المقدس میں ہو، جہاں کہیں بھی تم موجود ہو اپنے چہرے مسجد حرام کی طرف پھیر لیا کرو '' لئلا یکون للناس علیکم حجة '' یہ جو تکرار کیا گیا ہے یہ '' لئلا یکون للناس علیکم حجة '' کے بیان کرنے کے لیے ہے کہ یہ حکم تمہیں اس لیے دیا جا رہا ہے تا کہ لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی حجت نہ رہے، جھگڑنے کی گنجائش نہ رہے، جھگڑنے کی گنجائش کس طرح؟ عام طور پر مفسرین یوں ذکر کرتے ہیں کہ کتب سابقہ میں خاتم النبیین کی علامت کے طور پر اشارہ ہے '' یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم '' اس موقع پر جو اس کو ذکر کیا جا رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی علامتیں ہیں خاتم النبیین کی جس کو یہ اہل کتاب بھی پہچانتے ہیں۔

اب اگر نبی آخر الزمان بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے رہتے اور یہ قبلہ نہ بدلتا تو یہ لوگ تمہارے خلاف کل کو اپنی کتابیں اٹھائے پھرتے کہ دیکھو جو علامت ہے خاتم النبیین کی وہ تو ان پر صادق نہیں آتی وہ تو ذوقبلتین ہے اور ان کا قبلہ ایک ہی ہے تو یہ سچے پیغمبر کیسے ہوئے؟ کل کو یہ لوگ اپنی کتابوں کے حوالے دے دے کر تمہارے ساتھ جھگڑتے اور ہم نے اس علامت کو بھی پورا کر دیا اور تمہارا رخ بیت اللہ کی طرف کر کے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کی تکمیل کر دی۔

اب ان لوگوں کے لیے جھگڑنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی جھگڑا ختم ہو گیا وہ علامت جو ان کی کتابوں میں ذکر کی گئی تھی وہ پوری ہو گئی، ہاں ان میں سے جو ظالم ہیں، کٹ حجتی کرنے والے جنہوں نے کسی صورت میں ماننا نہیں وہ تو جھگڑتے رہیں گے ان کی تو بات ہی نہیں جنہوں نے نہیں ماننا، جو ظالم قسم کے لوگ ہیں جو کسی چیز کا حق ادا نہیں کرتے حق تلفی کرتے ہیں وہ تو جھگڑتے رہیں گے۔

البتہ جو منصف قسم کے لوگ ہیں ان کے لیے جھگڑا کرنے کی گنجائش نہیں رہی جھگڑا ختم ہو گیا یہ بھی حکمت ہے اس تحویل میں تا کہ لوگوں کے لیے حجت بازی کا موقع نہ رہے اس طرح سے بھی اس آیت کے مفہوم کو واضح کیا جا سکتا ہے اور عام طور پر مفسرین نے اسی طرح سے ہی واضح کیا ہے۔

لئلا یکون للناس علیکم حجۃ کی دوسری تفسیر:

اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے یہ جو تمہیں حکم دیے دیا ہے کہ ''شطر المسجد الحرام'' منہ مسجد حرام کی طرف کیا کرو اس کے اوپر جم جاؤ، پکے ہو جاؤ، اس میں کوئی ڈھیلا پن نہیں دکھانا حضر میں ہو تو ادھر منہ کرو، سفر میں ہو تو ادھر منہ کرو اگر اس میں ڈھیلا پن دکھاؤ گے کہ لاپرواہی برتنی شروع کر دی یہود و نصاریٰ پھر تمہارے لیے جھگڑے شروع کرلیں گے کہ دیکھو تم فلاں وقت میں یوں کرتے تھے فلاں وقت میں یوں کرتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اپنے نظریے پر پختگی نہیں ہے تمہیں اس کے بارے میں اعتماد نہیں ہے تم اس میں ڈھیلا پن دکھاؤ ہی نہ کہ لوگ اس مسئلے میں تمہارے ساتھ جھگڑا کرسکیں بلکہ سفر میں حضر میں جہاں بھی ممکن ہو بس اسی قبلے کے اوپر جمے رہنا ہے اس کے اوپر پختگی دکھانی ہے تاکہ تمہاری ثابت قدمی کو دیکھ کر پختگی کو دیکھ کر کوئی شخص تم سے اس مسئلے میں جھگڑا کرنے کی کوشش ہی نہ کرے۔

ورنہ اگر عمل کے طور پر ڈھیلا پن دکھاؤ گے تو دوسرے لوگوں کو امید لگی رہے گی کہ شاید بحث مباحثہ کرنے کی ساتھ رخ بدلا جاسکتا ہے اور تم اس طرح سے ڈٹ جاؤ اور اس طرح سے ثابت قدم رہو کہ کسی وقت بھی تمہارا رخ قبلے سے نہ بدلے ہر وقت تمہارا منہ قبلے کی طرف ہی رہے عبادات کے وقت تو دوسرے کسی کو جھگڑنے کی حجتیں اٹھانے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی یہ بھی ایک بات ہے نفسیاتی طور پر کہ انسان اپنے مسلک میں اگر پوری طرح سے ٹھوس ہو جائے تو پھر دوسرا شخص اس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا اور اگر اپنی باتوں میں اپنے عمل میں کچھ ڈھیلا پن سستی دکھائی جائے تو ہر کسی کو طمع ہوتی ہے کہ شاید بحث و مباحثہ کر کے اس کو ہم بدل لیں گے دوسری طرف رخ ہو جائے گا۔

اور اگر انسان اپنے مسلک میں ثابت قدم ہو جائے پوری طرح سے اپنے قول کے ساتھ اپنے فعل کے ساتھ اپنے مسلک کے اوپر اپنا وثوق اور یقین ظاہر کرتا ہے تو پھر کسی دوسرے کو جھگڑا اٹھانے کی گنجائش نہیں رہا کرتی یہ مفہوم بھی ان الفاظ کا ہوسکتا ہے ''لئلا یکون للناس علیکم حجۃ'' تاکہ نہ ہو لوگوں کے لیے تمہارے خلاف کوئی حجت سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں ''للناس'' سے یہود مراد ہیں جنہوں نے شور مچایا تھا۔

خوف صرف اللہ کا ہونا چاہیئے:

ہاں ان میں سے جو بے انصاف ہیں، جن کے اندر ظلم ہے انصاف نہیں وہ تو پھر بھی جھگڑے اٹھاتے

رہیں گے ان کو چھوڑ یے ان کا علاج یہ نہیں کہ ان کے ساتھ بحث وجدال کرو بلکہ ان کے متعلق جذبہ یہ ہو "فلاتخشوھم" ان کی کوئی پرواہ ہی نہ کیجئے، ان سے کوئی اندیشہ ہی نہ کیجئے کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاسکیں گے، شور مچاتے رہیں تمہارا کیا بگاڑتے ہیں بولتے رہیں تمہیں ان کے ساتھ الجھنے کی ضرورت نہیں ہے ظالم قسم کے لوگ جن کا کام ہی بحثیں کرنا ہے اور شور مچانا ہے اعتراض کرنا ہے ان کی طرف سے اندیشہ ہی نہ کیجئے کہ یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاسکتے ہیں "واخشونی" اور ہر وقت مجھ سے ڈرتے رہو کہ میرا خوف اور میری خشیت تمہارے اوپر غالب رہنی چاہیئے ان مخالفین ظالمین کی کوئی پرواہ نہ کیجئے" ولا تم نعمتی علیکم "اور یہ قبلہ جو بدلا گیا یہ اس لیے بھی بدلا گیا تا کہ لوگوں کی حجت بازی ختم ہو جائے اور اس لیے بھی تا کہ میں اپنی نعمت تمہارے اوپر تام کردوں کہ اچھی سے اچھی چیز کی طرف تمہیں متوجہ کروں اور اعلیٰ سے اعلیٰ چیز تمہیں دوں اس طرح سے میرا انعام اور میرا احسان تم پر پورا ہوتا ہے" ولعلکم تھتدون "اور تا کہ تم سیدھی راہ پا جاؤ اس وقت یہی سیدھی راہ ہے جو تمہیں سمجھائی جارہی ہے۔

کما ارسلنا فیکم رسولاً کی تفسیر:

"کما ارسلنا فیکم رسولا" اور یہ قبلے کا تبدیل کرنا اور اعلیٰ چیز کی طرف تمہاری راہنمائی کرنا ایسے ہی ہے جیسے تم پر ہم نے یہ بنیادی احسان کیا یا قبلہ کو بدل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عمارت کو ایسے ہی قبول کرلیا جس طرح سے ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو قبول کرلیا گیا کہ ہم نے اس کی دعا کے موافق ایک رسول اٹھا دیا" کما "کو آپ دونوں طرح سے ہی ظاہر کرسکتے ہیں ہم نے قبلہ بدل کر تم پر احسان کیا جیسے کہ تم پر یہ احسان کیا یا قبلہ کو تبدیل کرکے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا کر ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بناء کو قبول کرلیا۔

جس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو قبول کیا جوانہوں نے رسول کے بھیجنے کے لیے دعا کی تھی وہ دعا بھی قبول ہوگئی اور یہ دعا بھی قبول ہوگئی" ربنا تقبل منا "اے اللہ ہماری طرف سے اس کوشش کو قبول فرما تو اس سے اعلیٰ درجے کی اور قبولیت کیا ہوگی کہ باقی رہنے والے دین میں گویا کہ منسوخ دین میں نہیں قیامت تک رہنے والے دین میں اس بناء ابراہیمی کو عبادت کے لیے قبلہ بنادیا گیا تو جیسے وہ دعا قبول ہوئی تھی ایسے ہی یہ دعا قبول ہوئی رسول بھیجنے والی دعا پہلے قبول ہوئی اور اس کو ہمیشہ کے لیے قیامت تک کے لیے قبلہ بنا کر اس عمارت کی قبولیت جو تھی وہ بعد میں نمایاں ہوگئی جیسے کہ بھیجا ہم نے تمہارے اندر ایک رسول تم ہی میں سے "یتلوا علیکم اٰیٰتنا" تم پر ہماری آیات پڑھتا ہے تلاوت کرتا ہے یہ آیت انہیں الفاظ کے ساتھ آپ کے سامنے پچھلے پارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کے سلسلے میں گزرگئی" ویزکیکم "اور تمہیں صاف ستھرا کرتا ہے" ویعلمکم

الکتاب والحکمۃ ''اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے'' ویعلمکم مالم تکون تعلمون '' اور تمہیں ایسی باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم جانتے نہیں ہو اس میں ادھر متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اس رسول کی قدر کرو ایسی باتیں تمہیں بتاتا ہے جو تم پہلے جانتے نہیں تھے، ان کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہو جاؤ ان سے اچھی اچھی باتیں سیکھو اور یہ تمہارا تزکیہ کرتے ہیں ان سے باطنی ظاہری اور ہر قسم کی صفائی ستھرائی حاصل کرو جیسے یہ اللہ نے تم پر احسان کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کی کہ تمہارے اندر تم میں سے ایک رسول بھیج دیا اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ بنا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کر لی اور یا یہ ہے کہ قبلہ بنا کر اللہ تعالیٰ نے جس طرح سے تم پر احسان کیا یہ ایسے ہی احسان ہے جیسے تمہارے اندر یہ رسول اٹھا کر تم پر ایک احسان کیا تھا کامل رسول دیا کامل کتاب دی اور اعلیٰ سے اعلیٰ افضل سے افضل گھر تمہارے لیے قبلہ بنا دیا ''فاذکرونی '' پس تم مجھے یاد رکھو میرا ذکر کرو '' واذکرکم ''میں تمہارا ذکر کروں گا میں تمہیں یاد رکھوں گا۔

ذکر کی حقیقت:

'' فاذکرونی '' تم مجھے یاد کرو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے یاد کرو یعنی میری اطاعت کے ذریعہ سے، اصل حقیقت ذکر کی اطاعت ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کو یاد کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو یاد رکھتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے احکام سے غفلت ہو اور اس کی نافرمانی کی جائے زبان کے ساتھ اگر کوئی شخص الله اکبر، سبحان الله الحمدلله کہتا بھی ہے تو یہ ذکر کی ایک صورت ہے اس میں ذکر کی حقیقت نہیں ہے، ذکر کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانا جائے اعلیٰ درجے کا ذکر یہ ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو بھی اللہ کے نام کے ساتھ مشغول رکھا جائے عمل کے ساتھ ساتھ جس وقت اپنی زبان سے بھی اللہ کا نام لو گے تو اس میں برکات اور انوارات زیادہ ہو گئیں اس کی بھی تاکید حدیث شریف میں آتی ہے تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر کے ساتھ تر رہنی چاہیئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی عمل اللہ کے عذاب سے اتنا نجات دلانے والا نہیں جتنا اللہ کا ذکر اللہ کے عذاب سے نجات دلانے والا ہے۔

تو عملی زندگی کے ٹھیک کرنے کے ساتھ ساتھ پھر زبان سے تسبیح، تحمید، تکبیر '' سبحان الله، الحمد لله، لااله الا الله، الله اکبر '' ان الفاظ کا دہرانا اللہ کا نام بار بار لینا یہ مزید انوارت اور برکات حاصل ہونے کا ذریعہ ہے قلب کی مناسبت بڑھتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے جس سے عمل کی توفیق ہوتی ہے اس لیے یہ ذکر لسانی اپنی جگہ اہم لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا جائے جو حکم جس وقت آیا آپ اس کو یاد رکھیے اور اس کے مطابق عمل کیجئے یہ ہے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا۔

ورنہ نافرمان ہونے کی صورت میں اگر زبان سے کوئی شخص اللہ اللہ کرتا بھی ہے تو یہ اس کے مقابلے میں

کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ تمہیں یاد کس طرح سے کرے گا؟ اللہ تعالیٰ تمہیں یاد کرے گا تمہاری اطاعت پر ثواب دے کر، تمہاری اطاعت کے اوپر اچھا بدلہ دے کر، تم پر احسانات کر کے اللہ تعالیٰ تمہیں یاد کرے گا۔

اس سے بڑا خوش بخت کون ہوگا؟:

اور ایسے ہی حدیث شریف میں یوں بھی آتا ہے کہ جب ایک شخص اللہ کو یاد کرتا ہے اگر مجلس میں یاد کرتا ہے جس طرح ہم مجلس میں بیٹھے اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اس کا ذکر کرتا ہے کہ میرا فلاں بندہ مجھے یاد کر رہا ہے۔

اور یہ کتنا بڑا شرف ہے جو اللہ تعالیٰ کسی بندے کو دے دیں کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک کسی بندے کا ذکر کریں محبت کے ساتھ اور دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کریں تو یہ بہت بڑا شرف ہے، آپ اس وقت موجود ہیں اور کچھ اشخاص دنیا میں موجود ہیں کہ جن کی عظمت آپ کے دل میں ہے قریب سے قریب بزرگوں میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں حضرت درخواستی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہیں دوسرے بزرگ ہیں اگر آپ کے سامنے کوئی ذکر کر دے کہ فلاں بزرگ آپ کو یاد کر رہے تھے اور آپ کا ذکر کر رہے تھے کہ بڑا اچھا آدمی ہے تو جس وقت یہ خبر آپ کو پہنچے گی آپ خود اپنے دلوں کا اندازہ لگالیجیے کہ کتنی خوشی ہوتی ہے اور انسان اپنی عزت میں کتنا اضافہ سمجھتا ہے کہ فلاں بزرگ کی مجلس میں میرا ذکر اچھے الفاظ میں ہو رہا تھا تو جب ان اشخاص کی مجلس کے اندر اچھے الفاظ کے ساتھ کسی کا ذکر ہو تو وہ اپنے لیے اس کو ایک عظمت کی دلیل بناتا ہے عزت کی دلیل بناتا ہے اور اس کی طبیعت میں سرور اور خوشی آتی ہے تو درود شریف پڑھنے کے ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آپ کا ذکر اور اللہ کا ذکر کرنے کے ساتھ اللہ کی مجلس کے اندر آپ کا ذکر آجائے اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اندر آپ کا ذکر کریں تو یہ بہت بڑی شرافت ہے جو کسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔

تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ یاد کریں گے، اگر کوئی خلوت میں یاد کرتا ہے، تنہائی میں کوئی اللہ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہے کسی کے سامنے نہیں اور اگر مجلس میں یاد کرتا ہے اس طرح سے تذکرہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا اس کے اسماء کا اس کی صفات کا جیسے بھی تذکرنے کی صورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی مجلس کے اندر ذکر فرماتے ہیں یعنی جیسا آپ کا عمل ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ویسے ہی جزا ملتی ہے۔

ذکر کی پابندی کا طریقہ:

اور ذکر کی پابندی کی یہ صورت بھی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جن مواقع پر دعائیں منقول ہیں

کہ آپ فلاں موقع پر یہ دعا پڑھا کرتے تھے، فلاں موقع پر یہ پڑھا کرتے تھے اگر کوئی شخص ان دعاؤں کی پابندی کرلے تو بھی یوں سمجھا جائے گا کہ ہر وقت اللہ کو یاد کرنے والا ہے "کان یذکر اللہ فی کل احیانہ" حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ اپنے تمام اوقات میں اللہ کو یاد رکھا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کے یاد کرنے کی یہ صورت بھی ہے کہ جب بھی کوئی آپ کا حال بدلے جس وقت بھی آپ کوئی کام کرنے لگیں۔

تو حدیث شریف میں جو دعائیں تلقین کی گئی ہیں اگر ان دعاؤں کو انسان پڑھتا رہے تو ایسی صورت میں بھی ہر وقت اللہ کا ذکر لازم آجاتا ہے دعاؤں کی پابندی کریں چلتے پھرتے ویسے اللہ کی تسبیح تکبیر زبان پر جاری رکھیں بہت بڑی برکت کی چیز ہے اور اس کے ساتھ مزید نیکی کی توفیق ہوتی ہے اور اصل بنیادی چیز اللہ کی یاد ہی ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کی جائے تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

شکر کا مفہوم اور اس کا طریقہ:

"واشکروالی" اور میرا شکر ادا کرو، شکر کا اصل معنی ہوتا ہے قدردانی، کسی کی نعمت کی قدر کرنا یہ شکر ہے، میرے احسانات کی قدر کرو، قدر زبان سے بھی ہوتی ہے، دل سے بھی ہوتی ہے، عمل سے بھی ہوتی ہے اس لئے آپ تعمیم کرتے ہیں کہ شکر ایک لسان سے ہوتا ہے، ایک ارکان سے ہوتا ہے، ایک جنان سے ہوتا ہے، زبان سے شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا احسان ذکر کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مہربانی فرمائی، یہ احسان کیا، زبان کے ساتھ تذکرہ کرنا یہ بھی شکر گزاری ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ حدیث شریف میں آتا ہے "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر گزار نہیں ہوسکتا ہے تم پر انسانوں میں سے کوئی انسان احسان کرے تو اس کی بھی شکر گزاری ہے "ان اشکر لی ولوالدیك" میرا بھی شکر ادا کر اور اپنے والدین کا بھی شکر ادا کر، والدین کی طرف نسبت قرآن کریم میں صراحتاً آئی ہوئی ہے "من لم یشکر الناس" کا مطلب یہ ہے کہ میری نعمتیں جن لوگوں کی وساطت سے ملا کرتی ہے جو ان واسطوں کا شکر گزار نہیں وہ میرا شکر گزار نہیں اگر براہ راست تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں لیکن جن واسطوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمت آپ کو ملی ہے ان کی آپ بے قدری کریں گے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ بندہ میرا شکر گزار نہیں ہے، میرے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ پہلے ان واسطوں کا شکر ادا کرو جن واسطوں کے ساتھ میری نعمت تمہیں ملی ہے، والدین کی شکر گزاری کرو یہ میری شکر گزاری ہے، استاذ کی شکر گزاری کرو یہ میری شکر گزاری ہے، شیخ کی کرو، دوسرے جو بھی محسن ہیں، جتنے بھی احسان کرنے والے ہیں کوئی آپ کو پانی

پلاتا ہے، کوئی آپ کو کھانا کھلاتا ہے، کوئی آپ کو لباس دیتا ہے، کسی صورت میں آپ کے ساتھ زندگی کے اندر اعانت کرتا ہے جس کو آپ کہتے ہیں کہ احسان ہے اس کا بھی شکر ادا کرو وہاں بھی شکر کی یہی صورت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس پر احسان کیا جائے اگر وہ اس احسان کو چھپالے کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا کہ فلاں شخص نے میرے پر احسان کیا ہے تو یہ ناشکری ہے، یہ کفران نعمت ہے، جس پر احسان کیا جائے اس پر اخلاقاً یہ ضروری ہے کہ احسان کرنے والے کی لوگوں کے سامنے تعریف کرے کہ دیکھو فلاں شخص نے میرے اوپر احسان کیا ہے، فلاں شخص نے میرے اوپر احسان کیا ہے یہ ہے شکر گزاری اور کتمان ناشکری ہے اور احسان کرنے والے کو تعلیم دے دی کہ وہ اخفاء کی کوشش کرے وہ نہ لوگوں کو کہے کہ میں نے اس کے اوپر احسان کیا ہے کیونکہ جس وقت وہ کہے گا کہ میں نے احسان کیا ہے تو اس سے دوسرے شخص کی تذلیل ہوتی ہے اور اسے وہ شخص اپنی اہانت سمجھے گا اس کی پستی نمایاں ہوتی ہے جس کی بناء پر اس تکلیف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے احسان کے ثواب کو ضائع کر دیتے ہیں لیکن جس پر احسان کیا گیا وہ محبت کے ساتھ تذکرہ کرے گا تو احسان کرنے والے کے دل میں محبت آئے گی اس طرح آپس میں جوڑ ہوتا ہے تو زبان سے تعریف کرنا، اس کے لئے دعا کرنا، اس کی عظمت اپنے دل کے اندر محسوس کرنا اور جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت میں کوشش کرنا یہ انسانوں کی شکر گزاری ہے۔

والدین کا شکر اسی طرح سے ادا کیجئے، اپنے دوسرے محسنین کا شکر اسی طرح سے ادا کیجئے تو اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان واسطوں کا شکر ادا کیجئے جن کے ذریعے سے اللہ کی نعمت آپ کو ملی ہے اور پھر ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر بھی کیجئے زبان سے بھی کہ اللہ نے احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ مہربانی کی الحمد للہ اللہ کا شکر ہے اور قلب میں عظمت محسوس کیجئے اور اپنے احسان کرنے والے محسن کی اطاعت کیجئے، فرمانبرداری کیجئے اس کے احکام کو بجالائیے یہ شکر کے ادا کرنے کی صورت ہوتی ہے۔

شکر سے انعامات میں اضافہ ہوتا ہے:

اور پھر اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے "لئن شکرتم لازیدنکم" اگر تم میری نعمتوں کی قدر کرو گے تو پھر میں زیادہ نعمتیں دوں گا، نعمت میں اضافہ ہو جاتا ہے، انسانوں کے اندر بھی عادت اسی طرح سے ہے اگر آپ کے ساتھ کوئی حسن سلوک کرتا ہے آپ اس کی تعریف کریں گے، اس کی عظمت دل میں محسوس کریں گے، اس کی عزت نمایاں کریں گے تو اس کے دل میں داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ میں اس کے اوپر اور احسان

کروں اور اگر کسی نے احسان کیا اور آپ آگے سے ناقدری کر دیں آگے سے منہ چڑاتے ہیں، اس کو الٹا تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنی طرف سے کوئی محبت کا اظہار نہیں کرتے تو انسان کے قلب کے اندر جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کے اوپر احسان کیا جائے آئندہ کے لئے وہ رک جاتا ہے۔

تو بندوں کے اندر بھی عادت اسی طرح سے ہے اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت بڑھتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو ہیں وہ زائل ہو جاتی ہیں، میرا شکر ادا کیجئے، میرا احسان مانو میری نعمتوں کی قدر کرو "ولاتکفرون" اور میرے ساتھ ناشکری سے پیش نہ آؤ، میری نعمتوں کی ناقدری نہ کرو، رسول میں نے بھیجا ہے اس کی بھی قدر کرو اور اس کو کتاب دی اس کی بھی قدر کرو، اس کی تعلیمات کی قدر کرو یہ سب اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کی صورت ہے۔ جس کے ساتھ پھر ان احسانات کی برکات میں اضافہ ہوگا۔

مکہ معظمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ:

سوال: مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ کیا تھا؟

جواب: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کدھر منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے کسی آیت میں مذکور نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب مکہ معظمہ میں نماز فرض کی گئی تھی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ کدھر متعین کیا گیا تھا روایات کی طرف دیکھتے ہوئے بعض حضرات نے صورت یہ بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلے انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کی رعایت رکھتے ہوئے بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھنی شروع کی، مکہ معظمہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور مدینہ منورہ میں بھی آ کر اسی طرح سے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے، سولہ سترہ مہینے کے بعد قبلہ کو منسوخ کر کے کعبہ کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کر دیا گیا تو اس سے وہ مسئلہ بھی ثابت ہو گیا جو آپ کے سامنے آیا کرتا ہے نسخ کی صورتوں میں جو ذکر کیا گیا تھا کہ ایک حکم حدیث سے ثابت ہو قرآن سے منسوخ کر دیا جائے یہ اس کا نمونہ بن سکتا ہے کیونکہ قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں یہ حکم دیا گیا ہو کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ منہ کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی از خود اللہ تعالیٰ کے سمجھانے کے ساتھ ادھر کو منہ کرنا شروع کیا بہر حال یہ حکم قرآن کریم میں نہیں آیا بیت المقدس کا استقبال حدیث کے ساتھ ہوا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر کے بیت اللہ کی طرف متوجہ کر دیا۔

تو نسخ کی ایک صورت کہ کتاب اللہ کا حکم کتاب اللہ سے منسوخ ہو، سنت رسول اللہ کا حکم سنت سے منسوخ ہو یہ دونوں صورتیں تو متفق علیہ ہیں اور آپ اصول فقہ کے اندر پڑھیں گے کہ احناف رحمہم اللہ کے نزدیک یہ صورت بھی واقع ہے کہ حکم حدیث سے ثابت ہو منسوخ قرآن سے ہو جائے، حکم قرآن سے ثابت ہو منسوخ حدیث سے ہو جائے تو یہ ایک مثال ہے آپ کے سامنے اس کی کہ استقبال بیت المقدس یہ حدیث سے ثابت تھا اور قرآن سے منسوخ ہو گیا دوسری بات بعض حضرات نے یہ بھی کہی کہ چونکہ آپ ملت ابراہیمی پر تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس عمارت کی نسبت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم منہ بیت اللہ کی طرف کیا کرتے تھے بیت المقدس کی طرف نہیں کرتے تھے لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی صراحتاً حکم نہیں آیا ہوا تھا۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ نہیں تطبیق دیتے تھے کہ حجر اسود اور رکن یمانی یہ کونہ یوں سمجھ لیجئے بالکل بیت اللہ اسی طرح سے ہے جیسے ہمارا منہ بیت اللہ کے دروازے کی طرف ہے وہاں بیت اللہ میں جس وقت آپ جائیں گے دیکھیں گے بیت اللہ کا منہ مشرق کی طرف ہے اور ہم مشرق میں رہنے والے ہیں ہمارے لئے کعبہ مغرب کی طرف ہے جب ہم ادھر منہ کریں گے تو ہمارا منہ ادھر واقع ہوتا ہے جدھر بیت اللہ کا دروازہ ہے، ہمارا رخ اس جہت میں ہے اور بیت اللہ کا دروازہ ادھر ہماری طرف ہے اور اس کونے کے اوپر حجر اسود ہے اور یہ رکن رکن یمانی کہلاتا ہے یہ کونہ تو یہاں سے لے کر یہاں تک ادھر کو منہ اگر کیا جائے تو بالکل بیت المقدس سامنے آجاتا ہے بیت اللہ اس جہت میں ہے اور مدینہ منورہ یہاں ہے اس لئے آپ کا منہ جب ادھر کو ہوتا تھا تو پشت بیت اللہ کی طرف ہوتی تھی اور جس وقت آپ کا منہ بیت اللہ کی طرف کر دیا گیا تو پشت بیت المقدس کی طرف ہوگئی۔

یہاں رہ کر دونوں صورتیں جمع نہیں کی جاسکیں کیونکہ مدینہ منورہ درمیان میں آگیا اور میزاب رحمت ادھر ہے اس شق میں تو مسجد نبوی کا قبلہ میزاب رحمت کی طرف ہے اور ہمارا قبلہ بیت اللہ کے دروازے کی طرف ہے تو وہاں رہتے ہوئے تو ایسی صورت ہو سکتی تھی کہ جب نماز پڑھیں منہ ادھر کو کریں تو بیک وقت دونوں کی طرف رخ ہو جائے بناء ابراہیمی کی رعایت بھی ہو جائے اور بیت المقدس کی رعایت بھی ہو جائے بہر حال جو بھی عملی صورت تھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت وحی خفی کے ساتھ تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اس وقت تعیین کے طور پر قبلے کا کوئی حکم نہیں آیا تھا زیادہ ظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے پھر بیت اللہ کی طرف ہو گیا۔

ہمارے سامنے صراحت کے ساتھ یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ پہلے قبلہ متعین کیا گیا تھا بیت اللہ اور پھر بیت المقدس کیا گیا پھر بیت اللہ بنا دیا گیا یہ صورت نصوص کے تحت متعین نہیں ہے واضح طور پر کتاب اللہ میں یہی ذکر آیا کہ بیت المقدس کی طرف آپ کا نماز پڑھنا اس وقت نمایاں ہوا جب آپ ﷺ مدینہ منورہ میں گئے کہ پھر بیت اللہ کی طرف کلیۃً پشت ہوگئی گویا کہ قبلہ آپ ﷺ کے عمل کے ساتھ بیت المقدس قرار پا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو کلیۃً بدل دیا کہ اب بیت المقدس کی طرف پشت ہوگئی بیت اللہ کی طرف منہ ہوگیا باقی نصوص میں یہ کوئی متعین نہیں کہ مکہ معظمہ میں حضور ﷺ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بیت المقدس کی رعایت نہیں رکھتے تھے۔
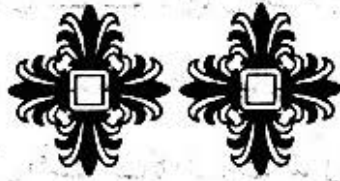
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ

اے ایمان والو! مدد طلب کرو صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے سے ، بے شک اللہ تعالیٰ ساتھ ہے

الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ

صبر کرنے والوں کے ﴿۱۵۳﴾ مت کہو ان لوگوں کے متعلق جو قتل کیے گئے اللہ کے راستے میں کہ وہ مردہ ہیں ،

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ

بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے ﴿۱۵۴﴾ البتہ ضرور آزمائش کریں گے ہم تمہاری کچھ

الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ

خوف کے ذریعے سے اور کچھ بھوک سے اور کچھ اموال اور نفسوں کے گھٹانے سے اور ثمرات کے گھٹانے سے ،

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا

اور تو بشارت دے دے صبر کرنے والوں کو ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے ، تو وہ کہتے ہیں بے شک ہم

لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

اللہ کے لئے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کے اوپر خصوصی رحمتیں ہیں ان کے رب کی طرف سے

وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ

اور عمومی رحمت ہے ، اور یہی لوگ ہیں جنہوں نے صحیح راہ پائی ﴿۱۵۷﴾ بے شک صفا اور مروہ

مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

اللہ کی علامات میں سے ہیں ، پھر جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ کرے کوئی گناہ نہیں

عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ

اس کے اوپر کہ ان دونوں کے درمیان گھومے ، اور جو شخص بھی کوئی بھلا کام خوشی کے ساتھ کرے ، پس بے شک اللہ تعالیٰ

شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ

قدردان ہے اور جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾ بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم نے اتاری واضح دلائل

وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِۙ اُولٰٓئِكَ

اور ہدایت بعد اس کے کہ ہم نے واضح کر دیا اس کو لوگوں کے لیے کتاب میں ، یہی لوگ ہیں کہ

يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا

ان کے اوپر اللہ لعنت کرتا ہے اور بھی بہت سارے لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ مگر جو لوگ توبہ کرلیں اور اپنے احوال کو درست کرلیں

وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ

اور ظاہر کردیں یہی لوگ ہیں کہ میں ان کے اوپر متوجہ ہوتا ہوں ، اور میں تو بہت متوجہ ہونے والا ہوں اور رحم کرنے والا ہوں ﴿۱۶۰﴾ بے شک

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر ہیں یہی لوگ ہیں کہ ان کے اوپر اللہ کی

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَۙ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۚ لَا يُخَفَّفُ

فرشتوں کی انسانوں کی سب کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ اس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ، نہ ہلکا کیا جائے گا

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌۚ

ان سے عذاب اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے ﴿۱۶۲﴾ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے ،

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

اس کے بغیر کوئی معبود نہیں وہ رحمٰن اور رحیم ہے ﴿۱۶۳﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

تحویل قبلہ کا مسئلہ پچھلے دو رکوع کے اندر ذکر کیا گیا جس کے ضمن میں آپ کے سامنے یہ بات آئی کہ اس مسئلے میں یہود کی طرف سے بہت پروپیگنڈا ہوا اور مختلف قسم کے طعن وتشنیع کے ذریعے سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی گئی ایسے موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں کہ جو تکلیف ان باتوں سے تمہیں پہنچی ہے اس پر صبر سے کام لو پہلے ذکر اور شکر کا حکم تھا اب صبر کا حکم دیا جا رہا ہے۔

صبر کا مفہوم اور اس کی حقیقت:

"استعینوا بالصبر والصلوٰۃ" اس آیت میں دو اہم اور بنیادی چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، ایک صبر ہے اور ایک نماز ہے، صبر کا مفہوم آپ کے سامنے گزر چکا صبر کا معنی ہے روک کر رکھنا، اس کے پھر مختلف درجات ہیں، نیکی کرنے کو دل نہیں کرتا اپنے آپ کو نیکی اور اطاعت پر جمائے رکھنا صبر ہے، برائی نفس کو اچھی لگتی ہے اس کو چھوڑنے کو دل نہیں کرتا اس سے اپنے نفس کو روک لینا یہ بھی صبر ہے اور ایک درجہ یہ ہے کہ کوئی پریشانی آ گئی، مصیبت آ گئی، تکلیف پہنچ گئی ان تمام چیزوں کو برداشت کرنا اور اپنے آپ کو کنٹرول کر لینا یہ بھی صبر ہے، اب ہمارے ہاں صبر کا آخری درجہ تو موجود ہے اور ہر شخص اس کو سمجھتا ہے لیکن پہلے دو درجوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو نیکی پر ثابت قدم رکھے اور برائی سے بچنے کی کوشش کرے یہ تینوں ہی صبر کے درجے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعامات صبر کرنے والوں کے لئے ہیں یہ تب ہی ملیں گے جب ان تینوں قسم کا صبر ہوگا ورنہ صرف ایک چیز کو اپنانے ہی سے صابر نہیں کہلا سکتا۔

صبر کی فضیلت:

حدیث مبارکہ میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے کہ مؤمن کا معاملہ عجیب ہے اس کی ہر حالت خیر ہے اور یہ چیز مؤمن کے سوا کسی کو حاصل نہیں کہ اگر مؤمن کو خوش کرنے والی بات پہنچ گئی تو اس نے شکر کیا یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے اور اگر اس کو تکلیف دینے والی بات پہنچ گئی تو اس نے صبر کیا یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے نقصان کسی حال میں بھی نہیں ہے، ہر حال میں فائدہ ہی فائدہ ہے اور اگر خوشی میں شکر نہ کرے اور تکلیف میں صبر نہ کرے تو پھر یہ خسارے اور نقصان میں ہے۔

مصائب سے بچنے کے لئے نماز کا اہتمام:

اور صبر کے ساتھ دوسری چیز نماز ہے، یہ بھی اللہ کی مدد کو حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو آپ فوراً نماز کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے اور حدیث شریف میں جو آپ مختلف قسم کی نمازوں کا تذکرہ پڑھتے ہیں صلوٰۃ الحاجۃ ہوگئی، صلوٰۃ الاستسقاء ہوگئی، صلوٰۃ التوبہ ہوگئی، صلوٰۃ الکسوف ہوگئی اور اسی طرح سے صلوٰۃ الخسوف یہ ساری کی ساری مشکل اوقات میں پڑھی ہوئی نمازیں ہیں جس سے پتہ چل گیا کہ نماز کی پابندی سے مشکلات دور ہوتی ہیں اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے بہر حال مسلمانوں کو متوجہ کر دیا کہ تمہیں جو ان کے طعن و تشنیع کی وجہ سے تکلیف پہنچی ہے

اس سے پریشان نہ ہوں صبر کرو اور نماز کا اہتمام کرو، ان کے ساتھ اللہ سے مدد طلب کرو بے شک اللہ کی مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے۔

شہداء کو مردہ کہنے کی ممانعت:

"ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات" صبر کی عمومی تعلیم دینے کے بعد اب خاص خاص مقامات کو بیان کیا جارہا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو شخص اللہ کے راستہ میں قتل کردیا جائے اس کو مردہ نہ کہو، فی سبیل اللہ سے مراد ہے اللہ کے دین کو پھیلانا اور اس کی اشاعت کرنا، اب جو شخص دین کی تبلیغ کرتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگادے اور اپنے آپ کو قربان کردے حقیقتاً شہید اس کو کہا جاتا ہے ورنہ شہداء اور بھی ہیں جن کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو حادثاتی موت مرے وہ بھی شہید ہے، جو سمندر میں ڈوب کر مرجائے شہید وہ بھی ہے پیٹ کی بیماری میں مرجائے شہید وہ بھی ہے لیکن یہاں فی سبیل اللہ کی قید جو لگائی ہے اس لئے مردہ کہنے کی ممانعت اسی کے متعلق ہوگی جو اللہ کے راستہ میں قتل ہوا اور جو دوسرے شہید ہیں جن کا ابھی میں نے ذکر کیا ان کے لئے یہ بات نہیں ہوگی، اور پھر موت تو ایک مرتبہ اس کو بھی آئی ہے لیکن اس کو مردہ کہنے کی ممانعت اس کے اعزاز کے طور پر ہے۔

"بل احیاء ولکن لاتشعرون" بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے یہ بھی ان کا اعزاز ہے کہ ویسے تو قبر کے اندر ہر جسم کے ساتھ روح کا کچھ نہ کچھ تعلق ہوتا ہے لیکن اس کے جسم کے ساتھ روح کا تعلق زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس کو احیاء کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اور یہاں جو فی سبیل اللہ کا لفظ کہا گیا ہے اسی سے یہ بیان بھی نکلتا ہے کہ مجاہد کی نیت بھی صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا ہو، اخلاص کے ساتھ جہاد کرے تب اس کو وہ فضیلت حاصل ہوگی جو شہید کی ہے ورنہ اگر نیت ٹھیک نہیں ہے، اپنی بہادری دکھانا مقصود ہے یا شہرت مقصود ہے تو پھر اس کا انجام اس حدیث میں مذکور ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابتداء میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جن لوگوں کو پیش کیا جائے گا ان میں ایک قاری ہوگا، ایک سخی ہوگا اور ایک شہید ہوگا، تینوں کی نیت ٹھیک نہیں ہوگی ان تینوں کو گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا اس لئے نیت کا ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے۔

حیات انبیاء علیہم السلام کا ثبوت:

پھر اسی آیت سے استدلال کرکے کہا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی اپنی قبروں میں حیات ہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے اور شہداء انبیاء علیہم السلام سے کم درجے میں ہیں کم درجے والوں کے لئے حیات کا ثبوت ہے

تو جوان شہداء سے اوپر درجے والے ہیں وہ تو بطریق اولیٰ حیات ہوں گے اس اصول کے تحت اس آیت سے حیات انبیاء علیہم السلام کا ثبوت بھی مہیا ہو گیا۔

دنیا میں آزمائش کے مختلف طریقے:

"ولنبلونکم" اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آزمائش کے مختلف طریقے بیان کیے ہیں "ولنبلونکم" البتہ ہم ضرور تمہیں آزمائیں گے "بشیء من الخوف" کچھ خوف دے کر، خوف میں مبتلا کر دیں گے، دشمن کا خوف ہو یا کسی اور چیز کا "والجوع" اور بھوک میں مبتلا کر کے، قحط سالی ہو جائے، روزگار نہیں ہوگا، فاقوں کی نوبت آجائے گی "ونقص من الاموال" اور مالوں میں کمی کر کے بھی آزمائیں گے "والانفس" اور نفسوں میں کمی کر کے بھی آزمائیں گے نفسوں میں کمی موت کے ساتھ ہوگئی، کسی کا بیٹا فوت ہو گیا، کسی کا باپ فوت ہو گیا تو نفسوں میں کمی کر کے بھی آزمائیں گے "والثمرات" اور پھلوں میں کمی کر کے بھی آزمائیں گے جس طرح فصل بوئی تھی آندھی سے خراب ہوگئی، کیڑا لگ گیا وغیرہ تو یہ ساری صورتیں دنیا میں آزمائش کی ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتے ہیں۔

صابرین کی خاص صفت:

"وبشر الصابرین" اور جو ان مصائب، آزمائش اور تکالیف میں صبر کریں ان کو خوشخبری دے دیجئے، کس چیز کی خوشخبری دینی ہے؟ اس کو آگے بیان کیا جا رہا ہے، اس سے پہلے صبر کرنے والوں کی ایک خاص صفت بیان کر دی کہ صبر کرنے والے وہ ہیں "الذین اذا اصابتھم مصیبة" کہ جب بھی انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہتے ہیں، یعنی زبان اور دل سے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں، اسی کے بندے ہیں، اسی کے مملوک ہیں، اور ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس کی مرضی وہ جس حال میں رکھے، وہ ہمیں جس حال میں بھی رکھے گا ہم اس پر ناراض نہیں ہو سکتے، ہم ہر حال میں اس کی رضا پر راضی ہیں یہ مطلب ہے "انا للہ وانا الیہ راجعون" کا۔

فائدہ:

یہ بہت بابرکت کلمہ ہے حدیث شریف میں اس کلمہ کے ساتھ ایک دعا بھی مذکور ہے ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب کسی مسلمان کو مصیبت پہنچ جائے اور وہ اللہ کے فرمان کے مطابق "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھے اور ساتھ یہ دعا بھی پڑھے "اللھم

اجرنی فی مصیبتی واخلفلی خیرامنھا" تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کو اس سے بہتر عطا فرمائے گا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں جب میرے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو میں نے سوچا کہ میرے لئے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر کون سا مسلمان ہوگا؟ اس کا گھرانہ پہلا گھرانہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی پھر میں نے مذکورہ دعا پڑھ لی تو مجھے اللہ تعالیٰ نے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے بدلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عطا فرمادی یعنی آپ سے نکاح ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر ہیں (مسلم ص ۳۰۰ ج ۱)

صبر کا انعام:

آگے اس بشارت کا بیان ہے جو پیچھے کہا تھا کہ صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو، کس چیز کی خوشخبری دینی ہے؟ اس کو یہاں بیان کر دیا "اولئك عليهم صلوات من ربهم ورحمة" صلوات جمع ہے صلوٰۃ کی اور صلوٰۃ رحمت کو کہتے ہیں اور آگے پھر رحمت کو علیحدہ ذکر کر دیا اس لئے دونوں میں فرق کرنے کے لئے میں نے صلوٰۃ کا ترجمہ کیا تھا خاص رحمت اور رحمت کا ترجمہ کیا تھا عام رحمت کہ ان پر اللہ کی خصوصی رحمتیں بھی ہوں گی اور عمومی رحمتیں بھی ہوں گی، خاص رحمت تو اس خاص واقعہ کے متعلق ہوگی جو پیش آیا ہے اور عمومی رحمت ویسے ہی ہوگی جو مؤمنین کو ہوتی ہے اور یا پھر رحمۃ کا لفظ صلوٰۃ کی تاکید کے طور پر ہے، صلوات چونکہ جمع ہے اس لئے رحمت کی مختلف انواع واقسام مراد ہیں جو دنیا کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہیں اور آخرت کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہیں "واولئك هم المهتدون" اور جو صبر کرتے ہیں یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

ان الصفا والمروة کا شان نزول:

اگلی آیت میں حج کے ارکان میں سے ایک رکن کا حکم مذکور ہے، صفا اور مروہ دو پہاڑوں کے نام ہیں جو مکہ میں ہیں اس آیت کے شان نزول کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے ایک بت صفا پہاڑی پر رکھا ہوا تھا جس کا نام اساف تھا اور ایک بت مروہ پہاڑی پر رکھا ہوا تھا جس کو وہ نائلہ کہتے تھے تو جب حج کرتے تو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے جب اسلام کا زمانہ آیا تو ان بتوں کو گرا دیا گیا اب مسلمانوں کو گمان ہوا کہ صفا مروہ پر آنا جانا تو جہالت کا کام ہے وہ تو اپنے بتوں کی وجہ سے ان پر آتے تھے اس لئے مسلمان ان کے درمیان سعی کرنے سے رک گئے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حج وعمرہ میں صفا مروہ کے درمیان سعی کرنا:

"ان الصفا والمروة من شعائر الله" شعائر شعیرۃ کی جمع ہے اس کا معنی ہے علامت، شعائر اللہ سے وہ

اعمال مراد ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے انہی شعائر میں سے صفا اور مروہ ہیں حج اور عمرہ میں ان دونوں پر سات مرتبہ آنا جانا ہوتا ہے اس کو سعی بین الصفا والمروۃ کہتے ہیں "فمن حج البیت اواعتمر" جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے "فلاجناح علیه ان یطوف بهما" تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس بات پر کہ وہ ان دونوں پر بھی آئے، بظاہر آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی سعی کرتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کرلے تو ٹھیک ہے اس سے زیادہ سے زیادہ اس کی اباحت ثابت ہوتی ہے جب کہ فقہ کی کتابوں میں آپ نے پڑھا ہے کہ یہ سعی کرنا احناف رحمہم اللہ کے نزدیک واجب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں جو "لاجناح" آیا ہے یہ سوال کی مناسبت سے ہے سوال یہ تھا کہ صفا اور مروہ پر تو بت رکھے ہوئے تھے اور لوگ انہی کی پوجا کے لئے یہاں آیا کرتے تھے اس کو جائز نہیں ہونا چاہیے تو جواب دے دیا کہ یہاں آنے میں کوئی گناہ نہیں ہے یہاں آیا کرو اس طرح اباحت والا شبہ زائل ہو گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھانجے کو جواب:

اسی طرح یہی سوال حضرت عروۃ رضی اللہ عنہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے "فلاجناح علیه ان یطوف بهما" فرمایا ہے اس میں لفظ "لاجناح" سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سعی بین الصفا والمروۃ نہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اے میری بہن کے بیٹے! اگر بات اس طرح ہوتی جیسے تو کہتا ہے تو آیت کے الفاظ یوں ہوتے "فلاجناح علیه ان لایطوف بهما" یعنی اس پر کوئی گناہ نہیں جو صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرے اور جب کہ آیت میں ہے کہ جو اس پر آئے اس پر کوئی گناہ نہیں، بہرحال یہ صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں اور ان کی سعی واجب ہے، آگے فرمادیا کہ جو بھی شخص کوئی اچھا کام اپنی خوشی سے کرے تو بے شک اللہ تعالیٰ قدردان ہیں اس کو ضائع نہیں کریں گے اور اس کو جانتے بھی ہیں اس پر اجر بھی عطا کریں گے۔

علماء سوء کا مصداق اور ان کا کردار:

"ان الذین یکتمون ما انزلنا" وہ کھلی کھلی ہدایت کی باتیں جو ہم نے لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کردیں اور ہماری اس وضاحت کے باوجود جو لوگ ان کو چھپاتے ہیں ان پر اللہ کی بھی لعنت اور لعنت کرنے والوں کی بھی لعنت "اللاعنون" کو عام ذکر کردیا جو بھی لعنت کرنے والے ہیں جیسے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق پوش علماء جن کو علماء سوء کہا جاتا ہے، اور علماء سوء انہیں کہا جاتا ہے جو اپنے علم کے ساتھ حق ثابت نہیں کرتے،

حق کا اعلان نہیں کرتے بلکہ اپنے علم کو حق کے چھپانے میں باطل کی حمایت میں صرف کرتے ہیں وہ ہوتے ہیں علماء سوء، علماء سوء کا ترجمہ عام طور پر لوگ کر دیا کرتے ہیں بدکردار علماء اور اس سے شبہ اس بات کی طرف جاتا ہے کہ شاید وہ علماء جن کے عمل کے اندر کمزوری ہے جو کسی اخلاقی کمزوری میں مبتلاء ہیں یا معاملاتی کمزوری میں مبتلاء ہیں، لوگوں کے حق ادا نہیں کرتے، وہ جھوٹ بولتے ہیں، غلط بیانی کرتے ہیں معاملات کے اندر یا ان کے اخلاق کے اندر کسی قسم کا سقم ہے یا وہ عبادات میں پوری طرح سے حصہ نہیں لیتے، عبادات میں کوئی کوتاہی کرتے ہیں تو بدکردار علماء سے ذہن ادھر کو جاتا ہے یہ بات ٹھیک نہیں ہے یہ جو علماء کی تقسیم ہے کہ ایک علماء خیر ہیں اور ایک علماء سوء ہیں علماء خیر جن کو ہم علماء حق کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور دوسرے علماء سوء۔

یہ تقسیم اس اعتبار سے نہیں کہ ان کا ذاتی کردار کیا ہے، خالی کردار کے اعتبار سے یہ تقسیم نہیں ہے یہ تقسیم ہے اس اعتبار سے کہ وہ اپنے علم کو استعمال کس طرح سے کرتے ہیں، اگر ایک شخص حق کا اعلان کرتا ہے، حق کی حمایت کرتا ہے، اپنے علم کو باطل کی تردید میں استعمال کرتا ہے اور کسی سے پیسے لے کر کسی سے لالچ میں آ کر مسئلہ غلط نہیں بتاتا، جب مسئلہ بتاتا ہے صحیح بتاتا ہے پھر وہ اگر اپنی ذات کے اندر کچھ کوتاہی کرتا ہے عبادات زیادہ نہیں کرتا، یا اس کے معاملات میں کوئی کسی قسم کا نقص ہے یا اس کے اخلاق کے اندر کوئی کسی قسم کا سقم ہے تو اس کو علماء سوء میں شمار نہیں کیا جائے گا یہ علماء حق میں سے ہے وہ جو اپنے علم کے ساتھ حق کا اثبات کرتا ہے اور باطل کی تردید کرتا ہے ہمیشہ مسئلہ سچا بتاتا ہے نہ کسی سے ڈر کر مسئلہ غلط بتائے نہ کسی لالچ میں آ کر مسئلہ غلط بتائے یہ علماء حق کی فہرست میں شامل ہے۔

باقی اس کے کردار میں جو کمی ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اس کو معاف فرما دیں گے بہر حال وہ علماء سوء میں شامل نہیں اور جو لوگ علم حاصل کرنے کے بعد پھر کتمان حق کرتے ہیں، حق کی حمایت نہیں کرتے بلکہ اپنے علم کے زور کے ساتھ وہ بدعات نکالتے ہیں اور بدعات کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں گمراہی پھیلاتے ہیں حق کی حمایت نہیں کرتے باطل کی حمایت کرتے ہیں تو یہ لوگ جنہوں نے اپنے علم کا استعمال غلط کیا ہے ان کو علماء سوء کہا جائے گا۔

اور حدیث شریف کے اندر سرور کائنات ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! بری چیز کونسی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ان شر الشر شرار العلماء وان خیر الخیر خیار العلماء (مشکوٰۃ ص ۳۷)" کہ بہترین چیزوں میں سے سب سے زیادہ بہتر علماء خیر ہیں خیار العلماء ہیں اور بری چیزوں میں سے سب سے بدتر چیز شرار العلماء ہیں یعنی علماء میں سے جو علماء شر ہیں وہ بدترین چیزوں میں سے سب سے زیادہ بدتر، اور جو علماء خیر ہیں خیار العلماء وہ تمام بہترین چیزوں میں سے سب سے زیادہ بہتر ہیں یعنی علم کی وجہ سے انسان کی پوزیشن یہ ہوگی کہ

اچھا ہوگا تو یہ بہت ہی اچھا ہوگا بگڑ گیا تو پھر یہ بہت ہی زیادہ بگڑ جائے گا جیسے کہ لطیف چیز کا خاصہ ہے جس چیز کے اندر لطافت زیادہ ہوا کرتی ہے جب وہ اچھی ہو تو بہت اچھی ہوتی ہے اور اگر وہ سڑ جائے خراب ہو جائے تو پھر وہ خراب بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے روٹی ہے آپ کی اگر سوکھ جائے گی تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا اکڑ جائے گی زیادہ دیر تک اگر پڑی رہی تو سوکھنے کے بعد وہ اکڑ جائے گی چبانی مشکل ہو جائے گی کھانی مشکل ہو جائے گی۔

لیکن شیرینی اور اس قسم کی لطیف اشیاء یہ اگر صحیح ہوں تو روٹی کے مقابلہ میں لذیذ حد سے زیادہ لیکن اگر یہ باسی ہو جائیں سڑ جائیں تو پھر ان میں کیڑے پڑتے ہیں پھر ناک نہیں دیا جاسکتا ان میں اتنی بدبو پیدا ہو جاتی ہے تو جو چیز لطیف زیادہ ہوا کرتی ہے اعلیٰ ہوتی ہے جب وہ بگڑتی ہے تو پھر بگڑتی بھی سب سے زیادہ ہے اسی طرح سے جب کسی انسان کے اندر علم آجاتا ہے تو اگر تو یہ اچھا ہوا تو پھر یہ بہت ہی اچھا ہوگا اگر اس کا رخ سیدھا ہے، اور اگر اس کا رخ غلط ہو گیا یہ برا ہو گیا تو پھر تمام بدتر چیزوں سے یہ بدترین ہوتا ہے، عالم بگڑ جانے کے بعد اس قسم کے فتنے اٹھاتا ہے کہ ایسے وقت میں اگر شیطان فارغ ہو کر بیٹھ جائے سانس لینے کے لئے کہ اب میرا قائم مقام آگیا تو یہ بالکل صحیح بات ہوگی ابلیس کو کسی کاروائی کی ضرورت ہی نہیں رہتی علماء کے بگڑ جانے کے بعد، علماء خود اتنی کاروائیاں کر لیتے ہیں کہ ابلیس بھی ان کو جھانکتارہ جاتا ہے یہ علماء سوء وہ ہوتے ہیں کہ جو واضح واضح باتیں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں وہ اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لئے اپنے اغراض کے ساتھ ان کو بھی چھپاتے ہیں لوگوں کو بتاتے نہیں ہیں اپنے اغراض کے تحت حق فروشی کرتے ہیں یہ ہوتے ہیں علماء سوء۔

"اولئك يلعنهم الله ويلعنهم اللاعنون" ایسے لوگوں کے اوپر کائنات کا ذرہ ذرہ لعنت کرتا ہے جس طرح سے علماء حق کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز ان کے لئے استغفار کرتی ہے اور دعا کرتی ہے حتی کہ پانی میں مچھلیاں، بلوں میں اپنے سوراخوں کے اندر چیونٹیاں یہ ساری کی ساری چیزیں عالم حق کے لئے استغفار کرتی ہیں دعا کرتی ہیں اور اسی طرح سے بالمقابل علماء سوء کے لئے پھر ساری کی ساری چیزیں بددعا کریں گی ان کے اوپر لعنت کریں گی، کیونکہ علماء حق کا فیضان ساری کائنات کو پہنچتا ہے اور علماء سوء کی نحوست ساری کائنات کے اوپر پڑتی ہے۔

توبہ کرنے والوں کے لیے رضا کا اعلان:

"الا الذين تابوا" مگر جو لوگ توبہ کرلیں، توبہ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی پچھلی غلطی کا اقرار کرلیا کہ ہم سے غلطی ہوگئی "واصلحوا وبينوا" اور اپنے حالات کی اصلاح کرلیں اور اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ جو حق چھپایا ہے

اس کو ظاہر کردیں کیونکہ غلطی ان کی جب کتمان حق والی ہے تو اس غلطی کا ازالہ اسی طرح سے ہوگا کہ حق کو ظاہر کریں یہ کتمان والے جرم سے باز آجائیں یہ "بینوا کا اصلحوا" کے اوپر عطف تفسیری ہے اپنے حالات کو ٹھیک کرلیں حالات کو ٹھیک کرنے کا مطلب ہے کہ جو حق انہوں نے چھپایا ہے اس حق کو واضح کردیں اور یہود کے لئے اس حق کو واضح کرنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ برملا اقرار کریں کہ واقعی یہ پیغمبر سچے ہیں اور ان کی علامات کتاب میں ذکر کی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ایمان لے آئیں تبھی جا کر حق کا اظہار ہوگا۔

"فاولئك اتوب عليهم" یہی لوگ ہیں کہ میں ان کی توبہ کو قبول کرلیتا ہوں "وانا التواب الرحيم" اور میں توبہ قبول کرنے والا ہوں رحم کرنے والا ہوں۔

کافروں کے لیے پوری کائنات کی لعنت:

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے اس حال میں کہ کافر ہیں یعنی کفر پر ان کا خاتمہ ہوگیا آخر وقت تک وہ کفر پر قائم رہے، "اولئك عليهم لعنة الله" یہی لوگ ہیں جن کے اوپر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی لعنت ہے، انسانوں کی لعنت ہے، سب کی لعنت ہے یہ ملعون ہیں سب کے نزدیک اور اللہ کی لعنت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ اس کو اپنی رحمت سے دور ہٹا دے گا، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے بددعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے محروم کردے۔

جس طرح سے اللہ کسی پر صلوٰۃ بھیجتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ خود رحمت نازل کرتا ہے اور باقی انسان فرشتے جو کسی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ اللہ اس کے اوپر اپنی رحمت نازل فرمائے اسی طرح سے اللہ کی لعنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے دور کردیتا ہے اور باقی جو لوگ لعنت کرتے ہیں فرشتے لعنت کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے بددعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے محروم کردے سب کی لعنت ہے "خالدين فيها" اس لعنت میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور لعنت کا اثر ہے عذاب خداوندی کے اندر مبتلا ہو جانا "لا يخفف عنهم العذاب" ان سے عذاب ہلکا نہیں کیا جائے گا جتنا عذاب ان کو دیا جائے گا اس میں تخفیف نہیں ہوگی "ولاهم ينظرون" اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی "والهكم اله واحد" یہاں سے توحید کا مسئلہ شروع ہوتا ہے اس کا تعلق اگلے رکوع کے مضمون کے ساتھ ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

بے شک آسمانوں کے پیدا کرنے میں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور دن اور رات کے مختلف ہونے میں اور ان کشتیوں میں

الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ

جو چلتی ہیں سمندروں میں ایسی چیز کے ساتھ جو تمہیں نفع دیتی ہے اور اس پانی میں جو کہ اللہ نے آسمان سے اتارا

مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ

پس زندہ کیا اس پانی کے ذریعے سے اس زمین کو بعد اس کی موت کے پھیلایا اس زمین میں اللہ نے ہر قسم کے دابہ کو ،

وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور ان بادلوں میں جو مسخر کیے ہوئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُونَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُونِ

البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو کہ سوچتے ہیں ﴿۱۶۴﴾ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو اختیار کرتا ہے علاوہ

اللّٰهِ أَنْدَادًا يُّحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا

اللہ کے شرکاء محبت کرتے ہیں ان سے اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی طرح ، اور جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی محبت میں سخت ہوتے ہیں

لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ أَنَّ الْقُوَّةَ

اگر سمجھ جایا کریں وہ لوگ جو ظالم ہیں جس وقت تکلیف دیکھتے ہیں کہ ، بے شک زور

لِلّٰهِ جَمِيعًا ۙ وَّأَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ

سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے ہے ، اور اللہ سخت عذاب والا ہے ﴿۱۶۵﴾ جس وقت بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ

اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ

جن کی اتباع کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے اتباع کی اور دیکھیں گے وہ عذاب تو ٹوٹ جائیں گے ان کے

الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ

آپس کے تعلقات ﴿۱۶۶﴾ اور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے اتباع کی کاش کہ ہمارے لئے لوٹنا ہو پھر ہم بھی لاتعلق ہو جائیں

مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ

ان سے جس طرح یہ ہم سے لاتعلق ہو گئے ہیں ، اسی طرح سے دکھائے گا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال حسرتیں

عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

ان کی ، اور یہ لوگ آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے ﴿۱۶۷﴾

تفسیر:

بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی طرف انتقال:

پچھلے رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے توحید کا ذکر کیا تھا "الٰھکم الٰہ واحد" تمہارا معبود حقیقی جو کہ معبود بننے کا مستحق ہے وہ ایک ہی ہے "الٰھکم" کا یہ معنی ہے کہ تمہارا معبود حقیقی جو معبود بننے کا مستحق ہے وہ ایک ہی ہے "لا الٰہ الا ھو" اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں "الرحمٰن الرحیم" وہ بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے، اہل کتاب کے ساتھ جو مذاکرہ شروع ہوا تھا مختلف باتوں پر وہ اس پچھلے رکوع پر ختم ہو گیا اب آگے اس امت کو جو بنی اسماعیل میں سے اٹھائی جا رہی ہے اور سرور کائنات ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں اور آپ ﷺ کے مخاطب اور آپ ﷺ کی امت بننے والی ہے اب سورۃ کے آخری حصے میں ان کے لئے ہدایات ہیں اب زیادہ تر تذکرہ حضور ﷺ کی امت کا ہی آئے گا اور آپ ﷺ کے مخاطبین کا ہی آئے گا اسرائیلیوں کے ساتھ جو گفتگو تھی وہ پچھلے رکوع پر ختم ہو گئی۔

عقیدہ توحید کا مفہوم:

اب نئی امت کے لئے ہدایات شروع ہونے والی ہیں اس کی ابتداء مسئلہ توحید سے کی ہے کیونکہ یہ مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس وقت تک یہ بنیاد مضبوط نہ ہو اس وقت تک آگے صحیح عقائد کا انسان حامل نہیں ہو سکتا سب سے پہلے جو چیز اختیار کرنی پڑتی ہے، جو ایمان کے لئے بنیادی اینٹ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق وحدانیت کا عقیدہ ہے اس کو پہلے تو مثبت انداز میں پیش کیا "الٰھکم الٰہ واحد" تمہارا مستحق عبادت معبود ایک ہی ہے، ایک ہی ہے یہ مثبت ہے اور "لا الٰہ الا ھو" یہ دوسرے انداز میں پیش کر دیا کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں ہے تو یہ نفی اثبات کے ساتھ اس بات کو صاف کر دیا گیا کہ ایک ہے اور کوئی نہیں، ایک ہے کس اعتبار سے واجب الوجود ایک ہے اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا واجب الوجود نہیں ہے، اپنی صفات میں وہ وحدانیت رکھتا ہے اس

کی صفات میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے، جو اس کی صفتیں ہیں جس حیثیت سے اس کے لئے ثابت ہیں اس طرح سے کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں ہیں۔

ایک وقت تھا جب وہ اکیلا ہی موجود تھا اور کوئی دوسری چیز موجود نہیں تھی اور ایک وقت آئے گا جب سب پر فناء آجائے گی صرف ایک ہی ہوگا جس کے اوپر فناء نہیں آئے گی ہر لحاظ سے اس کے لئے وحدانیت ثابت ہے بس اللہ تعالیٰ کے متعلق پہلا عقیدہ یہ وحدانیت کا ہے، وہ ذات میں ایک ہے، صفات میں ایک ہے، نہ اس جیسی صفتیں دوسرے کے لئے ثابت ہیں اور نہ اس کی ذات میں کوئی دوسرا شریک ہے، بنیادی اینٹ توحید کی یہی ہے اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ یہی رکھنا پڑتا ہے باقی جتنے مسائل آئیں گے سب اس کی تفصیل ہیں کہ ایسا کوئی عقیدہ اختیار کرنا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت میں رخنہ اندازی کرے بس وہی شرک ہے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بہر حال محفوظ رکھنا ہے ہر لحاظ سے وہ تنہا ہے اس کے درجے میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں نہ ذات کے اعتبار سے، نہ صفات کے اعتبار سے، نہ افعال کے اعتبار سے، نہ کسی دوسرے اعتبار سے تو آگے تفصیل جتنی بھی آئے گی سب کا حاصل یہی ہوگا کہ ایسا عقیدہ اختیار نہ کرو جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت کے اندر رخنہ اندازی کرے تو صاف طور پر یہ بات کہہ دی گئی کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں وہ صرف ایک ہے۔

رحمٰن اور رحیم میں فرق:

"الرحمٰن الرحیم" جب توحید کا تعارف کروایا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے الرحمٰن الرحیم کو ذکر کیا ہے بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے الرحمٰن کے اندر بھی وہی رحمت اور الرحیم کے اندر بھی وہی رحمت لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے جس طرح سے اور باتیں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے ایک آسان سی بات یہ ہے کہ رحمٰن میں جوش رحمت کی طرف اشارہ ہے اور رحیم کے اندر دوام رحمت کی طرف اشارہ ہے کہ بڑا پر جوش رحم کرنے والا ہے اور مسلسل رحم کرنے والا ہے اس کی رحمت جوش مارتی ہے اس کی رحمت اپنی مخلوق کے لئے جوش مارتی ہے انتہائی مہربان ہے اور پھر تسلسل کے ساتھ رحم کرنے والا ہے یہ نہیں کہ کسی وقت اس کی رحمت مخلوق سے منقطع ہو جاتی ہے اس کا جو معاملہ بھی مخلوق کے ساتھ ہے وہ رحمت پر ہی مبنی ہے۔

لفظ رحمٰن اور رحیم کو کثرت سے استعمال کرنے کی حکمت:

آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ان دونوں ناموں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت کثرت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

ابتداءً ہماری کتاب کی "بسم الله الرحمن الرحيم" سے ہوتی ہے، یہاں بھی اللہ کے ساتھ الرحمن الرحیم انہی دوناموں کا تعارف کروایا گیا ہے اور پہلے جس وقت سورۃ فاتحہ آئی تو اس میں بھی یہی "الحمد لله رب العالمين الرحمن الرحيم" یہاں بھی الرحمن الرحیم کو ذکر کیا گیا ان دوناموں کو ذکر کرنے کی جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ان کو تو اللہ ہی جانتے ہیں لیکن واضح طور پر ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے وحدت کا عقیدہ رکھیں گے کہ اللہ واحد ہے اس میں اس کی بہت عظمت نمایاں ہے ساری کائنات کے اندر وحدت اس کے لئے مان لی کہ کسی درجے میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے تو اس میں اس کی عظمت بہت نمایاں ہے۔

بسا اوقات یہی انتہائی عظمت کا عقیدہ بندوں کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے متعلق ایسا تصور پیش کر دیتا ہے کہ جب وہ اتنا عظیم ہے، اتنا عظمت والا ہے تو ہماری اس تک رسائی کیسے ہوسکتی ہے، اس کو ہماری کیا ضرورت، ہم اس کے دربار میں کس طرح سے پیش ہوسکتے ہیں، ہماری وہ کیا پرواہ کرے گا جس طرح سے آپ کہا کرتے ہیں کہ بھائی آپ تو بڑے آدمی ہوگئے ہو اب تمہیں ہماری کیا پرواہ ہے تو بڑائی بسا اوقات چھوٹوں سے انسان کو غافل سا کردیتی ہے، لاتعلق سا کردیتی ہے، لاپرواہ سا کردیتی ہے، اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہے جس وقت کسی کے متعلق یہ عقیدہ ہوجائے کہ وہ بہت عظمت والا ہے تو پھر دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ جب وہ اتنی عظمت والا ہے تو اس کو ہماری کیا پرواہ ہماری طرف اس کی کیا توجہ ہوگی تو یہ عدم توجہ والا تصور انسان کے قلب میں آسکتا ہے۔

یہ انسان کے قلب میں لاتعلقی پیدا کرسکتا ہے پھر انسان اس قسم کے ذرائع تلاش کرنے کے لئے نکلتا ہے جن کے ذریعے سے اس عظیم اللہ کے ساتھ وہ ربط پیدا کرلے اور اس عظیم اللہ کے سامنے اپنی درخواست پیش کردے جس طرح سے دنیا میں ایک بہت بڑا بادشاہ ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ ہم تو غریب مسکین ہیں ہماری وہاں پر کیا رسائی ہے وہ تو بہت بڑا آدمی ہے اس کے ساتھ بات کرنا ہر کسی کو میسر نہیں آتا لہٰذا آپ ان کے ساتھ تعلق رکھنے والے، ان کے رشتہ دار، ان کے وزیر اور ان کے مشیران کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں تاکہ اس عظیم بادشاہ کے سامنے تم جیسے مسکینوں کی فریاد پہنچادی جائے ورنہ تمہیں اس کے محلات کے قریب بھی کون جانے دیتا ہے اور تمہیں اندر کون گھسنے دیتا ہے تو یہ جو عظمت کا تصور ہے بسا اوقات یہ اس عظیم شخصیت کو چھوٹوں سے ایک علیحدگی کا تصور دیتا ہے وہ علیحدہ علیحدہ سا ہے اس لئے اس کو اپنے چھوٹوں کی پرواہ کوئی نہیں اور چھوٹے اس کی دربار میں پہنچ بھی نہیں سکتے، کیا اپنی درخواست پیش کرسکتے ہیں، کیا تعلق پیدا کرسکتے ہیں، وہاں پر ان کی

کیسے رسائی ہوسکتی ہے وہ بہت بڑا اور ہم بہت چھوٹے اور وہ بہت عظمت والا اور ہم اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔

انسان کی طبعیت میں چونکہ قیاس ہے تو اس قیاس کے ذریعے سے وہ دنیاوی بادشاہ پر اس بادشاہ کو قیاس کرسکتا ہے تو یہ علیحدگی علیحدگی سی ایک نمایاں ہو جاتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اس عظمت کے تصور کے ساتھ اس کا خوف جلال اور رعب طاری ہو جاتا ہے، ہیبت طاری ہوتی ہے اور ہیبت کا اثر بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان اس کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کرتا جس کے جلال سے انسان ڈرتا ہے اور یہ بھی وہی دنیاوی قیاس اگر بادشاہ کے متعلق آپ کو معلوم ہو کہ بہت قاہر بہت بڑا جابر اور بہت بڑا غضب ناک ہے وہ تو اپنے باغیوں کو اور اپنے انکار کرنے والوں کو یوں سزائیں دیتا ہے تو پھر جرأت ہی نہیں ہوتی کسی کو سامنے جانے کی کہ سامنے جا کر معافی مانگ سکے اس کا جبر اس کی قہاریت جب انسان کے سامنے آتی ہے تو انسان ڈرتا ہے تو پھر کوئی بھی سامنے جانے کی کوشش نہیں کرتا اور پھر بھی اس سے صلح کرنے کے لئے اس کو خوش کرنے کے لئے واسطے تلاش کرتا ہے کسی کو سفارشی درمیان میں لائے گا اسے خوش کرے گا اس کے جا کر پاؤں دبائے گا کہ مجھے معافی دے دو اور یہ میرا قصور کسی طرح سے معاف کروا دو اور میری یہ حاجت اس تک پہنچا دو تو یہ جلال اور رعب بھی بسا اوقات بندے کو اس عظیم شخصیت سے دور ہٹا دیتا ہے۔

اور میں عرض کر رہا ہوں کہ اسی قیاس کے ذریعے سے جو انسان اپنی دنیاوی زندگی میں کرتا ہے بارعب شخصیت کے سامنے ہر کسی کو جانے کی جرأت نہیں ہوتی وہاں بھی انسان پھر اسی طرح سے اس کے خواص کے آگے پیچھے پھرتا ہے کہ بھائی ہماری تو ہمت نہیں ہے کہ ہم اس سے جا کر بات کرلیں ہم تو اس کے سامنے جاتے ہیں تو ہمارا پتہ پانی ہوتا ہے اس لئے تم ہی ذرا بھر یہ بات کر دینا اور اس طرح سے کہہ دینا تو پھر جن کو جا کر بات کرنے کی جرأت ہے جو اس کے خواص ہیں اور جو جا کر اس کی مجلس میں بیٹھتے ہیں پھر ان کو خوش کرنے کے لئے آپ ان کے پاؤں بھی دبائیں گے، ان کو تحفے بھی دیں گے اور ان کے گھروں کے چکر بھی لگائیں گے یہ دونوں تصور ہی اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق غلط ہیں اور ''الرحمن الرحیم'' کے اندر انہیں دونوں تصوروں کا خاتمہ ہو گیا کہ اس کے واحد ہونے کا یہ معنی نہیں کہ وہ اتنی عظیم شخصیت ہو کر پھر وہ چھوٹوں کی پرواہ نہ کرے، ایسی بات نہیں، اس کی تو رحمت ہر وقت جوش مارتی ہے اور تسلسل کے ساتھ اس کی رحمت مخلوق کی طرف متوجہ ہے۔

تمہیں جو کچھ مل رہا ہے، جو تمہاری ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں سب وہی پوری کرتا ہے ہر وقت تمہاری طرف متوجہ ہے اس لئے یہ وحدانیت کے عقیدے سے جو عظمت ایک نمایاں ہے اس عظمت کی بناء پر تم یہ نہ سمجھ لینا

کہ اس کی ہماری طرف توجہ ہی نہیں ہے وہ ہماری کیا پرواہ کرے گا، ہماری وہاں تک کیا رسائی ہے، اتنی عظیم شخصیت کے ساتھ ہم رابطہ کس طرح سے قائم کر سکتے ہیں یہ بات غلط ہے واحد ہونے کے ساتھ ساتھ، عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ''الرحمن الرحیم'' بھی ہے اس کی رحمت ہر وقت جوش میں ہے اور تسلسل کے ساتھ اپنی رحمت کو مخلوق کے اوپر برساتا ہے اور دوسرا اس کی عظمت سے یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اس کا رعب اور جلال ایسا ہے کہ ہمیں جرأت ہی نہیں اس کے سامنے جانے کی، ایسی بات نہیں وہ ایک ایسی عظیم الشان ذات ہے کہ جس میں رعب اور جلال بھی ہے اس میں کوئی شک نہیں وہ قہار بھی ہے وہ جبار بھی ہے اور اسی طرح اس کے دوسرے نام بھی ہیں شدید العقاب بھی ہے ذوانتقام بھی ہے سب کچھ ہے۔

یہ صفتیں بھی اس کے لئے کمال درجے کی ثابت ہیں لیکن جو صفت زیادہ غالب ہے وہ رحمٰن ورحیم ہونے کی صفت ہے اس لئے ایسی کوئی ڈرنے کی بات نہیں کہ اس کے سامنے جا کر کوئی درخواست بھی نہ پیش کر سکو اور اس کو براہ راست تم خطاب نہ کر سکو، اس کا نام لے کر اس کو تم بلا نہ سکو یہ بات نہیں ہے اور یہ دونوں عقیدے ہیں جس نے لوگوں کے اندر شرک کے جراثیم پیدا کیے اور ''الرحمن الرحیم'' کی حقیقت اگر صحیح طور پر سمجھ آ جائے تو ان دونوں جذبوں کی ہی جڑ کٹ جاتی ہے کہ ہمارا اللہ جس کو ہم واحد مانتے ہیں، عظیم الشان مانتے ہیں وہ رحمٰن ہے رحیم ہے اس لئے وہ ہم سے بے توجہ نہیں اس کی رحمت کے ساتھ ہی ہمارے سارے کے سارے کام بنتے ہیں اس لئے اس کا ہمارے ساتھ تعلق ہے ہمیں بھی ادھر متوجہ رہنا چاہیے اور وہ عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا پر جلال اور پر رعب نہیں ہے کہ بندے اس کو نام لے کر بلا نہ سکیں، اس کو خطاب نہ کر سکیں، براہ راست اس کے دربار میں نہ جا سکیں وہ رحمٰن ورحیم ہے اور اس کے ساتھ جس طرح سے چاہو براہ راست رابطہ رکھو تمہاری وہ براہ راست ہر وقت سنتا ہے اور تمہاری ضروریات کی طرف متوجہ ہے۔

توحدانیت کے عقیدے سے جو ایک عظمت نمایاں تھی اس عظمت کے نتیجے میں دو خیال انسانوں میں پیدا ہو سکتے تھے الرحمن الرحیم کے لفظ سے ان دونوں کا خاتمہ کر دیا گیا تو جس وقت آپ اپنے اللہ کا تصور کریں اپنے معبود کا تصور کریں ''الرحمن الرحیم'' کی شان کے ساتھ جب تصور کریں گے تو انسان کے دل سے پھر محبت اگلتی ہے اور ایک خواہ مخواہ کا ربط قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے کہ پھر تو ''رحمن ورحیم'' ذات کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہیئے جو اتنا مہربان ہے اتنا تسلسل کے ساتھ مہربانی کرتا ہے اور ہماری طرف متوجہ ہے ہمیں اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیے اور اس کی مہربانی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

"رحمتی سبقت غضبی" میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے، میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی اس میں بھی یہی سبق دینا مقصود ہے کہ مجھے غضب ناک شخصیت کے طور پر تصور نہ کرو جس سے تم ایسے ہی ڈر جاؤ کہ پھر بلانے کی جرأت نہ کرو، آنے کی جرأت نہ کرو، درخواست پیش کرنے کی جرأت نہ کرو میرا جب تصور کرو "رحمٰن رحیم" کی شان سے کرو تو اس لفظ کو جو یہاں رکھا گیا توحید کا تعارف کرواتے ہوئے، توحید کا عقیدہ آپ کو بتاتے ہوئے تو بہت ایک بنیادی معنی کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ کے ان دو اسماء کے ذریعے سے شرک کے جراثیم کا خاتمہ ہوتا ہے ورنہ اگر اللہ کی یہاں وہی شان نمایاں کی جائے غضب ناک والی، غضب ناک بھی وہ ہے اس میں کیا شک ہے لیکن انسان میں پھر وہی جستجو پیدا ہو جاتی ہے میں کس کو واسطہ بناؤں، کس کے ذریعے سے درخواست پہنچاؤں میں اس کو کیسے بلا سکتا ہوں جب وہ اتنا غصے میں ہے، اس کا نام لے کر اس کو کس طرح سے پکاروں جب وہ اتنا غضب ناک ہے، ایسا نہ ہو کہ میں اس کے غضب کا نشانہ بن جاؤں پھر اس قسم کے تصورات انسان کے دل میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کے نمونے:

اور آگے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دلیل بھی دی ہے اور اپنے "رحمن ورحیم" ہونے کی دلیل بھی دی ہے۔

جو آگے فہرست آپ کے سامنے ہے اس میں دونوں باتیں نمایاں ہیں اللہ تعالیٰ کا واحد ہونا بھی نمایاں ہے کہ خالق وہی ہے کوئی دوسرا خالق نہیں ہے، مالک وہی ہے کوئی دوسرا مالک نہیں، متصرف وہی ہے کوئی دوسرا متصرف نہیں ہے، بادشاہ وہی ہے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کی سلطنت نہیں، اس کے لئے بھی اگلے الفاظ دلیل ہیں اور وہ "رحمن ورحیم" ہے اس کی رحمت کس قدر نمایاں ہے اس کے لئے بھی اگلے الفاظ دلیل بنتے ہیں اللہ کی رحمت بھی نمایاں ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی خالقیت، اس کی مالکیت، اس کی سلطنت وہ بھی ساری کی ساری اگلے الفاظ سے نمایاں ہے، زمین وآسمان کے پیدا کرنے میں، پیدا کرنا ایک تو ان کا وجود ہی ہو گیا کہ زمین کو وجود دیا آسمان کو وجود دیا اللہ تعالیٰ کی خالقیت ہے اور پھر کن کن حکمتوں اور کن کن مصلحتوں کے اوپر ان کو مشتمل بنایا اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کی دلیل ہے اور پھر ہمارے لئے اس میں کیا کیا منافع رکھے ہیں کس طرح مخلوق کے لئے ان دونوں کو باعث راحت بنایا اللہ تعالیٰ کے "رحمن ورحیم" ہونے کی شان اس میں نمایاں ہے۔

پیدا کیا زمین کو آسمان کو یعنی ان کو وجود بھی دیا اور ان کے یہ خواص اور ان کے یہ آثار اور ان کے اندر یہ

رحمتوں اور نعمتوں کے خزانے جس طرح سے آپ کے سامنے ہیں یہ سب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی بھی دلیل ہے کہ خالق وہی ہے مالک وہی ہے اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے ''رحمن ورحیم'' ہونے کی بھی دلیل ہے۔

رات اور دن کے اختلاف میں، اختلاف کی دونوں صورتیں ہیں دن گیا رات آئی، رات گئی دن آیا تو یہ اختلاف جو ہے اس طرح آمد ورفت کے اعتبار سے بھی ہے لیکن دوسرا اختلاف اس اعتبار سے بھی ہے کہ کبھی دن بڑے کر دیئے اور راتیں چھوٹی کر دیں، کبھی راتیں بڑی کر دیں اور دن چھوٹے کر دیئے اور اس کے ساتھ ساتھ صفات کا اختلاف بھی ہے کہ دن کو روشنی ہے، گرمی ہے، بدن میں چستی ہے، ہوش مندی ہے رات آتی ہے تو اس میں خنکی ہے، ٹھنڈک ہے، سکون ہے، اطمینان ہے، دن میں اچھلنے کودنے کو جی چاہتا ہے رات کو لیٹنے سونے کو جی چاہتا ہے۔

یہ دونوں قسم کی صفات کا اختلاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دلیل بھی ہے یعنی دن ہی دن رہتا تو آپ کو رات کے فوائد حاصل نہ ہوتے اور رات ہی رات رہتی تو دن کے فوائد حاصل نہ ہوتے دونوں چیزیں انسان کے لئے تکلیف دہ ہوتیں اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر دن ہی ہمیشہ کر دے تو کون ہے الٰہ جو تمہارے پاس رات لے آئے گا اور اگر ہم ہمیشہ رات ہی تم پر طاری کر دیں تو کون ہے جو تمہارے پاس دن لے آئے گا تو دن اور رات کے اندر یہ رحمت والا پہلو بھی نمایاں ہے کہ رات والے فوائد علیحدہ ہیں اور دن والے فوائد علیحدہ ہیں، سکون اطمینان خنکی ٹھنڈک یہ ساری کی ساری رات کو اور اسی طرح سے روشنی گرمی چستی چالاکی یہ ساری قسم کی کیفیتیں دن کو پیدا ہوتی ہیں۔

''والفلك التي تجري في البحر'' کشتیوں میں جو کہ سمندر میں چلتی ہیں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے، خالقیت بھی نمایاں ہے، پانی اللہ نے پیدا کیا، کیسا پیدا کیا؟ سیال ہے بہتا ہے اس کے اندر پہاڑوں جیسی پتھروں جیسی سختی نہیں ہے اور کشتیاں بنی لوہے کی لکڑی کی ان کی طبعیت اور ان کا مزاج اللہ نے کیسا بنایا دونوں کے مزاج بالکل مختلف ہیں باوجود اس بات کے کہ پانی میں ڈبونے کی صلاحیت ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ دل میں اس قسم کی سازگاری پیدا کر دی کہ پانی کشتی کو اٹھاتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچا دیتا ہے اور اس میں کتنے لوگوں کے لئے منافع ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی خالقیت کا یہ بے نظیر نمونہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے واضح ہوتی ہے اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کی وضاحت بھی ہے ہماری کتنی ضرورتیں ان کشتیوں کے متعلق ہیں اور دریاؤں اور سمندروں کے متعلق ہیں اور دریاؤں میں یہ کشتیاں چلتی ہیں سمندر میں جہاز چلتے ہیں سامان تجارت لے کر ہمیں ایک طرف سے دوسری طرف پہنچاتے ہیں۔

اور اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں یہ ذرائع نہ ہوتے تو یہ خشکی والے دوسرے خشکی والوں تک کس طرح سے پہنچتے جب کہ درمیان میں ہزاروں میل میں پھیلا ہوا سمندر ہے اس میں بھی اللہ کی رحمت نمایاں ہے، اور اس پانی میں جو آسمان سے اتارا یہ بارش کی شکل میں کس طرح سے قطرہ قطرہ کر کے اللہ تعالیٰ اتارتے ہیں آپ کے کچے کوٹھے اور چھپر بھی برداشت کر لیتے ہیں اور اگر یہ اتنا کروڑوں من پانی کہیں آبشار کی طرح گرتا تو جس محل پر گر جایا کرتا وہ بھی زمین بوس ہو جاتا اور زمین میں بھی گڑھے پڑ جایا کرتے اور ساری کی ساری زندگی تلخ ہو جاتی جس انسان کے سر پر اوپر سے نالہ چھوٹ جاتا تو اس کی کھوپڑی بھی ٹوٹ جایا کرتی جتنا پانی یہ اترتا ہے پانچ دس منٹ کی بارش میں جتنے من پانی اتر آتا ہے اور اگر یہ کہیں اکٹھا نیچے گرا دیا جاتا تو پھر نہ زمین برداشت کر سکتی تھی نہ آپ برداشت کر سکتے تھے اور نہ آپ کے مکانات برداشت کر سکتے تھے نقصان ہی نقصان تھا۔

پس زندہ کیا اس زمین کو پانی کے ذریعہ سے اس کی موت کے بعد، یہ ایک مشاہدے کی بات ہے کہ جب زمین خشک ہوتی ہے تو ایسے ہے جیسے بے جان پڑی ہوئی ہے آسمان کی طرف سے پانی اترتا ہے تو اس زمین میں جان پڑتی ہے، نباتات اگتی ہیں، زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے یہ زمین کی حیات ہے اور زمین کی حیات اور موت کے لئے محاورے میں لفظ بولا جاتا ہے زمین کا بنجر ہونا زمین کا سرسبز و شاداب ہونا اس لئے اگر یہاں ترجمہ یوں کر دیا جائے کہ اس پانی کے ذریعے سے زمین کو سرسبز و شاداب کیا اس کے بنجر ہونے کے بعد تو یہ ترجمہ محاورہ کے مطابق ہے۔

"وبث فیھا من کل دابۃ" کا عطف اگر" انزل" پر کریں تو پھر معنی یہ ہوگا کہ اس چیز میں جو پھیلائی اللہ نے اس زمین میں ہر دابۃ سے، جیسے پیچھے سے "ان فی خلق السمٰوات والارض" چلا آ رہا ہے اس چیز میں فلاں چیز میں اس طرح سے یہ ہو گیا کہ اس چیز میں جو پھیلائی اللہ نے اس زمین میں ہر دابۃ سے "من کل دابۃ" ما کا بیان ہوگا ہر چوپائے میں جس کو اللہ نے زمین پر پھیلایا، اگر اس کا عطف احیاء پر کریں تو پھر ترجمہ یوں ہو جائے گا پھر پھیلایا اللہ تعالیٰ نے اس زمین میں اس پانی کے ذریعہ سے ہر دابۃ کو یہ بات بھی واقعہ کے مطابق ہے کہ حیوانات کا نشو و نما پانا وہ بھی پانی کے ذریعے سے ہی ہے، زمین کے اندر پانی کا ذخیرہ بارش سے ہوا بارش سے نباتات پیدا ہوتی ہیں یہی نشو و نما کا ذریعہ ہوتی ہے ویسے بھی جب بارش ہوتی ہے تو زمین پر کیڑے مکوڑوں کی کثرت بھی ہوتی ہے اور نباتات کے پیدا ہونے کے ساتھ باقی حیوانات کو بھی زندگی ملتی ہے اسی کے ساتھ ہی اس نسل کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔

"وتصریف الریاح" ہواؤں کا پھیرنا، پھیرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ کبھی مشرق کی طرف سے چلتی ہے اور کبھی مغرب کی طرف سے چلتی ہے، کبھی شمال کی طرف سے اور کبھی جنوب کی طرف سے اور اسی تصریف کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ کبھی نرم چلتی ہے اور کبھی سخت، کبھی ٹھنڈی اور کبھی گرم اب جس وقت اس کے فلسفہ پر آپ غور کریں گے تو اس میں بھی انسان کے لئے سینکڑوں نہیں لاکھوں فوائد ایک وقت میں ہیں، اس کا گرم چلنا بھی انسانی زندگی کے لئے مفید ہے جس کے ذریعے سے فصلیں پکتی ہیں تو گندم کے موسم میں جب تک ہوا نہ چلے اس وقت تک وہ فصل تیار نہیں ہوتی اور ایک وقت میں ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اس سے پچھلے پتے خشک ہوتے ہیں، پتے جھڑتے ہیں پھر درختوں کو اور دوسری نباتات کو نئی زندگی ملتی ہے یہ پہلا لباس اس کا تبدیل کیا جاتا ہے پتے خشک ہوتے ہیں گرتے ہیں پھر نئے پتے آنا شروع ہو جاتے ہیں دوبارہ باغ و بہار ہو جاتی ہے یہ کیفیات کے اعتبار سے اس کا تصریف یہ بھی اس میں شامل ہے کبھی نرم اور کبھی سخت کبھی تیز اور کبھی مدھم کبھی سرد کبھی گرم یہ کیفیات بھی اس کی بدلتی رہتی ہیں اور ان میں سے ہر کیفیت کا انسان کی زندگی کے اوپر اثر پڑتا ہے۔

"والسحاب المسخر بین السماء والارض" اور اس بادل میں جو کہ مسخر کیا ہوا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے تابع کیا ہوا ہے زمین و آسمان کے درمیان، کس طرح سے یہ بادل آتے ہیں سمندروں سے پانی اٹھا کر لاتے ہیں اور پھر ہوائیں ان کو دھکیل دھکیل کر جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہاں لے جاتی ہیں اور جتنا اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے اتنا پانی برساتے ہیں جہاں حکم ہوتا ہے وہاں برساتے ہیں اور اس دنیا کی رونق ساری کی ساری ہی اسی سلسلے کے ساتھ ہے۔

دعوتِ غور و فکر:

"لآیات لقوم یعقلون" البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ سوچتے ہیں "یعقلون" کا لفظ یہاں استعمال کیا گیا اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان چیزوں سے ان کے خالق پر اور اس کی وحدانیت پر اور اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت پر استدلال کرنا یہ عقل کا کام ہے جتنا سوچو گے اتنی ہی یہ بات واضح ہوتی چلی جائے گی یہ استدلال عقلی ہے کہ عقل کے ساتھ ہی سوچو کہ یہ چیزیں حادث ہیں محدث ہیں اور اس قسم کے تصرفات ان کے اندر ہوتے ہیں جس وقت تک ان کے اوپر کوئی خالق کوئی مالک نہ ہو تو یہ دنیا کا نظم اس طرح سے چل نہیں سکتا یہ اتنا منظم سلسلہ ہے، زمین و آسمان آپس میں اگرچہ آپ کو مختلف نظر آتے ہیں لیکن مختلف ہونے کے باوجود ان کے اندر ایک قسم کا اتحاد بھی ہے اتحاد اس طرح سے کہ زمین میں یہ صلاحیت ہے کہ آسمان کی طرف سے فیضان آتا ہے زمین

اس کو قبول کرتی ہے دونوں ملتے ہیں تو اس کے فوائد مرتب ہوتے ہیں جیسے انسانوں میں آپ نے دیکھا کہ مرد کا مزاج اور ہے، اس کی ساخت اور ہے، اس کی خصوصیات اور قسم کی ہیں عورت کی خصوصیات اور قسم کی ہیں، اختلاف کے باوجود دونوں میں ایک قسم کا اتحاد ہے کہ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو پھر عجیب وغریب نتائج نکلتے ہیں اور انسانی زندگی کے اندر ایک نیا رخ پیدا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح سے زمین کو پیدا کیا اللہ تعالیٰ نے، یہ اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک علیحدہ چیز ہے آسمان اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک جدا چیز ہے لیکن دونوں کا آپس میں اختلاف کے باوجود اتحاد ہے کہ ایک دوسرے کے اثرات کو کس طرح سے قبول کرتے ہیں اور پھر ان سے کس قسم کے نتائج اخذ ہوتے ہیں ستاروں کی دنیا کو آپ دیکھیں گے باوجود انتہائی اختلافات کے ان کے اثرات میں کس طرح سے آپس میں اتحاد ہے، سورج اور چاند آپ کو علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں لیکن آپ جس وقت اس کا سائنس کے درجے میں مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنا ان کا آپس میں اتحاد اور آپس میں اتفاق ہے کہ ایک دوسرے سے اخذ فیض کر کے کس طرح سے دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی رحمت کو عام کرتے ہیں اور یہی آ گیا کہ دن اور رات کا آپس میں اختلاف بھی ہے۔

لیکن فوائد کس طرح سے آنے جانے کے ساتھ منطبق ہوتے ہیں، کشتی لوہے کی بنتی ہے لکڑی کی بنتی ہے اور پانی کے مزاج کے ساتھ بظاہر ان کی کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی دونوں چیزوں کا آپس میں اختلاف ہے لیکن اس اختلاف کے اندر اتحاد کا پہلو کس طرح سے ہے کہ دونوں مل کر انسان کے لئے کیسی راحت اور کیسے آرام کی چیزیں مہیا کرتے ہیں کس طرح سے اس کے لئے سفر آسان ہو گیا، تجارت آسان ہوگئی، انسان کے رزق کے اندر وسعت ہوگئی، اور یہی صورت آگے بارش کی ہے بارش کا نباتات سے تعلق، بارش کا حیوانی زندگی سے تعلق ان کی تفصیلات کے اندر اگر آپ جائیں تو کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں کہ ان چیزوں پر بارش کے اثرات کیا واقع ہوتے ہیں نباتات کے ساتھ بارش کا کیا تعلق ہے، حیوانات کا نباتات کے ساتھ کیا ربط ہے، اور حیوانات اور نباتات دونوں کا بارش کے ساتھ کیا ربط ہے اللہ تعالیٰ نے کس طرح سے اس چیز کو کڑی کی طرح جوڑا ہوا ہے جس طرح سے کڑی وار سلسلہ ساری کی ساری چیزیں جڑی ہوئی ہیں یہ سب علامت اس بات کی بنی ہوئی ہیں کہ منتظم اوپر ایک ہی ہے کہ جس کی قدرت کام کرتی ہے۔

ورنہ اگر یہ متعدد ہوتے کوئی بگڑ کر بیٹھ جاتا کوئی کچھ ہو جاتا یہ سارے کا سارا نظم درہم برہم ہو جاتا جیسے آپ کے سامنے وہ آیت آئے گی "لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا" اس میں ایک نکتہ یہی ہے کہ اگر متعدد ہوتے

ہر ایک کی سلطنت علیحدہ علیحدہ ہوتی تو اس طرح سے ان چیزوں کے اندر اتحاد نمایاں نہ ہوتا ان کا اتحاد آپس میں موافقت اور موافقت کے ساتھ آگے اچھے نتائج ہونا علامت ہے اس بات کی کہ دست قدرت ایک ہی ہے جس کے تحت یہ سارے کا سارا کارخانہ چلتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی خالقیت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی رحمت سب ان علامات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے یہ بات بالکل واضح ہے جتنا سوچیں گے اتنی نشانیاں نکلتی جائیں گی۔

مؤمنین کا کردار اور مشرکین کا طرز عمل:

یہ توحید کا ذکر تھا اس کی دلیل کے ساتھ آگے مشرکین کے طرز عمل کو بیان کیا کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ اپنے مالک کو خالق کو پہچانتے اور اس رحمٰن ورحیم کے ساتھ ہی محبت رکھتے اور اسی کے ساتھ ہی پوری کی پوری انسانیت کا تعلق ہوتا اطاعت کا محبت کا لیکن بعضے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسرے مقابل بنا لیتے ہیں اور ان کے ساتھ محبت ویسے ہی کرتے ہیں جس طرح سے کہ اللہ سے کرتے ہیں، محبت کا تقاضہ اعمال ہیں جب قلب کا تعلق کسی چیز کے ساتھ ہوا کرتا ہے تو پھر اس سے اطاعت اور اسی طرح دوسری چیزیں ظاہر ہوا کرتی ہیں جب انہوں نے صرف اللہ کے ساتھ دل نہیں لگایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور مقابل بنا کر ان کے ساتھ بھی دل لگالیا تو ان کی اطاعت اور عبادت کا رخ بھی اس طرف کو ہو گیا ان کی محبت میں مبتلاء ہو گئے "یحبونھم کحب اللہ" ان سے محبت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کی طرح، حب مصدر ہے اور لفظ اللہ اس کا مفعول ہے مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی طرح۔

"والذین آمنوا اشد حبا للہ" اور جو مومن ہیں وہ زیادہ سخت ہیں از روئے محبت کے اللہ کے لئے، مومنوں کو اللہ سے محبت سخت ہوتی ہے، مشرکین کو اپنے شرکاء کے ساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی مومن کو اللہ کے ساتھ محبت ہوتی ہے وجہ بھی ظاہر ہے ایمان کی برکت سے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے وہ اتنا مضبوط تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ جس طرح سے ہمیں فوائد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتے ہیں اس طرح سے ہمارے اوپر مصائب بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں اگر اولاد دینے والا اللہ ہے ہمارے عقیدے کے مطابق تو اس اولاد کو واپس لینے والا بھی اللہ ہی ہے، صحت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے تو بیماری کو بھی ہم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی سمجھتے ہیں، راحت اگر اللہ کی طرف سے ہے تو تکلیف بھی ہم اللہ کی طرف سے ہی جانتے ہیں ان سب چیزوں کو جاننے کے باوجود ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمزور نہیں ہوتا بلکہ اس بات کو جانتے ہوئے کہ ہماری اولاد کو اللہ نے مارا،

اس بات کو جانتے ہوئے کہ اس مصیبت میں اللہ نے مبتلا کیا، اور اس بات کو جانتے ہوئے کہ فقر و فاقہ جو بھی ہمارے اوپر آیا ہے ہمارے اللہ کی جانب سے آیا ہے اس کے باوجود مومن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کمزور نہیں ہوتا بلکہ ان واقعات کے ساتھ اور زیادہ ربط اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔

یہ ایک ایمان کی عجیب شان ہے کہ ہر لحاظ سے ہر بات کو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف جوڑتا ہے، اگر مومن مومن ہونے کے اعتبار سے اس کو سوچے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوا ہے، مصیبت آجاتی ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے خالق نے میرے مالک نے مجھے آزمایا ہے، مجھے اس کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیئے اور اس سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے لیکن مشرکین کا کیا حال ہے مشرکین کا حال یہ ہوتا ہے کہ جس وقت ان کے اوپر کوئی زیادہ سخت مصیبت آجائے تو شرکاء کو بھول جاتے ہیں پھر صرف ایک اللہ کو پکارنے لگ جاتے ہیں قرآن کریم میں جس طرح سے ان کا حال ذکر کیا گیا ہے اور اگر ان کو پتہ چل جائے کہ اس مصیبت میں ہمارے اس معبود نے مبتلاء کیا ہے اس وقت ان کے دل کی وہ کیفیت نہیں رہتی مومن کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے مشرک کی کیفیت وہ نہیں رہتی اگر اس کو پتہ چل جائے کہ مجھے مصیبت میں اس نے مبتلاء کیا ہے تو اس سے نفرت ہو جائے گی تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت کا اعتراف:

لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ مومنوں کا تعلق بہت مضبوط ہے اب اس میں ایک اقرار آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں مومنوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت بہت زیادہ ہے اور یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ جس کے ساتھ آپ کو محبت کا دعویٰ ہو وہ اقرار بھی کر لے کہ واقعی میرے ساتھ فلاں کو محبت ہے عاشق اور محب کے لئے ایک بہت بڑا انعام ہے، ورنہ اکثر و بیشتر عاشق کو یہ شکوہ ہوتا ہے کہ میں مرا جا رہا ہوں اور اس کی میری طرف کوئی توجہ ہی نہیں وہ جانتا ہی نہیں کہ مجھے اس کے ساتھ کوئی محبت ہے ایک فارسی شاعر کہتا ہے کہ میرے لئے یہ بات کافی ہے میرے چاند کو پتہ چل جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں سے ہوں اگر وہ اتنا ہی اعتراف کر لے کہ میں اس کے خریداروں میں سے ہوں تو بس میرے لئے یہی کافی ہے یعنی اس کو یقین دلانا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو اندازہ ہی نہیں اس کو پرواہ ہی نہیں کہ میرے دل کو اس کے ساتھ کتنا تعلق ہے، اس لئے وہ واقعات کے ساتھ، باتوں کے ساتھ رو کر چلا کر جیسے کیسے بھی یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ مجھے تیرے ساتھ محبت ہے اور تو میری محبت کی قدر کر اور اگر وہ اعتراف کر لے کہ واقعی اس کو میرے ساتھ محبت ہے تو عاشق کا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہاں

مومنین کے لئے اعتراف کیا ہے کہ مومنوں کو میرے ساتھ بڑی سخت محبت ہوتی ہے تو مومن جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مدعی محبت ہے اس کے لئے ان لفظوں کے اندر بہت بڑا انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ اعتراف کرے کہ واقعی مومنوں کو میرے ساتھ محبت ہے۔

تو جس وقت آپ کا دعویٰ محبت کا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی ظاہر کر دیا کہ واقعی مومنوں کو میرے ساتھ بہت سخت محبت ہوتی ہے تو آگے پھر محبت کے آداب اور محبت کے حقوق، محبت کے لوازمات خود بخود شروع ہو جاتے ہیں جن کی تفصیل آپ کی خدمت میں "یایھا الذین آمنوا" کے لفظ کے تحت ذکر کی تھی کہ "یایھا الذین آمنوا" کا خطاب جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جاتا ہے اور ادھر یہ ہے کہ مومن اللہ کے محبّ ہوتے ہیں تو گویا کہ ایمان والوں کو محبّ قرار دے کر اللہ تعالیٰ احکام دیتے ہیں اور پھر محبت کے دعویٰ کرنے والوں کی شایان شان نہیں کہ محبوب کی طرف سے حکم آئے تو اس کو تسلیم نہ کیا جائے محبوب کے حکم پر محبّ مرمٹا کرتے ہیں اور محبت ایک ایسی چیز ہے کہ جس وقت قلب کے اندر آجاتی ہے تو پھر اس میں پلٹنا نہیں ہے اس میں یکسوئی ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہو جائے پھر انسان دل کے اعتبار سے، دماغ کے اعتبار سے، ظاہر کے اعتبار سے، باطن کے اعتبار سے اسی کا ہو جاتا ہے پھر کسی دوسرے کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔

عشق حقیقی کی پہچان عشق مجازی سے:

جب وہ اسی کا ہو جاتا ہے پھر آگے سلسلہ اگر پھیلے گا تو اسی کی وساطت سے پھیلے گا ایک چیز کے ساتھ آپ کو محبت ہو گئی جیسے مثال دے دوں، اس سے عشق حقیقی اور عشق مجازی کا قصہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے، مجنوں کو لیلیٰ کے ساتھ محبت ہو گئی تو پھر وہ لیلیٰ تک ہی محدود نہیں رہی، لیلیٰ کے شہر کے ساتھ محبت لیلیٰ کے گلی کوچوں کے ساتھ محبت مجنوں کہتا ہے کہ میں دیارِ لیلیٰ میں سے گزرا کبھی اس دیوار کو بوسہ دیتا تھا کبھی اس دیوار کو بوسہ دیتا تھا، میرے دل میں دیواروں کی محبت نہیں ہے ہاں جو اس کے اندر رہنے والے ہیں ان کی محبت ہے جو میرے قلب میں داخل ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے میں ان کے در و دیواروں کو بھی چومتا ہوں اب اس شہر کی نسبت اس لیلیٰ کی طرف ہو گئی تو اس کے در و دیوار بھی پیارے ہو گئے۔

بلکہ ایک فارسی شاعر نے تو معلوم نہیں واقعہ ہے یا لوگ اس طرح سے بنا لیتے ہیں مثال کے طور پر اور واقعہ بھی ہو تو کوئی بعید نہیں ہے،

پائے سگ بوسیدہ مجنوں خلق گفتہ ایں چہ بود
گفت گاہے گاہے ایں درکوئے لیلیٰ رفت بود

کہ لوگوں نے دیکھا کہ مجنوں! ایک کتے کو پکڑ کر اس کے پاؤں چوم رہا ہے کتے کے قدم چوم رہا ہے، مخلوق کہنے لگی کہ یہ کیا ہوا کتے کے قدم کیوں چوم رہا ہے؟ وہ کہنے لگا میں کتے کے قدم چوم رہا ہوں کہ میں نے اس کو کوئے لیلیٰ کے اندر پھرتے ہوئے دیکھا ہے اس کے قدم چومے وہ لیلیٰ کے کوچے کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جہاں لیلیٰ کے قدم لگتے ہیں تو یہ کتے کے پاؤں جو ہیں حقیقت کے اعتبار سے دیکھنے والے کہیں گے کتے کے ساتھ محبت ہے یہ کتے کے ساتھ محبت نہیں ہے بلکہ اس لیلیٰ سے محبت ہے اور اس لیلیٰ کی طرف نسبت ہوگئی اس کتے کی تو اس کتے سے بھی محبت ہے اور جس وقت محبت ہو جاتی ہے اس کا تذکرہ ہی سب سے لذیذ ہوتا ہے "من احب شیأً اکثر ذکرہ" جتنی اس کے نام میں لذت ہے اتنی کسی دوسری چیز میں لذت نہیں ہوا کرتی۔

اور یہ تو مثنوی میں ہے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے مجنوں کو دیکھا کہ ریگستان میں صحراء میں غم کے جنگل میں اکیلا بیٹھا ہوا ہے کہتے ہیں کہ ریت کو اس طرح سے رکھا ہوا تھا سامنے جس طرح سے کاغذ ہوتا ہے اور انگلی کو قلم بنایا ہوا تھا ایسے لگتا تھا جیسے کسی کے نام کوئی خط لکھ رہا ہے انگلی کے ساتھ ریت کے اوپر کچھ لکھ رہا ہے اس نے کہا اے مجنوں! یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ کس کے نام خط لکھ رہے ہو؟ کہتا ہے کہ خط کس کے نام لکھنا ہے بس لیلیٰ لیلیٰ لیلیٰ.......... اس کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دے رہا ہوں اور لیلیٰ کے نام کی مشق کرتا ہوں تو یہ عشق کے لوازمات ہیں کہ پھر اس کا نام سب سے زیادہ لذیذ، اس کا نام بار بار لینے کے ساتھ دل کو اطمینان چین اور سکون حاصل ہوتا ہے اور جو چیزیں بھی اس کی طرف منسوب ہوتی چلی جائیں گی اسی سے محبت ہوتی چلی جائے گی اور اس کے برعکس جو چیز اس کے مخالف ہوتی چلی جائے گی اس سے دوری ہوتی چلی جائے گی، جو چیز بھی محبوب کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنے والی ہو۔

اس لئے تو لوگوں کو نصیحت کرنے والوں سے سب سے زیادہ نفرت ہوتی ہے، اس قسم کے جو لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو دل دے بیٹھتے ہیں ان کو پھر کوئی نصیحت کرنے کے لئے بیٹھ جائے تو ان کو بڑی نفرت ہوتی ہے کہ ہمیں سمجھاتے کیوں ہو کیونکہ جس طرح سے معشوق کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس طرح سے عاشق کو اپنے عشق کے ساتھ بھی محبت ہوتی ہے وہ اس عشق کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔

مشہور ہے کہ مجنوں کا والد مجنوں کو مکہ مکرمہ لے گیا کعبۃ اللہ کے سامنے تو وہاں جا کر اس کو کہتا ہے کہ دعا کر کہ اے اللہ! میرے دل سے لیلیٰ کی محبت نکال دے، کہتے ہیں کہ مجنوں رونے لگ گیا اور دعا کرتا ہے کہ اے اللہ!

لیلیٰ کے ساتھ محبت اور بڑھادے اللہ اس پر بھی رحم کرے جو میری اس دعا کے اوپر آمین کہے اور آگے پھر یہ شعر پڑھتا ہے اس کا اصل نام قیس ہے اور یہ عربی ہے یہ واقعی شخص ہے فرضی شخصیت نہیں ہے، اور یہ دیوان قیس بھی چھپا ہوا ہے اور اس کے حالات جس قسم کے ہیں پھر وہ موضوع بن جانے کے بعد لوگ مبالغہ بھی کرتے ہوں گے لیکن واقعہ کے اعتبار سے یہ اس کی اصلیت ہے تو وہ دعا کرتا ہوا اللہ کے سامنے کہتا ہے کہ الٰہی ہر گناہ سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ کرنے کے لئے میں تیار نہیں ہوں۔

تو یہ وہی بات ہے کہ عاشق کا معشوق تو معشوق ہوتا ہی ہے اس کو اپنے عشق کے ساتھ بھی محبت ہوتی ہے اس لئے اگر وہ سوچے کہ اگر کسی طرح سے میرے دل سے محبت نکل جائے ایسا نہیں ہوسکتا جہاں دل ایک دفعہ لگ جاتا ہے تو یہ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ نفس پر آ جائے تو اس سے پھر محروم ہونا نہیں چاہتا چاہے اس میں کتنی پریشانیاں ہیں،

برا نہیں یہ درد کچھ بھلا بھی ہے

اس میں لذت اور ذائقہ کچھ اس قسم کا پڑ جاتا ہے تو پھر انسان اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا یہ محبت کے لوازمات ہیں یہ محبت کی خصوصیات ہیں اور جہاں محبوب کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوگی اتنا ہی وہ دور ہٹتا چلا جائے گا جس کو دیکھے گا کہ یہ رکاوٹ بن رہا ہے اس سے نفرت ہوتی چلی جائے گی۔

ایک دفعہ کہتے ہیں کہ مجنوں اونٹنی پر سوار ہوکر لیلیٰ کی طرف چلا اور اونٹنی نے بچہ دیا ہوا تھا پیچھے پیچھے بچہ چلا آرہا تھا اور ان جانوروں کی عادت ہے تھوڑا سا چلنے کے بعد بچے کو دیکھتے ہیں کہ پیچھے آرہا ہے کہ نہیں آرہا مڑ مڑ کر تھوڑی دور چلیں گے چلنے کے بعد پھر پیچھے کو جھانکیں گے کہ وہ آرہا ہے کہ نہیں آرہا اسی طرح سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ اس کی اونٹنی پیچھے مڑ مڑ کر اپنے بچے کو دیکھتی اور مجنوں کے سفر میں رکاوٹ پیدا ہورہی تھی تو دو چار مرتبہ دیکھا دیکھنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس نے اونٹ سے چھلانگ لگادی اور کہنے لگا کہ میرا محبوب آگے ہے اور اس کا محبوب پیچھے ہے میرا اور اس کا اختلاف ہے ہمارا نبھا نہیں ہوسکتا میں آگے کو جھانک رہا ہوں اور یہ پیچھے کو جھانک رہی ہے۔

محبت کے تقاضے:

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ موضوع بہت پھیلا ہوا ہے ایک ایک چیز محبت کے تقاضے کے ساتھ دکھائی جاسکتی ہے کہ محبت کے کیا لوازمات ہیں، اس کی خصوصیات کیا ہیں جس وقت یہ آتی ہے تو پھر کیا رنگ دکھاتی ہے پورے کا پورا باب شرعیات کے اندر مطلوب ہے کہ انسان اللہ کے ساتھ محبت لگا کر اللہ کے رسول کے ساتھ محبت

لگا کر اس کے دل کے جذبات کیسے ہونے چاہئیں عشق مجازی کے رنگ میں نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ آجاتے ہیں، اللہ سے محبت ہے تو اللہ کے گھر سے محبت ہے، اللہ سے محبت ہے تو اللہ کے رسولوں سے محبت ہے، اللہ کے رسول سے محبت ہے تو اللہ کے رسول کے شہر سے محبت ہے، اللہ کے رسول سے محبت ہے تو اس کے یاروں سے محبت ہے، اس کے اہل بیت سے محبت ہے اور پھر اس کے فرمان اس کے احکام جتنے ہیں ان کو قبول کرنے میں اور ان کے اوپر عمل کرنے میں انسان کو لطف محسوس ہوتا ہے، مخالفت ناگوار گزرتی ہے، نافرمانی سے انسان بدکتا ہے یہ ساری کی ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جس وقت قلب کے اندر محبت آجائے تو اس کے بعد یہ سارے کے سارے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔

اس لئے محبت کے بغیر ایمان ہی کچھ نہیں "لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیه من والدہ وولدہ والناس اجمعین" حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک مجھ سے سب سے زیادہ محبت نہیں لگاؤ گے مومن ہی نہیں ہوو گے آپ کا ایمان ایسا خشک سا بے اثر سا اس پر کوئی ایسے آثار مرتب نہیں ہوتے جس وقت کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے محبت سب سے زیادہ نہ ہو تو مومنوں کو جب محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے تو یہ کسی دوسرے کی اس میں شرکت گوارہ نہیں کرتے شرک سے بچتے ہیں ہر لحاظ سے ان کی توجہ اللہ کی طرف ہی ہوتی ہے مثل مشہور ہے "ضرب الحبیب ذبیب" کہ محبوب اگر مارتا بھی ہو تو ایسے ہے جیسے کھانے کے لئے مٹھائی مل گئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آئے تکلیف آئے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو دبالیتا ہے اور دبانے سے کچھ ہائے بھی نکلتی ہے لیکن مزا بھی آتا ہے یہ دونوں باتیں ہوتی رہتی ہیں یہ ساری کیفیات جمع ہوجاتی ہیں جس وقت کہ انسان محبت کی چاشنی چکھ لے، جس وقت تک اس کا مزا چکھا نہیں خدا کی قسم ان کیفیات کا پتہ نہیں چلتا یہ چکھنے کی چیز ہے صرف لفظوں سے کہنے اور سننے کی بات نہیں ہے۔

جس وقت یہ کیفیات طاری ہوجاتی ہیں پھر پتہ چلتا ہے کہ باوجود تکالیف کے آنے کے، باوجود پریشانیوں کے آنے کے عاشق کے دل میں کس طرح سے لذت اور اطمینان ہوتا ہے، ہائے بھی کہے گا، آنکھوں سے آنسو بھی ٹپکیں گے سب کچھ ہوگا لیکن قلب ایک عجیب قسم کا سرور اور لطف محسوس کرتا ہے اللہ کے ساتھ تعلق ہونے کی بناء پر یہی وہ کیفیت ہے جس کو اطمینان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں "الا بذکر اللہ تطمئن القلوب" مومنوں کے دلوں کو چین اور سکون اللہ کے نام سے آتا ہے اور یاد رکھو سکون قلب اگر آسکتا ہے تو اللہ کے نام سے ہی آسکتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں آسکتا تو یہاں اللہ نے اعتراف کیا کہ مومنوں کو اللہ کے ساتھ بہت سخت محبت ہوتی ہے تو پھر اس محبت کے لوازمات ان مومنوں کے ذمے ہیں جتنا ایمان خالص ہوتا چلا جائے گا اتنی محبت خالص

ہوتی چلی جائے گی جتنی محبت بڑھتی چلی جائے گی اتنا ایمان بڑھتا چلا جائے گا اور ایمان اور محبت میں اضافہ ہونے کے ساتھ اطاعت عبادت سب آسان ہوتی چلی جائے گی اور اپنے محبوب کی نافرمانی انسان کے لئے بہت تکلیف دہ بات بنتی چلی جائے گی، تو ساری کی ساری زندگی اس طرح سے ہے کہ اللہ کی اطاعت اور عبادت میں انسان کو لذت آتی ہے۔

نزول مصائب کے ساتھ قدرت الٰہی کا اظہار:

آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان مشرکین نے شرکاء تو بنالیے اگر یہ زیادہ سمجھ نہیں سکتے تو کم از کم جس وقت یہ دنیا میں کسی تکلیف کے اندر مبتلاء ہوتے ہیں اور پھر اپنے ہزار جتن کر کے دیکھ لیتے ہیں وہ تکلیف دور نہیں ہوتی اگر اس وقت ان کی سمجھ میں یہ بات آجایا کرے کہ زور سارے کا سار اللہ ہی کے لئے ہے جب اللہ کی گرفت آتی ہے کسی عذاب کے اندر مبتلاء ہوتے ہیں تو پھر دنیا کی کوئی قوت اور طاقت چھڑالے یہ نہیں ہوسکتا، ایک مشاہدے کی بات ہے آپ کی محبوب ترین شخصیت والد، والدہ، بھائی، بیٹا، اولاد آپ کے سامنے دکھ اور درد میں تڑپ رہے ہیں اور آپ ہر قسم کے اسباب رکھتے ہیں، پیسوں کی کمی نہیں، ڈاکٹروں کی کمی نہیں، طبیبوں کی کمی نہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کہ جب تک اللہ کی منشاء نہ ہو اس وقت تک کوئی مصیبت سے چھڑالے، اگر پیسوں کے ساتھ بچا جاسکتا ہے تو کم از کم سرمایہ دار نہ کبھی بیمار ہوتے اور نہ مرتے اور اگر عملی قابلیت کے ساتھ بچا جاسکتا، طب اور ڈاکٹری کے زور سے بچا جاسکتا تو کم از کم آج جالینوس اور بوعلی سیناء زندہ ہوتے جو اس فن کے ماہر جو موت اور حیات کا فلسفہ سمجھتے تھے اور امراض کے علاج کے اندر ان کو ایک استاذ کی حیثیت حاصل ہے تو کم از کم یہ زندہ ہوتے حکیم اجمل آج بھی اسی طرح سے جلوہ دکھاتا اگر علاج معالجے کے ساتھ ان چیزوں کو دور کیا جاسکتا۔

اور اگر فوجوں کے ساتھ یا کسی دوسری چیز کے ساتھ ان عذابوں کو تکلیفوں کو دور ہٹایا جاسکتا تو نمرود شداد اور فرعون یہ عذابوں کے اندر مبتلاء نہ ہوتے ایسے موقع پر پتہ چلتا ہے کہ سارے کے سارے اسباب دھرے رہ جاتے ہیں، کوئی باطنی قوت ہے جو انسان کو اسی طرح سے رگڑا دیتی ہے جس طرح سے وہ چاہتی ہے اور ظاہری اسباب کے اعتبار سے اس سے انسان بچ نہیں سکتا جب اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاتا ہے تو یہ مصائب اور تکلیفیں ہر انسان کو سبق دیتی ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت، دنیا کی کوئی قوت اللہ تعالیٰ کے ارادے میں رکاوٹ نہیں ہوسکتی اگر یہ لوگ اس تکلیف کے وقت یہ سمجھ جایا کریں تو کم از کم یہ مشرک نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

اگلے الفاظ میں یہی دعوت دی گئی ہے کہ تکالیف میں غور کرنا تکلیف میں مبتلاء ہونے کے بعد حالات کو سوچنا یہ بھی انسان کے قلب کو باقیوں سے توڑ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑتا ہے ترجمہ ان الفاظ کا آپ کی خدمت میں پہلے عرض کر دیا گیا تھا کہ "اگر سمجھ جایا کریں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جب دیکھتے ہیں تکلیف یہ دوسری رؤیت کو رؤیت بصری بنایا تھا اور پہلی رؤیت رؤیت قلبی ہے اگر سمجھ جایا کریں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جب دیکھتے ہیں تکلیف کیا سمجھ جایا کریں کہ قوت ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے اور اس بات کو بھی سمجھ جایا کریں کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں اگر یہ سمجھ جایا کریں "لما اشرکوا" پھر یہ شرک نہ کریں پھر یہ دوسری چیزوں کو دل نہ دے بیٹھیں اس وقت ان کا تعلق جس طرح سے باقیوں سے کمزور ہو جاتا ہے اللہ کی طرف یہ متوجہ ہو جاتے ہیں یہی بات اگر ان کے دل میں اچھی طرح سے بیٹھ جائے کہ قوت ساری کی ساری اللہ کے لئے ہے کہ جب تک اللہ نہ چاہے کسی تکلیف کو دور نہیں کیا جا سکتا تو یہ غور کر لینا اور یہ سمجھ لینا ان لوگوں کے شرک سے بچنے کا ذریعہ بن جاتا۔

کل کے افسوس سے بہتر ہے کہ آج غور کرلو:

آگے ان کی آخرت کی بدحالی ذکر کی ہوئی ہے اور وہ اس انداز کے ساتھ کہ دنیا کے اندر بسا اوقات ایک مشرک ہوتا ہے اور دوسرے محض اس کے پیچھے لگ کر اس کے مسلک کے اوپر چلتے ہیں، چاہے ان کا دماغ اس کو قبول کرے یا نہ کرے یہ تابعین اور متبوعین کا قصہ جو دنیا کے اندر چلتا رہتا ہے کہ چھوٹے لوگ جو محنت کش مزدور قسم کے ہوتے جن کو آپ اپنی اصطلاح کے اندر کمی قسم کے لوگ کہتے ہیں یہ عموماً بڑوں کے پیچھے لگ کر ان کا مسلک اختیار کیے ہوئے ہیں ان کے دل و دماغ میں اگر کوئی بات آ بھی جاتی ہے تو یہ پھر بھی اپنے بڑوں کی مخالفت نہیں کرنا چاہتے اور ان کے مسلک کو چھوڑتے نہیں ہیں اور بڑے بسا اوقات کسی اغراض کی وجہ سے اڑ جاتے ہیں ان کو اپنے جاہ کا فکر ہوتا ہے کہ اگر ہم نے اس نئی آنے والی چیز کو قبول کر لیا تو ہم چوہدری نہیں رہیں گے چودراہٹ دوسری طرف منتقل ہو جائے گی، ہم سردار نہیں رہیں گے سرداری کوئی دوسرا لے جائے گا ہماری ریاست نہیں رہے گی۔

وہ ان اغراض کی وجہ سے ضد، حسد، حب جاہ حب مال کی بناء پر ان کو نہیں چھوڑتے ہیں اور چھوٹے اس وجہ سے اس پر لگے رہتے ہیں کہ ہمارے بڑے اس مسلک پر ہیں تو قرآن کریم نے اکثر و بیشتر یہ عنوان اختیار کیا ہے جس میں چھوٹوں کو دعوت دی ہے کہ تم سوچو ان بڑوں کے پیچھے لگ کر تم جو شرک میں مبتلاء ہو اور اللہ کی نافرمانی کر رہے ہو یہ کب تک تمہارے کام آئے گی، ایک وقت آئے گا جس وقت یہ تم سے بیزار ہوں گے تم ان سے

بیزار ہوگے اور پھر اس وقت تم حسرت کروگے ہائے کاش! ہم ان کے پیچھے نہ لگتے پھر ان کے اوپر تم غصہ دکھاؤ گے کہ آج ہم سے انہوں نے طوطا چشمی دکھائی ہے اور ہمارے یہ کام نہیں آرہے اور دنیا میں ہم ان کی خدمت کرتے رہے اب اگر ہمارا دوبارہ دنیا میں جانا ہوجائے تو ہم بھی ان کو ایسے ہی آنکھیں دکھائیں گے اور ان سے آنکھیں پھیرلیں گے پھر تم اس قسم کی حسرت کا افسوس کروگے آج اپنے انجام پر سوچو، اپنے انجام کو سوچ کر بڑوں کے پیچھے آنکھیں بندکر کے نہ لگو اللہ تعالیٰ کی بات پر کان دھرو، اللہ کے رسول کی بات پر کان دھرو کہ وہ تمہارے مفاد کی بات کہتا ہے اور یہ لوگ تم سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس طرح سے چھوٹوں کو بڑوں کے متعلق یہ طرز فکر دیا ہے تاکہ ان کی بڑائی سر سے اترے اور سرداری کا رعب یہ اپنے سر سے اتاریں اور اتارنے کے بعد یہ صحیح سوچیں اور صرف اتباع کی بناء پر جو کفر اور شرک اختیار کیے ہوئے ہیں ختم ہوجائے۔

"اذتبرء الذین اتبعوا" قابل ذکر ہے وہ وقت جب بیزار ہوجائیں گے وہ لوگ جن کی اتباع کی گئی یہ سردار لوگ "من الذین اتبعوا" ان لوگوں سے جنہوں نے اتباع کی اور یہ سارے عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے تعلقات ٹوٹ جائیں گے دنیا کے اندر جو ان کی یاری باشی کے تعلقات تھے وہ ختم ہوجائیں گے کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے اتباع کی کاش ہمارے لئے لوٹنا ہوجائے ہم دوبارہ دنیا میں چلے جائیں ہم ان سے لاتعلق ہوجائیں گے بیزار ہوجائیں گے جس طرح سے آج ہم سے بیزار ہوگئے ہیں "کذلک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم" اسی طرح سے اللہ تعالیٰ ان کو دکھائے گا ان کے اعمال اور حسرت اور افسوس بن کر ان کے اعمال ان کے سامنے آئیں گے "وماھم بخارجین من النار" اور یہ لوگ جہنم سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ

اے لوگو کھاؤ حلال پاکیزہ ان چیزوں میں سے جو زمین میں ہیں ، اور پیروی نہ کرو شیطان کے خطوات کی

الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ

بے شک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ سوائے اس کے نہیں کہ وہ شیطان تمہیں حکم دیتا ہے برائی کا اور بے حیائی کا

وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا

اور حکم دیتا ہے تمہیں اس بات کا کہ بولو اللہ پر تم ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو ﴿۱۶۹﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اتباع کرو

مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ

اس چیز کی جو اللہ نے اتاری وہ کہتے ہیں کہ بلکہ ہم اتباع کریں گے اس چیز کی جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا ، کیا وہ

كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا

اپنے آباء کی پیروی کرتے رہیں گے اگرچہ ان کے آباء نہ کسی چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ سیدھا راہ پاتے ہوں ﴿۱۷۰﴾ مثال ان لوگوں کی جو کہ کافر ہیں

كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ

مثل اس چیز کے ہے جو پکارے ایسی چیز کو جو نہیں سنتی مگر دعا اور نداء ، یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں

فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ

پس یہ سمجھتے نہیں ﴿۱۷۱﴾ اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ

وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ

اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ﴿۱۷۲﴾ سوائے اس کے کچھ نہیں اللہ نے حرام کیا تم پر مردار

وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ

اور خون اور سور کا گوشت اور وہ چیز جس کے اوپر اللہ کے غیر کے لیے آواز بلند کی گئی ہو ، پھر جو شخص مجبور کر دیا جائے

غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ

وہ طالب لذت نہ ہو اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو اس میں گناہ نہیں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۷۳﴾ بے شک وہ لوگ

يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ

جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو اللہ نے اتاری کتاب سے اور اس کے بدلے میں ثمن قلیل حاصل کرتے ہیں ،

اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ

یہی لوگ نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ اور نہیں کلام کرے گا اللہ ان کے ساتھ

الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے گا ، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۴﴾ یہی لوگ ہیں

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى

جنہوں نے لے لیا گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے ، کس چیز نے ان کو صابر بنا دیا

النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا

آگ پر ﴿۱۷۵﴾ یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب ٹھیک اتاری ، اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے اختلاف کیا

فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

کتاب میں وہ دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۱۷۶﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے توحید کا تذکرہ کر کے مشرکین کی تردید کی تھی جو لوگ انداد بناتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے مقابل دوسروں کو اختیار کرتے ہیں ان کے اوپر رد کیا گیا تھا اب یہاں کچھ رسوم شرکیہ کی تردید کرنا مقصود ہے مشرکوں نے جو طور طریقہ اختیار کر لیا تھا اس کے متعلق کچھ انکار کیا جا رہا ہے خاص طور پر ان کے تحلیل وتحریم کے مسئلے میں۔

تحلیل وتحریم کا منصب اللہ کے علاوہ کسی اور کو دینا:

اللہ تبارک وتعالیٰ کو واحد جاننے کا یہ تقاضہ بھی ہے کہ احکام دینے کا حق صرف اسی کے لئے تسلیم

کیا گیا ہے کسی چیز کو حلال ٹھہرانا، کسی چیز کو حرام ٹھہرانا، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور کسی دوسرے کے لئے یہ منصب نہیں ہے، رسول بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچانے والا ہوتا ہے جس بات کو وہ براہ راست کہہ دے ''قال الله'' اس کو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کا قول ہے اور جس کو وہ ''قال الله'' کے طور پر نہ کہیں تو ہم کہیں گے کہ اس کو رسول اللہ ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے نبی نے حرام ٹھہرایا نسبت اس کی طرف ہوگی لیکن نبی کا یہ منصب خدا کا عطا کردہ ہے اور دین کے اعتبار سے نبی کی جو بات ہوا کرتی ہے وہ اللہ ہی کی بات ہوتی ہے اس کی ذمہ داری اللہ پر ہے چونکہ اس نے اپنا نمائندہ بنا کر ہمارے سامنے بھیج دیا ہے اب وہ جو کہے گا اس کی ذمہ داری اللہ پر ہے وہ بات اللہ کی طرف منسوب ہے اللہ تعالیٰ نے ذمہ لیا ہوا ہوتا ہے نبی کے قول و فعل کا یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی انسان ہونے کی حیثیت سے اس سے کوئی لغزش ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً اس کا بیان آ جاتا ہے نبی کو لغزش پر برقرار نہیں رکھا جاتا۔

یہ مسئلہ آپ نے اصول فقہ کے اندر پڑھا ہوگا اس لئے جس بات پر اس کو برقرار رکھا جائے وہ یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جائز قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول کر لیا اب یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کا بیان کردہ ہے چاہے اس کی ظاہری نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے ''وماینطق عن الهویٰ ان هو الا وحی یوحیٰ'' کا یہی معنی ہے کہ یہ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں فرماتے، جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی شدہ ہوتی ہے، چاہے اس کے الفاظ وحی ہوں چاہے اس کے الفاظ وحی نہ ہوں مضمون جو بھی ہوگا وہ منجانب اللہ ہے،

گفتہ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس کا یہ معنی ہے کہ اس کی کہی ہوئی بات اللہ کی کہی ہوئی ہوتی ہے اگرچہ بظاہر اللہ کے بندے کی طرف منسوب ہو تو تحلیل و تحریم کا منصب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے تجویز کر لینا کہ اس کے کہنے سے کسی چیز کو حلال قرار دے دیا جائے یا اس کے کہنے سے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا جائے یہ بھی شرک کا شعبہ ہے۔

یہود و نصاریٰ کا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنانا:

چنانچہ قرآن کریم میں جو آیت اتری ہے ''اتخذوا احبارهم ورهبانهم اربابامن دون الله'' ان لوگوں نے یعنی یہود و نصاریٰ نے کیونکہ احبار و رہبان یہود و نصاریٰ کے تھے یعنی یہود و نصاریٰ نے اپنے علماء کو اور درویشوں کو احبار حبر کی جمع، رہبان راہبہ کی جمع درویش مشائخ پیر انہوں نے اپنے علماء کو اور اپنے مشائخ کو اللہ کے

علاوہ رب بنا دیا"اربابامن دون الله" بنالیا اور یہ علماء کو اور اپنے پیروں کو رب کی جگہ سمجھتے ہیں، رب بنالیا یہ آیت قرآن کریم میں موجود ہے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ یہ حاتم جو مشہور سخی گزرا ہے اس کا بیٹا عدی رضی اللہ عنہ یہ عیسائی تھے بعد میں مسلمان ہوئے نصرانی تھے اسلام قبول کرلیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر اس نے یہ اشکال کیا کہ جی قرآن تو کہتا ہے کہ ان یہود ونصاریٰ نے اپنے احبار ورہبان کو رب بنالیا حالانکہ وہ تو اپنے احبار ورہبان کو رب نہیں کہتے قرآن نے یہ الزام کیسے لگا دیا یہ عدی بن حاتم نے اشکال کیا ہے کہ قرآن نے یہ الزام نصاریٰ پر کیوں لگا دیا، نصرانی تو اپنے علماء اور درویشوں کو رب نہیں کہتے اور قرآن کہتا ہے"اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون الله" انہوں نے اللہ کے علاوہ ان کو رب بنالیا۔

تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ کہ کیا وہ اپنے علماء اور درویشوں کے کہنے سے بعض اشیاء کو حرام نہیں ٹھہرا لیتے چاہے اللہ کی کتاب کے اندر ان کے حلال ہونے کا تذکرہ ہی ہو وہ کہنے لگے ہاں جی ایسے تو ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشائخ کی بات پر ہی اعتماد کرتے ہیں چاہے اس بارے میں اللہ کی کتاب کچھ اور ہی کہتی ہو، مشائخ کہہ دیں حرام ہے تو حرام سمجھ لیتے ہیں چاہے اللہ کی کتاب اس کو حلال ہی کہتی ہو اور اگر اللہ کی کتاب کسی چیز کو حرام ٹھہرائے اور مشائخ کہہ دیں کہ حلال ہے تو کیا وہ اس کو حلال نہیں سمجھتے ؟ وہ کہنے لگے ہاں جی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ کی کتاب میں کسی چیز کی ممانعت آئی ہوئی ہو اس کو حرام ٹھہرایا ہوا ہو لیکن ان کے علماء اور مشائخ کہہ دیں کہ حلال ہے تو وہ اس کو حلال قرار دیتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی اتخاذ رب ہے، انہوں نے تحلیل اور تحریم کا منصب جو اپنے علماء اور مشائخ کو دے دیا یہی اتخاذ رب ہے اس لئے مسئلہ یونہی ہے کہ تحلیل وتحریم جیسے احکام دینا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا منصب ہے، اللہ تعالیٰ کی نیابت میں اللہ تعالیٰ کی ترجمانی اللہ تعالیٰ کا رسول کرتا ہے، اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف کسی چیز کا استناد نہ ہو، اس کی طرف سے تو ہو حلت اور کوئی فتویٰ دے دے کہ یہ حرام ہے اور اس کے ماننے والے یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے اس چیز کو حلال کہا ہے، اللہ کے رسول نے اس کو حلال کہا ہے اور یہ حرام کہتا ہے لیکن چونکہ ہمارا پیر ہے چونکہ یہ ہمارا مولوی ہے اس لئے ہم تو اسی کے فتوے پر چلیں گے ہم تو اسی کے قول پر عمل کریں گے چاہے اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو یوں سمجھو کہ اس نے اس پیر کو یا اس عالم کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا اور یہ اتخاذ رب کا مصداق ہے۔

حلت وحرمت کے متعلق مشرکین مکہ کا کردار:

اور مشرکین مکہ یوں کرتے تھے کہ بہت ساری چیزیں جو فی الواقعہ اللہ نے حلال ٹھہرائی تھیں ان کو وہ اپنے

بتوں کی طرف منسوب کر کے حرام کر لیتے اور بہت ساری چیزیں جو اللہ نے حرام ٹھہرائی تھیں ان کو اپنے رسم و رواج کے تحت وہ جائز سمجھتے تھے جیسے مردار کھاتے تھے وغیرہ تو یہ تحلیل و تحریم کے اعتبار سے ان کا شرک تھا اس رکوع میں اس پر انکار کرنا مقصود ہے اور مسلمانوں کو تاکید کرنی مقصود ہے کہ تم بچ کر رہنا ان کے طور طریقے سے متاثر ہو کر کہیں تم پھسل نہ جانا اللہ تعالیٰ نے جو چیز حلال ٹھہرائی ہے اس کو حلال جانتے ہوئے کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو تو مشرکین کی یہ رسم جو تھی اس کے اوپر اس رکوع میں انکار کیا جا رہا ہے۔

مشرکین کی ایک عادت یہاں یہ زیر بحث آئے گی کہ وہ لوگ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے بتوں کی طرف منسوب کر کے اپنے لئے حرام قرار دے لیتے تھے کوئی بکرا لات کے نام پر چھوڑ دیا کہ یہ ہم نے لات کو دے دیا یہ اس کی طرف منسوب کر دیا، عزیٰ کے نام پر چھوڑ دیا گائے چھوڑ دی، بھینس چھوڑ دی، بھینسا چھوڑ دیا، اور ان کو سمجھتے کہ اب یہ ہمارے آلہہ کے ہو گئے اب یہ ہمارے نہیں رہے اب اس کے اوپر سواری کرنا حرام، اس کا دودھ پینا حرام، اس کا گوشت کھانا حرام بس اب یہ مجاوروں کے لئے ہے مجاور اس کو کچھ کریں تو کریں باقی مالک اپنے لیے اس کی سواری کو، اس کے دودھ کو، اس کے گوشت کو اور اس قسم کی چیزوں کو حرام سمجھتا تھا، مختلف انداز کے ساتھ یہ جانور چھوڑے جاتے تھے جس کا ذکر سورۃ الانعام میں تفصیلاً آپ کے سامنے آئے گا۔

تو یہ جانور جو حلال تھے اور ان سے انتفاع حلال تھا ان کو بتوں کی طرف منسوب کر کے حرام قرار دے لیتے اور میتۃ وغیرہ اللہ کے حرام ٹھہرائے ہوئے تھے لیکن اپنے رسم و رواج کے طور پر وہ ان کو کھاتے تھے دم ہو گیا، میتۃ ہو گیا، "ما اھل بہ لغیر اللہ" ہو گیا، خنزیر کا گوشت ہو گیا، یہ حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں تھیں اپنے رواج کے طور پر وہ ان کو استعمال کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ یہاں دونوں پہلوؤں کے اوپر انکار کرتا ہے کہ حلال کو حرام ٹھہرانا یہ بھی غلط اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ان کو تمہارا حلال سمجھنا یہ بھی غلط اور دونوں باتوں کی وضاحت کر کے اہل اسلام کو یہ سمجھایا جائے گا کہ آپ اس بات سے بچئے جو حلال ہے اس کو حلال جانو جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اس کو حرام رہنے دو۔

جانوروں کو بزرگ کے نام پر چھوڑنا:

اور اب اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی قبر کی طرف نسبت کر کے کسی مرے ہوئے پیر کی طرف نسبت کر کے، بزرگ کی طرف نسبت کر کے کسی جانور کو کسی خانقاہ پر جا کر چھوڑ دیتا ہے کہ یہ جانور ہم نے اس بزرگ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اس بزرگ کو دیا ہے اور دینے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اس خانقاہ کا متولی ہے وہ

تو اس کو استعمال کرے لیکن جو مالک ہے وہ سمجھتا ہے کہ میرے لئے اب اس کا استعمال حرام ہو گیا مرغا لے جا کر چھوڑ دیا، بکرا لے جا کر چھوڑ دیا، گائے بھینس لے جا کر خانقاہ کی نذر کر دی کہ ہم نے یہ گائے بھینس اس بزرگ کو دے دی اور نیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ اس سے یہ بزرگ خوش ہو جائے اور ہمیں اس کی رضا حاصل ہو جائے زندہ لے جا کر اس کو اس بزرگ کی طرف منسوب کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کے اندر تصرف کی اجازت صرف خانقاہ کے متولی کو ہے ایسا جانور مالک کی ملکیت میں باقی رہتا ہے اور یہ جانور حلال ہے، حرام نہیں ہے اس لئے مالک کی اجازت کے ساتھ اس کو ذبح کر لیا جائے ذبح کر کے کھا لیا جائے یہ حلال ہے، اور جس وقت وہ مالک اپنے طور پر متولی خانقاہ کو دے گیا تو اگر وہ متولی خانقاہ اس کو بیچ بھی دے تو اس کے خریدنے والے کے لئے بھی اس کا کھانا جائز ہے یہ کہنے کے ساتھ کہ ہم نے جانور اس بزرگ کو دے دیا اس کی روح کو خوش کرنے کے لئے جانور جو چھوڑ دیا جاتا ہے جو مشرکین کے اندر بحیرہ سائبہ کی بات تھی اس کے ساتھ اس جانور میں حرمت نہیں آتی البتہ کرنے والے کا فعل حرام ہے کسی بزرگ کی طرف نسبت کر کے یوں چھوڑنا یہ فعل اس کا حرام ہے لیکن وہ جانور حلال ہے یہاں تو اس سے مراد یہ صورت ہے۔

باقی آگے اس بزرگ کی طرف نسبت کر کے ذبح کر دیا جائے اور اس کی روح اس جذبے سے نکالی جائے تا کہ اس کے ساتھ وہ بزرگ خوش ہو جائے اس کی تفصیل "ما اھل بہ لغیر اللہ" میں آ رہی ہے جو زندہ چھوڑ دیا جاتا ہے جانور ذبح نہیں ہوتا یہ جانور اپنی جگہ حلال رہتا ہے اس نسبت کے ساتھ وہ حرام نہیں ہوا البتہ مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے یہ قبروں پر آپ کے ہاں جو پیسے ڈال آتے ہیں لوگ یہ شیرینی وغیرہ ڈال کر آتے ہیں یا اس قسم کی کوئی چیز ڈال آتے ہیں اس بزرگ کی طرف نسبت کر کے اس میں تو بعض شقیں "ما اھل بہ لغیر اللہ" میں آئیں گی کہ اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے یہ چیز دے آئے ان کو "ما اھل بہ لغیر اللہ" ہی ذکر کریں گے، البتہ جانور کوئی اس طرح سے زندہ چھوڑ آئے تو زندہ چھوڑنے کے ساتھ ان کے اوپر حرمت نہیں آئی جب تک اس کو اسی جذبے کے تحت ذبح نہ کیا جائے ذبح کریں اور روح نکالیں اس بزرگ کو خوش کرنے کے لئے وہ "ما اھل بہ لغیر اللہ" میں آئے گا اس مسئلہ کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

اور صرف اس لئے ہم نے اس کو اس قبر کی طرف منسوب کر کے چھوڑ دیا جیسے سانڈھ چھوڑ دیا جاتا ہے تو مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے اس کی اجازت کے ساتھ مجاور استعمال کر لیں، مجاور کسی دوسرے کو اجازت دے دیں وہ اس کو بسم اللہ پڑھ کر قاعدہ کے مطابق ذبح کرے تو اس صورت میں وہ حلال ہو جائے گا تو یہ جو تحریم وہ کرتے تھے ایسا حرام ٹھہرانا یہ طریقہ غلط ہے یہ عمل حرام ہے لیکن جانور اس طرح سے چھوڑنے کے ساتھ حلال رہتا ہے

وہ حرام نہیں ہوتا، پہلی آیت کے اندر تو اس کے اوپر انکار ہے، کہ اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال اور طیب کو کھاؤ یا برتا کرو اپنی طرف سے اس کو حرام نہ ٹھہرایا کرو اپنی طرف سے اس کو حرام کرنے کی کوشش نہ کرو کھاؤ برتو یہ "کلوا" کے اندر تعمیم کر دی کیونکہ ہمارے محاورے میں بھی صرف کھانا یہی نہیں ہوتا کہ منہ کے ذریعے سے اس کو نگل لیا جائے کہتے ہیں کہ لوجی فلاں شخص جو تھا فلاں کا دس ہزار روپے کھا گیا کہ چاہے وہ آپ کا دس ہزار روپے دبا کر مکان ہی بنالے آپ کہیں گے کہ لومیرا دس ہزار روپیہ کھا گیا وہ یتیم کا مال تھا سارے کا سارا فلاں شخص کھا گیا، تو چاہے اس نے یتیم کے پیسوں سے کار خریدی ہو کہتے ہیں کہ فلاں شخص یتیم کا مال کھا گیا، فلاں شخص سود کھاتا ہے فلاں شخص رشوت کھاتا ہے اب وہ رشوت لے کر چاہے اپنے گھوڑے کو چارہ ہی ڈال دے آپ کہیں گے کہ فلاں کھا گیا۔

تو اس لئے کھانا اس سے مراد ہمارے ہاں بھی برتنا ہوتا ہے کہ کھانے کی چیز ہے کھالی، پینے کی چیز ہے پی لی، پہننے کی چیز ہے پہن لی اور جس طرح سے بھی اس کو برتا جاسکے یہ برتنا جو ہے ہمارے محاورے میں بھی کھانے کا مصداق ہے اس لئے "مافی الارض" میں سے حلال اور پاکیزہ چیز کو کھایا برتا کرو اپنے طور پر اس کو حرام نہ ٹھہرایا کرو یہ حرام ٹھہرانے کی رسم جو تم نے اختیار کر لی یہ تمہیں شیطان نے سکھائی ہے تاکہ تمہیں اللہ کی نعمتوں سے محروم کر دے اور آخرت میں بھی تم اللہ کے عذاب میں مبتلاء ہو جاؤ یہ شیطانی طریقہ ہے اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو تم اپنی طرف سے حرام نہ ٹھہرایا کرو "ولا تتبعوا خطوات الشیطان" ان چیزوں کو حرام ٹھہرا کر، حرام قرار دے کر شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو یہ شیطان کی پیروی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہیں ہے، اللہ نے جس چیز کو حلال اور پاکیزہ ٹھہرا دیا حلال ہے اور صاف ستھری ہے، طبعیت اس کی طرف رغبت کرتی ہے لذیذ ہے اس کو کھاؤ اور اس کو حرام ٹھہرانا یہ شیطانی طریقہ ہے۔

شیطان کی دشمنی اور اس کے مشورے:

"انه لكم عدو مبين" یہ تمہارے لئے صریح دشمن ہے اور تمہیں اس قسم کے طریقے سکھا کر اللہ کی نعمتوں سے محروم کرتا ہے اور اللہ کی ناراضگی کے اندر تمہیں پھنساتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ وہ شیطان جو تمہارا دشمن مبین ہے تمہیں حکم دیتا ہے بری باتوں کا اور بے حیائی کی باتوں کا مشورہ دیتا ہے تمہارے دل کے اندر ایسی باتیں ڈالتا ہے جو تمہیں برائی کی طرف لے جانے والی ہیں، بے حیائی کی طرف لے جانے والی ہیں "سوء" عام ہو گیا جو بھی برا کام ہو عقل کے نزدیک، فطرت صحیحہ کے نزدیک، اللہ کے احکام کی رو سے جو برا کام ہے سوء کا مصداق ہے۔

اور "فحشاء" شدید قسم کے گناہ آگئے، زنا، لواطت، ننگے طواف کرنا اور اس قسم کی کھلی کھلی بے حیائیاں جو ہیں وہ فحشاء کا مصداق ہیں اور تمہیں اس بات کا مشورہ دیتا ہے کہ تم اللہ پر ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے تم ایک بات منسوب کر دیتے ہو کہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ یوں کیا کرو حالانکہ تمہارے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہوتی جو تم بیان کر سکو کہ کہاں اللہ نے کہا ہے کسی علمی دلیل کے ساتھ ثابت کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب وہی بات کرنی چاہیئے کہ جس کے متعلق انسان کو علم ہو کہ واقعی یہ اللہ کی ہے اور علمی دلیل کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ کا قول ہے وہی بات اللہ کی طرف منسوب کرنی چاہیئے ورنہ یہ " افتراء علی اللہ " اللہ پر جھوٹ بولنا ہے جس کا عذاب ہوگا اور "ان تقولوا" سے وہی افتراء باندھنا مقصود ہے شیطان تمہیں مشورہ دیتا ہے کہ تم اللہ پر ایسی باتیں بولو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔

جاہل اور بے عقل آباؤاجداد کی اقتداء کرنا:

اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرو جو طریقہ اللہ نے بتایا ہے جو مذہب اللہ نے ظاہر کیا ہے تم اس کی اتباع کرو، عقل کے مطابق فطرت صحیحہ کے مطابق یہی بات ہے کہ اشیاء کو پیدا کرنے والا اللہ، اس میں کونسی شئی استعمال کرنا تمہارے لئے ٹھیک ہے کونسی نہیں ہے یہ اللہ سے پوچھو جو وہ احکام دے وہی ماننے چاہئیں اس کے جواب میں ان کے ہاں دلیل یہی ہے کہ نہیں بھائی ہم نہیں جانتے کہ "ما انزل اللہ" کیا ہے ہم تو صرف اس طریقہ پر چلیں گے جس کے اوپر ہم نے اپنے آباء کو پایا اتباع آباء یہ ہے ان کی دلیل اس کے ساتھ وہ اپنے اعمال کے لئے جواز مہیا کرتے ہیں پوچھو کہ کیوں کرتے ہو ایسا تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے کرتے ہوئے دیکھا ہے، بس یہ سب سے بڑی ان مشرکوں کی دلیل ہے آباء کی اتباع جس طریقے پر اپنے آباؤاجداد کو پایا ہم تو اسی طرح سے کریں گے ہم اپنے آباؤاجداد کا طریقہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں یہ مشرکوں کی دلیل ہے تو اس دلیل کو اللہ تعالیٰ ان الفاظ کے ساتھ باطل کرتے ہیں "اولو کان آباء ھم لایعقلون شیئا ولا یھتدون" اتباع اس کی کی جا سکتی ہے جس کا طریقہ عقل وہدایت کے مطابق ہو جو اپنے طریقے کو ثابت کرنے کے لئے عقلی دلیل رکھتا ہے یا وہ اپنے اس طریقے کو ثابت کرنے کے لئے نقلی دلیل رکھتا ہے نقلی دلیل ہدایت ہے اور عقلی دلیل یہ یعقلون کا مصداق ہے، ہدایت کا مصداق نقلی دلیل کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس کوئی راہنمائی ہے وہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے کوئی دلیل بیان کر سکتا ہے۔

اور عقل کا مطلب یہ ہے کہ استنباط اجتہاد وقیاس جو صحیح طریقہ ہے ان احکام کے سمجھنے کا اس سے کوئی عقلی

استدلال کو ثابت کر سکے اگر کوئی آدمی اپنے مسلک کے اوپر عقل ونقل کے دلائل رکھتا ہے اس کے تو پیچھے لگنا چاہیئے اور اگر کسی کا طریقہ ایسا ہے کہ نہ اس کے پاس کوئی نقلی دلیل اور نہ کوئی عقلی دلیل بے عقلے بے ہدایت لوگ نہ ان کے پاس عقل ہے نہ نقل نہ اپنے مسلک کے لئے وہ نقلی دلیل پیش کر سکیں کہ دیکھو اللہ نے یوں کہا اور نہ وہ قیاس صحیح اجتہاد صحیح اور عقلی دلیل کے ساتھ ثابت کر سکیں ایسے لوگوں کے پیچھے لگنا وہی بے عقلوں کا کام ہے جو ان کے پیچھے لگے گا جیسے وہ بے عقل ایسے ہی یہ بے عقل تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ان سے پوچھو کہ تم اپنے آباء کے پیچھے لگے رہو گے اگر چہ تمہارے آباء پرلے درجے کے جاہل ہوں بے عقل ہوں یہ کونسی عقل مندی ہے ان کے پیچھے لگنا تو یہاں انکار کرنا مقصود ہے ان لوگوں پر جو اپنے ایسے آباء کے پیچھے لگتے ہیں جو عقل وہدایت سے محروم ہیں ان کے پیچھے لگنے کی اجازت نہیں ہے۔

علوم نقلیہ وعقلیہ کے ماہر لوگوں کی اقتداء کرنا:

ہاں اگر کسی کا بڑا باپ ہو، دادا ہو، پردادا ہو، کوئی پیشوا ہو جس کے متعلق ہمیں پتہ ہے کہ وہ علوم نقلیہ کا ماہر ہے، علوم عقلیہ کا ماہر ہے اور اپنے ہر طریقے کے اوپر وہ عقل ونقل کے ساتھ صحیح دلائل رکھتا ہے لیکن ہم اس پائے کے نہیں ہیں کہ ہم اس کے دلائل کو سمجھ سکیں اس پر اعتماد ہے کہ جو بات کہتا ہے یا تو صراحتاً قرآن وحدیث میں آئی ہوئی ہے یا وہ صحیح طریقے کے ساتھ استنباط کر کے کہتا ہے کسی کے علم پر کسی کے عمل پر دیانت پر اس طرح سے اعتماد کر کے اگر کوئی بات مانی جائے تو وہ اس آیت کے خلاف نہیں ہے ایسے لوگوں کے تو پیچھے لگنا چاہیئے، اگر کسی کے آباؤ اجداد ایسے ہیں کہ عقل اور ہدایت کی دولت سے مالا مال ہیں ان کی تو اتباع مقصود ہے اس لئے اس آیت کو ائمہ کرام کی تقلید کی ممانعت کے لئے پڑھنا یہ جہالت ہے اس سے ائمہ کرام کی تقلید کی ممانعت نہیں ہوتی کیونکہ وہ بے عقل اور بے ہدایت نہیں بلکہ اپنے ہر مسئلے کے لئے نقلی دلیل رکھتے ہیں اور اپنے ہر مسئلے پر وہ عقلی دلیل رکھتے ہیں جس کے ساتھ وہ ثابت کرتے ہیں کہ واقعی حکم خداوندی ہے اور جو بے علمی کے ساتھ ایسے ہی بنا بنا کر اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہ مشرکانہ طریقہ ہے اور ایسے جاہلوں کے پیچھے لگنے کی اجازت نہیں ہے۔

کبھی کسی غیر مقلد سے آپ کو واسطہ پڑے گا آپ کہیں گے کہ ہمارے امام نے یوں کہا وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی مشرکوں والی بات ہے "ما الفینا علیه آباءنا" ہمارے آباء کا طریقہ یوں چلا آتا ہے وہ بھی تو یوں کہتے تھے وہ فوراً یہ آیت آپ کے سامنے پڑھ دیں گے میں اس کا جواب آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ یہ بات وہاں صادق نہیں آتی

کیونکہ یہ ان آباء کے بارے میں ہے کہ جو اپنے مسلک کے اوپر نہ کوئی صحیح نقل رکھتے ہیں اور نہ اپنے مسلک کو کسی عقلی دلیل سے ثابت کر سکتے ہیں اور جو ایسے اہل علم ہوں ہمارے آباء کہ جو نقل کے پابند ہیں اور صحیح دلائل کے پابند ہیں اور ہمیں ان کے علم پر، دیانت پر، عقل پر اعتماد ہے کہ جو وہ کہتے ہیں وہ اللہ کی بات کہتے ہیں ان کی بات کو یہ کہہ کر ماننا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اقوال کی ہمارے سامنے تفصیل کرتا ہے اور اللہ کے رسول کی ہمارے سامنے بات کہتا ہے چاہے ہم اپنے علم کے ساتھ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں اس اعتماد کے ساتھ کسی کی بات کو مانا جاسکتا ہے یہ تقلید ہے جو اس آیت کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہمارے امام "لا یعقلون شیئا ولایھتدون" کا مصداق نہیں ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کے تذکرے میں اتباع آباء کا ذکر:

دیکھو قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک وعظ نقل کیا ہے سورۃ یوسف میں قیدیوں کے سامنے "واتبعت ملة آباءی ابراھیم واسحاق ویعقوب" اب ابرہیم علیہ السلام اسحاق علیہ السلام یعقوب علیہ السلام یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء کا مصداق ہیں میں نے تو اپنے آباء کا طریقہ اپنالیا میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا جو اللہ کے ساتھ ایمان نہیں لاتے اور آخرت کے منکر ہیں ان کے طریقے پر میں نہیں چلتا میں تو اپنے آباء کے طریقے پر چلوں گا اور وہ آباء کون ہیں ابراہیم علیہ السلام اسحاق علیہ السلام یعقوب علیہ السلام یہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے متعلق پتہ ہے کہ وہ عقل وہدایت سے مالا مال ہیں لہذا ہم تو ان کے طریقے پر چلیں گے یہاں بھی اتباع ملت کا عنوان کیسے صریح آیا ہوا ہے۔

اور پہلے پارے میں آپ کے سامنے وہ الفاظ گزر گئے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی "ماتعبدون من بعدی قالوا نعبد الٰھك واله آباءك" وہ کہنے لگے ہم اس خدا کو پوجیں گے جس کو تو پوجتا تھا اور تیرے آباء اور بزرگ پوجتے تھے تو گویا کہ معرفت الٰہیہ کے بارے میں بھی اپنے آباء پر اعتماد کیا کہ جو الہ ان کا تھا وہی ہم مانیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے ورثاء کی اتباع:

اب کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تو سارے کے سارے انبیاء علیہم السلام ہیں جن آباء کا ذکر یہاں آرہا ہے وہ تو سارے کے سارے انبیاء علیہم السلام ہیں ان کی اتباع تو انبیاء علیہم السلام کی اتباع ہے اور انبیاء علیہم السلام کی اتباع کا تو انکار ہی نہیں ہے تو اس کا جواب یہی ہے جو میں آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کی اتباع وہ تو ہوگی فرض کے درجے میں وہ تو ایمان کی ایک بنیاد ہے لیکن "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" جب نبی نہ ہو تو نبی کے خلفاء، نبی نہ ہو تو نبی

کے ورثاء جو ترجمانی کریں گے جاہل کے لئے وہی حجت ہے جو شخص براہ راست اللہ اور اللہ کے رسول سے استفادہ نہیں کر سکتا اس کے اقوال میں اتنی استعداد نہیں جاہل ہے نادان ہے اتنی عقل اور سمجھ نہیں رکھتا۔

تو "العلماء ورثۃ الانبیاء" میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کی طرح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اقوال کی اشاعت کریں گے، اللہ تعالیٰ کے رسول کے اقوال کی اشاعت کریں گے "العلماء ورثۃ الانبیاء" اس طرح جس طرح استفادہ انبیاء علیہم السلام سے کیا جاتا ہے اس طرح سے آپ کے چلے جانے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے روپوش ہو جانے کے بعد وہی استفادہ آپ کے خلفاء اور آپ کے ورثاء سے کیا جائے گا اس لئے "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" میرے طریقے کو لازم پکڑو خلفاء کے طریقے کو لازم پکڑو، خلفاء راشدین یہ بھی تو ہمارے آباء ہی ہیں تو یہ اتباع جو ہوگی ان لوگوں کی وہ اس جذبے کے تحت ہے کہ یہ بات اپنی نہیں کہتے اللہ کی کہتے اور اپنی ہر بات کے لئے یہ اللہ اور اللہ کے رسول کی تعلیم سے اس کے اوپر دلیل رکھتے ہیں یا وہ بات صراحتاً آئی ہوئی ہو یا طریقہ قیاس واجتہاد کا جو اللہ اور اللہ کے رسول نے راہنمائی کی ہے اس کے مطابق یہ استنباط کرتے ہیں استنباط کی ہوئی باتوں کو ماننا یہ تو اللہ اور اللہ کے رسول کی اتباع ہے، ہم اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے بلکہ ہم اس لئے مانتے ہیں کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد واضح کی ہے۔

ورنہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوئی شارع نہیں ہیں کہ قرآن وحدیث سے نظر ہٹا کر اپنی طرف سے احکام دینے شروع کر دیں ایسی بالکل بات نہیں ہے ہم اس کو اللہ اور اللہ کے رسول کے اقوال کا شارح سمجھتے ہیں اس لئے جو وہ مراد واضح کرتا ہے ہم اس کو اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم سمجھ کر مانتے ہیں چاہے ہم اس کو براہ راست قرآن وحدیث سے سمجھ نہ سکیں لیکن ان کی عقل اور ان کا علم اس درجے کا ہے کہ ہمیں اعتماد ہے جو وہ کہتے ہیں اللہ اور اللہ کے رسول کی مراد کے مطابق کہتے ہیں، ان کی بات کو ماننا حقیقت کے اعتبار سے اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو ماننا ہے اس لئے یہ تقلید ممنوع نہیں ہے۔

علماء حق کی اتباع:

ہاں البتہ اگر کوئی اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کے خلاف کہتا ہے اور اپنے اس قول کے اوپر کوئی نقل وعقل سے دلیل نہیں رکھتا اب یہ کلیۃً دوسرے پر یوں اعتماد کر لینا، چاہے اس کی بات اللہ کے قول کے خلاف ہی ہو اور اللہ کے رسول کے قول کے خلاف ہو ہم اس کی بات مانیں گے تو یہ شرک ہے اور یہ تھا مشرکوں کا طریقہ جس کے اوپر یہاں انکار کیا جا رہا ہے اور اسی طرح سے جس وقت آپس میں آپ حضرات کی گفتگو ہوگی بعض حضرات جو اپنے

آپ کو علماء دیوبند کی طرف منسوب کرتے ہیں بلکہ سچے پکے دیوبندی صحیح طور پر اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں ان سے اگر کسی وقت آپ کی گفتگو کسی مختلف فیہ مسئلے میں ہو جائے اور آپ ان کے سامنے کوئی ایسی عبارت جو مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو یا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو یا مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو ان بزرگوں میں سے کسی بزرگ کی عبارت آپ پڑھیں کہ بھائی انہوں نے یوں لکھا ہے ہم تو اس بات کو مانتے ہیں تو منہ پھٹ جو ہوتے ہیں وہ یہاں بھی فوراً اس آیت کو پڑھ دیں گے وہ کہیں گے کہ یہ کیا طریقہ ہوا اللہ کا قول لاؤ یا اللہ کے رسول کا قول لاؤ۔

یہ کہنا کہ ہمارے بزرگوں کا یہ مسلک ہے یہ تو وہی مشرکوں والی بات ہے، ہم تو اپنے بزرگوں کے مسلک پر چلتے ہیں ہمیں نہیں پتہ کہ اللہ کا کیا حکم ہے اللہ کے رسول کا کیا حکم ہے تو یہاں بھی یہ بات کر دیں گے کبھی واسطہ پڑے گا آپ کو تو آپ کے سامنے یہ بات آ جائے گی تو اس وقت بھی آپ لوگوں نے یہی کہنا ہو گا کہ جی یہ بات آپ اس وقت کہنا کہ جن کے نام میں لے رہا ہوں حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کیا تیرے خیال کے مطابق یہ ''لایعقلون شیئا ولا یھتدون'' ہیں اگر واقعی ہی آپ کے خیال کے مطابق ''لایعقلون شیئا ولا یھتدون'' ہیں تو ایک دفعہ کہہ دو پھر پتہ چلے گا ان کے نام کی روٹیاں جو کھاتے ہو کہاں تک ملتی ہیں پھر دوبارہ اپنے آپ کو دیوبندیوں کی طرف منسوب کر کے ان بزرگوں کا نام لے کر جو روٹیاں کھا رہے ہو پھر پتہ چلے گا کہہ دو کہ یہ ''لایعقلون شیئا ولا یھتدون'' کا مصداق ہیں اس لئے ہم ان کے استنباطات اور ان کی باتیں ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ان کی باتوں کو ماننا یہ ایسے ہی ہے جیسے مشرکین اپنے آباء کے طریقے پر چلتے تھے۔

اور اگر تم ان کو ''لا یعقلون شیئا ولایھتدون'' نہیں کہہ سکتے بلکہ ''یعقلون یھتدون'' ہیں اور یقیناً ہیں یہ عقل و ہدایت کے زیور سے آراستہ ہیں اور عقل و ہدایت کی دولت سے مالا مال ہیں اس لئے اگر کوئی شخص ان کے اقوال پر اعتماد کرتا ہے اس طرح سے کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن و حدیث کی مراد یہی ہے اس لئے اس کی بات کو ماننا اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو ماننا ہے تو جس طرح سے ائمہ کی تقلید ہے اسی طرح سے ان بزرگوں پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی باتوں کو مان لیا جائے تو یہ اس قرآن کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ تو ملت آباء ہے جس کی اتباع ہمیں کرنی چاہئے کیونکہ آباء ہمارے ایسے ہیں جو کہ ''یعقلون یھتدون'' ہیں یہ نعوذ باللہ ''لایعقلون لایھتدون''

نہیں ہیں کہ ہم سمجھیں کہ انہوں نے تو قرآن سمجھا نہیں ہم نے قرآن سمجھا ہے اس لئے جو ہم کہہ رہے ہیں یہ تو تم مان لو۔

کس کا فہم معتبر ہے؟

اب ایک آدمی کہتا ہے دیکھو جی قرآن میں یوں آتا ہے اور انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ یوں کہتا ہے میں کیا کروں، میں تو قرآن کو مانوں گا، حقیقت کے اعتبار سے وہ قرآن کو نہیں مان رہا وہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فہم کے مقابلہ میں اپنے فہم کو ترجیح دے رہا ہے، وہ تاثر تو یہ دیتا ہے کہ میرا فہم صحیح ہے اور جو میں قرآن سے سمجھ رہا ہوں یہ بالکل ٹھیک ہے اور جو سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھا یا کسی دوسرے نے سمجھا وہ ٹھیک نہیں ہے اصل میں وہ دعوت اپنے فہم کی طرف دے رہا ہے اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ تمہارے فہم کے مقابلہ میں ان کا فہم اچھا ہے اور جس طرح سے تم سمجھتے ہو اس طرح سے ہمیں بھی سمجھنے کا حق ہے پھر ہمارے فہم کے مقابلہ میں تمہارا فہم کیسے اونچا ہو گیا پھر جو ہم نے سمجھا ہے ہمیں اس پر رہنے دو اور جو تم نے سمجھا ہے تم لئے پھرو یہ اصل کے اعتبار سے قرآن کریم کا اتباع نہیں اپنے فہم کا اتباع ہے یہ اپنے فہم کو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ ترجیح دیتے ہیں جس کی بناء پر وہ کہتے ہیں کہ ان کا سمجھا ہوا ٹھیک نہیں ہم جو سمجھ رہے ہیں یہ ٹھیک ہے۔

تو ایسے جو گستاخ ہوا کرتے ہیں اس قسم کے جاہل حقیقت کے اعتبار سے یہ "لایعقلون" ہیں ان کی بات پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے، بات وہی ہے جو کہ ان ماہرین نے جو علم و عقل کے ساتھ مالا مال تھے اور زندگی بھر ان لوگوں نے یہی قرآن و حدیث کے اندر غوطہ زنی کی ہے اور اللہ اور اللہ کے رسول کی مرادات کو واضح کیا اور ان اسرار و رموز کو اپنے قلب کے ساتھ پہچانا قابل اعتماد اصل میں انہیں کے فرمودات ہیں اور آج کل کے لوگ جن کو دائیں بائیں کی خبر نہیں ہے وہ وہی مثال جو محاورہ آیا کرتا ہے کہ بندر کو کہیں ادرک کی گٹھلی مل گئی اور وہ دوکان لگا کر بیٹھ گیا کہ میں بھی پنساری ہوں یعنی ایک ادرک کی گٹھلی مل گئی بندر کو اور وہ بھی ڈٹ کے بیٹھ گیا کہ جس طرح سے بازار میں پنساری کی دکان ہوتی ہے میں بھی پنساری ہوں۔

اب یہاں تو یہی حساب ہے کہ دو ورقی رسالہ دیکھ لیا کہیں سے وہاں سے زعم پیدا ہو گیا کہ ہم نے اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ لیا، اردو کے چار حرف جان لئے، اخبار میں کوئی مضمون پڑھ لیا بس اسی کے اوپر اچھلتے کودتے پھرتے ہیں باقی ان لوگوں کو علم کی کیا خبر، جنہوں نے برہا برس قرآن و حدیث کی ورق گردانی کی اور اس زمانے میں تمام امت نے ان کے اوپر اعتماد کیا اور آج عملی دنیا کی رونق انہی لوگوں کی وجہ سے ہے آج اس ملک کے اندر

اہل حق کا گروہ جس کو ہم سمجھتے ہیں کہ علماء دیو بند کے متبعین ہیں وہ وہی لوگ ہیں جو ان حضرات کے متبع ہیں جو ان پر اعتماد کرنے والے ہیں انہی کو ہم اہل حق سمجھتے ہیں حق کا نام ونشان اس ملک کے اندر ان لوگوں کے دم قدم سے آج تک قائم ہے اور ہم انہی کی برکت سے یہ چار حروف سیکھے ہوئے ہیں اور انہی کی برکت سے بیٹھے ہوئے ہیں عزت پار ہے ہیں روٹیاں کھا رہے ہیں۔

تو ان کی بات کو اس طرح سے ٹھکرا دینا کہ ہم قرآن وحدیث کے مقابلہ میں ان کی بات کو کیا کریں حقیقت کے اعتبار سے وہ بات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہوتی تمہارے اپنے فہم فاسد کے خلاف ہے تمہیں سمجھ نہیں آتی اس لئے سمجھتے ہو کہ جو ہم سمجھ رہے ہیں یہی ٹھیک ہے جو انہوں نے سمجھا ہے وہ غلط ہے بس یہ اعتماد آپ کی طبعیت میں ہونا چاہئے کہ یہ آباء ہمارے "یعقلون یھتدون" ہیں قرآن کریم سے یہ اشارہ تو نکلتا ہے کہ جو باعقل باہدایت ہوں ان کا کہنا ماننے چاہئے اور جو بے عقل ہوں ان کا کہنا نہیں ماننا چاہئے تو ایسے موقع پر اگر کوئی یہ آیت پڑھتا ہے تو یہ حد سے تجاوز ہے۔

جاننے کے باوجود رسم کی پابندی علم کی توہین ہے:

ہاں البتہ جاہل آباء کی بات صرف اپنی خاندانی رسوم جس طرح سے ہوتی ہیں اب آپ نے علم حاصل کر لیا آپ علمی دلیل کے ساتھ جانیں کہ یہ رسم غلط ہے اللہ اور اللہ کے رسول کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے جو کام کا طریقہ بتایا ہے اس کے یہ خلاف ہے اللہ کے رسول کی جو سنت ہے اس کے خلاف ہے یہ طریقہ آپ عقل کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے لیکن پھر آپ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوں صرف اس وجہ سے کہ یہ تمہاری خاندانی رسم ہے چاہے سنت کے خلاف ہے، چاہے شریعت کے احکام کے خلاف ہے یہ پھر جہالت کی اتباع ہے تو علم والے ہو کر جہالت کی اتباع کرنا یہ علم کی توہین ہے اس کی آپ کو ممانعت ہے یہ پھر ویسی بات ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے سنائی "ولئن اتبعت اھواء ھم من بعد ماجاء ك من العلم انك اذاً لمن الظالمین" یہ حضور ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہی ہے لیکن سنائی آپ کو ہے کہ اگر علم آ جانے کے بعد تم نے لوگوں کی خواہشات کی اتباع کی اور جو بھی شریعت کے خلاف کہتا ہے وہ خواہشات ہی خواہشات ہے اگر علم کے آجانے کے بعد تم نے ان کی خواہشات کی اتباع کی تو پھر آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آپ آ جائیں گے یہ بات وہاں صادق آئے گی جہاں علمی طور پر آپ ایک طریقے کی غلطی سمجھ گئے لیکن خاندان کے رسم ورواج کی پابندی آپ ویسے ہی کرتے ہیں جس طرح سے آپ کے آباء کا طریقہ چلا آرہا ہے چاہے آپ کے علم، عقل، ہدایت کے خلاف ہے یہ اتباع جو ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔

مشرکین تو جانوروں کی طرح ہیں:

"ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق" اس آیت میں مشرکین کے سوء فہم کو ایک مثال کے ساتھ واضح کیا گیا ہے ان کی مثال چوپائے جیسی ہے جیسے ان کو کوئی پکارے آواز دے تو ان کے کان تک آواز تو پہنچتی ہے لیکن اس کا مفہوم نہیں سمجھتے مفہوم ان کے ذہن میں نہیں آتا اس طرح سے مشرکین جانوروں کی طرح ہیں کہ حق سننے سے بالکل بہرے ہوگئے، حق بات کہنے سے گونگے ہوگئے اور حق دیکھنے سے اندھے ہوگئے اب ان کی عقل ٹھکانے نہیں اور ان کی مثال بالکل جانوروں جیسی ہے اس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے جو آپ کے بار بار سمجھانے کے باوجود اگر ان کی طبعیت پر اثر نہیں ہوتا تو آپ اس کی فکر نہ کریں انہوں نے اپنی استعداد خراب کرلی۔

اب یہ انسان نہیں بلکہ عام حیوانوں کی طرح ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں ہی دوسری جگہ ایسے الفاظ آئے ہیں "اولئك كالانعام بل هم اضل" یہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں ان الفاظ کا ترجمہ کرتے ہوئے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ یہاں مثال دی گئی ہے "کمثل الذی ینعق" مثل اس شخص کے جو کہ پکارتا ہے کافروں کی مثال پکارنے والوں کے ساتھ نہیں ہے پکاری ہوئی چیز کے ساتھ ہے جس کا مصداق ہے "بما لا یسمع الا دعاء ونداء" تو جو مثل کا مجرور ہے مثل کا مدخول براہ راست وہ مثال نہیں ہے بلکہ مثال بنتی ہے "بما لا یسمع الا دعاء ونداء" اس لئے یا تو یوں کہیے کہ یہ تشبیہ دی گئی ہے مرکب کے ساتھ جس میں مشبہ بہ صرف ایک جزو ہے پھر ترجمہ یوں ادا کریں گے ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا ایسے ہے جیسے کوئی شخص پکارے ایسی چیز کو جو نہیں سنتی سوائے چیخ و پکار کے اور مشبہ بہ جس کو بطور مثال کے بیان کرنا مقصود ہے وہ "ما لا یسمع الا دعاء ونداء" ہے اور مشبہ ہو جائیں گے "الذین کفروا" کافرلوگوں کی مثال اس جانور جیسی ہے جو نہیں سنتا مگر چیخ و پکار اس مرکب میں سے ایک جزو مثال ہے سارا مرکب مثال نہیں ہے۔

یہاں "الذین کفروا" کے اوپر داعی کا لفظ محذوف نکال لیجئے "مثل داعی الذین کفروا" ان کافروں کو بلانے والے کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص بلانے والا ہو کوئی شخص آوازیں دیتا ہو ایسی چیز کو جو سوائے چیخ و پکار کے کچھ نہیں سنتی یعنی آپ ان کو آوازیں دیتے ہیں، راہ حق کی طرف بلاتے ہیں، سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں تو یہ آپ کی آواز تو سنتے ہیں لیکن اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس طرح سے کوئی جانوروں کا چرواہا

جانوروں کو آواز دے تو وہ بامعنی بات نہیں سمجھتے مضامین سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اگرچہ چیخ و پکار ان کے کانوں تک جاتی ہے۔

"هم صم" یہ بہرے ہو چکے ہیں ان کے کانوں کی استعداد خراب ہوگئی اب آپ جانتے ہیں کہ وہ حقیقتاً تو بہرے نہیں تھے جب کوئی نفع کی بات سنتے نہیں، سن کر اس کے اوپر عمل نہ کرے سنی ان سنی کر دے تو ایسے ہی ہوتا ہے جیسے بہرہ کیونکہ مقصد بات سننے کا اس کو قبول کرنا اور اس کے اوپر عمل کرنا ہے جب توجہ کے ساتھ سنی نہیں جائے گی، سمجھی نہیں جائے گی، عمل نہیں کیا جائے گا سنا نہ سنا برابر ہے اور یہی مطلب ہے کہ "بکم" ابکم کی جمع ہے ابکم کہتے ہیں گونگے کو جو زبان سے صحیح بات کہتا نہیں "عمی" کی جمع اعمٰی اعمٰی اندھے کو کہتے ہیں "فهم لایعقلون" جب یہ کان آنکھیں اور ان کی زبان ماؤف ہوگئی "فهم لایعقلون" پس یہ سمجھتے کچھ نہیں ہیں ان کو عقل نہیں ہے "عقل یعقل" سوچنا لیکن جس وقت آگے مفعول نہ ذکر کیا جائے تو بسا اوقات اسی فعل کی نفی کرنا مقصود ہوتی ہے تو "هم لایعقلون" کا معنی ہوگا کہ ان کو عقل نہیں ہے جیسے "لایعلمون" کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا ہے کہ ان کو علم نہیں ہے مفہوم ذکر کرنا مقصود نہیں ہے صرف اسی معنی کی نفی کرنا مقصود ہے تو "لایعقلون" کا معنی ہوگا کہ ان کو عقل نہیں ہے۔

حلال کھانے اور شکر ادا کرنے کا حکم:

"یاایها الذین آمنوا کلوا مما رزقناکم" جو کچھ ہم نے تم کو دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ، کھاؤ کا معنی وہی ہے جو ذکر کیا تھا کھاؤ برتو استعمال کرو یعنی تم ان مشرکین کی طرح حلال چیزوں کو اپنے طور پر حرام ٹھہرانے کی کوشش نہ کرو جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس میں سے پاکیزہ لذیذ چیزیں جو تمہیں مرغوب ہیں انہیں کھاؤ اور برتو "واشکروالله" اور اللہ کے شکر گزار رہو، اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اگر تم اسی کو ہی پوجتے ہو، اگر تم اسی کی ہی عبادت کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ اور ان حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو اپنے طور پر مشرکین کی طرح غیر اللہ کی طرف منسوب کر کے حرام قرار نہ دو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری بھی ہو جاتی ہے کہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو خواہ مخواہ حرام ٹھہرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی ہے جب غیر اللہ کی طرف ان چیزوں کو منسوب کیا جائے گا ان کو نذرانے چڑھاوے دیے جائیں گے تو غیر اللہ کی عبادت ہو جائے گی اور اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو غیر کی عبادت نہیں کرتے تو پھر تم اس قسم کے تصرف نہ کرو جس طرح سے مشرکین حلال چیزوں کے بارے میں، جانوروں کے بارے میں کرتے ہیں۔

کلمۂ انما کے متعلق ایک سوال جواب:

"انما حرم علیکم المیتۃ" انما یہ حصر کے لئے ہوتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے حرام کیا تم پر میتہ، مشرکین میتہ کھاتے تھے، اللہ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہراتے تھے اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھتے تھے تو جو چیز زیر بحث ہے اس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ جن کو وہ حرام کہتے ہیں وہ حرام نہیں ہیں حرام تو یہ چیزیں ہیں ان کے اندر حصر اضافی ہے، یہ نہیں کہ ان چار چیزوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز حرام نہیں بلکہ جن چیزوں کو وہ حرام کہتے ہیں وہ حرام نہیں ہیں ان کے مقابلہ میں یہ حرام ہیں جن کو یہ حرام نہیں سمجھتے۔

یا دوسرے طور پر یہ کہہ لیجئے کہ ان چیزوں کو حرمت میں بند کرنا مقصود ہے کہ یہ چیزیں حرام ہیں ان میں حلت کا شبہ نہیں اور ایک ہے کہ حرمت کو ان میں بند کرنے کی کوشش کریں تو مطلب ہوگا کہ حرام چیزیں یہی ہیں ان کے علاوہ کوئی اور حرام نہیں ہے انما کے ساتھ حصر دونوں طرح سے ادا ہوجاتا ہے دونوں معنوں کے درمیان فرق سمجھ رہے ہو؟ یہ چیزیں حرام ہیں ان چیزوں کو حرمت میں بند کردیا ان کے اندر حلت کا شبہ نہیں ہے اور جو ان کو حلال کہہ رہے ہیں غلطی کررہے ہیں یہ چیزیں حرام ہی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو صرف حرام ہی ٹھہرایا ہے تو یہ چار چیزیں بند ہوگئیں حرمت میں، اور ایک ہے کہ حرام یہی چار چیزیں ہیں اس کا مطلب ہوگا کہ حرمت ان چار چیزوں میں بند ہوگئی ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز حرام نہیں ہے اگر تو پہلا معنی لیا جائے کہ ان کو حرمت میں بند کیا جائے کہ یہ چیزیں حرام ہی ہیں حلال نہیں تو اس مضمون پر کوئی شبہ نہیں واقعی یہ حرام ہیں ان کے اندر حلت کا کوئی شبہ نہیں ہے اور اگر یوں ترجمہ کیا جائے کہ حرام صرف یہی چار چیزیں ہیں اور کوئی حرام نہیں تو پھر اس پر اشکال ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت ساری چیزیں حرام ہیں خود قرآن کریم میں بعض چیزوں کا حرام ہونا ذکر کیا گیا ہے جیسے ابھی اگلی آیت کے اندر یہ بات آئے گی تو پھر اس حصر کا کیا مطلب ہوا؟۔

اس کو کہتے ہیں حصر اضافی یعنی ان کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کے مقابلہ میں کہنا مقصود ہے کہ وہ حرام نہیں صرف یہ حرام ہے باقی ان کے علاوہ اور چیزیں بھی حرام ہوں اس سے یہاں بحث نہیں ہے قرآن وحدیث سے اور بہت ساری چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہے یہ حصر اضافی کہلاتا ہے کہ بعض چیزوں کی نسبت حرمت کو ان میں بند کردیا گیا کہ جن چیزوں کو وہ حرام کہتے ہیں وہ حرام نہیں ہیں بلکہ ان کے مقابلہ میں یہ چیزیں حرام ہیں۔

میتہ کی تعریف اور میتہ کے مصداق:

حرام کیا تم پر میتہ کو، ہر وہ جاندار چیز جس کا ذبح کرنا شرعاً ضروری ہو اور وہ بغیر ذبح کرنے کے مرجائے

اس کو شریعت کی اصطلاح میں میتۃ کہتے ہیں، ہر وہ جاندار چیز جس کا ذبح کرنا شرعی طور پر ضروری ہو اور وہ بغیر ذبح کرنے کے مرجائے یہ جو قید درمیان میں لگا رہا ہوں کہ اس کا ذبح کرنا شرعی طور پر ضروری ہو پھر بغیر ذبح کرنے کے مرجائے تو اس کو میتۃ کہیں گے اس سے مچھلی کو نکالنا مقصود ہے کہ مچھلی جاندار چیز ہے لیکن اس کا شرعاً ذبح کرنا ضروری نہیں اس لئے بغیر ذبح کرنے کے مرتی ہے اور وہ حلال ہے اور اسی طرح سے جس کو آپ عربی میں جراد کہتے ہیں یہ بھی جاندار چیز ہے اور اس کو بھی ذبح کرنا ضروری نہیں اس کو ویسے ہی مار لیا جائے شکار کر لیا جائے تو اس کو بھی کھایا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا "احلت لنا المیتتان" ہمارے لئے دو میتۃ اللہ نے حلال کر دیے ایک مچھلی اور ایک جراد یہ جاندار ہیں لیکن ان کا شرعاً ذبح کرنا ضروری نہیں یہ بغیر ذبح کرنے کے بھی مرجائیں تو یہ حلال ہیں اس لئے یہ قید لگائی میتۃ کی تعریف میں کہ ہر وہ جاندار جس کا ذبح کرنا شرعاً ضروری ہو اور وہ بغیر ذبح کرنے کے مرجائے اور ذبح پھر عام ہے ذبح اختیاری ذبح اضطراری جو فقہ کے اندر آپ تفصیل پڑھیں گے ذبح اختیاری تو یہی ہے کہ ایک جانور آپ کے بس میں ہے تو اس کی رگیں کاٹو جو شریعت نے طریقہ بتایا ہے یہ ذبح اختیاری ہے اور ذبح اضطراری ہوتا ہے شکار میں کہ شکار کھیلتے وقت اس کو تیر مار دیا گیا یا کوئی دھاری دھار چیز ماری گئی جانور دوڑا جا رہا تھا آپ کے قابو میں نہیں تھا تو بدن میں کہیں اس کے زخم لگ جائے تو کہیں بھی زخم ہو جانے کی صورت میں وہ حلال ہو جاتا ہے اگر آپ کے قابو پانے سے پہلے وہ مرجائے تو رگیں کاٹنی ضروری نہیں، اور اگر آپ نے قابو پالیا اور آپ کے زندہ ہاتھ آگیا پھر ذبح کرنا ضروری ہے۔

کتے کے شکار میں باز کے شکار میں تیر کے شکار میں سب میں مسئلہ یہی ہے کہ شکاری کتا سکھایا ہوا آپ نے چھوڑا اس نے جا کر جانور کو پکڑا اور اس کو زخمی کر دیا لیکن آپ کے پاس آنے سے پہلے وہ مرگیا وہ حلال ہے بشرطیکہ اس کو "بسم اللہ" پڑھ کر چھوڑا ہو باقی شرائط فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں میں تو صرف ایک اشارہ کرنا چاہتا ہوں، باز کا شکار کتے کا شکار تیر کا شکار اس میں ذبح اضطراری ہے کہ زخم کہیں لگ جائے بدن پر اور قابو آنے سے پہلے اگر وہ جانور مرجاتا ہے تو وہ حلال ہے وہ بھی ذبح ہے اس کو میتۃ نہیں کہیں گے، زندہ جانور کا عضو کاٹ لیا وہ میتۃ ہے جس طرح سے آپ کے دنبے ہیں تو کوئی شخص زندہ دنبے کی چکی کاٹ لے تو وہ حرام ہے میتۃ کے حکم میں ہے یہ تو میتۃ کے بارے میں تفصیل ہوئی۔

میتۃ کی ہڈیاں، بال اور سینگوں کا حکم:

لیکن اس میں حرام جو کیا گیا ہے میتۃ کو اس کا کھانا حرام کیا گیا ہے یہ میتۃ کا کھانا حرام ہے اور جو چیز کھائی

نہیں جاتی جیسے اس کے بال ہو گئے، اس کی ہڈیاں ہو گئیں، اس کا سینگ ہو گیا اور اس کا چمڑا ہو گیا تو یہ سینگ بھی پاک ہے اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے، اس کے بال بھی پاک ہیں استعمال کیے جا سکتے ہیں جیسے بھیڑ مر گئی اور مرنے کے بعد آپ اس کی اون اتار لیں استعمال کی جا سکتی ہے، ہڈی استعمال کی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس سے گوشت کی رطوبات دور ہو جائیں، اس طرح سے چمڑا اس کا استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مٹی مل کر، چاہے دھوپ میں ڈال کر، چاہے کوئی مصالحہ لگا کر اس کی رطوبات زائل ہو جائیں تو چمڑا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے وہ پاک ہو جاتا ہے، استعمال اس کا جائز ہے، بیچنا اس کا جائز ہے اور بالوں کا بھی یہی حکم ہے اور ہڈی کا بھی یہی حکم ہے، سینگ کا بھی یہی حکم ہے۔

میتہ کے گوشت اور چربی کا حکم:

البتہ گوشت اس کا نجس ہو گیا اب اس کا نہ کھانا جائز، نہ بیچنا جائز اور نہ اس کو کسی دوسرے استعمال میں لانا جائز اور یہی حکم اس کی چربی کا ہے اس لئے مردار کی چربی کا بیچنا جائز نہیں ہے، خرید و فروخت بھی جائز نہیں ہے ہاں البتہ یہ جو چربی ڈال کر صابن بنا لیتے ہیں تو صابن میں اس چربی کو ڈالنے والے خریدنے والے گناہ گار ہیں ان کے لئے تو جائز نہیں لیکن جب وہ صابن کے اندر حل ہو جاتی ہے اور اس کی دوسری جنس بن جاتی ہے تو فقہاء رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ صابن کے طور پر اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے استعمال کرنا گناہ نہیں، آپ کے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے جو آپ اس صابن سے دھوتے ہیں لیکن جو یہ کاروبار کرتے ہیں چربی کو خریدتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں وہ گناہ گار ہیں صابن کا استعمال کرنا ٹھیک ہے، اگر شبہ ہو کہ اس کے اندر مردار کی چربی ڈالی گئی ہے کیونکہ چربی تو ڈالتے ہیں لیکن اس میں حلال کی بھی ہوتی ہے اور حرام کی بھی ہوتی ہے مثلاً یہ قصائی جو ذبح کرتے ہیں یہ موٹی موٹی چربی رکھ لیتے ہیں بعد میں بیچتے ہیں یہ حلال ہوتی ہے اور اس طرح سے جانور مر جاتے ہیں تو یہ بھنگی چمڑے اتارتے ہیں اور وہ چربی نکال کر بیچتے ہیں یہ حرام ہوتی ہے، تو اگر کسی صابن میں مردار کی چربی ڈالی گئی ہو تو صابن کا استعمال درست ہے۔

خون کا حکم:

”والدم“ اور حرام کیا گیا خون، یہاں تو صرف دم کا لفظ بولا گیا اور دوسری جگہ آپ کے سامنے قید لگی ہوئی ہوگی ”دما مسفوحا“ بہایا ہوا خون، اس لئے فقہاء رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس دم کا مصداق صرف وہی خون ہے جو کہ رگوں سے بہتا ہے رگوں کو کاٹتے وقت یہ دم نجس ہے اس کا بیچنا ٹھیک نہیں ہے اس کا کھانا ٹھیک نہیں ہے اور ذبح کرنے کے بعد چمڑا اتاریں تو جو گوشت کو خون سا لگا ہوا ہوتا ہے جیسے آپ کپڑے میں لاتے ہیں تو وہ کپڑے کو لگ

جاتا ہے وہ خون پاک ہے اس لئے اگر گوشت کو نہ دھویا جائے اسی طرح سے پکالیا جائے تو وہ ٹھیک ہے اور جو گوشت کپڑے کے ساتھ لگے گا اور کپڑے پر خون کا نشان آجائے گا یہ پاک ہے اس کا دھونا بھی ضروری نہیں ہے، نجس وہ خون ہے جو کہ بدن سے بہتا ہے جیسے زندہ کے زخم ہو گیا جیسے ہمارے بدن پر زخم ہو جائے اور خون بہنے لگ جاتا ہے یہ نجس ہے رگیں کاٹنے کے ساتھ جو خون بہتا ہے یہ نجس ہے اس کی بیع شراء جائز نہیں ہے۔

اسی پر فقہاء رحمہم اللہ نے مسئلہ لکھا ہے کہ یہ جو مریض کو خون دیا جاتا ہے ایک کے بدن سے خون نکال لیتے ہیں دوسرے کو دے دیتے ہیں یہ نکلا ہوا خون یہ بھی نجس ہے اور بوقت مجبوری جب ڈاکٹر یہ کہے کہ مریض اتنا کمزور ہے کہ اگر اس کو خون نہ دیا گیا تو یہ مرجائے گا جیسے زخم ہو کر خون بہت نکل گیا، آپریشن کرنے لگے اور خون بہت نکل گیا تو ایسے وقت میں تداوی بالحرام کے اصول کے تحت اس کی اجازت دی گئی ہے کہ جیسے مجبوری کے وقت میں حرام دوا استعمال کی جاسکتی ہے اور اختیاری صورت میں حرام دوا نہیں کھانی چاہیئے اور اس کے متبادل کوئی دوسری دوا ملتی ہو تو ایسی صورت میں وہ حرام دوا نہیں کھانی چاہیئے لیکن اگر کوئی مجبوری ہو جائے مجبوری کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر کہے کہ اس کے بغیر کوئی دوسری دوا نہیں ہے اور ظن غالب ہے کہ اس کے استعمال کرنے کے ساتھ صحت ٹھیک ہو جائے گی ایسے وقت میں حرام دوا کا استعمال کرنا فقہاء رحمہم اللہ نے جائز لکھا ہے اجازت دی ہے، اسی کے حکم میں ہے یہ خون جو استعمال کرتے ہیں ہاں البتہ اس کا بیچنا ٹھیک نہیں ہے جیسے آپ اپنا خون نکلوائیں اور جا کر ہسپتال میں بیچ دیں آپ کے لئے یہ پیسے حرام ہیں یہ کاروبار ٹھیک نہیں ہے بوقت ضرورت مجبوری کے وقت میں اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

خنزیر کا حکم:

"ولحم الخنزیر" اور خنزیر کا گوشت تم پر حرام ٹھہرایا، یہاں لحم کی صراحت کردی چونکہ ذکر ما کولات کا ہے ورنہ خنزیر مطلقاً نجس ہے اس کے بال بھی نجس، اس کا چمڑا بھی نجس، اس کی ہڈیاں بھی نجس اس کی کسی چیز سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا حیوانات میں سے متفق علیہ نجس العین یہی ہے اگرچہ کتے کے متعلق یا ہاتھی کے متعلق بھی روایات فقہ میں آتی ہیں لیکن اس میں اختلاف ہے وہ مختلف فیہ ہیں، متفق علیہ نجس العین نہیں ہیں اور خنزیر ہی ایک ایسا جانور ہے جس کو متفق علیہ نجس العین قرار دیا گیا یہ منصوص ہے قطعی طور پر نجس العین ہے اس لئے اس کی کسی چیز کا استعمال کرنا درست نہیں ہے نہ بال کا نہ ہڈی کا نہ کسی دوسرے عضو کا۔

اللہ کا نام لے کر اللہ کی رضا کے لیے ذبح کیے ہوئے جانور کا حکم:

"وما اهل به لغير الله" وہ چیز جس پر اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کی گئی ہے "ما اهل به لغير الله"

کا مصداق کیا ہے؟ جانور اللہ کی رضا کے لئے ذبح کیا جائے اور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے متفق علیہ حلال، قطعی طور پر حلال اور اس میں کوئی کسی قسم کا شبہ ناجائز ہونے کا نہیں ہے بشرطیکہ کوئی اور عارضہ نہ ہو اور عارضہ کا مطلب یہ ہے کہ چوری کا جانور ہے اس کو ہم حرام کہیں گے تو یہ دوسرے عارضہ کی بناء پر ہے ورنہ ان حلال جانوروں میں سے اس جانور کو اللہ کی رضا کے لئے ذبح کیا جائے اور اس کے اوپر "بسم اللہ" پڑھ لی جائے یا آپ اس کو اپنی ضرورت کے لئے ذبح کر رہے ہیں یہ مقصد نہیں کہ ہم اللہ کو راضی کرنا چاہتے ہیں آپ کو گوشت کی ضرورت ہے مرغی آپ لے آتے ہیں "بسم اللہ" پڑھ کر آپ اس کو ذبح کر لیتے ہیں وہ آپ کے لئے حلال ہے "ومالکم ان لاتاکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ" اس میں اسی مسئلے کو ذکر کیا گیا ہے کہ جس چیز پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اس کو کھا لیا کرو۔

غیر اللہ کے لیے ذبح کیے ہوئے جانور کا حکم:

اب اس مسئلے کو ذرا دھیان سے سمجھ لو ایک صورت یہ ہے کہ اس جانور کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا گیا یعنی اس کو خوش کرنے کے لئے نذرانہ دیا کہ یہ بکرا ہم فلاں پیر کے نام پر دیتے ہیں وہ خوش ہو جائے اور اس کے نام پر ذبح کرتا ہے روح نکالنی مقصود ہے، زندہ چھوڑ او وہ مسئلہ آپ کے سامنے آگیا کہ جب اس کو زندہ چھوڑنا مقصود ہو تو پھر وہ حرام نہیں ہوتا اس کی روح نکالنی مقصود ہے اس کو قربان کرنا مقصود ہے غیر اللہ کے لئے چاہے پیر کے لئے، چاہے پیغمبر کے لئے، چاہے جن بھوت کے لئے کسی چیز کے لئے ہو یعنی اس میں اس کی روح کا نکالنا مقصود ہے اس کو خوش کرنے کے لئے جس وقت نیت یہ ہو کہ اس کو نذرانہ بنا دیا گیا غیر اللہ کا کسی کا بنا دیا گیا ہو مسلمان کا ہو، کافر کا ہو، نبی کا ہو، غیر نبی کا ہو، جن کا ہو، بھوت کا ہو، فرشتے کا ہو، نذرانہ بنا دیا گیا کہ یہ فلاں کی نذر ہے اور اس کی روح نکالنی ہے اس کو خوش کرنے کے لئے اب اس کو ذبح کرتے وقت نام بھی غیر اللہ کا لے لیا گیا منسوب بھی غیر اللہ کی طرف اور نام بھی غیر اللہ کا لے لیا گیا ایسی صورت میں حرام قطعی ہے اس کے اندر کوئی کسی قسم کی حلت کا شبہ نہیں ہے یہ منصوص قطعی ہے۔

اور مشرکین کے زمانہ میں یہی اس کی صورت تھی کہ بتوں کی طرف منسوب کرتے تھے اور پھر منسوب کرنے کے بعد ذبح کرتے وقت بھی اس بت کا نام لیتے تھے جیسے عربی تفسیروں کے اندر آپ مثال پڑھیں گے "باسم اللات والعزیٰ" یہ کہہ کر وہ جانور کو ذبح کیا کرتے تھے قطعی طور پر تو ان الفاظ کا یہی مصداق ہے منصوص واقعہ کے لحاظ سے کہ غیر اللہ کی طرف اس کو منسوب کیا جائے اور غیر اللہ کا نام لے کر اس کو ذبح کر دیا جائے اور پھر یہ مسئلہ علیحدہ

ہے کہ چاہے غیر اللہ کی طرف منسوب نہ کرو لیکن غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کر دو اور اللہ کا نام نہ لو تو بھی وہ حرام ہے جیسے کہ اس آیت کے اندر آیا تھا کہ "لاتأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ" جس کے اوپر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو وہ جانور نہ کھایا کرو چاہے نذر نیاز اس کو نہ ہی بنایا گیا ہو لیکن اس کو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کر دیں تو اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ روح اس کے لئے نکالی گئی ہے وہ بھی حرام ہے اور اگر نیت بھی اسی کا نذرانہ ہو اسی کو خوش کرنا اس ذبح کے ساتھ مقصود ہے اور پھر نام بھی اس کے اوپر غیر اللہ کا لے لیا گیا تو یہ قطعی حرام ہے جس میں کوئی کسی قسم کی حلت کا شبہ نہیں ہے اور واقعہ کے لحاظ سے ان الفاظ کا مصداق یہی ہے کہ مشرکین کے اندر رواج یہی تھا کہ جب وہ غیر اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے پھر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیتے تھے۔

غیر اللہ کی رضا کے لیے اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا:

اب ایک تیسری صورت پیدا ہوگئی کہ نسبت تو کر دی اللہ کے غیر کی طرف کہ فلاں کو خوش کرنے کے لئے لیا گیا جا رہا ہے نذر و نیاز تو بنا دی غیر اللہ کی چاہے فرشتے کی چاہے پیغمبر کی چاہے پیر کی جن کی بھوت کی کسی کی بنا دی اس سے بحث نہیں غیر اللہ کی نذر و نیاز بنا دی اس کی ذبح کرنے سے مقصد یہ ہے کہ ہم اس پر اس کی روح کو نچھاور کرنا چاہتے ہیں قربان کرنا چاہتے ہیں لیکن ذبح کرتے وقت نام لے لیا اللہ کا، ذبح کیا اس کو " بسم اللہ" پڑھ کر ایک صورت یہ پیش آگئی صورت سمجھ آگئی کہ نیاز تو بنا دی پیر جی کی، کہ گیارہویں والے کے نام پر بکرا دے دیا ذبح کرنا محض اس کو خوش کرنے کے لئے مقصود اس کی رضا ہے، اس کی روح کو اس کے اوپر فدا کرنا مقصود ہے لیکن ذبح کرتے وقت "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر اس کو ذبح کر دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

جمہور فقہاء رحمہم اللہ اور جمہور علماء رحمہم اللہ اور اکثریت علماء دیوبند سب اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے بھی حکم یہی ہے کہ یہ صورت ہے نفاق کی اور نفاق جو ہوتا ہے وہ صریح کفر کے حکم میں ہے کہ جس طرح سے کوئی شخص دل سے بھی کافر زبان سے بھی کافر ایک دل سے کافر اور زبان سے مومن اور ایک دل سے بھی مومن اور زبان سے بھی مومن تو اصل جو ایمان قابل اعتماد ہے وہی ہے جو زبان سے بھی مومن اور دل سے بھی مومن، دل سے انکار کرے زبان سے انکار کرے وہ بھی کافر، دل سے انکار کرے زبان سے چاہے اقرار کرے وہ بھی کافر ہے تو مدار اصل دل کے حال پر ہے تو جب دل کے اعتبار سے اس نے اہلال کر دیا اس نے نسبت کر دی ادھر تو اس اہلال کی وجہ سے اس کے اوپر بھی حرمت کا حکم لگے گا۔

لیکن یہ حکم ہوگا تعدیہ کے طور پر علت کے پائے جانے کے ساتھ اس حکم کو متعدی کرلیا گیا ورنہ قرآن کریم کا جو عبارت النص کے طور پر مصداق ہے "ما اھل بہ لغیر اللہ" میں یہ وہی ہے جو بات آپ کی خدمت میں میں نے عرض کردی کہ منسوب غیر اللہ کی طرف کیا جائے اور ذبح بھی اس کو غیر اللہ کے نام کے ساتھ کیا جائے لیکن اہلال والی علت پائے جانے کی وجہ سے اس دوسرے کو بھی جمہور فقہاء رحمہم اللہ جمہور علماء رحمہم اللہ اور علماء دیوبند رحمہم اللہ کی اکثریت حرام کہتی ہے سورۃ المائدۃ کے اندر مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے صراحت ہوگی اس مسئلے میں اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے صراحت ہے کیونکہ سورۃ البقرۃ پر حاشیہ جو ہے وہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

"اھل بہ لغیر اللہ" کا یہ مطلب ہے کہ ان جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے یعنی اللہ کے سوا کسی بت یا جن یا کسی روح یا پیر یا پیغمبر کے نام کرکے اس جانور کی جان اس کی نذر کرنے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے، گو بوقت ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو کیونکہ جان کو جان آفریں کے سوا کسی دوسرے کے لئے نذر و نیاز کرنا ہرگز درست نہیں اس لئے جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی تھی کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی اور اس کی جان تو غیر اللہ کے نام پر نچھاور کردی گئی ہے جو عین شرک ہے جیسے خنزیر اور کتے پر بوقت ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آسکتی اور مردار پر اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہوسکتا۔

ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد کردی ہو اس پر ذبح کے وقت نام الٰہی کے لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور حلت اس میں نہیں آسکتی البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد اپنی نیت صحیح اور توبہ و رجوع کرلیں تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں علماء نے تصریح کردی ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے آنے پر اس کی تعظیم کی نیت پر کوئی جانور ذبح کیا جائے یا کسی جن کی اذیت سے بچنے کے لئے اس کے نام پر جانور ذبح کیا جائے تو وہ جانور بالکل مردار اور حرام ہے اور کرنے والا مشرک ہے اگرچہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا جائے، حدیث شریف میں آیا ہے یعنی جو غیر اللہ کے تقرب اور تعظیم کی نیت سے جانور کو ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کرکے فقراء کو کھلائے اور اس کا ثواب کسی پیر یا بزرگ کو پہنچادے یا کسی مردے کی طرف سے قربانی کرکے اس کا ثواب اس کو دینا چاہے کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لئے ہرگز نہیں ہے۔

موجودہ زمانہ میں بزرگوں کے نام پر نذر و نیاز دینا:

بعضے اپنی کج روی کے طور پر یہ حیلہ بیان کرتے ہیں کہ پیروں کی نذر و نیاز وغیرہ میں ہم کو تو یہی مقصود ہوتا ہے کہ کھانا پکا کر مردہ کے نام پر صدقہ دیا جائے تو اول تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کے سامنے جھوٹے حیلوں سے بجز مفر کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا دوسرا ان سے پوچھا جائے کہ جن جانوروں کی تم نے غیر خدا کے لئے نذر مانی ہے اگر اسی قدر گوشت اس جانور کے عوض خرید کر پکا کر فقیروں کو کھلا دیا جائے تو تمہارے نزدیک وہ نذر ادا ہو جاتی ہے کہ نہیں اگر بلا تامل تو اس کو کر سکتے ہو تو اپنی نذر میں کسی قسم کا خلل تمہارے دل میں نہیں رہتا تو تم سچے ورنہ تم جھوٹے تمہارا یہ فعل شرک اور مردار حرام یہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر ہے یعنی بسا اوقات لوگ منسوب کرتے ہیں پیروں کی طرف جب آپ انہیں کہیں گے کہ یہ تو "ما اهل به لغير الله" ہے یہ تو تم نے اس کو غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ثواب پہنچانا چاہتے ہیں ہمارا مقصد ثواب پہنچانا ہے ورنہ اس جانور کی روح اس کے اوپر قربان کرنا مقصد نہیں ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان سے یہ پوچھو کہ اگر تم یہ جانور ذبح نہ کرو اس جانور میں مثال کے طور پر دس سیر گوشت ہے اور کوئی دوسرا شخص جانور کو ذبح کرتا ہے جیسے قصائی نے ذبح کیا تو وہاں سے دس کلو گوشت لے کر تم خیرات کر دو پکا کر فقیروں کو کھلا دو تو تمہارے دل میں کوئی کھٹکا تو نہیں ہوگا اگر وہ کہیں کہ کوئی کھٹکا نہیں ہے ٹھیک ہے ہم اس جانور کو ذبح نہیں کرتے کیونکہ ہمارا مقصد تو صدقہ ہے تو ہم اس جانور کو ذبح نہیں کرتے ہم گوشت لے کر دے دیتے ہیں تو پھر تو وہ اپنی بات میں سچے ہیں کہ واقعی ان کو ایصال ثواب مقصود ہے روح قربان کرنی مقصود نہیں اور اگر وہ کہیں کہ نہیں جی ہم تو اسی جانور کو ذبح کریں گے جس کو ہم نے پیر کی طرف منسوب کیا ہے پھر چاہے وہ اپنی زبان سے کہیں کہ اس کی روح پیر کے لئے نکالنی مقصود نہیں صدقہ مقصود ہے پھر وہ اپنے قول میں جھوٹے اور حیلہ کرتے ہیں ورنہ اگر صدقہ ہی مقصود ہو تو اتنے پیسوں کا گوشت لے کر صدقہ کر دو خیرات کر دو قصائی سے جا کر خرید لو پھر جانور کا ذبح کرنا کیوں ضروری سمجھتے ہو؟ یہ ہے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد۔

تو یہ مسئلہ صاف طور پر واشگاف الفاظ میں آ گیا کہ جب نسبت غیر اللہ کی طرف کر دی جائے اور غیر اللہ کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ وہ اہلال بن گیا اور حرمت آ گئی اب اگر اس اہلال پر انسان قائم ہے اور بعد میں چاہے وہ اللہ کا نام لے لیتا ہے تو یہ ایسے ہی سمجھا جائے گا جیسے کہ "اهل به لغير الله" کی پہلی صورت آپ کے سامنے ذکر کی گئی اور یہ بھی اس طرح سے حرام ہوگا۔

ہاں البتہ ایک صورت ہے کہ غیر اللہ کی طرف منسوب کیا تھا لیکن اس کے ذبح کرنے سے پہلے پہلے اپنی نیت سے توبہ کرلی، ذبح کرنے سے پہلے پہلے کسی نے مسئلہ سمجھا دیا، سمجھانے کے ساتھ اس نے اس نیت سے توبہ کرلی، اب اگر اس کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے گا تو اب بلاشبہ وہ جانور حلال ہے کیونکہ وہ اہلال ختم ہو گیا یہ تو جاندار کی بات ہوئی۔

بے جان چیزیں غیر اللہ کے نام پر دینا:

اور بے جان چیزیں جیسے گیارہویں والے کے نام پر دودھ دے دیا، مٹھائی دے دی کسی قبر پر جا کر شیرینی رکھ آئے یہ بھی تو ہوتا رہتا ہے مزاروں پر جاتے ہیں جا کر لوگ اس قسم کی چیزیں چڑھا دیتے ہیں تو یہ بے جان چیزیں قرآن کریم کے ان الفاظ کا مصداق نہیں یہاں حکم حیوانات کا ہے لیکن اسی علت کے ساتھ جو اہلال والی علت حیوانات کے لئے بیان کی گئی ہے۔

اسی علت کے تحت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کے مطابق اور اس کے بعد اکابر دیوبند کی صراحت کے مطابق اس میں بھی حرمت آ جائے گی وہ بھی کھانی حرام ہو جائے گی لیکن فرق صرف اتنا ہوگا کہ جانور سے توبہ ہو سکتی ہے ذبح سے پہلے پہلے کہ ذبح سے پہلے پہلے وہ اپنی اس فاسد نیت سے رجوع کرلے تو جانور حلال ہے اور اگر ذبح ہو گیا تو اس کے بعد توبہ کا کوئی فائدہ نہیں، ذبح ہو جانے کے بعد پھر حرمت قرار پکڑ گئی پھر اس کو اٹھانے کی کوئی صورت نہیں ہے اور یہ بے جان چیزیں کھانے سے پہلے پہلے رجوع ہو سکتا ہے اور جب کھالی اور پیٹ میں چلی گئی اب حرمت مستقر ہو گئی اب توبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کسی قبر پر ڈال آئے، کسی پیر کے نام پر دے دی نذرانہ دے دیا یعنی ایک ہے اللہ واسطے دینا اس کی صورت تو میں نے پہلے آپ کے سامنے بیان کر دی ایک ہے کہ صرف اس کو خوش کرنے کے لئے دیا جا رہا ہے تو ایسی صورت میں کھانے سے قبل قبل اگر اس کا مالک جس نے دی ہے اپنی اس فاسد نیت سے رجوع کرلے تو وہ چیز حلال ہو گی اور اگر اسی نیت پر وہ کھالیا گیا تو کھانے کے بعد پھر نیت سے رجوع کا کوئی فائدہ نہیں تو انسان حرام خور بن گیا جس نے یہ کھائی ہے۔

اور یہاں بھی وہی ایصال ثواب والی توجیہ حیلہ لوگ کیا کرتے ہیں لیکن فرق پڑ جاتا ہے، پوچھنے کے ساتھ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں واقعہ ہے کہ دو طالب علم آپس میں گفتگو کرنے لگے ایک کہنے لگا کہ یہ جو لوگ پیر جی کے نام پر لاتے ہیں ان کا مقصد ہوتا ہے اللہ واسطے دینا اور ایصال ثواب پیر کے

لئے دوسرا کہنے لگا نہیں ایسا نہیں ہوتا اگر چہ وہ لفظ یہی بولتے ہیں لیکن ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ پیر جی کو دی جا رہی ہے اللہ کو نہیں دی جا رہی ان کا پیر کو دینا مقصود ہوتا ہے، اللہ واسطے دے کر ایصال ثواب مقصود نہیں ہوتا یہ آپس میں جھگڑا کر رہے تھے کہ ایک بوڑھی تھوڑی سی جلیبیاں لے کر آ گئی آ کر کہتی ہے کہ مولوی صاحب لو یہ پیر جی کی نیاز ہے تو دوسرا طالب علم کہتا ہے کہ اچھا اماں تیرا یہ مقصد ہے کہ اللہ واسطے تو دے رہی ہے صدقہ اور اس کا ثواب پیر جی کو پہنچانا مقصود ہے کہنے لگی نہیں نہیں یہ اللہ کے نام پر میں نہیں دے رہی یہ تو پیر کے نام پر دے رہی ہوں اللہ کے نام کی تو میں نے پہلے دے دی ہے یہ تو پیر کے نام کی ہے وہ کہنے لگا لو جی دیکھ لو۔

یعنی ایسے حال میں بسا اوقات انسان اگر کھود کرید کرے تو پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے دل میں کیا ہے اگر ایصال ثواب مقصود ہے تو پھر وہ چیز حلال ہے پھر کوئی بات نہیں اور اگر وہی چیز دینی مقصود ہے کہ پیر کے نام کی نیاز ہے اسی کو دی جا رہی ہے یعنی اللہ کو درمیان سے نکال دیا اللہ کا درمیان میں تصور نہیں ہے تو ایسی صورت میں وہ بھی "ما اهل به لغير الله" میں داخل ہوگی لیکن فرق صرف اس قدر ہوگا کہ اس کے کھانے سے پہلے پہلے فاسد نیت سے رجوع کیا جا سکتا ہے اور جانور کے ذبح کرنے سے پہلے پہلے رجوع کیا جا سکتا ہے جس وقت وہ ذبح ہو جائے گا تو ذبح ہونے کے بعد چاہے آپ نے ابھی کھایا نہیں ہے کھانے سے قبل رجوع کرنے کا یہاں کوئی فائدہ نہیں ہے یہ فرق ہو جائے گا غیر جاندار اور جاندار میں۔

جمہور کے مقابلہ میں قلیل علماء کی رائے:

تتمہ کے طور پر ایک بات آپ کے ذہن میں ڈال دوں تحقیق بعد میں کرتے رہنا یہ صورت جو میں نے ذکر کی جس کے متعلق میں نے جمہور جمہور کا لفظ بولا تو طالب علمانہ ذہن کے ساتھ آپ کو یہ سوال کرنا چاہیے تھا کہ آپ اس کو متفق علیہ کیوں نہیں کہتے یہ جمہور جمہور کی رٹ کیا لگا رکھی ہے جیسے پہلی صورت میں کہہ دیا کہ یہ متفق علیہ حرام ہے اور اس میں کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں ہے جب کہ غیر اللہ کی طرف منسوب کیا گیا اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا ذبح کرتے وقت بھی غیر اللہ کا نام لے لیا گیا تو میں نے کہا ہے کہ یہ متفق علیہ حرام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں قطعی طور پر حرام ہے اور ان الفاظ کا عبارۃ النص کے طور پر مقصود یہی ہے۔

اور دوسرا جو میں نے کہا کہ نسبت غیر اللہ کی طرف کر دی لیکن ذبح کیا گیا اللہ کے نام پر تو جمہور فقہاء جمہور علماء علماء دیوبند کی اکثریت اس کو ویسے ہی حرام قرار دیتی ہے جس طرح سے پہلا لیکن علت کی تعمیم کے ساتھ کہ اہلال کی علت یہاں میں بھی ہے ورنہ اس وقت جب یہ قرآن اتر رہا تھا مشرکین کے اندر یہ رواج نہیں تھا کہ یہ

منسوب غیر اللہ کی طرف کریں ذبح اللہ کے نام پر کریں یہ صورت مشرکین کے زمانہ میں موجود نہیں تھی، مشرکین کے زمانے میں صورت یہ موجود تھی کہ منسوب بھی غیر اللہ کی طرف اور ذبح بھی غیر اللہ کے نام پر لہٰذا عبارۃ النص کے طور پر تو مصداق یہی ہے لیکن اہلال کی علت کی تعمیم کے ساتھ دوسرا بھی اسی کے حکم میں ہے چاہے اس کے اوپر نام اللہ کا لیا جائے۔

لیکن اس مسئلے میں کچھ تھوڑے سے لوگ اختلاف کرتے ہیں اور اس اختلاف کرنے کی گنجائش بایں معنی ہے کہ عبارۃ النص کے طور پر چونکہ یہ مسئلہ مذکور نہیں ہے تعمیم علت کے ساتھ اس کو نکالا جاتا ہے تو اکثریت تو سرے سے حرام قرار دیتی ہے اور بعضے اقل علماء ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے والے کا فعل حرام ہے یہ نذر ماننا غیر اللہ کی حرام ہے شیرینی وغیرہ غیر اللہ کے نام پر دینا حرام ہے، اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے یہ فعل ممنوع ہے باعث لعنت ہے اور یہ حرام ہے لیکن اگر اللہ کا نام لے کر اس چیز کو ذبح کر لیا جائے تو وہ چیز فی حد ذاتہ حلال ہے دونوں باتوں میں فرق کر لو فعل حرام ہے غیر اللہ کے لئے نیاز دینا یہ حرام ہے اور اس طرح سے جانور کے متعلق سوچ لینا کہ یہ اس کی روح ہم فلاں کو خوش کرنے کے لئے نکالنا چاہتے ہیں یہ فعل حرام ہے لیکن اگر اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے تو اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کے ساتھ وہ جانور حلال ہو جاتا ہے۔

اور اسی طرح سے جو شیرینی وغیرہ دی جاتی ہے تو دینے والے کے لئے تو حرام ہے اگر اس نیت کے ساتھ دے لیکن فی حد ذاتہ وہ چیز حلال ہے اس لئے اگر کوئی دوسرا شخص اس کو کھائے تو اس کے لئے حرام نہیں ہے یہ بعض حضرات کا قول ہے اور اس کی بھی کسی درجے میں گنجائش ہے یعنی اس کو باصلہ باطل نہیں قرار دے سکتے جس طرح سے مجتہد فیہ مسائل کے اندر اکثریت ایک طرف ہو اور قلیل ایک طرف ہوں تو اس مسئلے کی نوعیت ایسی ہے اور ان کے ہاں اس آیت کی توجیہ پھر یہ ہے کہ "ماا ھل بہ لغیر اللّٰہ" سے وہ حکم مراد ہے وہ کلمہ جس کے ساتھ آواز بلند کی جائے اللہ کے غیر کے لئے تو اہلال تو ہر صورت حرام ہوا اور اگر پھر اس اہلال پر قائم رہتے ہوئے ذبح بھی غیر اللہ کے نام پر کر لیا تو وہ 'ماذبح علیٰ غیر اسم اللّٰہ'' ہو گیا اس لئے وہ قطعی طور پر حرام ہے اور اگر اس کو ذبح اللہ کے نام پر کیا گیا تو وہ کلمہ تو حرام رہا جس کی غیر اللہ کی طرف نسبت کی تھی لیکن یہ جانور اس حکم میں آ گیا کہ 'مالکم الا تأکلوا مما ذکر اسم اللّٰہ علیہ" جب وہ جانور فی حد ذاتہ حلال ہے پھر اس کو ذبح بھی اللہ کے نام پر کر لیا جائے تو ایسی صورت میں ہم پھر اس کو حلال قرار دیں گے ان کے نزدیک توجیہ یہ ہوگی ما سے مراد کلمہ ہوگا اس طرح کا اہلال اس طرح سے آواز بلند کرنا نذر ماننا یہ تو حرام ہی حرام ہے اور بعد میں وہ ذبح بھی غیر اسم اللّٰہ ہو گیا تو پھر وہ بھی حرام جیسا کہ قرآن کریم میں صراحت آ گئی۔

اور اگر اس کو ذبح علیٰ غیر اسم اللہ نہ کیا گیا صرف چھوڑا ہے تو پھر وہ فعل حرام ہے لیکن یہ جانور جب اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے جانور فی حد ذاتہ حلال اور پھر اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو اللہ کے نام پر ذبح کرنے کی صورت میں وہ جانور بھی حلال اس مسئلے کے اندر بعض حضرات کی رائے یہ ہے اگر چہ ہمارے حضرات اکابر جمہور علماء اس کو اسی طرح سے حرام قرار دیتے ہیں جس طرح سے پہلی صورت ہے تو سید انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی یہ دوسرا مسلک منسوب ہے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ ان کے نزدیک یہ فعل حرام ہے اور وہ چیز جو ہے وہ حلال ہے اور ہمارے دوسرے بزرگ بھی ہیں جو اسی مسلک کے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ فعل حرام ہے لیکن اس چیز کے اندر حرمت نہیں آتی اگر اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا جائے تو وہ چیز حلال ہے۔

ہمارے استاذ مولانا عبدالخالق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک تھا اور وہ بھی حضرت انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت کر کے ذکر کیا کرتے تھے فیض الباری میں بھی اسی مسلک کی طرف اشارہ ہے اور عملاً آپ کو یہی اختیار کرنا چاہیے کہ آپ بالکل کھانے سے پرہیز کریں لیکن اگر کسی کا مسلک ایسا ہو تو اس کے ساتھ زیادہ الجھنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح سے کہ مجتہد فیہ مسائل میں ہوا کرتا ہے تو "ما اھل بہ لغیر اللہ" تو یہ ہو گیا "فمن اضطر غیر باغ" جب یہ ما سے وہ جانور مراد لیں گے پہلی صورت میں تو پھر بہ کو علیہ کے معنی میں کرنا پڑے گا جس پر اللہ کے غیر کی آواز بلند کر دی گئی ہو اور جب ما کلمہ کے معنی میں لیں گے تو باء میں تاویل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ کلمہ جس کے ساتھ اللہ کے غیر کے لئے آواز بلند کی گئی ہو پھر ترجمہ ایسے ہو جائے گا اور یہ دونوں ترجمے جواہر القرآن میں حضرت مولانا غلام اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھے ہیں۔

مضطر اور مجبور کا حرام کھانا:

"فمن اضطر غیر باغ ولا عاد" جس شخص کو مجبور کر دیا جائے یعنی مضطر ہو گیا اب اگر نہیں کچھ کھاتا تو مرتا ہے اور پھر اس کے سامنے یہی حرام چیزوں میں سے کوئی چیز پیش ہو گئی طالب لذت نہ ہو کہ بلا ضرورت کھائے بلا ضرورت جو کھائے گا تو محض منہ کا ذائقہ اور لذت مقصود ہے اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو کہ ضرورت سے زیادہ کھائے ایسی صورت میں ہے تو یہ حرام لیکن جب مجبور ہو، طالب لذت نہ ہو، حد سے تجاوز نہ کرے تو کھانے پر گناہ نہیں ہے اللہ کی رحمت کے ساتھ اتنی اجازت ہو گی "فلا اثم" کا مطلب گناہ نہیں یعنی یہ نہیں کہ جانور حلال ہو گیا جانور تو حرام کا حرام ہے لیکن اس مضطر کے لیے اتنی سہولت ہو گی کہ اس کے کھانے پر گناہ نہیں۔

"غیر باغ ولا عاد" یہ مضطر کی حد بندی کر دی کہ مضطر حقیقت میں وہ ہوتا ہے کہ اگر نہیں کھائے گا تو مرتا ہے نہ تو وہ طالب لذت ہے اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہے ضرورت سے پہلے نہ کھائے یعنی بلا ضرورت نہ کھائے

ضرورت سے زیادہ نہ کھائے اس وقت کھائے گا جب اس کا ظن غالب ہو کہ اگر میں اب نہیں کھاؤں گا تو مر جاؤں گا اور اتنا سا کھائے جس میں اس کا ظن غالب یہ ہے کہ اب میں بچ جاؤں گا اس سے زیادہ نہ کھائے نہ طالب لذت ہو اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں رحم کرنے والے ہیں۔

دین فروشی کا انجام:

آگے آ گئی تحریم دین فروشی کی، ایک چیز بسا اوقات ہوتی ہے حلال لیکن آپ اس کو ناجائز ذریعے سے حاصل کریں گے تو وہ بھی حرام ہو جائے گی یہ حرام کھانے کی عادت اہل کتاب کو تھی غلط مسئلے بتاتے تھے، فیسیں لیتے تھے اس قسم کی فیس جو دین فروشی کے طور پر لیتے تھے کہ لوگوں کی مرضی کے مطابق مسئلہ نکال دینا اور ان کے لئے جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کرتے رہنا یہ دین فروشی ہے جو حرام ہے۔

ان محرمات کے بعد جس میں مشرکین مبتلاء تھے اب یہ اہل کتاب کے علماء مولوی "ان کثیرا من الاحبار والرھبان" کہ بہت سے ان کے علماء ایسے ہیں جو کہ غلط طریقے سے لوگوں کا مال کھاتے رہتے ہیں اور وہ غلط طریقہ یہی تھا جس کو دین فروشی کہتے ہیں تو ہمات میں لوگوں کو مبتلا کرنا، ان کی مرضی کے مطابق مسئلے بتانا اور دھوکہ دے کر ان سے مال حاصل کرنا یہ بھی حرام ہے اب آگے دین فروشی کی تحریم مذکور ہے بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم نے اتاری کتاب سے "من الکتاب" ما کا بیان ہو تو جو کتاب ہم نے اتاری اس کا کتمان کرتے ہیں اس کو چھپاتے ہیں اور حاصل کرتے ہیں اس کے بدلے ثمن قلیل، ثمن قلیل سے دنیا کا سامان مراد ہے وہ کتنا ہی کیوں نہ ہو وہ ثمن قلیل ہے۔

"اولئك ما یاکلون فی بطونھم الا النار" یہ لوگ نہیں بھرتے اپنے پیٹوں میں مگر آگ، یہ بظاہر اگرچہ حلوہ کھاتے ہیں لیکن حقیقت کے اعتبار سے جہنم کے انگارے اپنے پیٹ کے اندر بھر رہے ہیں یہی چیز ان کی کھائی ہوئی آخرت کے اندر آگ کی شکل میں ان کے پیٹ کے اندر بھڑکے گی، "ولا یکلمھم اللہ یوم القیامۃ" اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن بولے گا نہیں، جو یہ دین فروشی کرتے ہیں کتمان حق کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن بات نہیں کرے گا یعنی ان کے اوپر ناراضگی کا اظہار ہو گا بات ہی نہیں کرے گا یعنی بلاواسطہ بات کرنا بولنا اسے کہتے ہیں جو محبت اور پیار کا بولنا ہوتا ہے، ایک طالب علم کے متعلق میں کہتا ہوں کہ میں اس سے نہیں بولتا اور جب وہ سامنے آتا ہے تو اس کو ڈانٹ دیا جائے تو اس کو کوئی بولنا نہیں کہتا غصہ کے اظہار کو بات کرنا نہیں کہتے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ محبت پیار کی بات نہیں کرے گا۔

یا یہ ہے کہ بلاواسطہ بات نہیں کرے گا جو بات ہوگی فرشتوں کی وساطت سے ہوگی جلالین کے اندر آپ

یہی توجیہ پڑھیں گے "ولا یزکیھم" اور اللہ انہیں پاک صاف نہیں کرے گا یا ان کی تعریف نہیں کرے گا دونوں طرح سے اس کا مطلب بیان کیا گیا ہے، پاک صاف نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گناہ گار مسلمان جہنم میں جائیں گے لیکن جہنم کے عذاب سے ان کے گناہوں کی سیاہی ڈھل جائے گی اور ان کو پاک صاف کر کے جنت میں بھیج دیا جائے گا لیکن یہ ایسے نجس العین ہوں گے کہ جیسے پاخانہ کو سات سمندروں سے بھی دھولیا جائے تو پاخانہ تو پاک نہیں ہوتا، پاخانہ کو اگر کوئی پاک کرنا چاہے تو اس کو پاک کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، جتنا چاہے اس کو دھولو وہ کیسے پاک ہوگا وہ تو نجس العین ہے نجاست اس کی ذات میں شامل ہے۔

اسی طرح کفر وشرک کرنے والے جتنے بھی ہیں یہ نجس العین ہیں یہ جہنم میں ہزار ہا کروڑ ہا سال بھی جلتے رہیں گے تو بھی یہ پاک نہیں ہوں گے بخلاف مؤمن گناہ گار کے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کپڑے کو پیشاب لگ گیا، اس کو دھویا جاتا ہے تو ٹھیک ہو جاتا ہے اسی طرح اگر ایمان ہے تو ایمان کے ساتھ جو معصیت ہوگی وہ دھل جائے گی، وہ آدمی صاف ستھرا ہو جائے گا صاف ستھرا ہو جانے کے بعد پھر اس کو جنت میں بھیج دیا جائے گا اللہ تعالیٰ انہیں صاف ستھرا نہیں کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا، یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں گمراہی لے لی ہدایت کے بدلے، ہدایت کو چھوڑ دیا اور گمراہی کو اختیار کر لیا اور آخرت میں عذاب کو اختیار کر لیا مغفرت کے بدلے ایسا کردار انہوں نے اختیار کیا ہے کہ دنیا میں ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کر لی اور آخرت میں مغفرت کو چھوڑ کر عذاب لے لیا۔

"فما اصبرھم علی النار" یہ فعل تعجب ہے جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے اس کا ترجمہ کر دیا گیا تھا کہ کتنے ہی صبر کرنے والے ہیں یہ آگ والے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تعجب کے معنی کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ بولے ہیں کہ شاباش ان کی ہمت پر کہ کیسے باہمت ہیں، آگ پر بڑے دلیر ہیں، بڑی ہمت والے ہیں، جہنم میں جانے کے لئے جنہوں نے یہ کردار اختیار کر رکھا ہے یہ تعجب کا اظہار ہے اور ان کا جہنم میں جانا اس سبب سے ہوا کہ اللہ نے کتاب تو حق کے ساتھ اتاری، حق کا معنی کہ واقعی بات اس میں بیان کر دی کہ مختلف فیہ مسائل حل ہو جائیں اللہ تعالیٰ نے ہر بات واقعی طور پر اس میں بیان کر دی اور بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ دور کی ضد میں ہیں وہ بہت دور نکل گئے مخالفت کرتے ہوئے، اس لئے ان کا واپس آنا مشکل ہے، آپ بھی کہا کرتے ہیں جب ایک شخص دوسرے کا مخالف ہو جاتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر ضد کرنے لگ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ شخص بہت دور نکل گیا اب ان کا آپس میں اتفاق نہیں ہوسکتا، یہ بھی بہت دور کے اختلاف میں ہیں، ضد میں ہیں ان کا اب اس کے ساتھ اتفاق کرنا مشکل ہو گیا ہے اب حق کی طرف ان کا آنا مشکل ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ

تمہارا اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لینا ہی نیکی نہیں لیکن

الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ

نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور پچھلے دن کے ساتھ اور فرشتوں کے ساتھ اور کتاب کے ساتھ اور نبیوں کے ساتھ

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ

اور جو دے مال باوجود مال کی محبت کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافر کو ،

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ

اور سوال کرنے والوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے ، اور وہ لوگ جو پورا کرنے والے ہیں

بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ

اپنے عہد کو جس وقت کہ عہد کر لیں ، اور جو صبر کرنے والے ہیں مالی تنگی میں اور بدنی تکلیف میں اور لڑائی کے وقت

الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

یہی لوگ سچے ہیں ، اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷۷﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ

اے ایمان والو! فرض کر دیا گیا تم پر برابری کرنا مقتولوں کے بارے میں ، آزاد (قتل کیا جائے گا)

بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ

آزاد کے بدلے اور غلام غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے ، پس وہ شخص جو معاف کر دیا جائے اس کو اس کے بھائی کی جانب سے

شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ

کچھ پھر پیچھا کرنا ہے معروف طریقے سے اور ادا کرنا ہے اس کی طرف اچھے طریقے سے یہ تخفیف

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ

تمہارے رب کی طرف سے ہے اور رحمت ہے ، جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لئے عذاب ہے

أَلِيمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يٰٓأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ

دردناک (۱۷۸) تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو، تاکہ تم خون خرابے سے

تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ

بچ جاؤ (۱۷۹) فرض کر دیا گیا تم پر جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اگر وہ چھوڑ کر جائے

خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا

مال ، وصیت کرنا والدین کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے اچھے طریقے سے ، یہ وصیت کرنا لازم کر دیا گیا

عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ

متقین پر (۱۸۰) جو شخص بدل دے گا اس بات کو بعد اس کے کہ وہ بات اس نے سنی پس سوائے اس کے نہیں کہ اس کا گناہ

عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ

صرف انہی لوگوں پر ہوگا جو کہ اس بات کو بدلتے ہیں ، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے (۱۸۱) جو کوئی اندیشہ کرے

مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ

وصیت کرنے والے کی طرف سے باطل کی طرف میلان کا یا کسی گناہ کا پھر وہ ان لوگوں کے درمیان صلح کرا دے تو اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ،

إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۲﴾

بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے (۱۸۲)

صرفی لغوی تحقیق:

"بر" نیکی، بھلائی، خیر، وفاداری ان سب معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اچھا سلوک کرنا "بر الوالدین" والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، تو "بر" وفاداری کے معنی میں بھی ہے، بھلائی اچھائی کے معنی میں بھی ہے "لیس البر ان تولوا وجوھکم" میں "ان تولوا وجوھکم" یہ مصدر کی تاویل میں ہو کر "لیس" کا اسم ہے اور "بر" خبر ہے کیونکہ "لیس" کی خبر منصوب ہوتی ہے اور اسم مرفوع ہوتا ہے تمہارا اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لینا ہی نیکی نہیں نہیں ہے نیکی کہ پھیرو تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف لفظوں کے تحت اگر آپ ترجمہ کرنا چاہیں

تو اس طرح سے ہو جائے گا اللہ کے ساتھ وفاداری یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو"ولکن البر من آمن باللہ" لیکن نیکی "برمن آمن باللہ" من آمن کےاوپر "بر" کا لفظ محذوف نکالیں گے تب جا کر حمل ٹھیک ہو جائے گا ورنہ لفظی ترجمہ بنے گا لیکن نیکی وہ شخص جو ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس طرح سے فقرہ ٹھیک نہیں بن رہا"ولکن البر بر من آمن باللہ"لیکن نیکی نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور پچھلے دن کے ساتھ اور فرشتوں کے ساتھ اور کتاب کے ساتھ، کتاب سے یہاں جنس مراد ہے اس لئے یہاں ترجمہ جمع کے ساتھ کر دیا گیا ہے اور یہی ٹھیک ہے کتابوں کے ساتھ اور نبیوں کے ساتھ۔

"وآتی المال" آتیٰ کا عطف آمن کےاوپر ہے "من آتی المال"لیکن نیکی نیکی تو اس شخص کی ہے جو دے مال"علیٰ حبہ" ہ ضمیر اگر مال کی طرف لوٹائیں تو ترجمہ ہوگا باوجود اس مال کی محبت کے یعنی دل میں مال کی محبت ہے پھر بھی دیتا ہے اور اگر"حبہ" کی ہ ضمیر اللہ کی طرف لوٹائیں تو "علیٰ حبہ" کا ترجمہ ہوگا اللہ تعالیٰ کی محبت کی بناء پر مال دیتا ہے یعنی مال کے دینے کی منشاء اللہ تعالیٰ کی محبت ہے اور کوئی منشاء نہیں، کن کو دیتا ہے"ذوی القربیٰ" قربیٰ قرابت کے معنی میں، ذوی القربیٰ رشتے دار قرابت والے "والیتمیٰ" یتیم کی جمع آ گئی رشتے داروں کو، یتیموں کو، یتیم اس نابالغ بچے کو کہا جاتا ہے جس کا باپ فوت ہو گیا ہو، نابالغ کی قید ہے کیونکہ بالغ ہونے کے بعد یتیم کا معنی ختم ہو جاتا ہے"لایتم بعد احتلام" "والمساکین" مسکین کی جمع اور مسکینوں کو "وابن السبیل" اور مسافر کو"ابن السبیل" راستے کا بیٹا اس کا معنی ہوتا ہے راہ چلتا مسافر "والسائلین" اور سوال کرنے والوں کو "وفی الرقاب ای فی فك الرقاب" اور دے مال گردنوں کے چھڑانے میں، "آتی المال فی الرقاب" دے مال گردنوں میں یعنی گردنوں کے چھڑانے میں مال خرچ کرے، گردنوں کے چھڑانے میں اس کا مصداق غلاموں کو آزاد کروانا، کسی غلام کی قیمت ادا کر دی جائے جیسے مکاتب کو امداد دے دی، یا کسی مقروض کی قرض سے گردن چھڑا دی مقروض آدمی کو مال دے کر اس کا قرضہ اتر وا دیا یا آپ کا کوئی مقروض تھا اس کا قرضہ معاف کر دیا یہ بھی گردن چھوڑنے والی بات ہے "واقام الصلوٰۃ" اور اقام کا عطف بھی آمن کےاوپر ہے اور نیکی تو اس شخص کی ہے جو قائم کرے نماز کو اور زکوٰۃ دے۔

"والموفون بعهدهم" موفون اسم فاعل کا صیغہ وفا کرنے والے، الف لام اس کےاوپر الذی کے معنی میں ہے اور اس کا عطف ہو گیا "من آمن" پر کیونکہ "من آمن یہ مرفوع ہے لکن کی خبر ہونے کی وجہ سے "لکن

البر من امن "من امن، لکن کی خبر ہے اور لکن کی خبر مرفوع ہوتی ہے یہ حروف مشبہ بالفعل میں سے ہے، تو "والموفون" اسی لئے مرفوع ہے اور جب بر کا لفظ محذوف نکالیں گے پھر یہ مضاف الیہ کا معنی ادا کرے گا جیسے وہاں بر کا لفظ محذوف نکالا تھا مضاف کو محذوف کر کے مضاف الیہ کو قائم مقام مضاف کے ذکر کر دیا گیا جو رفع والا اعراب مضاف پر آنا تھا مضاف الیہ پر آیا ہوا ہے تو "من امن " یہ بھی مرفوع اور "والموفون" یہ بھی مرفوع اور وہ لوگ جو اپنے عہد کو وفا کرنے والے ہیں، نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو اپنے عہد کو وفا کرنے والے ہیں جس وقت کہ عہد کرلیں۔

"والصابرین" کا عطف ہے "والموفون" پر، قاعدہ نحوی کے مطابق اس کو "والصابرون" ہونا چاہیے تھا رفعی حالت کے ساتھ لیکن اس کو منصوب کر کے ذکر کر دیا علی الخصوص اس میں مدح والا معنی پیدا ہو گیا یہ بھی ایک طریقہ ہے عرب میں کہ خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے اس لفظ کا اعراب بدل دیا جاتا ہے اب چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں بھی بات ویسی ہوتی کہ نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو کہ اپنے عہدوں کے ساتھ وفا کرنے والے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں تو "موفون" پر اس کا عطف ہے تو "موفون" کی طرح اس کو مرفوع ہونا چاہیے تھا لیکن جب یہ اعراب بدل دیا تو یہاں فعل محذوف نکالا جائے گا "اخص الصابرین" اور خاص طور پر میں تعریف کرتا ہوں ان لوگوں کی جو صبر کرنے والے ہیں، نیکی کرنے والوں میں سے خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتا ہوں صابرین کا جو صبر کرنے والے ہیں اور صبر کے تین موقع ذکر فرمائے ہیں "البأساء والضراء وحین البأس" "بأس" مالی تنگی "ضراء" بدنی تکلیف" وحین البأس" اور لڑائی کے وقت، مالی تنگی میں بدنی تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔

"اولئك الذین صدقوا" یہی لوگ سچے ہیں، صدق کے ساتھ موصوف ہیں یعنی ان کا قول ان کے عمل کے مطابق ہے، دعویٰ ایمانی میں سچے ہیں، صدق کا یہی معنی ہوتا ہے جو کہتے ہیں اس کے مطابق ان کا عمل بھی ہے یہی لوگ سچے ہیں، صدق کے ساتھ موصوف ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں "یایها الذین آمنوا کتب علیکم القصاص " اے ایمان والو! قصاص برابری کرنا یہ باب مفاعلہ سے آئے گا اور ویسے باب افتعال سے یہ استعمال ہوتا ہے "اقتص فی القتلی" قتلی قتیل کی جمع ہے فرض کر دیا گیا تم پر برابری کرنا مقتولوں کے بارے میں، مقتولوں کے بارے میں برابری کرنا تم پر فرض کر دیا گیا ہے "الحر بالحر والعبد بالعبد" آزاد قتل کیا جائے گا آزاد کے بدلے، غلام قتل کیا جائے گا غلام کے بدلے۔

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

اہل کتاب اور مشرکین کے ساتھ پچھلے رکوع کے آخر تک اصولی بحث ختم ہوگئی جیسا کہ آپ نے دیکھ لیا کہ پہلے زیادہ تر گفتگو اہل کتاب کے متعلق چلی آرہی تھی اور پچھلے رکوع میں شرک اور مشرکانہ رسوم کی تردید تھی اب یہاں سے آخر سورۃ تک اہل اسلام اہل ایمان کو ہدایات دی جارہی ہیں اور ضمنی طور پر کہیں کفار و مشرکین کا بھی ذکر آجائے گا زیادہ تر احکام اہل ایمان کو دیے جائیں گے۔

نیکی صرف مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنا ہی نہیں ہے:

یہ پہلی آیت ایک عنوان کے طور پر آگئی جس میں سارے کے سارے اصول بیان کر دیے گئے اور اس سے آگے پھر احکام کی جزئیات شروع ہوں گی، پہلی آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی اس کا مفہوم یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نیکی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب قبلہ کی تحویل ہوئی تھی تو اہل کتاب نے اس مسئلے کو بحث کا موضوع بنالیا، جہاں بیٹھتے جدھر جاتے یہی مسئلہ زیر بحث رہتا بیت المقدس کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ بیت اللہ کی طرف کیوں منہ کر لیا گیا؟ پہلے نبیوں کا کعبہ بیت المقدس تھا ادھر ہی منہ کر کے نماز پڑھنی چاہیے تھی اس مسئلے کے اوپر انہوں نے بہت بحثیں اٹھائیں جس طرح آپ کے سامنے پچھلے رکوعوں میں اس کی تفصیل عرض کر دی گئی ہے اب آپ جانتے ہیں قبلہ، کسی جانب منہ، جہت استقبال یہ بذات خود کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ تو عبادت کے اندر یکسوئی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، نماز پڑھنی ہے اس لئے کسی طرف منہ کرنا بھی ضروری ہوگیا اس کے اندر حسن اگر آیا ہے تو اقامت صلوٰۃ کی وجہ سے آیا ہے یہ ایک ضمنی سی چیز ہے۔

اور اس کو اس طرح سے زیر بحث لے آئیں کہ گویا کہ سارے دین کا مدار ہی اس بات پر ہے تو یہ حد سے تجاوز ہے اب ان کو سمجھانے کے لئے بات یہ کی جارہی ہے کہ تم اس کے پیچھے اس طرح سے لگ گئے جس طرح سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ فرمانبرداری کا وفاداری کا معیار صرف یہی ہے کہ مشرق کی طرف منہ کرلو یا مغرب کی طرف منہ کرلو، کسی جہت کی طرف منہ کر لینا یہی ساری وفاداری ہے دین کا مدار ہی اسی بات پر ہے تم اس بات کو اس طرح سے لے کر بیٹھ گئے جیسے اس کے علاوہ دوسرا کوئی نیکی کا کام ہی نہیں، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نیکی کے کام تو یہ ہیں اصل ان کی طرف توجہ دینی چاہیے اس میں مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر کے نیکی کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے

بلکہ جس طرح سے ان لوگوں نے اس کو اپنا موضوع سخن بنالیا تھا اور ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے علاوہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تو دوسروں کے مقابلہ میں اس کی نفی کرنی مقصود ہے۔

مثال سے وضاحت:

اس کو آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص لباس کی اہمیت اتنی اختیار کر لیتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کے ساتھ بحث کرتا ہے کہ تو نے قمیص ایسی کیوں بنالی، تو نے شلوار ایسی کیوں بنالی، ٹوپی ایسی ہونی چاہیئے، ایسی نہیں ہونی چاہیئے، شلوار ایسی ہونی چاہیئے ایسی نہیں ہونی چاہیئے، کپڑا یہ استعمال کرنا چاہیئے یہ استعمال نہیں کرنا چاہیئے ہر وقت وہ اس کے پیچھے لگا رہے کپڑوں کی بناوٹ ان کی تراش ان کی خراش اور لوگوں کے سامنے تبلیغ کہ یوں کپڑا پہنا کرو یوں کیا کرو ایسا نہ کیا کرو اور اس کے علاوہ نماز کی پرواہ نہیں، روزے کی پرواہ نہیں، اخلاق رذیلہ کی پرواہ نہیں تو اس کو سمجھانے کے لئے کہیں گے کہ بھائی دین سارے کا سارا کپڑوں میں ہی نہیں آ گیا، دین تو یہ ہے کہ نماز وقت پر پڑھو، روزہ رکھو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، فرمانبرداری کرو اس کے مقابلہ میں صرف کپڑوں میں کیا رکھا ہے تو اس کا یہ معنی نہیں کہ کپڑوں کے متعلق احکام شریعت نہیں ہیں لیکن دوسرے احکام کے مقابلہ میں چونکہ ان کی حیثیت کمزور ہے تو ادا کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے۔

جیسے ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ "**درعمل کوش هرچه خواهی پوش**" عمل کے متعلق کوشش کرو پہننے کی کیا بات ہے جو چاہے پہن لو، اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہننے کے متعلق کوئی احکام نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ پہننے کے مقابلہ میں دوسرے احکام زیادہ اہم ہیں اب ان کا تو خیال نہ کرو اور پہننے کے پیچھے لگے رہو اور کپڑوں کو زیر بحث لے آؤ اور اگر یہ کہا جائے کہ بھائی کپڑوں میں کیا رکھا ہے یہ باتیں ہیں خیال کرنے کے قابل اور ان کی تم پرواہ نہ کرو کپڑوں کے پیچھے لگے رہو ان احکام کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، آپ ایمان لائے نہیں، کفر کو اختیار کیے ہوئے ہو، نماز روزہ کی تمہیں پرواہ نہیں ہے، مالی احکام تم اختیار نہیں کرتے، اخلاق تمہارے ٹھیک نہیں، ایفاء عہد تم نہیں کرتے بس یہی بحث لگی ہوئی ہے ادھر کو منہ کیوں کرلیا ادھر کو منہ کیوں کرلیا ادھر کرنا چاہیئے ادھر نہیں کرنا چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کاموں کے مقابلہ میں تمہارے نزدیک ایک یہی مسئلہ اہم ہے، جبکہ ان کے مقابلہ میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے تمہیں خیال ان باتوں کا کرنا چاہیئے۔

ورنہ یہ مطلب نہیں کہ مشرق کی طرف منہ کرنا، مغرب کی طرف منہ کرنا یہ نیکی کا کام نہیں، جب اللہ نے حکم دے دیا کہ نماز پڑھتے ہوئے مشرق کی طرف منہ کر دیا اللہ نے حکم دے دیا کہ مغرب کی طرف منہ نہ

کرو یہاں عمل کرنا نیکی ہے لیکن دوسرے احکام ان کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں اب ساری توجہ اسی پر کر دینا تو اچھی بات نہیں ہے ان الفاظ کا یہ مفہوم ہے جیسے بعض لوگ ایک مسئلے کو لے لیں اور اسی کے اوپر ہر وقت اٹھتے بیٹھتے بحث کرتے رہیں نہ نماز کی پرواہ، نہ روزے کی ان کو کہو کہ بھائی سارا دین اسی مسئلے میں تو نہیں رکھا ہوا یہ کام بھی تو کرنے کے ہیں، دوسرے کاموں کی طرف توجہ دلانے کے لئے یہ عنوان اختیار کیا جاتا ہے مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نیکی نہیں یعنی نیکی صرف یہ نہیں جو ہر وقت تم اس کے پیچھے پڑ گئے بلکہ نیکیاں تو یہ ہیں ان کا خیال کرو، تو اس مسئلے کے مقابلہ میں دوسرے مسائل کو اہم کر کے ذکر کرنا مقصود ہے۔

ایمانیات وعقائد کا ذکر:

نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ کے ساتھ ایمان لائے، سب سے زیادہ بنیادی چیز جو ضروری ہے وہ اللہ کے ساتھ ایمان لانا ہے ایمان لانے کا مطلب آپ نے جان لیا کہ اس کے وجود کو مانو کہ اللہ ہے، اس کو واحد جانو وحدانیت کا عقیدہ رکھو، ہر قسم کی اچھی صفات جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی کتاب کے اندر واضح کی گئی ہیں ان کے مطابق اس کو موصوف جانو ہر قسم کے نقص سے اس کو پاک جانو "وحدہ لاشریك" اس کو قرار دو، اللہ پر ایمان لائے، یوم آخرت پر ایمان لائے، یوم آخر سے وہی مر کے جی اٹھنے کا دن مراد ہے کہ جب یہ ساری دنیا ختم ہو جائے گی اس کے بعد دوبارہ اٹھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب وکتاب ہو گا اس کے بعد جنت اور دوزخ والی زندگی شروع ہو گی یہ یوم آخر پر ایمان ہے ضروریات دین میں شامل ہے اس کے اندر کوئی شخص اگر شک کرتا ہے تو وہ کافر ہے وہ مومن نہیں بنیادی عقائد کے اندر یہ بات داخل ہے اور ایمان لائے فرشتوں پر کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں جس طرح سے ان کے حالات بتا دیے گئے، نوری مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں، جو حکم اللہ تعالیٰ دیتے ہیں وہ اس کو پورا کرتے ہیں۔

"یفعلون مایؤمرون" اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف کاموں پر متعین کیا ہوا ہے، جو کام ان کے ذمے لگ جائے وہ کام کرتے ہیں، اس کائنات کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کی تقدیر کے نافذ کرنے کے لئے وہ کارکن ہیں جیسے حالات ان کے قرآن وحدیث میں واضح کر دیے گئے فرشتوں کو مانو "والکتاب" کتاب سے جنس مراد ہے اللہ کی طرف سے جو کتابیں اتری ہیں ان پر ایمان لاؤ "والنبیین" اور ایمان لائے نبیوں کے ساتھ سب نبیوں کو مانے یہ تو عقائد کا درجہ آ گیا کہ نیک بننے کے لئے ایمان اس طرح سے

تفصیل کے ساتھ لانا ضروری ہے کہ اللہ کو مانو، یوم آخر کو مانو، فرشتوں کو مانو، کتابوں کو مانو، نبیوں کو مانو، یہ اصول کے درجے میں ذکر دیئے گئے اور آپ جانتے ہیں کہ اس کے اندر سارا دین آ گیا جب کتابوں کو مان لیا تو جو کچھ کتابوں نے بیان کیا وہ بھی ایمان کے درجے میں آ گئی، نبیوں کو مان لیا نبیوں پر ایمان لائے اور اسی طرح سے یوم آخر پر ایمان لے آئے تو دین کے بنیادی عقائد اس کے اندر سارے آ جاتے ہیں۔

عبادات کا ذکر:

''واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ'' اب آگے یہ عبادات کا درجہ آ گیا، عبادت دو قسم کی ہے مالی اور بدنی، بدنی عبادات میں نماز کلی حیثیت رکھتی ہے اور مالی عبادت میں زکوٰۃ اور پھر زکوٰۃ کے ذکر کرنے سے پہلے مال کے دینے کا ذکر جو آ گیا یہ نفلی صدقات ہیں، ''ذوی القربیٰ'' رشتے داروں کو، رشتے داروں سے محتاج رشتے دار مراد ہیں کوئی رشتے دار سامنے آئے جو محتاج ہے اس کے پاس اپنی ضرورت کی کوئی چیز نہیں ہے اور تمہارے پاس مال ہے تو اس کو دو، یتیموں کو دو، مسکینوں کو، مسافر کو، مسافر سے بھی ضرورت مند مسافر مراد ہے، سوال کرنے والے اور گردنوں کے چھڑانے میں جو شخص اپنے مال کو ان حدوں کے اندر صرف کرتا ہے یہ ہے اللہ کا وفادار نیکی تو اس شخص کی نیکی ہے، ''فی الرقاب'' کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا، رقاب جمع رقبہ کی اور رقبہ کہتے ہیں گردن کو اور اس کے اوپر مضاف محذوف ہے ''فی فك الرقاب'' گردنوں کے چھڑانے میں، خرچ کرے غلاموں کے آزاد کرانے میں جیسے کوئی مکاتب ہے اس کی امداد کر دی یا کوئی مقروض سامنے آ گیا اس کا قرضہ ادا کر کے اس کی گردن چھڑا دی۔

''واقام الصلوٰۃ'' یہ بدنی عبادت کا اصول آ گیا نماز قائم کرے، نیکی تو اس شخص کی ہے جو نماز قائم کرے ''وآتی الزکوٰۃ'' اور زکوٰۃ دے، زکوٰۃ وہی مالی عبادت ہے لیکن دیکھ لیں زکوٰۃ سے پہلے ''اتی المال'' ذکر کیا ہوا ہے تو اس میں اہمیت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا اظہار اسی طرح ہوتا ہے کہ صرف زکوٰۃ پر اکتفاء نہ کیا جائے بلکہ وقتاً فوقتاً اپنا محبوب مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتا رہے جیسے چوتھے پارے کی پہلی آیت آئے گی تم ہرگز برکو نہیں پہنچ سکتے یہی بر والا لفظ ہے کہ تم ہرگز برکو نہیں حاصل کر سکتے جب تک کہ اپنے محبوب مال میں سے اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو تو کمال حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا ثبوت دینے کے لئے اپنے محبوب مال کا خرچ کرنا ضروری ہے۔

معاملات کا ذکر:

''والموفون بعهدهم'' یہ معاملات آ گئے، عقائد عبادات اور یہ معاملات کہ جس کسی کے ساتھ عہد کر لو

عہد یہ دونوں کا آپس میں ہوتا ہے یعنی جو لو اور دو کے اصول پر آپس میں کر لے بیع شراء ایک معاہدہ ہے، نکاح ایک معاہدہ ہے اور اسی طرح سے باقی جتنے معاملات چلتے ہیں وہ عاقدین کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے اور اس کے وفا کا مقصد یہ ہے کہ اس کے حقوق ادا کرو اور نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو کہ پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب بھی وہ عہد کر لیں یہ معاملات کی درستگی آ گئی۔

اخلاق کا ذکر:

''والصابرین فی البأساء'' یہ باطنی اخلاق آ گئے، باطنی عادات کا اچھا ہونا کہ انسان کے اندر صبر کی کیفیت پائی جائے اور صبر کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا کہ یہ نفس کی پختگی ہوتی ہے جس کو ہم برداشت کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں اور اس کے تینوں شعبے ہوتے ہیں کہ نیکی کو برداشت کرو نیکی سے طبعیت کراہت کرتی ہے تو اپنی طبعیت کو پابند کرو اس نیکی کے کرنے پر یہ بھی صبر کا تقاضا ہے جس کو صبر علی الطاعت کہیں گے، نفس کا میلان معصیت کی طرف ہے روکنا اس کو ناگوار ہے تو نفس کو معصیت سے روک کر رکھو، اس کی مکروہ چیز کے اندر اس کو پابند کرو یہ بھی صبر کا شعبہ ہے جس کو صبر عن المعصیت سے تعبیر کریں گے، اور خلاف طبعیت واقعات پیش آ گئے اور ان میں طبعیت کا تقاضا ہوتا ہے کہ شکوہ شکایت چیخنا چلانا لیکن اپنے نفس کو پابند کر کے رکھو یہ صبر علی المصیبت ہے، اور یہاں مصیبت والے صبر کا ذکر آ گیا کہ مالی تنگی پیش آ گئی، بدنی تکلیف پیش آ گئی یا کوئی لڑائی جہاد وغیرہ پیش آ گیا تو اس میں صبر کرنے والے جو لوگ ہیں اللہ فرماتے ہیں کہ میں ان کی خصوصیت سے تعریف کرتا ہوں کہ یہ ہیں وفادار قسم کے لوگ جو مالی تنگی کے اندر بھی مستقل مزاج رہتے ہیں اور بدنی تکلیف کے اندر بھی مستقل مزاج رہتے ہیں اور لڑائی کی نوبت آ جائے، اللہ کے راستے کے اندر جہاد کی نوبت آ جائے تو اس کے اندر بھی مستقل مزاج رہتے ہیں یہ اصل وفادار لوگ ہیں۔

چونکہ صبر تمام خیرات کے لئے تمام نیکیوں کے لئے جامع ہے کہ اس کیفیت کے حاصل ہو جانے کے بعد ہر نیکی آسان ہو جاتی ہے اور معصیت سے بچنا آسان ہو جاتا ہے جب اپنے آپ کو سنبھالنے کی عادت پڑ جائے تو صبر کا مفہوم اپنے آپ کو سنبھالنا ہے کہ اپنے نفس کو سنبھال لیا اور اس کے تقاضے کے مطابق اس کو چلنے نہ دیا نفس کا تقاضا ہے نیکی سے بھاگنا اور نفس کا تقاضا ہے گناہ کی طرف جانا اور نفس کا تقاضا ہے خلاف مزاج بات پیش آ جانے کے بعد اس کی شکایت کرنا اور شور مچانا، نفس کو سنبھال کر رکھو کہ اس میں بھی اوچھے پن کے ساتھ شکوہ شکایت چیخنا چلانا نہ پایا جائے تو یہ چیز چونکہ جامع ہے تمام نیکیوں کے لئے اور اس کیفیت کے حاصل ہو جانے کے بعد بہت

ساری نیکیاں آسان ہو جایا کرتی ہیں اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کی وفاداری کی تعریف کی ہے تو دین کے اہم شعبے کلی درجے میں اس میں آگئے عقائد آگئے، عبادات آگئیں مالی بھی اور بدنی بھی اور معاملات آگئے اخلاق آگئے۔

وفادار کون؟

''اولئك الذین صدقوا'' یہ ہیں سچے لوگ، صدق کا یہاں معنی یہی ہے کہ جو اپنے قول کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں، صرف باتیں ہی بنانا نہیں جانتے، جن کا کردار اس قسم کا ہے یہ ہیں اللہ تعالیٰ کی وفاداری کے دعویٰ کے اندر سچے لوگ، یہ نیک لوگ ہیں، یہ نیکی کا کردار اختیار کرنے والے ہیں'' واولئك هم المتقون'' اور یہی لوگ متقون ہیں تو ان کاموں کی طرف متوجہ ہو جاؤ یہ کام کرنے کے ہیں جو شخص یہ کام کرتا ہے اصل کے اعتبار سے اللہ کے وفادار یہ ہیں، نیکی کرنے والے یہ ہیں، صرف یہی کہ مشرق کی طرف منہ کر لیا مغرب کی طرف منہ کر لیا تم اسی کو لے کے بیٹھ جاؤ اور باقی اہم کاموں کو چھوڑ دو تو یہ کوئی وفاداری نہیں ہے۔

قانون قصاص:

اصول کے درجے میں ذکر کرنے کے بعد آگے کچھ احکام کی جزئیات آگئیں، پہلا حکم ذکر کیا جا رہا ہے مقتولین کے قصاص کا اور اس مسئلے کا تعلق امن عالم کے ساتھ ہے جس طرح سے آگے لفظ آئے گا'' ولکم فی القصاص حیوة یاولی الالباب'' اس میں زندگی کا بچاؤ ہے، امن عالم کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔

عرب کے اندر فساد جس قسم کا تھا اس کی تفصیل آپ سنتے رہتے ہیں کہ ذرا سی بات پر دوسرے کو قتل کر دیا جاتا اور جس قبیلے کا آدمی قتل ہوتا وہ قبیلہ انتقام لینے کے لئے پھر دوسروں کے قبیلوں کے قبیلوں کو ضد میں آکے ختم کرتے کوئی عورت ہاتھ آگئی اس کو مار دو، بچہ ہاتھ آگیا اس کو مار دو، اس کا باپ ہاتھ آگیا اس کو قتل کر دو، بیٹا ہاتھ آگیا اس کو قتل کر دو، کوئی قاعدہ اور ضابطہ ہی نہیں تھا اور خون ریزی ساری کی ساری چل رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں قصاص کی رعایت رکھو اگر قاتل حر ہے تو اس کے بدلے میں حر کو قتل کرو، اگر قاتل عبد ہے تو اس کے مقابلہ میں عبد کو قتل کرو، یہ نہیں کہ اگر ایک عبد دوسرے عبد کا قاتل ہے اور اس عبد کے مقابلہ میں اس قاتل عبد کو قتل نہیں کرنا بلکہ آزاد آدمی کو قتل کرنا ہے یہ بھی ایک ضد ہوتی تھی کہ ایک خاندان جو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں اچھا سمجھتا تھا وہ اپنے غلام کے عوض میں دوسرے قبیلے کا آزاد لیتا تھا چاہے قاتل غلام ہی ہو وہ کہتے تھے کہ ہم اس کو کیوں قتل کریں ہم تو اس قبیلے کا آزاد آدمی قتل کریں گے۔

یہاں برابری کا مقصد یہ ہے کہ قاتل جو ہو اس کو قتل کرو اگر عبد کو عبد نے قتل کیا ہے تو عبد کو قتل کرو، اگر حر نے حر کو قتل کیا ہے تو حر کو قتل کرو، عورت نے عورت کو قتل کیا ہے تو عورت کو قتل کرو، یہ نہیں کہ قاتل تو عبد ہے اور تم اس قبیلے کا آزاد لے لو، قاتل تو عورت ہے تم اس قبیلے کا مرد قتل کرو ایسی بات نہیں ہے اور دوسری شق پیش آجانے کی صورت میں کہ عبد قاتل ہے حر کا تو بھی عبد کو قتل کیا جائے گا، حر قاتل ہے عبد کا تو بھی حر کو قتل کیا جائے گا، عورت قاتل ہو مرد کی تو عورت کو قتل کیا جائے گا، مرد قاتل ہو عورت کا تو مرد کو قتل کیا جائے گا، یہاں اس کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے کہ حر کو حر کے بدلے میں قتل کرو عبد کے مقابلہ میں قتل نہ کرو یہ مقصود نہیں ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ برابری یوں کرو کہ اگر حر کا قاتل حر ہے تو حر کو قتل کرو، عبد کا قاتل عبد ہے تو عبد کو قتل کرو یہ نہ ہو کہ عبد کی بجائے تم حر کو قتل کرو، ایک کی بجائے تم کئی کئی کو قتل کردو ایسی بات نہیں ہے اس طرح سے برابری کی رعایت رکھیے، اصل حکم تو یہ ہوا کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کرو دونوں کے درمیان برابری ہو جائے گی۔

قصاص صرف قتل عمد میں ہے:

باقی احکام تفصیل کے ساتھ فقہ میں آئیں گے کہ کون سا قتل ہوتا ہے جس کے بدلے میں قصاص لیا جاتا ہے، قتل کی پانچ قسمیں آپ کے سامنے ذکر کی جائیں گی ان میں سے صرف ایک قتل ہے جس کو قتل عمد کہتے ہیں جو کسی کو آلہ قتل کے ساتھ جان بوجھ کر قتل کیا جائے اس کو قتل عمد کہتے ہیں استعمال بھی آلہ قتل کیا ہے اور مارا بھی جان بوجھ کر ہے بسا اوقات استعمال تو آلہ قتل ہوتا ہے لیکن انسان مارتا جان بوجھ کر نہیں ہے جیسے گولی ماری لیکن ماری ہرن کے تھی اور چوک کر لگ گئی کسی انسان کو اب یہاں آلہ تو قتل والا ہے لیکن اس انسان نے جان کر نہیں ماری اور یا کوئی چیز نظر آئی اس کو سمجھا کہ وہ ہرن ہے لیکن حقیقت میں وہ انسان تھا تو یہاں بھی مقصد میں خطاء ہو گئی اس کے سمجھنے میں غلطی ہو گئی یہ صورتیں پھر خطاء کی ہیں ان کے اندر قصاص نہیں آیا کرتا، قصاص اس طرح ہو گیا کہ آلہ قتل استعمال کیا ہے جس کے ساتھ آدمی کو قتل کیا جاتا ہے آلہ قاتلہ استعمال کیا اور جان بوجھ کر قتل کیا اور مارنا مقصود ہو جب یہ حالات ثابت ہو جائیں گے کہ اس نے جان بوجھ کر مارا ہے اور آلہ قتل کے ساتھ مارا ہے ایسی صورت میں ہم کہیں گے کہ یہ قتل عمد ہے اس صورت میں پھر قاتل کو مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے اگر آلہ قتل استعمال نہیں کیا اتفاقاً ڈنڈا مارا اور وہ مر گیا آلہ قتل استعمال نہیں کیا یا جس کو گولی لگی ہے اس کے مارنی مقصود نہیں تھی یا ہم حالات اس قسم کے سمجھتے ہیں آثار سے کہ اس کو مارنا مقصود نہیں ان صورتوں میں پھر قصاص نہیں آیا کرتا بلکہ دیت آتی ہے یہ سب تفصیل آپ فقہ کے اندر پڑھیں گے۔

قانون قصاص میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نرمی:

''فمن عفی لہ من اخیہ شیء'' قصاص حق العبد ہے، قتیل کے ورثاء معاف کرنا چاہیں تو معاف کر سکتے ہیں بالکل ہی معاف کر دیں کہ ہم کچھ نہیں لیتے اس کا بھی حق ہے، کچھ معاف کر دیں تو پھر بھی قصاص ساقط ہو جائے گا مثلاً قتیل کے دو وارث ہیں ان میں سے ایک نے معاف کر دیا تو قصاص ساقط ہو گیا اب قصاص نہیں لیا جائے گا دوسرے کو مالی معاوضہ دیا جائے گا اور اگر ویسے خون چھوڑ دیں کہ ہم اتنے پیسے لے کر معاف کرتے ہیں تو بھی قصاص ساقط ہو جائے گا اگر کچھ معافی مل گئی تو پھر چاہیئے کہ مال لیتے وقت قتیل کے ورثاء اس قاتل کی پیروی کریں اس کے پیچھے لگیں اچھے طریقے کے ساتھ شرافت سے پیسے مانگیں اور دینے والا بھی احسان کے ساتھ ادا کرے، اچھے طریقے کے ساتھ ادا کرے یعنی لینے والے کو چاہیئے کہ وہ بھی عرف کی رعایت رکھے اور بلاوجہ پریشان نہ کرے اور دینے والے کو بھی چاہیئے کہ بلاوجہ ٹال مٹول نہ کرے اس مالی معاملے کو شرافت کے ساتھ احسان کے ساتھ آپس میں طے کر لیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہوگئی اس کی مہربانی ہے اگر وہ کہتا کہ نہیں قتل کے بدلے میں دوسرے کو قتل ہی کیا جائے گا اور مالی طور پر معاملہ طے کرنے کی اجازت نہیں ہے تو اس میں سختی تھی اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی چاہے تم خون کا بدلہ خون لے لو اور چاہو تو معاف کر دو چاہے مالی معاوضہ لے لو یہ تخفیف ہے اور اس کی مہربانی ہے اور اس مالی معاملے کے طے ہو جانے کے بعد معافی مل جانے کے بعد اگر کسی نے تعدی کی کہ پہلے معاف کر دیا پھر قاتل سے بدلہ لے لیا یا دیت لے لی دیت لینے کے بعد پھر خون بھی وصول کر لیا اس قسم کی اگر کوئی حد سے تجاوز کرے گا ''فلہ عذاب الیم'' تو پھر تجاوز کرنے والا قصوروار ہے اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

قانون قصاص امن عالم کا ذریعہ ہے:

''ولکم فی القصاص حیوۃ یاولی الالباب'' اے عقل والو! تمہارے لئے اس قصاص میں زندگی ہے اگر یہ قصاص کا قانون نافذ کرو گے تو تمہاری اپنی زندگیاں بچیں گی، قتل و غارت اتنی نہیں ہوگی جب کسی شخص کو یہ یقین آجائے کہ اگر میں نے قتل کیا تو مقابلہ میں میں بھی قتل کر دیا جاؤں گا وہ خود بخود دبکے گا، وہ بھی بچ گیا جس کو قتل کرنا چاہتا تھا وہ بھی بچ گیا دونوں کی زندگیاں بچ گئیں، اور جب یہ پتہ ہے کہ چھوٹ جائیں گے، ہمیں کوئی پکڑنے والا نہیں ہے، رشوت دے کر چھوٹ جائیں گے، سفارش سے چھوٹ جائیں گے، قصاص نہیں لیا جائے گا تو پھر انسان بے باک ہو کر قتل کرتا ہے قتل و غارت زیادہ ہوتی ہے اس قانون کے نفاذ میں تمہاری زندگیوں کی حفاظت

ہے، تمہاری زندگی کی بقاء ہے یعنی معاشرہ سدھر جائے گا، قتل وخون بند ہو جائے گا، جان کا امن حاصل ہو جائے گا، کوئی شخص ایک دوسرے پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا، اگر پابندی کے ساتھ تم اس قانون کے اوپر عمل کرلو، زندگی کی بقاء ہے، زندگی کا بچاؤ ہے 'لعلکم تتقون'' تاکہ تم بچو اس قتل وخون سے اس لیے ہم نے تمہیں یہ قاعدہ بتایا ہے کہ اس قانون کی پابندی کرو گے تو قتل وخون سے بچ جاؤ گے یہ تو جان کے متعلق حکم تھا۔

وصیت کس کے لیے اور کتنے مال میں:

اور آگے مال کے متعلق حکم آ گیا جس وقت یہ آیت اتری ہے اس وقت تک ورثاء کے حصے قرآن میں متعین نہیں کیے گئے تھے کہ وارث کو مال کس طرح سے ملنا ہے تو حکم دے دیا کہ مرنے والا خود **وصیت** کر کے جایا کرے کہ میری ماں کو اتنا دے دینا، میرے باپ کو اتنا دے دینا، فلاں کو اتنا دے دینا، پھر اس کی وصیت کے مطابق اس کا مال تقسیم کر دیا جاتا تھا اور جو بچ جاتا تھا وہ اولاد کو دے دیا جاتا تھا۔

لیکن بعد میں جس وقت قرآن کریم کے اندر حصے متعین کر دیے گئے کہ ماں کا اتنا ہے باپ کا اتنا ہے، فلاں کا اتنا ہے جیسے سورۃ نساء میں آپ کے سامنے تفصیل آئے گی اس کے بعد پھر اقربین کے لیے وصیت ساقط ہوگئی، رشتے داروں میں سے جو رشتے دار وارث ہیں جن کے حصے قرآن اور حدیث کے اندر متعین کر دیے گئے ان کے لیے اب وصیت نہیں کی جا سکتی۔

ہاں البتہ ایک شخص رشتے دار ہے لیکن وہ وارث نہیں ہے تو اس کے لیے وصیت اب کی جا سکتی ہے اور اب یہ وصیت مستحب ہے فرض نہیں ہے جیسے اگر آپ کا باپ زندہ ہے تو باپ وارث ہے، دادا بھی زندہ ہے تو دادا وارث نہیں ہے تو آپ وصیت کر سکتے ہیں کہ میرے دادا کو میرے مال میں سے اتنا دے دینا تو آپ کی وصیت ثلث میں نافذ ہو جائے گی ثلث سے زیادہ میں نہیں ہوگی بھائی آپ کا زندہ ہے اور بھتیجا بھی آپ کا زندہ ہے تو بھائی کی موجودگی میں بھتیجا وارث نہیں ہے تو ایسی صورت میں آپ وصیت کرتے ہیں کہ میرے بھتیجے کو اتنا دے دینا تو اس رشتے دار کو وصیت کی جا سکتی ہے۔

کیونکہ یہ رشتہ دار اس وقت وارث کی حیثیت میں نہیں ہے تو وارث کے لیے وصیت نہیں جس کا ورث قرآن وحدیث کے اندر متعین ہو گیا اس کے لیے وصیت نہیں کی جائے گی اس کو اتنا ہی دیا جائے گا جتنا قرآن وحدیث میں متعین ہو گیا اور اگر کوئی شخص وصیت کر ہی دے کسی وارث کے لیے تو پھر باقی ورثاء کی اجازت پہ موقوف ہے اگر باقی ورثاء اپنا حق چھوڑ دیں اور اس کو زیادہ دینے پر راضی ہو جائیں تو شریعت کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

لیکن باقی ورثاء پر ان کی مرضی کے خلاف یہ وصیت نافذ نہیں ہوگی اور پھر غیر کے لیے وصیت ثلث میں بند کردی گئی، ثلث سے زیادہ وصیت کرنا جائز نہیں اگر کوئی شخص ثلث سے زیادہ وصیت کر جائے اگر ورثاء اجازت دیں گے تو زائد مال دے دیا جائے گا ورنہ ثلث تک وصیت نافذ ہوگی زیادہ پر نافذ نہیں ہوگی لکھ دی گئی تم پر، فرض کردی گئی تم پر وصیت، ''الوصیة کتب'' کا نائب فاعل ہے جس وقت تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وصیت کب کرنا ضروری ہے اگر مال چھوڑ کر جائے اور اگر مال چھوڑا ہی نہیں تو وصیت بھی کیا کرنی ہے، وصیت والدین کے لیے قریبی رشتے داروں کے لیے ہے معروف طریقے سے، اچھے طریقے سے، انصاف کی رعایت رکھو، عرف عام کی رعایت رکھو''حقا علی المتقین'' یہ متقین پر ضروری ہے یہ بات ضروری طور پر لکھ دی گئی ہے، حق ہے متقین پر، حکم لازم ہے متقین پر۔

وصیت تبدیل کرنے کا گناہ کس پر؟

اور وصیت کرنے والے نے وصیت کردی جس کے سامنے وصیت کی تھی اس نے آگے ادا کرتے ہوئے اس وصیت کو بدل دیا اس نے تو کہا تھا کہ اس کو پچاس روپے دے دینا۔

لیکن وہ کہتا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ پچیس دے دینا اب حاکم تو اس کی وصیت کے مطابق فیصلہ کردے گا اب حقیقت کے اعتبار سے جب حاکم نے فیصلہ کیا کہ اس کو پچیس روپے دے دو تو اس کا پچیس روپے حق مارا گیا لیکن اس کا گناہ حاکم پر نہیں اس تبدیلی کرنے والے پر گناہ ہے جس نے وصیت غلط ادا کی ہے، یہ حاکم کا فیصلہ بھی واقعہ کے اعتبار سے غلط ہوگا لیکن اس کا گناہ حاکم کو نہیں ہے جو بھی تقسیم کرنے والا ہوگا وہ بیان سن کر تقسیم کرے گا، بیان دینے والا اگر غلط بیانی کرتا ہے تو نہ مرنے والے پر گناہ نہ حاکم پر گناہ جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا، یہ گناہ اسی کے ذمے ہے جس نے تبدیلی کی اور جو شخص بدل دے اس کی وصیت کو سننے کے بعد پس اس کا گناہ اسی شخص پر ہے جس نے اس کو بدلا ہے اور اس کے بیان کے مطابق حاکم کا جو فیصلہ ہوگا تو گناہ حاکم پر نہیں ہے تبدیلی کرنے والے پر گناہ ہے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔

ظلم اور گناہ کی وصیت کو تبدیل کرنا:

ہاں البتہ ایک صورت ہے کہ وصیت کرنے والے نے وصیت ایسے طور پر کی کہ واقعی اس نے بعض کی حق تلفی کردی اور حق سے وہ پھر گیا پھر ان سب کے درمیان میں کوئی اصلاحی پہلو اختیار کرلیا جائے تو اس میں چاہے بظاہر وصیت کے اندر تبدیلی ہے لیکن اس قسم کی تبدیلی جو کہ اصلاح کے لیے کی گئی ہے، جس میں اصلاحی پہلو ہے

اس قسم کی تبدیلی کوئی کرے تو ایسی صورت میں پھر اس کو گناہ نہیں ہوگا تو واقعہ پیش آسکتا ہے کہ وصیت کرنے والا قرضداروں کا قرض ادا کرنے کے متعلق کہہ کر نہیں گیا دور کے رشتے داروں کو زیادہ دے دیا، قریب والوں کو بالکل محروم کر دیا، مال کو بے ڈھنگے پن کے ساتھ تقسیم کرنے کو کہہ دیا ایسے وقت میں کوئی شخص اس وصیت میں تبدیلی کر دیتا ہے اور اس میں حالات کی اصلاح کروا دیتا ہے تو اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں بظاہر اگرچہ اس میں تبدیلی ہے لیکن یہ تبدیلی اصلاح کے رنگ میں ہے اس لیے درست ہے جو شخص اندیشہ کرے وصیت کرنے والے کی طرف سے باطل کی طرف میلان کا یا وہ ناحق کسی کی حق تلفی کر گیا خاف یہاں عالم کے معنیٰ میں ہے مفسرین کہتے ہیں جس کو تحقیق ہوگئی جس کو موصی کے طرف سے میلان علی الباطل کا یا کسی قسم کے گناہ کا علم ہو گیا پھر وہ ان ورثاء کے درمیان میں اصلاح کر دیتا ہے، ان کے حالات کو درست کر دیتا ہے اصلاح کی کوئی صورت پیدا کر دیتا ہے'' فلا اثم علیہ '' تو اس پر کوئی گناہ نہیں ''ان اللہ غفور رحیم '' پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ

اے ایمان والو! فرض کر دیا گیا تم پر روزہ جس طرح سے فرض کیا گیا تھا ان لوگوں پر

مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم

جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ تم متقی ہو جاؤ ﴿۱۸۳﴾ چند گنتی کے دن روزہ رکھ لیا کرو ، پھر جو تم میں سے

مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ

بیمار ہو یا سفر پر ہو پھر اس کے ذمے ہے شمار دوسرے دنوں سے ، اور ان لوگوں کے ذمے

يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ

جو کہ طاقت رکھتے ہیں اس روزے کی فدیہ ہے ایک مسکین کا ، جو کوئی شخص شوق کے ساتھ نیکی کرے پس وہ اس کے لیے بہتر ہے ،

وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ

تمہارا روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو ﴿۱۸۴﴾ رمضان کا مہینہ

الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ

جس میں قرآن اتارا گیا اس حال میں کہ وہ قرآن لوگوں کے لیے رہنمائی ہے اور واضح دلائل ہیں ہدایت کے

وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ

اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی چیز ، جو تم میں سے مہینے میں موجود ہو تو اس کو اس کا روزہ رکھنا چاہیے ، اور جو کوئی

مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا

بیمار ہو یا سفر پر ہو پھر اس کے ذمے ہے شمار دوسرے دنوں سے ، ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق آسانی کا اور نہیں

يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ

ارادہ کرتا تمہارے متعلق دشواری کا ، اور تاکہ تم پورا کر لو شمار اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اللہ نے تمہیں ہدایت دی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ

اور تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿۱۸۵﴾ اور جب آپ سے سوال کریں میرے بندے میرے متعلق پس میں قریب ہوں ، میں قبول کرتا ہوں

دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ

پکارنے والے کی پکار کو جس وقت وہ مجھے پکارے ، پس چاہیے کہ لوگ بھی میری بات کو قبول کریں اور چاہیے کہ مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ

يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ

ہدایت یافتہ ہوجائیں ﴿۱۸۶﴾ حلال کردیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات کو اپنی بیویوں کی طرف بے حجاب ہونا ، وہ عورتیں لباس ہیں

لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ

تمہارے لیے اور تم ان کے لیے لباس ہو ، اللہ کو معلوم ہے کہ بے شک تم خیانت کرتے ہو اپنے نفسوں سے

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ

اللہ نے تم پر توجہ کی اور تمہیں معاف کیا ، پس ان کے ساتھ مل جل لیا کرو اور طلب کرو اس چیز کو جو لکھ دی

اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ

اللہ نے تمہارے لیے ، کھاتے رہو پیتے رہو یہاں تک کہ واضح ہوجائے تمہارے لیے سفید دھار

مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا

فجر کی سیاہ دھاری سے ، پھر پورا کیا کرو روزے کو رات تک ، اور نہ

تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

ملاجلا کرو ان عورتوں کے ساتھ اس حال میں کہ تم اعتکاف کرنے والے ہو مساجد میں ، یہ اللہ تعالیٰ کے ضابطے ہیں

فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ ، اسی طرح سے واضح کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات لوگوں کے لیے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں ﴿۱۸۷﴾

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

اور نہ کھایا کرو اپنے مال آپس میں غلط طریقے سے اور نہ پہنچایا کرو وہ مال حکام تک

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

تاکہ کھالو تم لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ حالانکہ تم جانتے ہو ﴿۱۸۸﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

احکام کی جزئیات کی تفصیل آپ کے سامنے شروع ہے اصول بر (نیکی) ذکر کرنے کے بعد پہلے قصاص کا حکم ذکر کیا گیا تھا جس کا تعلق جان کی حفاظت کے ساتھ ہے جیسے کہ اس کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا تھا "ولکم فی القصاص حیوۃ یٰا ولی الالباب" سے معلوم ہو گیا کہ جان کے بچاؤ کے لیے یہ قانون قصاص نافذ کیا گیا ہے اگر تم اس کے اوپر عمل کرو گے تو تمہاری جانیں بچ جائیں گی، اس قانون کے ڈر سے کوئی شخص دوسرے کو قتل نہیں کرے گا اور پھر اس کے بعد مالی تقسیم کے متعلق ضابطہ ذکر کیا گیا تھا خاص طور پر ورثہ کے بارے میں جو لوگ اس وقت غلط طریقے اختیار کیے ہوئے تھے اس کی اصلاح کی گئی تھی۔

اب یہاں روزے کا ذکر آ گیا اور اس رکوع کے اختتام میں جس طرح سے آپ نے آیت کا ترجمہ سنا پھر مال کے متعلق ایک حکم ہے مالی تصرفات کے متعلق ہدایت دی گئی ہے درمیان میں یہاں ذکر آ گیا روزے کا، روزہ اصل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مصلحانہ عبادت ہے جس کے ساتھ انسان کے نفس کی اصلاح ہوتی ہے اور قتل وغارت مال کا غلط استعمال، حرص لالچ اور اس قسم کی شہوات پرستی یہ مال کے اندر گڑ بڑ کرنے کا راستہ کھولتی ہے انسان کو برانگیختہ کرتی ہے اور روزہ نفس کے جذبات کو قابو کرنے کا ایک ذریعہ ہے اس کے ذریعے سے انسان کے نفس کی اصلاح ہو جاتی ہے، اپنے آپ پر قابو پانے کا طریقہ روزہ رکھنا ہے، یہ صبر کا باعث بنتا ہے اس لیے شہر رمضان کو شہر صبر بھی کہا جاتا ہے تو درمیان میں اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو ذکر فرمایا جب کوئی شخص روزے کی حقیقت کو حاصل کرے گا تو اس کو اپنے نفس پر، خواہشات پر پابندی لگانے کی طاقت حاصل ہو جائے گی، نہ پھر وہ غصے کی حالت میں بے قابو ہو سکتا ہے اور نہ وہ حرص و لالچ کے اندر بے اعتدالی اختیار کر سکتا ہے۔

روزہ کا حکم تمام شریعتوں میں:

اور بالاتفاق روزہ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے، جیسے نماز فرض ہے، زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح سے روزہ بھی فرض ہے یہاں اس کی فرضیت اور اس کے کچھ احکام بیان کیے جا رہے ہیں پہلی آیت کا مضمون صاف ہے، اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کر دیا گیا جیسے کہ فرض کیا گیا تم سے پہلے لوگوں پر اس میں اشارہ کر دیا کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی شریعتوں میں سے ہر شریعت کے اندر اس کا حکم رہا ہے جیسا کہ

تفاصیل کے اندر موجود ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں سب کی شریعت میں روزے کا ذکر تھا چاہے اس کے احکام میں فرق ہو تعداد میں فرق ہو کہ کتنے رکھے جاتے تھے، کیسے رکھے جاتے تھے اس میں فرق تھا جو خصوصیات جو احکام جو حد بندی ہمارے روزوں میں ہے اس طرح سے پہلے نہیں تھی۔

لیکن بہر حال روزہ فرض تھا تو یہ ایک ایسی عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ابتداء میں مشروع کی ہے۔

روزہ کا مقصد:

اور یہ فرض اس لیے کیا گیا تا کہ تم تقویٰ حاصل کرلو، تقویٰ حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب روزے رکھو گے تو اس طرح سے آہستہ آہستہ اپنی خواہشات کے اوپر کنٹرول کرنے کی مشق ہو جائے گی جیسے کہ روزہ جب رکھا ہوا ہو تو انسان کو بھوک لگتی ہے۔

اب گھر کے اندر اکیلا بیٹھا ہوا ہے کوئی دوسرا نہیں ہے اور کھانے کی چیزیں بھی سامنے رکھی ہوئی ہیں اب اپنا مال ہے، حلال کا مال ہے، اپنا کمایا ہوا ہے، بھوک بھی لگی ہوئی ہے بے تابی میں انسان کا جی چاہے گا کھانے کو لیکن اس تصور کے ساتھ کہ اللہ نے منع کیا ہوا ہے میں نے نہیں کھانا تو انسان کھانے سے رک جائے گا پیاس لگی ہوئی ہوگی ٹھنڈا پانی موجود ہوگا، گرمی کا موسم ہے، کوئی دیکھنے والا نہیں دروازے بند ہیں لیکن انسان اس تصور کے ساتھ پانی نہیں پیئے گا کہ اللہ نے منع کیا ہوا ہے میں اس وقت پانی نہیں پی سکتا۔

اور ایسے ہی دوسری شہوات ابھریں اور بیوی بھی پاس موجود ہو باوجود اس بات کے کہ اصولاً وہ حلال ہے لیکن اللہ کی طرف سے پابندی عائد ہونے کے تصور سے وہ اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کرے گا یہ وقتاً فوقتاً جب اس کے جذبات اس طرح سے ابھریں گے اور اس تصور کے ساتھ اس کے اوپر پابندی لگائی جائے گی تو انسان کو ایک روحانی قوت حاصل ہو جاتی ہے مشق ہو جائے گی کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ روزے کے دن میں اگر آپ اللہ کے حکم کے ساتھ کھانا چھوڑ سکتے ہیں، پینا چھوڑ سکتے ہیں اور اپنی حلال بیوی کی طرف توجہ کرنا چھوڑ سکتے ہیں تو آخر وہی اللہ رات کو بھی ہے اور وہی اللہ رمضان شریف کے علاوہ باقی ایام میں بھی ہے تو رمضان شریف کے روزوں میں تو احتیاط کریں، پرہیز کریں، اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ بھوک برداشت کریں، پیاس برداشت کریں، اپنے جذبات کو دبالیں اور باقی گیارہ مہینے پھر پرواہ نہ کریں اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے روزے کی حقیقت کو سمجھا نہیں ہے روزہ سال کے بعد گیارہ مہینوں کے بعد ایک مہینہ پریکٹس کا ہے

کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے علم کی اور اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی عظمت کی پریکٹس کروائی جاتی ہے اگر کوئی شخص سوچ سمجھ کر رمضان شریف کا مہینہ گزارے اس تصور کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے چاہے کوئی دوسرا نہ دیکھے تو مجھے نافرمانی نہیں کرنی چاہیئے ،خلوت میں نہیں کرنی چاہیئے ،علیحدگی میں نہیں کرنی چاہیئے ،چاہے کوئی دوسرا دیکھنے والا نہیں لیکن اللہ دیکھ رہا ہے۔

اس تصور کے ساتھ اگر رمضان شریف کا مہینہ گزارے گا تو یقیناً انسان کے اندر گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے انسان متقی اور پرہیز گار ہو جاتا ہے اور جتنی مشق اس عبادت میں ہے اتنی کسی دوسری چیز میں نہیں ہے تو متقی بننے کے لیے تمہیں روزوں کا حکم دیا گیا ہے۔

بیماری یا سفر کی وجہ سے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا:

چند گنتی کے دن روزے رکھ لیا کرو، اس کی تفصیل آگے آ گئی کہ اس کا مصداق شہر رمضان ہے لیکن اس میں بھی اتنی رعایت کردی گئی کہ جو تم میں سے بیمار ہو ایسا بیمار جس کو روزہ نقصان دیتا ہے، مرض بڑھنے کا خطرہ ہے یا ہلاکت کا خطرہ ہے یا سفر پر ہے اور سفر کی تفصیل شریعت میں آ گئی عام سفر مراد نہیں کہ گھر سے نکلے اور روزہ چھوڑنے کی اجازت مل گئی یہ تمام فقہاء کے نزدیک باجماع امت ایک لمبا سفر مراد ہے جس کی عام طور پر ہمارے ہاں مقدار آج کل کے حساب سے اڑتالیس میل (۴۸) ہے اور پرانے زمانے کے حساب سے تین منزل کہ اتنا سفر جو انسان تین دن میں طے کرتا ہے تین منزلیں اس کا اندازہ آج کل اڑتالیس میل ہے اور پرانے زمانے کے حساب سے تین منزل کہ اتنا سفر جو انسان تین دن میں طے کرتا ہے اتنے سفر پر اگر انسان نکلے تو پھر اس روزے کی قضا کرنی جائز ہے ''فعدۃ من ایام اخر''میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ وقتی طور پر چھوڑنے کی اجازت ہے۔

لیکن یہ گنتی بعد میں پوری کرنی ہوگی ،گنتی پوری کرنی ہوگی اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ وہ روزے قضاء کرنے تب ہی ضروری ہوں گے جب اتنے دن انسان کو مل جائیں اگر بیماری کی وجہ سے ایک مہینہ روزے چھوٹے تو پھر ایک مہینہ تندرست رہے تو تب اس کے اوپر مہینے کی قضاء آئے گی اگر وہ پندرہ دن تندرست رہا اور پندرہ دن کے بعد وہ مر گیا یا دوبارہ پھر بیمار ہو گیا تو ایسی صورت میں وہ روزے پھر وہی حکم اختیار کرلیں گے وقت ملے گا تو قضا ہے مسافر سفر سے واپس آ کر جتنے دن گھر ٹھہرے گا اتنے دن کے روزے اس کے ذمے ہیں اور اگر گھر آیا تھا روزے سفر میں دس چھوٹے تھے اور چار دن کے بعد وہ مر گیا تو باقی چھ اس کے ذمے سے ساقط ہیں کیونکہ اس کو قضا کرنے کا موقع ہی نہیں ملا جتنا وقت ملے گا اتنے دنوں کی قضا اس کے ذمے ہوگی، دوسرے دنوں سے گنتی اس کے ذمے ہے شمار اس کے ذمے ہے۔

روزوں کے فدیہ کا حکم:

" وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام "اس آیت کی تاویل عام طور پر مفسرین نے اس طرح کی ہے کہ جب رمضان شریف کے متعلق روزہ رکھنے کا حکم آیا تو لوگ چونکہ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے تو اللہ تعالیٰ نے تدریجاً ان کو عادی بنایا ابتداء ابتداء میں یہ حکم دے دیا گیا کہ باوجود اس بات کے کہ تم روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو لیکن روزہ رکھنا نہیں چاہتے کسی وجہ سے طبیعت آمادہ نہیں ہے تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے دے دیا کرو یہ روزے کے قائم مقام سمجھا جائے گا تو پھر ترجمہ اس طرح سے ہوگا کہ اس شخص کے ذمے جو اس روزے کی طاقت رکھتا ہے فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا جس کی تشبیہ روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہوگی کہ طاقت رکھتا ہے لیکن روزہ رکھنا نہیں چاہتا وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ کے دے دے تو اس کے ذمے سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔

لیکن بعد میں باتفاق امت اس طرح سے یہ اجازت باقی نہیں رہی بوڑھے کے لیے باقی ہے اور اسی طرح سے ایسے مریض کے لیے باقی ہے کہ جس کے تندرست ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی یعنی جن کو روزے دوبارہ رکھنے کی طاقت کی توقع نہیں ہے ایسے لوگوں کے لیے فدیہ دینے کا حکم باقی ہے کہ روزے کے قائم مقام فدیہ دے دیا کریں باقی تندرست کے لیے، صحت مند کے لیے روزے رکھنے فرض ہوں گے وقت پہ نہیں رکھ سکتا تو پھر دوسرے وقت میں قضا کرے اب فدیہ روزوں کا قائم مقام نہیں ہے، یہ اجازت منسوخ ہوگئی اور اس کو اس آیت سے منسوخ کیا گیا جو آگے آئی۔

" فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ "اسی لیے دوبارہ وہ لفظ لوٹا دیئے گئے کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ روزے رکھا کرو اس میں مریض اور مسافر کے لیے وہی اجازت باقی ہے اور طاقت ور کے لیے اجازت ختم کر دی گئی ہے "ومن کان مریضاً اوعلیٰ سفر "اس آیت کا اعادہ اس لیے کیا گیا ہے کہ جب روزہ رکھنے کا حکم دے دیا کہ جو بھی اس مہینے میں موجود ہے اس کو روزہ رکھنا چاہیئے۔

اب فدیہ دینے کی اجازت نہیں ہے اگر یہ حکم عام آجاتا تو پھر معلوم ہوتا کہ مسافر کی جو اجازت تھی وہ بھی منسوخ ہوگئی، مریض کو جو اجازت تھی وہ بھی منسوخ ہوگئی، طاقت ور کو اجازت تھی وہ بھی منسوخ ہوگئی، جو شخص بھی اس مہینے کے اندر موجود ہو اس کو روزہ رکھنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ نے منسوخ کیا ہے صرف طاقت ور کے لیے، مریض اور مسافر کے لیے اجازت باقی ہے اس لیے وہ آیت دوبارہ ذکر کر دی گئی تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ رعایت بحال ہے عام طور پر تو مترجمین نے مفسرین نے تفسیر اسی طرح سے کی ہے اور روایات کے ساتھ اس کی تائید بھی ہے

روایات حدیث سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ پہلے پہلے یہ وسعت کردی گئی تھی کہ طاقت کے باوجود جو شخص روزہ نہ رکھے روزے کے قائم مقام وہ فدیہ دے دے تو فدیہ سے وہ فرض ساقط ہو جاتا تھا۔

شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

لیکن حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے ایک اور تاویل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ فدیہ سے مراد یہاں جس کی تفصیل آگے طعام مسکین کی گئی ہے صدقۃ الفطر ہے اور یہ "یطیقونہ" کی ضمیر بظاہر قبل از ذکر ہے لیکن نیت میں چونکہ "طعام مسکین" اور فدیہ مقدم ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ "علی الذین" خبر مقدم ہے "فدیۃ طعام مسکین" یہ مبتدا مؤخر ہے ایسے طور پر ضمیر جس میں لفظاً تو اضمار قبل الذکر ہے معناً اضمار قبل الذکر نہیں ہے ضمیر پہلے آسکتی ہے نحو کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں تو اصل میں یوں عبارت تھی "فدیۃ طعام مسکین علی الذین یطیقونہ" تو جب مبتدا چونکہ رتبتاً مقدم ہوتا ہے اور متکلم کے ذہن میں مقدم ہوتا ہے اس لیے اس کی طرف ضمیر لوٹائی جاسکتی ہے چاہے اس کا پہلے ذکر آیا ہوا نہیں یہ اضمار قبل الذکر لفظاً و معناً دونوں طرح سے نہیں ہے۔

بلکہ صرف لفظاً ہے معناً نہیں تو مطلب یہ ہوا کہ جو شخص طعام مسکین دینے کی طاقت رکھتا ہے، فدیہ دینے کی طاقت رکھتا ہے جس کی مقدار مسکین کا کھانا ہے اس کے ذمے کھانے کا ادا کرنا ہے اس کو چاہیئے کہ مسکین کا کھانا ادا کرے یعنی روزے کے ساتھ ساتھ یہ صدقۃ الفطر کا ذکر بھی آگیا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے ان الفاظ کی تعبیر اس طرح سے کی ہے تو ضمیر ذکر ہوگئی لیکن بعد میں "فدیۃ طعام مسکین" کے ساتھ اس ابہام کی وضاحت ہوگئی جو بظاہر ضمیر کے اندر پیش آرہا تھا اور اس طرح سے تمام زبانوں میں ہوتا رہتا ہے کہ ایک ضمیر ذکر کردی جاتی ہے اور جب اس کے متصل اس کی وضاحت کردی جاتی ہے تو پھر پہلے اس ضمیر کا لے آنا کوئی نقصان دہ نہیں ہوتا۔

لیکن ذہناً وہ مقدم ہے چاہے لفظوں کے اندر اس کو مؤخر ہی ذکر کر دیا گیا ہو جیسے اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر آتا ہے اس میں یہی اصول استعمال کیا گیا ہے اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

تہذیب مغرب سیکھ کر دیکھا تو یہ کافور تھی
اب میں سمجھا کہ واقعی داڑھی خدا کا نور تھی

اب دوسرے مصرعے سے معلوم ہوا کہ پہلے مصرعہ میں جو "یہ" ہے اس کا مصداق داڑھی ہے یعنی جب ہم نے تہذیب مغرب سیکھی تو یہ غائب ہوگئی، اب ہمیں معلوم ہوا کہ واقعی داڑھی اللہ کا نور تھی کہ تہذیب مغرب کی ظلمت آئی تو یہ چلی گئی تو اس طرح سے اشارہ پہلے مصرعے کے اندر ہے اور اس کا مصداق اگلے جملے میں واضح ہو رہا ہے

تو اسی طرح سے یہاں بھی ذہناً چونکہ مقدم ہے متکلم کے ذہن میں ہے کہ داڑھی کے متعلق بات کرنا چاہتا ہے مگر پہلے اشارہ ہوگیا یا پہلے ضمیر آگئی تو اس سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوا یہاں بھی ذکر چونکہ طعام مسکین کا کرنا ہے جو ذہن میں پہلے موجود ہے ضمیر اگر اس کی طرف لوٹا دی گئی تو یہ معناً اضمار قبل الذکر نہیں ہے چاہے لفظوں میں اضمار قبل الذکر ہے تو پھر مطلب یوں ہوگیا کہ اگر ضمیر نہ لائی جاتی تو عبارت یوں ہوتی ''علی الذین یطیقون طعام مسکین فدیۃ طعام مسکین '' جو طعام مسکین دینے کی طاقت رکھتے ہیں ان کے ذمے طعام مسکین ہے۔

اب یہ طعام مسکین میں تکرار ہو جاتا ہے تو اس تکرار سے بچنے کے لیے یہی صورت اختیار کی گئی کہ یہ اضمار کر دیا گیا پہلے اور آگے جب اس کا ذکر آگیا تو اس سے تفصیل سامنے آگئی تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو محمول کیا ہے صدقۃ الفطر پر، اگر اس کو صدقۃ الفطر پر محمول کر دیا جائے تو پھر اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ عام طور پر یہی آیتیں ہیں جن کو منسوخ قرار دیا جاتا ہے لیکن ان میں سے بھی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض آیتوں کی تاویل کر دی اور تاویل کرنے کے بعد صرف چار یا پانچ آیتیں ایسی ہیں جن کو انہوں نے منسوخ مانا ہے تو اس آیت کو عام طور پر مفسرین منسوخ قرار دیتے ہیں اس آیت کے ذریعے سے کہ طاقتور کو جو مسافر بھی نہیں مریض بھی نہیں طاقت ور ہے، روزہ رکھنے کی طاقت ہے اس کو بھی پہلے پہلے اجازت تھی کہ فدیہ دے سکتا ہے روزہ نہ رکھے روزے کے قائم مقام فدیہ ہو سکتا ہے یہ اجازت منسوخ ہے اگلی آیت کے ذریعے سے۔

لیکن جب شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تاویل لے لی جائے گی تو پھر اب اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہیں یہ اب بھی باقی ہے تو عام طور پر مفسرین اس کو منسوخ قرار دیتے ہیں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ تاویل کر دی ''فمن تطوع خیراً '' جو کوئی نیکی کا کام خوشی سے کرے'' فھو خیر لہ '' تو اس کے لیے بہتر ہے یعنی ذمے تو ہے ایک مسکین کا کھانا، فدیہ دو وقت اس کو کھانا دو یا مقدار نصف صاع گندم ایک صاع کھجور جیسے تفصیل آپ فقہ کے اندر پڑھتے ہیں وہ دے دو اور گر خوشی کے ساتھ اس میں اضافہ کر دو زیادہ دے دو تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر چہ روزہ چھوڑنے کی اجازت دے دی گئی لیکن روزہ رکھنا تمہارا زیادہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تمہیں علم ہو، اگر تم علم رکھتے ہو روزے کی حقیقت کو سمجھ جاؤ تو روزہ رکھنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔

رمضان کی شان:

شھر رمضان یہ ''ایام معدودات'' کی تفصیل آگئی وہ ''ایام معدودات'' کیا ہیں ''ھو شھر رمضان'' وہ رمضان کا مہینہ ہے ''الذی انزل فیہ القرآن'' جس میں قرآن اتارا گیا گویا کہ رمضان کے مہینے میں یہ دوسری

فضیلت ہوئی کہ قرآن کریم کا نزول اسی میں ہوا دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”انا انزلناہ فی لیلۃ القدر“ ہم نے اس قرآن کو لیلۃ القدر میں اتارا اور یہاں آ گیا کہ قرآن رمضان کے مہینے میں اتارا گیا دونوں آیتوں کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے تو جب رمضان میں ہے تو جو لیلۃ القدر میں اترا وہ رمضان میں بھی اترا۔

تو یہاں ذکر صرف قرآن کریم کا ہے اور روایات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جتنی کتب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں ہیں سب اسی مہینے کے اندر اتاری گئیں ہیں باقی کتب چونکہ مجموعی طور پر ہی اس نبی کو دے دی گئیں جس نبی پر اتریں مجموعی طور پر دے دیں گئیں قران تھوڑا تھوڑا اترا اس لیے آپ نے نور الانوار میں اور دوسری کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ دفعتاً اس کا نزول رمضان شریف میں ہوا یعنی لوح محفوظ سے نقل کر کے آسمان دنیا پر پہنچا دیا گیا اور وہاں سے پھر قلیل قلیل مقدار تیئس سال (۲۳) میں سرور کائنات ﷺ کے اوپر زمین پر اتری یہ سارے کا سارا رمضان میں نہیں آیا لوح محفوظ سے اس کو منتقل کیا گیا رمضان شریف میں گویا کہ دفعی نزول اس کا رمضان شریف میں ہوا۔

اور لیلۃ القدر میں ہوا تو وہ رات رمضان شریف میں تھی، وہ کون سی رات تھی اس کی تعیین نہیں کی جا سکتی اس میں ابہام ہے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چوبیس رمضان کی رات تھی جس میں قرآن کریم کو اتارا گیا تو چوبیس کی رات کو لیلۃ القدر کہنا پڑے گا لیکن پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس رمضان میں جس میں اس کا نزول ہوا لیلۃ القدر چوبیس کو تھی اور باقی رمضان کے اندر تبدیل ہوتی رہتی ہے جیسے کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی شان:

قرآن کریم کی شان بیان کر دی گئی کہ لوگوں کے لیے یہ ہادی ہے اور ہدایت کے لیے ہر ہر جزء اس کا واضح دلالت ہے، بین ہے، واضح ہے ”من الھدی و الفرقان“ کو بینات کے ساتھ لگاؤ تو یہ ہدایت اور فرقان کی واضح دلیلیں ہیں یا واضح دلالت کو علیحدہ کر لو کہ اس کا ایک ایک جزء واضح دلالت ہے یہاں بات ختم ہو گئی۔

آگے ”من الھدی والفرقان“ یہ ایک نئی صفت ہوئی قرآن کی ” فمن شھد منکم الشھر “ جو تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو اسے چاہیئے کہ وہ روزہ رکھے، اس سے وہ اجازت منسوخ ہو گئی اور روزے کو لازم قرار دے دیا گیا شھد کا معنیٰ موجود ہے، اس نے اس زمانے کو پالیا مکلف ہونے کی حالت میں جب کہ وہ معذور نہیں عقل مند ہے بالغ ہے ایسی صورت میں وہ اس مہینے میں موجود ہے تو اس کو روزہ رکھنا چاہیئے۔

لیکن مسافر اور مریض کے لیے اجازت بحال ہے کہ وہ اس مہینے میں روزہ چھوڑ سکتا ہے بعد میں گنتی پوری کر لے تو جو مسافر نہ ہو مریض نہ ہو اور مکلف ہے مہینے کے اندر موجود ہے ایسی صورت میں روزہ اس کے ذمے فرض ہے جو کوئی مریض ہے یا سفر پر ہے اس کے ذمے گنتی وشمار دوسرے دنوں سے ہے۔

اللہ اپنی مخلوق سے آسانی کا ارادہ کرتا ہے:

"یرید الله بکم الیسر" اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے، یہ احسان جتلایا جارہا ہے کہ احکام دیے تمہارے فائدے کے لیے اور اس میں بھی آسانی کی رعایت رکھی معذور کو اجازت دے دی کہ روزہ چھوڑ دے، اللہ تعالیٰ کوئی دشواری کا ارادہ نہیں کرتا کہ ایک حکم دے کر اس کے اندر کوئی آسانی کی تدبیر نہ رکھتا۔

بلکہ اس کا پورا کرنا ہر صورت ضروری ہوتا ایسا نہیں کیا گیا اور یہ احکام جو اللہ نے تمہیں دیے ہیں جن کی تفصیل تم نے اوپر سن لی تاکہ تم گنتی اور شمار پورا کر لو مثلاً اس میں یہ حکم بھی آیا کہ جو چھوٹ جائیں اس کی قضا کر لو اب اگر قضا کا حکم نہ دیا جاتا تو جو روزے چھوٹ گئے تھے اس کا شمار پورا کرنے کے لیے کوئی صورت نہ ہوتی اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا، اجازت دے دی تمہیں کہ دوسرے دنوں میں قضا کر لیا کرو تاکہ تم اس گنتی کو پورا کر لو اور یہ سارے احکام جو دیے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کا احسان اور اس کی شفقت ہر طرح سے نمایاں ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس طریقہ پر جو تمہیں بتادیا کہ روزہ رکھ کر تم یہ فوائد حاصل کرو جو چھوٹ جائیں تو بعد میں قضا کر کے فوائد حاصل کر لو یہ جو تمہیں ہدایت دی ہے تمہیں طریقہ بتایا ہے ان کمالات کے حاصل کرنے کا اس میں اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اللہ کے شکر گزار ہو جاؤ اور اللہ کا احسان مانو یہ ان احکام کے ذکر کرنے کے بعد متوجہ کر دیا کہ ان احکام کی وجہ سے اللہ کا احسان مانو، اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیسے کیسے طریقے بتائے جو طریقے تمہارے لیے مفید ہیں روحانی فضائل حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور عذر کی بناء پر چھوٹ جائیں تو طریقہ بتادیا کہ کس طریقے سے تم ان فوائد کو حاصل کر سکتے ہو۔

واذا سألك عبادي عني فاني قريب کا مفہوم:

"واذا سألك عبادي عني فاني قريب" یہ درمیان میں ایک دعا کے ادب کے طور پر بات ذکر کر دی سرور کائنات ﷺ سے بعض لوگوں نے پوچھا تھا کہ یہ ذکر آیا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو تو یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کو کیسے پکاریں، اگر وہ دور ہے تو ہم اس کو بلند آواز سے پکاریں، قریب ہے تو ہم اس کو آہستہ آہستہ پکاریں۔

کیونکہ یہ نئی چیزیں دی جا رہی تھیں اللہ تعالیٰ کی معرفت واضح ہو رہی تھی لوگوں کے دلوں میں جس طرح کے اشکالات آتے تھے اپنی سادگی کے ساتھ وہ حضور ﷺ کے سامنے واضح کر دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ جب یہ بندے سوال کریں تو ان کے سامنے یہ بات واضح کر دو کہ میں تو بالکل قریب ہوں، اس لیے میرے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ یہاں مفسرین نے لکھا ہے کہ دعا سرًا کرنا ہی افضل ہے دعا کے اندر جہر پسندیدہ نہیں ہے، سری دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہے بمقابلہ جہری دعا کے ''اذا سالك عبادی'' جب آپ سے سوال کریں میرے بندے میرے متعلق تو میں قریب ہی ہوں، میں اس کے سوال کو سنتا ہوں میں جواب دیتا ہوں اور یا انہیں اطلاع دے دو یا انہیں یہ بات بتا دو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں ''فانی قریب'' پس میں قریب ہوں ''اجیب دعوۃ الداع'' بلانے والے کی پکار کو میں قبول کرتا ہوں جب بھی مجھے بلاتا ہے، بلانے والا جب مجھے بلاتا ہے میں اس کے بلانے کا جواب دیتا ہوں، میں اس کے بلانے کو قبول کرتا ہوں یہ آیت اپنے ظاہر کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر دعا قبول ہے جب بھی اللہ کو پکارو اللہ کو بلاؤ اللہ تعالیٰ تمہارے پکارنے کو قبول کرتا ہے۔

قبولیت دعا پر ایک اشکال کا مفصل جواب:

اس پر پھر اشکال ہوگا ظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے آپ کے دلوں میں ایک بات آئے گی کہ ہم تو بارہا دعا کرتے رہتے ہیں اور وہ قبول نہیں ہوتی اور اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دعا قبول ہے پھر اس کا کیا جواب ہے یہ اشکال قلوب میں پیدا ہو سکتا ہے اس کی تفصیل علماء کے کلام میں یوں لکھی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر یہ اپنی رحمت کا بیان ہے، جب بندہ بلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے پھر جو اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اگر اس کا دینا مصلحت ہو تو اللہ تعالیٰ وہی دے دیتے ہیں اور اگر اس کا دینا مصلحت نہ ہو یا فی الحال فی الفور دینا مصلحت نہ ہو تو کچھ دیر سے دے دیں گے جیسے بندہ کے حق میں بہتر ہوگا، وہ چیز دنیاوی مصلحت نہ ہو تو اس کے عوض میں اس جیسی کوئی اور چیز دے دیں گے، وہ چیز دینے میں حکمت اور مصلحت نہ ہو تو اس کے برابر کوئی تکلیف اور نقصان دور ہٹا دیں گے اگر ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو ذخیرہ کر کے آخرت میں ثواب پہنچا دیں گے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کو پکارنا خالی نہیں جاتا جب پکارو اس پکارنے کے اوپر اثر ضرور متوجہ ہوتا ہے دوسرے الفاظ میں آپ یوں سمجھ لیجیے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بندہ بلائے تو اللہ تعالیٰ متوجہ ضرور ہوتا ہے اور تمہاری درخواست لے لیتا ہے سمجھانے کے لیے ایک بات عرض کر رہا ہوں درخواست کے رد ہونے کی ایک صورت تو یہ

ہوتی ہے کہ تم درخواست لے کر جاؤ کسی حاکم کے دروازے پر وہ اس کو پکڑے ہی نہ ایسے ہی رد کر دے ایک یہ ردی صورت ہے ایک ہے کہ وہ درخواست اس نے لے لی تو آپ کہتے ہیں کہ درخواست ہماری قبول تو ہوگئی اب آگے اس کے اوپر کاروائی کا حاکم دیکھے گا دیکھنے کے بعد اگر مناسب سمجھے گا عدل وانصاف کا تقاضہ ہوگا تو آپ کو وہی چیز دے دے گا جس کی آپ نے درخواست دی ہے۔

ورنہ آپ کو جواب دے دیا جائے گا ایک درجے کی قبولیت یہ ہے کہ درخواست لے لی گئی اس کو زیر غور کر لیا گیا تو دنیا کے اندر تو حاکم ایسا ہے کہ وہ آپ کی درخواست ویسے ہی واپس کر دے اور آپ کو اس کے اوپر کوئی بھی فائدہ نہ پہنچائے لیکن اللہ کے ہاں ادنیٰ درجے کی قبولیت کہ آپ کی درخواست لے لی گئی یہ تو ہر کسی کے لیے ہوتا ہے جس وقت بھی وہ دعا کرے باقی اس درخواست لینے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوگی اگر وہی چیز آپ کے لیے مصلحت ہے تو وہی چیز دے دی جائے گی۔

اور بسا اوقات انسان اپنی کم علمی کی بناء پر ایسی چیز مانگ لیتا ہے جو اس کے لیے مناسب نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ مہربانی فرماتے ہیں کوئی چیز نہیں دیتے چاہے تم نے اپنے لیے مانگی تھی ایسے واقعات بہت سارے ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے لیے ایک چیز مصلحت سمجھتا ہے تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو میرے لیے نقصان دہ تھی تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بسا اوقات وہ نہیں دیتا رحمت تو اسی میں ہے یہ نہیں کہ آپ جو مانگیں دے دیا جائے یہ رحمت نہیں آپ کم علم ہیں آپ مستقبل کو جانتے نہیں اور اس چیز کے اثرات کو نہیں جانتے ہو سکتا ہے کہ آپ ایک ایسی چیز مانگ لیں جو آپ کے لیے مصلحت نہیں تو اس کا نہ دینا رحمت ہے۔

جیسے کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باپ کے پاس شہد تو بہت رکھا ہوا ہے اور بیٹا چیختا چلاتا ہے روتا ہے کہ شہد مجھے چاٹنے کے لیے دو وہ دیتا نہیں، باپ کو پتہ ہے کہ بیٹے کا مزاج گرم ہے اگر میں نے اس کو شہد چاٹنے کے لیے دے دیا تو یہ بیمار ہو جائے گا شہد کی تو کمی نہیں لیکن باپ کی جو بیٹے کے اوپر مہربانی ہے وہ اجازت نہیں دیتی کہ اس کو شہد چاٹنے کے لیے دے دیا جائے یہ مثال دینے کے بعد کہتے ہیں کہ تو اللہ سے دولت مانگتا ہے مال مانگتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تجھے مال و دولت دیتا نہیں اللہ کے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں ہے جو تجھے غنی نہیں بناتا مالدار نہیں بناتا وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے۔

اور بعض روایات میں اس کی تفصیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بندے کے متعلق میں جانتا ہوں کہ اگر میں اس کو غریب رکھوں، مسکین رکھوں محتاج رکھوں تو اس کا ایمان محفوظ ہے اور اگر اس کو مال دے دیا تو

یہ سرکش ہو جائے گا، باغی ہو جائے گا، ایمان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے گا اس بندے کے اوپر میری رحمت یہی ہوتی ہے کہ میں اس کو محتاج ہی رکھتا ہوں اور ایک بندے کا مزاج میں نے ایسا بنایا کہ اگر وہ کھاتا پیتا رہے تو ٹھیک اور اگر اس کو کسی قسم کی دقت پیش آ جائے اور وہ امتحان میں مبتلاء ہو جائے تو یہ گڑ بڑ ہو جائے گا۔

تو اللہ تعالیٰ اس کو امتحان میں مبتلاء نہیں کرتا اس کو اسی رنگ میں رکھ لیتا ہے اصل یہ ہے کہ اللہ کی رحمت وہ ہے جو بندے کے لیے بہتر ہے اللہ کی طرف سے برتاؤ وہ ہو، دوسری جگہ قرآن میں آئے گا دی اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز جو تم نے مانگی وہاں بھی یہی ہے کہ چونکہ رحمت کا بیان ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا دینا رحمت بھی ہو ورنہ ہر مانگی ہوئی چیز تمہیں دے دی جائے تو تم تو مصیبت میں پڑ جاؤ ہر دعا اگر قبول کر لی جائے آپ کو یاد ہوگا کہ جس وقت آپ چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے اور اپنی ماں کو تنگ کیا کرتے تھے تو پتہ ہے ماں بسا اوقات چیخ کر چلا کر درد دل کے ساتھ کہتی ہے کہ مرتے نہیں کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تو اگر اللہ تعالیٰ دفتر ہی کھول لیتے جو کسی کے منہ سے نکلے فوراً پورا کر دے تو تم میں سے اس وقت یہاں کوئی موجود ہوتا یہ سارے کنارے لگے ہوئے ہوتے اپنی جان کے لیے بددعائیں کرتے ہیں، اپنے مال کے لیے بددعائیں کرتے ہیں، اپنے بچوں کے لیے بددعائیں کرتے ہیں تو ایسی باتیں اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے اس کا قبول نہ کرنا ہی بہتر ہے یہ بیان ہے رحمت کا پھر وہ چیز دے دی جائے اسی وقت دے دی جائے، دیر سے دے دی جائے، اس کے برابر کوئی دوسرا نفع پہنچا دیا جائے، اس کے برابر کوئی نقصان ہٹا دیا جائے اور اگر کچھ بھی نہیں ہوگا تو یہ دعا آپ کی آخرت کے لیے محفوظ رکھ لی جائے گی اور آخرت میں اس کا اجر و ثواب مل جائے گا حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ آخرت میں وہ دعائیں جو دنیا میں قبول نہیں ہوئیں جب ان کے اوپر ثواب ملے گا تو جن کی دعائیں قبول ہوئیں تھیں یا جو دعائیں آپ کی قبول ہوئیں تھیں آپ کے دل میں تمنا ہوگی کہ ہائے کاش! ہماری کوئی دعا دنیا میں قبول نہ ہوتی تاکہ آج ہم اس کا اجر و ثواب یہاں لیتے ایک دعا کے نتیجے میں دنیا میں آپ نے روٹی حاصل کر لی۔

لیکن اگر وہی دعا محفوظ ہو جاتی اور آخرت میں ثواب مل جاتا وہ ثواب قائم ہوتا دائم ہوتا باقی رہنے والا ہوتا تو اس کے مقابلے میں یقیناً اچھا ہے، حاصل اس ساری تفصیل کا یہ ہے کہ اللہ کو پکارا ہوا ضائع نہیں جاتا جب بھی اللہ کو پکارو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے اللہ تعالیٰ توجہ فرماتے ہیں تمہاری دعا کو قبول کرتے ہیں، باقی قبول کرنے کی مختلف صورتیں ہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ جس طرح سے بندے کے لیے مصلحت حکمت سمجھتا ہے اس طرح سے برتاؤ کر دیتا ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کو پکارا ہوا ضائع نہیں جاتا یہ اس کی تفصیل ہے کہ جب بھی کوئی مجھے بلانے والا بلاتا ہے، میرا بندہ مجھ کو پکارتا ہے میں اس کے پکارنے کو قبول کرتا ہوں'' فلیستجیبوالی ''بندوں کو چاہیے کہ میرے احکام مانیں اور میرے ساتھ ایمان لائیں ایمان کی تفصیل جیسے آپ کے سامنے آتی رہتی ہے'' لعلھم یرشدون'' تاکہ وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں۔

روزے کے حکم میں ترمیم:

آگے پھر احکام کی تفصیل ہے کہ جب پہلے پہل روزے شروع ہوئے ہیں تو احکام چونکہ واضح طور پر موجود نہیں تھے تو صحابہ کرام کی عادت تھی ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے روزے کی تفصیل اسی طرح سے بیان فرمائی ہو اور ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے از خود یہ عادت اپنائی بایں معنیٰ کہ اردگرد مدینہ میں یہودی آباد تھے اور یہودیوں کے روزے کے احکام یہی تھے کہ غروب کے وقت افطار کرلیا اور افطار کرنے کے بعد سونے سے قبل قبل کھا پی سکتے تھے جو چاہیں کھالیں، پی لیں، بیوی کے پاس چلے جائیں جہاں نیند آئی تو وہاں سے روزہ شروع ہوگیا پھر سونے کے بعد اگر آنکھ کھلے تو پھر کھانے پینے کی اور کسی دوسری چیز کی اجازت نہیں تھی یہود کے روزوں کے احکام اسی طرح سے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے روزوں کی کیفیت سے عادت یہ اختیار کرلی یا ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہدایات اسی طرح سے دی گئیں اور اللہ کی تلقین کے ساتھ اس جزء کی بایں الفاظ روایات میں وضاحت نہیں اس آیت کی روشنی میں جو کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ عادت صحابہ نے اپنائی تھی حضور ﷺ کے کہنے سے اپنائی تھی یا وہ اردگرد اہل کتاب اور اہل شریعت تھے وہ روزے رکھتے تھے تو جب روزے کا حکم آیا اور اسی طرح سے حکم آیا جیسے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تو اس کی جو کیفیت معروف تھی متعارف تھی وہی اختیار کرلی گئی۔

لیکن اس میں پھر بعض اوقات گڑبڑ ہوئی، سارا دن محنت مشقت کر کے آتے جیسے یہ واقعہ پیش آیا حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی سارا دن محنت مشقت کر کے آئے، روزہ تھا جب افطاری کا وقت آیا گھر آیا تو بیوی سے پوچھتا ہے کہ کچھ کھانے کے لیے ہے، وہ کہتی ہے کہ تو تھوڑا سا انتظار کر میں کہیں سے لے کر آتی ہوں وہ اس کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے گئی اس کو اتنے میں نیند آگئی جب واپس آکر دیکھا کہ یہ سو گیا ہے تو افسوس ہوا کہ اب تو سو کے اٹھنے کے بعد یہ کھانا ٹھیک ہی نہ رہا تو اس کا دوبارہ اسی طرح سے روزہ شروع ہوگیا۔

اگلے دن مشقت کی وجہ سے اس کو غشی پڑ گئی بے ہوش ہوگیا اس قسم کی مشقت آگئی اور ایسے ہی جب خاوند بیوی نے اکٹھے رہنا ہے رات کو تو رات کو آنکھ کھلی اور طبیعت راغب ہوئی تو بعض واقعات اس قسم کے بھی پیش آگئے

اور صحابہ رضی اللہ عنہم چونکہ سمجھتے تھے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے تو یوں اپنے دل میں خیال لاتے تھے کہ ہم سے خیانت ہوگئی ایسا نہیں ہونا چاہیئے، طبیعت پر اس بات کا اثر پڑا اللہ تعالیٰ نے شفقت فرماتے ہوئے (اپنے ذہن کے اعتبار سے جس کو انہوں نے کوتاہی سمجھا تھا) وضاحت کردی کہ ہم نے اس کو معاف کر دیا آئندہ کے لیے تمہیں اجازت ہے کہ طلوع فجر تک جو چاہے کرتے رہا کرو، کھاؤ پیو بیویوں کے ساتھ رہو جس طرح سے ہو معاملہ کیا کرو اس میں کوئی کسی قسم کی پابندی نہیں ہے یہ وضاحت اگلی آیت کے اندر کر دی گئی حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات کو بیویوں کی طرف بے حجاب ہونا بیویوں کے ساتھ مجامعت کرنا ان کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کرنا۔

لیکن صرف باتیں مقصود نہیں ہیں اگلا فعل بھی مقصود ہے "ھن لباس لکم" کیونکہ بات کرنا تو اب بھی ناقض نہیں ہے، روزے کی حالت میں بھی انسان باتیں کرلیں تو باتیں کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا الی آخرہ مراد ہے وہ تمہارے لیے لباس ہیں یعنی تمہارے لیے اوڑھنے بچھونے کی طرح ہے جس طرح سے انسان کے ساتھ لباس کا تعلق ہوتا ہے وہ عورتیں تمہارے لیے لباس کی طرح ہیں اور تم ان کے لیے لباس کی طرح ہو، یہ شدت تعلق سے کنایہ ہے۔

مرد و عورت کا تعلق لباس کی طرح کیسے؟

لباس میں کیا بات ہوتی ہے لباس بدن کے لیے ساتر ہے اس کے ساتھ انسان کے وہ اعضاء چھپتے ہیں جن کا چھپانا مقصود ہے بیوی اس طرح سے انسان کے لیے ساتر ہے کہ بہت سارے طبعی جذبات بیوی کے ذریعے سے چھپتے ہیں اور اگر بیوی نہ ہو تو ان کا ظہور انسان کو رسوا کر کے رکھ دے، بیوی ان کے لیے ستر اور پردہ پوشی کا فائدہ دیتی ہے اور مرد عورت کے لیے اسی طرح سے پردہ پوشی کا فائدہ دیتا ہے جیسے لباس نہ ہونے کی صورت میں انسان ننگا ہو جائے اور اس کے عیوب نمایاں ہو جائیں جو قابل ستر چیزیں تھیں وہ ظاہر ہو جائیں تو بیوی نہ ہونے کی صورت میں بھی انسان کے باطنی عیوب نمایاں ہو سکتے ہیں اور بیوی ان کے لیے ساتر اور پردہ پوش بنتی ہے اور مرد عورت کے لیے پردہ بنتا ہے۔

اور ایسے ہی لباس زینت کا ذریعہ بھی ہے، زیب و زینت لباس کے ساتھ ہے اور بالکل اسی طرح سے انسان کی دنیاوی زندگی کے اندر زیب و زینت اور ظاہری طور پر عمدگی اگر پیدا ہوتی ہے تو یہ بھی خاوند بیوی کے آپس کے تعلقات سے پیدا ہوتی ہے اگر کسی مرد کے پاس عورت نہیں تو اس کی کوئی خانگی زندگی مزے دار اور آراستہ نہیں ہوا کرتی۔

بلکہ وہ اس طرح سے ہوا کرتا ہے جیسے خانہ بدوش مسافر جہاں بیٹھ گیا بس بیٹھ گیا کوئی رغبت ہی نہیں ہوتی کہ فلاں جگہ رہتا ہے وہاں ہمارا ٹھکانہ ہے یہ رغبت ٹھکانہ جو بھی مہیا ہوتا ہے یہ سارے کا سارا بیوی کے تعلق کے ساتھ ہوتا ہے، وہ بے گھونسلہ پرندے کی طرح جہاں جس شاخ پر بیٹھ گیا بیٹھ گیا اور گھر آنے کی تمنا اور گھر آنے کی خواہش اسی تعلق سے ہوتی ہے ورنہ پھر جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے جدھر چلے گئے چلے گئے جس طرح سے کسی پرندے کا کوئی گھونسلہ نہ ہو جس طرح سے خانہ بدوش قسم کے آدمی ہوا کرتے ہیں۔

''وابتغوا'' اور تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی، اس عمل کے نتیجے میں لکھ دی اولاد وغیرہ اس کو طلب کرو یا یہ جو قانون اجازت اللہ نے لکھ دیا ہے اب اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر کرو بیان القرآن میں یہی دوسرا مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے جو تمہارے لیے قانون اجازت لکھ دیا ہے اس کو طلب کرو یعنی اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

روزے کی ابتداء اور انتہاء:

''کلوا واشربوا حتیٰ'' یہ حتیٰ کے ساتھ جو غایت ذکر کر دی گئی تو ''کلوا واشربوا'' یہ استحباب کے لیے ہے پابندی اٹھانے کے لیے کہ پہلے جو ممانعت سمجھتے تھے اب وہ پابندی اٹھ گئی کھا سکتے ہو پی سکتے ہو حتیٰ کہ تمہارے لیے طلوع فجر ہو جائے، کھاتے رہو پیتے رہو یہ اباحت ہے کھاتے رہو پیتے رہو اپنی طبیعت کی رغبت کے مطابق کھانا پینا ضروری نہیں کھا سکتے ہو۔

اب کوئی پابندی نہیں ہے کھاتے رہو پیتے رہو حتیٰ کہ واضح ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاری فجر کی رات کی سیاہ دھاری سے، فجر کی سفید دھاری واضح ہو جائے اس وقت تک تم کھا پی سکتے ہو واضح ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں یقین حاصل ہو جائے کہ طلوع فجر ہو گئی یقین کے بعد پھر کھانا پینا ٹھیک نہیں ہے جس وقت تک شک ہے کہ فجر ہوئی یا نہیں ہوئی گنجائش ہے۔

لیکن جب یقین ہو جائے کہ طلوع فجر ہو گئی تو پھر اس کے بعد کھانے پینے کی اجازت نہیں اور اگر شک کی حالت میں کھا پی لیا بعد میں معلوم ہو گیا کہ جب ہم نے کھایا تھا طلوع فجر ہو چکی تھی تو انسان گناہ گار نہیں ہوگا لیکن روزے کی قضا کرنا پڑے گی فقہ کے اندر ان احکام کی تفصیل موجود ہے تو اس سے احتیاط اسی میں ہے کہ شک کی کیفیت پیدا ہونے سے پہلے پہلے انسان رک جائے لیکن اگر یقین آنے سے پہلے پہلے اس نے کھا پی لیا اور بعد میں

کوئی تحقیق نہیں ہوئی کہ جب ہم نے کھایا تھا طوع فجر ہو چکی تھی یا نہیں تو روزہ صحیح ہے اور یقین ہو جانے کے بعد جب یہ روشنی اچھی طرح سے واضح ہو جائے یقین ہو گیا تو اس کے بعد کھانا پینا ٹھیک نہیں ہے ''ثم اتموا الصیام الی اللیل'' پھر روزے کو پورا کر لیا کرو رات تک، غروب شمس تک روزے کی غایت ہے، روزے میں رات کو ملنے جلنے کی جو اجازت دے دی اس پر پابندی لگا دی کہ اگر اعتکاف کر لو مسجد میں تو اعتکاف کی راتوں میں بھی بیویوں سے ملنا ٹھیک نہیں ہے گفتگو کر سکتے ہو، بیٹھ اٹھ سکتے ہو لیکن بدن کو بدن کے ساتھ لگانا مباشرت یہ ٹھیک نہیں ہے روزے کی راتوں میں انسان مباشرت کر سکتا ہے۔

لیکن اعتکاف کی حالت میں پابندی ہے نہ مباشرت کیا کرو ان عورتوں کے ساتھ، اپنے بدن نہ لگاؤ ان عورتوں کے ساتھ اس حال میں کہ تم اعتکاف کرنے والے ہو مسجد میں یہ بھی کنایۃ اسی مجامعت سے ہے، یہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے ہیں ان کے قریب نہ جاؤ یعنی ان کی مخالفت تو اپنی جگہ مخالفت کے قریب نہ جاؤ، توڑو نہیں، ان ضابطوں کی رعایت رکھو ''کذلک یبین اللہ آیتہ'' اسی طرح سے اللہ تعالیٰ اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے لوگوں کے لیے ''لعلھم یتقون'' تاکہ وہ تقویٰ حاصل کریں۔

اموال کو باطل طریقے سے کھانے کی مختلف صورتیں:

''ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل'' نہ کھاؤ تم اپنے اموال آپس میں باطل طریقے کے ساتھ اور نہ ڈالو ان اموال کو حکام کی طرف، اللہ تعالیٰ نے ایک حکم تو یہاں پر یہ دیا کہ اپنے اموال آپس میں ناجائز، حرام اور باطل طریقوں کے ساتھ مت کھاؤ، اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسب مال اور حصول مال کے اللہ تعالیٰ نے کچھ طریقے جائز بتائے ہیں اور کچھ طریقے ایسے ہیں جو ناجائز ہیں، چوری والا طریقہ ڈکیتی والا طریقہ یہ ناجائز، رشوت والا طریقہ ناجائز، البتہ جو جائز طریقے ہیں کہ آدمی خرید وفروخت کے ذریعے، محنت مزدوری کے ذریعے، اسی طرح صنعت وحرفت کے ذریعے، اجارہ کے ذریعے، شرکت ومضاربت کے ذریعے، کھیتی باڑی کر کے یہ جو مختلف جائز ذرائع ہیں ان میں سے کوئی ذریعہ اختیار کر کے اس کے ذریعہ سے مال کمائے، لیکن جو باطل اور ناجائز طریقے ہیں ان کی حرمت بیان کی کہ ان باطل طریقوں سے اپنے اموال آپس میں مت کھاؤ۔

اور آگے خاص طور پر ایک باطل طریقہ کا صراحتاً ذکر کیا وہ یہ کہ حکام کو رشوت دے کر ان کو خوش کر کے کوئی ظالم دوسرے لوگوں کا مال کھائے اب جب ان کا مال ہڑپ کرے گا ان کا مال کھائے گا تو وہ جائیں گے حاکم کی طرف اور یہ حاکم کو رشوت دے کر اس کو پہلے ہی اپنا بنا لیتا ہے پہلے ہی اس کا منہ بند کر چکا ہے، پہلے نمبر پر تو یہ ہوگا کہ وہ حاکم

ان مظلوموں کی بات ہی نہیں سنے گا، اگر بات سن لی تو جب آگے پھر مقدمہ چلے گا تو اس میں ان کی جانب داری کرے گا ان کی حمایت کرے گا ان کی رعایت کرے گا اس لئے کہ وہ پیسہ لے چکا ہے تو اس طرح حکام کو رشوت دے کر حکام کی آڑ میں اور ان کے سہارے سے دوسروں کے اموال مت کھاؤ، اور نہ ڈالو تم اموال کو حکام کی طرف کسی مقصد کے لئے تاکہ لوگوں کے اموال کا ایک حصہ تم کھاؤ یعنی ان حکام کی حمایت حاصل کر کے ان حکام کی آڑ میں، ''بالاثم'' گناہ کے ساتھ۔

''وانتم تعلمون انکم مبطلون'' حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم باطل پر ہو اور تم ہو جرم کرنے والے، تم ہو ناجائز مال کھانے والے، لیکن اس کے باوجود جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ ان کے اموال پر قبضہ کرو اور کھاؤ، اس سے اللہ نے منع کیا ہے، یہ ''انتم تعلمون'' اس لئے کہا کہ ایک ہے نادانستہ طور پر کسی کا مال کھانا غیر شعوری طور پر اس میں تو گناہ نہیں، لیکن جب پتہ ہے کہ یہ فلاں کا مال ہے اور میں اس کو لوں گا تو اس پر ظلم ہوگا تو اس کے باوجود پھر بھی جھوٹ بول کر اور حکام کی حمایت حاصل کر کے، حکام کو رشوت دے کر اور اس طرح ان کا مال ظلم کر کے کھانا یہ گناہ ہے، اور بہت بڑا سخت گناہ ہے، اس کو یہاں پر کیوں ذکر کیا گیا روزوں کے اخیر میں اس لئے ذکر کیا گیا کہ ایک تو جب روزوں کا مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ تاکہ تم متقی بن جاؤ، یعنی گناہوں سے بچو، اللہ کے حکموں کی نافرمانی سے بچو تو تقویٰ میں یہ جو حب مال ہے اس مال کی ہوس ہے یہ ہے فرق ڈالنے والی چیز اس لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس مانع تقویٰ کا ذکر کر دیا کہ روزہ رکھنے سے جہاں دوسرے گناہوں سے بچو تو خاص طور پر یہ جو مال کی ہوس ہے مال کی محبت ہے جو حرام کی طرف لے جاتی ہے اس سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ اس لئے یہاں خاص طور پر اس کا ذکر کیا۔

عبادت کی قبولیت میں حلال کھانے کا بڑا دخل ہے:

نیز اس لئے بھی کہ کوئی عبادت بھی ہو اس عبادت پر مطلوبہ نتیجہ تبھی مرتب ہو سکتا ہے کہ جب آدمی حلال کھائے حرام کھا کر اگر عبادت کرتا ہے تو اس عبادت پر جو مطلوبہ مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوتا اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھی یہی حکم دیا ''یاایھاالرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا'' اللہ نے پہلے حکم دیا حلال کھانے کا اس کے بعد پھر حکم دیا ''واعملوا صالحا'' ''یاایھاالذین آمنوا کلوا من طیبات مارزقناکم واشکروا للہ'' یہاں پر بھی یہی ہے کہ ہم نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے پاکیزہ چیزیں ان سے کھاؤ اور پھر اللہ کا شکر ادا کرو۔

تو حلال روزی کا عبادت کی قبولیت میں بھی اور عبادت پر اچھے اثرات اور ثمرات مرتب ہونے پر بھی بڑا دخل ہے، اس لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب روزوں کا حکم دیا تو روزوں سے مقصود ہے تقویٰ پرہیز گاری پیدا ہو جائے، یہ مقصد تبھی حاصل ہوگا جس وقت کہ سحری کھائے تو حلال مال سے، افطار کرے تو وہ بھی حلال مال سے اور اگر حرام کے ساتھ سحری کرتا ہے، حرام مال کے ساتھ ہی افطاری کرتا ہے تو پھر ایسے حرام کھانے پینے کی صورت میں جو روزہ رکھا جائے گا تو یہ روزہ تقویٰ پیدا نہیں کرسکتا اس کا تقویٰ والا نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا اس لئے روزوں کے اخیر میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بھی بیان فرمادیا۔
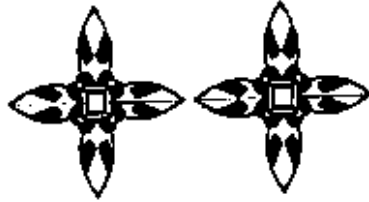
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ

سوال کرتے ہیں آپ سے چاندوں کے متعلق آپ کہہ دیجئے کہ یہ چاند لوگوں کے لیے اوقات متعین کرنے کا آلہ ہیں اور حج کے لیے، نہیں ہے

الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ

نیکی کہ آؤ تم گھروں میں ان کی پشت کی جانب سے لیکن نیکی تو اس شخص کی نیکی ہے جو اللہ سے ڈرے،

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا

آیا کرو ان گھروں میں ان کے دروازوں سے ، اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۱۸۹﴾ لڑائی کرو

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو ، بے شک اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتا

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ

حد سے تجاوز کرنے والوں سے ﴿۱۹۰﴾ اور انہیں قتل کردو جہاں بھی تم انہیں پاؤ اور انہیں نکال دو

مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ

جہاں سے تمہیں انہوں نے نکالا اور فتنہ زیادہ سخت ہے قتل سے باعتبار گناہ کے ، اور ان کے ساتھ لڑائی نہ کرو

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ

مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تمہارے ساتھ لڑائی نہ کریں مسجد حرام میں ، پس اگر وہ تم سے لڑ پڑیں

فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

تو پھر تم انہیں قتل کردو ، ایسے ہی بدلہ ہے کافروں کا ﴿۱۹۱﴾ پھر اگر وہ باز آجائیں پس بے شک اللہ تعالیٰ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ

بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۹۲﴾ اور ان سے لڑائی کرو یہاں تک کہ گمراہی نہ رہے اور ہو جائے

الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اطاعت سب اللہ کے لیے، پس اگر وہ باز آجائیں پس نہیں ہے زیادتی مگر ظالموں پر ﴿۱۹۳﴾

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ

شہر حرام شہر حرام کے بدلے میں ہے اور حرامات مساوات کی چیزیں ہیں ۔ جو کوئی

اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠

حد سے تجاوز کرے تم اس پر تجاوز کرو مثل اس کے جو اس نے تجاوز کیا تم پر ۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ

اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور خرچ کرتے رہو

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ڔ وَاَحْسِنُوْا ڔ

اللہ کے راستے میں اپنی جانوں کو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت کی طرف نہ ڈالو ۔ اور احسان کرو ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ

بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں ﴿۱۹۵﴾ پورا کرو حج کو اور عمرہ کو اللہ کے لیے ۔ اگر

اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ

تم گھیر لیے جاؤ تو تمہارے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی اور حلق نہ کروایا کرو اپنے سروں کا جب تک کہ نہ پہنچ جائے

الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ

قربانی کا جانور اپنے حلال ہونے کی جگہ کو ۔ پھر جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ

پھر اس کے ذمے فدیہ ہے روزوں سے یا صدقے سے یا قربانی سے ، پھر جس وقت تم امن میں ہو جاؤ ، پھر جو شخص فائدہ اٹھائے

بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

عمرہ کے ساتھ حج کی طرف ملا کر پھر اس کے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی ۔ اور جو ہدی نہ پائے

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ

پھر اس کے ذمے تین دن کے روزے ہیں وقت حج میں اور سات دن کے روزے ہیں جس وقت تم واپس لوٹو ۔ یہ

عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ

دس روزے ہوئے پورے ، یہ اس شخص کے لیے ہے کہ اس کے اہل رہنے والے نہ ہوں پاس مسجد

الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

حرام کے ، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ﴿۱۹۶﴾

تفسیر:

چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق سوال:

''یسئلونك عن الاھلة'' آپ سے چاندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، تفاسیر میں اس سوال کی تشریح دونوں طرح سے ہے کہ پوچھنے والوں نے یہ پوچھا تھا کہ چاند سورج کی طرح ایک ہی حالت پر کیوں نہیں رہتا یہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے یا یہ پوچھا تھا کہ گھٹنے بڑھنے میں حکمت کیا ہے؟ ان دونوں باتوں میں سے پہلی بات زمین و آسمان کی حرکت کے ساتھ، ستاروں کے نظم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اس کے متعلق جو علم ہے وہ علم نجوم یا علم ہیئت کہلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے جو جواب دیا اس میں یہ تشریح نہیں کی کہ چاند میں کمی بیشی کیوں ہوتی ہے کبھی یہ کمال کو پہنچتا ہے کبھی یہ پستی کو پہنچتا ہے کیونکہ اس کا جاننا علم شریعت کے طور پر غیر ضروری ہے۔

اور اس کو کما حقہ سمجھ لینا جان لینا اس وقت قرآن کریم کے مخاطبین کے بس کی بات نہیں تھی اگر زمین و آسمان کی حرکت پر بحث کی جاتی کہ فلاں چیز ساکن ہے، فلاں چیز گھومتی ہے تو ان کے پاس اس کی تصدیق کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط اور جو نظم اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کے اندر قائم کیا ہے، جس کی تحقیق آج کل سائنسی دنیا میں ہوگئی اس وقت اس قسم کے اسباب نہیں تھے کہ لوگ ان باتوں کی صداقت کا کسی طرح سے امتحان کر لیتے، اس قسم کی باریکیاں سمجھنا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی قرآن کریم کا یہ موضوع ہی نہیں کہ اس قسم کی باتیں بیان کرے قرآن کریم تو ہدایت کے لیے اترا ہے، سعادت اخروی کی راہنمائی کرنے کے لیے آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت عبادت بندگی اس طرح سے کرنی ہے تو اس چیز کی وضاحت قرآن کریم کرتا ہے، یہ کوئی فلسفے کی کتاب نہیں ہے، یہ کوئی ہیئت کی کتاب نہیں ہے کہ اس کے اندر اس قسم کی چیزوں کی بحث اٹھائی جائے اس لیے جواب میں حکمت بیان کر دی اگر ان کا سوال ہی حکمت کے متعلق تھا تو بھی بات واضح ہوگئی۔

اور اگر ان کا سوال حکمت کے متعلق نہیں تھا بیان حکمت کر دی گئی تو اس میں بھی نشاندہی اس بات کی طرف ہے کہ جس چیز کا تم سے تعلق ہے اس کو جانو اور جس چیز کا تعلق نہیں ہے اس کی بحثوں میں تمہیں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے چاند گھٹتا بڑھتا ہے کس وجہ سے گھٹتا ہے بڑھتا ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ اس کا یہ نظم جاری ہے۔

چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت:

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر فائدہ یہ رکھا ہے کہ لوگوں کے لیے اوقات جاننے کا ذریعہ ہے اور حج کے لیے اوقات جاننے کا ذریعہ ہے دو لفظ بولے ''مواقیت للناس والحج'' کیونکہ اوقات دو قسم کے ہیں بعضے تو ایسے ہیں کہ ان کی تعیین انسان کے اختیار میں ہے انسانی اعمال پر ان کی تعیین ہوتی ہے جیسے کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو تین مہینے عدت کے گزارنے ہیں یا آپ کسی کو قرض دیتے ہیں تو معیاد متعین کر دیتے ہیں کہ اتنے مہینوں کے بعد لیں گے معاملات کے اندر جو وقت متعین کیے جاتے ہیں یہ تو آپ کے اختیاری اوقات ہیں آپ کے عمل کے ساتھ ان کا اعتبار ہوگا۔

اور بعضے اوقات ایسے ہیں جو شریعت نے متعین کر دیے اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں رمضان کا مہینہ حج کا مہینہ اس طرح سے یہ مہینے شریعت کی طرف سے متعین ہیں اس میں کوئی تغیر تبدل انسان نہیں کر سکتا تو ''مواقیت للناس'' میں معاملات کے اندر وقت کے متعین کرنے کا آلہ ہو گیا اور الحج کے اندر عبادات کے لیے وقت متعین کرنے کا آلہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اوقات کے پہچاننے کا آلہ بنایا ہے جس کے ساتھ تم اپنے معاملات کے اندر بھی وقت کی تعیین کرتے ہو اور عبادات کے لیے بھی اس کے ذریعے سے وقت کی تعیین ہوتی ہے۔

چونکہ شریعت نے اپنی عبادت کا نظم جتنا بھی ہے وہ سارے کا سارا چاند کے مہینوں کے ساتھ لگایا ہے اور اس میں آسانی ہے اور جیسی شریعت اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے آسان شریعت اس کے مناسب یہی چاند کے مہینے ہیں سورج کے ساتھ معلوم کر لینا کہ اب کون سا مہینہ ہے کون سی تاریخ ہے یہ بہت مشکل ہے چاند چونکہ ہر مہینے نئے سرے سے شروع ہوتا ہے تو جو لوگ چاند کے ساتھ کچھ بھی دل چسپی رکھیں گے معلوم کر لیں گے کہ آج تین تاریخ ہوگئی سات ہوگئی آج چودھویں ہوگئی اب یہ آخری تاریخیں ہیں پھر نئے سرے سے نکلے گا پھر نئے سرے سے مہینہ شروع ہو جائے گا۔

اگر بالفرض تاریخ میں شبہ ہو ہی جائے تو جب نیا چاند چڑھے گا تو پھر تاریخ کا پتہ چل جائے گا کہ اب کون سی تاریخ ہے بخلاف اس کے کہ سورج کے ذریعے سے معلوم کیا جائے کہ آج مہینے کی کونسی تاریخ ہے یہ ہر کسی کے

بس کی بات نہیں ہے اس لیے شریعت نے اپنے حساب کتاب کا مدار جتنا بھی ہے وہ چاند کے مہینوں پر رکھا ہے اور دوسری جگہ قرآن کریم میں بھی یہی حکمت بیان کی گئی ہے ہم نے اس چاند کی منزلیں مقرر کی ہیں تا کہ تم ان کے ذریعے سے سالوں کو جان لو اور اپنے حساب کو جان لو۔

چاند کی تاریخوں کو یاد رکھنا فرض کفایہ ہے:

اب چاند کی تاریخ کا ضبط رکھنا اہل اسلام کے اوپر فرض کفایہ ہے اگر سارے کے سارے مسلمان ہی بھول جائیں کہ کونسا مہینہ ہے کونسی تاریخ ہے تو ساری دنیا گناہ گار ہوگی کیونکہ رمضان کی تعیین حج کی تعیین اشہر حرم کی تعیین جتنی بھی ہے وہ سب اس کے ساتھ ہی ہوتی ہے بعض جاننے والے موجود ہوں تو فرض ادا ہو گیا۔

لیکن جو چیز فرض کفایہ ہوتی ہے اس میں اگر چہ ہر شخص مکلف نہیں ہوتا جماعت میں سے غیر متعین افراد متعین ہوتے ہیں لیکن جو شخص اس کے اوپر عمل کرے گا اس کو ثواب فرض کے ادا کرنے کا مل جائے گا جیسے جنازہ فرض کفایہ ہے ہر شخص کے اوپر ضروری نہیں کہ وہ جنازہ پڑھے جماعت میں سے چند غیر متعین افراد پر ضروری ہے کہ اس کو پڑھ لیں جب چند آدمی جنازہ پڑھ لیں گے تو سب کے ذمے سے فرض اتر گیا فرض کے نا پڑھنے پر گناہ گار نہیں ہے۔

لیکن جنہوں نے جنازہ پڑھا ہے ان کو ثواب ایسے ہی ملا جس طرح کہ فرض ادا کیا جاتا ہے اس طرح سے اگر چند لوگ مہینوں کو یاد رکھیں اور تاریخ کو یاد رکھیں تو فرض تو امت کے سر سے اتر گیا لیکن جو شخص اس کا اہتمام کرے گا مہینے کو یاد رکھنے کا اور تاریخ کو یار کھنے کا اس کو ثواب ایسے ہی ملے گا جس طرح کسی فرض کی ادائیگی میں ملا کرتا ہے تو عبادات کا نظم تو ہے ہی چاند کے مہینوں کے ساتھ اس میں تو کوئی تقدم تاخر ہو ہی نہیں سکتا۔

شمسی مہینوں کی تاریخ کا استعمال غیرت اسلامی کے خلاف ہے:

باقی معاملات میں جائز ہے کہ آپ سورج کے مہینوں پر مدار رکھ لیں، جنوری فروری کا حساب کر لیں شرعاً یہ جائز ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن اگر یہ حساب بھی چاند ہی کی تاریخوں پر رکھا جائے تو مہینوں کو یاد رکھنے کا ذریعہ بھی ہے اور تاریخ کو ضبط رکھنے کا ذریعہ بھی ہے اور اسلامی مہینوں کی دوسروں کے مقابلے میں برتری کا ذریعہ بھی ہے، اسلامی غیرت کا تقاضہ بھی ہے کہ اپنے معاملات کو چاند کی تاریخوں پر ہی رکھا جائے اگر چہ یہ شرعاً ضروری نہیں دوسری تاریخیں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں، خط و کتابت میں، لین دین میں، قرض وغیرہ میں دوسری چیزوں میں اگر انسان اسلامی مہینوں پر مدار رکھے تو تاریخ یاد رہے گی مہینہ یاد رہے گا اور اسلامی مہینوں کی برتری دوسرے

مہینوں کے مقابلے میں ثابت رہے گی اس لیے اسلامی تاریخوں کا اعتبار کرے اگر چہ دوسری تاریخ استعمال کرنا جائز ہے لیکن غیرت اسلامی کے خلاف ہے تو حساب وکتاب لین دین جیسے عربی مدارس میں تنخواہوں کا سلسلہ چھٹی کا سلسلہ جو کچھ بھی ہے وہ سب عربی مہینوں پر ہی رکھا جاتا ہے وہ اسی تعلق کی بناء پر ہے یہ اسلامی مہینے کہلاتے ہیں اور جو لوگ اپنے خط وکتابت میں اور لین دین میں ان تاریخوں کا اعتبار نہیں کرتے ان مہینوں کا اعتبار نہیں کرتے جیسے کہ دوسرے کاروبار یونہی چلتے ہیں تو آپ ان میں سے کسی سے پوچھ کر دیکھ لیجئے نہ کسی کو مہینہ معلوم ہوگا نہ کسی کو تاریخ معلوم ہوگی انہیں اگر کہو کہ بارہ اسلامی مہینوں کے نام ہی بتادو تو انہیں نام بھی نہیں آئیں گے یہ عدم استعمال کی وجہ سے ہے۔

اور اگر وہ بھی اسی طرح سے استعمال رکھتے تو نام بھی یاد ہوتے، نام یاد ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی یاد رہتی فضیلت بہر حال ہے کہ اپنے خط وکتابت میں اور دوسرے معاملات میں اسی تاریخ کو استعمال کرو، آپ فرمادیجئے کہ یہ لوگوں کے لیے اوقات کے پہچاننے کا آلہ ہیں، یہ وقت کے متعین کرنے کا آلہ ہیں اور حج کے لیے اوقات کی تعیین کا آلہ ہیں۔

مشرکین کا گھروں میں پشت کی طرف سے جانا:

''ولیس البر بان تاتو البیوت من ظھورھا'' اب چونکہ حج کا ذکر آگیا تو اس حج کی مناسبت کے ساتھ بعض باتیں واضح کی جارہی ہیں کچھ احکام اور کچھ دیگر ضروری باتیں، حج چونکہ جاہلیت میں بھی ہوتا تھا، مشرک بھی حج کیا کرتے تھے ان لوگوں نے ایک عادت بنارکھی تھی کہ جس وقت وہ گھر سے حج کی نیت سے چل دیے اور احرام باندھ لیا پھر اگر کسی ضرورت کی بناء پر گھر آنا پڑ گیا تو وہ گھر کے دروازے میں سے اندر نہیں آتے تھے بلکہ پیچھے سے دیوار پھلانگ کر آتے یا پیچھے سے کوئی کھڑکی وغیرہ بنا کر گھر میں داخل ہوتے اور ایسے ہی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حج کر کے وہ واپس آتے تھے تو واپس آکر بھی وہ دروازے سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ مکان کی پشت کی جانب سے آتے تھے چاہے دیوار پھلانگ کر اور چاہے اس میں کوئی کھڑکی وغیرہ بنا کر، اس میں انہوں نے کیا حکمت سوچ رکھی تھی کس لیے یہ عادت اختیار کر رکھی تھی اس میں ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

ویسے مفسرین لکھتے ہیں ممکن ہے کہ ان کا یہ خیال ہو کہ جس دروازے سے ہم گناہوں کا بوجھ لے کر نکلے تھے تو اب پاک صاف ہو کر آئے ہیں تو ہم اس دروازے سے اندر نہ آئیں جیسے کہ ننگے طواف کرنے کے لیے بھی

انہوں نے ایسی کوئی حکمت سوچ رکھی تھی کہ جو کپڑے پہن کر ہم گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے گھر کا چکر لگاتے وقت، اس کی عبادت کرتے وقت یہ کپڑے ہمارے بدن پر نہیں ہونے چاہئیں، کپڑے اتار کر وہ ننگے ہو کر طواف کرتے تھے انسانی عقل جس وقت بغیر شریعت کی روشنی کے اپنے لیے کوئی عمل کا طور طریقہ ایجاد کرتی ہے تو ایسی ہی حماقتیں کرتی ہے۔

اب گھر کی پشت کی جانب سے آنا فی حد ذاتہ مباح ہے کہ آپ اپنے گھر جائیں دروازے سے نہ گزریں پیچھے سے سیڑھی لگا کر اوپر سے چڑھ کر آئیں اور صحن میں اتر جائیں یہ مباح ہے یہ کوئی گناہ اور معصیت نہیں ہے لیکن اس کو نیکی کا باعث سمجھ لینا یا اس کو ضروری سمجھ لینا کہ اللہ کی رضا اسی میں ہے اس کے ساتھ اس فعل کے اندر بدعت کا معنیٰ پیدا ہو جائے گا اور یہ معصیت بن جائے گی اب اس سے روکا جائے گا۔

بدعت کی پہچان اور بدعت کی مختلف صورتیں:

قرآن کریم کی ان آیات سے ایک اصول نکل آیا کہ جس چیز کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا اللہ کے احکام کے تحت اس کا ضروری ہونا ثابت نہیں، شریعت نے اس کو باعث ثواب قرار نہیں دیا، اس کا نیکی ہونا باعث ثواب ہونا شریعت کی دلیل کے ساتھ ثابت نہیں ہے جیسے اباحت کی شان ہوتی ہے کہ اس کی دونوں جانبیں برابر، کر دیا نہ کرو، نہ کرو گے تو ثواب نہیں، کرو گے تو گناہ نہیں۔

اس کی دونوں جانبیں برابر ہوتی ہیں، اپنی طرف سے اس کی ایک جانب متعین کر کے اس پر حکم لگا لینا مثلاً اس مباح کو ضروری سمجھنے لگ گئے مباح کے درجے سے نکال دیا بغیر کسی دلیل شریعت کے یا اس مباح کو ناجائز سمجھنے لگ گئے اس کے اندر معصیت کا معنیٰ پیدا کر دیا بغیر کسی شرعی دلیل کے یہ حد سے تجاوز ہے اور اس کے ساتھ وہ حکم بدعت کا معنیٰ اختیار کر جاتا ہے تو بغیر کوئی عقیدے کے کرے تو کر سکتا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

اب مثال کے طور پر فجر کی آذان سے پہلے پانی پینا نہ پینا آپ کے لیے دونوں باتیں برابر ہیں اور شریعت نے کوئی لازمی نہیں قرار دیا کہ آپ فجر کی نماز سے پہلے پانی ضرور پیا کریں نہ روکا ہے کہ نہ پیا کریں۔

اب اگر ایک آدمی کہے کہ سو کر اٹھ کر پانی پینا ضروری ہے جو نہیں پیئے گا وہ گناہ گار ہوگا اور جو پیئے گا اس کو ثواب ملے گا اب یہی پانی جو روزمرہ آپ پیتے ہیں عادت کے مطابق پیتے رہیں کوئی تمہیں پوچھنے والا نہیں جب یہ نظریہ بن جائے گا بغیر دلیل شرعی کے تو ایسی صورت میں یہی بدعت بن جائے گی ہمیں اس کی بھی تردید کرنی پڑے گی کہ بھائی فجر کی نماز سے پہلے پانی پینا جائز نہیں ہے اور یہ کہنا کہ پانی ضرور پیو یہ بالکل خلاف شریعت ہے۔

اب اس کو خلاف شریعت ثابت کرنے کے لیے ہمیں دلیل دینے کی ضرورت نہیں ہے اس کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ جب شریعت نے اس کو مباح قرار دیا ہے نہ اس کے متعلق حکم آیا ہے نہ اس کے متعلق نہی آئی ہے تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم اس کو مامور قرار دے دو یا تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم اس کو منہی عنہ قرار دے دو، اس کو باعث ثواب یا باعث عذاب قرار دے دو جب اس قسم کا عقیدہ بن جائے گا تو وہ بدعت ہو گیا۔

اب اس کو کرنا معصیت ہو جائے گا، روکنا ضروری ہو جائے گا تو آج بہت ساری چیزیں ہمارے درمیان ایسی ہی ہیں کہ جو بے اصل ہیں شریعت نے مباح قرار دی ہیں لیکن جہالت کے ساتھ لوگوں نے ان کو ضروری سمجھ لیا ضروری سمجھ لینے کی صورت میں ان کے اندر بدعت کا معنیٰ پیدا ہو گیا وہاں پھر یہ نہیں دیکھا جایا کرتا کہ فی حد ذاتہ جائز ہے کہ نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ جس درجے میں تم ضروری سمجھ رہے ہو شریعت کی دلیل کے ساتھ اس کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے یا نہیں اگر اتنا ضروری ہونا ثابت نہیں ہوتا جتنا تم اس کو ضروری سمجھ رہے ہو تو ایسی صورت میں بدعت ہو جائے گا، ایصال ثواب کے لیے شریعت نے کوئی وقت متعین نہیں کیا پیر کو کرو، منگل کو کرو، بدھ کو کرو، جمعرات کو کرو جمعہ کو کرو، جس دن آپ چاہیں کھانا کھلا کر ایصال ثواب کر دیں، قرآن کریم پڑھ کر ایصال ثواب کر دیں، اکیلا قرآن کریم پڑھ کر ایصال ثواب کر دیں، اکیلا کھانا کھلا کر ایصال ثواب کر دیں، دونوں کام بیک وقت کر لیں یہ ساری کی ساری صورتیں ایسی ہیں جن کو شریعت نے برداشت کیا ہے صرف قرآن کریم پڑھ کر ایصال ثواب کر دو کر سکتے ہو، صرف کھانا کھلا کر ایصال ثواب کر دو کر سکتے ہو، دونوں کر دو کر سکتے ہو جس دن چاہو رات کو کرو دن کو کرو جس طرح سے چاہو کر سکتے ہو یہ تمام صورتیں شریعت کے اندر برابر ہیں۔

لیکن ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ جس وقت تک کھانے کے ساتھ قرآن کریم کو جوڑا نہیں جائے گا اس وقت تک ثواب نہیں پہنچتا نہ کھانے کا پہنچتا ہے نہ قرآن پڑھنے کا پہنچتا ہے یا اگر فلاں دن کھانا نہ دیا گیا تو گناہ ہوگا اور فلاں دن ایصال ثواب کرنا زیادہ باعث ثواب ہے اور اس دن زیادہ ثواب پہنچتا ہے یہ چیزیں ایسی ہیں جو بلا دلیل شرعی اختیار کر لی گئی ہیں ان کے اوپر شارع علیہ السلام کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا یہ شارع علیہ السلام بتا سکتا ہے، اللہ کا رسول واضح کر سکتا ہے، میں اور آپ اپنی عقل کے ساتھ اس چیز کو واضح نہیں کر سکتے لہٰذا یہ تعینات جس قسم کی آ جائیں گی یہ ساری کی ساری بدعت ہوں گی پھر یہ فعل معصیت ہو جائے گا گویا کہ اپنی طرف سے ایک نیا حکم نکال لیا۔

اب یہ کہنا کہ دیکھو جی کھانے کا ثواب بھی جاتا ہے، قرآن کا ثواب بھی جاتا ہے دونوں کو اکٹھا کر لیا جائے

تو کیا حرج ہے بھائی اتفاقاً ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر اس کو ضروری سمجھنا شروع کر دیا تو ضروری سمجھنے کی صورت میں یہ بدعت ہو گیا اس طرح سے ان چیزوں میں جو کہ فی حد ذاتہ جب جائز ہوتی ہیں ہمارے اس قسم کے تغیرات وتصرفات جو ہوتے ہیں وہ اس کے اندر بدعت کا معنی پیدا کر دیتے ہیں۔

اور یہی صورت مثال کے طور پر آذان سے پہلے درود شریف پڑھنے کی ہے کہ آپ جس طرح سے درود شریف پڑھتے ہیں'' بسم اللہ '' پڑھتے ہیں، پڑھ لیں، پڑھ کر اذان کہہ دیں لیکن اب اس کی وہ ہیئت اختیار کرنا جس ہیئت کے ساتھ یہ پڑھتے ہیں اس کو ضروری سمجھنا ضروری سمجھنے کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی نہیں پڑھتا تو اس پر انکار ہے اور اگر کوئی کہتا ہے کہ بھائی کبھی چھوڑ بھی دیا کرو تو اس پر وہ راضی نہیں ہیں عملاً اس کا اہتمام کر لیا۔

اب کہنا کہ دیکھو درود پڑھنا تو باعث فضیلت ہے اگر ہم نے پڑھ لیا تو کیا حرج ہے یہ دلیل غلط ہو گی اس دلیل کے ساتھ عمل کا جواز ثابت نہیں ہو گا جب شریعت نے '' اللہ اکبر '' سے اذان شروع کر کے '' لاالہ الا اللہ'' پر اس کو ختم کر دیا تو اذان کے انداز کے ساتھ صرف یہی کلمات ادا کیے جاسکتے ہیں درود شریف کی کوئی بات نہیں ہے۔

آپ میں سے کوئی '' بسم اللہ '' بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دے اذان سے پہلے اور کہے کہ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ '' بسم اللہ '' پڑھ کر اذان کہنی چاہیے ہم اس کو بھی بدعت کہہ دیں گے کیونکہ شارع علیہ السلام نے تو اللہ اکبر سے اذان شروع کر کے لاالہ الا اللہ پر ختم کی ہے، اچھا '' لاالہ الا اللہ'' کو چھوڑیں اگر کوئی اذان کہتے ہوئے '' محمد رسول اللہ'' بھی ساتھ کہہ دیتا ہے آخری کلمہ کہہ دیتا ہے '' لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' تو کیا یہ اذان میں جائز ہو گا حالانکہ ''لاالہ الا اللہ'' کے ساتھ '' محمد رسول اللہ'' کا جزء ہر طرح سے ثابت ہے لیکن اگر اس کے اوپر اضافہ کر دیا گیا تو اضافہ کرنے کی صورت میں ہم کہیں گے کہ یہ بھی حکم اذان کو بدل دیا گیا یہ بھی بدعت ہے تو ایسے ہی یہ درود کی بات ہو گی اس میں یہ بحث کرنا کہ درود تو باعث فضیلت ہے دیکھو جی درود پڑھنا تو باعث ثواب ہے اس کو ہر جگہ تو ضروری قرار نہیں دیا جاسکتا جہاں اس کو ضروری قرار دیں گے اس کے اندر بدعت والا معنی پیدا ہو جائے گا اور پہلے آپ کھڑے ہوئے پہلے درود شریف پڑھ لیا پھر بسم اللہ پڑھ لی آہستہ اذان کے لب ولہجے کے ساتھ نہ پڑھی بلند آواز کے ساتھ نہ پڑھی اور اللہ اکبر سے اذان شروع کر دی تو کون کہتا ہے کہ بسم اللہ پڑھنی ناجائز ہے یا درود پڑھنا ناجائز ہے تو نہ پڑھنے والے پر انکار نہیں اور اذان کا لب ولہجہ اختیار نہ کیا جائے اور کبھی اتفاقاً ہو گیا اس کو ضروری نہیں سمجھا گیا بسم اللہ پڑھ لی لیکن اذان کے لب ولہجے کے ساتھ نہیں، کھڑے ہوئے ہیں کھڑے ہو کر بسم اللہ پڑھ کے بعد اذان شروع کر دیجئے تو کیا حرج ہے۔

لیکن اگر اسی طرح سے انداز اختیار کرلیا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنے کا تو یہ صورت بھی ناجائز ہو جائے گی یہ کتنی صاف ستھری بات ہے کہ جس عمل کو شریعت نے جس درجے میں رکھا ہے اس درجے پر اس کا رکھنا ضروری ہے ایک چیز مستحب ہے اور اس کو کوئی فرض سمجھنا شروع کردے اور ایسے ہی اس کا التزام کرے کہ جس طرح سے فرض کا کیا جاتا ہے اور اس کے چھوڑنے والے پر ایسے ہی انکار کرے جس طرح سے کہ فرض چھوڑنے والے پر انکار کیا جاتا ہے تو مستحب کا بھی درجہ بدل دیا گیا، تغیر حکم کے ساتھ یہ بھی بدعت بن جائے گا جو درجہ شریعت میں جس چیز کا ہے اس درجے کے اوپر اس کا محفوظ رکھنا ضروری ہے مستحب کو مستحب جانو اس کا کرنا باعث ثواب ہے چھوڑنے پر ایسا کوئی حرج نہیں ہے سنت کا عمل جو ہے سنت کے مطابق جانو، فرض کو فرض جانو، واجب کو واجب جانو اپنے نظریہ کے تحت ان حدود کی حفاظت کرو ان حدود کے اندر تغیر تصرف جائز نہیں ہے، مباح کو مباح جانو، مباح کو واجب نہ قرار دے دو۔

اس قسم کے تغیرات کے ساتھ بھی بدعت والا معنی پیدا ہو جاتا ہے جس کا اختیار کرنا پھر جائز نہیں، یہاں انکار جو ہوا، بدعت کا معنی جو پیدا ہوا وہ آپ کی تعیین کے ساتھ ہوا ہے اور اس کے ضروری سمجھنے کے ساتھ ہوا ہے زیارت قبور کے لیے جس وقت آپ جائیں جاسکتے ہیں قبر کی زیارت کرنا مرغوب فیہ ہے شریعت میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تمہیں پہلے منع کیا تھا کہ قبروں کی زیارت کے لیے نہ جایا کرو اب میں کہتا ہوں کہ جایا کرو یہ قبریں انسان کو دنیا سے بے رغبت کرتی ہیں اور آخرت یاد دلاتی ہیں اس مقصد کے تحت قبرستان میں جایا کرو، زیارت کیا کرو، والدین کی قبر کی زیارت کرنے کی ویسے ہی فضیلت آتی ہے مشکوٰۃ شریف میں روایت موجود ہے ہفتے میں کم از کم ایک دن والدین کی قبر کی زیارت کے لیے جانا چاہیئے یہ باعث ثواب ہے والدین کے حق کی ادائیگی ہے روایت میں آتا ہے۔

لیکن اب کوئی تعیین کرلے کہ دس محرم کو ہی ضرور جانا ہے آگے پیچھے نہیں جانا اور دس محرم کو جانا ہی شریعت کا حکم ہے تو یہی جانا بدعت بن جائے گا کیونکہ یہ تعیین ہم نے اپنی جانب سے کرلی شریعت نے یہ تعیین نہیں کی۔

اب اگر کوئی دس محرم کو روکے تو اس کو روکنے کا حق ہے اب یہ کہنا کہ دیکھو جی یہ قبروں کی زیارت سے منع کرتا ہے حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہوا ہے کہ قبروں کی زیارت کرو تو اس کا یہ روکنا حدیث کے خلاف ہے،

یہ جہالت ہے یہ روکنا عین شریعت کا منشاء ہے کیونکہ تم نے شریعت کے حکم کو بدل دیا کہ ضروری نہیں تھا ضروری سمجھ لیا ،تاریخ کی تعیین نہیں تھی تم نے تاریخ کی تعیین کر لی تو یہ اندازہ لگانا کہ کونسا کام سنت کے مطابق ہے کونسا کا کام سنت کے مطابق نہیں اور اس میں بدعت کا معنی کب پیدا ہو گیا کب پیدا نہیں ہوا یہ دین کی سمجھ رکھنے والے کا کام ہے اصولی طور پر یہ بات ذکر کی جا سکتی ہے کہ شریعت میں جو درجہ تبدیل کر دیں تو یہ تصرف شریعت کے اندر آپ نے ناجائز کیا اس کے اوپر گرفت ہوگی عملاً اس طرح سے اہتمام کر لینا گویا کہ واجب ہے اور اس کے خلاف کبھی کر لیا گیا تو اس کے اوپر اس طرح سے انکار کیا جائے جس طرح سے کہ واجب کے ترک پر انکار کیا جاتا ہے تو یہ بھی اس کے اندر بدعت کا معنیٰ پیدا کر دیتا ہے۔

ان الفاظ سے ایک اصول نکلا جس سے بیسیوں جزئیات کا آپ فیصلہ کر لیں گے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''لیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا'' یہ نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پشتوں کی جانب سے آؤ ''ولکن البر بر من اتقی'' لیکن نیکی نیکی تو اس شخص کی ہے من اتقیٰ کے اوپر بر کا لفظ محذوف نکالیں گے جیسے ترجمہ کے اندر اس کی وضاحت آ گئی تھی نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ سے ڈرے نیکی کا معیار یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو، اللہ کے احکام کی رعایت رکھو اپنے طور پر اس قسم کی چیزیں تجویز کر لینا اس میں کوئی نیکی کا کام نہیں ہے نیکی تقویٰ ہے اللہ سے ڈرنا نیکی ہے، ڈرنے والے کا جو کام ہے وہی نیکی ہے جو تقویٰ کے مطابق ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت رکھو اس کے حکم کی مخالفت نہ ہونے پائے نیکی کا معیار یہ ہے لہٰذا جس بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ثابت ہو جائے اس کے مطابق چلنا نیکی ہے چاہے وہ حکم شریعت کی عبارت النص سے ثابت ہو، دلالت النص سے ثابت ہو جو استدلال کے طریقے ہیں اس طرح استنباط صحیح اور قیاس صحیح کے اصول کے مطابق جو حکم ثابت ہو جائے جس درجے کا ثابت ہو جائے اس کے مطابق چلنا تقویٰ ہے اور اس کے مطابق چلنا نیکی ہے۔

اپنی طرف سے تجویزیں یہ کوئی نیکی نہیں ''واتوا البیوت من ابوابھا'' آیا کرو اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے، پشت کی جانب سے آنا کوئی ضروری نہیں ہے جس طرح سے تم نے سمجھ لیا دروازوں کی طرف سے آیا کرو ''واتقوا اللہ لعلکم تفلحون'' اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا جاؤ، اس حکم کے بیان کرنے کا یہاں موقع محل لفظ حج کی وجہ سے پیدا ہو گیا کیونکہ اس رسم کا تعلق حج کے ساتھ تھا تو جب حج کا تذکرہ شروع ہوا تو اس رسم کی تردید ہو گئی اور اس میں سے ایک اصول ہاتھ میں آ گیا جس کے ساتھ آپ سینکڑوں جزئیات کا فیصلہ کر سکتے ہیں جیسے کہ کچھ مختصر سی وضاحت میں نے آپ کے سامنے کر دی۔

آیات جہاد کا ماقبل و مابعد سے ربط:

آگے کچھ آیات جہاد کے بارے میں آگئیں اور اس کے بعد پھر حج کے احکام آرہے ہیں ''اتموا الحج والعمرۃ للہ'' تو یہ ابتداء کے اندر بھی حج کے احکام آئے درمیان میں یہ آیات قتال آگئیں ان کی مناسبت ماقبل مابعد کے ساتھ یہ ہے کہ آیات جو اتری تھیں تو یہ بھی حج اور عمرہ کے کرنے کے موقع پر ہی اتری تھیں۔

شان نزول:

واقعہ یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے مدینہ منورہ میں جانے کے بعد چھ ہجری کو ایک خواب دیکھا کہ ہم عمرہ کرنے گئے ہیں اور عمرہ ہم نے کیا سر منڈوایا احرام کھولا حلق اور قصر جس طرح سے کیا جاتا ہے اس خواب کا ذکر سورۃ فتح کے آخری رکوع میں ہے ''لقد صدق اللہ رسولہ'' سچا خواب دیکھا حضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اس کا تذکرہ کر دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلے ہی بیت اللہ کی زیارت کو ترسے ہوئے تھے، کتنی مدت ہوگئی تھی مشرکین نے وہاں جانے ہی نہیں دیا۔

اب خواب میں تو یہ تعیین نہیں تھی کہ اسی سال یہ واقعہ پیش آئے گا خواب میں تو تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک وقت میں تمہیں بیت اللہ لے جائے گا تم عمرہ بھی کرو گے اور حلق بھی کرو گے اسی شوق کے ساتھ انہوں نے فوراً تیاری کرلی اور سرور کائنات ﷺ بھی تیار ہوگئے چودہ سو ساڑھے چودہ سو پندرہ سو سے کم افراد حضور ﷺ کے ساتھ تھے جس وقت آپ عمرہ کرنے کے لیے چلے گئے واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے جب حدیبیہ میں آپ پہنچے تو مشرکین نے آگے سے روک دیا کہ آپ مکہ میں نہیں آسکتے حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ اگر اس بارے میں اصرار کیا جاتا تو لڑائی ہو جاتی اور حضور ﷺ بھی اس علاقے میں لڑائی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

تو حکمت اور مصلحت کا تقاضہ یہی ہوا کہ جیسے کیسے ہو مشرکین کے ساتھ صلح کر لی جائے صلح ہوگئی جس کو صلح حدیبیہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، بہت دب کر صلح کی بظاہر ساری ان کی شرطیں مان لیں جو کچھ بھی انہوں نے کہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس معاہدے کے وقت جو حضور ﷺ نے مشرکین کے ساتھ کیا تھا بڑی تکلیف ہوئی تھی۔

لیکن آپ نے سب کو مطمئن کر دیا کہ نہیں جو ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اسی میں خیر و برکت دے گا شرطوں کی تفصیل حدیث شریف کے اندر آتی ہے جو یہاں ذکر کرنے کا موقع نہیں ہے۔

بہر حال ان شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس سال تو واپس چلے جاؤ ہم عمرہ نہیں کرنے دیں گے اگلے سال آنا اور آکر عمرہ کر لینا تو سرور کائنات ﷺ چونکہ محصر ہوگئے دشمن نے روک لیا کعبۃ اللہ تک جانے نہیں دیا

تو آپ نے حکم دیا کہ اپنی قربانیاں ذبح کردو، قربانیاں ذبح کرنے کے بعد سر منڈوالو احرام کھول دو اس طرح سے کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت واپس آ گئے۔

اگلے سال پھر تیاری ہوئی اس عمرہ کو قضا کرنے کی چونکہ احرام باندھ کر جس وقت ایک فعل شروع ہو گیا تو وہ واجب ہو گیا تو اس کو قضاء تو کرنا تھا اگلے سال ذی قعدہ کے مہینے میں پھر موقع آیا پہلے بھی ذی قعدہ کا مہینہ تھا اور اب اگلے سال جو قضا کے لیے گئے ہیں تو یہ بھی ذی قعدہ کا اور مہینہ ذی قعدہ کا مہینہ اشہر حرم میں داخل ہے جس میں لڑنا جائز نہیں۔

اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خیال آیا کہ ہم چلے تو ہیں اگر مشرکین نے پھر مزاحمت کر لی، ان کی صلح کا، عہد کا کیا اعتبار ہے اگر کوئی گڑبڑ کر لی اور ہمیں عمرہ پھر نہ کرنے دیا تو پھر وہاں لڑائی کی نوبت آئے گی ایک تو ہم نے احرام باندھا ہوا ہوگا احرام میں بھی لڑنا ٹھیک نہیں پھر وہ حرم ہے حرم کے اندر بھی لڑنا ٹھیک نہیں پھر یہ شہر حرام ہے شہر حرام میں بھی لڑنا ٹھیک نہیں تو پھر کیا کریں گے جائیں گے اور آگے مشرکین کوئی گڑبڑ کریں گے تو پھر کیا کیا جائے گا یہ خیالات پیدا ہوئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایات دیں تو اس طرح معلوم ہو گیا کہ ان ہدایات کا تعلق اصل میں اسی سفر کے ساتھ ہے جو کہ عمرے کے لیے کرنا تھا عمرہ اور حج جن مہینوں کے اندر کیا جاتا ہے اس میں چونکہ یہ واقعات پیش آرہے تھے اس لیے یہاں ہدایات کے طور پر یہ آیات نازل فرمائیں۔

آیات کا مفہوم:

ان سب آیات کا مطلب یہ ہے کہ شہر حرام کی تم نے رعایت رکھنی ہے، حرم کی رعایت بھی رکھنی ہے، احرام کی رعایت بھی رکھنی ہے یہ سب ادب کی چیزیں ہیں، ان کے اندر لڑنا بھڑنا شرارت بالکل جائز نہیں ہے، آپ نے محتاط رہنا ہے لیکن اگر انہوں نے گڑبڑ کی اور ان کی طرف سے شرارت ہوئی پھر مدافعت کے طور پر تمہیں ان کے ساتھ لڑنا بھی جائز، احرام کی حالت میں لڑنا جائز، حرم کے اندر لڑنا جائز، شہر حرام میں لڑنا جائز پھر تمہیں ان کی رعایت رکھنے کی ضرورت نہیں ہے'' والحرمات قصاص ''جس طرح سے کہا جائے گا کہ ادب آداب کی باتیں یہ ادلے بدلے کی چیزیں ہیں تمہارے لیے کوئی ادب رکھے گا تم بھی رکھنا اور اگر وہ گڑبڑ کریں کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کریں تو پھر ان کو خوب مارنا کہ اچھی طرح سے سبق پڑھا دو انہیں، کھوپڑیاں کو تو ان کی یا ان کو قتل کر دو یا جس طرح سے مجبور کر کے انہوں نے تم کو اس علاقے سے نکال دیا تو تم بھی ان کو نکال دو یعنی اس کے لیے اگر آپ مختصر سا عنوان متعین کرنا چاہتے ہیں تو یوں کہہ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو یہ پڑھایا کہ اس موقع پر چھیڑ دمت کی پالیسی اختیار کرنی ہے پہلے تو کسی کو چھیڑو نہیں اصل تقاضہ تو یہی ہے کہ کسی کو چھیڑو نہیں۔

لیکن اگر کوئی چھیڑے تو پھر چھوڑو نہیں تو یہ پابندی جو تھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اٹھا دی گئی چنانچہ حضور ﷺ تشریف لے گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم کیا مشرکین نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی اور معاہدے کے مطابق انہوں نے وہاں جانے کی اجازت دے دی تو گئے عمرہ کیا تین دن ٹھہرنے کی شرط تھی کہ تین دن ٹھہر سکتے ہو تو تین دن ٹھہرے اور ٹھہر کر واپس تشریف لے آئے۔

لیکن تیاری اپنی اس قدر کر کے گئے تھے کہ اگر کوئی چھیڑ ہو گئی اور کسی نے کوئی شرارت کر لی تو شرارت کرنے کی صورت میں ان کی مدافعت مکمل کی جائے گی پھر ان کی رعایت نہیں کرنی تو چونکہ عمرہ کے سفر کے لیے یہ ضرورت پیش آئی تھی جس کے متعلق یہ ہدایت دی جا رہی ہے تو احکام حج اور احکام عمرہ کے درمیان میں یہ آیات قتال رکھ دیں گئیں ''وقاتلوا في سبيل الله'' اللہ کے راستے میں لڑائی لڑو ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے لڑتے ہیں ''ولا تعتدوا'' اور تم خود حد سے تجاوز نہ کرو کہ پہلے لڑائی چھیڑ دو اور از خود اس کے حالات پیدا کر دو ایسا نہ کرنا۔

بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، اگر مشرکین نے اعتداء کیا تو اللہ ان سے بغض رکھے گا اور اگر تم نے اعتداء کیا تو اللہ تعالیٰ کو تم پسند نہیں ہو، اپنی طرف سے تم نے حدود کی رعایت کرنی ہے لیکن اگر کوئی لڑ پڑے تو پھر اس کے ساتھ تمہیں لڑنے کی اجازت ہے قتل کر دو انہیں جہاں بھی تم ان کو پاؤ اور نکال دو ان کو اس جگہ سے جہاں سے تمہیں انہوں نے نکالا ''والفتنة اشد من القتل'' فتنہ کا معنی پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا تھا اصل میں یہ لفظ بولا جاتا ہے'' فتنة الذهب والفضة'' سونے کو چاندی کو آگ کے اندر تپانا تاکہ اس کا کھوٹ ظاہر ہو جائے یہ اصل کے اعتبار سے فتنہ کا معنی ہے بعد میں ہر اس واقعہ کو جو مصیبت کی شکل میں آئے آزمائش کی شکل میں آئے فتنہ کہہ دیا جاتا ہے۔

کیونکہ مصیبت ہو یا آزمائش کا کوئی دوسرا واقعہ ہو وہ بھی انسان کی اصلیت ظاہر کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے کہ اس میں کتنی برداشت ہے، کتنا اس میں صبر ہے، شکر کرتا ہے یا نہیں کرتا، صبر کرتا ہے یا نہیں کرتا، کہاں تک اس بات کو برداشت کر سکتا ہے تو اس قسم کے واقعات یوں انسان کے لیے آزمائش کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور انسان کی طبیعت کا کھوٹ اور اس کے دل کے جذبات یہ سارے کے سارے نمایاں ہو جاتے ہیں تو یہاں فتنے سے مراد ہے شرارت جو مشرکین کی طرف سے ہو رہی تھی کہ اہل اسلام کو وہ مجبور کرتے تھے یعنی ان کے اوپر مصائب کے پہاڑ توڑتے تھے تاکہ یہ اپنے دین سے باز آ جائیں اور اب وہ شرک اختیار کر لیں یہ ان کی طرف سے فتنہ تھا یہ شرارت تھی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں اگر لڑائی ہوگئی تو فتنہ تو ان کی طرف سے ہے، شرارت تو ان کی طرف سے ہے تمہیں وہ الزام نہیں دے سکیں گے۔

کیونکہ فتنہ ''اشد من القتل'' ہے تمہاری طرف سے قتل پایا گیا تو یہ بھی تو اسی فتنے سے ناشی ہے جو انہوں نے اٹھایا اس لیے نقصان کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبغوض ہونے کے اعتبار سے فتنہ زیادہ سخت ہے کیونکہ یہ فتنہ ہی آگے قتل وقتال کا باعث بنتا ہے شرارت جو کہ مشرکین کی طرف سے ہو رہی ہے جو ان کی نیکی سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں وہ قتل سے زیادہ سخت ہے اس لیے قصور پھر انہیں کا ٹھہرے گا قصوروار وہی ہوں گے جس قسم کی شرارت کرتے ہیں نہ لڑو ان کے ساتھ مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ لڑائی نہ کریں تمہارے ساتھ اس حرم میں، جب تک وہ لڑائی نہ لڑیں اس وقت تک تمہیں حرم کے اندر لڑائی کرنی جائز نہیں ہے۔

حرم سے شرپسندوں کو نکالنے کے لیے قتال کرنا:

چنانچہ اب یہ جو حرم شریف کا آپ کے سامنے واقعہ پیش آیا وہ جو ریڈیو میں آتا رہا کہ علماء سے فتویٰ لیا گیا اور فتویٰ لینے کے بعد یہ اقدام کیا گیا ہے تو اس کی اصلیت بھی یہ ہے کہ ایک گروپ بغاوت کر کے آ کے قابض ہوگیا اور آتے ہی پھر انہوں نے ہلاک کیا، مارا حکومت کے خلاف بغاوت کی طواف رکوا دیا، نمازیں رک گئیں، گڑبڑ مچ گئی یہ شرارت ہے یہ بغاوت ہے جو اس گروہ کی طرف سے پیش آئی تو ان کو وہاں سے نکالنے کے لیے اگر لڑائی لڑنی پڑ جائے تو اس میں قصور ان کا ہے جنہوں نے یہ شرارت کی اور جس نے امن بحال کرنے کے لیے حالات کو سازگار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا ہے وہ تو ایک جوابی کاروائی ہے اس لیے ہم اس مسئلے میں سعودی حکومت کو بالکل حق بجانب سمجھتے ہیں اور جو کچھ وہاں ہوا حرم کی بے ادبی ہوئی، وہاں قتل ہوا، خون ریزی ہوئی، طواف رک گیا، نمازیں رک گئیں ان سب کا وبال انہیں شرارت پسندوں پر ہے جنہوں نے یہ غلط اقدام کر کے اس قسم کے حالات پیدا کیے اور ان کو وہاں سے نکالنے کے لیے یہ اقدام جو ہوا ہے سعودی حکومت سے ٹھیک ہوا ہے۔

باقی وہ بادشاہ کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہتے تھے جمہوریت لانا چاہتے ہیں جیسے کہ آج کل لوگوں نے جمہوریت کا بت پوجنا شروع کر دیا اچھے طریقے سے بس جمہوریت آ جائے جس طرح سے بھی آ جائے اس قسم کا اگر کوئی وہ اقدام کرنا چاہتے تھے تو بھی ہم ان کے اس اقدام کی کبھی بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے یہ اقدام کرنا تھا تو جدہ میں کرتے، ریاض میں کرتے کسی دوسری جگہ کرتے بادشاہ کا اگر تختہ الٹنا مقصود تھا تو کوئی اور طریقہ اختیار کرتے تو کئی ملک ان کی حمایت بھی کرتے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی بھی ظاہر کر سکتا تھا۔

لیکن چاہے ان کا مقصد اچھا تھا لیکن یہ اقدام جوانہوں نے کیا ہے کہ حرم کے اندر آ کر شرارت کی ابتداء کردی اس کی کسی صورت میں تائید نہیں کی جاسکتی اس میں جو کچھ ہوا اس میں سارے کا سارا وبال انہی شرارت پسند عناصر پر ہے تو یہ فتویٰ جو وہاں علماء نے دیا کہ ان کو نکالنے کے لیے تشدد کیا جاسکتا ہے بالکل ٹھیک دیا اور انہیں آیات سے ماخوذ ہے اور ان کا حکم جو ہے وہ اس وقت باغی عنصر کا ہے جنہوں نے آ کر اس قسم کی گڑبڑ مچائی تھی تو اس فتویٰ کا ماٰخذ جو ہیں یہی آیات ہیں۔

تفسیر باللفظ:

ان سے نہ لڑو مسجد حرام کے پاس جب تک کہ وہ تمہارے ساتھ اس حرم میں لڑائی نہ کریں ''فان قاتلوا کم'' اگر وہ تم سے لڑ پڑیں'' فاقتلوھم ''تو پھر تم ان کو حرم میں بھی قتل کردو پھر تمہیں قتل کرنے کی اجازت ہے''کذلك جزاء الكفرين '' کافروں کا یہی بدلہ ہے جو حرم کے اندر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ پھر ان کی جان بخشی نہیں ہے ان کو حرم کے اندر بھی قتل کیا جاسکتا ہے'فان انتھوا ''اور اگر یہ شرارت سے باز آجائیں'' فان اللہ غفور رحیم ''تو اللہ غفور رحیم ہے پہلے جو حرکتیں کرتے رہے ہیں تو اللہ معاف بھی کردے گا باز آنے کا مطلب یہ ہے کہ شرارت چھوڑ دیں اور شرک کے لیے دوسروں کو مجبور کرنا یہ سب شرارت ہے۔

''وقاتلوھم ''اگر یہ لڑائی چھیڑ دیں پھر ان کے ساتھ اس وقت تک لڑو جب تک کہ شرارت ختم نہ ہو جائے''حتیٰ لا تکون فتنة'' یہ شرارت بازی جب تک ختم نہ ہو جائے اس وقت تک ان کے ساتھ لڑو'' ویکون الدین للہ ''اس وقت تک لڑو جب تک کہ دین، اطاعت اللہ کے لیے نہ ہو جائے حتیٰ کے بعد یہ ''لاتکون'' اور''یکون الدین للہ'' دونوں کا ترجمہ اکٹھا ہو گیا کہ ان کے ساتھ اس وقت تک لڑو جب تک کہ فتنہ ختم نہ ہو جائے اور جب تک کہ اللہ کا دین اللہ کے لیے ہی نہ ہو جائے یعنی قانون اللہ کا نافذ ہو جائے اطاعت اور فرمانبرداری اللہ کی ہو جائے اس وقت تک تم ان سے لڑ سکتے ہو۔

محاورۂ نفی کا ترجمہ کر رہا ہوں کہ جب تک کہ دین اللہ کے لیے نہ ہو جائے اس وقت تک تم ان کے ساتھ لڑتے رہو، جب تک فتنہ ختم نہ ہو جائے اس وقت تک تم ان سے لڑ سکتے ہو'' فان انتھوا ''اگر وہ باز آجائیں'' فلا عدوان الا علی الظالمین ''پھر تجاوز نہیں ہے زیادتی نہیں ہے مگر ظالموں پر جس کے لیے ظلم ثابت ہوگا جو ظلم کرے گا اسی پر پھر زیادتی کی جاسکتی ہے اور جو ظلم نہیں کرے گا ظلم سے باز آگیا اس پر نہیں کی جاسکتی، شہر حرام شہر حرام کے بدلے میں ہے اگر وہ تمہارے حق میں اس مہینے کو حرمت والا مہینہ سمجھیں تو تم بھی ان کے حق میں حرمت والا مہینہ سمجھو ''والحرمات قصاص ''حرمات ادب آداب یہ مساوات کی چیزیں ہیں اگر تمہارے لیے کوئی حرمت کا اعتبار کرتا

ہے تو تم اس کے لیے حرمت کا اعتبار کرو، اگر کوئی تمہارے لیے حرمت کا اعتبار نہیں کرتا تو تم بھی ان کے لیے حرمت کا اعتبار نہ کرو" فمن اعتدیٰ علیکم " جو کوئی تم پر حد سے تجاوز کرے" فاعتدوا علیہ " تم اس پر تجاوز کرو یہ " فاعتدوا" صورتاً کہہ دیا گیا ورنہ کسی کی تعدی کے مقابلے میں جزائے تعدی کے طور پر جو معاملہ ہوا کرتا ہے وہ حقیقت میں تعدی نہیں ہے مشاکلۃً اس کو اعتدیٰ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

کیونکہ یہ تو ہم نے اس کو سزا دینی ہے جو بالکل حق ہے جس طرح سے" جزاء سیئة سیئة مثلها " کہہ دیا جاتا ہے سیئہ کی جزا حقیقت میں سیئہ نہیں ہے لیکن جیسا معاملہ اس نے کیا ویسے ہی اس کے ساتھ کیا گیا بطور بدلے کے صورتاً اس کو سیئہ کہہ دیا مشاکلۃ کا یہ معنیٰ ہوتا ہے یہاں بھی ان کے اعتدیٰ کے جواب میں جو کچھ کیا جائے گا وہ حقیقتاً حد سے تجاوز نہیں ہے اعتدائی نہیں ہے۔

بلکہ یہ تو اللہ نے حد بتادی کہ تم ایسا کر سکتے ہو لیکن صورتاً مشاکلۃً اس کو اعتدیٰ سے تعبیر کر دیا" ما اعتدی علیکم " کا معنیٰ ان کے اعتدیٰ کرنے کی طرح جیسے انہوں نے کیا ہے یوں ترجمہ نہیں کرنا تجاوز کرو ان پر مثل اس کے جو انہوں نے اعتدیٰ کیا جس کا معنیٰ یوں نکال لیں کہ مقدار میں بھی برابری ہو وہاں مقدار میں برابری والی بات نہیں ہے۔

کیونکہ جنگ چھڑ جانے کے بعد پھر ہم نے یہ نہیں دیکھنا کہ انہوں نے ہمارے کتنے آدمی مارے اور ہم نے ان کے کتنے آدمی مارے یہ اعتدیٰ کے مقابلے میں اعتدیٰ ہے مقدار ضروری نہیں تشبیہ صرف اعتدیٰ میں ہے اقدام تم ویسے کر سکتے ہو جیسے انہوں نے کیا۔

باقی نقصان تو کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنا کچھ بھی نقصان نہ ہو اور ان کا سارا ہی ہو جائے، اپنا کوئی آدمی نہ مرے ان کے سارے ہی مرجائیں پھر تو کوشش یوں کرنی چاہیئے جہاد شروع ہو جانے کے بعد پھر برابری نہیں " واتقوالله " اور ہر معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو" واعلموا " اور یہ یقین کرلو کہ بے شک اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے، معیت اللہ تعالیٰ کی انہیں کے ساتھ ہے جو احکام کی رعایت رکھنے والے پرہیز کرنے والے ہیں تو یہاں جب قتال کا ذکر آیا یہ بدنی جہاد ہے اب اس بدنی جہاد کے لیے مال بھی خرچ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تبھی جا کر جہاد کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں تو اس کے ساتھ لگتے ہی مالی جہاد کا تذکرہ کر دیا یہ انفاق کا جو یہاں ذکر آ گیا ہے یہ بھی جہاد کا ہی مسئلہ ہے کہ جہاد میں کامیابی تبھی ہوتی ہے کہ جب جہاد کی تیاری میں اور جہاد کی دوسری ضروریات میں انسان مال بھی خوب خرچ کرے۔

مالی جہاد:

"وانفقوافی سبیل اللہ" اللہ کے راستے میں خرچ بھی کرو خاص طور پر ایسا خرچ کرنا جس کا تعلق جہاد کے ساتھ ہے "ولا تلقوابایدیکم" اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اگر اللہ کے راستے میں خرچ کرنا چھوڑ دو گے اور جہاد کی تیاری نہیں کرو گے تو یہ اپنے آپ کو تم خود ہلاکت کی طرف ڈالتے ہو کیونکہ اس کے ترک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور ہو جاؤ گے دشمن مضبوط ہو جائے گا اور ایک دن دشمن تمہیں ہڑپ کر جائے گا تو تم نے اپنے آپ کو خود بربادی کی طرف ڈالا ہے۔

چنانچہ اس آیت کے شان نزول میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ آتا ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں اتری ہے کہ ہم نے جب دیکھا کہ اب مسلمان کافی ہوگئے ہیں اور یہ جہاد وغیرہ کرتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی کاشت کی طرف زمینوں کی طرف متوجہ ہو جائیں اپنے باغوں کی نگرانی کریں جس طرح سے ہم پہلے کرتے تھے تاکہ یہ ضرورت اس طرح سے پوری ہو۔

تو ترک جہاد کا خیال ہمارے دل میں آگیا کہ ہم اللہ کے راستے میں جہاد نہ کریں بلکہ ہم اسی طرح سے زمینداری میں کاشت کاری باغ بانی میں لگ جائیں جس طرح سے ہم پہلے کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تنبیہ کی ہے کہ اگر اس طرح سے جہاد میں دلچسپی چھوڑ دو گے اور اپنی چیزوں کی طرف لگ جاؤ گے، کاشت کاری کی طرف زمینداری کی طرف تو یاد رکھو نتیجتاً ہلاکت آجائے گی اس لیے قوم کی زندگی اگر ہے تو جہاد کے ساتھ ہے، اسلام کی سرسبز، شادابی اگر ہے تو جہاد کے ساتھ ہے، اپنے بدن کو بھی اللہ کے راستے میں لگاؤ اور اپنے مال بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو" واحسنوا "اور ہر کام اچھی طریقے سے کیا کرو" واحسنوا" احسان کرو، احسان کا معنیٰ ہر کام اچھی طرح سے کرنا، احسان فی العبادت یہ ہے کہ اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ اللہ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

چونکہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے اس طرح سے سمجھو کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں احسان فی العبادت تو یہ ہے اور باقی معاملات ان میں احسان فی المعاملات جس کی تشریح حدیث شریف کے اندر آگئی کہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو، ہر شخص کے ساتھ معاملہ ایسا کرو جیسے تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے یہ احسان فی المعاملات ہے ہر کام کو اچھی طرح سے کرو بے شک اللہ تعالیٰ ہر کام کو اچھی طرح سے کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

محصر فی الحج والعمرۃ کے احکام:

آگے حج کے احکام ہیں جن کی تشریح کی ضرورت نہیں فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں، حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کیا کرو یعنی اگر حج یا عمرہ شروع کریں تو اللہ کی رضا کے لیے اس کو تمام تک پہنچایا کرو اور اس میں تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ حج ہو یا عمرہ یہ ابتداء کرنے کے ساتھ واجب ہو جاتا ہے ہمارا مسلک تو باقی نوافل میں بھی یہی ہے کہ کوئی نفلی کام ہو جب اس کو شروع کر لیا جائے تو واجب ہو جاتا ہے اور عمرہ بھی نفل ہے عمرہ فرض نہیں ہے تو جب یہ شروع ہو گیا تو یہ بھی فرض اور حج نفلی کا اگر کسی نے احرام باندھ لیا تو وہ بھی فرض۔

لیکن حج اور عمرہ کے بارے میں باقی ائمہ کا بھی اتفاق ہے کہ شروع کرنے کے ساتھ ان کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے واجب ہے "فان احصر تم" "اگر تمہیں روک لیا جائے آگے کوئی جانے نہیں دیتا جس طرح سے میدان حدیبیہ میں ہوا تھا تو پھر تمہارے ذمے ہے ہدی' جو میسر آجائے یعنی بکری دے دو گائے کا ساتواں حصہ دے دو، اونٹ کا ساتواں حصہ دے دو' پھر مسئلہ یہی ہے کہ محصر قربانی کا جانور دیتا ہے جب وہ قربانی حرم میں ذبح ہو جاتی ہے تو اس کے بعد پھر احرام کھول دیا جاتا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنی قربانی کے جانور ذبح کیے اور اس کے بعد احرام کھولا اور سر منڈوایا کرو" ولا تحلقوا رؤسکم " یہ علامت ہے احرام کھولنے کی سر نہ منڈوایا کرو جب تک کہ ہدی اپنے ٹھکانہ کو نہ پہنچ جائے جب تک حرم میں جا کر ذبح نہ ہو جائے اس وقت تک احرام نہ کھولا کرو۔

"فمن کان منکم مریضا" اور اگر احصار تو پیش نہیں آیا اور کوئی شخص بیمار ہو گیا جس کی وجہ سے سر منڈانا ضروری ہو گیا سر میں درد رہتا ہے یا کوئی اور تکلیف ہو گئی جیسے جوئیں چڑھ گئیں حدیث شریف میں جس طرح سے قرآن کریم کی اس آیت کی تشریح کے اندر ایک واقعہ آیا ہوا ہے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے اتنی جوئیں پڑ گئیں کہ میں بیٹھا ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ میرے سر، کپڑے، چہرے پر جوئیں گر رہی تھی اتنی جوئیں پڑ گئیں۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا یہ تیرے کیڑے تجھے تکلیف پہنچاتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں جی فرمایا کہ سر منڈا دو اور فدیہ دے دو اور فدیہ کی تشریح اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ تین روزے رکھ یا چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کھانا دو اور یا پھر ہدی جیسے کہ آگے لفظ آئے ہوئے ہیں تینوں کا برابر سرابر اختیار ہے جو کام چاہو کر لو تو یہ احرام نہیں کھلے گا۔

البتہ سر منڈانا چونکہ ایک جنایت ہے اور اس مجبوری کے طور پر اگر سر منڈایا ہے تو یہ فدیہ دے دیا جائے گا اور اس کو تینوں چیزوں کے اندر اختیار ہے جو تم میں سے بیمار ہو یا اس کے تکلیف ہے سر کی طرف سے اس لیے اس

کے ذمے فدیہ ہے روزوں کا یہاں صیام کی تعداد نہیں بیان کی گئی حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ تین روزے رکھنے پڑیں گے، صیام صوم کی جمع بھی ہے اور مصدر بھی ہے روزہ رکھنا روزہ رکھنے کی تشریح ہوگئی کہ تین روزے رکھیں اور صدقہ اور صدقہ کی تفصیل ہوگئی کہ چھ مسکینوں کو صدقۃ الفطر کی مقدار کھانا دے ''نسك'' قربانی جس کا کم سے کم درجہ بکری ہے ''فاذا امنتم'' اور جب تم امن میں ہو کہ کوئی تکلیف نہیں دشمن کی طرف سے کوئی احصار نہیں تو ایسی صورت میں پھر سر نہیں منڈایا جائے گا جب تک احرام نہیں کھولا جاتا پھر اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔

پھر جو شخص فائدہ اٹھائے عمرہ کے ساتھ حج کی طرف ملا کر اس کے ذمے ہے جو میسر ہو ہدی، ایسی صورت میں پھر قربانی کرنی واجب ہے اور یہ دم شکر ہوتا ہے اور اگر کسی کو یہ دم میسر نہ ہو مثلاً پیسے نہیں ہیں غریب ہے تو پھر دس روزے رکھے تین حج سے پہلے ایام حج میں جس کی آخری تاریخ نو ہے نو تک وہ تین پورے ہو جانے چاہئیں اور سات حج سے فارغ ہو کر، چاہے مکہ معظمہ میں رکھ لے چاہے گھر آ کر رکھے، دس روزے یہ قربانی کے قائم مقام ہو جائیں گے جو کوئی فائدہ اٹھائے عمرہ کے ساتھ حج کی طرف ملا کر اس کے ذمے ہے جو میسر ہو قربانی اور جو شخص قربانی نہ پائے تو اس کے ذمے ہے تین دن کا روزہ رکھنا حج کے ایام میں ''فی وقت الحج'' اور سات دن تک روزے رکھنا ہے جب تم لوٹ آؤ یعنی حج کر کے لوٹو حج سے فارغ ہو جاؤ پھر چاہے وہیں رہ جاؤ چاہے واپس آ جاؤ، یہ دس پورے ہو گئے اور یہ ایام حج میں اشہر حج میں حج اور عمرے کو اکٹھا کر کے فائدہ اٹھانا یہ اس شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہنے والے ہوں یعنی مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں اس کی تشریح روایات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ہے کہ مواقیت کے اندر رہنے والے نہ ہوں مواقیت سے جو باہر رہتے ہیں، وہ جو احرام باندھنے کے لیے چاروں طرف جگہیں متعین ہیں ان کو میقات کہا جاتا ہے فقہ میں تفصیل آپ پڑھتے رہتے ہیں اس سے باہر رہنے والے یہ حج اور عمرہ کو اکٹھا کر سکتے ہیں اور مکہ معظمہ میں رہنے والے حج اور عمرے کو اکٹھا نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے اس لیے حج کو جاؤ عمرہ کو جاؤ تو اس کے احکام کی رعایت رکھو اللہ سے ڈرتے رہو اگر یہ رعایت نہیں رکھو گے گڑبڑ کرو گے تو پھر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ

حج کا زمانہ چند معلوم مہینے ہیں ، پھر جو شخص متعین کرلے ان کے اندر حج کو

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا

پس نہیں ہے رفث اور نہیں ہے فسوق ، اور نہیں ہے جھگڑا حج کے ایام میں ، اور جو کوئی تم کرو

مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ

اچھا کام اللہ اس کو جانتا ہے ، سفر خرچ لے لیا کرو پس بے شک سفر خرچ کا فائدہ سوال سے بچنا ہے ،

وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا

مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو ﴿۱۹۷﴾ تم پر کوئی گناہ نہیں اس بات میں کہ تم طلب کرلو

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

اللہ کا فضل ، جس وقت تم لوٹو عرفات سے تو یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ

مشعر حرام کے پاس ، اور یاد کیا کرو اس اللہ کو جیسے کہ اس نے تمہیں طریقہ بتایا ہے ، بے شک بات یہ ہے کہ تم

قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ

اس کے ہدایت دینے سے قبل البتہ ناواقفوں میں سے تھے ، پھر تم لوٹا کرو وہیں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ

اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بے رحم کرنے والا ہے ﴿۱۹۹﴾ جس وقت تم پورے کرلو

مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ

اپنے حج کے احکام تو یاد کیا کرو اللہ کو اپنے آباء کو یاد کرنے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ سخت یاد کرنا ، بعض

النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ

لوگوں میں سے وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے پروردگار! تو دے دے ہمیں دنیا میں تو نہیں ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی

خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

حصہ ﴿۲۰۰﴾ اوران لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں دنیا میں بھلائی اور

الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا

آخرت میں بھلائی اور بچا تو ہمیں جہنم کے عذاب سے ﴿۲۰۱﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے حصہ ہے ان کی

كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ

کمائی کا ، اور اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے ﴿۲۰۲﴾ یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو چند گنتی کے دنوں میں ،

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ

پھر جو شخص جلدی کرلے دو دنوں میں اس پر کوئی گناہ نہیں ، اور جو دیر کردے تو کوئی گناہ نہیں

عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اس پر اس کے لیے جو ڈرے ، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ بے شک تم اسی کی طرف ہی جمع کیے جاؤ گے ﴿۲۰۳﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع سے حج کے احکام شروع ہوئے تھے اور یہ آیات جن کا آپ کے سامنے ترجمہ کیا گیا یہ بھی احکام حج پر مشتمل ہیں، پہلے تو حج کا وقت بتایا گیا ہے۔

حج کا وقت:

''اتموا الحج والعمرة لله'' اس میں حج اور عمرے کو پورا کرنے کا ذکر آیا تھا ان میں سے عمرہ تو ایک ایسی عبادت ہے جس کے لیے کوئی وقت متعین نہیں، نفلی عبادت ہے، جس وقت چاہیں سال کے دوران میں آپ کر سکتے ہیں لیکن حج کی شان یہ نہیں ہے کہ آپ جس وقت چاہیں کر لیں اس کے لیے ایک وقت متعین کیا گیا ہے اور وقت چند معلوم مہینے ہیں جس کا مصداق ہے شوال، ذی قعدہ اور ذی الحج کے پہلے دس دن تغلیباً جمع کا لفظ بول دیا گیا

اگرچہ دو پورے ہیں تیسرا پورا نہیں ہے جیسے کہ نورالانوار میں آپ نے پڑھا اصل تو یہ ہے کہ جمع تین پر بولی جاتی ہے یہ تین پورے نہیں لیکن دو سے زائد ہیں اس لیے توسعاً اس کے اوپر جمع کا لفظ بول دیا گیا ہے۔

اور ان کو حج کے مہینے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حج کے افعال ان مہینوں میں شروع ہو جاتے ہیں شوال کی پہلی تاریخ سے قبل حج کا احرام باندھنا احناف کے نزدیک مکروہ ہے اور بعض دوسرے ائمہ کے نزدیک احرام منعقد ہی نہیں ہوتا اس کے ساتھ حج ادا ہی نہیں کیا جا سکتا بلا کراہت حج کا احرام شوال میں باندھا جا سکتا ہے یکم شوال کو احرام باندھ لیں بلا کراہت درست ہے۔

تو گویا کہ ان دنوں سے حج کے احکام شروع ہو جاتے ہیں اس لیے شوال کو ذی قعدہ کو بھی حج کے مہینے میں شمار کیا گیا ہے یہ تو وقت کی تعیین ہوگئی۔

دوران حج رفث، فسق اور جدال سے احتیاط:

پھر آگے جو شخص حج کو اپنے اوپر لازم کر لے یعنی احرام باندھ لے اسے پھر اللہ تعالیٰ کا خوف کرتے ہوئے نیکی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور برائیوں سے بچنا چاہیئے خصوصیت کے ساتھ یہ پابندی لگادی کہ احرام کی حالت میں عورتوں کے ساتھ بے حجاب نہ ہوا کرو اگر تو عورت کے ساتھ جماع ہی کر لیا جائے تو آپ فقہ میں پڑھتے ہیں کہ حج باطل ہو جاتا ہے وہ احرام کو کھول بھی نہیں سکتا وہ حج بھی اسی طرح سے کرنا پڑے گا اور پھر اونٹ بطور تاوان کے بھی دینا پڑے گا اور اگلے سال دوبارہ حج کرنا پڑے گا اور اس سے کم درجے کی مباشرت یا اس طرح کی گفتگو کرنا وہ بھی جنایت کے درجے میں ہے، تو ایک فرد اس کا چونکہ بہت خطرناک ہے کہ حج ہی سرے سے باطل ہو جاتا ہے۔

اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس کو ذکر کر دیا اگرچہ عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا یہ بھی فسوق کے اندر داخل ہے لیکن فسوق کے افراد میں سے اس کو مستقل ذکر کر دیا کیونکہ اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی حرکت ہو جائے تو سرے سے حج ہی باطل ہو جاتا ہے اس کی پھر تلافی بھی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی دوبارہ اگلے سال کرنا پڑے گا اور وہ احرام کو کھول بھی نہیں سکتا اس سال حج کر کے کھولے گا۔

اور پھر اگلے سال قضاء بھی کرنی پڑے گی اور ایک اونٹ بھی بطور تاوان کے دینا پڑے گا اور فسوق کی تفصیل آپ کے سامنے عرض کر دی کہ معروف گناہ جو عام حالات میں گناہ ہیں احرام کی صورت میں ان سے زیادہ اہتمام کے ساتھ بچنا چاہیئے اور یا پھر فسوق سے مراد ایسے گناہ ہیں جو احرام کی حالت میں گناہ ہو گئے اگرچہ عام حالات میں گناہ نہیں ہیں جس طرح سے خوشبو لگانا ہو گیا، سر کا ڈھانپنا ہو گیا، سلے ہوئے کپڑوں کا پہننا ہو گیا،

کسی شکاری جانور کو مارنا ہو گیا اس قسم کی چیزیں جو ممنوعات احرام میں ہیں ان ممنوعات احرام سے بچنا یہاں مراد ہے۔ فسوق نہیں یعنی پھر انسان کو فسق اختیار نہیں کرنا چاہیئے اور جدال آپس میں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرو حج چونکہ ایک طویل سفر کا تقاضہ کرتا ہے اور بہت دن لگ جاتے ہیں گھر سے نکلے ہوئے تو اکثر و بیشتر اپنے رفقاء کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ معمولی چیز میں انسان الجھ جاتا ہے جگہ کے بارے میں، چلنے کے بارے میں، سامان کے بارے میں، اکٹھے ہوں تو اخراجات کے بارے میں کوئی نہ کوئی جھگڑا ہو ہی جاتا ہے۔

اس لیے خصوصیت کے ساتھ ممانعت کر دی کہ ان حج کے ایام میں جس وقت آپ نے اپنے اوپر حج کو لازم کر لیا ہے تو جدال سے بچنا چاہیئے اور سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ حج مبرور ہے ہی وہ، حج مقبول وہی ہے ''مالا جدال فیه'' کہ جس کے اندر لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے تو صورتاً اس کو نفی کے انداز سے ذکر کر دیا معناً یہ نہی ہے کیونکہ نفی کے انداز سے کسی چیز کو ذکر کر دیا جائے تو اس میں بچنے کی زیادہ تاکید ہوتی ہے گویا کہ ایام حج میں ان چیزوں کا وجود ہی نہیں ؕ ایسے طور پر رہنا چاہیئے کہ سرے سے ان کا وجود ہی نہ ہو ویسے نہی کا ترجمہ میں نے آپ کے سامنے کر دیا کہ جو شخص ان ایام میں ان اشہر میں حج کو لازم کر لے اسے رفث نہیں اختیار کرنا چاہیئے، فسوق نہیں اختیار کرنا چاہیئے اور جدال نہیں اختیار کرنا چاہیئے ''وما تفعلوا من خیر یعلمه الله'' اس میں خیر کی ترغیب دے دی کہ جو بھی اچھا کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے اس کی اللہ تعالیٰ تمہیں جزا دے گا۔

شانِ نزول اور تزودوا فان خیر الزاد کا مفہوم:

''تزودوا فان خیر الزاد التقویٰ'' اس آیت کے شانِ نزول میں یہ لکھا ہے کہ یمنی لوگ خاص طور پر جب حج کرنے کے لیے جایا کرتے تھے تو اپنے ساتھ خرچ اخراجات نہیں لے جایا کرتے تھے خالی ہاتھ گھر سے چلتے اور وہ کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں اس لیے ہم ظاہری طور پر خرچ لے کر نہیں جاتے لیکن جس وقت پھر وہ آگے جاتے تو لوگوں کو پریشان کرتے ان کے سامنے دست سوال دراز کرتے، گداگری کرتے خود پریشان ہوتے اوروں کو بھی پریشان کرتے یا تو اس درجے کا توکل ہو کہ پھر فاقہ پیاس بھوک جو کچھ ہو اس کو برداشت کرے، اللہ کی جانب سے کچھ آ گیا تو کھا لیا ورنہ پھر بھوک پیاس کو برداشت کریں اس درجے کا اگر کوئی شخص ہو وہ اگر ظاہری اسباب کو ترک کر دے تو کسی درجے میں اس کے لیے جائز بھی ہے ورنہ اگر یہ مقام کسی کو حاصل نہیں تو اس کے لیے ظاہری اسباب کا ترک کرنا جائز نہیں ہے اس کو ظاہری اسباب اختیار کرنے چاہئیں اور توکل کا درجہ یہ ہے کہ ظاہری اسباب اختیار کرنے کے باوجود بھروسہ اللہ پر ہو۔

جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے طور پر جو ہم سے ہو سکا تھا کر لیا باقی ہماری ضرورت اور حاجت پوری کرنا اللہ کے اختیار میں ہے ان اسباب کے اوپر اعتماد نہیں ہونا چاہیئے جیسے ایک آدمی بیمار ہو گیا اس بیماری کے ازالے کے لیے ڈاکٹر سے مشورہ کرے اس کے مشورے کے ساتھ اچھی سے اچھی دوا لے لیکن اس کا یقین یہی ہو کہ اگر اللہ کی طرف سے شفا منظور ہوئی تو ہو گی اور اگر اللہ کی طرف سے شفا منظور نہیں ہے تو یہ ڈاکٹر طبیب یہ دوائیاں کچھ نہیں کر سکتیں۔

باقی کوئی شخص اس کو چھوڑ کر بیٹھ جائے کہ میں دوا کروں گا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں شفا ہے اگر قسمت میں ہوئی تو مل جائے گی نہیں تو نہ سہی ایسا کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو قوی القلب ہے کل کو اس کی زبان کے اوپر کوئی شکوہ شکایت نہ آئے پھر جو حال آئے اس کو صبر کے ساتھ سکون کے ساتھ برداشت کرتا چلا جائے ایسے شخص کے لیے تو ترک اسباب جائز اور کمزور قلب کے لیے کہ جس کو پتہ ہے کہ کل کو اگر یہ تکلیف بڑھ گئی شکوئی شکایت پر اتر آئے گا، جزع فزع پہ اتر آئے گا ایسے شخص کو چاہیئے کہ ظاہری اسباب کا سہارا لیے رکھے ظاہری اسباب اختیار کرے۔

لیکن دل سے اس کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیئے یہ سمجھے کہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے، طبیب کے ہاتھ میں شفا نہیں ہے، دوائیوں کے اندر یہ تاثیر نہیں جو کچھ نمایاں ہو گا وہ سب اللہ کی قدرت اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہو گا قلبی کیفیت یہ ہو۔

اور ظاہری اسباب اختیار کیے جائیں تو پھر یہ شخص ظاہر اور باطن کا جامع ہو جائے گا اور اس کی حالت عین سنت کے مطابق ہے اور یہ صحیح مومن ہے کہ ظاہری اسباب کے ساتھ بھی وہ التباس رکھتا ہے اختلاط ہے لیکن قلب اس کا اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے وہ سمجھتا ہے کہ ان اسباب کے اندر اثر پیدا کرنا اللہ کی شان ہے۔

باقی انسان چونکہ کمزور ہے اس کو ظاہری اسباب کا سہارا لینا پڑتا ہے تو یمنی اس طرح سے کرتے تھے زادِ راہ لے کر نہ جاتے پھر خود بھی پریشان ہوتے اور دوسروں کو بھی پریشان کرتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ ہدایت دی گئی کہ یہ طریقہ تمہارا ٹھیک نہیں گھر سے جب چلو تو اپنے سفر کے اخراجات لے کر چلو اور اس کا فائدہ تمہیں یہ پہنچے گا کہ تم گداگری سے بچ جاؤ گے سوال سے بچ جاؤ گے۔

تو اب بھی اسی طرح سے ہے کہ جن کے پاس خرچ وسعت کا ہوتا ہے وہ اپنا وقت اطمینان کے ساتھ گزار لیں گے اور جن کے پاس خرچ وسعت کا نہیں ہوتا ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں اور وہ پھر یقیناً وقت پر پریشان ہوتے ہیں یہ مطلب تو ہو گیا شان نزول کی طرف دیکھتے ہوئے اور یہی مطلب زیادہ صحیح ہے۔

اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ترجمہ کے اندر یہی مطلب لیا ہے اور زادہ راہ لے لیا کرو کہ بے شک بہتر فائدہ زادہ راہ کا بچنا ہے سوال سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ سے یہی معنیٰ متعین ہوا جو آپ کی خدمت میں ذکر کیا جا رہا ہے اور بیان القرآن میں بھی یہی تفسیر اختیار کی گئی ہے۔

تزودوافان خیر الزاد التقویٰ کا دوسرا مفہوم:

اور بعض عربی تفاسیر کے اندر یہ دوسرا مطلب بھی لیا گیا ہے کہ تقویٰ سے تقویٰ من اللہ مراد ہے تو پھر معنیٰ یہ ہوگا ''تزودوالتقویٰ'' گھر سے جب چلا کرو تو اپنے ساتھ تقویٰ کا زاد لے کر چلا کرو، تقویٰ کے لیے زاد کا لفظ حدیث شریف میں بھی آیا ہے ایک شخص سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا جا کر کہنے لگا یا رسول اللہ! میں سفر پہ جا رہا ہوں ''زودنی'' آپ مجھے کوئی زاد دیجیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''زودك الله التقویٰ'' اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ کا زاد دے یعنی اس نے اپنے سفر کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا طلب کی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے یہی دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ کا زاد دے تو جب جائے تو تقویٰ کا سامان تیرے ساتھ ہو تو اس طرح سے یہاں مراد لے لی جائے کہ جب چلو تو تقویٰ کی صفت حاصل کر کے چلو۔

اور بہترین زاد جس کو انسان اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے وہ تقویٰ ہے کیونکہ تقویٰ کی صفت اپنے پاس ہوگی تو گناہوں سے بچنا آسان ہوگا اور نیکی کرنی آسان ہوگی اس لیے گھر سے چلو تو تقویٰ کی دولت ساتھ لے کر چلو اور اے عقل والو! مجھ سے ڈرتے رہو، ڈرنا ہی عقل کا تقاضہ ہے کیونکہ عقل کا تقاضہ ہے کہ نفع کی چیز حاصل کرنے کی کوشش کی جائے نقصان سے بچا جائے اور اللہ تعالیٰ کا خوف انسان کے لیے نفع کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے اور نقصان سے بچنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوران حج تجارت کی اجازت:

''لیس علیکم جناح'' اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ حج کے سفر میں تجارت وغیرہ کر کے کوئی چیز کما لینا، رزق حاصل کر لینا محنت مزدوری کر کے یا تجارت کر کے یہ بھی کوئی گناہ نہیں اصل یہ ہے کہ جاہلیت میں حج تو لوگ کرتے تھے۔

لیکن اس حج کو انہوں نے ایک قسم کا میلہ اور منڈی بنا لیا تھا جاتے حج کی رسوم بھی ادا کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ میلے لگتے خرید و فروخت ہوتی جس طرح سے عام جشن ہوا کرتے ہیں اس میں وہ اپنے نفع کی چیز بھی حاصل کرتے اور پھر شعراء کی مجلسیں لگتیں، خاندانی مفاخرت ہوتی اپنے ماں باپ کی تعریف کر کے، اپنے آباؤ اجداد

کی تعریف کر کے دوسروں کے مقابلے میں فخر محسوس کیا جاتا اس قسم کے مقابلے اور مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آ گیا کہ عبادت خالص اللہ کے لیے ہونی چاہیئے اور اس کے اندر دنیا کی آمیزش نہ ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اب ہم حج کے لیے جایا کریں گے تو اس کے اندر تجارت کرنا مزدوری کرنا یہ بھی پھر جائز نہیں ہوگا۔

کیونکہ اگر یہ کمانے کا سلسلہ شروع کر لیا جائے تو یہ عبادت اور سفر خالص اللہ کے لیے نہیں رہے گا اس لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ بات آئی کہ حج کے سفر میں مزدوری کر کے یا کسی دوسرے طریقے سے اپنے لیے رزق کا کمانا درست ہے یا نہیں؟ خصوصیت کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ ہماری یہ عادت تھی کہ ہم اونٹ کرائے پر دیا کرتے تھے اور لوگ حج کے دنوں میں بھی اونٹ ہم سے کرائے پر لے لیتے اور ہم ان کے ساتھ چلتے اپنے اونٹوں کو سنبھالنے کے لیے تو حج کی نیت بھی کر لیتے اور اس سے ہمیں کچھ معاشی فوائد بھی حاصل ہو جاتے تو یہ ہمارے لیے جائز ہے یا نہیں تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہی سوال ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اتر آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر اسے کہا کہ بھائی تمہارے لیے جائز ہے کہ تم اپنے اونٹ کرائے پر بھی دے لیا کرو اور تمہارا حج بھی درست ہے تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جائز طریقے کے ساتھ جو شخص محنت مزدوری کرتا ہے ایام حج میں یا جائز طریقے سے کوئی تجارت کرتا ہے اور اس طرح سے اپنی معاشی ضروریات پوری کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت ہے گناہ نہیں۔

دوران حج تجارت کا اثر عبادت پر ہوگا یا نہیں؟

باقی رہی یہ بات کہ پھر اس حج کے اندر خلوص میں بھی فرق آئے گا کہ نہیں آئے گا؟ اس عبادت میں نقص بھی آئے گا کہ نہیں آئے گا؟ اس کا مدار ہے نیت پر اگر تو حاجی صاحب گئے ہی اس لیے ہیں کہ وہاں جا کر کوئی بلیک کریں گے یہاں سے کوئی چیزیں بلیک کی لے گئے، کوئی چرس لے گئے کوئی بھنگ لے گئے کوئی دوسری چیز لے گئے اور وہاں جا کر بیچ کر نفع کمائیں گے اور وہاں سے سمگلنگ کا سامان لے آئے کوئی کپڑا اور دوسری چیزیں ادھر لا کر مہنگی بیچیں گے اور ایک سفر کے اندر اپنے سال کے اخراجات پورے کر لیں گے۔

تو پھر مقصود تجارت ہوئی حج مقصود نہیں ہے ایسی صورت میں اس کو ثواب نہیں ملے گا اور اگر گیا تو اصل حج

کے لیے ہے اگر اس نے حج نہ کرنا ہوتا تو یہ مکہ معظمہ کا سفر اختیار نہ کرتا تجارت اس کو مقصود نہیں ہے لیکن چونکہ جارہا ہے اس لیے خیال کرے کہ کچھ تنگی ہے چلو تجارت کر کے کچھ کماتا رہوں گا جیسے نائی اپنے اوزار ساتھ لے جاتے ہیں وہاں حج بھی کرتے ہیں اور حجامتیں کر کر کے اپنے حج کے اخراجات بھی مہیا کر لیتے ہیں اور کسی قسم کے کام کرنے والے دوسرے لوگ اصل مقصود حج ہے کہ اگر حج نہ کرنا ہوتا تو یہ طویل سفر نہ کرتے ان کے لیے محنت مزدوری کر کے کمانا اور اس طرح سے اپنی معاشی ضروریات پوری کر لینا بالکل جائز ہے جو کسی قسم کا گناہ نہیں ہے تو یہ نیت کے اعتبار سے فرق ہوگا کہ ثواب ملے گا کہ نہیں ملے گا اور اس تجارت کی نیت کے ساتھ حج کے اندر نقص آئے گا کہ نہیں اگر اصل مقصود تجارت ہے اور حج محض بہانہ ہے تو پھر حج کا کوئی ثواب نہیں اور اگر اصل مقصود حج ہے اور تجارت ضمنی طور پر انسان اختیار کر لے اپنی معاشیات پوری کرنے کے لیے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ''لیس علیکم جناح'' تم پر کوئی کسی قسم کا گناہ نہیں اس بات میں کہ تم طلب کرلو اللہ کا فضل، رزق حلال کو ہمیشہ فضل رب کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے یہ بہت بڑا اللہ کا فضل ہے کہ کسی کو رزق حلال مل جائے جہاں بھی قرآن کریم کے اندر ذکر کیا گیا اس کو فضل کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے سورۃ جمعہ کے دوسرے رکوع کے اندر بھی آپ نے پڑھا تھا وہاں بھی رزق حلال کو فضل اللہ کے ساتھ ہی تعبیر کیا گیا ہے۔

حج کا رکن اعظم:

اور جب تم عرفات سے لوٹو، حج اصل کے اندر ہوتا ہے عرفہ میں وقوف، عرفہ جو ہے یہ اعظم رکن ہے حج کا اس لیے اگر کوئی شخص عرفات میں وقوف نہ کر سکے تو اس کی کوئی تلافی نہیں حج اس کا فوت ہو گیا اور عرفات میں وقوف نو تاریخ کو زوال شمس کے بعد غروب شمس تک ہوتا ہے اس وقت میں عرفات کے اندر جانا ضروری ہے اور پھر وہاں سے جب لوٹتے ہیں تو رات مزدلفہ میں گزرتی ہے مزدلفہ میں ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اللہ کے یاد کرنے کے اندر ایک متعین صورت یہ بھی ہے کہ مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی پڑھی جاتی ہے عشاء کے وقت میں جس طرح سے عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز پڑھی جاتی ہے اکٹھی ظہر کے وقت میں اور مزدلفہ میں آنے کے بعد مغرب اور عشاء کی نماز عشاء کے وقت میں یہ بھی اللہ کے یاد کرنے میں داخل ہے۔

اللہ کو یاد کیسے کرنا چاہیئے؟:

''واذکروہ کما ھدٰکم'' اور یاد اس طرح سے کرو جس طرح سے اللہ نے طریقہ بتایا یہ معیار ہے عبادت کا، صحیح عبادت وہی ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو۔

جاہلیت میں بھی لوگ عبادت کرتے تھے لیکن انہوں نے ان عبادتوں کے طریقے اور ان کی شکل وصورت اپنی مرضی سے بنائی تھی اوقات کی تعیین ہیئت سب اپنے خیال کے مطابق اختیار کرتے تھے جس طرح سے جی میں آتا سمجھتے یہی طریقہ ہے اللہ کو یاد کرنے کا اور اللہ کی عبادت کا اور اسلام میں اس بات پر پابندی لگادی کہ اللہ کی عبادت اپنی مرضی سے تم نہیں کرسکتے اس کی کوئی شکل وصورت اور اس کے لیے کوئی قید کوئی شرط اپنی مرضی کے ساتھ نہیں لگائی جاسکتی اس قسم کی شرطیں اپنے طور پر بنالینا جس طرح سے کل آپ کی خدمت میں تفصیل کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ وقت کی تعیین کرلی کوئی شکل صورت متعین کرلی اور اس کو ضروری سمجھ لیا کہ اس کے بغیر یہ عبادت ہوگی نہیں یہ سب جہالت ہے اللہ کو یاد اس طرح سے کرنا چاہیئے جس طرح سے اللہ نے بتایا جو طریقہ بتایا ہے اس کے مطابق یاد کروگے تو یہ یاد کرنا صحیح سمجھا جائے گا اور تبھی جاکر اس ذکر کے فوائد حاصل ہوں گے، اپنی مرضی کے ساتھ حدود قیود نہیں لگانی چاہئیں عبادت کے اندر اپنی طرف سے حدود قیود لگانا یہ تغییر شرع ہے جس کے ساتھ اس کے اندر بدعت کا معنیٰ پیدا ہوجاتا ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے تاکید کردی کہ یاد اس کو اس طرح سے کرو جیسے اللہ تعالیٰ نے طریقہ بتایا ہے اگر اس طریقے کے مطابق یاد کروگے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ذکر قبول ہوگا اور اگر اس کے مطابق یاد نہیں کروگے تو چاہے تم عبادت میں کتنی محنت اٹھالو ریاضت کرلو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ عمل قبول نہیں ہوگا وجہ اس کی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے کیا چیز پسند نہیں۔

یہ اصل میں منصب نبوت ہے کہ وہ بیان کرے اور جو شخص اپنے طور پر تجویز کرلے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تو گویا کہ وہ درپردہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے شریعت میں بدعت کی مذمت زیادہ آئی ہے اور اس مسئلے کی پچھلے صفحوں میں بھی کچھ وضاحت ہوگئی تھی جس میں ''واتوالبیوت من ابوابھا'' کا ذکر کیا گیا تھا۔

لوٹو وہاں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں:

''ثم افیضوا من حیث افاض الناس'' پھر لوٹو وہیں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں قریش چونکہ اپنے آپ کو بیت اللہ کا مجاور قرار دیتے تھے تو اس مجاورت کی بناء پر انہوں نے باقی لوگوں سے یہ امتیاز اختیار کررکھا تھا کہ جب وہ حج کرنے کے لیے جاتے تو مزدلفہ میں ٹھہر جاتے تھے اور عرفات کی طرف نہیں جاتے تھے کیونکہ میدان عرفہ یہ حرم سے باہر ہے اور مزدلفہ یہ حرم کے اندر ہے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم

بیت اللہ کے مجاور ہیں تو ہمارا حج حرم کے اندر ہی ہوگا ہم حرم سے باہر کیوں جائیں اور دوسرے لوگ عرفات میں جاتے تھے اور وہاں سے ہوکر واپس لوٹتے تھے اور عرفہ کا وقوف یہ حج کا اعظم رکن ہے جس کے فوت ہوجانے کی صورت میں اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ جہاں سے لوگ ہوکر لوٹا کرتے ہیں یعنی عرفات میں سے ہوکر مزدلفہ آتے ہیں تو اسی طرح آپ بھی وہیں سے لوٹیں جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں چنانچہ جب حجۃ الوداع کے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو قریش کا خیال یہی تھا کہ پہلے رواج کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی مزدلفہ میں ہی ٹھہر جائیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں گئے اور عرفات میں جاکر وقوف اختیار کیا ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت میں پڑھی وہاں سے ہوکر پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مزدلفہ کی طرف لوٹے ''ثم افیضوا من حیث افاض الناس'' کا یہی معنیٰ ہے پھر لوٹو وہیں سے جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں'' واستغفروا اللہ ''اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو مغفرت طلب کرو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

احکام حج پورے کرنے کے بعد اللہ کے ذکر کا حکم:

''فاذا قضیتم مناسککم ''جس وقت تم اپنے حج کے احکام پورے کرلو، مناسک احکام حج، جس طرح پہلے بھی یہ لفظ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں آیا تھا ''ارنا مناسکنا ''ہمیں ہمارے حج کے طریقے بتا، حج کے احکام بتا تو یہاں مناسک سے وہی حج کے احکام مراد ہیں منسک کی جمع ہے حج کے احکام پورے کرلو یعنی وقوف عرفہ بھی ہوگیا وقوف مزدلفہ بھی ہوگیا۔

اور اس کے بعد رمی جمرہ عقبیٰ بھی ہوگئی قربانی بھی کرلی، سر منڈا لیا اور طواف زیارت کرلیا اب یہ حج کے احکام پورے ہوگئے اس کے بعد پھر جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ منیٰ کے اندر ٹھہرا کرتے تھے اس میں پھر ان کے میلے لگتے، مشاعرے ہوتے، ایک دوسرے کے مقابلے میں مفاخرت کرتے، ہر قبیلے والے کا زور لگتا کہ اپنے اکابر کے مناقب بیان کرکے مفاخر بیان کرکے دوسرے کے مقابلے میں بڑائی حاصل کی جائے۔

تو دو دن یا تین دن اسی قسم کا چرچہ ان کا رہتا تھا ایک دوسرے کے مقابلے میں فخر شعر وشاعری خرید وفروخت میلے جس طرح سے ہوا کرتے ہیں تو یہ منیٰ کے اندر جشن مناتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حج کے ان احکام سے فارغ ہوجانے کے بعد پھر منیٰ کے اندر ٹھہرو اور وہاں پھر اللہ تعالیٰ کو اسی طرح سے یاد کرو جس طرح سے تم اپنے آباء کو یاد کرتے تھے۔

بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو جس طرح سے تم اپنے آباء کو یاد کرتے تھے بلکہ اس لفظ کے اندر زور یہی ہے کہ وہ لوگ اپنا پوری طرح سے زور لگا کر قوت صرف کر کے مفاخر بیان کرتے اپنے آباء کے اور دوسروں کے مقابلے میں برتری ثابت کرتے۔

اب ان دنوں کے اندر اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنا چاہیے جس طرح سے آباء کو یاد کیا جاتا تھا پورے شغف کے ساتھ پوری مشغولیت کے ساتھ کامل توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اس طرح سے یاد کرو بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت یاد کرو۔

جو صرف دنیا مانگے آخرت میں اس کو کچھ نہیں ملے گا:

''فمن الناس من یقول ربنا آتنا'' اب یہاں اللہ کو یاد کرنے کے تذکرے کے بعد لوگوں کی دو قسمیں ذکر کر دیں کہ بعضے لوگ ایسے ہیں کہ جس کو اپنی عبادت اور اللہ کو یاد کرنے سے مقصود صرف دنیا ہوتی ہے اور آخرت کے متعلق ان کا عقیدہ نہیں ہوتا یا آخرت کی ان میں طلب نہیں ہوتی اس لیے جو وہ دعا کریں جو عبادت کریں ان کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر ہمیں اولاد دے، مال دے، جائیداد دے، عزت دے، اس قسم کے ان کے مقصود ہوا کرتے تھے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو اپنی عبادت سے ذکر سے صرف دنیا چاہتے ہیں ان کو دنیا میں ہم دیں گے کتنا دیں گے جتنا ہم چاہیں گے کیا ہر مانگنے والے کو دیں گے ایسا نہیں، جس کو چاہیں گے دیں گے ''ما نشاء لمن نرید'' جو چاہیں گے دیں گے جس کو چاہیں گے دیں گے اس لیے دنیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ جو کوئی مانگے اس کو مل جائے جتنی مانگے اس کو مل جائے یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت نہیں رکھی، دنیا کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت پر رکھی ہے اس لیے جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں تو اگر کوئی اپنا مقصود اس کو بنا لے تو اس کی کوشش ضائع جاتی ہے دنیا کے اندر جو مقدر ہے اس کو ملتا ہے تو پھر آخرت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملتا ''فمن الناس من یقول ربنا اتنا فی الدنیا'' من یہ مفرد ہے لفظوں میں اس لیے یقول کی ضمیر مفرد لوٹی مصداق اس کا جمع ہے لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! دے دے ہمیں دنیا میں آتنا کا مفعول یہاں محذوف کر دیا گیا کوئی چیز متعین ذکر نہیں کی گئی کیا دے دے، جو ان کو مطلوب ہے عزت ہے، مال ہے، دولت ہے، اولاد ہے، صحت ہے، جو بھی ان کو مطلوب ہے آتنا کا وہ مفعول ہے ہمیں دے دے دنیا میں۔

''وما لہ فی الاخرۃ من خلاق'' ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اس کی نیکی کا جو ثمرہ اللہ تعالیٰ کا منظور ہو گا دنیا کی شکل میں اسے دنیا میں مل جائے گا اور آخرت میں اس کا عمل بیکار جائے گا۔

دنیا وآخرت میں اچھائی کے طالب:

"منھم من یقول" اور ان لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں جمع کے طور پر اگر ترجمہ کیا جائے کیونکہ من کا مصداق ایک متعین نہیں اور مفرد کے طور پر ظاہر کی رعایت رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جائے تو لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو کہتا ہے دونوں طرح سے بات درست ہے، اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں حسنة دے دے اور آخرت میں حسنة دے دے یہاں آتنا کا مفعول حسنة ذکر دیا گیا حسنة کا معنی خوبی اچھی حالت اب خوبی اور اچھی حالت کا مصداق کیا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے اگر ہمارے لیے اچھی حالت یہ ہے کہ ہمیں اولاد ملے تو اللہ ہمیں اولاد دے دے اور اگر ہمارے لیے اچھی حالت یہ ہے کہ اولاد نہ ملے تو اللہ تعالیٰ اولاد سے محروم کردے، اگر ہمارے لیے اچھا یہ ہے کہ مال کثرت سے ملے تو اللہ تعالیٰ مال دے دے، اگر ہمارے لیے اچھا یہ ہے کہ ہمیں مال کم ملے اور فاقہ نصیب ہو تو اللہ تعالیٰ ہمیں وہ حال دے دے، صحت مفید ہے تو صحت دے دے، عافیت صحت علم عمل اور عزت راحت جو کچھ بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو حالت پسند ہے اللہ تعالیٰ جس چیز کو حسنة قرار دے دیں ہمارے حق میں جو مفید ہو دنیا کے اندر بھلائی کی شکل میں وہ اللہ تعالیٰ ہمیں عطا کردے اس لیے حسنة کا مصداق ایک متعین نہیں بلکہ جو بھی حالت اچھی ہے اللہ کے علم میں ہمارے لیے "ربنا اتنا فی الدنیا حسنة" کے تحت وہ مانگی گئی ہے اور آخرت کی حسنات متعین ہیں اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات دے دے، اپنی رضا نصیب فرمائے اور جنت کے اندر داخلہ نصیب ہو جائے آخرت کی حسنة اس طرح سے ہے "وقنا عذاب النار" اس کو اہتمام کے ساتھ ذکر کر دیا کہ اللہ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچالے۔

مختلف خصوصیات کی حامل دعا:

یہ بہت جامع دعا ہے جس میں دنیا اور آخرت کے بھلائی مانگی گئی ہے، سرور کائنات ﷺ یہ دعا کثرت سے پڑھا کرتے تھے اور طواف کی حالت میں اس کا پڑھنا مستحب ہے ایک روایت میں آتا ہے کہ رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے متعین ہیں جو شخص وہاں یہ دعا کرتا ہے۔

"ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار" تو فرشتے اس کے اوپر آمین کہتے ہیں تو دنیا اور آخرت دونوں کی خیر کو یہ دعا جامع ہے بلکہ بعض حضرات نے ان کتابوں میں جو عملیات کے بارے میں لکھی ہوئی ہیں تحریر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس دعا کو پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بیوی نیک دیتے ہیں، وہ عذاب النار سے اس کا استنباط کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائے اور بری بیوی کامل جانا دنیا میں یہ بھی جہنم ہے

جس طرح سے ہمارے شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا واسطہ کسی ایسی عورت سے پڑ گیا تھا جس نے بہت زیادہ پریشان کیا تو وہ اسی چیز کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''زنہار زبے بد زنہار ربنا وقنا عذاب النار'' بری عورت سے خدا کی پناہ بری عورت سے خدا کی پناہ اے اللہ! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچانا گویا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تأثر دیا کہ دنیا کے اندر بری بیوی کا ملنا ایسے ہے جیسے دنیا کے اندر انسان جہنم میں داخل ہو گیا۔

اس لیے آپ حضرات جن کی شادی نہیں ہوئی وہ کثرت کے ساتھ اس دعا کو پڑھیں تو اللہ تعالیٰ نیک بیوی عطا کر دیں گے اور جن کی شادی ہو چکی ہے وہ بھی اگر اس کو پڑھتے رہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی بیویوں کو بھی نیک کر دیں گے۔

قرآن وحدیث میں مذکور دعاؤں کا حکم:

بہرحال جس قسم کی دعائیں قرآن کریم کے اندر آئی ہوئی ہیں یا حدیث شریف کے اندر جن کا ذکر صراحتاً آیا ہوا ہے ان دعاؤں کا پڑھنا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کی مثال اس طرح سے سمجھ لیجئے کہ ایک حاکم ہے جس کے سامنے آپ درخواست دینا چاہتے ہیں ایک تو یہ ہے کہ آپ اپنے طور پر درخواست پر ایک مضمون تجویز کریں اس میں ہو سکتا ہے کہ آپ کسی لفظ میں کمی بیشی کر لیں کوئی ایسا لفظ لکھ دیں جو حاکم کے مزاج کے مطابق نہیں ہے یا کوئی اس قسم کا لفظ چھوٹ جائے جس کے ساتھ آپ کا مقصد پوری طرح سے واضح نہ ہو اور وہ درخواست رد ہو جائے یا آپ کے مقصد کے پوری طرح سے وہ مطابق نہ ہو یہ امکان ہوتا ہے۔

لیکن اگر آپ اس حاکم سے پوچھ لیں تو جس کو وہ درخواست کا مضمون بتائے گا اور یہ کہے گا کہ میرے پاس درخواست لاؤ اور اس طرح سے لکھ کر لاؤ یہ مضمون ہونا چاہیئے تو جب آپ وہ مضمون لکھ کر لے جائیں گے تو پھر وہ درخواست کسی ایسے نکتے کی وجہ سے رد نہیں ہوگی کہ فلاں لفظ کیوں لکھا فلاں لفظ کیوں نہیں لکھا پھر یہ تو ہو سکتا ہے کہ جو چیز آپ نے مانگی ہے وہ آپ کے لئے مصلحت نہ ہو حکمت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ وہی نہ دیں اور دے دیں اس کے بدلے میں آپ سے نقصان ٹال دیں ایسا تو ہو سکتا ہے۔

لیکن درخواست کے مضمون کی بناء پر اس درخواست کو رد نہیں کیا جا سکتا اس لیے ہمیشہ دعائیں وہی پڑھنی چاہئیں جس قسم کی قرآن اور حدیث کے اندر آئی ہوئی ہیں یہی موجب برکت ہیں اور ان کے اندر کسی قسم کا نقصان کا پہلو نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ ہم سب کو دنیا اور آخرت کی بھلائی نصیب فرمائے اور دنیا اور آخرت میں اپنی رضا نصیب فرمائے جو کچھ انہوں نے کمایا وہی ان کو ملے گا وہ ان کا نصیب ہے۔

بروں کے لیے وعید اور نیکوں کے لیے بشارت:

"واللہ سریع الحساب" اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں، اس میں بروں کے لیے وعید ہوتی ہے اور نیکوں کے لیے بشارت ہوتی ہے، برے یہ نہ سمجھیں کہ آخرت بہت دور ہے ہم اس وقت تک تو کم از کم عیش اڑالیں جس وقت آخرت نہیں آتی اس وقت تک تو عیش اڑالیں اللہ کے عذاب کو یہ دور نہ سمجھیں اللہ تعالیٰ بہت جلدی حساب لینے والا ہے پتہ نہیں موت کس وقت آجائے گی موت سر پر کھڑی ہے جب مرے اور اللہ کے حساب میں آئے تو اسی وقت ہی سزا شروع ہو جائے گی سمجھو کہ جلدی سامنے آنے والی بات ہے اور نیک لوگ نیکیاں کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ یہ بہت معاملہ ادھار کا ہے پتہ نہیں کتنی مدت کے بعد یہ جزا ملے گی نہیں اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والا ہے۔

اور اس کا نتیجہ بہت جلدی آجائے گا جتنا بھی درمیان میں تمہیں فاصلہ نظر آرہا ہے عمل اور جزا میں لیکن جس وقت تم اس جزا کے پاس پہنچو گے تو ایسے معلوم ہوگا جیسے پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے مزدوری مل گئی ہے یہ درمیان کے فاصلے سب سمٹ جائیں گے اللہ تعالیٰ بہت جلدی اس کا حساب کرتے ہیں تو اس میں دونوں پہلو ہیں بروں کے لیے وعید ہے اور اچھوں کے لیے اس میں بشارت اور ترغیب بھی ہے۔

منیٰ کا قیام دو دن یا تین دن:

"واذکروا اللہ فی ایام معدودات" "معدودات" گنے ہوئے دن، چند گنے ہوئے دنوں میں اللہ کو یاد کرتے رہا کرو اس سے وہی ایام منیٰ مراد ہیں تو معدودات سے دو یا تین دن مراد ہیں۔

اب آگے وہی ایک خیال کی اصلاح کرنی مقصود ہے کہ جاہلیت میں بھی دو قسم کے لوگ تھے بعض کہتے تھے کہ منیٰ میں دو دن ہی ٹھہرنا چاہیئے تیسرے دن ٹھہرنا گناہ ہے، بعض کہتے تھے کہ تین دن ٹھہرنا چاہئے دو دن کے بعد واپس آجانا گناہ ہے یعنی دونوں فریق ایک دوسرے کے عمل کو معصیت قرار دیتے تھے جو تین دن ٹھہرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ جو دو دن میں آ گیا وہ گناہ گار ہے اور جنہوں نے دو دن کی عادت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھتے تھے کہ جو تین دن ٹھہرتے ہیں یہ گناہ گار ہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کو واضح کر دیا کہ اگر کوئی دو دن میں جلدی کر کے چلا جائے تو بھی اس پر کوئی گناہ نہیں۔

اور اگر کوئی دیر کر دے تیسرا دن بھی ٹھہرا رہے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں دونوں عمل جائز ہیں، فی حد ذاتہ جائز دونوں ہیں اگرچہ تیسرے دن ٹھہرنا افضل ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے دن رمی جمار کر کے سورج چھپنے سے پہلے

پہلے منیٰ میں ٹھہرا رہا اور سورج غروب ہوگیا پھر تیسرے دن رمی کرنے سے قبل نہیں آسکتا پھر تیسرے دن کی رمی واجب ہو جاتی ہے۔

لیکن باقی ایام کے اعتبار سے فرق صرف یہ ہے یہ فقہی احکام ہیں فقہ میں تفصیل آپ پڑھتے ہیں کہ پہلے دنوں میں رمی جمار ثلاثہ کی زوال شمس کے بعد ہوتی ہے لیکن تیسرے دن سورج نکلنے کے بعد زوال شمس سے پہلے بھی کی جاسکتی ہے تو رمی کر کے واپس آسکتے ہیں تیسرے دن یہ سہولت ہے جو جلدی کرے دو دنوں میں اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو دیر کر دے اس پر بھی کوئی نہیں یہ سب باتیں اس شخص کے لیے ہیں جو اللہ سے ڈرے اور جس نے اللہ سے نہیں ڈرنا اس کے لیے نہ کوئی قید اور نہ کوئی حد وہ جو چاہے کرتا رہے'' واتقوا اللہ '' اور تم اللہ سے ڈرتے رہو '' واعلموا '' اور اس بات کا یقین رکھو، یہ بات ہمیشہ تمہارے دل میں متحضر رہنی چاہیئے کہ تم اللہ کی طرف جمع کیے جاؤ گے جس وقت اللہ کی طرف جمع کئے جاؤ گے وہاں تمہاری نیکی بدی کا پورا پورا حساب ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی کا تصور اور یقین اور اس کا استحضار، یہ پھر انسان کو تقویٰ اختیار کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور ایسے شخص کے لیے نیکی کی رغبت ہوتی ہے گناہ سے بچنا آسان ہو جاتا ہے جب یہ تصور رہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں ہمارا حساب و کتاب ہوگا نیکیوں کی جزا ملے گی، برائیوں کی سزا ہوگی تو یہ تصور انسان کو برائی سے روکنے کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے۔
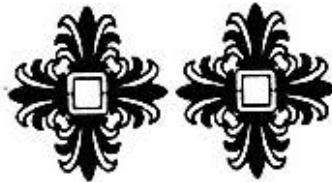
وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ

لوگوں میں سے بعض وہ ہے کہ اس کی بات آپ کو اچھی لگتی ہے دنیاوی زندگی میں اور وہ شخص گواہ بناتا ہے

اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى

اللہ کو اس چیز پر جو اس کے دل میں ہے جھگڑنے والوں میں سے وہ ضدی ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جس وقت وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے کوشش کرتا ہے

فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ

زمین میں تا کہ اس میں فساد برپا کردے اور ہلاک کردے کھیتی کو اور حیوانات کو ، اللہ تعالیٰ

لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ

فساد کو پسند نہیں فرماتے ﴿۲۰۵﴾ اور جس وقت اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر تو غرور اس کو گناہ پر برانگیختہ کرتا ہے

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ

پس اس کے لیے جہنم کافی ہے ، البتہ وہ برا ٹھکانہ ہے ﴿۲۰۶﴾ لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو بیچتا ہے

نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اپنی جان اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے ، اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ نرمی کرنے والے ہیں ﴿۲۰۷﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اطاعات میں پورے ، نہ چلو پیچھے

الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

شیطان کے ، بے شک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ

جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ

تمہارے پاس واضح واضح دلائل آ گئے تو یقین کر لو بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے اور حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ نہیں انتظار کرتے یہ لوگ

اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ

مگر اس بات کا کہ آ جائے ان کے پاس اللہ بادل کے سائبانوں میں اور آ جائیں فرشتے

وَقُضِيَ الْأَمْرُ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾

اور معاملہ پورا کر دیا جائے ، امور اللہ کے طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں ﴿۲۱۰﴾

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

احکام حج کے تذکرہ میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر آیا تھا ایک طالب دنیا اور ایک طالب آخرت، طالب دنیا کافر بھی ہوسکتا ہے، منافق بھی ہوسکتا ہے اور طالب آخرت مومن ہی ہے جس کا پیچھے ذکر آیا تھا اسی کی مناسبت سے یہاں دو قسم کے لوگ ذکر کیے جا رہے ہیں ایک وہ شخص جو کہ دنیاوی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے حیلے بہانے اختیار کرتا ہے اور ایک وہ شخص جس کے دل میں آخرت کے طلب ہوتی ہے اور آخرت کی طلب کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دیتا ہے، انہیں دو کی یہاں وضاحت کرنا مقصود ہے۔

شان نزول:

پہلی آیت جو آپ کے سامنے پڑھی گئی '' ومن الناس من یعجبك قوله '' اس آیت کے شان نزول میں ایک واقعہ لکھا ہے لیکن اس اصول کو ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ آیات شان نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوتیں، شان نزول محض اس لیے بیان کیا جاتا ہے تا کہ الفاظ قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے کسی درجے میں ایک مصداق محقق ہو جانے کے بعد کہ ایک مصداق اس کا ہمارے سامنے آ گیا جس کے بعد ان الفاظ کا مطلب سمجھنا آسان ہو گیا ورنہ آیت اپنے شان نزول کے ساتھ خاص نہیں ہوا کرتی جو شخص بھی اس قسم کے احوال کا حامل ہوگا اس کے اوپر یہ قرآن کریم کے الفاظ ثابت آئیں گے اور قیامت تک آنے والے حالات کے اوپر اس کا انطباق اسی طرح ہوتا چلا جائے گا۔

ایک منافق تھا جس کا نام غالباً اخنس بن شریق لکھا ہے سرور کائنات ﷺ کی مجلس میں آتا تھا زبان کا بڑا فصیح بڑا بلیغ تھا، بڑی چرب زبانی کرتا، سامنے بیٹھ کر بڑی محبت کا اظہار کرتا، بڑے اخلاص کو نمایاں کرتا اور بات بات میں یوں کہتا کہ اللہ گواہ ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں میرے دل میں یہی ہے، میں بڑا مخلص ہوں آپ کے حق میں تو اس طرح مشورے دینے کی کوشش کرتا اور یوں وہ سرور کائنات ﷺ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا مقصد اس کا کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل کرے دنیاوی فوائد حاصل کرے اور جو اس کی فطرت خراب

تھی خبیث تھی تو باہر نکل کر فساد مچاتا تھا کسی کی کھیتی اجاڑتا، کسی کے جانوروں کو نقصان پہنچاتا اپنی اس خبیث فطرت کو چھپانے کا اس نے یہ ذریعہ بنایا ہوا تھا کہ چاپلوسی کر کے تعریف کر کے آپ کی مجلس میں قرب حاصل کرتا ایسے موقع پر مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ جب لوگ ہمیں دیکھیں گے کہ ہم بڑے مقرب ہیں اول تو کوئی ہماری شکایت کرنے کی کوشش نہیں کرے گا کہ شکایت ہم اس کی کیا جا کر کریں اس کا تو تعلق ہی بڑا ہے کوئی جرأت نہیں کرے گا شکایت کرنے کی اور اگر کوئی شکایت کرے گا بھی تو سرور کائنات ﷺ اس کا اعتبار نہیں کریں گے کہ وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے دیکھو اس قسم کی باتیں میرے ساتھ کرتا ہے وہ ایسا فساد کہاں کر سکتا ہے اس طرح سے انسان کو اپنی خباثتیں کرنے کا ایک پردہ مہیا ہو جاتا ہے یہ اس کی بھی عادت تھی۔

منافقین کا کردار قرآن کی زبانی:

اور عام طور پر منافقین نے یہی رویہ اختیار کیا ہوا تھا اور اس قسم کے لوگ جماعتی نظم میں بدترین قسم کے ہوتے ہیں اور انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو وقت کا حاکم ہے جو وقت کا سردار ہے جو مقتداء ہے پیشوا ہے اس کے اردگرد اگر ایسے لوگوں کا دائرہ ہو جائے چاپلوسی کرنے والوں کا جو اس تحریک کے حق میں اس جماعت کے حق میں مخلص نہ ہوں اور سردار لیڈر اور راہنما کے اردگرد ایسے لوگ جمع ہو جائیں تو وہ کوشش کرتے ہیں اپنے قائد کو اپنے لیڈر کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کی وہ ان کی باتیں سن کر کچھ سمجھ رہا ہوگا اور جماعت کے اردگرد سب فساد ہی فساد ہوگا اور جس وقت ان کا دائرہ ٹوٹے گا تو دائرہ ٹوٹنے کے بعد پھر پتہ چلے گا کہ کتنا نقصان ہو گیا باقی جماعت ساری کی ساری حاکم وقت پر قائد پر لیڈر پر بداعتماد ہوتی چلی جائے گی اور اس طرح سے شیرازہ بکھر جائے گا تو جماعت کا پھیلاؤ رک جاتا ہے جو مخلص کارکن ہوتے ہیں ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور یہ چاپلوس قسم کے لوگ چرب زبان قسم کے لوگ قائد کو مطمئن کرتے ہیں کان بھر بھر کے اور جن کے ساتھ ان کی کسی قسم کی مخالفت ہوتی ہے ان کے خلاف بھڑکاتے ہیں اس طرح سے یہ اپنا عارضی طور پر مفاد حاصل کرتے ہیں لیکن جماعت کا نقصان ہو جاتا ہے بداعتمادی پھیلتی ہے، بدگمانی پھیلتی ہے، نظم نہیں رہتا منافقین نے یہی رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔

تو اس قسم کے دشمنوں سے اللہ تعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ کو مطلع کیا ہے کہ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہیں یہ سب دنیاوی زندگی کے خواہاں ہیں اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر آپ کے کانوں میں آ کر گھستے ہیں اور اس طرح سے آپ کے کان بھرتے ہیں حقیقت کے اعتبار سے انتہائی فسادی لوگ ہیں ان کی کوشش یہی ہے کہ علاقے کے اندر

فساد برپا ہے کسی کے حیوانات کو نقصان پہنچاتے ہیں، کسی کی کھیتی کو نقصان پہنچاتے ہیں ایسے لوگوں سے ذرا ہوشیار رہا کیجئے یہ بڑے بڑے جھگڑالو قسم کے لوگ ہیں، بڑے زبان دراز ہیں، آپ کے سامنے کچھ ہیں اور پیچھے کچھ ہیں اس قسم کے لوگوں کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی فرمائی اور سورۃ المنافقون کے اندر بھی ان کا کچھ تذکرہ کیا ہے سورۃ المنافقون میں کچھ لفظ اس طرح سے آئے ہوئے ہیں "اذا رأیتھم تعجبك اجسامھم وان یقولوا تسمع لقولھم کانھم خشب مسندۃ یحسبون کل صیحۃ علیھم ھم العدو فاحذرھم "خوشحال لوگ ہیں خوش پوشاک لوگ ہیں چہرے صاف ستھرے ہیں جس طرح سے کہ پالش وغیرہ کر کے چمکے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ چمکتے چہروں والے یہ خوش پوشاک جس وقت آپ کے سامنے آتے ہیں تو "تعجبك اجسامھم "ان کا قدوقامت ان کے جسموں کی ظاہری ہیئت ان کی مالش بالش کنگھی پٹی آپ کو بڑی اچھی لگتی ہے آپ دیکھنے میں ان کو بڑے اچھے سمجھتے ہیں۔

"وان یقولوا "اور پھر یہ بولنے میں اتنے ہوشیار ہیں کہ جب یہ بات کرتے ہیں "تسمع لقولھم " آپ ان کی باتوں پر کان لگاتے ہیں ان کی باتیں آپ کو ظاہری طور پر بڑی اچھی لگتی ہیں لیکن ہیں یہ اس قسم کے بزدل کھوکھلے کہ ہمدردی کے دعوے بہت کرتے ہیں لیکن جس وقت موقع آئے گا موقع پر سب بھاگ جائیں گے کسی وقت بھی کوئی قربانی دینے کے لئے تیار نہیں بزدل اتنے ہیں اندر سے بالکل کھوکھلے کہ جس وقت بھی کہیں سے کوئی شور پکار اٹھتی ہے تو ان کے دل اندر سے دھڑکنے لگ جاتے ہیں کہ پتہ نہیں ہمارے خلاف ہی کوئی شرارت پھیل رہی ہے کیونکہ مجرم ہوتے ہیں لہٰذا کسی طرف سے بھی کوئی بات ہو تو ان کو ڈر لگتا ہے کہ ہمارے خلاف ہی تحریک چل رہی ہے اور ہمارے خلاف ہی کوئی آواز اٹھ رہی ہے۔

یہ تو اس طرح سے ہیں کہ جس طرح سے بے جان لکڑیاں اور ان کو کوئی اچھا سا لباس پہنا کر کوئی سہارا دے کر کھڑا کر دے "کانھم خشب مسندۃ" یہ تو سہارا دے کر کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں اس لئے ان کے ظاہر پر آپ نہ جایئے "ھم العدو فاحذرھم "یہ دشمن ہیں ان سے بچ کے رہا کرو تو اس قسم کے افراد کو تاڑ کر رکھنا یہ قائد کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے ورنہ اگر اس قسم کے لوگوں کا دائرہ اس کے ارد گرد لگ جائے جو باتوں باتوں سے مطمئن کرنا جانتے ہیں ایسے مخلص نہیں ہوتے ہمدرد نہیں ہوتے ان کے اندر کوئی کسی قسم کی قربانی کا جذبہ نہیں ہوتا بہادر نہیں ہوتے بلکہ اپنی شرارتوں کو چھپانے کے لئے یا اپنی خباثتوں کو چھپانے کے لئے وہ قائد کے کانوں لگتے ہیں دوسروں کے متعلق بدگمانی پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں بدترین قسم کے دشمن یہ ہوتے ہیں جو جماعت کو نقصان

پہنچاتے ہیں، مشن کو نقصان پہنچاتے ہیں اور مخلص لوگوں کی دل شکنی کا باعث بنتے ہیں تو اس قسم کے فسادیوں کی نشاندہی اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمائی ہے۔

اور پھر حال ان کا یہ ہے کہ اگر انہیں کوئی کہہ دے کہ بھائی تم یہ شرارت نہ کرو، تم اس بات سے باز آجاؤ تو "اخذته العزة بالاثم" اس کا مطلب یہ ہے کہ پھر ان کا غرور نفس اور ان کی عزت نفس ان کو مہلت نہیں دیتی کہ وہ نصیحت کرنے والوں کی نصیحت پر کان رکھیں بلکہ غرور میں آکر اور زیادہ شرارت کرتے ہیں ان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر کسی کے کہنے سے ہم ایک دفعہ مان گئے تو ہماری کمزوری واضح ہو جائے گی کہ ہم ان کے سامنے نیچے ہیں اور نصیحت کرنے والا ہم سے بالاتر ہے یہ خبیث النفس انسان کی عادت ہوتی ہے کہ اگر اس کو کوئی سمجھائے تو سمجھانے کے بعد مزید وہ ضد میں آتا ہے صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میرے مان جانے کی صورت میں میری عزت کو میرے غرور کو یہ نقصان پہنچے گا کہ لوگ کہیں گے کہ بھائی دیکھو فلاں نے اس کو روکا تھا اور یہ رک گیا تو روکنے والے کی برتری ثابت ہو جائے گی تو جتنا کوئی روکنے کی کوشش کرے اس کا غرور اس کو شرارت پر برانگیختہ کرتا ہے۔

اور اس قسم کی بات وہاں سورۃ المنافقون میں بھی ہے "اذا قيل لهم تعالوا يستغفرلكم رسول الله" ان سے جب کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول کی خدمت میں آجاؤ اور آکر معافی مانگ لو اللہ کا رسول تمہارے لئے استغفار کرے گا "لووا رء وسهم ورأيتهم يصدون وهم مستكبرون" اپنے سروں کو یوں موڑ کر چل دیتے ہیں اور تو ان کو دیکھے گا کہ وہ تم سے اعراض کریں گے اس حال میں کہ وہ تکبر کرنے والے ہوں گے تو وہاں بھی اس تکبر کی وجہ سے کہا کہ ان کا تکبر یہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ کی خدمت میں آکر معذرت کریں اور آپ سے یہ کہیں کہ ہم سے غلطی ہوگئی ہمیں آپ بھی معاف کر دیجئے اور اللہ تعالیٰ سے بھی ہمارے لئے استغفار کیجئے ان کا تکبر ان کا غرور ان کو یہ مہلت نہیں دیتا تو ایسے سرکش لوگ جو باتوں باتوں میں آکر مطمئن کرنا چاہیں ان کے اوپر کسی صورت اعتماد نہ کیجئے "هم العدو" یہ حقیقت کے اعتبار سے دشمن ہیں جیسے سورۃ المنافقون کے اندر ان کی یہ باتیں ذکر کر کے ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محتاط کیا گیا تو یہاں بھی یہی بات ہے۔

چاہے یہ واقعہ ایک شخص کا ہو لیکن صادق آئے گا اس قسم کے سب لوگوں پر جو چرب زبانی کے ساتھ چاپلوسی کے ساتھ قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اندر سے مخلص نہیں ہوتے اپنی شرارتوں کو چھپانے کے لئے قائد کے ساتھ اپنے سردار کے ساتھ اپنے حاکم کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تعلقات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہماری شرارتیں چھپی رہیں کوئی ہماری شکایت نہ کرے اگر کوئی ہماری شکایت کر بھی دے گا تو اس کا اعتبار نہ کریں ایسے لوگوں کے اوپر یہ آیات صادق آئیں گی جو یہاں قرآن کریم کے اندر آپ کے

سامنے پڑھی گئی ہیں کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جن کی باتیں آپ کو دنیاوی زندگی کے بارے میں اچھی لگتی ہیں، ان کی گفتگو ساری کی ساری دنیاوی زندگی کے لئے ہوتی ہے وہ دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پھر چونکہ عمل تو ان کے پاس ہوتا نہیں کہ اپنے عمل کے ساتھ ثابت کرسکیں کہ ہم مخلص ہیں ان کی کاروائیاں ان کے صدق کی دلیل نہیں وہ کوئی قربانیاں دیتے ہوں جانی قربانیاں دیتے ہوں ان کا کوئی کردار واضح ہو جس کی وجہ سے پتہ چلے کہ جو یہ زبان سے کہتے ہیں واقعی سچی بات کہتے ہیں دل میں ان کے یہی ہے کہ دیکھوان کا عمل ان کے قول کی تصدیق کرتا ہے اس سے تو وہ خالی ہوتے ہیں۔

اور چونکہ ان کو باتوں باتوں کے ساتھ ہی مطمئن کرنا ہوتا ہے وہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں کردار کے غازی نہیں ہوتے تو اپنے اس بھرم کو قائم رکھنے کے لئے اور اپنی باتوں میں وزن کرنے کے لئے بات بات پر قسم کھائیں گے، اللہ کو گواہ قرار دینا یہ قسم سے کنایہ ہے اگر عمل کا وزن ساتھ ہو تو جو انسان منہ سے کہتا ہے عملی زندگی بھی اس کی تائید کرے تو اپنے سچے ہونے پر قسم کی کیا ضرورت ہے آپ کہا کرتے ہیں کہ عطر تو اپنا ثبوت خود مہیا کرتا ہے کہ میں خوشبودار ہوں عطار تعریف کرکر کے کہے کہ یہ بہت خوشبودار ہے تو اس طرح سے کوئی چیز خوشبودار ثابت نہیں ہوتی عطر تو وہ ہوتا ہے جو خود مہکے عطر وہ نہیں ہوتا جس کے متعلق عطار کہے کہ اس میں سے خوشبو آتی ہے یہ کہنے کی نوبت کب آئے گی کہ اس میں سے خوشبو آتی ہے جب وہ خود مہکتا نہیں ہے۔

اسی طرح سے اگر انسان کا کردار مضبوط ہو تو جو وہ منہ سے کہتا ہے اس کے مطابق اس کا کردار بھی ہے تو کیا ضرورت ہے قسمیں کھانے کی اپنا اخلاص ثابت کرنے کی آپ کا کردار خود بتائے گا کہ تم کتنے ہمدرد ہو کتنے مخلص ہو کہ فلاں وقت امتحان آیا تھا آپ نے اپنا مال قربان کردیا، فلاں وقت ضرورت پڑی تھی آپ نے اپنی جان لگادی جب یہ واقعات خود نمایاں ہوتے ہیں تو پھر اپنے صدق پر اخلاص پر قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی قسمیں کھانے کی نوبت تبھی آیا کرتی ہے کہ جب کردار تائید نہ کرے قول کی، گفتار اور قسم کی ہو کردار اور قسم کا ہو پھر قسمیں کھا کھا کر اس طرح سے وہ اعتماد جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"یشھد اللہ علیٰ مافی قلبہ" اسی قسم کی چیز ہے اپنے دل کے جذبات پر اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ قرار دیتے ہیں یہ بہت بدترین قسم کا سخت قسم کا جھگڑالو ہے اس لئے جھگڑنے میں بہت دلیر، باتیں بنانے میں بہت ہوشیار اور اپنی بات کو جمانے اور بنانے کے لئے اس کو بڑا سلیقہ آتا ہے سخت جھگڑالو ہے اور جب آپ کی مجلس سے اٹھ کر جاتا ہے اور پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو پھر اس کی کوشش سارے علاقے میں یہی ہوتی ہے کہ یہ دین حق جو کہ اس

علاقے کے اندر ایک اصلاح کی تحریک ہے اصلاح کا باعث ہے جس کے جاری ہونے کے ساتھ شر وفساد ختم ہوجاتا ہے اس دین کی مخالفت کرتا ہے۔

دین کی مخالفت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ علاقے میں فساد برپا کرتا ہے کہ جس طرح سے پہلے قبائلی جنگیں تھیں جس طرح سے پہلے لوگ اخلاق سے آزاد تھے اور خوف خدا سے آزاد تھے قتل وغارت ایک دوسرے کی لوٹ مار باغوں اور کھیتیوں کو اجاڑنا جس قسم کے حالات پہلے تھے اس کی کوشش یہ ہے کہ یہی حالات پھر ہوجائیں اور اللہ کا قانون جو نافذ ہو رہا ہے اللہ کا دین جو آ رہا ہے جو کہ ہر کسی کے لئے حفاظت اور اصلاح کا ذریعہ ہے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور فخر وغرور کے ساتھ آکے خود بھی نقصان کرتا ہے اور اس کی اسلام کی مخالفت مستقل فساد کا ذریعہ ہے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے جس طرح سے کہ اسلام کے آنے سے قبل جنگیں ہوتی تھیں لوٹ مار ہوتا تھا لوگوں کی کھیتیاں بھی برباد ہوتی تھیں لوگوں کی جانیں بھی برباد ہوتی تھیں حیوانات بھی برباد ہوتے ہیں۔

تو اسلام کی مخالفت گویا کہ اسی قسم کے فساد برپا کرنے کی کوشش ہے کوشش کرتا ہے کہ علاقے میں فساد برپا کردے اور ہلاک کردے کھیتی کو اور نسل کو واللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا اس قسم کے لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں تو جب اس قسم کے لوگ اللہ کو پسند نہیں تو آپ کو بھی یہ لوگ پسند نہیں ہونے چاہئیں "واذا قیل لہ اتق اللہ" جب اسے کہا جاتا ہے کہ تو اللہ سے ڈر اس کی شرارتوں پر اس کو تنبیہ کی جاتی ہے "اخذتہ العزۃ بالاثم" تو اس کا غرور اس کی عزت اس کو گناہ پر برانگیختہ کرتی ہے "فحسبہ جھنم" اس کے لئے جہنم کافی ہے "ولبئس المھاد" اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے یعنی اس دنیا کے اندر اگر اس کو سزا نہ بھی ملے تو جہنم آئے گی تو سب کسریں پوری کردے گی اگلا پچھلا سب حساب پورا ہوجائے گا "فحسبہ جھنم ولبئس المھاد"۔

مخلص صحابہ رضی اللہ عنہم جان اور مال نچھاور کرنے والے:

اور اس کے مقابلہ میں بعضے ایسے بھی ہیں جن کو تاڑ کر رکھنا چاہیئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے قابل اعتماد یہی لوگ ہیں جو کہ اللہ کی رضا کے لئے اپنی جان تک کو کھپا دیتے ہیں جان تک کو قربان کردیتے ہیں یہ مفلس لوگ بعضے ایسے بھی ہیں سارے انسان ایک جیسے نہیں ہوتے ان کا بھی تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں۔

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ جب مکہ معظمہ سے چلے ہیں تو مشرکین نے ان کا راستہ روکا تو انہوں نے آگے سے یہ کہا کہ دیکھو میرے پاس اتنے تیر ہیں اور یہ تلوار ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ میں اچھا تیر انداز ہوں اور اچھا

شمشیر باز ہوں اس وقت تک تم میرے پاس نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ میرے ترکش میں ایک بھی تیر باقی ہے اور تیر ختم ہو جانے کے بعد پھر میں تمہارا مقابلہ تلوار سے کروں گا پھر آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا، اس لئے تم میرے ساتھ مزاحمت نہ کرو میں تمہیں ایک اور چیز بتا دیتا ہوں ایک جگہ اتنا مال رکھا ہوا ہے جاؤ جا کر لے لو میری جان چھوڑ دو تو وہ روکنے والے اس پر مطمئن ہو گئے چھوڑ کر چلے گئے اب یہ ہجرت کر کے جو آرہے تھے تو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے نہ جان کی پرواہ تھی نہ مال کی پرواہ تھی یہ تو ایک صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جیسے میں نے عرض کیا تھا کہ آیت خاص نہیں ہوا کرتی شان نزول کے ساتھ۔

جتنے بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم ملے خاص طور پر مکی زندگی میں انہوں نے اپنی جانیں بھی قربان کیں اور مال بھی قربان کیا اور مدینہ منورہ میں آنے کے بعد جو انصار آپ کے ساتھ شامل ہوئے ان میں بھی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی بعض منافق تھے جن کا ذکر اوپر آیا مکی زندگی میں جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ان میں منافق کوئی نہیں تھا یہ بات یاد رکھئے، کیونکہ منافق تو اس لئے نفاق اختیار کیا کرتا ہے کہ ظاہر داری کے اندر اس کو دنیا کا نفع معلوم ہوتا ہے لیکن مکہ معظمہ کے اندر جو کلمہ پڑھتا تھا اس کو مصیبت آتی تھی کلمہ پڑھنے کے اندر اس کو کیا دنیا کا نفع تھا اس لئے وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ نفاق کے طور پر کوئی کلمہ پڑھے نفاق تو وہاں آیا کرتا ہے کہ جہاں ظاہر کے ساتھ کوئی فائدہ اٹھانا ہو اور یہاں سے یہ ظاہر ہے کہ اگر اختیار کیا جاتا ہے ایمان دل میں ایمان نہ ہو تو پٹنا ہی تھا پٹنے کے لئے نفاق کون اختیار کرتا ہے۔

اس لئے مکہ معظمہ میں جو لوگ بھی مؤمن ہوئے جنہوں نے کافروں سے ماریں کھائیں پتھر کھائے گھر بار چھوڑا اور ہر چیز کو قربان کر کے ان کو اپنا علاقہ تک ترک کرنا پڑا تو یہ علامت ہے کہ انہوں نے اخلاص کے ساتھ ہی ایمان کو قبول کیا ان کے اندر نفاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے نفاق اگر آیا ہے تو مدینہ منورہ میں آیا ہے جس وقت مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور اسلام قبول کرنے کے ساتھ کچھ دنیاوی مفادات قائم ہونے لگ گئے تھے تب اس قسم کے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے دنیا کا فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسلام کو قبول کیا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھا تو جتنے بھی یہ جانباز قسم کے لوگ تھے انہوں نے اپنا مال اور جان اللہ کے راستے میں قربان کیا وہ سب اس آیت کا مصداق ہیں۔

مقابلۃً ان کو ذکر کر دیا کہ بعضے لوگ ایسے ہیں یہ سب اس قابل ہیں کہ ان کی قدر کی جائے، اس قابل ہیں کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اللہ کی رضا کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں لوگوں میں سے بعض وہ ہیں، بعض وہ ہے (مفرد کے ساتھ اگر ترجمہ کریں) جو بیچ دیتا ہے اپنی جان اللہ کی رضا حاصل کرنے

کے لئے، کھپادیتا ہے اپنی جان، صرف کردیتا ہے اپنی جان اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایسے بندوں پر شفقت کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ کو بڑی شفقت ہے ان بندوں پر جیسے پیچھے آیا تھا "واللہ لایحب الفساد" کہ ایسے مفسدین سے اللہ کو محبت نہیں ہے اور جو اس قسم کے بندے ہیں جو اللہ کی رضا کے لئے مال جان قربان کرتے ہیں ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کو بہت شفقت ہے اور بہت مہربانی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو احتیاط کی تاکید:

اتنا احتیاط کردیا کہ آپ کے پاس اردگرد بیٹھنے والے سارے مخلص نہیں سارے منافق نہیں اور حالات کے ساتھ پتہ چل جایا کرتا ہے کہ کون قابل اعتماد ہے اور کون قابل اعتماد نہیں عنوانات اس قسم کے دے دیے اشارے اس قسم کے دے دیے کہ جن کے حالات اس قسم کے ہوں سمجھو کہ وہ قابل اعتماد نہیں ہوتے جن کے اس قسم کے ہوں وہ قابل اعتماد ہوتے ہیں قرآن کریم میں اور بھی بہت ساری آیات ہیں جن میں منافقوں کی علامات بیان کی گئی ہیں "ولتعرفنھم فی لحن القول" ایک جگہ یہ بھی ہے کہ آپ ان کو لب ولہجہ سے ہی پہچانتے ہیں مخلص اور منافق کا لب ولہجہ مختلف ہوتا ہے غور کریں گے تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ کون باتوں والا ہے اور کون کردار والا ہے ان کے لب ولہجے سے آپ پہچان لیں گے اور بعض اس قسم کے بھی تھے کہ بالکل ان کا نفاق چھپا ہوا تھا ان کا پتہ چلتا ہی نہیں تھا۔

بہرحال اتنا احتیاط کردیا کہ ہر قریب آنے والے کو قابل اعتماد نہ سمجھا کرو ان میں سے بعضے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے مفاد کے لئے قریب آتے ہیں اور ان کے مقاصد اچھے نہیں ہوتے اور وہ مخلص نہیں ہوتے جو بھی قریب آجائیں اور ذرا سی میٹھی میٹھی باتیں کریں اور دانت دکھائیں تو ان پر ہی اعتماد کرنا شروع کردیں تو یقیناً آپ کہیں نہ کہیں دھوکہ کھا جائیں گے اس لئے اعتماد کے لئے اس کا جانچنا پرکھنا اس کے کردار کو دیکھنا اس کے قول اور عمل کی مطابقت کو دیکھنا یہ بہت اہم چیز ہے زندگی کے اندر جو شخص ہر کسی پر اعتماد کرے اور باتوں میں آجائے اس کو آپ بھی کہا کرتے ہیں کہ یہ کانوں کا کچا ہے بھائی جو کوئی اس کو جا کر کہہ دے گا بس اسی کے پیچھے لگ جائے گا اور ایسا آدمی جگہ بجگہ دھوکے کھاتا ہے اور ٹھوکریں کھاتا ہے۔

یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ کا مفہوم:

"یایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ" اس آیت کے متعلق بیان القرآن میں یہ لکھا ہے کہ پیچھے چونکہ مخلص کی تعریف آئی تو بسا اوقات اخلاص کے جذبے سے انسان کچھ غلو اختیار کرجاتا ہے اور اس غلو کی بناء پر

بدعت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے آگے یہ تنبیہ کی ہے کہ اخلاص بھی اعتدال کے ساتھ ہونا چاہیئے اور اس کا معیار یہ ہے کہ اسلام کے احکام پورے پورے کامل مکمل تسلیم کرو اور اپنے طور پر تم نیکی کے جذبے سے ایسی صورتیں نہ بنالو کہ جس کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔

اور شان نزول کے طور پر یہاں ایک بات لکھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہ یہودیوں کے عالم تھے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لے گئے تو یہ پہلے پہلے ہی مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں پہلی ملاقات میں ہی جس وقت یہ مسلمان ہو گئے تو ان کے دل میں خیال آیا کہ یہودی ملت میں ہفتہ کے دن کی تعظیم ضروری ہے ہفتہ کے دن کوئی کسی قسم کا کام کرنا مشغولیت رکھنا ٹھیک نہیں ہے اس دن کو عبادت کے لئے رکھنا ضروری ہے اور اسلام میں ہفتے کی تعظیم کو واجب نہیں کیا کہ اس کی تعظیم نہ کرو اور اس میں کوئی کسی قسم کا کام کرنا ضروری ہے یا کوئی ضروری نہیں اس لئے اگر ہم ہفتہ کے دن کو اسی طرح سے فارغ رکھیں تو یہودیت کی رعایت بھی رہ جائے گی اور اسلام کے بھی کسی تقاضے کے خلاف نہیں ہے۔

اور اسی طرح سے اونٹ کا گوشت یہودیوں کے لئے حرام تھا توراۃ میں، توراۃ کی تعلیم میں اونٹ کا گوشت حرام قرار دیا گیا تھا حضرت یعقوب علیہ السلام سے اس کی حرمت چلی تھی چوتھے پارے کے شروع میں یہ بات آئے گی، اور اسلام میں گوشت کھانا فرض نہیں ہے اس لئے اگر آپ میں سے کسی نے آج تک اونٹ کا گوشت نہیں کھایا تو آپ گناہ گار نہیں، اس لئے انہوں نے سوچا کہ اگر ہم اس کو حلال سمجھتے ہوئے عمداً ترک کر دیں کہ نہ کھائیں اس کا دودھ نہ پئیں اور گوشت نہ کھائیں تو اس سے یہودیت کی بھی رعایت رہ جائے گی اور اسلام کی بھی رہ جائے گی تو دونوں کی رعایت رکھی جاسکے اس میں کیا حرج ہے، حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یا دوسرے اس قسم کے لوگ جو تھے انہوں نے کچھ اس انداز سے سوچنا شروع کیا لیکن آپ دیکھ رہے ہیں جب انسان اس انداز سے سوچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں ابھی تک یہودیت کی عظمت ہے اس لئے وہ اس کے احکام کی رعایت کرنے کی طرف متوجہ ہے۔

جب کہ اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلی ملت منسوخ ہوگئی اب اپنے سارے کے سارے جذبات جو ہیں ملت اسلامیہ کے مطابق رکھو ویسے اگر آپ ہفتہ کے دن فارغ رہ جائیں تو بری بات نہیں ہے لیکن اس جذبے سے فارغ رہنا کہ یہودیت کا تقاضا ہے اور اس طرح سے اگر آپ عملاً گوشت نہ کھائیں تو کوئی حرج نہیں اونٹ کا گوشت ساری زندگی نہ کھاؤ گناہ نہیں ہے لیکن اس جذبے سے احتیاط کرنا کیونکہ یہ یہودیت کا تقاضا ہے کہ اونٹ کا گوشت نہ کھایا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ دل ودماغ ابھی پوری طرح اسلام کے سانچے میں

ڈھلا نہیں ہے کچھ کچھ توجہ دوسری طرف بھی ہے تو اس قسم کا اخلاص اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اس قسم کے جذبات پھر انسان کو بدعت میں مبتلا کر دیتے ہیں اور شریعت اسلامیہ کے ساتھ وہ لگاؤ قلب کا پوری طرح سے نہیں رہتا جس کو یکسوئی کے ساتھ ہم تعبیر کریں کہ انسان پوری طرح سے شریعت اسلامیہ سے مطمئن ہو گیا اور اس کی توجہ کسی دوسری طرف نہیں ہے۔

تو ایسے جذبات پر یہاں انکار کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ اے ایمان والو! کامل مکمل طریقے سے اسلام میں داخل ہو جاؤ تمہارے دل اور دماغ میں کسی دوسری ملت کی عظمت کسی دوسری شریعت کی عظمت باقی نہیں رہنی چاہیئے کہ تم اس کی بھی رعایت رکھنے کی ضرورت محسوس کرو ان جذبات کے اوپر کنٹرول کرنے کے لئے یہ آیات آئیں اس طرح سے بھی اس کا مفہوم صاف ہو گیا کامل مکمل طریقے سے اسلام میں داخل ہو جاؤ کسی دوسری چیز کی طرف نہ جھانکو، وہ تمہارا اسلام ہی ہے جس کے مطابق تم نے کردار اختیار کرنا ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری چیز کی عظمت اپنے دل میں لانے کی کوشش نہ کرو ایسا اخلاص کہ جس میں اسلام کے مقابلہ میں کسی دوسرے دین یا دوسری ملت کی دل میں عظمت ہو یہ مناسب نہیں ہے۔

ادخلو فی السلم کافۃ کا دوسرا مفہوم:

اور اگر کافۃ کو اس علم کے ساتھ لگا لیجیے تو بھی مطلب وہی نکلے گا لیکن تاویل میں فرق پڑ جائے گا، کامل مکمل اسلام قبول کرو یہ نہیں کہ کچھ کچھ اسلام اور کچھ کچھ کوئی اور چیز جس طرح سے کہیں کہ ہمارا دین اسلام ہے ہماری سیاست جمہوریت ہے اور ہماری معاشرت سوشلزم ہے اس قسم کی بات "ادخلوا فی السلم کافۃ" کے منافی ہے کہ کسی شعبے میں تو اسلام لے لیا کسی شعبے میں کوئی دوسری چیز لے لی، یا کہیں کہ اسلام تو صرف عبادات تک ہے عقائد تک ہے باقی تجارت میں دنیا کے اصول اپنائے جا سکتے ہیں، سیاست میں مروجہ سیاست کو اپنایا جا سکتا ہے اس قسم کا انداز اگر کوئی رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کامل مکمل طریقے سے اسلام کو قبول نہیں کیا۔

اسلام کو کامل مکمل طریقے سے اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سیاست کے اصول بھی اسلام سے لو، معاشیات کے اصول بھی اسلام سے لو، تجارت کے اصول بھی اسلام سے لو، جب تمہارے گھر میں سب کچھ موجود ہے پھر تم اس کو چھوڑ کر دوسروں سے لے لے کر اس کے ساتھ پیوند کیوں لگاتے ہو یہ پیوند لگانے کا مطلب یہ ہے کہ تم اسلام پر پوری طرح مطمئن نہیں ہو تم یہ سمجھتے ہو کہ اسلام زندگی کے بعض شعبوں کے اندر راہنمائی کرتا ہے یہ بات

غلط ہے اسلام کو پورا پورا لے لو اس کی کسی بات کو چھوڑو نہیں اور پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اسلام کے علاوہ کسی دوسری چیز کی طرف جھانکنے کی کوشش نہ کرو تب جا کر سمجھا جائے گا کہ تم کامل مؤمن ہو اور کامل مسلم ہو۔

اور اگر اسلام کی ہدایات واضح واضح تمہارے سامنے آگئیں اور واضح واضح ہدایات آنے کے بعد پھر تم پھسلتے ہو تو تم شیطان کے متبع قرار پاؤ گے اور جب شیطان کے متبع قرار پاؤ گے تو پھر یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے پھر تمہارے اس قسم کے لولے لنگڑے اسلام کا اللہ کے ہاں کوئی اعتبار نہیں ہے، اگر واضح واضح دلائل کے آنے کے بعد پھر بھی تم اس قسم کے شیطانوں کے پیچھے لگتے ہو جو تمہیں اس قسم کے سبق پڑھاتے ہیں ان کی اتباع قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح سے اسلام پر مطمئن نہیں یا اسلام کو کامل دین سمجھتے ہی نہیں تو اس قسم کا ناقص عمل اور ناقص عقیدہ آخرت میں کام نہیں آئے گا "من بعد ماجاء تھم البینات" جس میں تمہارے سامنے واضح دلائل آچکے ہیں واضح ہدایات آچکی ہیں اس کے آنے کے بعد بھی اگر تم پھسل جاؤ گے تو پھر اللہ تعالیٰ پکڑے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور فقہاء کا آپس میں اختلاف:

اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے متعلق واضح دلائل نہیں آئے بلکہ وہ استنباطی ہیں اجتہادی ہیں وہاں اگر کسی قسم کا اختلاف ہو جاتا ہے ایک کہے کہ اسلام کا تقاضہ یہ ہے دوسرا کہے اسلام کا تقاضہ یہ ہے وہاں دورائیں پیدا ہو سکتی ہیں جس طرح سے فقہاء رحمہم اللہ کے ہاں ہے، لیکن فقہاء رحمہم اللہ کی وہ باتیں بینات آنے کے بعد نہیں ہیں وہ انہی مسائل کے بارے میں ہیں جن کے بارے میں شریعت نے بینات کے طور پر اس کی وضاحت نہیں کی اشارات ہیں جس سے فقہاء رحمہم اللہ نے استنباط کیا، کسی نے استنباط کسی طرح سے کر لیا، کسی نے کسی طرح سے کر لیا، وہ اگر کہے کہ اسلام کا تقاضہ یہ ہے دوسرا کہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے یہ اختلاف "من بعد ماجاء تھم البینات" نہیں ہے اس لئے یہ اصول ہمیشہ اپنے ذہن میں مستحضر رکھیے کہ جو مسئلہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مختلف فیہ ہو یا جو مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہو وہ مدار ایمان نہیں ہوتا اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے بارے میں اس کے لئے کوئی بینات اور واضح دلائل موجود نہیں ہیں۔

ورنہ بینات اور واضح دلائل اگر موجود ہوتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم اس مسئلے میں کیوں اختلاف کرتے، فقہاء اس مسئلے کے اندر کیوں اختلاف کرتے جو اس قسم کا مختلف فیہ مسئلہ ہوتا ہے وہ مدار ایمان قطعاً نہیں ہوتا وہاں دونوں طرف گنجائش ہوتی ہے چاہے یہ راستہ اختیار کر لو، چاہے یہ راستہ اختیار کر لو واضح دلائل آجانے کے بعد تو اختلاف کی

گنجائش ہی نہیں ہوتی لہٰذا جو متفق علیہ مسائل ہیں ایمان کا مدار وہ ہیں اختلافی مسائل کے اندر مختلف فیہ رائیں اختیار کی جاسکتی ہیں اور وہ اسلام کا تقاضہ ہے اور اسلام کے خلاف نہیں ہے پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو یہ مفہوم جس طرح سے آپ کی خدمت میں واضح کر دیا گیا ہے۔

بدعت کی ایجاد منصب نبوت پر ڈاکہ ہے:

تو اسی سے بدعت کا اصول بھی نکل آیا جیسے پہلے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ جو چیز اسلام نے باعث ثواب نہیں ٹھہرائی اس کو باعث ثواب سمجھ لینا یہ بھی بدعت کا ایک شعبہ ہے اپنے طور پر متعین کر لینا کہ یوں کر لینا باعث ثواب ہے حالانکہ اس کے باعث ثواب ہونے پر اسلام سے کوئی روشنی نہیں پڑتی اور اسلام کے اندر کوئی اس قسم کا قرینہ اور دلیل نہیں ہے جو اس کو باعث ثواب قرار دے اپنے طور پر اس کو باعث ثواب اگر آپ سمجھنے لگ جائیں گے تو یہ شریعت کے اندر تحریف ہے اور پیوندکاری ہے کہ کچھ احکام تو اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیے اور کچھ احکام ایسے ہیں جو اپنے دماغ سے آپ افتراء کر رہے ہیں یہ بھی گویا کہ اسلام کو ناقص سمجھنے والی بات ہے اس قسم کی پیوندکاری یہ بھی برداشت نہیں ہے باعث ثواب وہی چیزیں ہیں جن کو شریعت نے کہہ دیا کہ یہ باعث ثواب ہیں شریعت کی کسی شرعی دلیل کے ساتھ باعث ثواب ثابت ہوتی ہیں۔

اور اگر وہ شریعت کی کسی دلیل کے ساتھ باعث ثواب ثابت نہیں ہوتیں اور تم کہو کہ باعث ثواب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس بھی کوئی ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کو معلوم کرنے کا تو بدعت کی ایجاد درپردہ یہ منصب نبوت پر ڈاکہ ہوتا ہے اس لئے بدعت شرک فی النبوت ہے کہ جو منصب نبی کا تھا وہ تم نے اختیار کر لیا نبی کا منصب تھا کہ تمہیں بتائے کہ اللہ تعالیٰ کو کونسا کام پسند ہے اور کونسا پسند نہیں ہے اور جب تم اپنے دماغ کے ساتھ پسند اور ناپسند کام بنانے لگ جاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مرضی کی تفصیل تمہارے اختیار میں بھی ہے تو بدعت کی مذمت جو شریعت میں آتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ شرک فی النبوۃ کا شعبہ ہے بے شک وہ دشمن ہے صریح، بے شک وہ تمہارے لئے صریح دشمن ہے اگر تم پھسل گئے واضح دلائل آجانے کے بعد تو یاد رکھو کہ بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے۔

اگر تم باتوں سے نہیں سمجھتے تو کیا لاتوں سے سمجھو گے:

آگے بھی وعید ہے کہ جو واضح دلائل آجانے کے بعد بھی نہیں سنبھلتے اتنا کھلا کھلا سمجھا دیا تو پھر بھی نہیں سنبھلتے کیا وہ اللہ کے عذاب کے آنے کے منتظر ہیں اور جب اللہ کا عذاب آجائے گا پھر سنبھلے تو کیا سنبھلے ایسے وقت میں

تمہارے سنبھلنے کا اعتبار کوئی نہیں، اللہ آ جائیں اس کو قیامت پر محمول کیا گیا ہے کہ واقعی اللہ آئے گا اور اس طرح سے معلوم ہوگا جس طرح سے سائبان کے اندر اللہ تعالیٰ کی تجلی ہو رہی ہے اس کی کیفیت متعین نہیں کی جاسکتی اللہ تعالیٰ کی صفات کا جہاں بھی تذکرہ آئے وہاں یونہی کہنا پڑتا ہے کہ جیسے اس کی شان کے لائق ہے، فرشتوں کا نزول بھی ہوگا اللہ کا نزول بھی ہوگا پھر حق و باطل کا، اچھے برے کا فیصلہ ہوگا اور اس کی عذاب اللہ کے ساتھ بھی تاویل کی گئی ہے کہ وہ اس چیز کے منتظر ہیں کہ اللہ کا عذاب آ جائے بادلوں کی شکل میں بادلوں کے سائبان آ جائیں ان میں اللہ کا عذاب ہو فرشتے ہوں اور اس طرح سے ان کو اگر نیست و نابود کر دیا جائے پھر یہ اس قسم کے عذاب کے منتظر ہیں۔

یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جو باتوں سے نہیں سمجھتا کیا وہ لاتوں سے سمجھنے کی توقع رکھتا ہے یہ کہا کرتے ہیں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے جن کی عادت ہے کہ جب تک ان کے چار پانچ لاتیں نہ لگیں تو اس وقت تک ان کا دماغ سیدھا نہیں ہوتا وہ صرف باتوں سے کہاں سمجھتے ہیں اگر تم باتوں سے نہیں سمجھتے تو کیا تم لاتوں سے سمجھو گے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی لاتیں لگیں گی پھر بچے گا کچھ نہیں پھر سمجھنے کا فائدہ کیا یہ لوگ جو بینات سے نہیں سمجھتے وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ آسمان کی طرف سے سے بادلوں کے سائبان آ جائیں ان میں اللہ کا عذاب آ جائے فرشتوں کی فوجیں آ جائیں اور تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے معاملہ ہی ختم کر دیا جائے تم اس بات کے منتظر ہو تو جب اس قسم کا واقعہ پیش آ جائے گا جس طرح سے پچھلی امتوں کے اندر پیش آیا تھا تو پھر یاد رکھو کہ سمجھنے کا وقت نہیں ملتا ہے۔

"والی اللہ ترجع الامور" اللہ کی طرف ہی یہ امور لوٹائے جاتے ہیں، اس قسم کے واقعات کا اختیار سب اللہ کو ہے سب امور لوٹ کر اللہ کی طرف جائیں گے اللہ تعالیٰ چاہے تمہیں دلائل کے ساتھ سمجھائے چاہے تو تمہارے نہ سمجھنے کی صورت میں عذاب اتار دے یہ اللہ کے اختیار میں ہے اللہ کے رسول کے اختیار میں نہیں ہے، اس طرح سے وعید کی گئی کہ واضح ہدایت آنے کے بعد مخالفت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اتباع کرو اور اگر تم ان واضح دلائل کی اتباع نہیں کرو گے پھر بھی پھسل جاؤ گے تم متبع شیطان سمجھے جاؤ گے پھر ڈرو اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ پھر ایسا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بھی تمہیں نیست و نابود کیا جائے اگر دنیا میں نیست و نابود نہ کیے گئے تو آخرت میں تمہارا انجام وہی ہوگا جو متبع شیطان کا ہوتا ہے۔

سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ

سوال کریں بنی اسرائیل سے کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دیں ، اور جو شخص بدل دے اللہ کی نعمت کو

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا

بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آ گئی پس بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں ﴿۲۱۱﴾ مزین کر دی گئی کافروں کے لیے

الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا

دنیاوی زندگی اور ہنستے ہیں وہ کافر مومنوں سے ، اور وہ لوگ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا وہ

فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

ان کافروں سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن ، اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے شمار ﴿۲۱۲﴾

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ

لوگ ایک ہی جماعت تھے ، پھر بھیجا اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو اس حال میں کہ وہ نبی بشارت دینے والے تھے

وَ مُنْذِرِیْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ

اور ڈرانے والے تھے ، اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری وہ کتاب حق پر مشتمل تھی تاکہ فیصلہ کردے درمیان

النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ

لوگوں کے اس بات میں جس میں انہوں نے اختلاف کیا ، نہیں اختلاف کیا اس میں مگر انہی لوگوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ

بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آ گئے اختلاف کیا آپس میں ضد اور حسد کی وجہ سے ، پس راہنمائی کی اللہ تعالیٰ نے

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ

مومنوں کی اس بات کی طرف جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا اپنی توفیق کے ساتھ ، اور اللہ تعالیٰ راہنمائی کرتا ہے

مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا

جس کی چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ﴿۲۱۳﴾ کیا تم سمجھتے ہو کہ داخل ہو جاؤ گے

الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ ۖ مَّسَّتْهُمُ

جنت میں حالانکہ ابھی تک نہیں آیا تمہارے پاس حال عجیب ان لوگوں کا جو تم سے پہلے گزرے ہیں ، پہنچی انہیں

الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا

مالی تنگی اور بدنی تکلیف اور وہ لوگ جنبش دیے گئے کہ پکار اٹھے رسول اور وہ لوگ جو ایمان لائے تھے

مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾ يَسْأَلُونَكَ

ان کے ساتھ کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ، خبردار بے شک اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے (۲۱۴) آپ سے سوال کرتے ہیں کہ

مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

وہ کیا خرچ کریں ، آپ انہیں کہہ دیجئے کہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو مال میں سے وہ والدین کے لئے ہے

وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا

اور قریبی رشتہ داروں کے لئے ہے اور مسکینوں کے لئے ہے اور یتیموں کے لئے ہے اور مسافروں کے لئے ہے ، اور جو بھی تم کرو

مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ

نیکی کا کام پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے (۲۱۵) فرض کر دیا گیا تمہارے اوپر لڑنا اور قتال ناگوار ہے

لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا

تمہارے لئے ، ہو سکتا ہے کہ تم مکروہ جانو کسی چیز کو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو ، اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو

شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

کسی چیز کو اور وہ تمہارے لئے بری ہو ، حقیقت امر اللہ بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۲۱۶)

تفسیر:

ماقبل سے ربط:

گزشتہ رکوع کی آخری آیت اس مضمون پر مشتمل تھی کہ اگر واضح دلائل آجانے کے بعد تم پھسل گئے تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے جس میں ایک دھمکی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح دلائل مل جانے کے بعد جو شخص

ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا اوران دلائل سے فائدہ حاصل نہیں کرتا اوران دلائل کے مطابق اپنا عقیدہ اوراپنا عمل نہیں بناتا تو پھر وہ شخص اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا اسی مضمون کی تائید کے طور پر یہ آگے ذکر کیا گیا کہ بنی اسرائیل سے پوچھ لو جو تم سے پہلے صاحب کتاب تھے اہل کتاب تھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس کیسی کیسی بینات آئیں، کیسے کیسے واضح دلائل سمجھانے کے لئے اللہ نے ان کو دیئے لیکن جب انہوں نے واضح دلائل سے فائدہ نہیں اٹھایا تو پھر وہ کس طرح سے اللہ کی گرفت میں آئے یہ بنی اسرائیل سے پوچھ لو یہ خود تمہیں بتادیں گے کہ کیا حال ان کے اوپر گزرا ہے گویا کہ اس ضابطے کی جسے ذکر کیا گیا ہے تائید ہوگئی۔

حاکم کے انتخاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل:

حاکم وقت کے انتخاب کے لیے کوئی ایسا متعین طریقہ کہ جس کو ہم کہیں کہ اس کے خلاف کرنے سے اسلام کا خلاف لازم آتا ہے اس قسم کا کوئی انتخاب کا طریقہ قرآن وحدیث میں واضح نہیں کیا گیا باقی کوئی طریقہ انتخاب کا بتایا بھی ہے؟ وہ تو واضح ہے کہ سرورکائنات صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو کسی کو صراحت کے ساتھ متعین نہیں کر کے گئے کہ میرا جانشین یہ ہے عامۃ المومنین کی رائے پر چھوڑ دیا، اور صاف فرمادیا کہ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی پر متفق نہیں ہوں گے اس لئے مجھے تعیین کی ضرورت نہیں ہے پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ اس بارے میں کوئی تحریر لکھ دوں لیکن میں نے کہا کہ کیا ضرورت ہے اللہ اور مومنین کسی پر متفق ہی نہیں ہوں گے سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی منشاء تو واضح کی قرائن کے ساتھ لیکن تعیین نہیں کی۔

اور تعیین اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہوئی تو اس وقت کے اہل عقد جو بااختیار قسم کے لوگ اور رؤساء قسم کے تھے سردار قسم کے جن کو قبیلوں کی سرداری حاصل تھی مہاجرین اور انصار میں ممتاز شخصیات تھیں ان کے مشورے کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب ہوگیا۔

موجودہ جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں فرق:

اور یہ عین آج کل کی جمہوریت ہے اور جمہوری طریقہ ہے کہ اکٹھے ہوگئے سمجھ دار قسم کے لوگ، یہ ایرے غیرے نہیں کیونکہ تمام لوگ بصیرت نہیں رکھتے جو سمجھتے نہیں کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز اچھی نہیں ان کا وزن ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے آج کل کی جمہوریت میں اور اسلامی جمہوریت میں یہی فرق ہے اسلام اپنے نظام کا نام شورائی نظام رکھتا ہے اس کے لئے جمہوریت کا لفظ نہیں بولتا شورائی نظام کا مطلب ہے مشورے کے ساتھ کام کرو" وامرھم

شوریٰ بینهم " اور مشورہ جب بھی لیا جاتا ہے تو سمجھ دار لوگوں سے لیا جاتا ہے جو مسئلہ درپیش ہو جو شخص اس کے متعلق بصیرت رکھتا ہے اس سے رائے لی جائے گی کہ اس میں کس طرح سے کریں۔

اور آج کل کی جو مغربی جمہوریت ہے اس میں ہر ایرے غیرے کو ووٹ دینے کا حق ملتا ہے چاہے وہ دائیں اور بائیں کا فرق نہیں کرتا جیسے کہ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں

گریز از طرز جمہوری

یہ جو موجودہ طرز جمہوری ہے اس سے بھاگو، اس کی وجہ یہ ذکر کی کہ اس میں لوگوں کو گنا جاتا ہے ان کا وزن نہیں کیا جاتا کہ وزن دار شخص کون ہے؟ رائے کس کی وزنی ہے؟ یہاں لوگوں کو گنتے ہیں لوگوں کا وزن نہیں کرتے، اور پھر یہ بھی کہا کہ کسی پختہ کار کے متبع ہو جاؤ اور اس جمہوری طرز سے بھاگ جاؤ کیونکہ ایک انسان کا فکر دو سو گدھوں کے دماغ میں نہیں آسکتا ایک طرف تو ایک انسان ہو اور دوسری طرف دو سو گدھے ہوں اب اگر گنتی کرو گے تو دو سو گدھے بڑھ گئے لیکن فکر انسانی دو سو گدھوں کے دماغ میں نہیں آسکتا اس لئے جو مسئلہ درپیش ہو اس میں جو پختہ کار لوگ ہیں ان سے مشورہ لو مشورہ لینے کے بعد اس کے مطابق عمل کرو، اب ایک طرف امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور دوسری طرف پانچ بھیڑیں چرانے والے بیٹھیں ہیں یا پچاس کان کھودنے والے بیٹھے ہیں ایک طرف امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں اور دوسری طرف اس قسم کے جاہل کہ ان کو علم کا پتہ ہی نہیں کہ ہوتا کیا ہے۔

اب ایک مسئلہ علمی پیش ہو جاتا ہے اب اگر ہاتھ اٹھانے سے فیصلہ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہل اس عالم کے اوپر غالب آجائیں گے یہ جہالت جو ہے یہ علم کے اوپر غالب آجائے گی کیونکہ اکثریت جو ہے وہ دنیا میں جاہلوں کی ہوتی ہے اس لئے افراد کے اعتبار سے اکثریت کا اعتبار نہیں ہے "ان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ" زمین کے اندر جو لوگ موجود ہیں اگر ان میں سے اکثریت کی اطاعت تم کرو گے تو یہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے وجہ کیا ہے کہ عادت یہی ہے، واقعہ یہی ہے کہ اکثریت جاہل ہوتی ہے اور اکثریت نادان ہوتے ہیں اور وہ اکثریت جس وقت فیصلہ دیں گے اگر ان کے فیصلہ کو مان لیا جائے تو وہ جہالت کا فیصلہ ہے تو اسلام نے اپنے نظام کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ جو لوگ سمجھ دار ہیں جو اس معاملہ میں بصیرت رکھتے ہیں ان سے رائے لو، مشورہ کر کے جو طے ہو جائے اس کے مطابق عمل کرو یہ شورائی نظام ہے سمجھ دار لوگوں سے مشورہ لیا جاتا ہے۔

حاکم کے انتخاب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عمل:

اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل ہمارے لئے حجت ہے کہ اگر وقت کا

حاکم پوری طرح سے دیانت داری سے سمجھتا ہے کہ یہ شخص اہلیت رکھتا ہے بعد میں یہ کام سنبھال لے گا تو اپنی زندگی کے اندر چند لوگوں سے مشورہ کر کے جن پر وہ اعتماد کرتا ہے کسی کو منتخب کر سکتا ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی ایسے ہی کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لوگوں کی رائے معلوم کی جس وقت دیکھا کہ اس کے اوپر سب مطمئن ہیں تو اعلان کر دیا کہ میرے بعد ان امور کے متولی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، اس لئے وقت کا حاکم اگر اس طرح سے دیانت داری کے ساتھ ایک رائے قائم کر کے کسی کی تعیین کر دے تو یہ تعیین بھی ہمارے نزدیک صحیح ہے لیکن تعیین شک اور شبہ سے بالاتر ہونی چاہیئے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کوئی اپنا رشتہ دار نہیں بنایا، اپنا بیٹا نہیں بنایا اس قسم کا نہیں بلکہ جس کے اوپر جماعت اعتماد کرتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا معاون سمجھا جاتا تھا اس کی تعیین کر دی اور پیچھے قوم نے قبول کر لیا تو یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حاکم کے انتخاب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل:

تیسرا ہمارے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل حجت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کمیٹی بنا گئے سات آدمیوں کی اور کہا کہ یہ مشورہ کر کے جس کو چاہیں متعین کر لیں جن کے اندر چھ عشرہ مبشرہ تھے جو اس وقت زندہ تھے کہ یہ شخص ہیں جن کے اوپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کیا ہے بلکہ ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے تو میں اپنے بعد ان کی تعیین کر جاتا میرے پاس تعیین کی ایک دلیل ہوتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "امین ھذہ الامۃ ابو عبیدۃ بن الجراح" اس امت کا امین ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہے تو میں امت کی امانت اس امین کے سپرد کر دیتا کہ لے بھائی تجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امین قرار دیا اس امت کا اس امانت کو سنبھال تو جس طرح سے چاہے کر میں اس کے سپرد کر دیتا تو اس طرح سے بھی آپ نے فرمایا لیکن ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اس سے پہلے شہید ہو چکے تھے وہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں تو چھ عشرہ مبشرہ اس وقت زندہ تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی کمیٹی بنا دی کہ یہ مشورہ کر کے آپس میں جس کو چاہیں ایک کو متعین کر لیں لیکن چھ کی کمیٹی جو بنائی اس میں ہو سکتا تھا کہ تین ایک طرف ہو جائیں تین ایک طرف ہو جائیں تو ساتویں آدمی کا اضافہ کر دیا آپ نے اپنے بیٹے کا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا کہ اس کو مشورے میں بلا لینا لیکن خلافت میں اس کا حق نہیں ہے۔

تو یہ بیٹا تھا بیٹا ہونے کے اعتبار سے اس شک سے اپنے آپ کو نکال دیا شبہ سے بھی نکال دیا کہ یہ اپنے بیٹے کے لئے خلافت چاہتے ہیں صراحت کے ساتھ نفی کر دی کہ میرے بیٹے کا خلافت میں کوئی حصہ نہیں ہے ہاں البتہ مشورے میں اس کو شریک کر لیجئے تو جب یہ ساتواں آدمی شریک ہو جائے گا تو اگر کسی طرف چار ہو جائیں کسی

طرف تین ہو جائیں اور یہ ہیں سارے کے سارے وہ جن کے اوپر حضور ﷺ نے اعتماد کیا ہے یہ جس کے بارے میں متفق ہو جائیں گے اس کی تعیین ہو جائے گی تو یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

اسلام کا شورائی نظام:

تو ان تینوں طریقوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے اب وہ لائحہ عمل جو مرتب کیا جائے گا اس کو ہم شورائی نظام کہیں گے اس کے لئے جمہوریت کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کریں گے کہ جمہوریت کا معنی آج یہی ہے کہ ہاتھ گنتی کرو کہ ہاتھ کتنے کھڑے ہوتے ہیں جدھر ہاتھ زیادہ کھڑے ہو گئے بس اس کے مطابق فیصلہ دے دو یہ نہیں دیکھنا کہ ہاتھ کھڑا کرنے والا کچھ سمجھتا بھی ہے کہ نہیں سمجھتا وہی بات جو میں نے پہلے عرض کی کہ ایک انسان کا فکر دو سو گدھوں کے دماغ میں نہیں آسکتا اس لئے تم کسی انسان کے پیچھے لگو گدھوں کے پیچھے لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر صرف افراد کو گننا مراد ہو تو قرآن صراحتاً کہتا ہے "ان تطع اکثر من فی الارض یضلوك عن سبیل الله" اگر زمین کے اندر بسنے والوں کی اکثریت کی رائے مانو گے تو یہ تمہیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیں گے وجہ یہی ہے کہ اکثریت متبع شیطان ہے اور اہل حق سمجھدار قسم کے لوگ نیک دین دار ہمیشہ کم ہوا کرتے ہیں تو جس قسم کا مسئلہ پیش ہو جائے اس قسم کے لوگوں کی رائے لینی چاہیئے اور ان میں سے پھر اکثریت کا اصول نکالا جا سکتا ہے لیکن جمع سارے کے سارے سمجھ دار ہونے چاہئیں اور سمجھ داروں کی جو رائے ہوگی ساری امت کی ترجمانی سمجھی جائے گی اور اس کا نام اسلام شورائی نظام رکھتا ہے۔

حاکم وقت کو معزول کرنا:

اور پھر جس کو ایک دفعہ منتخب کر دیا جائے پھر یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ تین سال کے بعد پانچ سال کے بعد اس کی ٹانگ کھینچو اگر وہ کام سیدھا کرتا جا رہا ہے تو اس کو زندگی بھر رہنے دو، ہاں البتہ اگر وہ امت کے مفادات کے خلاف کرنے لگ جائے راہ حق سے بھٹک گیا اور بالکل اس کی گمراہی واضح ہے تو ایسے وقت میں اس کو اتارا بھی جا سکتا ہے لیکن اگر وہ سیدھا چل رہا ہے اور قاعدے کے مطابق کام کر رہا ہے تو اس کو زندگی بھر مہلت دو کہ خدمت کرے کرنے دو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو اس منصب کو چھوڑا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو اس منصب کو چھوڑا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی تو اس منصب کو چھوڑا، اہل حق جس وقت متفق تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تو بعض باغیوں نے شرارت کر کے شہید کر دیا وہ ایک علیحدہ بات ہے اب بھی اگر کوئی شریر آدمی

کسی حاکم کو قتل کر دے تو اس کی جگہ دوسرے کو منتخب کیا جائے گا باقی یہ ہے کہ زندگی کے اندر بلاوجہ کہ اب چونکہ اس کو چار سال کا عرصہ کام کرتے ہوئے ہو گیا اب کسی دوسرے کو بھی کام کرنے کا موقع دینا چاہیئے قوم سے پوچھ لو کہ اب وہ اس پر خوش ہیں کہ نہیں یہ توڑ پھوڑ کا طریقہ اسلام میں نہیں ہے۔

اگر ایک آدمی منتخب ہو گیا کام وہ صحیح کرتا جا رہا ہے تو کوئی ضرورت نہیں کہ اس کی زندگی کے اندر اس منصب سے آپ اس کو ہٹائیں ہاں البتہ غلط ہو گیا قوم کے مفاد کے خلاف کرتا ہے اسلام کے خلاف کرتا ہے اور وہ قابل برداشت نہیں رہا تو ایسی صورت میں وہی اہل عقد اس کو ہٹا بھی سکتے ہیں اور اگر اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے وہ واضح طریقے پر چلا آ رہا ہے جس طرح سے کتاب وسنت کے ساتھ ایک طریقہ متعین ہے تو پھر زندگی بھر اس کو برقرار رہنا چاہیئے پھر ہٹانے کی اس کو کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ ہدایات ساری کی ساری موجود ہیں سرور کائنات ﷺ کے کلام میں بھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل میں بھی حضور ﷺ کے بعد جس طرح سے یہ اصول چلا ہے اس سے یہ قاعدہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ جمہوریت میں حصہ لینا:

اب جمہوریت چونکہ طاری ہو گئی اور اس کو اپنا چکے اس کو بدلنے کا طریقہ یہی ہے کہ اسی ہتھیار کے ساتھ لڑ کے آگے آ کر اس نظام کو تبدیل کرو اور اگر آپ یہ موجودہ ہتھیار نہیں اپناتے جس ہتھیار کو یہ غلط لوگ اپنائے بیٹھے ہیں تو وہ آپ کو اس دعویٰ کے ساتھ کہ یہ نظام غلط ہے آگے آنے نہیں دیتے اور ہم اس کو بدلیں گے، اس کو تبدیل کریں گے، آگے آنے کے لئے اس غلط پالیسی کو اپنا کر اس کے ذریعے سے آگے آنا تا کہ آگے آ کر آگے بڑھ کر ہم معاملات کی اصلاح کریں تو یہ بالکل ٹھیک ہے اس کو غلط کہتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ جس وقت ہمیں اختیار ملے گا تو ہم اس میں تبدیلی لائیں گے اس میں حصہ اگر لیا جائے تو یہ کوئی اسلام کے خلاف نہیں ہے۔

حاکم کا اپنے بعد اپنے رشتہ دار کو منتخب کرنا:

سمجھ دار لوگ مل کر کسی طریقے کو اگر متعین کریں تو اسلام میں اس کی گنجائش ہے اتنی سی لچک اس میں ہے حضور ﷺ کے خلفاء کا انتخاب جس انداز سے ہوا اس میں کافی راہنمائی موجود ہے اگر کوئی شخص راہنمائی حاصل کرنا چاہے باقی اگر عوام کی رائے کے ساتھ جانے والے کے بعد اس کا رشتہ دار ہی منتخب کر لیا جائے اس میں بھی کوئی عیب نہیں ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ منتخب ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے

ہاتھ پر بیعت کر لی حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ بیٹے ہی ہیں یہ کوئی ممانعت بھی نہیں کہ جانے والے کا رشتہ دار نہیں آسکتا اسی انداز کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دیانت داری کے ساتھ مناسب سمجھا کہ امت اگر مجتمع رہ سکتی ہے تو میرے بیٹے پر رہ سکتی ہے اگر میں نے اس کو ایسے ہی بغیر کسی قسم کی تعیین کرنے کے اپنے زمانے کے اندر چھوڑ دیا اگر ایک پر میں نے جمع کرنے کی کوشش نہ کی تو اب مسلمان اتنے پھیل چکے ہیں کہ پھر وہ کہے گا کہ اس کو بناؤ وہ کہے گا اس کو بناؤ پھر امت آپس میں لڑے گی، بھڑے گی، فساد کرے گی دیانت داری کے ساتھ اگر اس کو مناسب سمجھا اور امت کے ساتھ اجتماعیت والا مفاد اسی میں سمجھا تو ان کا یہ عمل بھی بالکل ٹھیک ہے کہ زندگی کے اندر تعیین کر دی۔

جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے اندر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعیین کر دی تھی اور پھر لوگوں سے مشورہ لیا لوگوں کو اس بات پر متفق پانے کے بعد اعلان کر دیا اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی سے روشنی حاصل کی ہو کہ اپنی زندگی میں ایک کو متعین کر کے باقیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہو تاکہ خلیفہ کے بعد پھر امت انتشار میں نہ مبتلا ہو جائے اور دیانت داری سے سمجھا ہو کہ میرے خاندان پر تو سارے متفق رہ سکتے ہیں اور اگر اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا تو کوئی کہے گا فلاں ہو کوئی کہے گا کہ فلاں ہو پھر وہی انتشار برپا ہو جائے گا اور ادھر سرحدوں کے اوپر باقاعدہ سب جہاد جاری تھے تو امت کو مجتمع رکھنے کی نیت کے ساتھ اگر وہ اپنے بیٹے کی تعیین کرتے ہیں تو یہ بھی کوئی شریعت کے خلاف نہیں ہے باقی مدار ان کی نیت پر ہے چونکہ وہ ہادی تھے چونکہ وہ مہدی تھے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے ساتھ اس لئے ہم یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی جگہ وہ نیک نیت تھے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر پائیں گے۔

بنی اسرائیل کو ڈانٹ:

"سل بنی اسرائیل" یہ خصوصی طور پر بنی اسرائیل کے لیے زجر و توبیخ ذکر کی گئی ہے یہ جو فرمایا کہ بنی اسرائیل سے پوچھے تو ایک پوچھنا ہوتا ہے کسی چیز کے جاننے کے لیے کسی چیز کے سمجھنے کے لیے اور ایک ہوتا ہے کسی سے سوال کرنا زجر و توبیخ کے طور پر ڈانٹنے کے لیے اس کو عتاب کرنے کیلئے جیسے کسی کو کوئی حکم دیا جائے بار بار حکم دیا جائے کہا جائے یہ کام کر یہ کام کر اور اس نے ہر دفعہ سستی کی، کام نہ کیا تو ڈانٹتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ذرا اس سے پوچھو تو سہی اس کو کتنی دفعہ میں نے کہا تو اب یہاں پر اس سے پوچھنا مقصود نہیں کہ وہ گن کر بتائے کہ اتنی دفعہ مجھے کہا یہ کہنا زجر و توبیخ کے طور پر ہے اسی طرح یہاں پر بھی "سل بنی اسرائیل" یہ زجر و توبیخ اور ڈانٹنے کے لیے ہے۔

بنی اسرائیل کو دیے جانے والے واضح دلائل:

"کم آتینا ھم" یہ ہے جس چیز کو پوچھا ہے کہ بنی اسرئیل سے پوچھیے کتنی واضح دلیلیں ہیں جو ہم نے ان کو عطا کیں، توراۃ میں انجیل میں کتنے واضح دلائل ہیں جو ہم نے ان کو عطا کیے واضح دلائل نبی ﷺ کی نبوت پر اور اس اسلام کے حق ہونے پر لیکن اتنے واضح دلائل کے باوجود یہ جو کہا پوچھیے بنی اسرائیل سے "کم آتینا ھم" اس سے مراد ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کو ہم نے کتنی واضح نشانیاں اور واضح دلائل عطا کیے، اس سے مراد بنی اسرائیل کو جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکامات آئے ان کے حق ہونے پر واضح نشانیاں واضح دلائل پیش کیے جیسا کہ ان کے لیے دریا کو پھاڑ دینا، دریا میں ان کے لیے راستے بنا دینا، ان کو خیر وخوبی سے دریا سے گزار دینا اور پھر ان کے دشمن کو غرق کر دینا اور ان کے باغات خزانوں محلات اور ان کی حکومت کا ان کو مالک بنا دیا اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو من وسلوی عطا کیا، ان کے لیے پتھر سے پانی کے چشمے جاری کیے، اور ان پر بادل کا سایہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا پھر انہوں نے اللہ سے دال گندم سبزیوں کا سوال کیا اللہ تعالیٰ نے وہ ان کی خواہش پوری کر دی تو یہ جو اللہ تعالیٰ نے موقع بموقع دلائل عطا کیے اس لیے کم اتینا ھم میں ھم سے مراد ان کے آباؤ اجداد ہیں، لیکن ان کی طرف نسبت اس لئے کی گئی کہ بعض اوقات آباؤ اجداد پر احسانات کی نسبت ان کی بعد والی نسل کی طرف کی جاتی ہے۔

جو اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کرے اس کے لیے سخت عذاب ہے:

" ومن یبدل نعمة الله " تو آیات بینات کی دو تفسیریں ہو گئیں یا تو اس سے مراد دلائل جو نبی ﷺ کی نبوت پر توراۃ وانجیل میں اتارے گئے، یا آیات بینات سے مراد جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وقتاً فوقتاً معجزات عطا کیے اور بنی اسرائیل کے اوپر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی، توراۃ کی سچے ہونے کی اور اپنے احکامات کے حق ہونے پر نشانیاں دکھائیں وہ مراد ہیں۔

لیکن انہوں نے ان واضح نشانیوں کے بعد اللہ کی نعمت کو تبدیل کیا کفر کے ساتھ، اس اللہ کی نعمت سے مراد یہاں پر یہی واضح نشانیاں ہیں یہ اللہ کی نعمت تھیں لیکن انہوں نے ان واضح نشانیوں کو اور واضح دلائل کو دیکھ کر ایمان لانے کی بجائے کفر کیا" ومن یبدل نعمة الله کفراً من بعد ماجاء ته " ان نشانیوں کے آنے کے بعد بھی انہوں نے پھر کفر کیا یہاں پر بعض مفسرین نے کفر سے کفر کا حقیقی معنیٰ مراد لیا اور بعض نے ناشکری والا معنیٰ مراد لیا ہے کہ انہوں نے اللہ کی اس نعمت کی ناشکری کی اس ناشکری کے صورت بھی یہی ہے کہ ایمان لانے کی

بجائے انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ''فان اللہ شدید العقاب لمن یبدل'' اس کی جزاء محذوف ہے کہ بات صرف ان کی نہیں کہ بنی اسرائیل نے ایسا کیا بلکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو بھی اللہ کی نعمت آنے کے بعد بطور شکر کے اللہ پر اور اللہ کے رسول پر اللہ کے دیئے ہوئے احکامات پر ایمان لانے کی بجائے کفر کرے تو اللہ کا قانون یہی ہے کہ ان کو عذاب دیتا ہے یا دنیا میں اور اگر دنیا میں نہیں تو آخرت میں اللہ تعالیٰ عذاب دے گا جس طرح بنی اسرائیل جس وقت ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی دنیا میں ہی ان کے کفر کی سزا دی تو جو بھی اللہ کی نعمتوں کو بجائے ایمان کا ذریعہ بنانے کے وہی نعمتیں ان کے لیے جب کفر کا سبب بن جائیں گی ان کی ناشکری کی وجہ سے تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے گا اور عذاب بھی معمولی نہیں سخت عذاب، کیونکہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔

اب یہ واضح دلائل آجانے کے بعد واضح نشانیاں آجانے کے بعد جو کفر کیا گیا اس کفر کا سبب کیا ہے؟

تو اللہ تعالیٰ نے اس کفر کا سبب بیان فرمایا سبب ہے حب جاہ اور حب مال یہ دونوں چیزیں کفر کا سبب بنتی ہیں اسی حب جاہ حب مال کو اس عنوان سے یہاں ذکر کیا گیا۔

دنیاوی زندگی کافروں کے لیے مزین کردی گئی:

''زین للذین کفروا الحیوۃ الدنیا'' مزین کی گئی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا دنیاوی زندگی، دنیاوی زندگی کے مزین کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں مال اور جاہ یہ دو چیزیں ہیں کہ جس سے دنیاوی زندگی ان کو پرکشش نظر آتی ہے اور دنیاوی زندگی میں مال حاصل کرنے کیلئے کوئی بڑا منصب مقام حاصل کرنے کے لیے وہ تگ ودو کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے دین کی پرواہ نہیں کرتے ایمان کی پرواہ نہیں کرتے اللہ کے احکامات کی پرواہ نہیں کرتے۔

اب ان کو مال اور جاہ کی محبت اندھا بہرا کر دیتی ہے وہ حصول مال کے لیے اور حصول جاہ کے لیے اللہ کے احکامات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، اللہ کے رسول کی، رسول کی بھی تکذیب کردی اللہ کی بھی تکذیب کردی اور صرف ایک ہی ان کے سامنے مقصود ہے کہ ہمیں مال ودولت حاصل ہو جائے اور کوئی ہمیں بڑا مرتبہ حاصل ہو جائے اور یہی ان کے لیے بڑی کامیابی ہے مزین کردی گئی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا دنیاوی زندگی، دنیاوی زندگی کے مزین کرنے سے مراد یہ ہے کہ دنیاوی زندگی کے اسباب یعنی مال اور کوئی بڑا منصب یہ ان کے لیے بڑی پرکشش چیز بن جاتی ہے یہاں پر زین مجہول کا صیغہ ذکر کیا گیا مزین کی گئی۔

تزئین کی نسبت رحمٰن اور شیطان کی طرف مختلف وجوہ کی وجہ سے ہے:

لیکن دوسری آیات کو دیکھا جائے تو کہیں تو نسبت ہے شیطان کی طرف ''زین لهم الشیطان اعمالهم'' شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو مزین کردیا اور کہیں نسبت اللہ کی طرف'' وکذالك زینا لکل امة عملهم'' کہیں اللہ نے اپنی طرف نسبت کی، اصل حقیقت یہ ہے کہ تزئین کے کئی معنے ہیں ایک تزئین کا معنیٰ یہ ہے کہ ''ایجاد الشی حسناً'' کسی چیز کو اس طریقے سے پیدا کرنا موجود کرنا کہ اس کے اندر خوبصورتی اور کشش ہو۔

اور دوسرا تزئین کا معنیٰ کہ کسی چیز کی انسان کے دل کے اندر خواہش اور چاہت ابھار دینا اور اس کی چاہت کو اور اس کے شوق کو اتنا ابھار دینا کہ اس کے دین ایمان پر بھی غالب آجائے تو جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مزین کردیا تو وہاں تزئین سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر جب ان چیزوں کو پیدا کیا تو اپنے کمال قدرت کے مطابق اللہ نے ان کو پرکشش بنادیا اور ان کے اندر کشش رکھ دی اور شیطان کی طرف جہاں نسبت کی گئی تو اس سے مراد یہ ہے کہ شیطان نے ان دنیا کی پرکشش چیزوں کی طرف انسانوں کے دل میں اتنا شوق اور اتنی کشش اور خواہش ابھار دی کہ اب ان کا مقصد یہی بن گیا کہ ہماری یہ خواہش پوری ہونی چاہیئے ہماری یہ چاہت پوری ہونی چاہیئے یہ پرکشش چیزیں ہمیں حاصل ہونی چاہئیں جس طریقے سے بھی حاصل ہوں خواہ دین کا انکار کرنا پڑے، خواہ کفر کرنا پڑے، بدعات کا ارتکاب کرنا پڑے بس یہ خواہش پوری ہونی چاہیئے۔

تو جہاں یہ معنیٰ ہے اس کے اعتبار سے پھر شیطان کی طرف نسبت ہے، اللہ کی طرف جہاں پر نسبت ہے وہاں یہی معنیٰ مراد ہے کہ خلقی طور پر کسی چیز کو پرکشش بنادینا تو اللہ تعالیٰ نے یہ جو چیزیں پرکشش بنادی ہیں تو یہ پرکشش چیزیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر بھی دلالت کرتی ہیں اور یہی انسان کے لیے دنیا اور آخرت کی ترقی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو پیدا کیا اور دونوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے کشش رکھ دی تو اب یہی جو اللہ پاک نے کشش رکھ دی ہے اسی کی وجہ سے دنیا میں جوڑے بنتے ہیں اسی کی وجہ سے آگے پھر اولاد ہوتی ہے اور ماں باپ کے دل میں اولاد کے لیے کشش رکھ دی اولاد کی خاطر ماں باپ کتنی محنت کرتے ہیں، کتنی تکالیف برداشت کرتے ہیں اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے اندر ایک کشش رکھ دی اور ادھر انسان کے دل کے اندر بھی ایک خواہش رکھ دی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان خواہشات کے پورا کرنے کے لیے کچھ حدود مقرر کردیں ضابطے بنادیئے کہ ان حدود کے اندر رہ کر ان ضابطوں کے مطابق اپنی خواہشات تم نے پوری کرنی ہیں اب ان حدود کے اندر رہتے ہوئے

انسان اپنی ہر خواہش پوری کرے تو پھر یہی خواہشات اس کے لیے دینی دنیاوی ظاہری اور باطنی اعتبار سے ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں یہ تو ہے کہ اگر وہ ان حدود کے اندر رہ کر اپنی خواہشات کو پورا کرے اور اگر ان چیزوں کے اندر یہ خواہش کشش نہ رکھی جاتی تو نتیجہ یہ ہوتا جب کشش نہ ہوتی تو زبردستی کے جوڑ تو لگ نہیں سکتے تو پھر جو اولاد کا سلسلہ ہے نہ یہ چلتا نہ اولاد کے لیے جتنی آدمی تکلیف برداشت کرتا ہے محنت کرتا ہے مشقت اٹھاتا ہے نہ یہ پھر اٹھاتا تو انسانوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے اندر کشش رکھ دی یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان کی نسل آگے چلی اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کے اندر کشش رکھ دی انسان پھر اس کے حاصل کرنے کے لئے اتنی محنت اور مشقت کرتا ہے اور کتنا کچھ کرتا ہے نئے سے نئے خزانے حاصل کرنے کے لئے اپنی صلاحیتیں استعمال کرتا ہے دن رات ایک کر کے جستجو میں لگا رہتا ہے کتنے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مناظر سامنے آ گئے۔

دنیاوی چیزوں میں کشش باعث رحمت ہے:

اور اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے اندر یہ شوق اور جذبہ نہ رکھتے اور ان چیزوں کے اندر یہ کشش نہ ہوتی تو انسان ان کے حصول کے لیے اتنی محنت نہ کرتا، اتنی جستجو نہ کرتا تو نہ یہ چیزیں دریافت ہوتیں نہ یہ چیزیں وجود میں آتیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اس طرح مناظر کھلتے، مناظر قدرت اتنے نہ کھلتے اور اسی طریقے سے اگر ان کے اندر کشش نہ ہوتی تو کبھی بھی یہ چور چوری نہ کرتا۔

اب چور نے چوری کی اس کو ایک کشش اس چیز کے اندر نظر آئی تو چور کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی اور اس چیز کو اس نے حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کی جائز طریقے سے اس کو نہیں مل سکی تھی تو اس نے چوری والا طریقہ اختیار کر لیا لیکن اس کی وجہ سے ہوا کیا؟ چور چوری کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اسی کی وجہ سے کئی لوگ ہیں کہ جن کو روزی مل رہی ہے جو مکانات بنائے جاتے ہیں، سٹور بنائے جاتے ہیں، پھر ان کے دروازے لگتے ہیں پھر ان کے تالے لگتے ہیں، چوکیدار مقرر کئے جاتے ہیں یہ صرف اپنے مال کی حفاظت کے لیے چوروں سے اپنے مال کو بچانے کے لیے ہے تو مال کے اندر کشش رکھی ادھر انسان کے اندر خواہش رکھ دی اس نے اس کے حاصل کرنے کے لیے چوری والا طریقہ اختیار کیا تو اس کی وجہ سے مستری مزدوروں کو بھی رزق مل گیا، اس کی وجہ سے دروازے بنانے والوں کو روزی مل گئی، اور اس کی وجہ سے تالے بنانے والوں کو روزی مل گئی، اس کی وجہ سے تالے مرمت کرنے والوں کو روزی مل گئی تو اس لئے اللہ تعالیٰ کی نسبت سے دیکھا جائے تو اللہ نے بھی ان چیزوں کو پرکشش بنایا یہ انسان کی ترقی کا ذریعہ ہے۔

اور اگر انسان تھوڑی سی دوراندیشی سے کام لے اور یہ سوچ لے کہ بجائے اس کے کہ دنیا کی ان گھٹیا چیزوں سے خواہش پوری کرے اللہ تعالیٰ نے ایک اگلا جہان بنایا اور جنت کے اندر بڑے اونچے پیمانے پر اعلیٰ سطح پر خواہشات پوری ہونگی میں یہاں خواہشات پوری کرنے کی بجائے ایسی زندگی گزاروں کہ ساری خواہشات جنت میں پوری ہوں تو یہی انسان کے اندر خواہش اور چیزوں کے اندر خواہش یہ اس کے لیے آخرت کی محنت کا ذریعہ بھی بن جائے گی تو خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہاں پر نسبت کی گئی ہے تزئین کی تو اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے چیزیں پیدا کیں کہ ان کے اندر خلقی طور پر کشش رکھ دی اور جہاں شیطان کی طرف نسبت کی گئی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اندر جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی چیزوں کی خواہش رکھ دی اور اس کے دل کے اندر ان کے حصول کا جذبہ رکھ دیا اس کو اسی طریقے سے ابھار دینا کہ وہ اس کے دین ایمان پر غالب آ جائے دین ایمان اس کے سامنے مغلوب ہو جائے شیطان کی طرف جہاں پر نسبت ہے تزئین کی وہ اس معنیٰ کے لحاظ سے ہے یہاں پر یہی ہے کہ کافروں کے لیے دنیاوی زندگی مزین کردی گئی۔

یہاں پر مزین کرنے والا یہی شیطان ہے اس نے اس طریقے سے کافروں کے اندر یہ جذبات اور خواہشات ابھار دیں اور مال و جاہ کی اتنی کشش ان کے اندر پیدا کر دی کہ اب یہ اپنا اصل مقصد اسی کو سمجھتے ہیں کہ مال حاصل ہو جائے، کوئی مرتبہ مجھے مل جائے اور اگر ان کو نظر آتی ہے یہ بات کہ ایمان لانے میں دین اختیار کرنے میں ہمیں کچھ نہیں ملے گا تو وہ پھر دین کا بھی انکار کر دیں گے، اللہ کی کتاب کا بھی انکار کر دیں گے بلکہ اللہ کے رسول کے ساتھ عداوت پر اتر آئیں گے اسی لیے قرآن کریم میں آپ دیکھیں گے کہ انبیاء علیہم السلام کا جو مقابلہ کرنے والے تھے وہ اکثر و بیشتر ایسے ہی اہل ثروت لوگ تھے۔

آیت بالا کی دوسری تفسیر:

ایک اور بات بھی یہاں پر یاد رکھو بعض مفسرین نے ایک اور وجہ بیان کی کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نسبت ایک فعل کے سبب کی طرف ہو جاتی ہے اور کبھی نسبت ہوتی ہے بطور حقیقت کے یہ اسی بات کا ایک اور عنوان ہے تو چیزوں کے اندر چونکہ کشش اللہ پاک نے رکھی اللہ پاک نے ان کو اس انداز سے پیدا کیا کہ ان کو پر کشش بنایا خوبصورت بنایا تو اس اعتبار سے تو اللہ کی طرف نسبت ہے بطور حقیقت کے لیکن یہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کے اندر خواہشات رکھ دیں پر کشش چیزوں کی اور چیزوں کو بھی پر کشش بنا دیا تو اس میں اس خواہش کو غلط رنگ کے ساتھ پورا کرنے کا راستہ دکھانے والا شیطان ہے اس نے پھر غلط راستہ دکھایا کہ یہ خواہش تو نے اس طریقے سے پوری کرنی ہے۔

اللہ نے بھی راستہ بتایا شریعت والا کہ خواہشات پوری کرو اس شریعت کے راستے پر چلتے ہوئے لیکن شیطان نے ان کو ایک اور غلط راستہ دکھایا گناہوں والا معصیت والا تو چونکہ شیطان پھر اس غلط راستے پر ان کو چلاتا ہے ان خواہشات کے پورا کرنے کے لیے تو شیطان گویا کہ سبب بن گیا ان غلط راستوں پر ان کو چلانے کے لیے اور ان کی خواہشات پوری کرانے کے لیے اس نے وسوسے ڈالے اسی نے ان کے دل کے اندر غلط راستوں کا شوق ڈال دیا ان کو ادھر لگا دیا اس لیے پھر شیطان کی طرف نسبت کر دی گئی۔

تزئین دنیا کا نتیجہ:

" وھم یسخرون " یہ اسی تزئین دنیا کا نتیجہ بیان کیا کہ چونکہ ان کے سامنے دنیاوی زندگی مزین کر دی گئی تو اس لیے اب کسی کی عزت ذلت کا پیمانہ اور معیار ان کے ہاں وہی دنیاوی زندگی کے آسائشات عیش وعشرت اور مال وجاہ بن گیا جس کے پاس ان کو مال ودولت اور دنیا کے اعتبار سے اونچا منصب نظر آتا ہے تو وہ ان کے نزدیک صاحب عزت ہے اور جس میں وہ مال ودولت اور اونچا مرتبہ نظر نہیں آتا ان کے نزدیک وہ حقیر اور ذلیل ہے انہوں نے پھر عزت ذلت کا پیمانہ اس کو بنالیا تو اس لیے پھر جو مومنین ایمان لائے تھے ان کے پاس چونکہ مال ودولت نہیں تو اس لیے یہ پھر ان مؤمنین سے استہزاء کرتے ان کو گھٹیا سمجھتے اور ان کا مذاق اڑاتے ان کے ساتھ استہزاء کرتے " ویسخرون من اللذین آمنوا " اور ہمیشہ ہوتا ایسے ہی ہے کہ جس کے دل میں آخرت کا فکر نہیں خوف خدا نہیں اور دین کی محبت نہیں، دنیا کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، دنیا کی عظمت اس کے دل میں ہے تو وہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اگر اس کو کوئی مال ودولت والا نظر آجائے گا تو اس کے لیے تو پھر بے تاب ہو کر آگے بڑھ کر استقبال کرے گا خواہ وہ چور ڈاکو بدمعاش ہی کیوں نہ ہو اور اگر اس کے پاس مال ودولت نہیں دنیا کا کوئی اعلیٰ منصب اس کے پاس نہیں تو پھر بڑے سے بڑا ولی ہی کیوں نہ ہو اس کے نزدیک وہ حقیر ترین ہوگا اس لیے کہ اس کے عزت ذلت کے معیار پر وہ پورا نہیں اترتا اس کے اعتبار سے نہ اس کے پاس وہ مال نہ اس کے پاس کوئی منصب یہ اس کو حقارت کی نگاہ سے ذلت کی نگاہ سے دیکھے گا۔

مؤمنین کو تسلی:

"والذین اتقوا" یہاں سے مؤمنین کے لیے تسلی ہے اللہ نے ان کو تسلی دی " والذین اتقوا فوقھم یوم القیامة " یہ دنیا کی چند روزہ بہار ہے کہ مال ودولت والے مال ودولت کی وجہ سے کسی بڑے منصب کی وجہ سے اپنے آپ کو باعزت سمجھتے ہیں ایمان والوں کو گھٹیا سمجھتے ہیں۔

لیکن قیامت والے دن جو ایمان والے ہیں اہل تقویٰ لوگ ہیں فوقھم یہ پھر ان پر بلند ہوں گے مقام کے لحاظ سے بھی اور مرتبے کے لحاظ سے بھی، اللہ تعالیٰ ان کو بہت اونچا مقام بھی عطا کریں گے اور اسی طرح سے اونچا مرتبہ بھی عطا کریں گے، تفسیر روح المعانی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ محل بھی اونچے اونچے ان کو دیں گے مرتبہ بھی ان کو بہت اونچا عطا فرمائیں گے، تو تسلی دی گئی کہ دنیا کی اس تکلیف سے ان کی طعن وتشنیع سے اور ان کی اس تحقیر سے گھبرانا نہیں بلکہ تمہاری نظر جنت پر اور جنت کی نعمتوں پر ہونی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ وہاں پر یہ ساری کمی پوری کردیں گے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی اللہ تعالیٰ تمہیں نعمتیں عطا کریں گے چنانچہ دوسری جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کا ذکر کیا ''واذا انقلبوا الیٰ اھلھم انقلبوا فکھین، واذا رأوھم قالوا ان ھؤلاء لضالون، وما ارسلوا علیھم حافظین، فالیوم الذین آمنوا من الکفار یضحکون'' دنیا میں یہ استہزاء کرتے ہیں لیکن قیامت والے دن ایمان والے ان کے ساتھ استہزاء کریں گے کہ استہزاء کرنے والو اب بتاؤ، وہ مال و دولت تمہارے کام آئے وہ کوٹھیاں تمہارے کام آئیں وہ مرتبہ اور منصب جس پر تم فخر کیا کرتے تھے آج وہ تمہارے کام آئے تو یہ پھر ان سے استہزاء کریں گے۔

سورۃ المؤمنون میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ''فاتخذتموھم سخریا حتیٰ انسوکم ذکری وکنتم منھم تضحکون، انی جزیتھم الیوم بما صبروا انھم ھم الفائزون'' کہ تم نے ان ایمان والوں کو دنیا کے اندر استہزاء کا ذریعہ بنایا اور اتنا استہزاء کیا کہ تم نے میرے ذکر کو یعنی شریعت کو قرآن کو ہی تم نے بھلا دیا، اتنے تم استہزاء میں لگے اور ان کے ساتھ استہزاء کرتے رہے انہوں نے تمہارے استہزاء پر ایذاء رسانی پر صبر کیا، آج میں نے ان کے صبر کی وجہ سے ان کو کامیاب کردیا اور وہ اپنے مقصد کو پا گئے ''انھم ھم الفائزون'' اسی طریقے سے نوح علیہ السلام کی جو قوم تھی انہوں نے بھی تو یہی کیا، اپنے ایمان نہ لانے کا جو انہوں نے عذر بیان کیا تو وہی ''فقال الملأ الذین کفروا من قومه ما نرٰک الا بشرا مثلنا وما نرٰک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا'' گویا کہ ایمان لانے والوں کو انہوں نے بھی گھٹیا سمجھا، ''واتبعک الارذلون''

اور مشرکین مکہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر یہی شرط لگائی تھی کہ یہ جو ایمان لا چکے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے بارے میں کہا کہ یہ تو بہت گھٹیا گھٹیا لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ بیٹھنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں، ہم ان کے ساتھ بیٹھنا گوارہ نہیں کرتے لہٰذا ہم ایمان تب لائیں گے اور آپ کی بات تب سنیں گے کہ جب ہم آئیں تو یہ نہ آئیں، یہ آئے ہوئے ہوں گے تو ہم نہیں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سختی کے ساتھ یہ حکم دیا ''ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھه ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک

علیھم من شیء" اللہ تعالیٰ نے ڈانٹ دیا کہ خبردار ان غریبوں کو نہیں ہٹانا اور وہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو مشہور ہے جس پر پوری سورۃ اتری "عبس وتولی ان جاءہ الاعمیٰ ومایدریک لعلہ یزکیٰ اویذکر فتنفعہ الذکریٰ اما من استغنیٰ فانت لہ تصدیٰ وماعلیك الا یزکیٰ واما من جاءك یسعیٰ وھو یخشیٰ فانت عنہ تلھیٰ" تو اللہ نے ان فقراء کو تسلی دی کہ "والذین اتقوا فوقھم یوم القیامۃ"

"واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب" یہاں سے دوسری تسلی دی کہ اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب، اتنا زیادہ اتنا زیادہ جو حساب میں ہی نہیں آسکتا حساب میں آتی ہے تھوڑی چیز اللہ ان کو اتنا دیتا ہے اتنا دیتا ہے جو حساب سے ہی باہر ہے، اللہ تعالیٰ ان گنت بے شمار رزق عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے، اس میں ان فقراء کے لئے تسلی ہے کہ یہ تقسیم الٰہی ہے اللہ نے کسی کو زیادہ دے دیا کسی کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا دے دیا تو اگر اللہ نے ان کو زیادہ دے دیا اور ان کو تھوڑا دیا اور اس تھوڑے ہونے کی وجہ سے تمہیں گھٹیا اور حقیر سمجھتے ہیں اور تمہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، استہزاء کرتے ہیں تو اللہ کی اس تقسیم پر تمہیں راضی رہنا چاہیئے، اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیئے ایک تو ان کے لئے یہ تسلی ہے۔

اور دوسرا بعض نے یہ کہا کہ اس کے اندر تسلی یوں دی گئی کہ اللہ نے دنیا میں تمہیں تھوڑا دیا ہے لیکن قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اتنا دے گا اتنا دے گا بغیر حساب، اس لئے اللہ یہ کمی وہاں پوری کردے گا "ولکم فیھا ماتشتھی انفسکم ولکم فیھا ماتدعون" وہاں جو مانگو گے جو چاہو گے سب ملے گا یہاں پر بس اللہ کی چاہت تم پوری کردو وہاں پر اللہ تمہاری چاہتیں پوری کرے گا اس لئے اس استہزاء کی اور ایذاء رسانی کی یہاں پر کوئی پرواہ نہ کرو اور دین پر پختہ رہو۔

اسلام سے اعراض کا دوسرا سبب:

"کان الناس امۃ واحدۃ" یہاں سے ان کے اسلام سے اعراض وانحراف کرنے کا، واضح آیات یعنی واضح دلائل اور نشانیوں کے بعد بھی، واضح معجزات دیکھنے کے بعد بھی انکار کرنے کا دوسرا سبب بیان کیا، پہلا سبب بیان کیا تزئین دنیا، یعنی حب مال حب جاہ، اور دوسرا سبب بیان کیا بغض، کینہ، حسد، عداوت، عناد، یہ چیزیں ہیں جو حق کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، ایک تو یہاں پر یہ بیان کیا، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا کہ یہ جو اللہ کی نعمت کو کفر میں تبدیل کیا، اللہ کی نعمت کیا تھی؟ واضح دلائل واضح معجزات واضح احکامات یہ اللہ کی نعمت تھی لیکن انہوں نے بجائے ایمان لاکر ایمان کی نعمت حاصل کرنے کے ان آیات کے ساتھ کفر کیا اس تبدیلی نعمت

اور کفر کا سبب بیان کیا، فرمایا کہ لوگ پہلے ایک جماعت تھے ایک جماعت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سارے کے سارے لوگ عقیدہ توحید پر تھے یہ کب تھے؟ جب اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ لیا تھا عہد الست ''الست بربکم قالوا بلی'' تو سب نے عقیدہ توحید اختیار کیا پھر اسی طریقے سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں بھی سارے ایک عقیدے پر تھے یا اس سے مراد یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا اور اس وقت کا فر مشرک سارے غرق ہو گئے تو جو بچ گئے تھے وہ سارے عقیدہ توحید پر تھے ''امة واحدة'' تھے۔

پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا یہاں پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت یہی ہے ''کان الناس امة واحدة فاختلفوا'' ایک جماعت تھے پھر اس کے بعد انہوں نے اختلاف کیا، کوئی عقیدہ توحید پر قائم رہا کوئی عقیدہ توحید کا منکر بن گیا انہوں نے پھر اختلاف کیا، اور جو اختلاف کرنے والے تھے حق راستے سے ہٹنے والے اس وقت بھی ان کا یہی انداز اور اب بھی یہی انداز کہ ان کے پاس دلائل نہیں ہوتے شکوک وشبہات ہوتے ہیں حق کے بارے میں وساوس ڈالنا شکوک وشبہات پیدا کرنا تو ایسی صورت میں پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع کیا حق وباطل میں فرق کرنے کے لئے، حق کا داعی بنا کر اور حق وباطل کی پہچان کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کا اور آسمانی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا یہ ہے '' فبعث الله النبيين ''۔

نحو کی اصطلاح میں یہ فبعث کی جو فاء ہے اس کا نام ہے فاء فصیحیہ، فاء فصیحیہ سے پہلے اس کا معطوف علیہ مقدر ہوتا ہے اور وہ سبب بنتا ہے فاء کے مابعد کے لئے تو پہلے مقدر نکلے گا ''فاختلفوا'' کہ سارے ایک جماعت تھے پھر انہوں نے اختلاف کیا اختلاف کیا یہی سبب بنا سلسلہ انبیاء علیہم السلام کے شروع کرنے کا تا کہ وہ انبیاء علیہم السلام آ کر حق وباطل کے درمیان فرق کریں، اسی لئے قرآن کریم کی ایک صفت ہے ''الفرقان'' حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والا، تو اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا ''مبشرین ومنذرین'' جو خوشخبری دینے والے تھے مؤمنین کو جنت کی اور ڈرانے والے تھے کافروں کو دوزخ سے تو اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی یہ دونوں صفتیں تھیں مبشر اور منذر، تبشیر اور انذار یہ دونوں کام پیغمبروں نے کئے جنت کی بشارت دی مؤمنین کو اور دوزخ سے ڈرایا کافرین کو۔

''وانزل معهم الكتاب'' اور اللہ نے پھر ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری، ''بالحق'' اور جو کتاب اللہ تعالیٰ نے اتاری چونکہ حق اور باطل کے دونوں سلسلے موجود تھے، حق کیا ہے باطل کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ذریعے سے حق کا تعین کیا کہ یہ حق ہے جو حق کو بیان کرنے والی ہے ''ليحكم بين الناس'' تا کہ اللہ فیصلہ کر دے اللہ کا نبی فیصلہ کر دے اور وہ کتاب فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟ ''فيما اختلفوا فيه'' اس چیز میں جس میں انہوں نے اختلاف کیا، اختلاف کیا تھا حق کے اندر کہ کوئی حق کو ماننے والا اور کوئی حق

کے مقابلے میں حق کی نقل پیش کر کے اس کو حق بتانے والا اور اصل حق کا انکار کرنے والا، تو اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ذریعہ سے نبی کے ذریعہ سے فیصلہ کرنے کے لئے یہ سلسلہ شروع کیا۔

آپس میں اختلاف کا سبب:

آگے اللہ تعالیٰ نے سبب بتایا کہ یہ اختلاف انہوں نے کیوں کیا؟ اور اختلاف کن لوگوں نے کیا فرمایا کہ یہ جو اختلاف کیا ''بغیا بینھم'' آپس میں ضد، حسد، عناد، عداوت کی وجہ سے انہوں نے آپس میں اختلاف کیا، تو اصل اختلاف کا جو سبب ہوتا ہے وہ یہی اندرون کھاتہ کبھی تو شکوک وشبہات، یہاں پر جو انہوں نے اختلاف کیا یہ تھا ضد، حسد، عناد، عداوت کی وجہ سے اور اختلاف بھی کیا ''من بعد ماجاء تھم البینات'' ان کے پاس اللہ کے احکامات واضح واضح دلائل آچکے تھے، لیکن واضح احکامات اور واضح دلائل آجانے کے بعد پھر بھی انہوں نے ضد وعناد کی وجہ سے اختلاف کیا، ایک ہے کہ اختلاف اس وجہ سے ہو کہ کوئی چیز واضح نہ ہو غیر واضح چیز کی وجہ سے اختلاف ہو لیکن یہاں پر تو ''من بعد ماجاء تھم البینات'' واضح دلائل اور واضح احکامات اللہ تعالیٰ کے آچکے جن کو کہا جاتا ہے احکام محکمہ، اس کے باوجود پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔

ہدایت کس کو نصیب ہوتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جب انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے حق وباطل کا فرق واضح کیا اب حق واضح ہو گیا لیکن حق کو تسلیم کس نے کیا، اس حق پر ایمان کون لایا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''فھدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ'' کہ اللہ نے پھر ان لوگوں کو ہدایت دی حق کی طرف جب حق میں وہ اختلاف کر رہے تھے اس کی طرف ان لوگوں کو ہدایت دی جو ایمان لانے کا ارادہ رکھتے تھے، یعنی ان کے اندر ضد نہیں تھی عناد نہیں تھا اور ان کے اندر کوئی کینہ نہیں تھا، ان نقائص سے وہ پاک تھے اور ایمان کا ارادہ رکھتے تھے، ان کے اندر ایمان کی طلب تھی ہدایت کی پیاس تھی تو ایسے جو طالب حق لوگ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر ہدایت دی اس حق کی طرف جس میں وہ اختلاف کر رہے تھے ''باذنہ'' اپنی توفیق کے ساتھ اور اپنے فضل کے ساتھ اس سے معلوم ہوا کہ واضح احکامات بھی ہوں واضح دلائل بھی ہوں تو ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے اندر ضد عناد نہ ہو، ضد عناد آجائے تو پھر سمجھانے والے پیغمبر ہوں سمجھنے والا ابولہب ابوجہل ہو تو پھر بھی ہدایت نصیب نہیں ہوتی، اور یہ بھی پتہ چلا کہ یہ ہدایت نصیب اسی کو ہوتی ہے جس کے اندر حق کی طلب ہو جس کے اندر ایمان لانے کا اور ماننے کا ارادہ ہو عزم ہو اس کو ہدایت نصیب ہوتی ہے وہ اللہ سے ہدایت مانگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے دیں گے۔

"فھدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ" کی حدیث پاک میں چند مثالیں ہیں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے حدیث ہے تفسیر خازن میں اور اس کا خلاصہ پھر تکالا تفسیر مظہری میں کہ یہود و نصاریٰ نے اختلاف کیا قبلہ کے مسئلے میں یہود کا قبلہ بیت المقدس کی مشرق کی طرف تھا نصاریٰ کا مغرب کی طرف تو یہ اختلاف کیا "فھدانا اللہ للکعبۃ" اللہ تعالیٰ نے پھر ہدایت کی کعبہ کی طرف اسی طریقے سے روزوں کے بارے میں اختلاف ہوا کہ روزے کس مہینے میں رکھنے زیادہ فضیلت والے ہیں "فھدانا اللہ شھر رمضان" اسی طریقے سے ایام کے بارے میں اختلاف ہوا کہ ایام میں سے کونسا دن عبادت کے لیے زیادہ فضیلت والا ہے نصاریٰ نے اتوار کو اختیار کیا یہود نے ہفتہ کے دن کو ترجیح دی "فھدانا اللہ للجمعۃ" ابراہیم علیہ السلام کے بارے اختلاف پیدا ہوا کہ ان کا مذہب کیا تھا، یہود نے کہا کہ وہ یہودی تھے نصاریٰ نے کہا کہ وہ نصرانی تھے "فھدانا اللہ للحق" اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا کہ حق کی طرف یعنی ابراہیم علیہ السلام کا مذہب کیا تھا اسی طریقے سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی انہوں نے اختلاف کیا یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت بدزبانی کی حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بہت بدزبانی کی عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور العیاذ باللہ ولد الزناء کہا حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں تہمت کی بات کی اور نصاریٰ نے اتنا بڑھایا چڑھایا کہ الٰہ بنا دیا" فھدانا اللہ للحق "عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو حق بات تھی اللہ نے ہماری اس کی طرف راہنمائی کی۔

کونسا اختلاف دوزخ میں لے جانے کا سبب ہے؟

دوسری جگہ یہ بھی آتا ہے "ولاتکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد جاء تھم البینات" ان لوگوں کی طرح نہ ہوؤ کہ جنہوں نے اللہ کے واضح احکام واضح دلائل آجانے کے بعد پھر اختلاف کیا اس سے بات سمجھ میں آگئی کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں ایک ہے اختلاف واضح احکامات اور واضح دلائل آجانے کے بعد ان واضح احکامات میں اختلاف کرنا یہ اختلاف مذموم ہے اور یہی اختلاف ہے جس کے نتیجے میں ۷۳ فرقے بنیں گے، اور ۷۲ دوزخ میں جائیں گے محکمات میں واضح احکامات میں اختلاف، یہ اختلاف ۷۲ کو دوزخ میں لے جائے گا اور ایک فقط جنت کے اندر جائے گا۔

اور ایک اختلاف ہے غیر واضح مسائل میں جس کو اجتہادی اختلاف کہا جاتا ہے یہ دوزخ میں لے جانے والا نہیں، بلکہ اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بخاری شریف کی روایت کے مطابق کہ اگر مجتہد درست اجتہاد کرے تو دو اجر اور اگر اس نے اجتہاد میں خطا کی تو ایک اجر پھر بھی اللہ تعالیٰ دے دیں گے تو اس کا مطلب

یہ ہوا کہ مجتہد مصیب بھی اجر کا مستحق ہے اور مجتہد مخطی بھی اجر کا مستحق ہے، اور اجر ملے گا جنت کے اندر تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجتہد مصیب بھی جنت میں اور مجتہد مخطی بھی جنت میں اسی طرح دونوں کے پیروکار بھی جنت میں، صرف اتنا ہے کہ جو مجتہد مصیب ہے اس کے درجے زیادہ اونچے ہیں اور اس کو ثواب دگنا ملے گا مجتہد مخطی اور اس کے پیروکاروں کو درجہ کم ملے گا ثواب بھی کم ملے گا لیکن بہرحال وہ بھی جنت میں ہی ہوں گے، تو اس لئے یہاں پر جس اختلاف کی مذمت کی گئی جس اختلاف سے منع کیا گیا وہ ہے "من بعد ماجاء تھم البینات" بینات سے مراد واضح دلائل واضح احکامات، واضحات میں اختلاف کرتا ہے یہ ہے اختلاف جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنے گا۔

اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے:

"واللہ یھدی من یشاء الیٰ صراط مستقیم "اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف، جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے، اور اللہ ہدایت کس کو دینا چاہتا ہے جو اللہ سے ہدایت مانگتا ہے جو طالب ہدایت ہے اس کے اندر ضد نہ ہو عناد نہ ہو، جن کے اندر ضد اور عناد ہوتی وہاں تو ہے "ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم " وہاں تو اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے اور اسی لئے ہے "وجعلنا علیٰ قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ وفی آذانھم وقرا" اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تو ان کو اللہ ہدایت نہیں دیتا اللہ ہدایت انہی کو دیتا ہے اور اللہ کی مشیت انہی کو ہدایت دینے کی ہے جن کے اندر یہ ضد و عناد نہ ہو بلکہ ان کے اندر ایمان لانے کا ارادہ ہو اور ان کے دل کے اندر سچی طلب ہو اور وہ اللہ سے ہدایت مانگیں اللہ ان کو ہدایت دیتا ہے۔

آزمائشوں کے ساتھ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے:

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ "اللہ تعالیٰ نے والذین اتقوا سے ایمان والوں کو ایک تسلی دی، "واللہ یرزق من یشاء" سے دوسری تسلی دی، "ام حسبتم " سے اللہ تعالیٰ نے تیسری تسلی دی، نیز جب حق و باطل کا اختلاف ہوتا ہے اور معرکہ حق و باطل چلتا ہے تو پھر بعض دفعہ اہل باطل کو مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں، اب آگے مضمون جو چل رہا ہے ایک تو اہل ایمان کو تسلی دینا مقصود ہے، اور دوسرا ان کے اندر استقامت ثابت قدمی پختگی پیدا کرنا مقصود ہے، اور تیسری چیز ان کے اندر ایک بہادری دلیری شجاعت پیدا کرنا مقصود ہے، "ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ" کیا تم نے گمان کیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ پہلے لوگوں کے اوپر جو حالات گزرے وہ حالات ابھی تمہارے اوپر آئے ہی نہیں، جو پہلے لوگوں

کے اوپر حالت آئی مصیبتوں کی تکلیفوں کی ایذاءرسانیوں کی وہ حالت تمہارے اوپر نہیں آئی، تو تمہارا خیال ہے کہ تم ایسے ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور مصیبتیں تکلیفیں تمہیں پیش نہیں آئیں گی۔

"الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لایفتنون ولقدفتناالذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکذبین" کیا اللہ سچے اور جھوٹے لوگوں کو جدا نہیں کرے گا اصل یہی ہے کہ یہ سچے اور جھوٹے مل جاتے ہیں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ ان میں سچا کون ہے؟ جھوٹا کون ہے؟ منافق قسم کے لوگ اس طرح شامل ہو جاتے ہیں اہل حق کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور وہی ہیں جو پھر اندر گھس کر اہل ایمان کو نقصان بھی پہنچاتے ہیں، ان کے دین ایمان کو خراب بھی کرتے ہیں، شکوک وشبہات بھی پیدا کرتے ہیں، اندر گھس کر یہ مار آستین بن جاتے ہیں جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لئے ان کو جدا جدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایسی بھٹی گرماتے ہیں کہ جس سے یہ میل کچیل الگ ہو جائے یہ منافقین کا گروہ الگ ہو جائے، مخلصین سے منافقین نکھر کر سامنے آ جائیں،"ما کان اللہ لیذر المؤمنین علیٰ ماانتم علیہ حتیٰ یمیز الخبیث من الطیب" تو اللہ تعالیٰ پھر اس طریقے سے ان کو جدا کرتے ہیں۔

اب جدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نام بتادے کہ فلاں ایسا ہے فلاں ایسا ہے تو یہ بتانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھ مختص ہو جاتا وحی آپ پر اترتی لیکن آپ کے بعد تو پھر یہ صورت نہ بنتی جبکہ اللہ کا یہ اصول دائمی ابدی ہے کہ جب اس طریقے سے حق باطل میں مل جائے کوئی پتہ نہ چلے کہ اہل حق کون ہیں؟ اہل باطل کون ہیں؟ تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے مصیبتوں کی تکلیفوں کی بھٹی گرماتے ہیں اب ہوتا کیا ہے کہ جو تو مخلص ہوتے ہیں وہ تو حق کی خاطر مصیبتیں تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور وہ ثابت قدم رہتے ہیں لیکن جو منافق قسم کے لوگ ہوتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ اہل حق کے ساتھ رہنے میں مصیبتیں ہیں، تکلیفیں ہیں، آزمائشیں ہیں، رگڑے لگتے ہیں اور وہ یہ رگڑے سہہ نہیں سکتے تو پھر وہ ایک طرف ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ ایک طرف ہو جائیں تو اس لئے اللہ تعالیٰ نے پھر قرآن کریم میں جگہ جگہ تسلی دی اور ان کے اندر استقامت ثابت قدمی پیدا کی، اور ان کے اندر شجاعت بہادری اور ایمانی قوت ابھاری کہ اگر ایسا وقت آ جائے کہ دین کی خاطر مصیبتیں تکلیفیں اٹھانی پڑیں خندہ پیشانی کے ساتھ یہ مصیبتیں تکلیفیں اٹھاؤ۔

"ام حسبتم ان تدخلوا الجنة" کیا تمہارا گمان ہے کہ تم جنت میں ایسے ہی داخل ہو جاؤ گے، "ولمایأتکم مثل الذین خلوا من قبلکم" حالانکہ ابھی تک نہیں آئی تم پر وہ حالت جو تم سے پہلے لوگوں پر آئی

"مستھم البأساء" یہاں سے جو پہلے لوگوں کی حالت ہے اس کی تفصیل کی کہ ان کی کیا حالت ہوئی، ان پر مالی تنگی آئی، بدنی تکلیفیں بھی آئیں، ان پر اتنی تکلیفیں آئیں کہ وہ جھنجوڑ دیئے گئے، ہلا کر رکھ دیئے گئے اس قدر ان پر تکلیفیں آئیں ان کا رسول بھی اور رسول پر جو ایمان لے کر آئے تھے وہ بھی اللہ کے سامنے فریاد کرنے لگے "متیٰ نصر الله" اللہ تیری مدد کب آئے گی، تو نے جو وعدہ کیا تھا، "انا لننصر رسلنا والذین آمنوا" وہ تیرا وعدہ کب پورا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا "الا ان نصر الله قریب" اللہ کی مدد قریب ہے بس ذرا صبر کرو، استقامت اختیار کرو، ثابت قدمی پختگی دکھاؤ، جمے رہو اللہ کی مدد آئے گی۔

گذشتہ امتوں پر آنے والی تکالیف:

حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ اور اسی طرح وہ صحابہ جن کو ستایا گیا انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کعبۃ اللہ کے سائے میں تشریف فرما تھے تو حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا "الا تستنصر لنا الا تدعو لنا" آپ ہمارے لئے اللہ سے مدد کیوں نہیں مانگتے آپ ہمارے لئے دعا کیوں نہیں کرتے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قد کان من قبلکم یوخذ الرجل فیحفر له فی الارض فیجعل فیھا" کہ تم ابھی اس تکلیف پر گھبرا گئے ہو تم سے جو پہلے لوگ تھے ان میں سے ایک آدمی کو پکڑا جاتا زمین میں گڑھا کھودا جاتا اس کو زندہ اس گڑھے کے اندر ڈال کر اوپر سے گڑھے کو بند کر دیا جاتا، اس کو زندہ درگور کر دیا جاتا "فیجاء بالمنشار فیوضع علیٰ رأسه فیجعل نصفین" ایک آدمی کو پکڑا جاتا اس کے سر کے اوپر آری رکھ کر اس کو اس طریقے سے دو ٹکڑے کر دیا جاتا آری کے ساتھ "ویمشط بامشاط الحدید مادون لحمه وعظمه" لوہے کی کنگھی بنا کر اس کے ساتھ ان کا گوشت نوچ لیا جاتا ہڈیوں سے "فما یصده ذلك عن دینه" لیکن اتنی سخت سے سخت تکلیف یہ بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیر سکتی، اتنی استقامت اور ثابت قدمی دکھاتے۔

"والله لیتمن هذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لایخاف الا الله والذئب علی غنمه ولکنکم تستعجلون (بخاری ص ۱۰۲۷ ج ۲)" اللہ کی قسم اللہ اس دین کے معاملے کو کامل کرے گا اللہ اس کو غالب کرے گا حتیٰ کہ اتنا غالب کر دے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک چلے گا اور سوائے اللہ کے اس کے دل میں کسی کا خوف نہیں ہوگا دشمن اس طرح سے مغلوب ہو جائے گا، اور حتیٰ کہ بھیڑیے بکریوں کو نقصان پہنچانا چھوڑ دیں گے، لیکن تم ذرا جلدی کر رہے ہو اس لئے ذرا صبر دکھاؤ استقامت اختیار کرو، ایمانی قوت پر قائم رہو تو یہ حقیقت میں آئے گا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی۔

انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب:

"یسئلونک ماذا ینفقون" اب ظاہر بات ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فقر و فاقہ کی وجہ سے طعنے دیے جارہے تھے اور ان کو ستایا جارہا تھا تو جو اہل ثروت ہیں ان کے دل میں جذبہ پیدا ہوا ہوگا کہ ہم کچھ مال خرچ کریں، ان کی امداد کریں، ان کی پریشانی میں کام آئیں تو پھر آپ سے پوچھا ہوگا کہ اللہ کے راستے میں ہم کیا کچھ خرچ کریں، نیز جب کفار کے مظالم کا ذکر کیا تو اب ان مظالم کے سدباب کے لئے ایک تدبیر بتائی یہ تدبیر کیا ہے؟ "القتال القتال القتال" اس کی تدبیر ہے قتال، قتال یہ کفار کے ظلم وستم کے سدباب کے لئے ہے لیکن یہ قتال موقوف ہے انفاق مال پر اس لئے پھر اللہ تعالیٰ نے اس تدبیر کے بتانے سے پہلے انفاق مال کا حکم ذکر فرمایا اور اس کے بعد پھر قتال کا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا "ماذا ینفقون" کونسی ہے وہ چیز جس کو وہ خرچ کریں، تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہلوایا "قل" "فرما دیجئے" "ماانفقتم من خیر فللوالدین والاقربین" جو مال بھی تم خرچ کرو پس وہ خرچ کرو والدین کے لئے قرابت داروں کے لئے "والیتامیٰ والمساکین" یتیموں کے لئے مسکینوں کے لئے "وابن السبیل" اور مسافرین کے لیے، مسافرین کے اندر مجاہدین بھی آگئے۔

اب سوال تو یہ تھا کہ کونسی ہے وہ چیز جس کو وہ خرچ کریں لیکن اللہ تعالیٰ نے جو جواب ذکر فرمایا اس انداز سے کہ اس کا جواب بھی دے دیا اور ایک مزید فائدے کی بات اور بھی بتادی، کیا چیز خرچ کریں جواب دیا "ماانفقتم من خیر" جو مال بھی خرچ کر سکتے ہو کرو خواہ تھوڑا یا زیادہ "ماانفقتم من خیر" یہ ما کا بیان ہے اور ما عموم کے لیے ہے کہ جو مال بھی خرچ کر سکتے ہو خواہ تھوڑا خواہ زیادہ اپنی گنجائش کے مطابق جو بھی خرچ کر سکتے ہو کرو یہ تو اس کا جواب آگیا کہ کونسی چیز خرچ کریں جواب یہی ہوا جو خرچ کر سکتے ہو کرو۔

صراحت کے ساتھ مصارف کو بیان کرنے کی وجہ:

اور آگے مزید ایک بات بتائی کہ جو مال خرچ کرو اس کا مصرف یہ ہیں والدین کے لیے، قرابت والوں کے لیے، یتیموں، مسکینوں کے لیے، مسافرین کے لیے، یہ مصرف بھی بتادیا جو اصل سوال کیا گیا تھا اس کا جواب آیا ضمناً اور جو زائد بات بتائی جارہی ہے مصرف اس کو بیان کیا زیادہ صراحت کے ساتھ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اشارہ اس بات کی طرف کیا گیا ہے کہ مال خواہ تھوڑا خرچ کرو یا زیادہ وہ تو اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرو۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مال خرچ کرو صحیح مصرف میں اگر تھوڑا مال ہو اور صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے تو یہ عند اللہ قبولیت کا، عند اللہ نجات کا ذریعہ بن جائے گا اور یہی کامیابی کا ذریعہ بن جائے گا اور اگر مال

تو زیادہ سے زیادہ مقدار میں خرچ کیا لیکن اگر صحیح مصرف پر خرچ نہیں کیا تو اس پر مطلوبہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوگا، اور اللہ کی رضا بھی حاصل نہیں ہوگی تو اس لیے اصل چیز یہ ہے کہ صحیح مصرف پر خرچ کیا جائے " وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم " یہ پھر آگے ترغیب دی انفاق مال کی کہ جو نیکی بھی تم کرو گے اور اسی طریقے سے یہاں تعمیر کرنی مقصود ہے کہ صرف انفاق مال نہیں انفاق مال کے علاوہ اور بھی بہت سارے کار خیر ہیں تو جو نیکی بھی تم کرو گے مال خرچ کرنے والی، اس کے علاوہ بیماروں کی تیمارداری کرنے والی، مجاہدین کے گھروں کی دیکھ بھال کرنے والی، مجاہدین جو جہاد میں چلے جاتے ہیں ان کے گھر کے بھی کچھ مسائل ہوتے ہیں تو جو پڑوسی ہوتے ہیں پیچھے رہنے والے ان کا کام یہی ہے کہ وہ یہ فریضہ انجام دیں تو جو نیکی بھی تم کرو گے مال خرچ کرنے والی جہاد کرنے والی مجاہدین کی خدمت کرنے والی وہ بہتر ہے۔

اور بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسا ہوتا تھا کہ میں جمعہ پڑھنے جا رہا ہوں اور تو نے اپنے مال کی بھی خبر گیری کرنی ہے اور میرے مال کی بھی، اپنے مال کی بھی فکر کرنا اور میرے مال کی بھی وہ جو نماز پڑھنے کے لیے گیا یہ پیچھے اس کے مال کو سنبھالتا، اگلا جمعہ آیا تو پہلے جمعے میں جو کام کاج کرنے والا تھا وہ جمعہ پڑھنے کے لیے جاتا اور وہ پیچھے رہتا اور اس کے کام کاج کو بھی سنبھالتا تو اسی طرح مجاہدین کچھ جہاد کے لیے چلے گئے لیکن ان کے پیچھے کئی کام ہوں گے جو ان کے پیچھے رہنے والے ہیں پھر وہ خدمات سرانجام دیں تو " ماتفعلوا من خیر " کے اندر عام لفظ استعمال کیا گیا کہ جو نیکی بھی تم کرو گے تو " یجازیکم اللہ " اللہ تمہیں بدلہ دے گا" فان اللہ بہ علیم " کہ اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے، وہ جانتا ہے تمہاری وہ نیکی ضائع نہیں جائے گی اللہ اس کا بدلہ دیں گے انفاق مال کے بعد اب آگے قتال کا حکم انفاق مال کے ساتھ آلات جہاد تیار ہو گئے اب آگے قتال کا حکم آ رہا ہے۔

فرضیت قتال:

" کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم " فرض کیا گیا ہے تم پر قتال حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے ایک کراہت ہوتی ہے عقلی ایک ہوتی ہے طبعی اگر اللہ کی طرف سے حکم ہو اور کراہت عقلاً ہو یہ کفر ہے جب کوئی عقل کے اعتبار سے اس کو ناپسند سمجھے نہ مانے تو یہ کفر ہے۔

ایک ہے کراہت طبعی کہ عقل کے اعتبار سے تو وہ مانتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے فرض ہے لیکن طبعیت پر گراں ہے یہ غیر اختیاری ہے کیونکہ عقلاً کراہت اختیاری ہوتی ہے جو طبعاً کراہت ہوتی ہے یہ غیر اختیاری ہوتی ہے تو اس لیے یہاں کراہت سے کراہت طبعی مراد ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناپسند ہے ناگوار ہے یہ جو کہا " ھو کرہ لکم " یہ اس

فرضیت قتال والے حکم کی تاکید ہے کہ خواہ تم قتال کو پسند نہیں کرتے لیکن قتال تمہارے اوپر فرض ہے اس لیے یہ کراہت طبعی قتال میں رکاوٹ نہیں بنی چاہیئے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اس کراہت طبعی جو جہاد اور قتال میں مانع بن سکتی ہے اس کا ازالہ فرمایا ازالہ کے لیے فرمایا کہ یہ جو تمہاری کراہت ہے یہ کراہت بے اعتباری ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو لیکن اسی میں تمہارے لیے بہتری ہو اور ایک چیز کو تم پسند کرو لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہو یعنی انسان کی پسند تو ایسے ہی ہے جیسے چھوٹے بچے کے سامنے انگارے رکھ دیے جائیں اور وہ چمک رہے ہوں تو وہ کس طرح سے اچھل اچھل کر ان تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے اتنا قریب ہو جاتا ہے، تو جتنا قریب ہوتا جاتا ہے اتنا زیادہ خوش ہوتا ہے اس کا جی یہ چاہتا ہے دوڑ کر پہنچ جائے۔

لیکن جب ماں کی نظر پڑتی ہے تو وہ تڑپ جاتی ہے وہ دوڑ کر آتی ہے فوراً اس کو پیچھے کھینچتی ہے، اب بچہ چیختا ہے چلاتا ہے اکڑ اکڑ کر وہ گرنے کی کوشش کرتا ہے اور ادھر ہی زور لگاتا ہے ماں اس کو کھینچ لیتی ہے ماں جانتی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا بچے کو نہیں پتہ اور اسی طریقے سے کڑوی دوائی ہے اب بچے کو جب ماں پلانے لگتی ہے تو بچے کی کیا حالت ہوتی ہے بچہ کبھی منہ ادھر پھیرے گا کبھی ادھر پھیرے گا کبھی ہاتھ مار کر گرانے کی کوشش کرے گا، اخیر ماں کیا کرتی ہے اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھنسا لیا اور گھٹنوں کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ قابو کر لیے اور قابو کر کے چمچی اس کے منہ میں رکھی اس کے دانت کھول کر دوائی پلٹ دیتی ہے اب ضد میں دوائی لی تو پھر بھی وہ کوشش کرتا ہے کہ میں نہ نگلوں لیکن جب تک وہ حلق سے نیچے نہیں اتر جاتی ماں چمچی باہر نہیں نکالتی۔

اب دیکھو یہی مثال ہے بچہ اس دوائی کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے مفید ہے اور وہ انگاروں کو پسند کرتا ہے اور وہ اس کے لیے نقصان دہ ہیں تو یہی انسانوں کی مثال اللہ کے علم کے مقابلہ میں ہے اللہ فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو "وھو خیر لکم" اور اسی میں تمہارے لیے بہتری ہو، اور ایک چیز کو تم پسند کرو "وھو شر لکم" اسی میں تمہارے لیے شر ہو، وہ نقصان دہ ہو، کیوں "الله یعلم وانتم لا تعلمون" اللہ جانتا ہے انجام کو اور تم انجام کو نہیں جانتے تو اس لیے اللہ کا علم کامل ہے تمہارا علم ناقص ہے تو جب اللہ فرماتے ہیں کہ قتال فرض ہے قتال فرض ہے تو یقیناً قتال کے اندر فائدہ ہی فائدہ ہے خیر ہی خیر ہے اور ترک قتال کے اندر نقصان ہی نقصان ہے اس لیے اگر طبعی کراہت تمہارے اندر ہے تو اس کو نکال باہر کرو اللہ کے علم پر یقین رکھو اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کو خوش دلی سے قبول کر کے قتال کرو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ

وہ آپ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے کے متعلق ، فرمادیجئے کہ اس میں قتال بڑا گناہ ہے ،

وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ

اور اللہ کے راستے سے روکنا اور مسجد حرام سے روکنا اور اللہ کے راستے کے ساتھ کفر کرنا ، اور مسجد حرام والوں کو نکالنا

مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ

اس مسجد حرام سے زیادہ بڑا گناہ ہے اللہ کے نزدیک ، اور فتنہ بہ زیادہ بڑا گناہ ہے قتل سے ، اور وہ ہمیشہ

يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ

تم سے قتال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمہیں پھیر دیں تمہارے دین سے اگر وہ طاقت رکھیں ، اور جو کوئی

يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

تم میں سے پھر جائے گا اپنے دین سے پھر وہ مرے گا اس حالت میں کہ وہ کافر ہے پس یہ لوگ ہیں کہ باطل ہو گئے

اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

ان کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں ، یہ لوگ ہیں آگ والے ، وہ لوگ

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

ہمیشہ رہیں گے اس میں ﴿۲۱۷﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا

فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

اللہ کے دین کو بلند کرنے کیلئے ، یہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں ، اللہ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۲۱۸﴾

شان نزول:

وہ آپ سے پوچھتے ہیں یہ پوچھنے والے کون تھے؟ یا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ پوچھنے والے ہیں یا مشرکین مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا، شہر حرام کے متعلق پوچھتے ہیں " قتال فیہ " یہ شہر حرام سے بدل الاشتمال ہے یعنی شہر حرام میں قتال کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں، یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس واقعہ کی تفصیل تفاسیر میں یوں

آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں ان کو ایک سریہ کا امیر بنا کر بھیجا اور یہ سریہ آپ نے جمادی الاخریٰ کے اخیر میں بھیجا اور یہ بھیجا بھی جنگ بدر سے دو مہینہ قبل اور حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو آپ نے ایک خط لکھ کر دیا اور آپ نے جب بھیجا تو یوں فرمایا کہ یہ خط لے لے اللہ کا نام لے کر چل لیکن دو دن چلتے رہو اور جب دو دن چل لو اور اس کے بعد پھر تم پڑاؤ کے لیے اترو تو اس وقت پھر خط کو کھولنا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے سامنے اس خط کو پڑھو اس خط کے اندر جو کچھ حکم لکھا ہوا ہے اس کے مطابق پھر عمل درآمد کرو۔

لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر جبر نہیں کرنا حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ وہ خط لے کر چلے اس طریقے سے وہ دو دن چلتے رہے دو دن چلنے کے بعد جب اترے اور خط کو کھولا وہ خط اپنے ساتھیوں کو پڑھ کر سنایا اس میں یہ بھی تھا کہ فلاں جگہ جا کر ٹھہر جائیں اور وہاں سے قریش کا ایک قافلہ گزرے گا اس قریش کے قافلے کا انتظار کرو اور اس قافلے پر حملہ کرنا ہے " لعلك تاتينا منها بخير " شاید کہ آپ اس قافلے سے ہمارے پاس کوئی خبر لے آئیں کوئی مال لے آئیں اور نبی کریم ﷺ نے اس قریش کے قافلے کی خاطر یہ ایک سریہ بھیجا۔

جب خط پڑھ کر سنایا تو خود حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بھی پتہ نہیں تھا کہ خط میں کیا لکھا ہوا ہے اب پڑھنے سے پتہ چلا تو پڑھ کر فرمانے لگے " سمعنا واطعنا " ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی " امنا وصدقنا " پھر اپنے ساتھیوں کو کہا کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے منع فرما دیا ہے کہ میں تم میں سے کسی پر اکراہ کروں جبر کروں لہٰذا " فمن کان یرید الشهادة فلينطلق فمن كان يكره فليرجع " کہ جو تم میں سے شوق شہادت رکھتا ہے وہ تو چلے اور جو اس کو ناپسند کرتا ہے وہ لوٹ جائے اس کے بعد پھر چل پڑے جب یہ چلے " لقي اصحابه معه " ان کے باقی ساتھی بھی ان کے ساتھ چل پڑے اور یہ کل آٹھ ساتھی تھے جو اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے بھیجے اور آٹھوں کے آٹھوں وہاں سے چل پڑے حتیٰ کہ جب بطن نخلہ میں پہنچے جو مقام بتایا تھا کہ تم نے وہاں جا کر پڑاؤ کرنا ہے وہاں سے قریش کا قافلہ گزرے گا اس سے یہ کچھ پیچھے تھے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عتبہ بن مروان رضی اللہ عنہ کے پاس ایک اونٹ تھا جس پر یہ باری باری سوار ہوتے تھے وہاں وہ اونٹ ان کا گم ہو گیا تو یہ دونوں حضرات اس اونٹ کی تلاش کرنے میں پیچھے رہ گئے باقی چھ رہ گئے تو وہاں سے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے باقی ساتھیوں کو لے کر چلے گئے اور بطن نخلہ میں جا کر پڑاؤ کیا یہ مکہ اور وادی طائف کے درمیان میں جگہ تھی۔

اب وہاں پر اس قافلے کی انتظار میں یہ ٹھہرے ہوئے ہیں کہ قریش کا قافلہ وہاں سے گزرا اور ان کے پاس کشمش اور اسی طرح طائف سے کچھ تجارتی سامان وہ لے کر آرہے تھے اور اس قافلے کے اندر عمرو بن حضرمی، حکم بن کیسان، عثمان بن عبداللہ، اور نوفل بن عبداللہ، یہ چار آدمی بھی تھے جب انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ان اصحاب کو دیکھا تو ان کے اوپر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور جہاں یہ صحابہ ٹھہرے ہوئے تھے ان کے کچھ فاصلے پر وہ بھی گزرے تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ جو قریش کا قافلہ ہے یہ تم سے ڈر گئے اور یہ گھبرا گئے تو ہوسکتا ہے اِدھر اُدھر چھپیں ہوتا یہی ہے کہ جب کوئی گھبرا جائے تو پھر وہ بچاؤ کی تدبیریں اختیار کرتا ہے تو حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ ان کے دل سے خوف اور ڈر نکال دیا جائے تاکہ وہ بے فکر ہوکر وہاں پر رہیں۔

اب ترکیب یہ سوچی کہ ایسا کرو کہ اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو اور وہ پھر ان کے سامنے کرو چنانچہ حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ یہ بھی ان چھ ساتھیوں میں تھے ان کا سر مونڈا اور پھر اس کو ان کے سامنے کر دیا جب انہوں نے ان کے گنجے سر کو دیکھا تو ان کے دل سے خوف دور ہوگیا اور وہ کہنے لگے کہ یہ تو عمار کی قوم ہے وہ قوم کوئی اتنی جرأت مند نہیں اور لڑائی والی نہیں تو وہ بے فکر ہوگئے ترکیب کامیاب رہی اور ادھر پھر یہ صورت تھی کہ یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن تھا، حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ ہمارے پاس یہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن ہے اگر ہم نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ مکہ واپس پہنچ جائیں گے لہٰذا آج رات ہی ان کے اوپر حملہ کر دینا چاہیئے اور وہ چونکہ جمادی الاخریٰ کا آخری دن تھا۔

اب ان کے سامنے دو چیزیں تھیں ایک یہ چیز تھی کہ آگے رات رجب کی ہے اور رجب یہ شہر حرام ہے تو اگر حملہ کرتے ہیں تو شہر حرام میں قتال لازم آتا ہے حملہ نہیں کرتے تو یہ واپس مکہ میں پہنچ جائیں گے تو حضور ﷺ نے جو ہمیں مقصد دے کر بھیجا ہے وہ رہ جائے گا آپس میں پھر اس بارے میں مشورہ ہوا تو مشورے میں یہ طے پایا کہ ان کو چھوڑنا نہیں چاہیئے بلکہ ان پر حملہ کر دینا چاہیئے چنانچہ قتال کے شروع ہوجانے کے بعد یہ پہلا سریہ تھا جو نبی کریم ﷺ نے اس قافلے کے تعاقب میں بھیجا تو سب سے پہلے اس قافلے میں واقد بن عبداللہ سہمی رضی اللہ عنہ تھے انہوں نے تیر مارا عمرو بن حضرمی کو اور سیدھا اس کو جا کر لگا اور اس کو قتل کر دیا" فکان اول قتیل من المشرکین " یہ سب سے پہلا تھا جو مشرکین کا آدمی یہاں پر قتل ہوا اور باقی ان کے اندر جو حکم بن کیسان تھا اس کو بھی قید کرلیا اور عثمان بن عبداللہ کو بھی قید کرلیا ایک کو قتل کر دیا دو کو قیدی بنالیا اور چوتھا ان کا ساتھی وہ نوفل تھا وہ بھاگ گیا۔

وہ ان کے ہاتھ نہ آیا وہ بچ گیا جو سامان لے کر جو جا رہے تھے وہ ان کے ہاتھ لگا اور دو قیدی ان کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ادھر قریش نے پھر شور مچانا شروع کر دیا کہ ''قد استحل محمد شهر الحرام وسفك الدماء واخذ الحرائج'' کہ دیکھو محمد ﷺ نے شہر حرام کو حلال سمجھ لیا اس میں خون ریزی کو حلال سمجھ لیا، مال کا لینا حلال سمجھ لیا اور ادھر جو قریش تھے تو مکہ میں جو مسلمان تھے ان مسلمانوں کو بھی طعنے دینے شروع کر دیئے کہ دیکھو تمہارے محمد نے شہر حرام کا لحاظ نہیں رکھا ایک قافلہ مدینہ بھیج دیا اور اس مسئلہ کو بہت اٹھایا اس پر نبی کریم ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو بھی تھوڑا سا ڈانٹا آپ نے ان کے اوپر کچھ ناگواری کا اظہار فرمایا کہ میں نے تمہیں شہر حرام میں قتال کرنے کا حکم تو نہیں دیا تھا، تم نے شہر حرام میں قتال کیوں کیا چونکہ یہ رجب کی ہی رات تھی تو شہر حرام میں یہ قتال ہوا اور یہ قتال ممنوع تھا اس کے ذریعہ سے جو انہوں نے مال حاصل کیا اور قیدی آئے نبی کریم ﷺ نے ان کا معاملہ موقوف کر دیا اور آپ نے لینے سے ہی انکار کر دیا اسی طریقے سے باقی مسلمانوں نے بھی ذرا ناگواری کا اظہار کیا اور سخت الفاظ کہے کہنے لگے ''لم صنعتم مالم تومروا به'' جس کا تمہیں حکم نہیں تھا وہ کام تم نے کیوں کیا؟

تو جب نبی کریم ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا باقی مسلمانوں نے بھی سختی کی تو یہ جو سریہ والے تھے یہ بھی کچھ گھبرا گئے اور ان کے اوپر بڑی گھبراہٹ طاری ہوگئی اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب نبی کریم ﷺ بھی ناگواری کا اظہار کر رہے ہیں اور دوسرے مسلمان بھی ہمارے اوپر ناراض ہو رہے ہیں تو ہماری تو خیر نہیں ہے یہ تو بہت بڑا ہم نے گناہ کیا ہے اب نبی کریم ﷺ کو یہ ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ عمرو بن حضرمی کو بھی انہوں نے قتل کیا ہے تو جب ان کے سامنے یہ بات آئی کہ ہم نے بہت بڑا گناہ کیا کہ مال ان کا لے آئے دو آدمیوں کو قید کیا قتال کیا ایک کو تو ہم نے قتل بھی کیا چنانچہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا کہ حضرت ہم نے تو اس سے بھی بڑا ایک کام کیا کہ عمر بن حضرمی کو قتل بھی کر کے آئے ہیں تو اب اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور اس کے اندر گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سریہ والوں کی حوصلہ افزائی کی اور اہل مکہ جو مکہ والوں کو پریشان کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے وہ پریشانی بھی دور کر دی۔

تو اس کے بعد پھر نبی کریم ﷺ نے اس مال کو بھی لیا اور اس مال میں سے پھر خمس کو جدا کیا اور باقی جو مال تھا وہ ان سریہ والوں میں تقسیم کر دیا یہ قتال کے شروع ہو جانے کے بعد سب سے پہلا خمس تھا سب سے پہلا یہ مال تھا

جو قتال کے ذریعے سے حاصل ہوا اور سب سے پہلا خمس تھا جو نبی کریم ﷺ نے وصول کیا اور یہ پہلی غنیمت تھی جو ان مجاہدین پر آپ ﷺ نے تقسیم فرمائی۔

یہاں پر تو معاملہ ہو گیا ٹھیک لیکن اہل مکہ مکہ میں جو مسلمان ان کی قید میں تھے ان کو طعنے دے رہے تھے تو ان کے بارے میں ایک پیغام حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے بھیجا کہ اگر وہ تمہیں طعنہ دیں تو تم بھی ان کو جواب میں کہنا کہ تم وہی تو ہو جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہاں سے نکالا، وہی تو ہو جنہوں نے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روکا، قرآن کریم میں جو الفاظ ذکر کیے گئے یہی لکھ کر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے بھیجے کہ تم ان کو یہ جواب دو پھر اہل مکہ نے ایسا کیا کہ نبی کریم ﷺ کے پاس اپنا پیغام بھیجا کہ ہمارے جو یہ دو قیدی ہیں حکم بن کیسان، اور عثمان بن عبداللہ ان دو قیدیوں کا فدیہ لے لو اور یہ دو قیدی رہا کر دو۔

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ نہیں ہم ان کو فدیہ لے کر نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ سعد اور عقبہ ہمارے پاس نہ آئیں، سعد اور عقبہ یہ دو صحابی تھے ان کو اہل مکہ نے قید کیا ہوا تھا تو فرمایا کہ جب تک وہ نہیں آئیں گے اس وقت تک یہ دو قیدی ہم نہیں چھوڑیں گے چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور عقبہ رضی اللہ عنہ جس وقت آگئے تو پھر نبی کریم ﷺ نے ان کو بھی رہا کر دیا یہ آیات جو آگے بیان کی گئی ہیں ان سب آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان سریہ والوں کو تسلی دی جو ان کو پریشانی لاحق ہو رہی تھی شہر حرام میں قتال کرنے کی وجہ سے اللہ نے ان کی وہ پریشانی دور کی۔

آیت کا مفہوم:

" یسئلونك عن الشهر الحرام " وہ آپ سے پوچھتے ہیں شہر حرام کے متعلق یعنی اس میں قتال کے متعلق فرما دیجئے قتال فیه کبیر اس میں شک نہیں کہ شہر حرام میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے لیکن جس گناہ کا سد باب کرنے کے لیے یہ قتال ہوا ہے وہ اس قتال فی شہر حرام سے کئی گنا بڑھ کر ہے اور یہ شرعی قاعدہ بھی ہے تحقیقی قاعدہ بھی ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لیے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جاتا ہے جیسے پاؤں کا انگوٹھا ہے اس پر اگر کسی شوگر والے کا پھوڑا ہو یا کینسر ہو اب ڈاکٹر کہتا ہے کہ جناب جب تک یہ انگوٹھا نہیں کاٹیں گے آپ کی ٹانگ نہیں بچے گی یہ بڑھتا بڑھتا چھ مہینے سال تک آپ کی پوری ٹانگ ختم ہو جائے گی لہذا انگوٹھا کٹوا دو تا کہ باقی ٹانگ بچ جائے جب ڈاکٹر یہ کہے گا تو اب یہ اپنے انگوٹھے کٹوانے کی ڈاکٹر کو فیس بھی دے گا، دوائیوں کا خرچہ بھی برداشت کرے گا، سفارش بھی کروائے گا اور کہے گا کہ دیر نہ ہو اور میرا انگوٹھا کٹے حالانکہ انگوٹھا کاٹنا یہ بھی تو ایک ضرر ہے۔

لیکن اب بڑے ضرر سے بچنے کے لیے چھوٹا ضرر برداشت کیا جارہا ہے یہ ایک عقلی اصول بھی ہے شرعی اصول بھی ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لیے چھوٹا ضرر برداشت کیا جاتا ہے تو اسی طریقے سے یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہی جواب دیا کہ شہر حرام میں قتال ہوا لیکن اسی قتال فی الشہر کے مقابلے میں جو کچھ تم کر رہے ہو ''صد عن سبیل الله وصد عن المسجد الحرام و کفربه واخراج اهله منه اکبر عندالله '' یہ اللہ کے نزدیک اس ''قتال فی شهر حرام'' سے بڑھ کر گناہ ہے ایک گناہ نہیں کئی گناہ تم نے کیے، ان کے سدباب کے لیے اگر قتال فی شہر حرام ہوا ہے تو وہ اہون چیز ہے اس لیے تم اس کو تو دیکھ رہے ہو اور اپنے جرائم اور اپنے اکبر الکبائر کو تم نہیں دیکھ رہے۔

''قتال فیه کبیر وصد عن سبیل الله '' ایک اللہ کے راستے سے روکنا'' والمسجد الحرام'' کا عطف ہے سبیل اللہ پر اور یہ بھی صد عن سبیل اللہ کے تحت ہے مسجد حرام سے روکنا دوسرا گناہ اور کفر بہ اللہ کے راستے کے ساتھ اللہ کے راستے سے مراد ہے اللہ کا دین اس کے ساتھ کفر کرنا یہ تیسرا گناہ ''واخراج اهله منه'' اور مسجد حرام والوں کو مسجد حرام سے نکالنا یہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس طریقے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انہوں نے وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا حالات ایسے پیدا کر دیے کہ ان کے لیے وہاں پر رہنا مشکل ہو گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اور آپ کو ختم کرنے کے لیے کیا کچھ سازشیں تیار کر لی تھیں تو یہ'' اکبر عندالله اکبر وزراً عندالله '' اللہ کے نزدیک یہ زیادہ بڑا گناہ ہے'' والفتنة اکبر من القتل '' پانچویں چیز یہاں فتنہ ہے اس سے مراد ظلم شرک کفر ہے اور اسی طرح پیغمبر کے ساتھ عداوت مسلمانوں کی تحقیر فتنے کے اندر یہ سب کچھ آ گیا اور اسی طرح یہ جو بیت اللہ کے اندر بت رکھے ہوئے تھے، اللہ کے گھر میں بت پرستی ہو رہی ہے، اور اللہ کے دین سے بغاوت ہو رہی ہے، اور بیت اللہ کا ننگے طواف ہو رہا ہے یہ جو کچھ تھا یہ سارا'' والفتنة اکبر من القتل'' کے اندر شامل ہے یہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔

مجاہدین کو تسلی:

''ولا یزالون یقاتلونکم '' بعض دفعہ جب اس قسم کا واقعہ پیش آتا ہے تو اس قسم کا واقعہ پیش آنے پر جو مجاہدین ہوتے ہیں بعض اوقات ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اس قسم کے واقعات پیش آنے پر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری کا اظہار کیا اور باقی مسلمانوں نے بھی ان کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے تو ان حالات میں کچھ نہ کچھ جذبات پر زد پڑتی ہے، حوصلے پست ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے جذبہ قتال کو ابھارنے کے لیے اور مزید پختہ کرنے کے لیے فرمایا'' ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم ان

استطاعوا'' کہ یہ طعنے دینے والے یہ تمہارے بارے میں دل کے اندر اتنی عداوت رکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ قتال کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اور قتال ہے ہی تمہیں دین سے پھیرنے کیلئے اس بڑے مقصد کی خاطر ہے اس لیے تم اپنے اندر اس فتنے کے کچلنے کا جذبہ زندہ رکھو اور تم بھی ان کے مقابلے میں قتال کے لیے تیار رہو۔

ارتداد کی نحوست:

'' ومن یرتدد منکم عن دینه فیمت وهو کافر '' چونکہ ان کا مقصد تھا دین سے پھیرنا تو اب اللہ تعالیٰ نے آگے اس کا انجام بتایا کہ جو تم میں سے دین سے پھرے گا فیمت کا عطف ہے یرتدد پر اور پھر وہ مرے کفر کی حالت میں یعنی موت تک وہ پھر اس کفر کے اوپر پکا رہا تو ان کے اعمال باطل ہو گئے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اعمال سے مراد ہیں اعمال صالحہ ان کے جو نیک عمل ہیں یہ دنیا آخرت کے اعتبار سے باطل، آخرت کے اعتبار سے بھی باطل ہیں کہ جب کسی نے کفر اختیار کر لیا اور اسی کفر پر موت آئی تو اب آخرت میں اس کے اعمال باطل ان کے اوپر کچھ نہیں ملے گا یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی کپڑے قیمتی قیمتی اکٹھے کرے پھر ان کو آگ لگا دے کفر کی آگ کے ساتھ اپنے سب اعمال پھونک دیئے ان پر آخرت میں کوئی اجر نہیں ملے گا اور یہ کہا کہ دنیا میں بھی وہ باطل ''واولئك اصحاب النار هم فیها خالدون'' یہ لوگ ہیں آگ والے اس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

ایک تو یہاں پر یہ آیت ہے کہ جو تم میں سے دین سے پھر گیا دین سے پھرنے کے بعد موت تک اسی ارتداد پر کفر پر قائم رہا اعمال باطل ہو گئے'' واولئك اصحاب النار ''اور یہ آیت آگے چھٹے پارے میں آتی ہے ''ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله وهو فی الاخرة من الخسرین '' جو کوئی کفر کرے گا ایمان کے ساتھ ایمان لایا اور پھر اس نے ایمان کے ساتھ کفر کیا فقد حبط عمله اس کا عمل باطل ہو گیا آخرت میں ہو گا وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے، یہاں پر کہ جو کفر کرے'' فیمت وهو کافر ''اور پھر کفر کی حالت میں ہی وہ مرے '' اولئك حبطت اعمالهم '' تو یہاں موت علی الکفر کا بھی ذکر ہے، لیکن وہاں پر ہے کہ جس نے ایمان کے بعد کفر کیا فقد حبط عمله وہاں موت علی الکفر کا ذکر نہیں ہے۔

تو دونوں آیتوں کو سامنے رکھ کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ اصل میں جو حابط عمل ہے باطل کرنے والی چیز ہے وہ ہے ارتداد کہ جب ایمان کے بعد اس نے کفر اختیار کیا تو کفر اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس کے اعمال

باطل ہو گئے، جیسا کہ سورۃ المائدہ کی اس آیت میں ہے چونکہ یہاں پر موت علی الکفر کا ذکر نہیں لہٰذا کفر اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس کے اعمال باطل ہو گئے اب آگے خواہ وہ بعد میں توبہ تائب ہو جائے تو بھی اس کے اعمال باطل ہو چکے یا کفر پر موت آ جائے تو بھی اس کے اعمال باطل ہو گئے۔

دونوں آیتوں سے نتیجہ یہی نکلتا ہے آیت کے مطابق کہ جب اس نے کفر اختیار کر لیا تو کفر اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس کے اعمال باطل ہو گئے۔

اب اگر توبہ کرے جیسا کہ وہاں پر موت علی الکفر کا ذکر نہیں ہے تو بھی اس کے اعمال باطل اور اگر موت تک کفر کے اوپر قائم ہے تو بھی اعمال باطل اب اس کا نتیجہ کیا نکلے گا کہ ایک آدمی نے حج کیا حج کرنے کے بعد پھر وہ مرتد ہو گیا مرتد ہونے کے بعد پھر اس نے توبہ کر لی تو کیا پہلے والے حج سے اس کا فرض ادا ہو گیا یا دوبارہ حج کرے تو ان آیات سے معلوم ہوا کہ وہ اگر صاحب استطاعت ہو تو حج دوبارہ کرے پہلے والا اس کا حج باطل لہٰذا اس کو نئے سرے سے حج کرنا پڑے گا۔

اہل سریہ لغزش کے باوجود ثواب سے محروم نہیں:

''ان الذین آمنوا والذین ھاجروا'' اب اس قتال پر ثواب ملے گا یا نہیں اور اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب سریہ نے پوچھا بھی تھا کہ کیا ہمیں ثواب ملے گا یا ثواب نہیں ملے گا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور ان کو تسلی دے دی کہ تمہیں ثواب بھی ملے گا اللہ کی رحمت بھی تمہیں نصیب ہوگی جو لوگ ایمان لائے ہجرت کی جہاد کیا اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے یہی لوگ ہیں جو امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی باقی اگر ان سے یہ کمی کوتاہی ہوئی ہے تو جو ان کے دل میں ندامت آئی اللہ کے سامنے پھر توبہ استغفار کیا اللہ غفور رحیم اللہ ان کو بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے، اللہ بخش بھی دیں گے مزید رحمت بھی فرمائیں گے، یا یوں کہہ دو کہ پیچھے دو چیزیں ذکر کی گئیں ہیں ''یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیه'' یہاں سے لے کر ھم فیھا خالدون تک تو اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی کہ ان کے ذمے معصیت نہیں یہ غفور ہونا ہے، اور ''ان الذین آمنوا والذین ھاجروا'' یہاں سے تسلی دی کہ ان کو ثواب بھی ملے گا اللہ کی رحمت بھی ان کو نصیب ہوگی یہ رحیم ہونا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ

یہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے

وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ

اور لوگوں کے لیے منافع ہیں، اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے، اور آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ

مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

کیا خرچ کریں، آپ کہہ دیجئے کہ عفو کو خرچ کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات کو

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ۲۱۹ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ

واضح کرتا ہے تاکہ تم سوچو (۲۱۹) دنیا میں اور آخرت میں، اور آپ سے سوال کرتے ہیں

الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ

یتیموں کے متعلق آپ کہہ دیجئے کہ اصلاح کرنا ان کے لیے بہتر ہے، اور اگر ان کا خرچ آپس میں ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں،

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ

مصلحت رکھنے والے سے مصلحت فوت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا،

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۲۲۰ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ

بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے (۲۲۰) اور نکاح نہ کرو مشرک عورتوں سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں،

وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا

اور البتہ ایمان والی باندی بہتر ہے مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں اچھی لگے، اور نہ نکاح کرواپنی عورتوں کا

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ

مشرکین سے جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں، البتہ ایمان والا غلام بہتر ہے مشرک سے

وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا

اگر چہ وہ تمہیں اچھا لگے، یہ لوگ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف، اور اللہ بلاتا ہے

اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ

جنت اور مغفرت کی طرف اپنے حکم سے، اور لوگوں کے لیے اپنے احکام کو واضح کرتا ہے تاکہ لوگ

يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۱﴾

خمر کا حقیقی اور مجازی معنیٰ:

''یسئلونك عن الخمر والمیسر'' وہ آپ سے سوال کرتے ہیں خمر اور میسر کے متعلق، قرآن وحدیث میں خمر کے معنیٰ پر غور کیا جائے تو خمر کے دو اطلاق ہیں یا یوں کہہ لو کہ خمر دو معنوں میں مستعمل ہے، ایک خمر کا حقیقی معنیٰ اور دوسرا خمر کا مجازی معنیٰ، ایک خمر کا اطلاق حقیقی ہے اور دوسرا مجازی ہے، حقیقتاً خمر کہا جاتا ہے کہ انگور کا کچا پانی جب وہ پڑا پڑا جوش مارنے لگ جائے اور سخت ہو جائے یعنی اس کے اندر قوت مسکرہ پیدا ہو جائے اور وہ اس حد کو پہنچ جائے کہ نشہ پیدا کرے اور جھاگ پھینکنے لگے، تو تین چیزیں آگئیں۔

جوش مارے، اس کے اندر قوت مسکرہ پیدا ہو جائے، اور تیسری چیز کہ جھاگ پھینکے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قذف بالزبد (جھاگ پھینکنے) کا اعتبار ہے، اور ان کا دوسرا قول جس کو صاحبین نے ترجیح دی وہ یہی ہے کہ قذف بالزبد (جھاگ پھینکنا) شرط نہیں ہے صرف اس کے اندر جوش آجائے اور قوت مسکرہ پیدا ہو جائے تو یہ خمر کا مصداق ہے تمام اہل لغت کا اتفاق ہے کہ خمر کا حقیقی معنیٰ یہی ہے، اور دوسرا خمر کا مجازی معنیٰ ہے وہ خمر حقیقتاً نہیں لیکن خمر کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس کو بھی خمر کہا جاتا ہے اور مشابہت میں وجہ تشبیہ یعنی مشابہت کس چیز میں ہے؟ مشابہت اس چیز میں ہے کہ جیسے خمر نشہ لاتی ہے اسی طرح وہ چیزیں جن کو خمر مجازاً کہا گیا ان کی بھی اگر اتنی مقدار پی لی جائے کہ جس سے نشہ آجائے تو چونکہ وہ زیادہ مقدار میں پی لینے سے نشہ لاتی ہیں اس لیے ان کو بھی خمر مجازاً کہا گیا ہے۔

حقیقی اور مجازی معنیٰ کی وضاحت مثالوں سے:

جیسا کہ زنا کا ایک اطلاق حقیقی ہے اور ایک مجازی ہے، زنا حقیقی تو ہے عورت کے ساتھ بدکاری، حرام طریقہ سے اپنی جنسی خواہش پوری کرنا اسی کے بارے میں حکم ہے'' الغناء رقیۃ الزنا'' گانا یہ زنا کا ایک تعویذ

ہے، اسی کے بارے میں حکم دیا "ولا تزنوا" زنا نہ کرو، "ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ" اور "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما" یہاں پر بھی زانیہ اور زانی اس سے یہی حقیقی معنیٰ مراد ہے اور اسی کے مرتکب پر حد جاری ہوتی ہے۔

لیکن حدیث پاک میں آتا ہے آنکھ کا غلط دیکھنا آنکھ کا زنا، کانوں سے گانا سننا یہ کانوں کا زنا، ہاتھ سے پکڑنا یہ ہاتھ کا زنا، پاؤں سے چل کر جانا یہ پاؤں کا زنا، اس کو بھی زنا کہا گیا لیکن یہ مجازی معنیٰ میں ہے، یہاں اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنکھوں سے اگر کوئی غلط دیکھے تو یہ زنا ہے۔

لہٰذا اس کے اوپر بھی حد زنا جاری کی جائے، اس نے شہوت کے جذبہ سے عورت کو ہاتھ لگایا تو اس کے اوپر بھی حد جاری کی جائے کہ اس نے زنا کیا ہے، یہاں زنا کا مجازی معنیٰ مراد ہے کہ جو زنا حقیقی کا حکم ہے وہ ان کے اوپر جاری نہیں ہوگا۔

اسی طرح شرک اور کفر کا ایک ہے حقیقی معنیٰ کہ اللہ کے احکامات میں سے جو حکم قطعی ہے اس کا انکار کردینا کفر ہے جیسے نماز کا انکار کرنا کفر ہے لیکن نماز کو دل سے تسلیم کرے کہ یہ فرض ہے اور عملاً نماز نہ پڑھے تو جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے پر بھی کفر کا اطلاق ہوا ہے "من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر" تو نماز کا انکار کرے تو یہ کفر حقیقی ہے نماز کا مقر ہو اور دل سے تسلیم کرے، فرضیت مانے لیکن عملاً نہ پڑھے اس کو بھی کفر کہا گیا ہے لیکن یہ کفر مجازاً ہے۔

اسی طرح اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک کرنا، اللہ کی الوہیت میں، صفات میں، ذات میں کسی کو شریک کرنا یہ تو شرک حقیقی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "الریاء شرك" کہ ریا بھی شرک ہے، لیکن یہ شرک مجازاً ہے اور ہمارے عرف میں بھی اسی طرح ہے مثلاً شیر کا لفظ ہم بولتے ہیں تو ایک ہے شیر کا حقیقی معنیٰ جنگل کا درندہ، جنگل کا بادشاہ، اور ایک بہادر آدمی ہو اس کو بھی شیر کہا جاتا ہے۔

لیکن یہاں شیر کا معنیٰ مجازی ہے کہ یہ شیر کی طرح بہادر ہے اگر چہ شیر کی بہادری بہت اونچے درجہ کی ہے اور اس کی بہادری اس کے مقابلہ میں کم ہے۔

لیکن بہر حال اس کے اندر بہادری ہے اس لیے اس کو بھی شیر کہہ دیا جاتا ہے، جس طرح ایک آدمی دوکان پر جاتا ہے اور اس نے دیکھا کہ پلاسٹک کے شیر پڑے ہوئے ہیں، پلاسٹک کی کار رکھی ہے، پلاسٹک کا ہوائی جہاز رکھا ہے، پوچھتا ہے کہ یہ شیر کتنے کا ہے؟ اس نے کہا بیس روپے کا ہے، یہ گھوڑا کتنے کا ہے؟ یہ تیس روپے کا ہے، یہ کار کتنے کی ہے؟ یہ دس روپے کی ہے، یہ ہوائی جہاز کتنے کا ہے؟ یہ پچاس روپے کا ہے۔

اب کہاں پچاس روپے کا ہوائی جہاز مل سکتا ہے؟ ان کو ہوائی جہاز کہنا، کار کہنا، شیر کہنا یہ ہے مجازاً لیکن کہا بھی جاتا ہے کہ یہ شیر کتنے کا ہے اور وہ شیر کی شکل بنی ہوئی ہے تو ہر زبان میں لفظ دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں حقیقی معنیٰ میں بھی اور مجازی معنیٰ میں بھی۔

خمر کی حقیقی اور مجازی معنیٰ کے اعتبار سے مختلف اقسام ہیں:

اور خمر کا لفظ جب حقیقی معنیٰ میں استعمال ہو تو حقیقی معنیٰ تو اس کا یہی ہے کہ خمر کہتے ہیں انگور کا کچا پانی جو ویسے ہی پڑا پڑا بغیر پکائے جوش مارنے لگ جائے اور اس کے اندر شدت پیدا ہو جائے لیکن زیادہ سخت ہو کر اتنا گاڑھا نہ ہو کہ اس کے اندر قوت مسکرہ نہ رہے یعنی وہ اس حد کو پہنچ جائے کہ اس کے اندر نشہ دینے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور جھاگ پھینکے یہ خمر کا حقیقی معنیٰ ہے اور قرآن کریم میں ''انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام'' میں خمر کا یہی حقیقی معنیٰ مراد ہے اسی کو کہا گیا کہ حرام ہے۔

دوسرا ہے خمر کا مجازی معنیٰ وہ یہ ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت اور قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نشہ دے تو جس کے اندر بھی نشہ دینے والی قوت پیدا ہو جائے اس کو خمر کہا جائے گا، خمر مجازی کی پھر دو قسمیں ہیں۔

① اس قسم میں مختلف صورتیں شامل ہیں مثلاً انگوروں کا پانی تھا لیکن اس میں شدت پیدا ہوئی ہے پکانے کے ساتھ، اب یہ خمر حقیقی نہیں بلکہ خمر مجازی ہے، کیونکہ خمر حقیقی ہوتا ہے جو بغیر پکانے کے جوش مارنے لگ جائے، اور اسی طرح تر کھجوروں کا پانی جو ایسے ہی پڑا پڑا جوش مارنے لگ جائے اور اس میں قوت مسکرہ پیدا ہو جائے اب یہ بھی خمر مجازی ہے، کیونکہ خمر حقیقی انگوروں کا پانی ہوتا ہے اور یہ کھجوروں کا پانی ہے۔

اور اسی طرح کشمش پانی میں بھگو کر رکھے تھے کہ پانی جوش مارنے لگ گیا اور اس میں نشہ کی قوت پیدا ہو گئی تو یہ بھی خمر مجازی ہی ہے (اس کو عرف عام میں ''نقیع الزبیب یا ماء الزبیب'' کہتے ہیں) کیونکہ خمر حقیقی کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی، تو یہ تینوں صورتیں خمر مجازی کی پہلی قسم کی ہیں ان کو بھی خمر کہیں گے لیکن ان کو خمر کہنا مجازاً ہوگا۔

② اور خمر مجازی کی دوسری قسم یہ ہے کہ کھجور، کشمش یا کسی بھی چیز کو پانی میں بھگو کر رکھیں یا ان کو پکائیں اور اس سے صرف مٹھاس حاصل ہو، نشہ کی کیفیت پیدا نہ ہو، تو یہ بھی خمر ہی کی قسم ہے کیوں کہ تھوڑی سی غفلت کے ساتھ اس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، اس لیے اس کو خمر کہا جائے گا، چہ جائیکہ اس کا دوسرا نام نبیذ بھی ہے چاہے وہ تمر کا نبیذ ہو،

زبیب کا نبیذ ہو، شہد کا، گندم کا، جوء کا، جوار کا یا اور کسی بھی چیز کا ہو یہ سب مجازاً خمر کی تعریف میں داخل ہیں، جب خمر کی یہ مختلف اقسام بن گئیں تو اب آگے ان کے حکم میں کچھ نہ کچھ فرق ہوگا۔

خمر کی اقسام کا حکم:

ان میں سے جو خمر حقیقی ہے اس کا حکم تو یہ ہے کہ یہ نجس ہے نجاست غلیظہ کے تحت جیسے قرآن پاک میں اس کا حکم بیان کیا گیا ہے "رجسٌ من عمل الشیطٰن" اگر یہ کپڑے پر لگ جائے تو جو پیشاب پاخانہ کے لگ جانے کا حکم ہے اس خمر کا بھی وہی حکم ہے اس کی بیع وشراء بھی حرام ہے اور اس کا پینا قلیل ہو یا کثیر، نشہ دے یا نشہ نہ دے حرام ہے اس میں حرام ہونے کا دارومدار نشہ پر نہیں نشہ نہ دے تو بھی حرام ہے اس کا پینا ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی پیشاب پی لے، نجاست کھالے، اسی طرح اس میں حد کا دارومدار بھی نشہ پر نہیں ہے۔

اگر کوئی ایک دو قطرے بھی پی لے جو حلق سے نیچے اتر جائیں اگر چہ نشہ نہ آئے تو بھی اس پر حد جاری ہوگی یہ تو حکم ہے خمر حقیقی کا۔

اور جو خمر مجازی کی پہلی قسم ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا مطلقاً پینا حرام ہے خواہ وہ قلیل ہو یا کثیر تھوڑی مقدار میں پیئے جس سے نشہ نہ آئے تو بھی حرام ہے، اصل میں خمر کی دوسری قسم میں قوت مسکرہ بمقابلہ تیسری قسم کے چونکہ زیادہ ہے تو یہ خمر حقیقی کے زیادہ قریب ہے اس لیے اس کا بھی مشابہت کی بناء پر حکم یہی ہوگا کہ اس کا قلیل کثیر پینا حرام ہے۔

البتہ یہ ہے کہ اس قسم میں حد اس وقت لگے گی جب نشہ آئے، قلیل مقدار میں اگر کوئی پی لے تو اس کے اوپر تعزیر تو ہے لیکن جو شرب خمر کی حد ہے وہ اس وقت جاری ہوگی جب اس کو نشہ آجائے اس کا دارومدار نشہ پر ہے باقی اس کا بیچنا ناجائز ہے اور ایک قول کے مطابق یہ نجاست غلیظہ ہے اور دوسرے قول کے مطابق نجاست خفیفہ ہے، اور جو خمر مجازی کی دوسری قسم ہے اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اتنی مقدار میں پینا کہ جس سے نشہ آجائے وہ تو حرام ہے، وہاں مقدار سکر حرام ہے اس سے قلیل مقدار میں اگر کوئی پی لے تو پینا جائز ہے وہ حرام نہیں ہے، اس کا بیچنا بھی جائز ہے، اور اسی طرح اگر کپڑے پر لگ جائے تو نماز بھی ہو جائے گی اور اس میں حد اس وقت لگے گی جس وقت نشہ آجائے اور جو خمر حقیقی ہے وہاں پر حد کا دارومدار سکر پر نہیں، اس کا دارومدار ہے خمر کی ذات پر ہے کہ اگر کوئی شخص اس خمر کی تھوڑی سی مقدار چند قطرے بھی پی لے تو بھی حد اس کے اوپر جاری ہو جائے گی، اور آخری جو دو قسمیں ہیں خمر مجازی کی ان میں حد تب جاری ہوگی کہ جب ان میں نشہ آجائے ان دو قسموں میں حد کا دارومدار ہے سکر پر، نشہ

آجائے تب حد لگے گی لیکن پھر دوقسموں میں بھی فرق بتایا کہ خمر مجازی کی پہلی قسم میں قلیل ہو یا کثیر اس کا پینا حرام ہے اور جو خمر مجازی کی دوسری قسم ہے اس میں مقدار سکر سے کم اگر پی لی تو اس کا پینا جائز ہے۔

حرمت خمر پر حدیث مبارکہ سے استدلال اور مختلف روایات میں تطبیق:

اب حدیث پاک میں دیکھا جائے تو نبی کریم ﷺ کے فرمان میں (یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن حکماً مرفوع ہے مرفوع حکمی یہ ہے کہ صحابی کا ایسا قول کہ جو مدرک بالقیاس نہ ہو تو وہ مرفوع حکمی ہوتا ہے، تو اس میں یہ لفظ آتے ہیں ''حرمت الخمر بعینها والسکر من کل شراب'' (سنن نسائی ص ۲۸۳ ج ۲) ''بعینها'' کا مطلب یہ ہے کہ جو خمر حقیقی ہے اس کی تو ذات ہی حرام ہے۔

لہٰذا جو خمر کے احکامات ہیں ان کا تعلق خمر حقیقی کی ذات کے ساتھ ہے سکر کے ساتھ نہیں ہے تو اس میں پینے کی حرمت کا تعلق بھی ذات کے ساتھ ہے، حد کا تعلق بھی ذات خمر کے ساتھ ہے، خرید وفروخت کے ممنوع ہونے کا تعلق بھی اس کی ذات کے ساتھ ہے، اس کے نجس ہونے کا تعلق بھی اس کی ذات کے ساتھ ہے۔

لہٰذا اس کی تو ذات ہی حرام ہے اس کے پینے پر حد جاری ہو جائے گی خواہ نشہ نہ بھی دے اور دوسری بات یہ فرمائی ''والسکر من کل شراب'' کہ اس خمر حقیقی کے علاوہ باقی جو مشروبات ہیں ''السکر من کل شراب'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی جو مشروبات ہیں نشہ ان سے بھی آتا ہے لیکن ان سے کتنی مقدار حرام ہوگی ''والسکر من کل شراب'' کہ نشہ آجائے تو وہ بھی حرام ہے۔

لیکن ان میں خمر مجازی کی جو پہلی قسم ہے اس میں چونکہ سکر غالب ہے اور وہ خمر حقیقی کے زیادہ قریب ہے مشابہت کے لحاظ سے لہٰذا اس وجہ سے اس میں پینا تو قلیل کثیر حرام ہوگا، البتہ حد اس وقت جاری ہوگی جب اس سے نشہ آجائے، اور جو تیسری قسم ہے اس میں چونکہ نشہ والی کیفیت بمقابلہ پہلی کے کمزور ہے اور اس کو نبیذ کہا جاتا ہے اور نبیذ کا پینا یہ نبی کریم ﷺ سے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے (سنن نسائی ص ۲۸۶ ج ۲) لیکن اتنی مقدار پینا کہ جس سے نشہ آجائے وہ ناجائز ہے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ شام سے ایک مشروب میرے پاس لایا گیا جب پکایا گیا تھا تو اس کے دو ثلث ختم ہو گئے تھے اور ایک ثلث باقی رہ گیا۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا جو حرام حصہ تھا وہ ختم ہو گیا اور جو باقی رہ گیا وہ حلال ہے (سنن نسائی ص ۲۸۵ ج ۲) تو اس سے پتہ چلا کہ اگر قوت مسکرہ اس کے اندر کمزور ہو جائے تو وہ پھر حلال ہے اسی

طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک سخت قسم کا نبیذ پیا کرتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ کچھ لوگوں کی مہمانی کی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک مشروب پلایا اب اس مشروب کے پینے سے بعض لوگوں کو نشہ آ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر حد جاری کی ان میں سے ایک آدمی نے کہا یہ عجیب بات ہے آپ ہمیں پلاتے بھی ہیں اور پھر حد بھی لگاتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا'' انما احدك للسكر'' کہ میں تم پر حد لگاتا ہوں نشہ کی وجہ سے اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان دونوں حضرات سے نبیذ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک پیالہ، دو پیالے تین پیالے یہ تو تو پی سکتا ہے۔

لیکن جب تجھے نشہ کا خطرہ محسوس ہو تو پھر چھوڑ دے، اس سے پتہ چلا کہ اگر اتنی مقدار میں نبیذ پی لے کہ جس سے نشہ نہ آئے تو یہ جائز ہے لیکن جب نشہ کا خطرہ پیدا ہو جائے تو پھر وہ مقدار حرام ہوگی اس کو چھوڑ دے اور اس سے اگر سکر آ جائے تو پھر حد بھی جاری ہوگی یہ ہیں ان کے احکامات، باقی جو حدیث پاک میں آتا ہے '' کل مسکر خمر '' (سنن نسائی ص ۲۷۶ ج ۲) ہر مسکر خمر ہے تو یہ خمر کہنا یہاں مجازاً ہے اور اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا '' ما اسکر کثیرہٗ فقلیله حرام '' (سنن نسائی ص ۲۷۸ ج ۲، ترمذی ص ۹ ج ۲) یہ ہے خمر حقیقی کے بارے میں کہ اس کی کثیر مقدار اور قلیل مقدار دونوں حرام ہیں، اور خمر مجازی کی پہلی قسم یہ نشہ دینے میں خمر حقیقی کے قریب قریب ہے اس کا بھی یہی حکم ہوگا کہ اس کی قلیل کثیر مقدار حرام ہے، باقی خمر کی تیسری قسم جو نبیذ ہے اس کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے۔

اس کی دلیل یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پینا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پلانا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فتویٰ کہ قلیل مقدار جس سے نشہ نہ آئے وہ تو جائز ہے لیکن اتنی کثیر مقدار جس سے نشہ آئے وہ حرام ہے یہ انہوں نے خود یہاں پر فرق کیا ہے اسی طرح طحاوی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شدید نبیذ تھا جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیا کرتے تھے لیکن کم مقدار میں کہ جس سے نشہ نہ آئے، یہ جو فقہ میں اشتداد اور شدید کا لفظ آتا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ جس کے اندر قوت مسکرہ پیدا ہو جائے، حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شدید نبیذ تھا جس میں پانی ڈال کر آپ پی لیا کرتے تھے، جبکہ خمر حقیقی کے اندر پانی ڈال کر پینا وہ تو ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی آدمی پیشاب کے اندر پانی ڈال کر پی لے تو اس سے وہ پاک نہیں ہو جاتا بلکہ ایک من پانی ہو اس میں تھوڑا سا پیشاب گر جائے تو وہ بھی ناپاک ہو جائے گا، اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ جب یہ یمن گئے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ گندم، جو، شہد کا نبیذ بنا

کرپیتے ہیں اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے انہوں رابطہ کیا آپ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اشربا ولا تسکرا“ کہ تم دونوں پیو تو سہی لیکن نشہ کی مقدار نہ پیو۔

حرمت خمر کی مختصر تاریخ:

باقی خمر کی جو حرمت کی تاریخ ہے وہ مرحلہ وار حرام ہوئی ہے، پہلے نمبر پر سورۃ نحل کے اندر اللہ تعالیٰ نے ابتداءً ابتداءً اس کو ایک نعمت کے طور پر ذکر فرمایا ہے ”ومن ثمرات النخیل والا عناب تتخذون منه سکراً“ یہاں سے مراد یہی خمر ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں سے یہ نعمت ہے کہ تم انگوروں سے اور کھجوروں کے پھلوں سے سکر بناتے ہو یعنی خمر بناتے ہو اور پھر آپ سے خمر کے متعلق پوچھا گیا ”یسئلونك عن الخمر والمیسر“ کہ آپ سے خمر اور میسر کے متعلق پوچھتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا گیا ”قل فیهما اثم کبیر ومنافع للناس“ فرما دیجئے کہ اس میں نقصان بڑا ہے ہاں کچھ لوگوں کے لیے نفع بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے کچھ قوت حاصل کریں، اس کے ذریعہ سے تجارت کر کے مال کمائیں۔

پھر تیسرے مرحلہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں دعوت تھی، عصر کے بعد ہوگی، دعوت کھائی اس میں شراب بھی پی کیونکہ ابھی تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا اور جب مغرب کی نماز پڑھی تو امام صاحب نے سورۃ الکافرون پڑھی اور ”لا اعبد ما تعبدون“ کی جگہ وہ پڑھ گئے ”اعبد ما تعبدون“ نشہ کی حالت میں تھے اس پر پھر یہ آیت اتری ”لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکریٰ حتی تعلموا ما تقولون“ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ نشہ دور نہ ہو جائے اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ شراب حرام ہوئی، لیکن ایسے وقت میں پینا حرام ہے کہ جب نماز پڑھیں تو نماز میں نشہ والی حالت ہو۔

لیکن اگر کوئی آدمی اس طرح پیئے کہ نماز تک نشہ ختم ہو جائے مثلاً صبح کی نماز اور ظہر کے درمیان وقفہ بہت ہے صبح کی نماز پڑھ کر پی لے پھر ظہر تک نشہ ختم ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے، عشاء کی نماز پڑھ کر کوئی پی لے اور صبح تک نشہ ختم ہو جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور یا کوئی آدمی پینے کے بعد کوئی ایسی چیز استعمال کرے کہ جس سے نشہ ختم ہو جائے نماز سے پہلے پہلے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

چوتھے مرحلہ میں پھر وہ آیت اتری جو ساتویں پارہ میں ہے ”انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون“ اب قطعی طور پر خمر حرام ہوگئی لہٰذا جب قطعی طور پر اس کی حرمت ہے تو جو آدمی اس کی حلت کا قائل ہوگا وہ قرآن کریم کے ایک قطعی حکم کا منکر ہے وہ کافر ہوگا یہ ہے اس کی حرمت کی مختصر تاریخ۔

میسر کی تعریف اور اس کا حکم:

اور اس آیت میں دوسری چیز میسر ہے جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے میسر یہ مصدر ہے، اور یہ تقسیم کرنے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، یا سر تقسیم کرنے والے کو کہتے ہیں زمانہ جاہلیت میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ ایک اونٹ ذبح کیا جاتا اور پھر ہر ایک کے حصہ کا قرعہ نکالتے تھے بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے اور بعض بالکل محروم رہتے اور جو شخص محروم رہتا وہ پورے اونٹ کی قیمت ادا کرتا، اور وہ سارا گوشت فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے اس میں چونکہ فقراء کا فائدہ تھا اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت نمایاں ہوتی تھی، اس لیے اس کو باعث فخر سمجھتے اور اس میں شریک نہ ہونے والے کو کنجوس کہتے تھے اور اسی طرح جوئے کی اور بھی مختلف صورتیں ہیں ابتدائے اسلام میں جیسے شراب حلال تھی اسی طرح یہ جوا اور قمار بھی حلال تھا اور بعد میں جس آیت کے اندر خمر کی حرمت بیان کی گئی ہے اسی آیت کے اندر میسر کی حرمت بھی بیان کی گئی ہے۔

یہاں پر صرف اس کے نقصان کی طرف اشارہ کیا ہے حرمت بعد میں بیان کی گئی جیسا کہ شراب کے مسئلہ کی وضاحت تمہارے سامنے آچکی ہے۔

موجودہ دور کی لاٹریوں کا حکم:

اور میسر کے حکم میں آج کل کی لاٹریاں ہیں، جیسا کہ عام طور پر اخباروں میں اشتہار آیا ہوتا ہے کہ یہ چیز خریدو یا ٹکٹ خریدو اس میں جو چیز نکلے گی وہ تمہاری ہوگی کسی کو سائیکل ملے گا، کسی کو مشین ملے گی، کسی کو کچھ ملے گا اور کسی کو کچھ یہ ساری قمار کی صورتیں ہیں یہ سب حرام ہیں، اور اس سے دولت کی تقسیم میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے اور انسان میں کم ہمتی پیدا ہوتی ہے، انسان یہ سوچتا ہے کہ محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، اور دماغ لڑانے کی کیا ضرورت ہے اس قسم کی آسان آسان صورتیں اختیار کرو جس کے ساتھ مال حاصل ہو جائے، عملی سستی کا ذریعہ بھی یہ چیزیں بنتی ہیں، اس قسم کے جتنے معاملات ہیں شریعت نے حرام قرار دیے ہیں گویا کہ خمر اور میسر کے سلسلہ کی یہ پہلی آیت ہے جو آپ کے سامنے بیان کی جارہی ہے وہ آپ سے سوال کرتے ہیں خمر اور میسر کے متعلق؟ آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، ان دونوں میں بڑا گناہ ہے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے ارتکاب میں بڑا گناہ ہے۔

اگر ان کے ارتکاب کو گناہ قرار دیا جائے تو ان کا ممنوع ہونا یہیں سے نکل آئے گا حالانکہ اس آیت کے اترنے سے خمر اور میسر ممنوع نہیں ہوئے اس لئے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان دونوں کے سبب سے بڑا گناہ لازم آتا

ہے،''ومنافع للناس'' اوراس میں لوگوں کیلئے کچھ فوائد بھی ہیں''واثمھما اکبر من نفعھما''اوران دونوں سے جوگناہ لازم آتا ہے وہ بڑا ہے دونوں کے نفع سے اس میں اشارہ کردیا کہ ان کاترک اولیٰ ہے۔

ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کی ترغیب:

'' ویسئلونك ماذا ینفقون''اورآپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟اس قسم کا سوال پچھلے رکوع میں بھی آیا تھا وہاں اس کے مصارف کواہمیت کے ساتھ بیان کردیا گیا کہ خرچ کہاں کرنا چاہیئے اورکتنی مقدار خرچ کرنی چاہیئے اس کے بارے میں اجمال چھوڑ دیا گیا کہ جوبھی تم خرچ کرواس کواللہ تعالیٰ جانتا ہے وہ تمہیں اس کا اجردے گا لیکن خرچ ان مواقع میں کرنا چاہیئے وہاں چونکہ والدین اور'' اقربین'' کاذکر بھی آیا تھا۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ یہاں نفلی صدقہ مراد ہے زکوٰۃ مرادنہیں کیونکہ زکوٰۃ والدین کونہیں دی جاتی اس طرح'' اقربین ''جن میں اولاد اورنواسے پوتے بھی آجاتے ہیں ان کوزکوٰۃ نہیں دی جاتی ان مصارف کا بیان یہ بتاتا ہے کہ یہاں نفلی صدقات مراد ہیں فرض زکوٰۃ مرادنہیں اس لئے وہاں مقدار کاتعین نہیں کیااور یہاں اس سوال کو دوبارہ دہرایا گیا یہاں مصارف نہیں ذکر کیے گئے البتہ مقدار کے بارے میں ہدایت دے دی گئی '' قل العفو'' آپ کہہ دیجئے کہ ''عفو''کوخرچ کیجئے'' عفو'' کا کیا معنیٰ؟ ''عفو'' کا معنیٰ دوطرح سے ذکرکیا گیا ہے جوآسان ہواور جوضرورت سے زائد ہو،اصل بات یہ ہے کہ عفوجس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس چیز کوخرچ کروکہ جس کا خرچ کرنا تمہارے لیے آسان ہے اور اس کے خرچ کرنے کی وجہ سے تم پرکسی قسم کی کوئی مشقت لازم نہ آئے۔

اسی سے یہ بات نکل آئی کہ جوضرورت سے زائد ہے وہ خرچ کروبسااوقات انسان کی اپنی ضرورت انکی ہوئی ہوتی ہے اوراپنے سرمایہ کواپنی ضرورت میں خرچ نہ کیا اللہ کے نام پردے دیا تو پھرانسان کے دل میں یہ وسوسہ آجاتا ہے کہ میں نہ دیتا تواچھا تھا،اب مشقت میں نہ پڑتا تواللہ کے راستہ میں دے کرپچھتانا،اس سے بہتر یہ ہے کہ انسان پہلے سے ہی نہ دے پہلے اپنی ضرورتیں پوری کرواپنی اولاد اورمتعلقین کی ضرورتیں پوری کرو،اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد جوزائد بچے وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کروتوگویا کہ اس میں ترغیب دی گئی ہے عفوکے خرچ کرنے کی۔

ضرورت سے زائد مال جمع کرنا کیسا ہے؟

عفوکاخرچ کرناشریعت نے واجب قرارنہیں دیا'' عفو '' کوخرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے کہ پہلے

اپنی ضرورت پوری کرو پھر جو بچے اس کو خرچ کرو تو جو بچ جائے کیا اس کا خرچ کرنا ضروری ہے؟ جو ضرورت سے زائد ہے کیا اس کا خرچ کرنا واجب ہے؟ کیا ضرورت سے زائد مال انسان اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے؟ اگر یہ مقصد ہے تو بالاتفاق یہ منسوخ ہوگا، اور ایک خاص وقت میں یہ ہدایت آئی تھی جبکہ مدینہ منورہ میں بہت زیادہ تنگی تھی اس وقت کسی کے لیے جائز نہیں تھا کہ ضرورت سے زائد چیز کوئی آدمی اپنے پاس رکھے اور بعد میں جس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے وسعت دے دی تو وسعت دینے کے بعد اپنی ضرورتوں سے زائد اپنے پاس رکھنا جائز ہے۔

جبکہ انسان صدقات واجبہ کو ادا کرتا رہے تو ان کو ادا کرنے کے بعد انسان کے پاس مال بچ جائے تو انسان اس کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے، تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہی تفسیر نقل کی ہے کہ ایک وقت تھا جب مدینہ منورہ میں بہت تنگی تھی اس وقت حکم یہی تھا کہ جو ضرورت سے زائد ہوا سے خرچ کردو، قرآن کریم میں جس وقت یہ آیت اتری ”ان الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولاینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم“ جو سونا اور چاندی کو زمین میں گاڑھ کے رکھتے ہیں یعنی ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ”عذاب الیم“ کی بشارت دے دو جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو گرانی محسوس ہوئی کہ سونا چاندی گھر کے اندر رکھنا اس آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل جائز نہیں اور انسان اپنی طبیعت کی کمزوری کی بناء پر اپنے مستقبل کیلئے کچھ نہ کچھ جوڑ کے رکھتا ہے جب کہ آیت سے معلوم ہوا کہ بالکل جوڑ کے رکھو ہی نہیں جو رکھے گا اس کو ”عذاب الیم“ کی بشارت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع کر کے رکھنا ممنوع ہے تو جو شخص حلال چیز حلال طریقہ سے کما کر گھر میں جمع کر کے رکھے گا تو کیا اس کو عذاب الیم پہنچے گا؟

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا جس کا حاصل یہ ہے کہ ” ما اُوتیت الزکوٰۃ فلیس بکنز “ کہ یہاں ”کنز ذھب“ اور ”کنز فضہ“ پر جو وعید آئی ہے تو ”کنز“ سے مراد وہ مال ہے جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو اور اگر زکوٰۃ ادا کردی جائے تو پھر وہ ”کنز“ کا مصداق نہیں جس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ وعید آئی ہے اور آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ”مواریث“ اس لئے متعین کیے ہیں تاکہ یہ تمہارے بعد والے لوگوں کیلئے ہو جائے اگر مال ضرورت سے زائد گھر میں رکھنا ٹھیک ہی نہیں تو وراثت کی تقسیم کا اصول کیا ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ جو کہا کہ ترکہ یوں تقسیم کیا کرو ترکہ کے اندر تب ہی کوئی چیز آئے گی جب انسان بچا کے رکھے گا، اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک یہی تھا کہ ضرورت سے زائد گھر کے اندر رکھا جا سکتا ہے لیکن جو فرض مقدار ہے زکوٰۃ کی وہ ضرور ادا ہونی

چاہیئے ہاں اگر ایسا وقت آجائے کہ جس وقت معاشرہ میں اتنی تنگی آگئی کہ لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور آپ کے پاس ضرورت سے زائد موجود ہے اس وقت آپ اخلاقاً پابند ہیں کہ دوسروں کے ساتھ رواداری کریں، ان کے ساتھ مواسات اور خیر خواہی سے پیش آئیں، اور حکومت وقت اسلامی نقطۂ نظر سے اگر ضروری سمجھے کہ عوام کی ضرورت پوری کرنے کیلئے فاضل سرمایہ لوگوں سے لے لیا جائے اور پھر عوام میں اس کی صحیح تقسیم کر کے عوام کی ضرورت پوری کردی جائے دیانت دارانہ طور پر حکومت اگر ضروری سمجھے تو ایسے وقت میں فاضل سرمایہ جس کا عام طور پر خرچ کرنا مستحب ہے حاکم وقت اس کو ضروری قرار دے سکتا ہے۔

اور بوقت ضرورت لوگوں سے سرمایہ لے کر مفاد عامہ کیلئے اس کو خرچ کر سکتا ہے، اس اصول کے تحت جو شریعت نے قائم کیا کہ مفاد عام کیلئے ضرر خاص کو برداشت کر لیا جائے اگر اس قسم کی تنگی آجائے کہ بیت المال کے اندر بالکل سرمایہ نہیں ہے اور اس قسم کی ضرورتیں اٹکی ہوئی ہیں جس کے ساتھ پوری قوم کا تعلق ہے کہ اگر اس کو پورا نہ کیا گیا تو قومی طور پر نقصان ہوگا اور بعض لوگوں کے پاس زائد سرمایہ پڑا ہے جو ان کی ضرورت سے زائد ہے، خواہ مخواہ انہوں نے ذخیرہ کیا ہوا ہے، اور وہ از خود خرچ نہیں کرتے شریعت نے جس کو مستحب قرار دیا ہے حاکم وقت مصلحت کے تحت مالک کی مرضی کے بغیر اس فاضل سرمایہ کو مفاد عام کے لیے خرچ کر سکتا ہے لیکن یہ ہنگامی حالات میں ہے، جس وقت ایسی تنگی نہ ہو فاضل سرمایہ رکھا جا سکتا ہے ہاں البتہ حسب توفیق جتنا اس میں سے خرچ کرتے رہو گے نفل کے طور پر باعث فضیلت ہے فرض مقدار اس میں سے ادا کرنی ضروری ہے تو " قل العفو " کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم نے خرچ کرنا ہے تو ایسی چیز خرچ کرو جس کے خرچ کرنے کے بعد تمہیں مشقت پیش نہ آئے لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں قوت پیدا کی ہے کہ تم اپنی ضرورتیں ختم کر سکتے ہو اور ایثار و ہمدردی کے بعد تم پچھتاؤ گے نہیں تو یہ بھی فضیلت کا درجہ ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایسے موقع پر گھر کا سارا سامان اٹھا کر دے دیتے تھے روایات کے اندر موجود ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات روایات کے اندر موجود ہیں کہ خود بھوکے رہتے تھے، مسافروں کو کھلا دیتے تھے حتی کہ اپنے بچوں کو بھی بھوکا رکھتے تھے اور یہ سب ان کے مناقب میں ان کی فضیلت میں شمار ہوتا ہے۔

تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر پہلے اپنی ضرورت پوری کریں اور اس کے بعد دوسروں پر خرچ کریں تو بھی جائز اور اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوی القلب بنایا ہے کہ آپ مشقت برداشت کر سکتے ہیں کہ آپ خود بھوکے رہیں اور دوسرے کو کھلا دیں، خود اچھا کپڑا نہ پہنیں دوسرے کو پہنا دیں یہ فضیلت ہے جس کو حاصل کرنے کی ہمت ہے تو بڑی خوشی سے کیجئے یہ ناجائز نہیں ہے، اس لئے اجازت دی گئی ہے

کہ پہلے اپنی ضرورتیں پوری کر کے اس کے بعد خرچ کرو یہ تمہارے لئے ضروری نہیں ہے کہ اپنی ضرورتیں ختم کر دو اور دوسروں کو دے دو" کذلك یبین الله لکم الاٰیٰت "اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات کو واضح کرتا ہے، اپنے احکام کو نمایاں کرتا ہے" لعلکم تتفکرون " تاکہ تم دنیا اور آخرت کے معاملات میں سوچو، تاکہ دنیا اور آخرت کے معاملات میں غور کر لیا کرو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے دنیا و آخرت کے معاملات طے کیا کرو۔

یتیم کی مصلحت کی رعایت رکھو:

"ویسئلونك عن الیتٰمیٰ" آپ سے "یتامیٰ" کے متعلق سوال کرتے ہیں "یتامیٰ" کے متعلق سوال کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح ہمارے ہاں یتیموں کے حقوق کی کوئی نگہداشت نہیں ہے، کوئی حفاظت نہیں، مال کو (نعوذ باللہ) ہڑپ کر جاتے ہیں، عرب کے اندر بھی اسی طرح تھا کہ اگر کوئی یتیم تولیت میں آ گیا تو اس کے مال میں احتیاط نہیں کی جاتی تھی لوگ بے احتیاطی کے ساتھ اس کے مال کو بھی اپنے مال کے ساتھ شامل کر کے کھا جاتے تھے قرآن کریم میں حکم آیا" ان الذین یاکلون اموال الیتٰمیٰ ظلماً انما یا کلون فی بطونھم ناراً " کہ جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں کے اندر آگ بھرتے ہیں جب یہ وعید آئی تو جن کے پاس یتیم بچے تھے انہوں نے ان کا مال بالکل علیحدہ کر دیا، ان کے ساتھ مل کر کھانا پینا بھی چھوڑ دیا، ان کے کھانے کی چیز علیحدہ پکائی جاتی علیحدہ رکھی جاتی ایک تو اس کے ساتھ گھروں کا کام بڑھ گیا کہ یتیم بچے کیلئے ہر قسم کا انتظام علیحدہ کیا جائے اور پھر اس میں گڑ بڑ یہ بھی ہو گئی کہ بسا اوقات یتیم بچے کے لئے کوئی چیز تیار کی جاتی وہ بچہ استعمال نہیں کرتا اور وہ یتیم بچے کی طرف سے صدقہ خیرات بھی نہیں کی جا سکتی، گھر والے کھاتے نہیں کہ جو یتیم کا مال کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتا ہے اس طرح یتیم کا مال ضائع ہونے لگ گیا، ان مشکلات کی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا۔

کہ یا رسول اللہ! یتیموں کے مال کے بارے میں کچھ وضاحت چاہیئے؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اصل بات یہ ہے کہ یتیموں کی مصلحت کی رعایت رکھو اور ان کا مال ضائع نہ ہونے پائے، اگر علیحدہ رکھنے میں مصلحت ہے تو علیحدہ رکھو اور اگر ساتھ شامل کر کے کھانے میں مصلحت ہے تو ان کا کھانا ساتھ شامل کر لو اگر ایک وقت انہوں نے نہیں کھایا تم نے کھا لیا تو دوسرے وقت اپنا حصہ ان کو کھلا دو دیکھنا یہ ہے کہ یتیم بچے کی مصلحت کس چیز میں ہے، تو جو شخص مصلحت کی رعایت رکھنے والا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے اور جو شخص مصلحت کو خراب کرنے والا ہے کہ اس مخالطت کو اس یتیم بچے کے مال کھانے کا بہانہ بنا لے کہ برائے نام اپنا شامل کر لیا اور زیادہ اس کا ڈال لیا اور اس طرح بہانہ بنا کر کھا گئے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے، تو جو مصلحت کی رعایت نہیں رکھتا وہ مفسد ہو جائے گا، اور مصلح

ہو جائے گا جو مصلحت کی رعایت رکھتا ہے اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے مخالطت کی اجازت دے دی کہ ہر وقت تمہارے دماغ میں یتیم کی مصلحت رہے اگر مصلحت علیحدگی میں ہے تو اسے علیحدہ رکھو۔

اگر مصلحت ساتھ شامل کرنے میں ہے تو اسے ساتھ شامل کرلو اس میں کوئی کسی قسم کی خرابی نہیں ہے، آپ سے پوچھتے ہیں یتیم بچوں کے متعلق؟ آپ کہہ دیجئے کہ ان کے لیے مصلحت کی رعایت رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اصلاح کا معنی اصلاح احوال اور اصلاح اموال ہے جس کے لیے ہم نے اجمالی لفظ مصلحت کا استعمال کیا ہے اور اگر تم ان کے ساتھ مخالطت کرلو یعنی ان کے مال کے ساتھ اپنے مال کو ملالو تو بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہی ہیں، مصلحت رکھنے والے سے مصلحت کو فوت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے تمہیں مخالطت کی اجازت دے دی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا یہ بھی کہتا کہ جدا جدا رکھو اور پھر یہ بھی کہتا کہ یتیم کا مال ضائع نہ ہونے پائے اس سے تمہیں مشقت ہوتی۔

لیکن اللہ نے مہربانی کر کے تمہیں مخالطت کی اجازت دے دی اب یتیم کی مصلحت کی رعایت رکھنا تمہارے ذمہ ہے بے شک اللہ تعالیٰ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

مسلمان اور مشرک کی آپس میں مناکحت کا مسئلہ:

ابتداء اسلام میں مسلمانوں اور مشرکین کی آپس میں مناکحت جائز تھی، مکہ معظمہ میں خاوند مسلمان ہے، بیوی مشرکہ ہے، بیوی مسلمان ہے اور خاوند مشرک ہے، یا مرد اور عورت کا نکاح ہوا پھر خاوند مسلمان ہو گیا بیوی مشرک ہی رہی یا بیوی مسلمان ہو گئی اور خاوند مشرک رہا یہ صورت ابتداء میں جائز تھی کہ خاوند مسلمان ہو اور کسی مشرکہ کے ساتھ نکاح کرلے یا مومن عورت کا کسی مشرک کے ساتھ نکاح ہو گیا تو یہ صورت گوارا تھی اور برداشت تھی۔

گذشتہ امتوں کے اندر بھی اس کی اس طرح گنجائش تھی آپ کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے اور حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ ہے قرآن کریم میں دونوں کی بیویوں کا ذکر موجود ہے کہ نوح علیہ السلام کی بیوی بھی کافرہ تھی اور لوط علیہ السلام کی بیوی بھی کافرہ تھی اور دونوں کفر کی حالت میں ہی اس دنیا سے گئی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے گذشتہ امتوں میں بھی زوجین کا دین کے اعتبار سے متحد ہونا ضروری نہیں تھا، مؤمن کے نکاح میں کافر عورت رہ سکتی تھی اور ابتداء اسلام میں بھی اسی طرح تھا مدینہ منورہ میں جس وقت اسلامی معاشرہ قائم ہو گیا اور اتنے مرد و عورت مسلمان ہو گئے کہ ان کی آپس میں ضرورت پوری ہو سکتی تھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت آ گئی کہ مسلمان مشرکہ

کے ساتھ نکاح نہ کرے اور کوئی مسلمان اپنی بہن یا بیٹی کو مشرک کے نکاح میں نہ دے اس آیت نے آکر ممانعت کردی اب نہ تو ابتداءً نکاح ہوسکتا ہے کسی مؤمن کا مشرکہ کے ساتھ یا مؤمنہ کا مشرک کے ساتھ اس عقیدے کے اختلاف کے ساتھ کہ جس میں ایمان اور شرک کا فرق آجائے ابتداءً نکاح نہیں ہوسکتا اور اگر پہلے نکاح ہوگیا اور پھر ان میں سے کوئی ایک کافر ہوگیا مثلاً مرزائی ہوگیا یا اس نے مشرکانہ عقیدہ اختیار کرلیا تو نکاح ٹوٹ جائے گا عورت اگر اس قسم کا عقیدہ بدل لیتی ہے تو بھی نکاح ٹوٹ گیا مرد اگر بدل لیتا ہے تو بھی نکاح ٹوٹ گیا۔

اور اگر دونوں اکٹھے ہی کافر ہوجائیں اور پھر دونوں اکٹھے ہی مسلمان ہوجائیں تو پھر یہ نکاح باقی رہتا ہے، نکاح ٹوٹنے کی صورت وہ ہوگی کہ جس میں دونوں کے درمیان میں عقیدے کا اختلاف ہوجائے یہ جزئیہ صراحتاً فقہ کے اندر موجود ہے کہ دونوں اکٹھے کافر ہوجائیں اور پھر اکٹھے ہی مسلمان ہوجائیں تو پھر دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں ہے پہلا نکاح باقی ہے چنانچہ منکرین زکوۃ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں تھے اور اس طرح مسیلمہ کذاب کو ماننے والے لوگ کہ ان سب کے نکاح کی تجدید نہیں کرائی گئی اسی سے استدلال ہے فقہاء کا کہ اگر دونوں مرتد ہوجائیں اور پھر دونوں بیک وقت مسلمان ہوجائیں تو سابقہ نکاح باقی رہتا ہے اور اگر آپس میں تقدم و تأخر ہوگیا تو اس سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے چاہے مرد کافر ہوجائے یا عورت کافرہ و مشرکہ ہوجائے۔

کیا مسلمان کا نکاح اہل کتاب کے ساتھ ہوسکتا ہے؟

البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ یہاں مشرکات سے کیا مراد ہے؟ اگر یہاں مشرکین سے مراد مطلقاً غیر مسلم ہیں کہ جو مسلمان نہیں پھر اس میں سے اہل کتاب کو خاص کرنا پڑے گا باوجود اس بات کے کہ یہ یہود و نصاریٰ غیر مسلم تھے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے مؤمن مردوں کو ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دی ہے جس کا ذکر سورۃ المائدہ کے پہلے رکوع میں ہوگا، اور اگر مشرکات سے مراد غیر اہل کتاب ہوں یا بت پرست تو پھر ان کا حکم یہاں مذکور ہے باقیوں کا حکم یہاں نہیں آیا لیکن بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے مشرکین اور مشرکات کا عنوان اہل کتاب کیلئے اختیار نہیں کیا اہل کتاب کا جہاں بھی ذکر آیا ہے وہاں عنوان ہے "الذین کفروا من اھل الکتاب" تو اہل کتاب کو اہل کتاب کے عنوان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور ان کے کفر کو واضح کیا گیا ہے باقی جہاں بھی مشرکین یا مشرکات کا ذکر آجائے تو اس کے مصداق مشرکین مکہ اور دوسرے بت پرست قرار پائیں گے اہل کتاب ان کے اندر شامل نہیں ہوں گے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک یہی تھا کہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح ہوسکتا ہے۔

اس مسئلہ میں اختلاف صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا منقول ہے یہ اس وقت ہے جب کہ اہل کتاب

ان عقیدوں پر ہوں جس پر وہ سرور کائنات ﷺ کے زمانے میں تھے اگر اہل کتاب ان عقیدوں پر نہ ہوں جو سرور کائنات ﷺ کے زمانہ میں ان کے عقیدے تھے بلکہ سرے سے توحید کے منکر ہو جائیں، دہریہ ہو جائیں، خدا کے وجود کے قائل نہ ہوں، عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قائل نہ ہوں، تورات و انجیل کو اللہ کی کتاب نہ سمجھیں، آخرت کے قائل نہ ہوں جس طرح آج کل عام طور پر جدید تہذیب کے لوگ آخرت کے قائل نہیں اور اس طرح توحید و رسالت کا عقیدہ بھی صحیح نہیں ہے چاہے وہ سیاسی طور پر اپنے آپ کو عیسائیوں کے اندر ہی شمار کراتے ہوں یا یہودیوں میں شمار کراتے ہوں یہ مشرکوں کے حکم میں ہیں ان کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہے اہل کتاب کے ساتھ اہل اسلام کا بنیادی عقائد میں تو اتحاد تھا صرف تعبیرات میں اختلاف تھا یا سرور کائنات ﷺ پر ایمان لانے میں تھا وہ بھی مدعی توحید تھے ہم بھی مدعی توحید ہیں یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض عقائد انہوں نے ایسے اختیار کر لئے جن کو ہم شرک کہتے ہیں۔

لیکن اپنے طور پر وہ " لاالہ الااللہ " پڑھتے تھے، موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے تھے، تورات کو اللہ کی کتاب مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے فرشتوں کے قائل تھے، جنت وجہنم کے قائل تھے، حساب و کتاب کے قائل تھے، سب چیزوں کو تسلیم کرتے تھے یہ کافر ٹھہرے سرور کائنات ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے باقی سب اصول شریعت کو مانتے تھے اور اسی طرح عیسائی بھی توحید کے مدعی تھے، عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا فرستادہ مانتے تھے، انجیل کو اللہ کی کتاب قرار دیتے تھے اور فرشتوں کے قائل تھے، قیامت کے قائل تھے، آخرت کے قائل تھے، سب چیزوں کو مانتے تھے وہ کافر ٹھہرے سرور کائنات ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے اور بعض عقائد جن کو قرآن نے کہا کہ یہ شرک ہے اور وہ اپنے طور پر ان کو شرک نہیں سمجھتے تھے، آج بھی اگر کوئی عیسائی توحید کا مدعی ہے اور انجیل کو اللہ کی کتاب سمجھتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چاہے اس کا عقیدہ ابنیت کا ہے جس کی بناء پر یہ عقیدہ شرک ہے اور حضور ﷺ کے زمانے والے عیسائی بھی ابنیت کے قائل تھے" لقد كفر الذين قالوا ان الله هو المسيح ابن مريم ،لقد كفر الذين قالوا ان الله ثالث ثلثة (سورۃ المائدہ ۷۲، ۷۳) اگرچہ اس قسم کے عقیدے ہوں پھر بھی نکاح درست ہے، ہاں البتہ اگر وہ آخرت کے منکر ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل نہیں رہے، اللہ کی طرف سے آنے والی کتابوں کا انکار کر دیا، فرشتوں کا انکار کر دیں، یہ عقائد اس وقت اہل کتاب کے نہیں تھے اس قسم کے عقائد اختیار کرنے کے بعد وہ شخص اہل کتاب میں شامل نہیں وہ کافر ہے اور اس کا حکم عام مشرکوں والا ہے کہ پھر ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح نہیں کیا جا سکتا اور مؤمنہ عورت کے ساتھ کسی غیر مسلم کا نکاح درست نہیں چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو۔

اہل کتاب کو دو حکموں میں مستثنیٰ قرار دیا تھا ایک ان کے ذبیحہ کو مسلمانوں کیلیے حلال قرار دیا تھا بشرطیکہ اللہ کے نام پر ذبح کریں اور ایک ان کی عورتوں کو اہل ایمان کیلیے حلال قرار دیا گیا، دونوں کا ذکر اکٹھا ہی سورۃ مائدہ کے پہلے رکوع میں ہے۔

آیت کی تشریح:

''ولاتنکحوا المشرکت'' مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کیا کرو'' حتی یومن'' جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں'' ولامۃ مؤمنۃ خیر من مشرکۃ ''اور ایمان والی باندی بہتر ہے مشرکہ آزاد سے کیونکہ '' امۃ مؤمنۃ '' کے مقابلے میں مشرکہ کو ذکر کیا جارہا ہے تو اس سے مشرکہ آزاد مراد ہے چاہے وہ مشرک عورت آزاد ہے اور اپنے مال اور جمال کی وجہ سے تمہیں اچھی لگ رہی ہے تو بھی اس کے مقابلے میں مؤمنہ باندی زیادہ بہتر ہے'' ولاتنکحوا المشرکین ''اور مشرکوں کے نکاح میں نہ دیا کرو یعنی ان عورتوں کو جن کا نکاح کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔

مثلاً بیٹی یا بہن'' حتی یومنوا '' جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں '' ولعبد مؤمن '' البتہ ایمان والا غلام'' خیر من مشرك ''بہتر ہے مشرک آزاد سے'' ولو اعجبکم '' اگر چہ وہ مشرک اپنی شکل، صورت، جاہ، مال کی وجہ سے تمہیں اچھا لگے'' اولئك یدعون الی النار '' یہ لوگ جہنم کی طرف بلاتے ہیں کہ ان کے ساتھ مناکحت جہنم میں لے جانے کا ذریعہ ہے'' واللہ یدعوا الی الجنۃ '' اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم کے ساتھ جنت کی طرف بلاتا ہے، اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور لوگوں کے لئے اپنے احکام کو واضح کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔
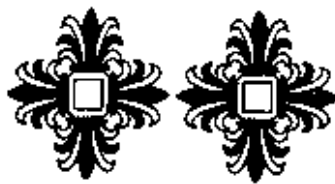
وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ

وہ سوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق آپ کہہ دیجئے کہ وہ دم حیض اذیٰ ہے، جدا رہو تم عورتوں سے

فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ

حیض کے زمانہ میں، اور ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ پاک ہو جائیں

فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ

تو تم ان کے پاس آیا کرو اس جگہ سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں کثرت سے توبہ کرنے والوں سے

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ

اور محبت کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے والوں سے ﴿۲۲۲﴾ تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیت ہیں، آیا کرو تم اپنے کھیت کے پاس

اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

جس طرح سے چاہو، اور آگے بڑھایا کرو اپنے نفسوں کے لیے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو

اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ

کہ تم اس اللہ سے ملاقات کرنے والے ہو اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو ﴿۲۲۳﴾ اور اللہ کو نہ بنایا کرو

عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ

آڑ اپنی قسموں کے سبب سے اس کام سے کہ تم نیکی کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور اصلاح کرو

النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ

لوگوں کے درمیان، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾ نہیں مواخذہ کرے گا اللہ تعالیٰ تم سے اس لغو کے سبب سے جو

اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

تمہاری قسموں میں پیش آجاتا ہے لیکن مواخذہ کرے گا تم سے بسبب اس کام کے جس کو تمہارے دل کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ

بخشنے والا ہے، بردبار ہے ﴿۲۲۵﴾ ان لوگوں کیلئے جو اپنی عورتوں سے ایلاء کر لیتے ہیں ان کیلئے انتظار کرنا ہے چار

اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا

مہینے کا اگر وہ رجوع کرلیں پس بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۲۲۶﴾ اور اگر انہوں نے عزم کیا ہے

الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ

طلاق کا پس بے شک اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں ﴿۲۲۷﴾ اور وہ عورتیں جن کو طلاق دے دی جائے انتظار میں رکھیں

بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ

وہ اپنے نفسوں کو تین قروء، حلال نہیں ان عورتوں کیلئے کہ چھپالیں اس چیز کو جو پیدا کی

اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں اگر وہ ایمان لاتی ہیں اللہ کے ساتھ اور یوم آخرت کے ساتھ،

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ

اور ان عورتوں کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں ان کو لوٹانے کا اس مدت میں اگر ارادہ کریں وہ حالات کو درست کرنے کا اور ان عورتوں کیلئے

مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ

مثل اس چیز کے ہے جو ان کے ذمہ ہے معروف کے ساتھ اور مردوں کیلئے ان عورتوں پر درجہ ہے

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع

اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں ﴿۲۲۸﴾

تفسیر:

"یسئلونك عن المحیض" میں المحیض یہ مصدر میمی ہے حاض، یحیض، حیضاً، بہنا، اور پھر یہ اصطلاح شریعت میں متعین ہوگیا عورتوں کے اس خون کے لیے جو عادت کے طور پر ان کو آتا ہے چونکہ وہ ایک صحت مند عورت کو مہینہ میں ایک دفعہ آہی جاتا ہے اس لیے اس خون کو ماہواری کا خون کہتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ مہینہ

میں ایک دفعہ آئے لیکن عادت کے طور پر صحت مند عورت کو مہینہ میں ایک دفعہ آہی جاتا ہے اور اس کی مقدار تین دن سے لے کر دس دن تک ہے، اس لئے عرف عام میں اس کا نام ماہواری کا خون ہے، تو یہاں محیض سے وہی دم حیض مراد ہے" یسئلونك عن المحیض "سوال کرتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق، قل هو اذى اذی کہتے ہیں تکلیف دہ چیز کو یا قابل نفرت چیز کو، حدیث شریف میں لفظ آتا ہے" اماطة الاذیٰ عن الطریق" تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹا دینا وہاں اذیٰ تکلیف دہ چیز کے معنی میں ہے اور اس طرح قابل نفرت چیز کو بھی اذیٰ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

آپ کہہ دیجئے کہ وہ دم حیض اذیٰ ہے یعنی قابل نفرت چیز ہے" فاعتزلوا النساء فی المحیض" جدا رہو تم عورتوں سے حیض میں یعنی حیض کے زمانے میں" ولا تقربوهن "اور ان عورتوں کے قریب نہ جاؤ قریب جانا یہ کنایہ ہے جماع سے اور ان عورتوں کے قریب نہ جایا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ اچھی طرح سے پاک ہو جائیں تو تم ان کے پاس آیا کرو اس جگہ سے جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں کثرت سے توبہ کرنے والوں سے اور محبت کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے والوں سے۔

یسئلونك عن المحیض کا شان نزول:

پچھلے رکوع کے آخر میں نکاح کا ذکر ہوا تھا اسی سے کلام منتقل ہوگئی بیوی کے بعض احکام کی طرف، اس رکوع کی پہلی آیت "یسئلونك عن المحیض" کے شان نزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ ایام حیض میں بیوی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جا سکتا ہے اور اس پوچھنے کی وجہ یہ تھی کہ مدینہ منورہ کے ارد گرد یہود آباد تھے اور وہ اہل علم سمجھے جاتے تھے یہود کا طریقہ یہ تھا کہ جس وقت عورت کو یہ ایام آجائیں تو اس کو علیحدہ کر دیتے تھے، علیحدہ کمرے میں اس کو ٹھہراتے اس کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے تھے، جب کھانے پینے سے پرہیز تھا، ساتھ رہنے سے بھی پرہیز تھا تو دیگر معاملات بوس و کنار کو وہ کیسے جائز سمجھ سکتے تھے، اس طرح سے وہ عورت کو اپنے ماحول سے کاٹ کر الگ کمرہ دیتے تھے اور بعض حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے برعکس نصاریٰ کسی قسم کا پرہیز نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ ایام حیض میں عورت کے ساتھ مجامعت کو بھی جائز سمجھتے تھے تو ایک طرف افراط اور دوسری طرف تفریط صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟

ہم نے ان ایام میں بیویوں کے ساتھ کیا معاملہ کرنا ہے؟ ان کے سوال کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل کے ساتھ ان آیات کی وضاحت فرمائی، جواب کا حاصل یہ ہے کہ یہ آپ سے ایام حیض میں عورت کے ساتھ برتاؤ کے متعلق پوچھتے ہیں؟ تو آپ

ان کو کہہ دیں کہ یہ قابل نفرت چیز ہے، گندی چیز ہے، پلید چیز ہے، عورتوں سے حیض کے زمانہ میں دور رہا کرو اب اس علیحدگی کی حد کیا ہے؟

حکم خداوندی کی وضاحت سرور کائنات ﷺ کے قول وفعل سے:

بظاہر تو یہ لفظ اشارہ کر رہا ہے اس معاملہ کی طرف جو یہود نے اختیار کر رکھا تھا اس لیے سرور کائنات ﷺ نے منشاء خداوندی کو ظاہر فرمایا صحاح کے اندر روایت موجود ہے۔

اور خاص طور پر نسائی شریف میں اس روایت کے اوپر ترجمۃ الباب بھی یہ قائم کیا گیا ہے'' تاویل قول اللہ عزوجل فاعتزلوا النساء فی المحیض '' اللہ تعالیٰ کے اس قول'' فاعتزلوا النساء فی المحیض '' کا مطلب اور اس کے نیچے سرور کائنات ﷺ کی طرف سے روایت نقل فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ'' اِصْنَعُوْا کلَّ شیءٍ الا النکاح '' کہ اپنی بیویوں کے ساتھ ہر معاملہ کرسکتے ہو سوائے وطی کے، تو'' فاعتزلوا النساء '' سے مراد ہوا وطی سے اعتزال جو مقام حیض ہے جس طرح'' قل ھو اذی '' کے اندر اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ گندی چیز ہے، قابل نفرت چیز ہے تو جس مقام میں وہ گندی چیز موجود ہوگی علیحدگی بھی اسی سے اختیار کرنی ہے اور سرور کائنات ﷺ نے اپنے عمل کے ساتھ بھی اس بات کو واضح فرمایا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حیض کے زمانہ میں حضور ﷺ ہمیں چادر باندھنے کا حکم فرمادیا کرتے تھے اور پھر ہمیں ساتھ بھی لٹا لیا کرتے تھے، (سنن نسائی ص ۴۳ ج ۱) بوس وکنار جائز ہے اور فرماتی ہیں کہ میں ایک ہڈی لیتی گوشت والی اور اس میں سے کھاتی وہ ہڈی مجھ سے حضور ﷺ لے لیتے اور جہاں سے میں نے منہ رکھ کے کھایا ہوتا وہیں حضور ﷺ منہ رکھ کر کھاتے جس سے آپ نے اس نفرت کو ختم کردیا جو حائضہ عورت سے لوگوں نے بنا رکھی تھی۔

اور میں پانی پیتی تو بچا ہوا پانی حضور ﷺ مجھ سے لے لیتے اور جس جگہ سے میں نے منہ لگا کے پانی پیا ہوتا حضور ﷺ بھی وہیں منہ لگا کر پانی پیتے (سنن نسائی ص ۴۰ ج ۱) جس کا مطلب یہ ہوا کہ حائضہ عورت کا'' لعاب دھن '' بالکل پاک ہے، اور اس کا جوٹھا بالکل پاک ہے، اس کے ساتھ لیٹنا جائز ہے، باقی بدن کے ساتھ مباشرت جائز ہے البتہ وطی بالاتفاق حرام ہے، موضع دم سے بچنا ضروری ہے، اور ناف سے لے کر گھٹنوں تک حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک استمتاع ممنوع ہے لیکن یہ پابندی احتیاط کی بناء پر ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تو یہاں تک فرماتی ہیں کہ اعتکاف کے دنوں میں حضور ﷺ اپنا سر مبارک مسجد سے باہر گھر کی طرف کردیا کرتے تھے تو میں اس کو دھو بھی دیتی اور کنگھی بھی کرتی باوجود حائضہ ہونے کے، میں حائضہ ہوتی

تب بھی حضور ﷺ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے اور قرآن کریم بھی پڑھتے رہتے (سنن نسائی ص ۴۴ ج ۱) جس سے معلوم ہوا کہ یہ سارے کے سارے معاملات درست ہیں۔

حضور ﷺ کے اقوال اور افعال مبارکہ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب واضح ہو گیا کہ "فاعتزلوا النساء" سے مراد یہ ہے کہ وطی سے دور رہو یہود نے جوان ایام میں عورتوں کو قابل نفرت بنا دیا تھا یہ ان کا طریقہ ٹھیک نہیں ہے اور نہ ہی نصاریٰ کا طریقہ ٹھیک رہا کہ کسی چیز سے بھی پرہیز نہیں حتیٰ کہ وطی بھی جائز۔

حیض ختم ہونے کے بعد وطی کب جائز ہے؟

"ولا تقربوھن حتی یطھرن" ان کے قریب نہ جایا کرو حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائیں یہاں بھی قربان سے وطی مراد ہے یعنی ان سے وطی نہ کیا کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں "یطھرن" یہ مجرد سے ہے اصول کی کتابوں میں آپ پڑھیں گے کہ یہاں ہے "یَطَّھَّرْنَ" یہ مبالغہ کا لفظ ہے دونوں میں فرق کرتے ہوئے کیونکہ دو قراءتیں دو آیتوں کے حکم میں ہوتی ہیں "یَطْھُرْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طاہر ہو جائیں یعنی ان کا خون ختم ہو جائے "یطھرن" اس میں مبالغہ آ گیا یعنی وہ نہا دھو کر اچھی طرح صاف ستھری ہو جائیں، پھر حیض ختم ہونے کے بعد وطی اس کے ساتھ کب جائز ہے؟ ہمارے مسلک کی تفصیل آپ کے سامنے موجود ہے کہ اگر خون کا انقطاع ہوا ایام حیض پورے ہونے کے بعد، دس دن کے بعد تو اب چونکہ امکان ہی نہیں حیض کے آنے کا بالیقین اس کا حیض ختم ہو گیا اب تو بغیر غسل کے بھی اس کے ساتھ وطی کی جا سکتی ہے اور اگر خون ختم ہوا ہے دس دن کے اندر اس صورت میں پہلے غسل کیا جائے اور اس کے بعد وطی درست ہے یا حیض کا خون ختم ہوئے اتنا وقت گزر جائے کہ اس عورت کے ذمہ ایک نماز واجب ہو جائے تو جب شریعت اس کے ذمہ ایک نماز واجب کر دے گی تو گویا کہ شریعت نے اس کو طاہرہ کے حکم میں داخل کر لیا جب وہ طاہرہ کے حکم میں داخل ہو گئی تو اب اس کے ساتھ وطی بھی کی جا سکتی ہے۔

بعض امور فطرت کا تقاضہ ہیں:

"فاذا تطھرن فاتوھن من حیث امرکم اللہ" جب وہ پاک ہو جائیں پھر آیا کرو ان کے پاس اس جگہ سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا "امرکم اللہ" اللہ نے تمہیں حکم دیا بظاہر اس کا ترجمہ یہی ہے لیکن یہ حکم اللہ کا کہاں ہے؟ یہ حکم صراحۃً کتاب اللہ کے اندر مذکور نہیں ہے پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس "امر الٰھی" سے مراد ہے وہ امر جو فطرت اللہ کے تحت انسان کی طبیعت میں ودیعت رکھا گیا ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ منہ سے کھاؤ اب یہ سیدھی سی بات ہے اگر کوئی شخص ناک میں لقمہ ڈالنا چاہے یا کسی اور طریقہ سے پیٹ میں کوئی چیز ڈالنا چاہے تو ہم کہیں گے یہ "امر الٰھی" کے خلاف ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کے طور پر اس کا منہ بنایا ہے اس کے ذریعہ سے لقمہ پیٹ میں ڈالا جائے کوئی دوسرا سوراخ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے ذریعے لقمہ پیٹ میں ڈالو جب فطرت کا تقاضہ یہی ہے تو پھر اس کام کو فطرت کے تقاضہ کے تحت کرنا یہ ''امر الٰھی'' ہے اس فطری امر کے ساتھ انسان کی خواہش بھی پوری ہوتی ہے اور بقاء نسل والی حکمت بھی پوری ہوتی ہے اس لیے ''من حیث امر کم اللہ'' سے قبل مراد ہے اور امر سے وہ ''امر الٰھی'' مراد ہے جو فطری طور پر انسان میں ودیعت ہوا ہے۔

'' ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین '' بے شک اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں اچھی طرح توبہ کرنے والوں کو اور پسند کرتے ہیں اچھی طرح صاف ستھرا رہنے والوں کو، توبہ باطنی گناہوں سے صفائی کا ذریعہ ہے، اور تطاہر ظاہری میل کچیل کے صاف ہونے کا ذریعہ ہے تو توبہ اور تطاہر دونوں کو ذکر کردیا کہ اگر کوئی غلطی ہوجائے اور اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کام ہوجائے تو توبہ کرکے اس کو صاف کرو۔

نساؤ کم حرث لکم کا شان نزول:

اس آیت کے شان نزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ یہود کے ہاں طریقہ یہ تھا کہ وہ عورت کے ساتھ وطی ایک متعین طریقہ سے کرتے تھے کہ اس کو چت لٹا کر اس کے ساتھ مجامعت کی جائے اور وہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی دبر کی جانب سے قبل میں وطی کرے اور ایسی صورت میں حمل ٹھہر جائے تو بچہ احول پیدا ہوتا ہے یعنی بھینگا جس کو فارسی میں لوچ کہتے ہیں جس کی دونوں آنکھوں کا زاویہ ٹھیک نہیں ہوتا یہ سوال بھی سرور کائنات ﷺ کے سامنے آیا کہ کیا ان کا یہ نظریہ ٹھیک ہے؟ اور اس کے شان نزول میں ایک دوسرا واقعہ بھی نقل کیا ہوا ہے چونکہ زوجین کا تعلق انسان کی زندگی کا ایک اہم شعبہ ہے اور اس تعلق میں انبساط اور پوری طرح سے ایک دوسرے سے لذت اٹھانا انسان کی زندگی کی تعمیر میں بہت بڑا دخل رکھتا ہے اخلاق کی صفائی میں اور ماحول کی اچھائی میں ان چیزوں کا بہت دخل ہے، انصار کے اندر مجامعت کا طریقہ ایک ہی تھا۔

لیکن مکہ معظمہ سے جو لوگ ہجرت کرکے مدینہ منورہ گئے تھے وہ مختلف حرکات کے ساتھ عورت سے لذت حاصل کرتے تھے مدینہ منورہ میں آکر مہاجرین نے انصار کی لڑکیوں سے شادی کی تو کہیں زوجین کا آپس میں اختلاف ہوگیا خاوند نے اس کو اسی طرح استعمال کرنا چاہا جیسے مروج تھا اور اس عورت نے انکار کیا پھر یہ اختلاف سرور کائنات ﷺ کے سامنے گیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس بارے میں بھی راہنمائی فرمادی جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے جماع کرنے کیلئے جگہ متعین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرث قرار دیا ہے کھیت جس میں بیج

ڈالا جاتا ہے باقی اس کھیت تک پہنچنے کیلئے طریقہ کوئی متعین نہیں جس طرح زوجین کی طبیعت میں انبساط ہو اسی طرح درست ہے اور اس میں حکمت شریعت کی یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں جتنے جذبات پیار کرنے کے ہوں ان کی تسکین بیوی کے ساتھ کرلے تاکہ اس کی طبیعت میں تشنگی باقی نہ رہے کہ پھر اس کو فسق و فجور کا راستہ اختیار کرنا پڑے، غلط نگاہ اٹھانی پڑے جتنے جذبات ہیں سب کی تسکین بیوی کے ساتھ ہونی چاہیئے ہاں البتہ مقام متعین ہے جس کو حرث قرار دیا ہے گویا کہ نطفہ کا ڈالنا بیج کے ڈالنے کی طرح ہے اور بچہ پیداوار کی طرح ہے مقام متعین ہے لیکن آنے کی کیفیت متعین نہیں۔

بیوی سے استمتاع میں محل خاص ہے کیفیت عام ہے:

"انی شئتم، انیٰ کیف" کے معنی میں بھی ہوتا ہے اس صورت میں کیفیت میں عموم ہوگا کہ جس طرح چاہو جماع کرو، جو کیفیت چاہو اختیار کرو یہ جائز ہے، اور کبھی "انیٰ این" کے معنی میں ہوتا ہے اگر "این" مراد لیں گے تو تعمیم ہو جائے گی محل کی حالانکہ بیوی کے استعمال میں محل کی تعمیم نہیں ہے اور اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ لواطت اپنی بیوی کے ساتھ بھی حرام ہے اگرچہ جسم کے اس حصہ کو اللہ نے خاوند کے لیے حلال قرار دیا ہے کہ ہاتھ پھیر سکتا ہے اور استمتاع کر سکتا ہے لیکن قضاءِ شہوت فی الدبر باتفاق ائمہ اربعہ حرام ہے اس لیے ہم اس کو یہاں این کے معنی میں نہیں کریں گے جس سے محل میں تعمیم پیدا ہو اور "قضاءِ شہوت فی الدبر" کے جواز کی طرف اشارہ نکلے۔

اب یہاں لفظ حرث جو استعمال کیا گیا ہے اس پر غور کریں کہ کھیت کے بارے میں صاحب کھیت کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ایسے طریقے اپنائے جائیں جس سے پیداوار زیادہ سے زیادہ لی جائے، جب اچھی پیداوار حاصل کرنی ہوگی تو انسان اوقات کا خیال بھی کرتا ہے اور باقی سب چیزوں کی بھی رعایت کرتا ہے کھاد استعمال کرتا ہے، اسپرے استعمال کرتا ہے، تو اس بات کی طرف تو اشارہ نکلتا ہے کہ زوجین کے تعلق سے مقصود کثرت اولاد ہے تاکہ بقاءِ نسل ہو اور اس دنیا کی آبادی ہو اور سرور کائنات ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ "تزوجوا الودود الولود" "ایسی عورت سے نکاح کیا کرو جو زیادہ بچے دینے والی ہو زیادہ محبت کرنے والی ہو" فانی مکاثر بکم الامم" (مشکوٰۃ ص۲۷۶) میں قیامت کے دن تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا اور امت میں کثرت کثرت اولاد کے ساتھ ہوگی اس لیے فرمایا کوشش کیا کرو کہ ایسی عورت حاصل کرو جو بچے زیادہ دینے والی ہو۔

یہ ساری چیزیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اولاد کی کثرت مطلوب ہے اور اس سے اس

نظریہ کی کتنے اچھے انداز کے ساتھ تردید ہو جاتی ہے جو اس کھیت کو بنجر بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس کو آپ خاندانی منصوبہ بندی یا برتھ کنٹرول کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں کھیت کو بنجر بنانے کی کوشش کرنا اس فطرت کے خلاف ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے یہ لفظ حرث خود اس نظریہ کی تردید کیلئے کافی ہے اس لیے خاندانی منصوبہ بندی کیلئے جتنی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اور برتھ کنٹرول کے جتنے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں سب ممنوع اور حرام ہیں۔

اپنے مستقبل کی فکر کرو:

"وقدموالانفسکم" "اپنے نفسوں کیلئے آگے بھیجو، کیا چیز آگے بھیجو؟ یہاں "قدموا" کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا اس کا مفعول یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعمال صالحہ کو آگے بھیجو اور پھر اس بات کو یہاں ذکر کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ زوجین کے تعلقات میں چونکہ استلذاذ ہے تو اس طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اسی عیش وعشرت میں مبتلا نہ رہنا، لذت پرستی میں نہ لگے رہو بلکہ اپنے لیے اعمال کا اہتمام کیا کرو اور پھر یہ مقصد بھی ہوگا کہ زوجین کا تعلق آپس میں اعمال صالحہ کے جذبہ کے ساتھ ہو، اچھی نیت کے ساتھ ان معاملات کو ادا کرو تا کہ تمہارے یہ معاملات بھی اعمال صالحہ میں شمار ہوں جیسے حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے قضاءِ شہوت کرتا ہے تو اس کو بھی صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! ایک شخص اپنی شہوت پوری کرتا ہے اور اس کو بھی ثواب ملتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بتاؤ اسی شہوت کو اگر وہ حرام جگہ میں پوری کرتا گناہ ہوتا یا نہ ہوتا؟ اگر حرام جگہ پوری کرتا تو گناہ ہوتا اگر حلال جگہ پوری کرے گا تو ثواب بھی ملے گا تو جب نیک نیتی کے ساتھ یہ کام کیا جائے تا کہ ہمیں عفت حاصل ہو، عصمت حاصل ہو، ہماری طبیعت کے اندر گناہ کا جذبہ نہ رہے تو اس کا یہ عمل بھی نیک اعمال میں شمار ہوگا، اولاد حاصل کرنے کا جذبہ کہ ہماری اولاد ہوگی ہم اس کو حافظ، قاری، عالم بنائیں گے ہم مرجائیں گے وہ ہمارے لیے دعا کرے گی یہ جذبہ ہونا چاہیئے کیونکہ نیک اولاد بھی انسان کیلئے صدقہ جاریہ ہوتی ہے جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان مرجاتا ہے اور مرنے کے ساتھ اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں لیکن چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ثواب اس کو پہنچتا رہتا ہے۔

ان میں ایک ولد صالح بھی ہے اس لیے ولد صالح حاصل کرنے کی کوشش کرو صرف قضاءِ شہوت ہی مقصود نہ ہو اور بقاءِ نسل کا سامان پیدا کرو کہ تمہاری نسل باقی رہے اور اسی کے ساتھ اس دنیا کی آبادی ہے۔

"قدموا لانفسکم" میں یہ ساری باتیں شامل ہیں یعنی اپنے مستقبل کی فکر کرو، آخرت کے لیے بھی اور دنیا کے مستقبل کے لیے بھی دنیا میں مستقبل کے لیے یہی ہے کہ اولاد حاصل کرنے کی کوشش کرو جو تمہاری قائم مقام ہوگی تمہاری نسل باقی رہے گی تمہارے لیے صدقہ جاریہ ہوگی اور نیک اعمال کا اہتمام کرو جو آخرت میں تمہارے کام آنے والے ہیں دونوں طرح سے اس مفہوم کو واضح کیا جا سکتا ہے۔

اعمال پر برانگیختہ کرنے والی چیزیں:

"واتقوا الله واعلموا انکم ملقوه" اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ تم اس سے ملاقات کرنے والے ہو یہ اس قسم کی باتیں اللہ تعالیٰ احکام ذکر کرنے کے بعد جو فرمایا کرتے ہیں ان کا یاد رکھنا اصل کے اعتبار سے ان احکام پر عمل کو آسان کر دیتا ہے یہ تصور انسان کی عملی زندگی کو آسان کر دیتا ہے "وبشر المؤمنین" اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دو، یعنی ایمان والوں کو خبر دے دو کہ ان کے سامنے ایسی حالت آنے والی ہے جس سے وہ خوش ہو جائیں گے۔

قسموں کی اقسام واحکام:

"ولاتجعلوا الله عرضة لأیمانکم" عورتوں کے متعلق احکام کا سلسلہ شروع ہے اور دو تین آیتوں کے بعد آپ کے سامنے ایلاء کا مسئلہ آرہا ہے اور ایلاء میں بھی چونکہ قسم ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ یہاں پہلے قسم کے حکم کو واضح فرماتے ہیں پھر بعد میں اس خاص قسم کے حکم کو بیان فرمائیں گے جس کا تعلق عورت کے احکام سے ہے۔

پہلی بات تو یہ کہی کہ دیکھو اللہ تعالیٰ عظیم الشان ہیں اس کے نام کی عظمت کو پہچانو، کثرت کے ساتھ قسمیں نہ کھایا کرو پھر خاص طور پر ایسی قسم کھانا جس میں کسی نیکی کا ترک ہو مثلاً کوئی یہ قسم کھالے کہ میں اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک نہیں کروں گا، کسی کے ساتھ بولوں گا نہیں یا کسی برے کام پر قسم کھالی کہ میں وہ کام کروں گا یا کسی وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی اور آپ نے قسم کھالی کہ میں آئندہ لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤں گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اللہ کے نام کو برائی کا ذریعہ بنالیا، نیکی سے رکنے کا ذریعہ بنالیا اور اس طرح کی قسم اللہ کے نام کی عظمت کے خلاف ہے ایسی قسمیں نہ کھایا کرو اس لیے مسئلہ بھی یونہی ہے کہ اگر کوئی اس طرح کی قسم کھالے جس کے نتیجے میں کوئی گناہ لازم آتا ہو یا کسی نیکی کا ترک لازم آتا ہو تو اس قسم کا توڑنا واجب ہے اور اس کو توڑ کر اس کا کفارہ دینا ضروری ہے کفارہ کا ذکر آپ کے سامنے سورۃ مائدہ میں آئے گا۔

تو ترجمہ اس طرح ہوگا اللہ کے نام کو قسموں کے سبب سے آڑ نہ بنالیا کرو اس بات سے کہ تم اچھا برتاؤ کرو

اور تقویٰ اختیار کرو اور لوگوں کے درمیان اصلاح کراؤ، اس قسم کی قسم جو نیکی کے چھوڑنے پر ہو، تقویٰ کے ترک کرنے پر ہو، اصلاح ''بین الناس'' کے خلاف ہو یہ قسم جائز نہیں اگر اس قسم کی قسم کھالی جائے تو یہ اللہ کے نام کی عظمت کے منافی ہے اس قسم کا توڑنا ضروری ہے اور کفارہ دینا ضروری ہے، اس کے متعلق آگے حکم آ گیا ''لایؤاخذکم اللہ باللغوفی ایمانکم'' کہ قسم اٹھانے میں دو طرح کے حالات ہیں ایک تو یہ ہے کہ بلا قصد زبان پر قسم جاری ہو گئی، قسم اٹھانا مقصد نہیں تھا تکیہ کلام کے طور پر زبان سے لفظ نکل گیا اس کو کہتے ہیں ''لغو فی الیمین'' اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے نہ دنیا میں کفارہ نہ آخرت میں گناہ، اور ایک ہے کہ آپ نے قصد کے ساتھ قسم اٹھائی پھر اگر مستقبل کے متعلق اٹھائی ہے تو یہ ''یمین منعقدہ'' ہے اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے اگر اس کے مطابق عمل نہیں کر سکو گے تو قسم ٹوٹ جائے گی اور پھر کفارہ دینا پڑے گا اور اگر ماضی کے متعلق خلاف واقعہ قصداً قسم اٹھائی ہے اس کو ''یمین غموس'' کہتے ہیں اس کے اوپر آخرت میں مواخذہ ہے دنیا میں اس کے اوپر کفارہ نہیں ہے، اگر جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھائی اور یہ ہمیشہ ماضی کے متعلق ہوتی ہے آپ نے کوئی کام کیا ہے اور قسم اٹھالی کہ میں نے نہیں کیا یا آپ نے کوئی کام نہیں کیا اور قسم اٹھالی کہ میں نے کیا ہے اس کو ''یمین غموس'' کہا جاتا ہے یعنی غوطہ دینے والی قسم جو اللہ کے غضب میں نار جہنم میں انسان کو غوطہ دے گی، اس کے اوپر آخرت میں مواخذہ ہے دنیا کے اندر اس کے اوپر کفارہ نہیں آتا۔

ایلاء کی تعریف اور اس کا حکم:

'' للذین یؤلون من نسائھم تربص اربعۃ اشھر '' اب آگے قسم کی ایک خاص قسم آ گئی جس کو ایلاء کہتے ہیں ایلاء کا معنیٰ ہے کہ اپنی بیوی سے ترک تعلق کی قسم کھانا اب اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار مہینہ کے اندر اندر کی قسم کھائی ہے کہ دو ماہ قریب نہیں جاؤں گا یا ایک ماہ قریب نہیں جاؤں گا حتیٰ کہ چار ماہ سے ایک دن ہی کم ہو تو پھر یہ ''یمین منعقدہ'' کی طرح ہے اگر اس کے مطابق عمل کر لو گے تو کوئی گرفت نہیں ہے اگر اس کے خلاف ہو گیا تو کفارہ دینا پڑے گا مثلاً قسم اٹھائی کہ تین ماہ اپنی بیوی کے قریب نہیں جاؤں گا اگر نہ گیا تو کوئی بات نہیں اگر تین ماہ سے پہلے چلا گیا تو کفارہ دینا پڑے گا اور اگر چار ماہ کی قسم اٹھائی ہے یا چار ماہ سے زائد کی یا اس کی کوئی مدت ہی متعین نہیں کی تو ان تینوں صورتوں میں اگر چار ماہ کے اندر توڑ دو گے تو کفارہ واجب اگر چار ماہ کے اندر نہیں توڑ و گے تو چار ماہ پورے ہوتے ہی احناف رحمہم اللہ کے ہاں طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی باقی ائمہ کے نزدیک طلاق واقع نہیں ہو گی۔

البتہ عورت قاضی کے پاس اس فیصلہ کو لے جائی گی قاضی خاوند کو کہے گا یا رجوع کر یا طلاق دے اگر خاوند دونوں باتوں سے انکار کردے تو قاضی اپنے طور پر طلاق دے دے گا، ہمارے ہاں چار ماہ گزرتے ہی طلاق ہوجائے گی گویا کہ رجوع نہ کرنا یہی عزم طلاق ہے۔

آپ فقہ کی کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ عورت کو جب طلاق ہوجائے تو اس کے فوراً بعد پھر عدت شروع ہوجاتی ہے تو آگے مسئلہ عدت کا ذکر کردیا۔

کس عورت کی عدت کتنی ہے؟

" والمطلقات يتربصن بانفسهن ثلثة قروء " یہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جن عورتوں کو طلاق دی جاتی ہے روک کے رکھیں اپنے نفسوں کو تین قروء (یعنی تین حیض) آپ کے سامنے چونکہ عدت کی تفصیلات ہیں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ تین حیض عدت ان ہی عورتوں کی ہے جو بالغہ ہوں جنہیں حیض آتا ہے اگر حیض والی عورت نہیں جیسے بچی ہے یا بوڑھی ہے جس کا حیض کا زمانہ ختم ہوگیا تو اس کی یہ عدت نہیں ہوگی ان کی عدت کا تذکرہ سورۃ طلاق میں آئے گا ان کی عدت تین ماہ ہے اور پھر اس میں یہ بھی آگیا کہ حیض والی عورت تین حیض اپنے نفس کو روک کر رکھے گی اگر وہ عورت حاملہ ہو تو وہ چونکہ حائضہ نہیں ہوتی اس لیے اس کی عدت وضع حمل ہے اس کا ذکر بھی سورۃ طلاق میں آئے گا اور ایسے ہی عدت ہوتی ہے اس عورت کی جس کے نکاح کے بعد خاوند کو اس کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوگیا ہو خلوت صحیحہ ہوگئی یا وطی ہوگئی تب عدت آیا کرتی ہے اور اگر طلاق دے دی گئی اور ابھی تک اس سے مس نہیں کیا پھر کوئی عدت نہیں ہے فوراً جدائی ہوجاتی ہے لہٰذا ان مطلقات سے مراد وہ عورتیں ہوں گی جن کا نکاح کے بعد خاوند سے ملنے کا اتفاق بھی ہوگیا ہو۔

اور اگر ملنے کا اتفاق نہ ہوا تو پھر عدت نہیں ہے اسی طرح پھر یہ تفصیل کرتے ہیں کہ تین حیض عدت حرہ کی ہے اگر باندی ہو تو باندی کی عدت نصف ہوتی ہے قاعدہ کے مطابق ڈیڑھ ہونی چاہیئے لیکن حیض کی چونکہ تنصیف نہیں ہوتی تو اس کو دو حیض قرار دے دیا گیا، اور اگر باندی ایسی ہو جس کی عدت مہینوں کے ساتھ ہو تو اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہوگی کیونکہ مہینوں کی تنصیف ہوسکتی ہے یہ قیدیں ساری کی ساری قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات کو دیکھتے ہوئے جو سرور کائنات ﷺ سے منقول ہیں لگائیں گے یہاں ہر عورت کی عدت بیان نہیں کی گئی بلکہ ان قیدوں کا لحاظ رکھنا ہوگا یعنی ایسی عورت جو کہ بالغہ ہو اور اس کو حیض آتا ہو حاملہ نہ ہو اور نکاح ہونے کے بعد خاوند کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا ہو اور حرہ ہو تب اس کی عدت یہ ہوگی کہ اپنے نفس کو وہ تین حیض روک کے رکھے۔

"ولایحل لھن الخ" اوران عورتوں کے لیے حلال نہیں کہ چھپا ئیں اس چیز کو جواللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے اگر وہ ایمان لاتی ہیں اللہ کے ساتھ اور یوم آخر کے ساتھ یعنی اگر وہ عورتیں مؤمن ہیں تو ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے ان کے رحموں کے اندر پیدا کیا ہے چھپا ئیں نہیں بلکہ ظاہر کردیں اگران کو حیض آرہا ہے تو بتادیں کہ ہمیں حیض آ گیا تا کہ عدت مشتبہ نہ ہو جائے اگر انہیں حیض نہیں آتا حمل ظاہر ہو گیا تو حمل بتادیں کیونکہ عدت کے بارے میں مدار عورت کے قول پر ہی ہوتا ہے وہ کہے کہ مجھے اب حیض آیا اور اب ختم ہو گیا اسی پر مدار رکھا جائے گا جس وقت وہ تین حیض بتادے گی تو عدت ختم ہو جائے گی اور اگر اس کو حیض نہیں آیا تو وہ طاہرہ ہے اور طہر کی مدت متعین نہیں وہ چھ ماہ بھی ہوسکتی ہے وہ جھوٹ بھی بولتی رہے کہ مجھے حیض آ گیا ختم ہو گیا، حیض آ گیا، ختم ہو گیا تو قاضی تو فیصلہ کردے گا کہ عدت ختم ہو گئی حالانکہ واقعہ کے اعتبار سے اس کو ایک حیض بھی نہیں آیا اس قسم کے جھوٹ بولنے کے ساتھ سارا معاملہ خلط ملط ہو جائے گا اس لیے اس کو کہا گیا ہے اگر تیرا ایمان اللہ پر اور یوم آخر پر ہے تو اس کو چھپانا نہیں ہے حمل ہے تو اس کو ظاہر کرا اور اگر حیض آرہا ہے تو کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا یہ بتا، کیونکہ عورت کے بیان پر ہی عدت کے ختم ہونے کا فیصلہ ہوگا۔

عدت کے اندر خاوند رجوع کرسکتا ہے:

عدت کے اندر جبکہ عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو ایک یا دو جیسا کہ مطلقات میں صراحۃً طلاق کا ذکر آیا ہوا ہے تو خاوند رجوع کرسکتا ہے رجوع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خاوند اپنی زبان سے کہہ دے کہ میں نے اپنے الفاظ واپس لیے، میں اپنی بیوی کے ساتھ رجوع کرتا ہوں تو رجوع ہو جائے گا، اور عملاً رجوع وہ ہوتا ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرے جیسا برتاؤ عام طور پر بیویوں کے ساتھ کیا جاتا ہے مثلاً بوس وکنار کرلیا، محبت کرلی تو بھی رجوع ہو گیا اور یہ حق خاوند کو ہے بیوی راضی ہو یا نہ ہو کیونکہ اصل حکم نکاح کے ختم ہونے کا لگانا ہے عدت کے ختم ہونے کے بعد اور جب تک عدت باقی ہے طلاق صریح میں نکاح باقی ہے، بائنہ میں نہیں، بائنہ میں عدت کے اندر بھی اور بعد میں بھی رجوع بالنکاح ہوسکتا ہے بشرطیکہ تین طلاقیں نہ دی ہوں اگر طلاق صریح دی ہوئی ہے جس کو ہم طلاق رجعی کہتے ہیں وہاں عدت کے اندر نکاح کی بھی ضرورت نہیں بلکہ خاوند کا یہ کہنا کہ میں طلاق واپس لیتا ہوں اس سے رجوع ہو گیا، یہی مسئلہ آگے ذکر کیا گیا ہے۔

"وبعو لتھن احق بردھن الخ" اوران کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں ان کو لوٹانے کا اس مدت کے اندر اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں اصلاحاً کی شرط ان کی راہنمائی کے لئے ہے یعنی رجوع تو ہو جائے گا اگر چہ تنگ کرنے کا

ارادہ ہی ہو لیکن تنگ کرنے کی نیت سے رجوع کرنا جائز نہیں ہے اگر کوئی کرے گا تو شریعت نے خاوند کو حق دیا ہے رجوع ثابت ہو جائے گا لیکن گناہ گار ہوگا۔

اسلام نے انسان ہونے کی حیثیت سے عورت کے مقام کو ممتاز کیا ہے؟

"ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف" عورتوں کیلئے ہے مثل اس چیز کی جو عورتوں کے ذمہ ہے، اس میں قرآن کریم نے ایک بہت بڑا اصلاحی پروگرام دیا، اس زمانہ کے اعتبار سے اس کی بہت اہمیت ہے کیونکہ سرور کائنات ﷺ جس وقت تشریف لائے تھے تو عورتوں کو کسی قسم کی عزت حاصل نہیں تھی ان کو جانوروں کی طرح سمجھا جاتا تھا ماں باپ کے مال کی وارث نہیں قرار دی جاتی تھیں، بلکہ بیوی ہونے کی حیثیت سے خاوند کی وارث بھی نہیں ہوتی تھیں بلکہ خاوند کے فوت ہونے کے بعد جب اس کی وارثت تقسیم ہوتی تو بیوی بھی ساتھ ہی ورثاء کے قبضہ میں چلی جاتی، چاہے وہ اپنے نکاح میں رکھیں، چاہے وہ ان کا دوسری جگہ نکاح کر کے مہر وصول کر لیں نہ ان کو مال میں تصرف کا حق ہوتا تھا نہ جان میں تصرف کا حق ہوتا تھا، اسلام نے آکر عورت کے مقام کو ممتاز کیا اور اس کو انسان ہونے کی حیثیت سے برابر کا مقام دیا۔

لیکن برابر کا مقام دینے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مغربی تہذیب کی طرح عورت کو بالکل ہی آزاد کر دیا جائے کہ مرد کی حکومت بھی اس کے اوپر نہ رہے، عورت کے بارے میں یہ دو قسم کے جرائم ہمیشہ مخلوق نے کیے ہیں یا تو اس کو انتہائی ذلیل کیا یا پھر اس کو برابری کی سطح پر اتنا چڑھایا کہ مرد پر بھی غالب آگئی اور یہ دونوں چیزیں ہی نظام عالم کو برباد کرنے والی ہیں اگر آپ غور کریں گے تو آپ کے سامنے یہ بات آئے گی کہ دنیا کے اندر دو چیزیں ایسی ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن وہ دونوں بہت بڑا فتنہ ہیں ایک عورت اور دوسرا مال نہ تو مال کے بغیر اس دنیا کی آبادی رہ سکتی ہے مال بھی اس زندگی کے اندر نہایت اہم چیز ہے، اور نہ عورت کے بغیر اس دنیا کی آبادی کا توازن برقرار رہ سکتا ہے عورت بھی اس دنیا کی آبادی میں بہت بڑا کردار ادا کرتی ہے، دونوں ہی انسان کی زندگی میں ضروری ہیں لیکن یہ دونوں بہت بڑا فتنہ بھی ہیں اس لیے حدیث شریف میں دونوں کے متعلق ہی ارشاد فرمایا گیا ہے، قرآن کریم میں بھی ہے" انما اموالکم واولادکم فتنۃ " اور ایک جگہ ازواج کا ذکر بھی ہے، اور حدیث شریف میں" فتنۃ النساء " کا ذکر کثرت سے موجود ہے کہ عورت بہت بڑا فتنہ ہے اس سے ہوشیار رہا کرو، بنی اسرائیل کے اندر بھی فتنہ عورت کی وجہ سے ہوا تھا اور ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ میں نے جتنی چیزیں چھوڑی ہیں ان میں سے سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والی عورت ہے، ہوشیار آدمی کی عقل کو زائل کر دینے والی ہیں تو مال اور عورت دونوں دنیا کی زندگی میں نہایت ضروری، ان کے بغیر دنیاوی زندگی نہیں گزرتی۔

لیکن دونوں ہیں فتنے اس لیے ان کے متعلق ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے آج اگر دنیا کے اندر دیکھو گے

کہ جتنے لڑائی جھگڑے اور فساد ہیں یا تو مالی جھگڑے ہیں یا عورت کے پیچھے لڑتے ہیں شریعت نے اس بارے میں اعتدال بتایا ہے وہ یہ ہے کہ نہ تو ان کو جانور سمجھو یہ تمہاری شکل کی ہیں جس طرح تم آدم علیہ السلام کی اولاد ہو یہ بھی آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اس حیثیت سے تم دونوں برابر ہو سورۃ نساء کی پہلی آیت کے اندر یہی ذکر کیا گیا ہے، مرد کے لیے اس کو سکون کی چیز بنایا گیا ہے اور آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے اعتبار سے اس کے حقوق مرد کے برابر ہیں۔

معاملات میں مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے:

لیکن عورتوں کے اوپر مردوں کی برتری قائم رکھی '' الرجال قوامون علی النساء'' عورتوں کے اوپر یہ حاکم ہیں، عورتوں کو سنبھالنے والے ہیں، حکومت مرد کی برقرار رکھی، اور عورت کو مرد کے ماتحت قرار دے دیا، دونوں باتوں کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو پھر عورت دنیا کے اندر فتنہ نہیں بن سکتی اس لیے یہاں جو کہا گیا ہے کہ عورتوں کیلئے بھی حقوق ہیں جیسے حقوق ان کے ذمہ ہیں، وجود کے اندر حقوق برابر ہیں۔

اگر چہ حقوق کی نوعیت مختلف ہے یہ نہیں کہ جیسا حق مرد کا ہے ویسا ہی حق عورت کا ہے، عورت محکومہ ہے اور مرد کو اللہ تعالیٰ نے حاکمیت دی ہے، اس کو درجہ کے اعتبار سے فضیلت دی ہے، عورت کے ذمہ ہے خاوند کی اطاعت، خاوند کے ذمہ اطاعت نہیں ہے لیکن وجود کے اندر اس کے حقوق بھی ہیں کہ اس کے کھانے کا خیال کرو، اس کے لباس کا خیال کرو، اس کی رہائش کا خیال کرو اور کبھی اگر آپس میں اختلاف ہو جائے تو اس کو مارنے پیٹنے کی کوشش نہ کرو کبھی تنبیہ کرنی بھی پڑ جائے تو ہلکے انداز سے تنبیہ کرو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہیں اس لیے ان کی طبیعت میں کچھ نہ کچھ کجی ضرور ہوتی ہے اس کجی کو برداشت کرتے ہوئے ان سے استمتاع کیا کرو۔

اگر بالکل سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی، اور ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری آپس میں جدائی ہو جائے گی بالکل اس کو سیدھا کر لو اور اس میں کجی نہ رہے ایسا ممکن نہیں ہے، عورت کی فطرت میں کچھ نہ کچھ کجی ضرور رہتی ہے بلا وجہ خاوند سے جھگڑا کرلے گی اور خاوند کے رشتہ داروں سے جھگڑا ڈال لے گی اس کو برداشت کیا کرو اس کو اگر پوری طرح سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی تو یہ ایسی اعتدال کی راہ ہے اس کو اگر اپنا لیا جائے تو عورت کی عزت اپنی جگہ بحال، ماں ہونے کے طور پر اس کا احترام انسان کے ذمہ، بیٹی ہونے کے طور پر یہ شفقت کا تقاضہ کرتی ہے۔

بہن ہونے کے طور پر یہ محبت کا تقاضہ کرتی ہے، اور بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کے حقوق ہیں گویا کہ

ایک عورت کے ساتھ مردوں کے چار قسم کے تعلق ہوگئے کسی کی یہ ماں ہوگی ماں ہونے کی وجہ سے وہ اس کا احترام کرے، کسی کی بہن ہوگی بہن ہونے کے طور پر وہ اس کے ساتھ محبت کرے، کسی کی یہ بیٹی ہوگی باپ ہونے کے طور پر وہ اس کے ساتھ محبت کرے، کسی کی یہ بیوی ہوگی تو خاوند کے ذمہ اس کے حقوق لگا دیے، تو کتنا اس کی راحت کا انتظام کر دیا، ہر قسم کی معاشرے کے اندر اس کو عزت دے دی لیکن عملی زندگی کے اندر یہ محکوم ہے، مرد کے برابر اس کو اس طرح نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ وہ اپنے اوپر مرد کی حکومت بھی تسلیم نہ کرے اگر اس طرح اس کی رسی ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو پھر دنیا کے اندر فساد ہی فساد ہے پھر دنیا کے اندر کسی طرح امن قائم نہیں ہوسکتا تو بالکل آزادی اور دنیا کے اندر ان کی مردوں کے برابر حیثیت شریعت اس چیز کو برداشت نہیں کرتی۔

عورت کی راحت بھی اس کی محکومیت میں ہے:

ہاں البتہ حقوق اس کے اتنے رکھ دیے کہ اگر مرد ان حقوق کو ادا کرے تو یہ دنیا کے اندر سکون سے وقت گزارے گی، راحت سے زندگی گزارے گی پھر اس کیلئے کوئی پریشانی نہیں ہے، برابر ہونے کی حیثیت اگر دو کہ جیسے مرد کماتا ہے عورت بھی کمائے جس طرح آج کل یہ نظریہ ہے کہ دکان داری بھی عورتیں کریں، کارخانوں میں عورتیں کام کریں، بازار میں خرید وفروخت کریں یہ ان کے اوپر ظلم ہے یہ ان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ عورت بازار جانے کو اپنی آزادی سمجھتی ہے، یہ آزادی نہیں فطرت کے خلاف بات ہے عورت کا بدن بھی اس قسم کی مشقت کا متحمل نہیں پھر اس معاشرے میں عورت پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے خاوند کے حقوق ادا کرنے کی حمل اٹھانے کی، پھر بچوں کو پالنے کی یہ ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ ان کے ساتھ عورتوں کو معاشی ذمہ داری نہیں سونپی جاسکتی اگر معاشی ذمہ داری سونپی جائے گی تو گھریلو زندگی برباد ہوجائے گی، عورت بچوں سے گھبرانے لگ جائے گی، اور پھر بچے نوکروں کے سپرد کیے جائیں گے، بچے کی صحیح تربیت کسی صورت میں نہیں ہوسکتی ورنہ خاوند اگر ایک دفعہ بیوی کے پاس چلا جائے اور اس کے نتیجہ میں عورت حاملہ ہوجائے تو دو سال کیلئے عورت مشغول ہوجاتی ہے۔

حمل کے زمانے میں بھی وہ کسی کام کی نہیں رہتی پھر بچہ جننے کے بعد چالیس دن تک اس کی کمزوری نہیں جاتی، اس کے بعد بچہ کو دودھ پلوانے کا زمانہ آگیا تو اگر عورت ان کاموں کو سنبھالے گی تو معاشی ذمہ داریاں وہ پوری نہیں کرسکتی اس لیے اسلام نے یہ اعتدال کا راستہ بتایا ہے کہ عورت انسان ہونے کے اعتبار سے تمہارے برابر ہے لیکن معاملات میں عورتوں کے اوپر مردوں کو فوقیت حاصل رہے تب تو نظم ٹھیک رہے گا" لھن مثل الذی علیھن " جیسی ذمہ داری ان عورتوں پر ہے اسی طرح ان کیلئے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں معروف طریقہ سے، جو شریعت میں جانے پہچانے ہیں " وللرجال علیھن درجۃ "مردوں کے لیے عورتوں کے اوپر فضیلت ہے اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ

طلاق دو مرتبہ ہے پھر روک لینا ہے اچھے طریقے سے یا رخصت کر دینا ہے اچھے طریقے سے

وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـــًٔا اِلَّآ اَنۡ يَّخَافَآ

اور حلال نہیں تمہارے لیے کہ لو تم کچھ بھی اس میں سے جو تم نے ان عورتوں کو دیا ہے مگر ایسے وقت میں کہ خاوند، بیوی دونوں اندیشہ کریں

اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ

کہ وہ نہیں قائم رکھ سکیں گے اللہ کے ضابطوں کو پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ زوجین اللہ کے ضابطوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ

تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس مال میں جس کے ساتھ وہ عورت اپنے کو چھڑائے یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں

فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ

پس تم ان سے تجاوز نہ کیا کرو، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ان ضابطوں سے تجاوز کرے گا پس یہی لوگ

الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ

ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾ پھر اگر وہ اس عورت کو طلاق دے دے تو وہ عورت حلال نہیں اس کیلئے تیسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد یہاں تک کہ نکاح کرے وہ

زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ

اس کے علاوہ اور خاوند سے پھر اگر یہ دوسرا خاوند اس عورت کو طلاق دے دے پھر کوئی گناہ نہیں اس بیوی اور پہلے خاوند پر کہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کرلیں

اِنۡ ظَنَّآ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

اگر ان دونوں کا خیال ہو کہ وہ اللہ کے قاعدوں کو قائم رکھیں گے اور یہ اللہ کی حدود ہیں بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو

لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ

ان لوگوں کیلئے جو علم رکھتے ہیں ﴿۲۳۰﴾ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو پھر وہ اپنے وقت مقررہ کو پہنچنے لگیں

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ

تو تم ان کو روک لیا کرو معروف طریقے سے یا چھوڑ دیا کرو معروف طریقے سے اور نہ روکا کرو ان عورتوں کو

ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا

نقصان پہنچانے کیلیے تاکہ تم زیادتی کرو اور جو کوئی ایسا کام کرے گا پس تحقیق اس نے اپنے اوپر ہی ظلم کیا اور نہ

تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ

قرار دیا کرو اللہ تعالیٰ کے احکام کو مذاق یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے اور یاد کرو اس چیز کو جو اتاری

عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

تم پر اللہ تعالیٰ نے کتاب سے اور حکمت سے اس بات کے ساتھ اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو

اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۳۱﴾

تفسیر:

نکاح اور طلاق کی حکمتیں اور ضوابط:

عورتوں کے متعلق احکام کا سلسلہ شروع ہے اس رکوع سے طلاق کے متعلق کچھ ہدایات دی جارہی ہیں اس دنیا کی آبادی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کی رعایت رکھتے ہوئے مرد وعورت کو آپس میں جوڑا ہے۔

یعنی مرد کا رجحان عورت کی طرف اور عورت کا رجحان مرد کی طرف یہ فطری چیز ہے جس طرح تمام حیوانات میں نر کا رجحان مادہ کی طرف اور مادہ کا رجحان نر کی طرف ہوتا ہے اب اگر اس سلسلہ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جو عورت جس مرد کے ساتھ چاہے اپنی خواہش پوری کرلے اور جو مرد جس عورت سے چاہے اپنی خواہش پوری کرلے تو پھر انسان اور حیوان کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت جو قوم اور قبیلوں کے بنانے سے ہے وہ بھی متحقق نہ ہوتی، انسان بھی جانوروں میں سے ایک جانور ہوتا، حیوانوں میں سے ایک حیوان ہوتا جس طرح حیوانوں کی نسل چلتی ہے نر اور مادہ کے ملنے کے ساتھ لیکن ان میں کوئی قوم کوئی خاندان، کوئی قبیلہ نہیں ہوتا، جہاں جس کا تقاضہ ہوتا ہے وہ اپنی اس خواہش کو پوری کرلیتا ہے اس کے ساتھ آگے نسل کا بڑھنا تو متحقق ہوگیا۔

لیکن ان میں کسی قسم کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اس طرح آزاد چھوڑنا یہ حیوانیت ہے اس میں انسان کا کوئی شرف نمایاں نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو اشرف المخلوقات بنایا تو ان کے لیے اس خواہش کو پورا کرنے

کے لیے ایک نہایت مہذب قاعدہ بنادیا اوراس کے اوپر کچھ پابندیاں عائد کردیں کہ مرد وعورت کا آپس میں تعلق شرافت کے تحت ہونا چاہیئے اوراس تعلق کی کوئی اہمیت ہونی چاہیئے، جانوروں کی طرح صرف قضاء شہوت کا ذریعہ نہ ہوکہ نہ اس کے بعد مرد کسی قسم کی ذمہ داری محسوس کرے اور نہ ہی عورت کا خاص آدمی کے ساتھ تعلق ہونے کی بناء پر اس کی ضرورت کا کوئی کفیل ہو بلکہ اللہ تعالیٰ نے کچھ قاعدے اور ضابطے بنائے اور نکاح کو صرف دنیاوی معاملہ قرار نہیں دیا بلکہ اس کے اندر عبادت کا معنی بھی پیدا فرمایا جس طرح آپ جانتے ہیں کہ جمہور کے نزدیک نکاح بھی عبادت کا ایک شعبہ ہے اس لیے نکاح کرنا عبادت ہے، سرور کائنات ﷺ کی سنت ہے جیسا کہ فرمان نبوی ہے''اتزوج النساء فمن رغب عن سنتي فليس مني ''(سنن نسائی ص ۵۸ ج ۲) ان قاعدوں اور ضابطوں کی تفصیل قرآن وحدیث میں بھی موجود ہے اور فقہ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

پہلا ضابطہ:

یہ ہے کہ ہر عورت ہر مرد کیلیے حلال نہیں بلکہ بعض عورتیں حلال ہیں اور بعض عورتیں حرام ہیں جس کی تفصیل قرآن مجید میں بھی ہے اور حدیث شریف میں بھی ہے اس میں بھی ایک عظمت اور شرافت کا پہلو ہے کہ خاص خاص تعلقات اگر عورتوں کے ساتھ ہوں تو ان عورتوں کو پھر نکاح کے لیے مرد کے واسطے حلال نہیں ٹھہرایا گیا اور پھر نکاح کرنے کے لیے کچھ قاعدے بتائے کہ یہ کوئی خفیہ معاہدہ نہیں کہ اندر بیٹھ کر مرد عورت آپس میں بات طے کرکے پھر قضاء شہوت کرلیں اس کی اجازت نہیں دی گئی اگر یہ خالص معاملہ ہوتا تو طرفین آپس میں مختار ہوتے جب چاہے کرلیتے رات کو کرتے، دن کو کرتے، خفیہ کرتے، سامنے کرتے اور جب چاہے اس کو توڑ دیتے تو ایسے ان کا بھاؤ کیا جاتا جیسے گاجر اور مولی کی ''بیع وشراء'' ہوتی ہے پھر اس میں یہ پابندی بھی لگائی گئی کہ یہ خفیہ نہیں ہوسکتا علی الاعلان کرنا پڑتا ہے اس میں کم از کم دو گواہوں کا موجود ہونا ضروری ہے اور پھر اس میں عورت کے حقوق کی تفصیل بتائی، مرد کے حقوق کی تفصیل بتائی، شریعت کا اصل منشاء یہ ہے کہ مرد وعورت کا آپس میں جوڑ جو لگے یہ دائماً نشاط اور سرور کا ذریعہ بنے اور قوم اور قبیلے کے پھیلنے کا باعث ہو، دنیا کی آبادی کا باعث ہو اس لیے جوڑنے کے جذبہ کے تحت یہ نکاح ہوتا ہے اور ہمیشہ زندگی بھر اس تعلق کو قائم رکھنے کیلیے ہوتا ہے، اس میں توڑنے کا پہلو نہیں ہوتا۔

ایسے حالات اختیار کیے گئے کہ زوجین کا تعلق قوی سے قوی ہو اور دائماً قائم رہے، نکاح ہوجانے کے بعد ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہوئے اگر زندگی گزاریں تو شریعت کا عین مطلوب ہے لیکن بسا اوقات یہ جوڑ لگانے میں تجویز کی غلطی ہوجاتی ہے کہ مرد اور عورت کا مزاج آپس میں یکسانیت نہیں رکھتا یا کچھ اور عوارض بھی

پیش آسکتے ہیں جس کی بناء پر اگر ان کو زبردستی جوڑے رکھنے کی کوشش کریں گے تو سوائے اس کے کہ دونوں کی زندگی تلخ ہو اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، اب اگر علیحدگی کے لیے کوئی ضابطہ نہ بنایا جاتا تو یہ بھی فطرت کے ساتھ ایک جنگ ہے کہ ایک مرتبہ جوڑ لگانے کے بعد کوئی صورت ہی نہیں چاہے لڑیں چاہے مریں تو اس طرح مرد اپنی جگہ انتہائی تنگ ہوگا اور بسا اوقات عورت اپنی جگہ انتہائی تنگ ہوگی اور نکاح کے اندر جو حکمتیں اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھی ہیں کہ انسان امن کے ساتھ، چین کے ساتھ، سرور کے ساتھ زندگی گزارے اور گھروں کے اندر سرور اور نشاط کی کیفیت ہو یہ حکمت باطل ہو جاتی ہے اگر ناگزیر حالات میں بھی علیحدگی کی اجازت نہ دی جائے۔

اس لیے شریعت نے اس نکاح کو ختم کرنے کا طریقہ بھی بتایا جس کو طلاق، خلع، یا نسخ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اور اجازت تو دے دی لیکن اس کو ناپسندیدہ قرار دیا، اس لیے ناگزیر حالات میں ہی کوئی شخص اس سے فائدہ اٹھائے عورت کو کھیل نہ بنا لیا جائے اس لیے اس علیحدگی کیلئے بھی شریعت نے بڑے کڑے اور سخت ضابطے مقرر فرمائے حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں ''ابغض الحلال الی اللہ الطلاق'' (مشکوٰۃ ص ۲۸۳ ج ۲) کہ جو چیزیں حلال ہیں لیکن ان حلال میں سے سب سے زیادہ قابل نفرت چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے کہ اگر کوئی شخص اس کو حلال سمجھ کے استعمال کرنا چاہے تو ذہن میں یہ بات رہے کہ اگرچہ حلال کردی گئی ہے لیکن ہے اللہ کو ناپسندیدہ اس لیے جب تک ناقابل برداشت صورت پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک یہ نوبت نہ آئے، کیونکہ شریعت آپس میں جوڑنا چاہتی ہے، توڑنا نہیں چاہتی، توڑنے کیلئے بہت سخت پابندیاں لگادی گئیں کہ اگر ایسا کرو گے تو پھر یہ توڑنا تمہارے لیے صحیح ہے اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجاؤ گے۔

طلاق دینے کا احسن اور مسنون طریقہ:

اب یہاں سے زوجین کے تعلق کو توڑنے کے قاعدوں کی وضاحت کی جارہی ہے جاہلیت میں رواج تھا کہ ایک شخص طلاق دیتا، طلاق دینے کے بعد پھر رجوع کر لیتا، طلاق دیتا بیوی کو تنگ کرنے کیلئے لیکن جب اس کی عدت ختم ہونے لگتی پھر رجوع کر لیتا تاکہ یہ کسی اور سے نکاح نہ کر سکے اور رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا پھر دوبارہ طلاق دے دیتا پھر جب عدت ختم ہونے لگتی پھر رجوع کر لیتا اس طرح عورت کو درمیان میں لٹکائے رکھتے تھے اور بدترین قسم کی سزا عورت کو دیتے تھے اور کوئی حد متعین نہیں تھی کہ کتنی دفعہ وہ طلاق دے دیں اور کتنی دفعہ رجوع کر لیں، اس میں عورتوں کے اوپر ظلم تھا، عورتوں کے حقوق تلف ہوتے تھے، نہ وہ شوہر والی سمجھی جاتیں

نہ بلا شوہر سمجھی جاتیں شوہر والی اس لیے نہ سمجھی جاتیں کہ شوہران کے ساتھ شوہر والا تعلق نہ رکھتا، بلا شوہر اس لیے نہ سمجھی جاتیں کہ نکاح کی قید موجود ہوتی اس ظلم وستم کا خاتمہ اللہ تعالیٰ نے کیا کہ ایسی طلاق جس کے بعد رجوع کیا جا سکتا ہے وہ دو مرتبہ ہو سکتی ہے ایک مرتبہ طلاق دے دو تو اس کے بعد بھی تمہیں رجوع کا حق ہے، دو مرتبہ طلاق دے دو پھر بھی رجوع کا حق ہے۔

لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق دے دی تو پھر رجوع کا حق نہیں رہا بلکہ آپس میں رضامندی کے ساتھ بھی نکاح کرنا چاہیں گے تو نکاح نہیں ہو سکتا یہ پابندی لگا دی اور تین درجے اس لیے رکھے تاکہ اگر کوئی شخص غصے میں آ کر طلاق دے ہی دے اور اس کے بعد سنبھل جائے تو سنبھلنے کے بعد پھر اصلاح احوال کی گنجائش ہے یہی وجہ ہے کہ احسن طریقہ سنت کے مطابق یہی ہے کہ جب بھی کوئی ایسی نوبت آ جائے سوچ بچار کر کے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے نصیحت سے کام لے اگر نصیحت سے کام نہیں چلا تو پھر تنبیہ سے کام لے اور اگر تنبیہ سے بھی کام نہیں چلا تو ''حکماً من اهله وحكماً من اهلها'' پنچایتی صورت اختیار کی جائے کہ مرد وعورت کے خاندان میں سے فیصل متعین کر دیے جائیں جو اس جھگڑے کو ختم کرنے کی کوشش کریں ان سب صورتوں کے ناکام ہو جانے کے بعد پھر نوبت طلاق کی آئے گی پھر بھی طلاق ایسے انداز سے دو کہ صرف ایک دفعہ طلاق دو تاکہ بعد میں عدت کے اندر رجوع کرنے کی گنجائش ہو۔

اور اگر دوبارہ طلاق دینی ہے، تو دوسری طلاق بھی اسی طرح صریح لفظ سے دو تب بھی عدت کے اندر دوبارہ رجوع کرنے کی گنجائش باقی رہے گی اور اگر تیسری طلاق دے دی تو پھر تم نے اپنا سارا حق استعمال کر لیا اس کے بعد اب رجوع کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی بلکہ اب رضامندی کے ساتھ بھی نکاح کرنے کی گنجائش نہیں ہے لیکن تین پوری ہونے سے قبل اگر عدت گزر جائے اور نکاح کا تعلق ختم ہو جائے اس کے بعد رضامندی سے نکاح ہو سکتا ہے لیکن تین پوری ہونے کے بعد رضامندی سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا یہ ترتیب اس لیے قائم کر دی تاکہ جلد بازی میں کوئی اپنا نقصان نہ کر بیٹھے درجہ بدرجہ آگے کو بڑھو تاکہ ندامت ہونے کی صورت میں اس کے تدارک کی گنجائش باقی رہے، باقی طلاق کا سنت طریقہ کیا ہے؟ یہ سب احکام فقہ کے اندر موجود ہیں۔

طلاق ثلاثہ پر غیر مقلدین کا اختلاف اور سعودی عرب کا قانون:

اور اس بات کے اوپر فقہاء اربعہ بلکہ ساری امت کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص تین طلاقیں بیک وقت دے دے تو وہ واقع ہو جاتی ہیں اگرچہ اس نے ناجائز کام کیا، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کام کیا، سرور کائنات ﷺ

کے نزدیک ناراضگی کا کام کیا لیکن تین طلاقیں دینے کی صورت میں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اس میں موجودہ دور کے غیر مقلد اختلاف کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تین طلاقیں اکٹھی دے دی جائیں تو ایک ہی سمجھی جاتی ہے۔

لیکن یہ اجماع امت کے خلاف ہے، ائمہ اربعہ کا بھی اس بات پر اتفاق ہے اور جمہور فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ہی اس پر اتفاق ہو گیا تھا، پچھلے دنوں جب میں عمرے پر گیا تھا تو وہاں مدینہ یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا وہاں اس مسئلہ کی کچھ تفصیلات معلوم ہوئیں کہ وہاں کے سب سے بڑے عالم بن باز ہیں اور آج کل ان کی حیثیت ویسے بھی قاضی القضاۃ کی ہے پہلے وائس چانسلر تھے یونیورسٹی میں وہ بھی تین کو ایک قرار دیتے تھے جس کی وجہ سے وہاں غیر مقلد اس مسئلہ کو بہت اچھالتے تھے اور مدینہ منورہ کا جو قاضی ہے مسجد نبوی کا امام اس کا مسلک تھا کہ تین تین ہی ہیں ایک نہیں ہے ان کی آپس میں کچھ نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

سعودی عرب میں ایک طریقہ جاری ہے کہ جس وقت کوئی مسئلہ پیش آجائے تو اس کو علماء کے مجمع میں پیش کرتے ہیں، ایک مجلس مشاورت ہے، اس میں اس مسئلہ کو پیش کرتے ہیں پوری بحث کے بعد جو طے ہو جائے وہ سعودی عرب کا قانون بن جاتا ہے تو یہ مسئلہ بھی اس مجلس میں پیش ہوا، ان ارکان میں بن باز بھی ہیں، انہوں نے اپنا مطالعہ ضبط کیا اور پھر اجتماعی طور پر اس مسئلہ پر بحث ہوئی بحث ہونے کے بعد جو فیصلہ قرار دیا گیا ''المقرر'' کے عنوان سے وہ یہی ہے کہ تین تین ہیں اور تین ایک نہیں اس مسئلہ سے اختلاف پر بن باز نے اختلافی نوٹ لکھا لیکن اکثریت کی رائے کے ساتھ یہ بات طے ہو گئی کہ تین تین ہی ہیں جس کے بعد پھر سعودی عرب میں اب یہ قانون بن گیا کہ اگر کوئی شخص ایک دفعہ بھی تین طلاقیں دے دے تو تین ہی واقع ہوں گی ان کی ساری بحث اور ان کا سارا مواد کتابی شکل میں چھپ کر ان دنوں آگیا تھا اور ایک ہی نسخہ مدینہ یونیورسٹی کی لائبریری میں آیا تھا جو وہاں دیکھا اور ان سے طلب کیا کہ یہ دے دو تمہارے پاس تو اور آجائے گا وہ کہنے لگے نہیں چونکہ اور نسخے ابھی آئے نہیں ہیں اس لیے یہ نسخہ ہم نہیں دے سکتے ورنہ میرا خیال تھا کہ میں اس کو لے آتا (یہ رسالہ احسن الفتاویٰ ج ۵ میں چھپ گیا ہے) تو ''المقرر'' کے عنوان سے جو فیصلہ نقل کیا گیا وہ یہی نقل کیا گیا کہ تین تین ہی ہیں چنانچہ سعودی عرب میں اب یہ قانون بن گیا اور بن باز نے بھی اس کے خلاف فتویٰ دینا چھوڑ دیا چاہے اس کا مسلک وہی ہے لیکن وہ اس پر فتویٰ نہیں دے گا چنانچہ بعض حضرات نے پھر انہیں خط لکھا یہی مسئلہ پوچھنے کے لیے تو اس نے جواب یہی دیا کہ قاضی مدینہ سے رجوع کرو اور قاضی کا مسلک پہلے یہی تھا کہ تین تین ہیں چنانچہ اس مسئلہ کے طے ہونے کے بعد جو جمعہ میں نے مسجد نبوی میں پڑھا اس جمعہ میں مسجد نبوی کے امام نے خطبہ ہی اس مسئلہ پر دیا

اور وہ میرے پاس ریکارڈ ہے اور اس میں اس نے اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے جمہور کا مسلک پہلے یہی ہے اس میں اختلاف اگر کیا ہے تو اہل ظاہر نے کیا ہے اور اس کے بعد ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو لے کر یہ غیر مقلد بھی اسی طرح فتویٰ دیتے ہیں۔

مسئلہ تین طلاق پر غیر مقلدین علماء کا فتویٰ:

پچھلے دنوں یہاں بھی شہر (کہروڑپکا) میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک مرد نے اپنی عورت کو تحریری طلاق دی اس پر صریح طور پر تین طلاقیں لکھی ہوئی ہیں، صریح انداز میں یہ کہا ہوا ہے کہ میں نے اپنا تن تجھ پر حرام کیا ہوا ہے میرا اب اس کے ساتھ کوئی کسی قسم کا تعلق نہیں ہے پہلے وہ حضرت جاوید شاہ صاحب کے پاس لے کر آئے تو آپ نے کہا ہمارے نزدیک تو اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے بالکل نکاح نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ صورت اختیار نہ کی جائے جس کو حلالہ کہتے ہیں وہ اس مسئلہ کو لے گئے شہر کے ایک مولوی کے پاس گیا انہوں نے واضح طور پر لکھا کہ تین ایک ہیں تین نہیں اس لیے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے اس کے بعد وہ اس کو لے گئے مولوی عبداللہ اہل حدیث کے پاس اس نے الجواب صحیح لکھ کر اس پر دستخط کر دیئے، پھر وہ اس کو میرے پاس لے کر آئے، مجھے یہ نہیں بتایا کہ پہلے ہم حضرت شاہ صاحب سے بات کر گئے ہیں میں نے جب وہ اسٹام دیکھا تو میں نے کہا اس کی ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں چاہے غصہ میں دی چاہے رضامندی سے دی، تحریر اسٹام پر ہے اس کے ہوتے ہوئے قطعاً نکاح نہیں ہوسکتا جس وقت تک کہ حلالہ کی صورت اختیار نہ کی جائے پھر انہوں نے مجھے وہ مسئلہ نکال کر دیا کہ اس کو پڑھو کہ یہ کیسے لکھا ہوا ہے۔

میں نے کہا مجھے پڑھنے کی ضرورت نہیں میں جانتا ہوں کہ یہ لوگ اس قسم کے فتوے دیتے ہیں اگر تم حنفی ہو اور اپنے آپ کو مقلد کہتے ہو تو یہ قطعاً جائز نہیں اگر نکاح کر دو گے تو نکاح نہیں ہوگا اور یہ زندگی بھر کے لیے زنا ہوگا اس لیے ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں ہے وہ کہنے لگے دیکھو تو صحیح انہوں نے کیا دلائل دیئے ہیں میں نے کہا مجھے ان کے دیکھنے کی ضرورت نہیں یہ سب دلائل ہمیں زبانی یاد ہیں اور پھر باتوں سے ہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ مُصِر ہیں اور نکاح کرلیں گے اور وہ اس کی ذمہ داری اس مولوی صاحب پر اور اسی طرح مولوی عبداللہ غیر مقلد پر ڈالیں گے، انگریز کے دور میں بھی یہ مسئلہ کئی دفعہ عدالتوں میں زیر بحث آچکا ہے ہمارے حضرات نے ہمیشہ اس پر بحث کی ہے اور فیصلہ اسی طرح ہوا کہ تین تین ہی ہیں ایک نہیں۔

حلالہ کی حکمت، صورت اور اس کا مقصد:

پھر تین طلاقیں ہوجانے کے بعد بھی شریعت نے ایک اصلاح کی صورت باقی رکھی ہے اس کی صورت یہ بنادی جس میں طویل راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔

مقصد شریعت کا یہ ہے کہ تین طلاقیں ہو جانے کے بعد ان خاوند بیوی کی آپس میں ایک دوسرے سے توجہ ہٹ جانی چاہیئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جوڑ لگانے میں اتفاق کی امید نہیں اتنی مہلت دینے کے بعد پھر بھی ان کا معاملہ اسی طرح ہو یا طبیعت کی تیزی کی وجہ سے انہوں نے اس رائے سے فائدہ نہیں اٹھایا اور یک دم اپنا پورا حق استعمال کر لیا تو یہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو دوبارہ جوڑا جائے اصل مقصد شریعت کا یہ ہے کہ زوجین جنہوں نے تین طلاقوں کا حق استعمال کر لیا اب ایک دوسرے سے توجہ چھوڑ دیں یہ عورت کسی اور جگہ جا کے ہمیشہ ساتھ رہنے کی نیت کے ساتھ شادی کرے شادی ہونے کے بعد اگر اتفاق ایسا ہو گیا کہ دوسرا خاوند مر گیا یا دوسرے خاوند نے طلاق دے دی تو اب یہ دوبارہ اگر پہلے خاوند کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو اجازت ہے آپ جانتے ہیں جب اتنی مدت گزر گئی تو ندامت کے بعد پچھتانے کے بعد جب ان کو پتہ چل جائے گا کہ ہم اپنا اتنا نقصان کر بیٹھے ہیں تو آئندہ اس قسم کے جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کریں گے اور ذرا محتاط رہیں گے۔

ورنہ شریعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ اب اس مرد اور عورت کا تعلق کاٹ دیا جائے، ان کی توجہ ایک دوسرے سے ہٹا دی جائے عورت اطمینان کے ساتھ کسی اور جگہ جا کر نکاح کرے پھر کسی وجہ سے وہاں سے اگر جدائی ہو گئی یا وہ خاوند مر گیا اور اس کے ساتھ عورت والا تعلق قائم کرنے کے بعد اگر اتفاقاً جدائی ہو گئی پھر پہلے خاوند سے نکاح کیا جا سکتا ہے اصل مقصد تو یہ ہے جب یوں ہو جائے گا تو اس میں کوئی کراہت نہیں کوئی خباثت نہیں وہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اب قانون کا مقصد تو یہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس قانون کے پردہ میں اس نیت کے ساتھ اس عورت کا نکاح دوسرے سے کرتا ہے اور دوسرا بھی سمجھتا ہے کہ میرے پاس یہ صرف اس لیے بھیجی جا رہی ہے کہ بیوی بنا کے میں اس کو نہیں رکھوں گا نہ رکھنا مقصود ہے۔

بلکہ شریعت کے ایک ضابطہ کو ظاہری طور پر پورا کرنا مقصود ہے کہ نکاح ہو جائے ایک رات گزار لے وطی ہو جائے تو بعد میں طلاق ہو جائے گی تا کہ پہلے خاوند سے نکاح کر لے اگر اس قسم کا واقعہ پیش آ جائے تو فقیہ اس ظاہری واقعہ کی طرف دیکھتے ہوئے فتویٰ یہی دے گا کہ قرآن کریم کے ظاہر کا تقاضہ پورا ہو گیا اب اس پہلے خاوند کے ساتھ یہ نکاح کر سکتی ہے کیونکہ قانون کی ظاہری سطح کو پورا کر لیا گیا باقی اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ چونکہ نیت پر ہے اب اگر اس نیت سے نکاح کیا گیا ہے کہ صرف ایک ہی رات کے لئے جانا ہے پھر واپس آ جانا ہے اور نکاح کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ میں اس کو دائماً رکھنے کے لیے نکاح نہیں کر رہا بلکہ میں نے صرف اس کو ایک رات رکھنا ہے

پھر واپس کر دینا ہے اس قسم کا معاملہ حقیقت کے اعتبار سے عنداللہ لعنت کا باعث ہے گناہ ہے، حضور ﷺ نے اس طرح کرنے والے کو ''طیر مستعار'' کہا ہے جس طرح کرایہ کا سانڈھ لے لیا جائے، اور اس کو بے غیرتی اور بے حیائی قرار دیا اس لیے عنداللہ تو اس کی حیثیت بہت بری ہے، لعنت ہے، خباثت ہے، بے حیائی ہے، بے غیرتی ہے کرائے کا سانڈھ ہے باطنی حال یہی ہوگا لیکن ظاہری قانون پورا ہونے کے بعد مفتی فتویٰ دے دے گا کہ اب یہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہے قانون کی ظاہری سطح اور ہوا کرتی ہے باقی اس کو استعمال کرنے کے لیے دل کے جذبات کیسے ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان دل کے جذبات کا اعتبار ہوگا۔

حیلہ کے ساتھ شرعی حکم سے بچنا باعث لعنت ہے :

حیلے جتنے بھی ہیں سب کی یہی صورت ہے مثال کے طور پر زکوٰۃ واجب تب ہوتی ہے جب کسی شخص کے پاس مال ایک سال تک ملکیت میں رہ جائے آج مثال کے طور نیا سال شروع ہو رہا ہے، یکم محرم ۱۴۰۰ھ ہے آج کسی کی ملکیت کے اندر ایک ہزار روپیہ آ گیا اب جس وقت یہ سال گزرے گا تب زکوٰۃ فرض ہوگی سال پورا ہونے سے ایک ماہ قبل گیارہ ماہ پورے ہونے کے بعد وہ ایک ہزار اپنے بھائی کو ہدیہ کر دیتا ہے تو اب اس کی ملکیت میں چونکہ مال گیارہ ماہ رہا سال پورا نہیں ہو رہا تو زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی۔

اب وہ ہزار روپیہ اس بھائی کے پاس چلا گیا اب جس وقت اس پر گیارہ ماہ گزرے تو اس نے وہی ہزار اس بھائی کو ہبہ کر دیا اس کی ملکیت میں آ جائے تو زکوٰۃ اس پر بھی واجب نہیں ہوئی، پیسوں کو زکوٰۃ سے بچانے کیلئے اگر کوئی شخص اس طرح کر لے اگر تو اتفاقی بات ہے کہ میرے پاس دس ہزار تھا ابھی دس ماہ گزرے تھے زکوٰۃ کا وقت نہیں آیا تھا میں نے بطور امداد کسی کو دے دیئے تو یہ اتفاقی بات ہے عنداللہ بھی کوئی گناہ نہیں زکوٰۃ بھی کوئی نہیں آئی لیکن اگر زکوٰۃ سے بچنے کی نیت کے ساتھ یوں کیا گیا کہ ایک سال بیوی سب کچھ خاوند کو دے دے اگلے سال خاوند سب کچھ بیوی کو دے دے مقصد یہ ہو کہ زکوٰۃ واجب نہ ہو جس وقت مسئلہ کسی فقیہ کے پاس جائے گا، دارالافتاء میں مفتی کے پاس آئے گا تو وہ یہی لکھے گا کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ مفتی نیت سے بحث نہیں کرتا باقی اگر کسی شخص نے زکوٰۃ سے بچنے کے لئے یہ حیلہ ڈھونڈا ہے اور اس قانون کے پردے سے فائدہ اٹھایا ہے تو اللہ کے نزدیک یہ خباثت ہے اس کے اوپر ایسے ہی گناہ ہوگا جیسے تارک زکوٰۃ کا ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ آخرت کا ہے دنیا میں یہ بات زیر بحث نہیں آئے گی دنیا میں مسئلہ یہی بتایا جائے گا کہ جب سال نہیں گزرا ملکیت پر تو ایسی صورت میں زکوٰۃ فرض نہیں

ہے شرعی ضابطوں میں بھی یوں حیلے کر کے لوگ جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور ظاہری سطح کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے اوپر گرفت نہیں ہو سکے گی جیسے دنیا میں ہوتا ہے، پچھلے دنوں آپ نے سنا ہوگا کہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں مٹھائی لے جانے پر تو پابندی نہیں لیکن چینی منتقل کرنے پر پابندی ہے۔

اب اگر ایک صوبہ والے اسی کو مِسری بنا کر دوسرے صوبہ میں منتقل کر دیں اب مقصد تو ہے چینی منتقل کرنا لیکن اس کی ظاہری شکل مٹھائی والی بنالی اب قانون کے پردے سے بچ جائیں گے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ انہوں نے اپنا مفاد حاصل کر لیا قانون جو بنایا گیا تھا کہ لوگ یوں نہ کریں، اس حکمت کے یہ منافی ہوگئی لیکن ظاہری قانون کی گرفت میں نہیں آسکتے اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جس وقت تک انسان کا دل ودماغ مسلمان نہیں ہوتا قاعدوں اور ضابطوں سے کسی کو مسلمان نہیں کیا جا سکتا دل ودماغ مسلمان نہ ہو تو حیلہ کے ساتھ انسان ہر قاعدے سے بچ سکتا ہے کوئی نہ کوئی حیلہ اس قسم کا نکال لے گا جس سے ظاہری قانون سے بچ جائے گا لیکن دل اور دماغ میں اگر قانون کی عظمت موجود ہے اور انسان اس کی حکمت کو سمجھتا ہے تو اس قسم کی گڑ بڑ کرنے کی کوشش نہیں کرتا اب حلالہ کی اصل حقیقت تو یہ ہے۔

لیکن لوگوں نے اس قانون کی ظاہری سطح کو باقی رکھتے ہوئے حیلے کے طور پر یہ بھی کرنا شروع کر دیا ایسا کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ شادی ایک ہی رات کیلئے کی جارہی ہے اور نکاح کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ مجھے بیوی کے طور پر نہیں دیا جارہا محض اس حرمت کو ختم کرنا مقصود ہے اور وہ رات رکھتے ہیں صبح کو طلاق دے دیتے ہیں تو گویا کہ قانون کی ظاہری سطح پوری کر دی اور اس میں شریعت کی جو حکمت تھی اس کا لحاظ نہیں رکھا اب ایسا کریں گے تو پہلے خاوند کیلئے وہ حلال ہو جائے گی کیونکہ ضابطہ پورا کر دیا گیا۔

لیکن اس نیت کے فساد کے طور پر یہ فعل اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعث لعنت ہے تو یہ ہیں قاعدے اور ضابطے جو یہاں بتائے جارہے ہیں کہ بہت محتاط طریقہ کے ساتھ یہ معاملہ طے کرنا چاہیئے جوش میں آکر، جلد بازی میں انسان اپنے سارے حق کو استعمال نہ کرلے کہ اس کے بعد پھر پچھتاوا ہو اور اصلاح کی صورت نہ رہے یہ ہے طلاق کی تفسیر جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئی۔

خلع کی صورت اور اس کا حکم :

طلاق کا مسئلہ ذکر کرتے ہوئے درمیان میں خلع کا مسئلہ مذکور ہے عام حالات میں مرد کو چاہیئے کہ اگر

عورت کو طلاق دیتا ہے تو جو کچھ مہر میں عورت کو دے چکا اور اس کے علاوہ بھی جو کچھ دے چکا وہ واپس نہیں لینا چاہیئے یہ بات مرد کی مردانگی کے خلاف ہے جب اس نے اس سے استمتاع کر لیا، بیوی بنا کے اس کو اپنے گھر لے آیا اب جو کچھ اس کو محبت اور پیار کے انداز میں دیا تھا تعلقات کے دنوں میں دیا تھا اب اس کا واپس لینا یہ کوئی شرافت اور عقلمندی نہیں ہے لیکن اگر صورتحال ایسی پیدا ہو جائے کہ مرد سمجھتا ہے کہ قصوروار یہ عورت ہے میں اس کو رکھنا چاہتا ہوں یہ نہیں رہنا چاہتی اور عورت یہ سمجھتی ہو کہ قصوروار مرد ہے یعنی قصور مرد کا متعین نہیں اگر قصور مرد کا متعین ہو تو پھر کچھ واپس لینا حرام ہے لیکن اگر صورتحال ایسی پیدا ہو گئی کہ مرد سمجھتا ہے کہ میں تو رکھنا چاہتا ہوں یہ نہیں رہتی اور عورت یہ سمجھتی ہو کہ میں رہنا چاہتی ہوں یہ نہیں رکھتا اگر اس قسم کا حال پیدا ہو گیا کہ دونوں کا خیال یہ ہے کہ اب ہماری طبیعتوں میں اتنا اختلاف آ گیا کہ اب ہم اللہ کے قاعدوں کا لحاظ نہیں رکھ سکیں گے۔

معاشرت کے اصول ہم نہیں اپنا سکتے، ایک دوسرے کیلئے باعث راحت نہیں رہ سکتے ایسی صورت میں اجازت دے دی گئی کہ عورت کچھ دے کر اپنی جان چھڑا لے اور مال مقدار مہر سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے جتنا خاوند نے اس کو دیا ہے اس کے اندر اندر وہ معاملہ طے کر لیں تو یہ درست ہے یعنی ایسی صورت میں جب ظلم مرد کی طرف سے متعین نہ ہو پھر نہ اس مال کے دینے میں گناہ نہ لینے میں گناہ ہے اور حاکم کی عدالت میں اگر یہ فیصلہ چلا جائے وہ بھی اس طرح فیصلہ کرے گا کہ مہر کی مقدار کے اندر ہی معاملہ کیا جائے اور یہ علیحدگی طلاق بائنہ ہے اور اس کے بعد عدت اسی طرح گزارنی پڑے گی جس طرح طلاق کے بعد گزاری جاتی ہے لیکن اس میں رجوع نہیں ہو سکتا کیونکہ جب عورت نے مال دے کر طلاق خریدی ہے تو مرد کو واپس لینے کا اختیار نہیں ہے ہاں البتہ دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔

تفسیر باللفظ :

" الطلاق مرتان" یہاں سے طلاق صریح مراد ہے یعنی جس کے بعد رجوع ہو سکتا ہے یہ دو مرتبہ ہے مرتان کہنے میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ دو طلاقیں بھی یک دم نہیں دینی چاہئیں بلکہ مرۃ بعد مرۃ دینی چاہیئے جیسا کہ فقہ کے اندر تفصیل موجود ہے دو طلاقیں ہو جانے کے بعد بھی تم ان کو اچھے طریقہ سے روک سکتے ہو معروف طریقہ سے یعنی جس کا دستور شرفاء کے اندر ہے نقصان پہنچانے کے لیے روکنا نہ ہو یا اچھے طریقہ سے بھلائی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو رخصت کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ رجوع نہ کرو خود چلی جائے گی اور جاتے ہوئے اس کو کچھ نہ کچھ سامان جس کو لفظِ متعہ کے ساتھ فقہ کے اندر ذکر کیا گیا ہے اس کو دے کر رخصت کرنا چاہیئے۔

"فان خفتم " "اگر تم خوف کرو" یہ خطاب عام مسلمانوں کو ہے یا اس کے مخاطب حکام ہیں۔

"فان طلقها " یہاں طلقها سے تیسری طلاق مراد ہے۔

"حتی تنکح" یہاں نکاح سے عقد مراد ہے کیونکہ نسبت اس کی عورت کی طرف کی گئی ہے نکاح کی نسبت عورت کی طرف ہوتی ہے وطی کی نسبت عورت کی طرف نہیں ہوتی، وطی کرنا یہ فعل مرد کا ہے، عورت کے لیے وطی کرانا یہ لفظ عورت کے لیے استعمال ہوتا ہے کتاب اللہ سے تو صرف عقد ہی کا معنیٰ سمجھ میں آتا ہے باقی وطی کی زیادتی وہ صحیح روایت کے ذریعہ ہے اور متفق علیہ ہے کہ صرف عقد کرنا کافی نہیں کہ ایجاب وقبول ہو اور اس کے بعد طلاق دے دی بلکہ بیوی بنا کے اس کو رکھنا بھی مقصود ہے کہ اس کے ساتھ مجامعت بھی ہو جائے تب جا کے پہلے خاوند کے لیے وہ حلال ہوگی اس کی قید حدیث صحیح کے ساتھ لگائیں گے جو مجمع علیہ ہے "ولاتتخذوا أیٰت الله هزوا" اللہ کے احکام کو مذاق قرار نہ دیا کرو اور مذاق قرار دینے کی اگر ظاہری صورت ہو تو یہ بالکل کفر ہے اور یہ بھی مذاق بنانے والی بات ہے کہ ان کی عظمت دل میں نہ ہو اور حیلے بہانوں کے ساتھ ان سے بچنے کی کوشش کریں، یہ بھی تو ایک مذاق بنانے والی بات ہے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ

اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو پھر وہ اپنی اجل کو پہنچ جائیں پھر تم ان عورتوں کو روکا نہ کرو

اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

اس بات سے کہ وہ نکاح کرلیں اپنے تجویز کردہ خاوندوں سے جس وقت کہ وہ مرد و عورت راضی ہو جائیں معروف طریقہ سے،

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

یہ بات نصیحت کیا جاتا ہے اس کے ذریعہ سے وہ شخص جو تم میں سے ایمان لاتا ہے اللہ کے ساتھ اور یوم آخر کے ساتھ،

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

یہ بات جو تمہیں بتائی گئی ہے یہ تمہارے لیے ازکی اور اطہر ہے، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۳۲﴾

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ

بچہ جننے والی عورتیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو سال پورے یہ بات

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ

اس شخص کیلئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہے، اور اس شخص کے ذمہ جس کے لیے بچہ جنا گیا ہے

رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

ان عورتوں کی روزی ہے اور ان کا لباس ہے معروف طریقہ سے، کوئی نفس تکلیف نہیں دیا جاتا مگر اس کی وسعت کے مطابق،

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى

نہ نقصان پہنچائی جائے والدہ اس کے بچہ کے سبب سے نہ وہ شخص جس کیلئے بچہ جنا گیا ہے اپنے بچہ کے سبب سے، اور

الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا

وارث کے ذمہ بھی ایسی ہی چیز ہے، اگر والد اور والدہ ارادہ کرلیں دودھ چھڑانے کا ان دونوں کی طرف سے رضامندی

وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا

اور مشورے سے تو ان دونوں کے ذمہ کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم ارادہ کرو کہ دودھ پلواؤ

اَوۡلَادَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَيۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ

اپنے بچوں کو پھر بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب سپرد کر دو تم وہ چیز جو تم نے دینی ٹھہرائی ہے اچھے طریقہ سے ،

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَالَّذِيۡنَ

اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے (۲۳۳) اور جو لوگ

يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ

تم میں سے وفات دے دیے جاتے ہیں اور وہ بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیویاں روک کے رکھیں اپنے نفسوں کو چار

اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا

ماہ اور دس دن ، پھر جس وقت وہ اپنی مدت متعینہ کو پہنچ جائیں تم پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں جو

فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۳۴﴾

وہ کریں اپنے نفسوں میں معروف طریقہ سے ، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے (۲۳۴)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِهٖ مِنۡ خِطۡبَةِ النِّسَآءِ

تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس کا جو نکاح کا پیغام تم اشارۃً دے دو

اَوۡ اَكۡنَنۡتُمۡ فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُوۡنَهُنَّ وَلٰكِنۡ

یا نہیں گناہ تم پر اس چیز میں جس کو تم اپنے دلوں میں چھپا رکھو ، اللہ کو معلوم ہے کہ بے شک ضرور تم عورتوں کا تذکرہ کرو گے ،

لَّا تُوَاعِدُوۡهُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ؕ وَلَا تَعۡزِمُوۡا

لیکن نہ وعدہ کیا کرو ان عورتوں سے خفیہ طور پر مگر یہ کہ کہو تم قاعدے کے مطابق ، اور عزم نہ کیا کرو

عُقۡدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ

عقد نکاح کا جب تک کہ کتاب اپنے اجل کو نہ پہنچ جائے ، اور جان لو اللہ تعالیٰ جانتا ہے

مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُ ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع

ان چیزوں کو جو تمہارے دلوں میں ہیں پس اس سے ڈرتے رہا کرو ، اور یقین کر لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے (۲۳۵)

تفسیر

طلاق کے بعد زمانہ جاہلیت کی رسم اور آیت کا شان نزول :

عورتوں کے ساتھ معاملات کا سلسلہ چلا آ رہا ہے، پچھلے رکوع میں بھی طلاق اور عدت کے متعلق کچھ احکام ذکر کیے گئے ہیں اور یہ رکوع بھی اسی قسم کے احکام پر مشتمل ہے، پہلے طلاق کا مسئلہ واضح کیا گیا ہے، اس کے بعد رضاعت کے مسئلہ کی کچھ تفصیل ہے، اور اس کے بعد عدت وفات کا ذکر ہے، یہ تین مسئلے ہی اس رکوع میں بیان کیے گئے ہیں، طلاق کے مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ جاہلیت میں ایک رسم تھی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور پھر اس کی عدت بھی گزر جائے تو عدت گزر جانے کے بعد اگر وہ عورت کسی اور جگہ نکاح کرنا چاہتی تو یہ سابقہ خاوند رکاوٹیں ڈالتا تا کہ یہ عورت وہاں نکاح نہ کر سکے اور اس کو وہ اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا کہ پہلے یہ میری بیوی تھی اب یہ فلاں شخص کی بیوی بن جائے گی چاہے قانوناً وہ اس کی بیوی نہیں رہی۔

لیکن اس تعلق کی بناء پر اس کو وہ اپنی غیرت کے خلاف سمجھتا تھا کہ جو میری بیوی تھی اب وہ کسی دوسرے کی بیوی بن جائے، اور بسا اوقات یوں ہوتا تھا کہ ایک عورت اپنے خاوند کی طرف سے مطلقہ ہوگئی اور اس کی عدت گزر گئی نکاح ختم ہوگیا بعد میں وہی خاوند جس نے طلاق دی تھی اپنے کیے پر پشیمان ہوا اور عورت کا بھی دل پہلے خاوند کے ساتھ لگا ہوا تھا عدت گزر جانے کے باوجود، نکاح منقطع ہو جانے کے باوجود ان دونوں کا آپس میں رجحان ہوگیا پھر وہ چاہتے ہیں کہ ہم دوبارہ آپس میں نکاح کر کے اپنی اسی قسم کی زندگی اختیار کر لیں پھر عورت کے اولیاء رکاوٹ ڈالتے تھے کہ جس شخص نے پہلے ہماری بچی کو طلاق دے کر جدا کر دیا ہے اب ہم دوبارہ اس کے ساتھ نکاح نہیں کریں گے ایسے واقعات بھی پیش آئے اور عام طور پر پہلی طلاق کی بناء پر دلوں کے اندر عداوت کا پیدا ہو جانا یا لڑکی کا دوبارہ اس گھر میں جانا جس نے پہلے طلاق دے دی اپنی عزت کے خلاف سمجھنا اس قسم کے جذبات اس رکاوٹ کا باعث بنتے تھے۔

چنانچہ اس کے شان نزول میں ایسے واقعات لکھے ہوئے ہیں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں انہوں نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح کسی کے ساتھ کیا لیکن نباہ نہ ہو سکا ان کے بہنوئی نے ان کی بہن کو طلاق دے دی عدت ختم ہونے کے بعد اس کا پھر رجحان ہوا کہ میں اسی سے شادی کر لوں اور معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن کا رجحان بھی ادھر ہی تھا جس وقت اس نے معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے بات کی معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے ناراضگی کا اظہار کیا کہ میں نے تیری عزت کی تھی کہ اپنی بہن تیرے نکاح میں دے دی لیکن تو نے یہ قدر کی کہ تو نے اس کو طلاق دے دی کسی

صورت میں بھی میں اپنی بہن کا نکاح تجھ سے نہیں کروں گا اور قسم کھالی کہ ایسا نہیں ہو سکے گا پھر جس وقت یہ آیت اتری اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت کردی گئی کہ مرد و عورت کا اگر آپس میں رجحان ہو جائے تو روکا نہ کرو اس آیت کے سنتے ہی معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے پھر توبہ کی اور اپنی قسم کو توڑ دیا اس کا کفارہ دیا اور اپنی بہن کا نکاح اس کے سابق شوہر کے ساتھ کر دیا تفاسیر کے اندر یہ واقعہ بھی موجود ہے، اور غالباً جلالین میں بھی اس کے شان نزول میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے تو یہ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں کہ سابق خاوند کسی اور جگہ نکاح نہ کرنے دے اور رکاوٹ ڈال دے یا اولیاء سابق خاوند سے نکاح نہ کرنے دیں اور رکاوٹ ڈالیں۔

عدت کے بعد عورت کو نکاح ثانی سے روکنا جہالت ہے :

اور بعض خاندان ایسے ہیں جن میں یہ جہالت چلی آرہی ہے کہ اگر کوئی لڑکی پہلے خاوند سے بیوہ ہو جائے یا مطلقہ ہو جائے تو اس کو کسی دوسری جگہ نکاح ثانی کی اجازت نہیں دیتے اس کو بھی اپنی غیرت کے منافی سمجھتے ہیں کہ ہماری لڑکی مختلف شوہروں کے ہاں جائے راجپوتوں کے بعض خاندانوں میں ابھی تک یہ رسم چلی آرہی ہے اصل کے اعتبار سے یہ ہندوؤں والی رسم ہے کہ وہ نکاح ثانی کے قائل نہیں اور یہ راجپوت بھی چونکہ اصل کے اعتبار سے ہندو تھے اس قسم کی جاہلانہ رسمیں ان میں اب تک باقی ہیں یہ نکاح ثانی کے قائل نہیں ہیں ایسی صورت بھی پیش آسکتی تھی کہ لڑکی کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی طلاق کے بعد اس لڑکی کا رجحان ہے کہ میں نکاح ثانی کروں لیکن اولیاء اجازت نہیں دیتے اور اس کی منشاء بھی وہی جاہلانہ غیرت، جاہلانہ آکڑ اور اپنے ناک کو اونچا رکھنے کا جذبہ اور یہ خیال کرنا کہ ہماری لڑکی کا کہیں دوسری جگہ جانا بے غیرتی کا باعث ہے ایسے واقعات ہیں جن کے لیے یہ ہدایت دی گئی کہ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر اس کی عدت پوری ہو جائے اور وہ کسی شخص کو تجویز کرلیں کہ میں اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہوں اس میں دونوں صورتیں ہیں چاہے تجویز کردہ خاوند پہلا ہی ہو جس نے پہلے طلاق دی ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور ہو "لاتعضلوا" کا خطاب عام ہے پہلے ازواج کو بھی اور اولیاء کو بھی کہ پھر تم روکا نہ کرو جس وقت ان مرد و عورت کی آپس میں تراضی ہو جائے اور عرف شرع کے مطابق، شرفاء کے عرف کے مطابق ہو یعنی نکاح کیلئے جس قسم کے حدود و قیود متعین کیے گئے ہیں وہ ان حدود و قیود کے مطابق ہو کہ لڑکی اپنے ہمسر خاندان میں نکاح کرنا چاہتی ہے، مہر مثل کے ساتھ کرنا چاہتی ہے، عدت کے بعد کرنا چاہتی ہے اور کسی قسم کی شرعی عرفی اس میں رکاوٹ نہیں ہے تو ایسے وقت میں نکاح کرنے سے روکا نہ کرو اس کو نکاح کرنے دیا کرو، "لاتعضلوا" کا خطاب دونوں کو

ہو جائے گا سابقہ خاوند کو بھی چاہیئے کہ وہ کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالے اور اولیاء کو بھی چاہیئے کہ رکاوٹ نہ ڈالیں جس وقت کہ مرد و عورت آپس میں معروف طریقہ سے راضی ہو جائیں یہ ایک قاعدہ بیان کر دیا اللہ تعالیٰ نے۔

دنیوی قانون اور اللہ تعالیٰ کے قانون میں فرق :

اب اس پر عمل کو سہل کرنے کے لیے اگلے الفاظ کہے جا رہے ہیں اور یہی قرآن کریم کی خصوصیت ہے، دنیوی قانون اور اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ فرق ہے کہ دنیوی حکومتیں قانون بناتی ہیں اور اس قانون کو قوت کے ساتھ نافذ کرتی ہیں نافذ کرنے کے بعد چونکہ ذہنی تربیت اس کے مطابق نہیں ہوتی تو لوگ اس وقت تک اس قانون کی رعایت رکھا کرتے ہیں جب تک انہیں یہ ڈر ہو کہ ہم حکومت کی گرفت میں آ جائیں گے۔

اور اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ حکومت کی گرفت میں نہیں آؤں گا خفیہ طور پر جعل سازی کے ساتھ کوئی نہ کوئی حیلہ بہانہ کر کے بچ سکتے ہیں تو پھر انسان اس قانون کی پرواہ نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو قانون ہمیں دیا اس کے ساتھ ساتھ ذہنی تربیت بھی فرمائی اور ذہنی تربیت فرمانے کا حاصل یہ ہے کہ اس کو پھر کسی دنیوی حکومت کے ڈر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے خوف کے ساتھ اپنی آخرت کی مصلحت کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر عمل کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے دل و دماغ کے ساتھ اسلام کو قبول کر لیا چاہے دنیا کے اندر کسی قسم کی گرفت کا اندیشہ نہ ہو، چاہے انہیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، خلوت میں، علیحدگی میں، کوئی خفیہ پولیس نہیں، کوئی کسی قسم کی شکایت کا ڈر نہیں ہے وہ لوگ ایسی جگہوں میں بھی اس قانون کا پاس رکھتے ہیں۔

کیونکہ ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی کہ یہ قانون اللہ کا ہے اور اللہ سے تم چھپ نہیں سکتے اگر دل میں اس کے خلاف جذبہ رکھو گے یا ظاہری طور پر اس کے خلاف کوئی عمل کرو گے چاہے دنیا کے اندر تمہیں کوئی پکڑے یا نہ پکڑے لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے اس لیے تم اللہ تعالیٰ کے خوف کے تحت اس قانون کو اپناؤ اور اس کے اوپر عمل کرو یہ ذہنی تربیت ہے اس قانون کو اپنانے کے لیے جس تربیت کے قبول کر لینے کے بعد پھر انسان یہ نہیں سوچا کرتا کہ مجھے کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا، کوئی مجھے اس کے اوپر ملامت کرے گا، یا نہیں کرے گا مجھے دنیا میں اس کے اوپر سزا ہو گی یا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا استحضار کرتے ہوئے انسان اس قانون کے اوپر عمل کرتا ہے۔

آیت میں مذکور حکم خداوندی کی مصلحت :

پھر اس میں ایک مربیانہ شان یہ بھی ہے کہ وہ اس قانون کی عظمت کو دل اور دماغ میں اتارتا ہے قانون

بیان کیا پھر اس کی مختلف مصلحتوں کی طرف اشارہ کر دیا جیسے یہاں آئے گا" ذلکم ازکیٰ لکم و اطھر" یہ بات جو تمہیں کہی جا رہی ہے جن لوگوں کا اللہ پر ایمان ہے، یوم آخرت پر ایمان ہے، یہ دونوں باتیں تقاضہ کرتی ہیں کہ اس بات کو قبول کرو پھر یہ بات جو تمہیں کہی جا رہی ہے تمہارے نفع کے لیے کہی جا رہی ہے کہ یہ قاعدہ تمہارے لیے زیادہ صفائی ستھرائی کا باعث ہے اب تو تم اپنے اختیار کے ساتھ اپنی بہن کو، بیٹی کو دوسرے کے نکاح میں نہیں دیتے ہو کہ اس سے ہمارا ناک نیچا ہو جائے گا۔

لیکن تم جانتے نہیں کہ انسان کے فطری جذبات کیسے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت خواہش سے غالب آ جائے جائز طریقہ تم اس کیلئے مہیا نہیں کرتے پھر خفیہ آشنائیاں لگیں گی جس کے نتیجہ میں فرار اور اغواء کے واقعات روزمرہ پیش آتے ہیں پھر جس وقت یہ کسی کے ساتھ یاری لگا کر گھر سے نکل جائے گی یا کوئی اس کو اغواء کر کے لے جائے گا یہ واقعات جب سامنے آئیں گے تو پھر اونچی ناک بالکل ہی کٹ جائے گی تو اخلاق کی صفائی، ستھرائی اور گناہوں سے بچنا اسی طریقہ سے ہے کہ مرد عورت کا آپس میں رجحان ہو جائے تو نکاح میں رکاوٹ نہ ڈالا کرو یہ مصلحت کی طرف اشارہ کر دیا۔

اللہ کا علم تام ہے اسی پر بھروسہ کرو :

اور تیسری بات ساتھ یہ کہہ دی کہ اپنے طور پر اپنی عقل کے ساتھ جو تم مصلحتیں تجویز کرتے ہو یہ مصلحتیں کوئی حقیقی مصلحتیں نہیں ہیں تمہارا علم ناقص ہے تمہاری عقل ناقص ہے تم اپنے لیے جو سوچ لیتے ہو کہ اس میں ہمارا فائدہ ہے حقیقت میں فائدہ نہیں ہوتا تمہارے مصالح اور تمہارے فوائد کو اللہ زیادہ جانتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ جو کچھ کہہ دے اس پر اعتماد کرو یقین رکھا کرو کہ تمہارا فائدہ اسی میں ہے یہ جتنی باتیں کہی جا رہی ہیں یہ ساری کی ساری دل اور دماغ کی تربیت ہے اس قانون کو قبول کرنے کے لیے جب انسان ان باتوں کے اوپر غور کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے قانون پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا اور انسان اس پر خوشی کے ساتھ عمل کرے گا۔

"ذلک یوعظ بہ" یہ بات نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعہ سے اس شخص کو جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخر پر یعنی جس کا اللہ پر ایمان ہوگا اور یوم آخر پر ایمان ہوگا وہ اس بات کو قبول کرے گا اور جس کا اللہ پر ایمان نہیں یوم آخر پر ایمان نہیں پھر وہ قانون کی پابندی کہاں کرتا ہے؟ پھر وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے اور آگے اس قانون کی عظمت اور فائدے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزگی اور ستھرائی کا ذریعہ ہے کہ مرد عورت کا آپس میں رجحان ہو جانے کے بعد رکاوٹیں نہ ڈالا کرو ورنہ پھر خفیہ آشنائیاں ہو جائیں گی جس کے نتیجہ میں پھر فرار

کے واقعات پیش آتے ہیں کہ لڑکیاں گھر سے بھاگ جاتی ہیں جس کے نتیجہ میں اغواء کے واقعات پیش آتے ہیں کہ وہ مرد جس کا اس لڑکی کی طرف رجحان ہوتا ہے اور لڑکی کی بھی اس کے ساتھ ساز باز ہوتی ہے جب اولیاء اپنی مرضی سے نکاح نہیں کرنے دیں گے پھر وہ گھر سے بھاگتی ہیں۔

اور اگر تم ان کے جذبات کی رعایت رکھو کہ جدھر رجحان ہو گیا اور اپنی جاہلانہ غیرت کو چھوڑ و، اگر تم اپنی رضامندی کے ساتھ ان کا نکاح کر دو گے تو کم از کم اس قسم کے ذلت آمیز واقعات تو سامنے نہیں آئیں گے اور ان کے جذبات کی رعایت رہ جائے گی، عزت بحال رہ جائے گی، اپنے طور پر تم مصلحتیں نہ سوچا کرو تمہاری عقل ناقص، تمہارا علم ناقص، تم جانتے نہیں کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے جو کچھ اللہ بتائے اسی میں تمہاری مصلحت ہے، تم نہیں جانتے اپنی مصلحتیں، اللہ جانتا ہے، یہ تو طلاق کا قصہ ختم ہو گیا۔

رضاعت کی مدت کے بارے میں ائمہ کا اختلاف :

اب آگے آ گیا رضاعت کا مسئلہ، بچے کو دودھ پلانے کا مسئلہ کیونکہ نکاح ہوتا ہے نکاح کے بعد اولاد بھی ہوتی ہے اور اولاد ہونے کے بعد ان کے دودھ پلانے کا مسئلہ پیش آتا ہے اور بسا اوقات ماں باپ کی آپس میں جدائی ہو جاتی ہے، تو پھر وہ بچہ کشاکشی کا باعث بن جاتا ہے کہ دودھ کون پلائے؟ کس کے ذمہ یہ چیز ہے؟ اس لیے یہ احکام واضح طور پر بتائے جا رہے ہیں۔

"والوالدات یرضعن اولادھن " "بچہ جننے والی عورتیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو سال یہ اس شخص کیلئے ہے جو رضاعت کی مدت کو پورا کرنا چاہے" اگر پوری مدت دودھ پلانا چاہتے ہو تو دو سال تک پلاؤ اس کا مطلب کیا ہے کہ دو سال سے زائد دودھ پلانا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں جمہور کا مسلک یہی ہے کہ دو سال سے زائد دودھ نہیں پلانا چاہیئے اور احناف کا فتویٰ بھی اسی بات پر ہے، ایک قول ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا آتا ہے بعض آیات وروایات کے اشارہ سے اس کا جواز نکلتا ہے کہ اگر دو سال سے چھ ماہ زائد بھی کوئی عورت دودھ پلانا چاہے تو اس کے ساتھ بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے اگر کسی بچے نے سوا دو سال کا ہونے کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا ہے تو رضاعت کا تعلق قائم ہو جائے گا اور وہاں پھر نکاح وغیرہ میں احتیاط کرنی چاہیئے اور ڈھائی سال کے بعد ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی رضاعت جائز نہیں اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول تین سال تک کا ہے اور تین سال کے بعد بالاتفاق رضاعت کی مدت ختم ہو جاتی ہے اس میں کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں، تین سال کا بچہ ہو جانے کے بعد اگر کسی عورت کا دودھ پیتا ہے تو پینا جائز نہیں اور اس دودھ کے ساتھ احکام رضاعت متعلق نہیں ہوتے۔

دودھ پلانے کی اجرت والد کے ذمہ ہے :

والدات تو دودھ پلائیں گی اور ان عورتوں کا رزق اور ان کا لباس یہ ان بچوں کے والدوں کے ذمہ ہے جن کیلئے یہ بچے جنے گئے، اب ان کے ذمہ دو طرح سے ہے اگر تو بچے کی والدہ بچے کے والد کے نکاح میں ہے یعنی بچہ جننے کے بعد بھی نکاح قائم ہے پھر یہ روٹی کپڑا خاوند کے ذمہ ہے بیوی ہونے کے اعتبار سے پھر وہ دودھ پلائی کی اجرت نہیں لے سکتی، یہ خرچ بیوی ہونے کی حیثیت سے لے گی اور اگر جدائی ہوگئی جیسے بچہ پیدا ہونے سے پہلے طلاق ہوگئی یا بچہ ہوتے ہی کسی طرح سے جدائی ہوگئی اب اس دودھ پلانے والی عورت کا روٹی کپڑا اجرت رضاعت کے طور پر اس بچہ کے باپ کے ذمہ ہے کیونکہ جس وقت طلاق ہو جائے عدت ختم ہو جائے بیوی والا نان نفقہ تو رہا نہیں البتہ جب اس بچہ کو دودھ پلاتی ہے تو دودھ پلائی کی اجرت کے طور پر نان نفقہ لے سکتی ہے۔

بہر حال جب بچے کی ماں بچے کو دودھ پلائے گی تو خرچ اس کا بچے کے باپ کے ذمہ ہے چاہے بیوی ہونے کی حیثیت سے چاہے مرضعہ ہونے کی حیثیت سے اتنی دیر تک وہ خرچہ لے سکتی ہے اگر نکاح قائم ہے تو بیوی ہونے کی حیثیت سے خرچ لے گی پھر دودھ پلانے کا خرچ اس کو علیحدہ نہیں دیا جائے گا کیونکہ جس طرح بچہ مرد کا ہے عورت کی طرف بھی منسوب ہے اس کا بھی ہے ہاں البتہ اگر علیحدگی ہوگئی تو دودھ پلانے کی ذمہ داری باپ پر آتی ہے۔

اب اگر والدہ کے سر پہ یہ ذمہ داری ڈالی جائے تو وہ اپنے رزق و کسوہ کی صورت میں اس کی اجرت وصول کر سکتی ہے ''بالمعروف''، یعنی دستور کے مطابق جس قسم کا دستور اس وقت موجود شرفاء کے ہاں ہو یعنی اگر مرد و عورت دونوں ہی امیرانہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں تو خرچ وسیع دیا جائے گا اور اگر دونوں ہی غریب ہیں تو خرچ غریبوں کے دستور کے مطابق دیا جائے گا۔

اور اگر مرد امیر ہے عورت غریب گھرانے کی ہے یا مرد غریب ہے اور عورت دولت مند گھرانے کی ہے تو متوسط خرچ دیا جائے گا نہ بالکل امیرانہ، نہ بالکل غریبانہ، یعنی دستور کے مطابق خرچ دو۔

وسعت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہ دی جائے :

''لا تکلف نفسٌ الا وسعھا'' نہیں تکلیف دیا جائے گا کوئی شخص مگر اپنی وسعت کے مطابق، گنجائش سے زیادہ تکلیف کسی کو نہیں دی جائے گی، باپ اگر خرچہ برداشت نہ کر سکے اس پر ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی، والدہ اگر دودھ پلانے کے قابل نہیں اس کو کوئی کسی قسم کی تکلیف ہے تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ تو دودھ ضرور پلا، ان معاملات کے اندر اس قانون کو مدنظر رکھا جائے گا جتنی جس میں گنجائش ہے اسی کے مطابق اس کو

تکلیف دی جائے گی، ناقابل برداشت تکلیف کسی انسان کو نہیں دی جائے گی اسی کو آگے واضح کر کے کہا جارہا ہے کہ والدہ کو اس کے بچے کے سبب سے نقصان نہ پہنچایا جائے۔

کیا مطلب؟ کہ واقعی معذور ہے اور تم کہو کہ نہیں یہ ضرور دودھ پلائے یہ اس بچے کی وجہ سے ماں کو تکلیف پہنچانے والی بات ہے اور اگر ماں کو کوئی کسی قسم کا عذر نہیں اور باپ بیچارہ مسکین ہے وہ کسی پرائی عورت کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تو ماں بلاوجہ بچے کے باپ پر ذمہ داری ڈالے کہ میں تو دودھ نہیں پلاتی یہ بلاوجہ بچے کے باپ کو نقصان پہنچانے والی بات ہے یعنی آپس میں مروت کے ساتھ آپس میں ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ اس معاملہ کو طے کیا جائے نہ بلاوجہ بچے کی ماں کو تکلیف پہنچاؤ نہ بلاوجہ بچے کے باپ کو تکلیف پہنچاؤ۔

یتیم کا خرچ اس کے ورثاء کے ذمہ ہے:

" وعلی الوارث مثل ذلك " اور اگر کسی بچے کا باپ موجود نہیں بچہ یتیم ہے تو پھر خرچ کس کے ذمہ ہے؟ اس کو قرآن کریم نے ایک ہی لفظ کے اندر ادا کر دیا کہ پھر خرچہ وارث کے ذمہ ہے یعنی بچے کے وارث کے ذمہ ہے، بچے کے وارث کا مطلب یہ ہے کہ اس بچے کے جتنے رشتہ دار موجود ہیں دیکھو کہ اگر آج یہ بچہ مر جائے تو اس کا ورثہ کس کس کو کس اندازے کے ساتھ پہنچے گا؟ تو جس کو جس اندازے کے ساتھ ورثہ پہنچتا ہے اسی اندازے کے ساتھ اس کا خرچہ برداشت کیا جائے گا ورثہ حقیقت میں بچہ کا ہو یا نہ ہو یعنی اہلیت کس میں ہے وارث بننے کی۔

ایک بچے کا باپ مر گیا اس کی ماں موجود ہے اس کا دادا موجود ہے اب آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی بچے کی ماں اور اس کا دادا موجود ہو تو بچے کے مرنے کے بعد جس وقت آپ وارثت کا مسئلہ پوچھیں گے تو وراثت میں تیسرا حصہ ماں کا ہے دو حصے دادا کے ہیں دو ثلث دادا کے اور ایک ثلث ماں کا اب اس بچہ پر تین روپے خرچہ آئے گا تو ایک روپیہ ماں ادا کرے گی دو روپے دادا ادا کرے گا۔ اس طرح سے جو بھی وارث موجود ہوں مثلاً بھائی بہنیں موجود ہیں تو اگر یہ مرے تو بھائیوں کو بہنوں کو کس حساب کے ساتھ اس کا ورثہ پہنچے گا اسی تناسب کے ساتھ ان سے اس کا خرچہ وصول کیا جائے گا تو وارث کے لفظ کے اندر یہ ساری تفصیل آ گئی کہ نابالغ بچے کا خرچہ باپ کی عدم موجودگی میں اس کے ورثاء پر ہوتا ہے کہ جس نسبت کے ساتھ اس کا ورثہ ان کو پہنچ سکتا ہے اسی نسبت کے ساتھ ان سے خرچ وصول کیا جائے گا۔

مدت رضاعت سے قبل دودھ چھڑانا جائز ہے لیکن؟

" فان ارادا فصالاً عن تراض منهما " اگر بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں دونوں کی طرف سے رضامندی

سے اور مشورے سے، مشورہ اور رضا مندی اس لیے تا کہ بچے کی مصلحت کو دیکھ لیا جائے، بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ ماں کا مزاج ٹھیک نہیں جس کی بناء پر بچے کے دودھ موافق نہیں آرہا یا بچے کی صحت عورت کے دودھ کی متحمل نہیں اور اطباء کی طرف سے یہ تجویز ہو گیا کہ بکری کا دودھ پلاؤ یا آج کل ڈبہ کا دودھ پلاؤ اس قسم کی اگر تجویز ہو جائے تو آپس میں مشورہ کر کے وہ دودھ اگر چھڑا لیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ماں باپ پر کوئی گناہ نہیں کم مدت کے اندر وہ دودھ چھڑا سکتے ہیں اور آج کل زیادہ رواج یہی ہوتا جا رہا ہے کہ مائیں دودھ پلاتی نہیں اور بچے ڈبہ پر پلتے ہیں اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے شرعاً جائز ہے لیکن جہاں تک والدہ اور اولاد کے تعلق کی بات ہے اس فطری تعلق میں یقیناً کمی آجاتی ہے۔

یعنی جن گھروں کے اندر بچے ڈبوں پر پلتے ہیں ان میں وہ فطری تعلق جو ماں باپ اور اولاد میں ہوتا ہے اس میں یقیناً کمی آجاتی ہے کہاں تو دو سال تک بچے نے ماں کا دودھ ہی چوسنا اور پینا ہے اور کہاں پیدا ہوتے ہی ڈبوں کے دودھ پر لگا دیا بڑا فرق پڑتا ہے مصلحت اسی فطرت کے اندر ہے اگر چہ شرعاً جائز ہے کہ دودھ پلایا جائے اب جتنا رجحان اس طرف ہو جائے گا کہ عورتیں بھی معاشی زندگی میں شریک ہو جائیں، یہ بھی ملازمتیں کریں، یہ بھی دوکانیں کھولیں اور کاروبار کریں پھر بچے ڈبوں پر ہی پلیں گے، جنیں گی، جن کر ہسپتال میں دے دیں گی یا نوکروں کے سپرد کر دیں گی اور خود دفتروں میں جایا کریں گی ملازمت کرنے کے لیے اور بچے دوسروں کے ہاتھوں پلیں گے پھر آپس میں وہ تعلقات کیسے قائم رہ سکتے ہیں؟

یورپ کی گندی تہذیب اور اس کے اثرات :

چنانچہ یورپ نے اگر اس زندگی کو اپنایا ہے تو یورپ اس فطری محبت سے خالی ہو گیا یعنی آپ یقین جانیے فطری محبت جو تھی ایک دوسرے کے ساتھ وہ یورپ میں نہیں رہی ماں باپ کو اولاد سے کوئی تعلق نہیں، اولاد کو ماں باپ سے کوئی تعلق نہیں اس لیے وہاں یہ رسم ہے کہ اگر باپ بھی بیٹے کے گھر جائے ملنے کے لیے تو خرچ اپنا ساتھ لے جائے گا اور جا کے ہوٹل میں ٹھہرے گا۔

اور اتنی لاتعلقی ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ماں باپ کو تو شاید یاد ہو کہ ہم نے کتنے بچے جنے ہیں باقی عام لوگوں کو پتہ نہیں کہ ہم کتنے بہن بھائی ہیں تو تعلق ہی نہیں رہا آپس میں، جیسے دانہ دانہ بکھر گیا پیدا ہوئے مینڈکوں کی طرح اپنا اپنا وقت گزارا اور مر گئے۔

اب تو ان ممالک میں عام طور پر یہ رواج ہوتا جا رہا ہے کہ ولدیت لکھی ہی نہیں جاتی کہ فلاں بیٹا ہے

فلاں کا، کہتے ہیں بس نام اور فوٹو کافی ہے اور یہ طریقہ اپنانے پر وہ لوگ مجبور ہیں کیونکہ بہت سارے لوگوں کو اپنے باپ کا پتہ ہی نہیں ہے اور واقعہ کے اعتبار سے کنواری ماؤں کی اولاد ہوتے ہیں جب ان کی ماں ہی کنواری ہے تو باپ کہاں سے بتائیں؟

آج سے آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے ''الحق'' کے اندر رپورٹ شائع ہوئی تھی کہ امریکہ کے اندر ساٹھ فیصد بچے ولدالحرام ہیں جو ناجائز تعلق کا نتیجہ ہیں، آپ جانتے ہیں ساٹھ فیصد یہ نصف سے زائد ہیں اور ''للاکثر حکم الکل'' کے تحت سارے حرام زادے تو جس وقت ان کو اپنے باپ کا پتہ ہی نہیں ہوگا عورتیں حاملہ ہوتی ہیں، باوجود برتھ کنٹرول کے، ہر قسم کے اسباب مہیا ہونے کے نطفہ ٹھہر جاتا ہے ہسپتال میں جاتی ہیں بچہ جن کے ہسپتال کے سپرد کر آتی ہیں اور جہاں جہاں یہ مغربی تہذیب آتی جارہی ہے وہاں بھی اثرات ہیں اور معاف کرنا آپ تو مسجدوں، مدرسوں میں بیٹھنے والے درویش ہیں آپ کو علم نہیں ہمارے معاشرے کے اندر بھی یہ چیز کثرت سے ہوگئی ہے۔

اگر اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو ملتان ''مشن ہسپتال'' میں جا کر دیکھ لیں یہ عیسائیوں کا ہسپتال ہے اکثر و بیشتر اس قسم کے ناجائز بچے وہاں پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہسپتال والوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور وہاں مستقل کمرے بنے ہوئے ہیں جن کے اندر بچے پنگھوڑوں میں رکھے ہوئے ہیں اور ان کو نرسوں کے ذریعہ سے پالا جاتا ہے اور پھر ان کو عیسائی بناتے ہیں اور عیسائیوں کی آبادی زیادہ تر انہی حرامی بچوں کی وجہ سے بڑھ رہی ہے لڑکی کو بمقابلہ لڑکے کے زیادہ خوشی سے قبول کرتے ہیں کیونکہ لڑکی ان کے زیادہ کام کی ہے مسلمان جوڑوں کی ناجائز اولاد نتیجۃً عیسائی بنتی ہے اور ہسپتالوں میں پلتی ہے یعنی سینکڑوں کے حساب سے بچے ہسپتالوں میں یہاں پاکستان میں بھی پل رہے ہیں جب اس قسم کے بچے ہوں گے ان کو کیا پتہ کہ ماں کون ہے؟ باپ کون ہے؟ بہن کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ وہ انہی کے ہسپتالوں میں پلیں گے انہی کے سکولوں میں تعلیم حاصل کریں گے اور تعلیم پانے کے بعد انہی کے مذہب کی اشاعت کریں گے اور انہی کے کارکن بنیں گے اور یہ بات وہاں عام ہے کہ ہسپتال میں بچہ جن کر ہسپتال کے سپرد کر دیا اور اگر کسی کی جائز اولاد ہو تو ہسپتال میں خرچ دیتے ہیں اور وہ خرچ کے ذریعہ سے پلتا ہے ناجائز اولاد ہو تو حکومت سرپرستی کرتی ہے تو یہ لاتعلقی کی بناء پر آپس میں محبت نہیں رہی، ہمدردی نہیں رہی اس کے اندر ان چیزوں کا بہت بڑا دخل ہے فطری طریقے جب سے ہم نے چھوڑ دیے اس کا اثر آخر یہی ہے کہ فطری محبت میں بھی زوال آگیا اور جیسے جیسے یہ چیز آتی جائے گی ویسے ویسے بات بڑھتی جائے گی۔

غیر عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں :

اگر تم ارادہ کرو دودھ پلوانے کا یعنی ماں دودھ نہیں پلاتی اور ان کا مشورہ ہوگیا کہ کسی پرائی عورت سے دودھ پلوالیں جس طرح عرب میں رواج تھا کہ بچوں کو باہر کی عورتوں کے سپرد کر دیا جاتا تھا تو بھی کوئی حرج نہیں ہاں البتہ یہ بات ہے کہ جو ان کی اجرت طے کرو وہ اچھے طریقہ سے ان کو دے دو یہ نہ ہو کہ بچے کو دودھ تو پلوالو اور جو دینا طے کیا تھا وہ دو نہیں اس طرح اگر ان کی حق تلفی کرو گے تو یہ بری بات ہے پھر تمہیں گناہ ہوگا جو دینا طے کیا ہے اگر وہ تم اچھے طریقے سے دیتے رہو پرائی عورتوں سے دودھ پلوالو تو بھی کوئی حرج نہیں ہے پھر وہی بات کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آپ کو یہ قوت کی گولی دی جاتی ہے جس سے ایمان کو قوت حاصل ہونے کے بعد ان احکام پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، بس یہ تصور رکھو کہ ہمارا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں ہماری ہر ہر حالت کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے اور جان رہا تو پھر انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر جرأت نہیں ہوگی۔

بیوہ کی عدت اور اس کے متعلقہ احکام:

" والذین یتوفون منکم " ''اور جو لوگ تم میں سے مرجائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں''

اب یہ ہوگئی بیوہ عورت تو یہاں بیوہ عورت کا حکم آگیا کہ یہ روک کے رکھیں اپنے نفسوں کو چار ماہ دس دن تو عدت وفات چار ماہ دس دن ہے لیکن یہ اس عورت کے لیے ہے جو حاملہ نہ ہو اگر حاملہ ہے تو عدت وضع حمل ہے جب حمل وضع ہوگیا عدت ختم ہوگئی چاہے گھر کے اندر جنازہ پڑا ہوا ہے خاوند کے فوت ہونے کے فوراً بعد بچہ پیدا ہوگیا تو اس کی عدت ختم ہوگئی اس کے بعد اس کو نکاح کرنے کی اجازت ہے حاملہ کی عدت وضع حمل ہے یعنی خاوند کے مرتے وقت عورت حاملہ تھی جب وضع حمل ہو جائے گا عدت ختم ہو جائے گی اس کا ذکر اٹھائیسویں (۲۸) پارہ میں سورۃ الطلاق میں ہے۔

اور اسی طرح یہ حکم آزاد عورت کا ہے، باندی اگر کسی کے نکاح میں ہو اور اس کا شوہر فوت ہو جائے تو اس کی عدت وفات دو ماہ پانچ دن ہے، جس وقت یہ عورتیں اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو پھر ان پر کوئی حرج نہیں جو چاہیں اپنے نفسوں میں تصرف کریں لیکن یہ تصرف معروف کے مطابق ہونا چاہیئے۔

یعنی اگر وہ عورت عدت ختم ہونے کے بعد اپنا نکاح کرنا چاہتی ہے، کسی اپنے ہمسر خاندان میں کرنا چاہتی ہے، مہر مثل کے ساتھ کرنا چاہتی ہے، ایسی جگہ کرنا چاہتی ہے جہاں شرعاً نکاح کرنے کی اجازت ہے تو تمہیں کیا ضرورت ہے اس میں رکاوٹ ڈالنے کی جو کریں ٹھیک ہے ہاں البتہ اگر وہ عرف کے خلاف چلیں عدت کے اندر

نکاح کرنا چاہیں، ایسی جگہ نکاح کرنا چاہیں جہاں شرعاً نکاح کرنا ٹھیک نہیں ہے پھر اگر نہیں روکو گے تو گناہ گار تم بھی ہوئے اور اگر وہ قاعدے کے مطابق اپنے نفسوں میں تصرف کرنا چاہتی ہیں تو پھر کوئی گناہ نہیں اللہ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے۔

ہاں البتہ چار ماہ دس دن تک عورت جو فارغ ہوگئی اس مدت کے اندر اس عورت کے ساتھ تم نکاح کی صراحتاً گفتگو نہ کرو کہ وعدہ کرلو کہ عدت ختم ہوگی تو ہم تیرے ساتھ نکاح کرلیں گے اس قسم کی گفتگو بھی نہ کرو اس عورت کے ساتھ تمہارا میل جول ہونا چاہیے محض ہمدردی کے ساتھ جو محض تعزیت پر مبنی ہو کہ اس کو صبر کی تلقین کرو اس کے خاوند کے فوت ہوجانے کی وجہ سے اس پر صدمہ ہے اس لیے اس کے ساتھ ہمدردی کی گفتگو ہونی چاہیے اس کے خاوند کے فوت ہونے کے بعد فوراً نکاح اور رنگ رلیاں منانے کے پروگرام بنانا شروع کردینا یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

ہاں البتہ ایسا موقع جب ہوتا ہے کہ کسی عورت کا شوہر فوت ہوجائے لوگوں کی توجہ ہوجاتی ہے کہ اب یہ عورت فارغ ہوگئی ہے اور اس کی طرف نکاح کی رغبت ہوسکتی ہے اشارے کنایہ سے کوئی بات کہہ دو تو اس میں حرج کوئی نہیں ہے اس سے بھی انسان کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے بس اس کے کان میں بات ڈال دی تاکہ اس کو پتہ چل جائے کہ یہ بھی میری طرف رغبت رکھتا ہے بعد میں کوئی نکاح کا پیغام آئے تو وہ تجویز کرسکتی ہے کہ کون مناسب ہے؟ اشارہ کرسکتے ہو دل کے اندر کسی بات کو چھپالو کہ جب اس عورت کی عدت ختم ہوجائے گی تو ہم اس کے ساتھ نکاح کریں گے اس قسم کی بات کا کوئی حرج نہیں البتہ صراحتاً ان سے وعدہ لے لینا اور چپکے چپکے ان سے اس قسم کے عہدوپیمان لینا یہ مناسب نہیں ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ

کوئی گناہ نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو عورتوں کو جبکہ تم نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ

یا تم نے ان کے لیے فرض متعین نہیں کیا اور انہیں فائدہ پہنچایا کرو، وسعت والے پر اس کا اندازہ ہے

وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

اور تنگدست پر اس کا اندازہ ہے فائدہ پہنچانا معروف طریقہ سے یہ بات لازم کردی گئی ہے خوش معاملہ لوگوں پر ﴿۲۳۶﴾

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ

اور اگر تم ان عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ تم ان سے مس کرو اور حال یہ ہے کہ تم نے متعین کیا ہے

لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا

ان کیلئے مہر پھر جو تم نے متعین کیا اس کا نصف تمہارے ذمہ ہے مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں یا درگزر کر جائے

الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ

وہ شخص جس کے قبضہ میں ہے عقد نکاح، اے مردو! تمہارا درگزر کر جانا تقویٰ کی طرف زیادہ قریب ہے،

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

نہ بھولا کرو آپس میں مہربانی کرنے کو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۲۳۷﴾

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

نگہداشت رکھو نمازوں کی اور خاص طور پر صلوٰۃ وسطیٰ کی اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلئے اس حال میں کہ فرمانبردار ہو ﴿۲۳۸﴾

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا

پھر اگر تمہیں خوف ہو پھر تم نماز پڑھا کرو پاؤں پر کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے پھر جس وقت تم بے خوف ہو جاؤ پھر یاد کیا کرو اللہ کو جیسا کہ

عَلَّمَكُم مَّا لَمۡ تَكُونُواْ تَعۡلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنكُمۡ

اللہ نے تمہیں تعلیم دی جو تم جانتے نہیں تھے ﴿۲۳۹﴾ اور وہ لوگ جو تم میں سے وفات دے دیے جاتے ہیں

وَيَذَرُونَ أَزۡوَٰجٗا وَصِيَّةٗ لِّأَزۡوَٰجِهِم مَّتَٰعًا إِلَى ٱلۡحَوۡلِ غَيۡرَ إِخۡرَاجٖۚ

اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں انہیں چاہیے کہ وصیت کیا کریں اپنی بیویوں کیلئے سال تک نفع پہنچانے کی اس حال میں کہ ان کو نکالا نہ جائے

فَإِنۡ خَرَجۡنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِي مَا فَعَلۡنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ مِن

پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو کچھ وہ کریں اپنے نفسوں میں

مَّعۡرُوفٖۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٞ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلۡمُطَلَّقَٰتِ مَتَٰعُۢ بِٱلۡمَعۡرُوفِۖ حَقًّا

معروف طریقہ سے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۴۰﴾ اور طلاق دی ہوئی عورتوں کیلئے متاع ہے معروف طریقہ سے، لازم ہے

عَلَى ٱلۡمُتَّقِينَ ﴿۲۴۱﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمۡ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ ﴿۲۴۲﴾

اللہ سے ڈرنے والوں پر ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات تاکہ تم سوچو ﴿۲۴۲﴾

تفسیر:

مہر کے متعلق طلاق قبل الجماع اور بعد الجماع کی صورتیں اور ان کا حکم:

سلسلہ احکام پچھلی آیات میں آپ کے سامنے آچکا یہ رکوع بھی طلاق کے مسائل پر ہی مشتمل ہے، پہلی صورت ذکر کی جارہی ہے کہ اگر طلاق کی نوبت ایسی حالت میں آجائے کہ نکاح کرتے وقت مہر متعین نہیں کیا اور نکاح کے بعد عورت کے ساتھ مس کرنے کی نوبت نہیں آئی مس کرنا یہ کنایہ ہے جماع سے اور خلوت صحیحہ جماع کے حکم میں ہے کہ جس وقت خاوند بیوی ایسی جگہ تنہا ہوجائیں کہ اگر وہ آپس میں وہ تعلق قائم کرنا چاہیں تو کوئی مانع نہ ہو اس کو خلوت صحیحہ کہا جاتا ہے۔

فقہی نقطہ نظر سے یہ جماع کے قائم مقام ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں تو ایسی صورت میں جبکہ نکاح ہونے کے بعد مس کی نوبت نہیں آئی اور نکاح کے اندر مہر بھی متعین نہیں کیا گیا تو طلاق ہوجانے کی صورت میں عدت واجب نہیں ہوتی اور جب مہر متعین نہیں کیا گیا تو ایسی صورت میں اس عورت کو کچھ نفع پہنچانا ضروری ہوتا ہے جس کی کم از کم مقدار یہ ہے کہ ایک جوڑا کپڑوں کا دے دیا جائے یعنی

اس کو رخصت کرتے وقت اپنے سے تعلق اس کا قطع کرتے وقت کچھ نہ کچھ احسان اس کے ساتھ کرنا چاہئے تا کہ طلاق کے ساتھ جو تلخی ہے اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔

کم از کم ایک جوڑا دے دیا جائے اور مرد اپنی حیثیت کے مطابق معاملہ کرے اگر کشادہ دست ہے تو اچھی قسم کے کپڑے دے دے اگر تنگ دست ہے تو گھٹیا دے دے کپڑے ضروری نہیں کم از کم یہ ہے اور اس سے زائد جتنا بھی احسان کر لیا جائے بہتر ہے۔

جس طرح تفسیر کے اندر روایت نقل کی گئی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے ہی معاملہ میں اپنی بیوی کو قبل از وطی طلاق دے دی اور مہر متعین نہیں کیا گیا تھا پچیس ہزار درہم ادا کیے تو جتنی حیثیت ہو اس کے مطابق اس سے معاملہ کرنا چاہئے مقصد یہ ہے کہ اس طلاق کے ساتھ جانبین کے اندر ایک تلخی جو پیدا ہو جاتی ہے رخصتی کے وقت اس کی کچھ تلافی ہو جائے یہ آئندہ کیلئے نفرت اور عداوت کا ذریعہ نہ بنے۔

پہلی آیت کے اندر یہ حکم ذکر کیا گیا ہے اور اگر نکاح کرتے وقت مہر متعین کر لیا گیا تھا لیکن مس سے قبل جدائی ہو گئی جماع کی نوبت نہیں آئی اور نہ خلوت صحیحہ ہوئی ہو تو ایسی صورت میں متعین کیے ہوئے مہر کا نصف دینا مرد کے ذمہ ہے آدھا مہر ادا کرنا ہوگا آدھا مہر ذمہ لگ گیا باقی آگے دو صورتیں ہیں اگر عورت معاف کر دے تو آدھا بھی ادا نہیں کرنا ہوگا، مرد درگزر کر جائے سارا ہی دے دے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے یہ ہے اپنی خوشی پر، شرعی طور پر نصف مہر مرد کے ذمہ ہے اگر نکاح کے وقت کل مہر دے دیا گیا تھا تو آدھا وہ واپس لے سکتا ہے درگزر کر جائے نہ لے اس کی مرضی یہ دونوں شقیں زوجین کے اختیار میں ہیں، آگے ترغیب دے دی کہ ایک دوسرے کے ساتھ "عفو" اور درگزر کا معاملہ کرو اگر خاوند دے چکا ہے تو اسے چاہیے کہ درگزر کر جائے نصف واپس نہ لے، اور اگر عورت نے وصول نہیں کیا تو اس کو چاہیئے کہ درگزر کر جائے وہ آدھا بھی نہ لے ایک دوسرے کے ساتھ جدائی کے وقت بھی فضل اور احسان کا معاملہ ہو عداوت کی بنیاد نہ بنے۔

دو صورتوں کا حکم تو یہ آ گیا باقی دو صورتیں اس کے علاوہ رہ گئیں کہ نکاح کیا نکاح کے اندر مہر بھی متعین ہوا اور پھر عورت کے ساتھ جماع کی نوبت بھی آ گئی یا خلوت صحیحہ کی نوبت آ گئی ایسی صورت میں کل مہر مرد کے ذمہ ہوتا ہے یہ صورت بھی دوسری آیات کے اندر مذکور ہے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ نکاح کے اندر مہر متعین نہیں کیا لیکن نکاح کے بعد خلوت صحیحہ کی نوبت آ گئی ایسی صورت میں مرد کے ذمہ مہر مثل ہے یعنی عورت کے خاندان کی لڑکیوں کا جس طرح مہر ہے اس کے مطابق مہر اس لڑکی کو دیا جائے گا، اس چوتھی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔

اور آیت کے اندر جس متاع کا ذکر آرہا ہے کہ مطلقات کو متاع دیا کرو کچھ نہ کچھ دیا کرو اس کی تفصیل بھی یہی ہے کہ جس کا مہر متعین نہیں کیا گیا تھا اور طلاق قبل از وطی ہوگئی اس کو جوڑا دینا یہی متاع ہے اور یہ واجب ہے اور جس کو طلاق دی گئی مہر متعین ہو گیا تھا طلاق قبل از وطی دی گئی اس کیلئے متاع نصف مہر ہے جو کہ لازم ہے اور جس کو طلاق ہوگئی مہر متعین تھا وطی بھی ہوگئی اس کا متاع جو فرض ہے وہ یہ ہے کہ پورا مہر ادا کرو اور جس کو وطی کے بعد طلاق دی لیکن مہر متعین نہیں کیا گیا تھا اس کے لیے متاع یہ ہے کہ مہر مثل ادا کرو یہ تو ہے فرض اور اگر متاع سے مراد کپڑوں کا جوڑا ہی لیا جائے تو پھر پہلی قسم کی عورت کے لیے اس کا ادا کرنا واجب ہے باقیوں کیلئے مستحب ہے یہ اس متاع کی تفصیل ہے، یعنی عقلاً چار ہی صورتیں ہو سکتی تھیں کہ طلاق قبل از وطی ہوئی یا بعد از وطی اور مہر متعین ہے یا نہیں ان چاروں صورتوں کا حکم میں نے آپ کے سامنے واضح کر دیا۔

محافظت علی الصلوٰۃ کا حکم اور اس کی حکمت :

درمیان میں ایک حکم ذکر کیا جا رہا ہے نمازوں کے متعلق کہ نمازوں کی محافظت کیا کرو، محافظت کا معنی ہوتا ہے اس کے آداب کی رعایت رکھنا، وقت پر ادا کرنا، خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنا، ان کے آداب وشرائط کی رعایت رکھتے ہوئے نماز پڑھنا، پہلے بھی طلاق کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی ازواج کے مسائل ہیں درمیان میں نماز کو ذکر کر دیا جس وقت یہ احکام کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس وقت بھی توحید کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر تھا، اب یہ احکام کا سلسلہ اختتام کو پہنچ رہا ہے تو آخر میں اللہ تعالیٰ نے پھر نماز کے متعلق تاکید کر دی اور آگے جو دو حکم آئیں گے "معتدۃ الوفات" کے متعلق اور عام مطلقات کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ پہلے احکام کا تتمہ ہے۔

ورنہ سلسلہ احکام یہاں ختم کیا جا رہا ہے، اور اس کے آخر میں نماز کی تاکید کر دی اول وآخر جب نماز کا ذکر ہو گیا تو اس سے نماز کی اہمیت واضح ہوگئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان معاملات میں جن کے اندر فساد جھگڑا اور کشاکشی آجاتی ہے ان کو احسن طریقہ سے طے تب ہی کیا جا سکتا ہے جب انسان کے اندر تواضع ہو، انسان کے اندر برداشت پیدا ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہو اور نماز ایک ایسی چیز ہے جس کی پابندی اگر محافظت کے ساتھ کی جائے، اس کے حقوق اور آداب کو ادا کیا جائے تو انسان کے اندر تواضع بھی پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی قوی ہوتا ہے، جب تواضع پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہو جائے تو اہل حقوق کے حقوق ادا کرنے آسان ہو جاتے ہیں اور جھگڑے، فساد کے جتنے بھی معاملات ہیں ان کو احسن طریقہ سے ادا کیا جا سکے گا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق

جس وقت انسان کا مضبوط ہوگا تو پھران احکام کی پابندی انسان کے لیے آسان ہوجاتی ہے، اس اعتبار سے ان احکام کے درمیان میں نماز کا ذکر ایک مصلح کی حیثیت سے آ گیا۔

صلوٰۃ وسطیٰ سے کونسی نماز مراد ہے؟

محافظت علی الصلوٰۃ کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ذکر صلوٰۃ وسطیٰ کا ہے صلوٰۃ وسطیٰ کا لفظی معنیٰ ہے بیچ والی نماز اب اس صلوٰۃ وسطیٰ کا مصداق کیا ہے؟ اس میں اگرچہ متعدد اقوال ہیں جتنی نمازیں پڑھی جاتی ہیں سب اس کا مصداق بنائی گئی ہیں مختلف اقوال کے تحت لیکن راجح قول جو روایت صحیح کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے اور ہمارے اکثر جمہور مفسرین نے جس کو ترجیح دی ہے وہ یہی ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ کا مصداق عصر کی نماز ہے، عصر کی نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ اس لیے کہہ دیا کہ اس میں دو نمازیں ایک طرف تو دن کی آجاتی ہیں فجر اور ظہر دو نمازیں رات کی آجاتی ہیں مغرب اور عشاء اور یہ نماز دن کے اختتام پر ہے۔

اور یہ وقت ہر کسی کی انتہائی مشغولیت کا ہوتا ہے، کاشتکار لوگ بھی جس وقت دن کو ختم ہوتا دیکھتے ہیں تو کام کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں، بازاروں میں بیٹھے ہوئے تاجر بھی شام کے وقت اپنے حساب وکتاب کو سمیٹنا شروع کردیتے ہیں، اور مسافر بھی غروب سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ دن کا آخری حصہ جو ہوتا ہے اس میں ہر شخص اپنے کام کو سمیٹ کر اطمینان اور سکون کی زندگی اختیار کرنے کے لیے گھروں کی طرف بھاگتا ہے تو ایسے وقت میں نماز میں غفلت ہوجاتی ہے جس کی بناء پر خصوصیت سے تاکید کردی کہ اس نماز کا خیال رکھا کرو، سرور کائنات ﷺ جس وقت غزوۂ احزاب میں مشغول تھے تو ایک دن کچھ مشرکین کی طرف سے ایسے چھیڑ چھاڑ جاری رہی کہ آپ عصر کی نماز نہیں پڑھ سکے اور عصر کی نماز آپ کی قضاء ہوگئی آپ ﷺ نے اس وقت مشرکین کیلئے بددعا کی بخاری شریف میں روایت آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبور کو اور بیوت کو آگ سے بھردے جنہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ پڑھنے سے روک دیا اور وہ نماز قضا ہوئی تھی عصر کی اس روایت کی طرف دیکھتے ہوئے راجح یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ کا مصداق صلوٰۃ عصر ہی ہے، اور پھر ایک ہے محافظت کہ اوقات کا خیال کرو، آداب کا خیال کرو اچھی طرح سے پڑھو امن کی حالت میں تو طریقہ یہی ہے جس طرح آپ نماز پڑھتے ہیں۔

خوف کی حالت میں نماز کا حکم اور اس کا طریقہ :

اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ انسان لڑائی کے اندر مشغول ہو اور اطمینان کے ساتھ نماز نہ پڑھی جاسکے تو اس آیت کے اندر یہ کہا جارہا ہے کہ نماز کو قضا نہیں کرنا اگر تم باقاعدہ رکوع سجدہ کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتے

تو کھڑے کھڑے ہی اشارے کے ساتھ نماز پڑھ لیا کرو چاہے قبلہ کی طرف منہ ہو چاہے نہ ہو مثال کے طور پر اگر دشمن کے ساتھ مشغولیت اس طور پر ہوگئی کہ ہمارا دشمن ہمارے سامنے کھڑا ہے اور وہ ہے مشرق کی جانب اب اگر ہم مغرب کی طرف منہ کریں گے نماز پڑھنے کے لئے تو پیچھے سے حملہ کا اندیشہ ہے اور اس طرح دشمن ہمیں نقصان پہنچا دے گا تو آپ مشرق کی طرف منہ کر لیجئے، اور رکوع سجدہ کرتے ہوئے اگر خطرہ ہے کہ وہ حملہ کر دے گا ہماری اس حالت سے دشمن فائدہ اٹھا سکتا ہے تو رکوع سجدہ نہ کرو اشارہ کے ساتھ نماز پڑھ لو تا کہ دشمن کے سامنے ڈٹے رہو اور کھڑے رہو قبلہ کی طرف منہ کرنا بھی ضروری نہیں۔

اور اگر سواریوں پر چڑھے ہوئے ہو تو سواریوں پر چڑھے ہوئے ہی اسی طرح اشارے کے ساتھ نماز ادا کی جا سکتی ہے اور جب امن کی حالت ہو جائے اور خوف زائل ہو جائے تو پھر قرآن کہتا ہے کہ نماز اسی طرح پڑھو یہاں ''فاذکرو الله'' سے نماز کا پڑھنا مراد ہے نماز اسی طرح پڑھو جیسے اللہ نے تمہیں سکھائی، اب اس پر توجہ کر لیں، نماز پڑھنے کا حکم تو قرآن میں آیا ہوا ہے کہ نماز کو قائم کرو، نماز کا خیال رکھو، نماز پر مداومت اختیار کرو لیکن یہ پڑھنی کس طرح ہے؟ اس کی تفصیل قرآن کریم میں نہیں ہے یہ تفصیل سرور کائنات ﷺ نے اپنے اقوال سے ہمیں بتائی ہے اور اپنے افعال کے ساتھ ہمیں سکھائی ہے یہاں جو تعلیم کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اس سے مراد وہی تعلیم نبوی ﷺ ہے کیونکہ سرور کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے جب معلم بنا کر بھیجا ہے تو یہ تعلیم حضور ﷺ دیں گے تو بالواسطہ یہ تعلیم اللہ تعالیٰ ہی کی ہے یہاں پھر مطلب یہ ہوگا جیسے حضور ﷺ نے تمہیں نماز پڑھنی سکھائی ہے، پڑھ کر دکھائی ہے اور پڑھنے کے متعلق بتلایا ہے تو جس وقت تمہیں اطمینان کی کیفیت حاصل ہو جائے اسی طرح پڑھو۔

بیوہ کو ایک سال تک گھر میں رکھنے کی وصیت کا حکم :

اس نماز کی تاکید اور ان چند احکام کے بعد پھر آگے مسئلہ آ گیا کہ اگر کوئی شخص مر رہا ہے اور بیوی اس کی پیچھے موجود ہے اس وقت تک میراث کے احکام کی تفصیل نہیں آئی تھی تو حکم یہ دیا کہ وصیت کر جایا کرو اپنے پچھلوں کو کہ میری بیوی کو سال تک میرے گھر میں رہنے دینا اور اس کو نان نفقہ دیتے رہنا، عدت تو چار ماہ دس دن متعین ہوگئی لیکن اس کو ایک سال تک گھر رہنے کی اجازت وصیت کے ذریعہ سے ہوگئی چار ماہ دس دن تو اس کو گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے۔

یہ تو شرعی حق ہے اور اگر چار ماہ دس دن کے بعد وہ خود جانا چاہے تو تمہیں روکنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر وہ شریعت کے مطابق اپنے نفس میں کوئی تصرف کرتی ہے تو اس کو نہ روکو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے ہاں اگر وہ چار ماہ دس دن کے اندر نکلنا چاہتی ہے یا عدت پوری ہونے سے قبل نکاح کرنا چاہتی ہے پھر جو لوگ روک سکتے ہیں تو وہ اس کو روکیں اگر نہیں روکیں گے تو وہ بھی گناہ میں برابر کے شریک ہوں گے اور آخری آیت کے اندر پھر وہی ذکر کر دیا کہ مطلقات کو کچھ نہ کچھ متاع دیا کرو، کچھ نہ کچھ نفع پہنچایا کرو جس کی تفصیل وہی ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی گئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا آپ نے دیکھا ان لوگوں کی طرف جو نکلے اپنے گھروں سے حالانکہ وہ ہزاروں تھے موت سے ڈر کر

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں کہہ دیا تم مرجاؤ (وہ مرگئے) پھر اللہ نے انہیں زندہ کیا بے شک اللہ تعالیٰ مہربانی کرنے والا ہے لوگوں پر

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا

لیکن اکثر لوگ قدر نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستہ میں لڑو اور یقین کرلو

اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۴۴﴾ کون ہے وہ شخص جو قرض دے اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ

پھر اللہ تعالیٰ بڑھائے اس قرض کو اس کیلئے زیادہ کئی گنا، اللہ تنگ کرتا ہے اور کشادہ کرتا ہے اور اسی کی طرف

تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ

تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾ کیا تو نے نہیں دیکھا بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت کی طرف موسیٰ کے بعد

اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ

جب کہا ان اسرائیلوں نے اپنے وقت کے نبی کو مقرر کر ہمارے لیے ایک بادشاہ کہ ہم اللہ کے راستہ میں لڑیں، اس نے کہا

هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا

کیا تم اس بات کے قریب ہو کہ اگر فرض کردیا گیا تمہارے اوپر لڑنا تو تم لڑو گے نہیں، انہوں نے کہا کیا ہو گیا

لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا

ہمیں کہ ہم اللہ کے راستہ میں نہیں لڑیں گے حالانکہ نکال دیے گئے ہم اپنے گھروں سے

وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ

اور اپنے بیٹوں سے، اور جب ان کے اوپر لڑنا فرض کردیا گیا وہ پیٹھ پھیر گئے مگر ان میں سے کچھ تھوڑے سے،

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ

اللہ تعالیٰ ظالموں کو جاننے والا ہے ﴿۲۴۶﴾ اور کہا انہیں ان کے نبی نے بے شک اللہ تعالیٰ نے متعین کیا ہے

لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ

تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ وہ کہنے لگے کیونکر ہوگی اس کیلئے حکومت ہم پر اور ہم زیادہ حق رکھنے والے ہیں

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ

سلطنت کا بمقابلہ اس کے اور حال یہ ہے کہ وہ مال کی وسعت نہیں دیا گیا، اس نبی نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ نے چنا ہے اس کو

عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ

تم پر اور زیادہ کیا ہے اس کو از روئے کشادگی کے علم اور جسم میں، اللہ تعالیٰ دیتا ہے اپنا ملک

مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ

جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے ﴿۲۴۷﴾ اور کہا انہیں ان کے نبی نے بے شک اس کی سلطنت کی نشانی یہ ہے

اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

کہ آجائے گا تمہارے پاس صندوق اس میں سکون ہے تمہارے رب کی طرف سے اور بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جن کو چھوڑا

اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ

موسیٰ اور ہارون کے متعلقین نے اٹھا لائیں گے اس تابوت کو فرشتے اس میں البتہ نشانی ہے تمہارے لیے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ

اگر تم یقین کرنے والے ہو ﴿۲۴۸﴾ جس وقت جدا ہوئے طالوت لشکر لے کر تو کہا طالوت نے بے شک اللہ تعالیٰ

مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ

تمہیں آزمانے والا ہے ایک نہر کے ذریعہ سے پس جس شخص نے اس نہر میں سے پی لیا وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے اور جو اس میں سے نہیں چکھے گا

فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا

پس بے شک وہ مجھ سے ہے مگر جو شخص اپنے ہاتھ کے ساتھ چلو بھر لے، سب نے اس نہر سے پانی پی لیا کچھ لوگوں کے علاوہ

مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا

ان میں سے جس وقت طالوت اور جو ایمان لانے والے اس کے ساتھ اس نہر سے گزر گئے تو کہنے لگے نہیں طاقت ہمارے لئے

الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا

آج جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی، کہا ان لوگوں نے جو اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ ملنے والے ہیں

اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

اللہ تعالیٰ سے ، کتنی ہی چھوٹی جماعتیں غالب آگئیں بڑی جماعت پر اللہ کے حکم کے ساتھ ، اور اللہ تعالیٰ

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

مستقل مزاجوں کے ساتھ ہیں ﴿۲۴۹﴾ جب یہ میدان میں نکلے جالوت اور اس کے لشکروں کے لیے تو کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! ڈال ہمارے اوپر

صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ ؕ فَهَزَمُوْهُمْ

صبر اور ہمارے قدم جمادے اور کافر لوگوں کے خلاف ہماری مدد کر ﴿۲۵۰﴾ پھر انہوں نے شکست دے دی ان جالوتیوں کو

بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ

اللہ کے اذن کے ساتھ اور داؤد نے قتل کردیا جالوت کو اور اللہ تعالیٰ نے اس داؤد کو سلطنت دی اور حکمت دی اور

عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ

تعلیم دی اس کو ان باتوں کی جو چاہا ، تو اگر نہ ہو اللہ تعالیٰ کا دفع کرنا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ سے ،

لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

تو البتہ خراب ہو جائے زمین لیکن اللہ تعالیٰ مہربانی والے ہیں عالمین پر ﴿۲۵۱﴾

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں ہم پڑھتے ہیں ان آیات کو ٹھیک ٹھیک ، اور بے شک تو البتہ رسولوں میں سے ہے ﴿۲۵۲﴾

تفسیر :

موت سے ڈر کر جہاد نہ کرنا عقیدہ توحید کے منافی ہے :

یہاں سے تذکرہ شرع ہو رہا ہے انفاق فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کا، تیسرے پارے میں زیادہ تر اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ذکر آئے گا مختلف طریقوں کے ساتھ اس کی ترغیب دی جائے گی اور یہاں ابتداء میں دونوں کو ذکر کیا ہوا ہے انفاق اور قتال کو اور پھر ایک واقعہ کے ذریعہ سے قتال کے اوپر برانگیختہ کیا ہوا ہے اور جہاد کی ترغیب دی ہوئی ہے پہلی بات جو بطور تمہید کے ذکر کی گئی اس کا حاصل یہ ہے کہ ترک جہاد میں بسا اوقات یہ چیز دخیل ہوتی ہے کہ انسان موت سے ڈرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم جہاد میں جائیں گے تو وہاں قتل ہو جائیں گے مر جائیں گے اور گھروں میں چھپ کر بیٹھے رہیں گے تو ہم بچ جائیں گے اور یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کے بیان کردہ عقیدہ تقدیر کے خلاف ہے۔

مسلمانوں کو جو بنیادی عقیدے سکھائے گئے ہیں، ان میں اس عقیدہ کو اہمیت حاصل ہے کہ موت کا وقت متعین ہے چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب القدر میں ہے کہ پیدا ہونے سے قبل اللہ تعالیٰ جو فیصلے بچے پر ثبت کرتے ہیں، لکھواتے ہیں اور اس کے بعد روح ڈالتے ہیں ان فیصلوں میں سے ایک فیصلہ یہ بھی ہے کہ اس کی عمر کتنی ہے؟ یہ کب مرے گا؟ موت کا وقت انسان کے اندر روح ڈالنے سے پہلے ہی متعین کر دیا جاتا ہے موت اپنے وقت سے نہ آگے ہو سکتی ہے نہ پیچھے ہو سکتی ہے۔

"اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدة" تم مضبوط قلعوں کے اندر بند ہو گے تو بھی موت تمہیں پالے گی، جہاں کہیں بھی ہو گے وہیں پہنچ جائے گی موت سے انسان بچ نہیں سکتا جس وقت یہ عقیدہ ہے تو پھر یہ سوچنا اگر ہم لڑائی میں جائیں گے تو مر جائیں گے اور گھر بیٹھے رہیں گے تو بچ جائیں گے یہ اس عقیدے کے خلاف ہے۔

موت سے ڈر کر بھاگنے والے اسرائیلیوں کا واقعہ :

اللہ تعالیٰ یہاں ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں اور اس واقعہ کے ضمن میں یہی عقیدہ سمجھاتے ہیں، جس واقعہ کو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے یہ بنی اسرائیل کا واقعہ ہے تفسیروں کے اندر اس کو دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ ایک وقت میں اسرائیلیوں کے کسی شہر میں کوئی وباء پھوٹی جس طرح طاعون پھیل جاتی ہے جس میں کثرت کے ساتھ موتیں واقع ہوتی ہیں اور اس وباء سے بچنے کے لیے ڈر کر اسرائیلی ہزاروں کی تعداد میں

شہر سے نکل گئے اور باہر جا کر جنگل میں آباد ہو گئے اس خیال سے کہ اگر ہم شہر کے اندر رہیں گے تو اس وباء کے اثر سے مر جائیں گے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سبق سکھانا تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگ کر جانا یہ موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا اللہ کا حکم آنا ہی تھا کہ سب کے اوپر موت طاری ہو گئی۔

جب وہ سارے کے سارے مر گئے کچھ دیر کے بعد اس زمانہ کے جو پیغمبر تھے جن کا نام حضرت حزقیل علیہ السلام لکھا ہے انہوں نے دعا کی کہ یا اللہ! انہیں دوبارہ زندگی دے دے ان کی دعا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندگی دے دی تو نمونہ دکھا دیا کہ موت وحیات دونوں ہی اللہ کے ہاتھ میں ہیں جب چاہے وہ مار دے کوئی بچا نہیں سکتا اور جب وہ زندگی دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، اس واقعہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عقیدے کا مشاہدہ کرا دیا، آنکھوں کے سامنے دکھا دیا کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے، موت سے بھاگ کر کوئی بچ نہیں سکتا اور اللہ تعالیٰ جب چاہے موت دے دے کوئی روکنے والا نہیں یہ واقعہ ان کے لیے فضل بایں معنیٰ تھا کہ ان کو دوبارہ زندگی مل گئی اور اس واقعہ کا بیان کرنا ہمارے لیے اللہ کا فضل ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہمارے عقیدہ کی اصلاح ہو گئی تو چاہیئے کہ اس عقیدہ کی قدر کی جائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مقابلہ میں یہ نہ سوچا جائے کہ شاید ہم اس طرح کریں گے تو مر جائیں گے مرنے کا وقت متعین ہے مسلمان کا کام یہ ہے کہ اللہ کا حکم جس وقت آ جائے بازی لگا دے باقی موت تو بہر حال آنی ہے اور اگر اس میدان میں نہیں جاؤ گے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر جاتے تو مر جاتے اور اب تمہاری حیات باقی ہے ایسی بات نہیں ہے۔

موت سے ڈرنا نفاق کی علامت ہے :

چنانچہ جس وقت غزوۂ احد کا ذکر سورۂ آل عمران میں آپ کے سامنے آئے گا وہاں بھی منافقوں کی کلام نقل کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ وہاں بھی جواب اسی انداز سے دیں گے، منافقین جو کہ جہاد میں شریک نہیں ہوئے تھے جس وقت ان کے قبیلہ کے لوگ میدان جہاد میں کام آ گئے شہید ہو گئے تو اس وقت منافقوں نے کہا تھا۔

"لو کانوا عندنا ما ماتوا وما قتلوا" اگر یہ ہمارے پاس رہ جاتے تو نہ یہ مرتے اور نہ یہ قتل کیے جاتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا" قل فادرؤا عن انفسکم الموت ان کنتم صادقین " اگر تمہاری تدبیر پر چلنے سے کوئی شخص موت سے بچ سکتا ہے تو ذرا اپنے آپ کو تو بچا کے دکھا دو، جس وقت تمہارا وقت آ جائے گا اس وقت تم تدبیروں پر عمل کر کے اپنے آپ کو بچا کر تو دکھانا اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، اگر تم اپنی جانیں نہیں بچا سکتے اور ایک سانس بھی تمہیں زائد لینے کا موقع نہیں ملے گا تو پھر کیسے کہتے ہو کہ ہماری تدبیر پر چلنے سے انسان موت سے بچ جائے گا۔

بزدلوں کے لئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی نصیحت :

یہی بات ہے جس کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی زندگی کے آخری حصہ میں لوگوں کے سامنے واضح کیا، خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلامی نو جوانوں کے سپہ سالار رہے ہیں ایمان لانے کے بعد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زندگی میں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زندگی میں، بہت علاقے ان کی وساطت سے فتح ہوئے ہیں، بہت کامیاب سپہ سالار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "سیف من سیوف الله" کا خطاب دیا کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، اس لیے سیف اللہ ان کا لقب ہے، تعجب کی بات ہے کہ ان کا انتقال میدان جہاد میں نہیں ہوا، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو سپہ سالاری سے معزول کر دیا تھا تو یہ مدینہ منورہ آگئے تھے اور ان کا انتقال گھر میں ہوا ہے اور آخر وقت میں فرماتے تھے کہ میرے بدن کا ایک بالشت حصہ خالی نہیں ہے جس میں تیر، تلوار یا نیزے کے زخم کا نشان نہ ہو سارا بدن چھلنی ہے اور میں نے ساری زندگی جہاد کے اندر گزاری لیکن آج میں اونٹ کی طرح گھر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہا ہوں "فلانامت اعین الجبناء" بزدلوں کی آنکھوں کو نیند نہ آئے یعنی اللہ تعالیٰ کرے کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں، میرا حال دیکھ کے ان کو عبرت ہو جائے کہ میدان جہاد میں جانا مرنے کا باعث نہیں ہے اگر لڑائی کے اندر شرکت کرنا موت کا باعث ہوتا تو خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کسی میدان میں جان دیتا لڑتا ساری زندگی رہا، زخمی سارا بدن ہو گیا لیکن موت گھر میں آرہی ہے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی واقعہ ذکر کر کے فرمایا کہ اس کے اندر غور کرو اور غور کرنے کے بعد اللہ کے راستہ میں لڑائی لڑو تا کہ تمہارا عقیدہ مضبوط ہو جائے کہ لڑنے سے بھاگنا زندگی بچانے کا ذریعہ نہیں ہے یا تو یہ کسی وباء سے ڈر کر نکلے تھے اور بعض روایات کے اندر یوں بھی آتا ہے کہ کسی دشمن نے حملہ کیا تھا تو یہ جہاد سے جی چرا گئے اور ان سے ڈر کر یہ بھاگ گئے اور جہاں کہیں ہزاروں کی تعداد میں چھپے تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر موت طاری کر دی آگے واقعہ اسی طرح ہے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو ان لوگوں کیلئے بھی عبرت بنایا اور ہمارے سامنے ذکر کر کے ہمارے لیے بھی عبرت بنایا جس میں بتایا کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی انسان کا اپنا نقصان ہے ورنہ موت نے تو اپنے وقت پر آنا ہے، موت وحیات کا رشتہ براہ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ساری تقریر جو میں نے کی عام مفسرین نے اس موت سے حقیقی موت مراد لی ہے اسی کے مطابق یہ بات میں نے آپ کے سامنے نقل کر دی۔

آیت کی تفسیر ثانی :

ویسے موت وحیات یہ لفظ جس طرح حقیقی موت اور حقیقی زندگی کے لیے بولے جاتے ہیں اس طرح

موت وحیات کے لفظ میں کچھ وسعت بھی ہے ایک قوم اخلاقی طور پر اگر مردہ ہوگئی، جذبہء جہاد ان کے اندر نہیں رہا، دشمن کے سامنے مرعوب ہو گئے، غلام بن گئے، ذلیل ہو گئے اس کو بھی کہتے ہیں یہ قوم مردہ ہے ان کے اندر زندگی کے آثار نہیں اور پھر جس وقت وہ جہاد کرتے ہیں اپنی کھوئی ہوئی عزت کو واپس لے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ فلاں قوم زندہ ہے، زندہ قوموں کا شعار یہ ہے کہ وہ جان نہیں چھڑایا کرتے، مال خرچ کرنے سے بچا نہیں کرتے بلکہ اپنی عزت اور وقار کو باقی رکھنے کے لئے یا اللہ کے نام کو بلند رکھنے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار ہوتے ہیں اور جو مردہ قومیں ہوتی ہیں ان کو نہ اپنی عزت کا احساس ہوتا ہے، نہ ذلت کا خیال ہوتا ہے تو موت وحیات یہ اخلاقی مردانگی اور جذبہء جہاد کے سرد ہونے سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے، اور حیات سے مراد ہوگا کہ ان کے اخلاق دوبارہ ابھر آئے۔

چونکہ بعض تفاسیر کے اندر اس طرح مراد واضح کی گئی ہے تو لفظوں کے تحت اس کی بھی گنجائش ہے مطلب یہ ہوگا کہ اسرائیلی تو ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن وہ اخلاق سے عاری ہو گئے، جذبہ جہاد سے خالی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلت کے گڑھے میں دھکیل دیا اور ان کی دنیا کے اندر کسی قسم کی کوئی عزت نہ رہی جس وقت انہوں نے جہاد کو چھوڑ دیا اور محنت، مشقت کرنی چھوڑ دی۔

لیکن پھر کسی نبی کے آنے سے ان کی دوبارہ تربیت ہوئی تو اس تربیت کے ذریعہ سے انہوں نے اپنی کھوئی ہوئی عزت واپس لی اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر دوبارہ زندگی کے آثار پیدا کیے یہ واقعہ عبرت ہے قوموں کے لیے کہ جو قومیں آرام طلب ہو جاتی ہیں، محنت اور مشقت سے گھبرانے لگ جاتی ہیں وہ زندہ ہونے کے باوجود مردہ ہیں اور جو قومیں محنت کرتی ہیں مشقت برداشت کرتی ہیں، جان اور مال کی قربانی دیتی ہیں اصل زندگی انہی قوموں کی ہوتی ہے تو یہ واقعہ جو دنیا کے اندر پیش آیا اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے نقل کرتا ہے یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس قسم کے واقعات تمہیں سنا کے سیدھے راستہ کی طرف لے جاتا ہے لوگوں کو چاہیئے کہ ان واقعات کی قدر کریں۔

پچھلی تاریخ کے اوپر نظر ڈالیں کہ دنیا کے اندر یہ دستور چلا آتا ہے کہ محنت ومشقت سے جان بچانے والی قومیں مردہ ہو جاتی ہیں اور جو جہاد، اجتہاد، محنت، کوشش اور لگن کو اپنا شعار بناتی ہیں اصل زندگی انہی لوگوں کی ہوتی ہے اس واقعہ کی طرف متوجہ کر کے جہاد کی طرف برانگیختہ کیا جائے تو تفسیروں کے اندر یہ بھی منقول ہے اور لفظوں کے تحت اس کی بھی گنجائش ہے لیکن عام طور پر مفسرین نے موت وحیات سے حقیقی موت وحیات مراد لی ہے۔

الم تر الی الذین کا خطاب بطور محاورہ کے ہے:

الم تر سے جو خطاب کیا گیا ہے یہ بطور محاورے اور بطور مثال کے ہے، جس طرح ہم جب کسی عجیب

بات کوشروع کرتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تو نے دیکھا نہیں حالانکہ پتہ ہوتا ہے کہ دیکھا نہیں ہے، یہ الفاظ محاورۃ کلام کی ابتداء میں آجاتے ہیں جس وقت کوئی عجیب واقعہ پیش آجائے، اس لئے محل تعجب میں قرآن کریم بھی ''الم تر'' کے ساتھ تعبیر کرتا ہے کہ یہ واقعہ ایسا ہے جو دیکھنے کے قابل تھا کیا آپ نے دیکھا نہیں اور یا پھر یہاں رؤیت سے رؤیت قلبی مراد ہے پھر بھی الم تر کے ساتھ جو اس کو تعبیر کیا گیا ہے تو مقصد یہی ہے کہ اس طرح یہ واقعہ یقینی ہے گویا کہ آنکھوں کے سامنے ہے، یہ انداز محل تعجب میں واقعہ نقل کرتے ہوئے اختیار کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ خطاب ایسے شخص کو کیا جا سکتا ہے جس نے وہ واقعہ دیکھا نہیں لہٰذا ان الفاظ کے ساتھ اس شخص کو خطاب کرنا جس نے وہ واقعہ دیکھا نہ ہو یہ قابل اعتراض نہیں ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب:

جہاد جس طرح جانی ہوتا ہے اس طرح مالی بھی ہوتا ہے، اب آگے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی کہ جہاد کے اندر جس وقت تک مال خرچ نہ کیا جائے بسا اوقات جہاد میں کامیابی نہیں ہوتی، مال کو بھی قربان کرنا پڑتا ہے تو بنیادی طور پر اس کو بھی ذکر کر دیا، اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کو یہاں تعبیر کیا گیا ہے لفظ قرض کے ساتھ یہ بھی ایک قسم کی ترغیب ہے'' انفاق فی سبیل اللہ'' کی۔

قرض کی کیا حقیقت ہے؟ کہ جو شخص قرض لیتا ہے بشرطیکہ مفلس نہ ہو اور ظالم نہ ہو تو لیا ہوا قرض واپس یقیناً دیتا ہے اگر وہ مفلس ہے تو وہ واپس نہیں دے گا آپ کا دیا ہوا ضائع ہو جائے گا اور اگر وہ ظالم ہے کہ دوسرے کا حق دبا لیتا ہے تو بھی آپ کا دیا ہوا ضائع ہو سکتا ہے کہ آپ سے اس نے لے لیا لیکن آپ کا حق وہ واپس نہیں کرتا لیکن اگر کوئی مفلس بھی نہیں اور ظالم بھی نہیں تو جو آپ سے قرض لے گا وہ آپ کو واپس یقیناً دے گا، اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں آپ کو خطاب کرتے ہیں کہ کون مجھ سے استغفار کرتا ہے کہ میں اس کو معاف کر دوں ان جملوں کے بعد پھر اللہ تعالیٰ یوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور کہتے ہیں، ''من یقرض غیر ظلوم ولا عدوم'' کون قرض دیتا ہے ایسے کو جو نہ مفلس ہے اور نہ وہ ظالم ہے کہ کسی کی حق تلفی کرے، نہ وہ عدوم ہے، عدوم اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو اور ظلوم اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کی حق تلفی کرنے والا ہو کیونکہ یہ دو ہی باتیں ہیں جس کی بناء پر دیا ہوا قرض ضائع جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ دونوں صفتیں ذکر کرتے ہیں کہ نہ میں عدوم ہوں نہ ظلوم ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے نام پر تم جو خرچ کرو گے تمہاری طرف اسی طرح واپس آئے گا جیسے تم کسی غیر عدوم اور غیر ظلوم کو قرض دو تو یہ لفظ قرض استعمال کرنے میں ترغیب ہے کہ دیا ہوا واپس ضرور آئے گا پھر یہی نہیں کہ جتنا دو گے اتنا ہی واپس آئے گا بلکہ تمہیں

یہ تحریض دی جارہی ہے کہ جتنا دو گے اس سے کئی گنا بڑھ کے واپس آئے گا اب یہاں دیکھئے اللہ تعالیٰ کا معاملہ بندوں کے ساتھ عجیب ہے ایک تو آپ کے مشاہدے میں ہے جو مشاہدے میں ہے اس پر تو آپ کا عمل ہے اور جس پر آپ کو ایمان بالغیب کے طور پر کہا جارہا ہے اس میں ہمیں تردد ہے اور اس میں دل پر وہ اثر نہیں پڑتا۔

اللہ تعالیٰ کے بڑھا کر دینے کی حسی مثال :

اللہ نے عادت اپنائی ہے کہ آپ سے جو لیتا ہے یعنی آپ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا چڑھا کر واپس کرتا ہے ایک تو اس کی مثال ہے کاشتکار کہ یہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق کچھ مال مٹی میں بکھیرتے ہیں اور وہ جتنا بکھیرتے ہیں اس سے کئی گنا بڑھ کے واپس آتا ہے اب یہاں عادت اللہ تعالیٰ کی یہی ہے کہ بڑھا کے واپس کرتے ہیں اس لئے ہر کوئی جرأت کرتا ہے اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق گھر سے مال اٹھاتا ہے اور جا کر مٹی میں بکھیر دیتا ہے اس امید پر کہ زیادہ واپس آئے گا، کبھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے تحت کسی عارضے کی بناء پر دنیا میں کچھ تھوڑا واپس کر دیں یا نہ لوٹائیں، آپ کے اعمال کی غلطی کی بناء پر کوئی چیز دنیا میں واپس نہیں بھی لوٹاتے لیکن اکثر عادت اسی طرح ہے اور دنیا کی بنا اسی طرح ہے کہ جتنا بکھیرتے ہیں اس سے زیادہ واپس لے لیتے ہیں اب یہ تو اللہ کی عادت چونکہ ہمارے سامنے ہے بالکل بلا جھجک بیج بکھیرتے ہیں اور ہمارے دل میں کوئی کسی قسم کا خطرہ نہیں آتا لیکن دوسرا طریقہ جو ایمان بالغیب کے طور پر بتایا جارہا ہے کہ اللہ کے نام پر مساکین کو دو، اس کے نام پر یتیموں کو دو، اللہ کے نام پر قومی کاموں کے اندر لگاؤ، جہاد کی تیاری کرو اور مسافر کی خدمت کرو، بیواؤں کی خدمت کرو یہ ایسے ہے جیسے تم مجھے قرض دے رہے ہو مطلب یہ ہے کہ تمہارا دیا ہوا ضائع نہیں جائے گا جتنا دو گے اس سے بڑھ کر واپس آئے گا۔

اب یہ چیز چونکہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے ایمان بالغیب ہی اس کا تقاضہ کرتا ہے تو بہت سارے لوگوں کو یہاں تردد ہو جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بہت جگہ یہ چیز بیان کی گویا کہ ایک قسم کی تحریر تمہیں دی جارہی ہے کہ ذمہ داری میری ہے تم جتنا خرچ کرو گے میں دنیا میں یا آخرت میں اس سے زیادہ کر کے تمہیں لوٹا دوں گا تو یہاں قرض کے لفظ کے ساتھ یہی اثر ڈالنا مقصود ہے ورنہ نعوذ باللہ وہ مفہوم نہیں جس قسم کا بدطینت یہودیوں نے سمجھ لیا تھا کہ "الله فقير ونحن اغنياء" کہ جب اللہ تعالیٰ قرض مانگتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مال دار جس طرح فقیر مال دار سے مانگا کرتا ہے اس طرح اللہ بھی ہم سے مانگتا ہے، یہ مقصد نہیں ہے جو ان خبیثوں نے سمجھا تھا، ایسی بات نہیں ہے "انتم الفقراء والله غني حميد" "تم سارے اللہ کے محتاج ہو اللہ غنی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل کا اندازہ تو کرو :

لیکن اس کی یہ اپنے بندوں پر شفقت ہے کہ دیتا بھی خود ہے اور پھر کہتا ہے لاؤ مجھے دو جس طرح آپ بچوں کے ساتھ دل بہلاتے ہیں کہ پہلے ایک روپیہ دے دیا پھر کہا کہ یہ مجھے دے دے میں تجھے دو کر کے دیتا ہوں اگر بچہ خوشی کے ساتھ وہی روپیہ آپ کو واپس لوٹا دے اور آپ ایک کی بجائے خوش ہو کے دس دے دیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ نے مہربانی کرنے کے لیے بچہ کو دیا، دے کے پھر لیا اور پھر بڑھا کے اس کو دے دیا پہلا روپیہ جو تھا وہ بھی آپ کا ہی دیا ہوا تھا اس نے آپ کے ہاتھ پر اگر دوبارہ رکھ دیا تو اس نے کونسا احسان کیا؟ تو اسی طرح یہاں دیا ہوا جو کچھ بھی ہے سب اللہ کا ہے ہم ماں کے بطن سے کچھ نہیں لے کر آتے۔

لیکن جب وہی چیز لوٹا کر واپس دی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ خوش ہو کے اور بڑھا کے دے دیتے ہیں یہ اس کی مہربانی ہے اور بندوں پر مہربانی کا ایک طریقہ ہے اور بندوں کو آزمانے کا ایک طریقہ ہے ورنہ احتیاج کی بناء پر اللہ تعالیٰ ہاتھ نہیں پھیلاتے قرض کے لفظ سے تعبیر کرنا اسی ترغیب دینے کے پہلو سے ہے قرض کے ساتھ حسن کی قید لگا دی کہ اچھا قرض یعنی حلال مال میں سے دو، اچھے کا مطلب یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ دو، ریا کاری مقصود نہ ہو اس قسم کے جذبات کے ساتھ جو دیا جائے گا وہ قرض حسنہ ہے اس کو اللہ تعالیٰ قبول کریں گے۔

اور پھر اللہ تعالیٰ اس دینے والے کے لیے بڑھائے گا کئی گنا زیادہ یعنی کم از کم دس اور سات سو گنا کا ذکر تو قرآن میں صراحتاً ہے لیکن آگے بھی فرمایا'' **فیضعف لمن یشاء**''اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا بڑھا دے گا اور اس بڑھانے کو ایک مثال کے ساتھ حدیث شریف میں واضح کیا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کے نام پر خلوص کے ساتھ ایک کھجور دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بڑھاتے جاتے ہیں بڑھاتے جاتے ہیں یہاں تک کہ احد پہاڑ کے برابر وہ ہو جاتی ہے اب آپ اندازہ کیجیے کہ ایک کھجور اور احد پہاڑ کے درمیان کیا نسبت ہے وزن کے اعتبار سے دیکھیں گے تو کھجوریں شمار میں نہیں آسکتیں کہ احد پہاڑ کے وزن میں کتنی آسکتی ہیں اور اگر پتھروں کو کھجوروں کے برابر توڑ توڑ کر کھجوریں بنائی جائیں تو آپ اندازہ کیجیے کہ کتنی بن جائیں گی۔

اس لیے یہ سات سو گنا پر بند نہیں ہے اللہ تعالیٰ خلوص کی طرف دیکھتے ہوئے، اور بوقت ضرورت جو خرچ کرتے ہیں اس وقت کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ فرماتے رہتے ہیں جتنا خلوص ہو گا اتنا بڑھ جائے گا اور جتنا ضرورت کے وقت انسان خرچ کرے گا اتنا بڑھ جائے گا مختلف عوارض ہیں جن کی بناء پر ثواب میں اضافہ ہوتا ہے اور پھر خرچ کرتے ہوئے تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہیئے کہ اگر ہم اللہ کے راستہ میں خرچ کریں گے تو خود

تنگ دست ہو جائیں گے یہاں بھی وہی بات ہے کہ مال کو روک کے رکھنا رزق کی کشادگی کا باعث نہیں، اللہ کے نام پر خرچ کرنا رزق کی تنگی کا باعث نہیں، یہاں رزق کا قبض اور رزق کا بسط براہ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے جس طرح جہاد میں جانا موت کا باعث نہیں اور جہاد سے ڈر کر گھر میں بیٹھے رہنا یہ بچنے کا باعث نہیں اسی طرح مال کو روک کے رکھنا یہ رزق میں وسعت کا ذریعہ نہیں اور خرچ کرنا تنگی کا ذریعہ نہیں رزق کا قبض اور رزق کا بسط براہ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے یہ جذبہ بھی تمہارے لیے خرچ کرنے سے مانع نہ بنے۔

طالوت کا جالوت کو شکست دینے کا واقعہ :

اب آگے ایک واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں پیش آیا تھا اور اس کو بھی جہاد کی ترغیب کے طور پر ذکر کر رہے ہیں بات وہی ہے کہ اسرائیلیوں میں ایک دور ایسا آیا جو انتہائی انتشار کا دور تھا، افراتفری کا دور تھا نہ تو ان کے اندر کوئی قوت رہی نہ ان کے اندر کوئی تنظیم رہی، بدانتظامی عام ہو گئی، اور دشمن ان پر چڑھ آیا، ان کے بہت سارے شہر چھین لیے، اور بہت سارے آدمیوں کو قید کر کے لے گیا اب کئی سالوں کے بعد اسرائیلیوں کو خیال آیا تو اپنے وقت کے نبی جن کا نام سموئیل یا شموئیل علیہ السلام ہے سے کہنے لگے کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ متعین کرو جو ہماری سیاسی تنظیم کرے، ہماری تربیت کرے تا کہ ہم اس کے ساتھ مل کر جہاد کریں اور اپنا کھویا ہوا علاقہ اور اپنے گرفتار شدہ بچوں کو ہم آزاد کرا لیں تو وہ نبی چونکہ ان کی عادتوں کو جانتے تھے۔

اس لیے ان سے کہا دیکھو کہیں ایسا خطرہ تو نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کہہ کے جہاد کا حکم لے لو اور اللہ تعالیٰ بادشاہ متعین کر دیں کہ اس کے ساتھ مل کر جہاد کرو اور جب وقت آ جائے پھر تم گھروں میں بیٹھے رہ جاؤ چونکہ پہلے اس قسم کے کئی نقشے دیکھے جا چکے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں بھی جب انہوں نے کہہ دیا تھا ''اذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون'' ''تو اور تیرا رب جا کر لڑتے رہو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں'' اس لیے نبی نے احتمال ذکر کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کی طرف سے حکم لے لو اور پھر تم سستی کرو، وہ کہنے لگے نہیں، کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارے علاقے وہ لے گئے، ہمیں گھروں سے نکال دیا، ہمارے بچوں کو گرفتار کر کے لے گئے، ایسے وقت میں ہم کیوں نہیں جہاد کریں گے ہم ضرور جہاد کریں گے؟ اس نبی نے اللہ تعالیٰ سے اجازت لے کے طالوت کو نامزد کر دیا کہ یہ تمہارا بادشاہ ہے اس کی قیادت میں تم اپنی تنظیم کرو اور تنظیم کر کے جہاد کرو۔

اب طالوت یہ حضرت بنیامین علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے یہ بارہ قبیلے بنی اسرائیل کے چلے آ رہے تھے ان میں سے بنیامین علیہ السلام کا قبیلہ ایسا تھا جو افراد کے اعتبار سے بھی کم اور مال میں بھی باقی قبائل کے مقابلے میں کم

سمجھا جاتا تھا، یہ طالوت بہت غریب گھرانے کا تھا اور ان کے خاندان کے افراد بھی کم تھے لیکن اس کے اندر علمی استعداد تھی، انتظام کی صلاحیت تھی، علم سیاست کا ماہر تھا، جنگی اصول سے واقف تھا، اور قد وقامت بھی ایسا تھا کہ ماشاء اللہ دیکھ کر دوسرے پر رعب پڑے، مضبوط جسم اور اونچے قد کا مالک تھا البتہ مال نہیں تھا اور کسی اونچے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے ظاہری طور پر یہ خاندان باقیوں کے مقابلہ میں پست سمجھا جاتا تھا۔

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طالوت کی تعیین ہوئی تو اسرائیلی اپنے مزاج کے مطابق پھر بگڑ گئے وہ کہنے لگے یہ کیسا بادشاہ ہے؟ نہ اس کے پاس مال ودولت نہ یہ اونچے خاندان کا، اس کے مقابلہ میں ہم بادشاہت کے زیادہ حقدار ہیں یعنی وہ سمجھتے تھے کہ جس کے پاس مال زیادہ ہو اور اونچے خاندان سے تعلق رکھے وہی برسر اقتدار آنا چاہیئے، چاہے وہ حد درجہ کا نالائق ہی کیوں نہ ہو سیاست نہیں جانتا، انتظام کرنا نہیں جانتا، بہادر نہیں ہے، دشمن کی چالوں کو نہیں سمجھتا لیکن قیادت اسی کو ملنی چاہیئے جس کے پاس پیسے بہت ہوں یہ پرانا ذہن چلا آرہا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل جب یہ دولت مند ہی کامیاب ہو کر سامنے آئے ہیں تو ساری قوم کا بیڑا غرق کر دیا۔

یعنی یہ نہیں دیکھتے کہ قابلیت کس میں ہے کس میں نہیں ہے؟ پیسے زیادہ خرچ کر کے کامیاب ہو جائے چاہے بدکار ہی کیوں نہ ہو اور پھر جس وقت بدکار سامنے آجائے گا تو قوم کو بدکار ہی بنائے گا اور بزدل قسم کے لوگ جب منصب اقتدار کو سنبھال لیں گے تو کیا بہادری دکھائیں گے؟ اور کیا قومی مسائل کو حل کریں گے؟ آج ہمارے ہاں بھی اقتدار انہی کو ملتا ہے، انتخاب میں وہی حصہ لے سکتے ہیں، وہی اپنے علاقوں میں کامیاب ہوتے ہیں جو پیسے زیادہ خرچ کرلیں اور ہم یہ نہیں دیکھتے کہ علم کس کے پاس ہے، تقویٰ کس کے پاس ہے، مسائل کون سمجھتا ہے، ان کو حل کرنے کی استعداد کس میں ہے یہی وجہ ہے کہ پھر قومی مسائل حل نہیں ہوتے اور معاملہ سارے کا سارا خراب ہوتا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب طالوت کو متعین کیا تو بنی اسرائیل نے بھی اسی ذہن کے ساتھ اعتراض کیا اس نبی نے جو جواب دیا اس کا حاصل یہ ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے اللہ نے چنا ہے، اللہ کے چنے ہوئے پر تم کیوں اعتراض کرتے ہو؟

دوسری بات یہ ہے کہ بادشاہ بننے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے اور بدنی قوت کی ضرورت ہے وہ طالوت کو تم سب سے زیادہ حاصل ہے اس لیے اس ظاہری دلیل کے ساتھ بھی فوقیت اس کو ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ سلطنت، ملک اللہ کا ہے جس کو چاہے دے دے۔

چوتھی بات یہ ہے اللہ وسعت والا ہے اور چاہے گا تو اس کو بھی وسعت دے دے گا یہ کونسی بات ہے کہ جو آج غریب ہے وہ ہمیشہ غریب ہی رہے اس طرح ان کو مطمئن کیا اور پھر اس نے ایک حسی نشانی پیش کی کہ اس لڑائی میں جس میں دشمن ان پر غالب آ گئے تھے وہ تابوت جس کو یہ بطور تبرک کے اپنے سامنے رکھا کرتے تھے بلکہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز بھی اس کی طرف منہ کر کے پڑھا کرتے تھے قبلہ کی جگہ اس کو استعمال کرتے تھے لڑائی میں جاتے تو اس کو آگے آگے رکھتے تھے اس کی برکت کے ساتھ ان کو فتوحات ملتی تھیں۔

لیکن جب اخلاق سے عاری ہو گئے دشمن کے سامنے مغلوب ہوئے تو دشمن ان کا تابوت بھی چھین کر لے گیا اور یہ ان کے لیے بہت بڑے صدمہ کی بات تھی کہ تابوت جو ہمارا روحانی مرکز تھا وہ بھی گیا اور وہ دشمنوں کے قبضہ میں تھا نبی نے کہا اس کی سلطنت کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ تابوت تمہارے پاس آ جائے گا فرشتے اٹھا کر چھوڑ جائیں گے یہ پکی بات ہوگی کہ طالوت اللہ کی طرف سے بادشاہ ہے چنانچہ واقعہ ایسے ہی ہوا کہ وہ تابوت جس شہر میں رکھتے وہیں وباء پھوٹ پڑتی، جدھر رکھتے وہیں کوئی نہ کوئی بیماری پھیل جاتی جب بار بار انہوں نے تجربہ کیا تو کہنے لگے کہ یہ تابوت ہی رکھنے کے قابل نہیں ہے تو وہ تابوت بیل گاڑی پر رکھ کے گاڑی کو ہانک دیا اور وہ بیل بغیر کسی سبب کے طالوت کے دروازے کے سامنے آ کھڑے ہوئے گویا کہ فرشتوں کی راہنمائی کے ساتھ وہ بیل طالوت کے دروازے پر پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے غیبی امداد کے ساتھ فرشتوں کی وساطت سے تابوت واپس بھیج دیا جب یہ حسی نشانی پائی گئی تو قوم مطمئن ہو گئی۔

اور اس تابوت کے اندر تورات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے کچھ ملبوسات ہارون علیہ السلام کے کچھ ملبوسات اسی طرح من وسلویٰ کا کچھ نمونہ اس سے وہ لوگ برکت حاصل کیا کرتے تھے اس کے آنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے جب مطمئن ہو گئے تو اب طالوت نے تنظیم شروع کی اور تنظیم بنانے کے بعد جہاد کا اعلان کیا تو اس جوش کے اندر بھیڑوں کی طرح سارے اسرائیلی اکٹھے ہو گئے کہ ہم جہاد کرنے کیلئے جاتے ہیں۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ اگر فوج کے اندر اس قسم کے آدمی شامل ہو جائیں جو بزدل ہوں اور مشقت برداشت نہ کر سکیں وہ باقیوں کے بھی قدم اکھاڑنے کا باعث بن جاتے ہیں اب منتخب کرنا کہ تو آ جا، تو نہ آ، تو پیچھے ہٹ جا یہ بسا اوقات مصلحت کے خلاف ہوتا ہے تو حضرت طالوت نے ان کو اللہ کی اجازت کے ساتھ ایک امتحان میں ڈال دیا جس سے پتہ چلے گا کہ کون مشقت اٹھا سکتا ہے کون مشقت نہیں اٹھا سکتا، سفر کر کے جا رہے تھے، گرمی کا موسم تھا پیاس کی شدت تھی طالوت نے اعلان کر دیا کہ آگے نہر آنے والی ہے کسی کو پانی پینے کی اجازت نہیں ہے جو پانی پیئے گا میرے ساتھ نہیں جا سکتا اور جو نہیں پیئے گا وہ میرے ساتھ رہے گا البتہ ایک چلو بھرنے کی اجازت ہے۔

اب یہ اعلان بالکل ایسے موقع کے مطابق تھا کہ حکم کے تحت کون پیاس کی مشقت برداشت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا اس اعلان ہو جانے کے بعد جو لوگ پانی پیٹ بھر کے پی لیں گے وہ ساتھ لے جانے کے قابل نہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ احکام کی پابندی نہیں کریں گے اور کوئی مشقت نہیں اٹھائیں گے اب وہ پیاس سے مرے جا رہے تھے جب گئے تو سارے ہی نہر پر ٹوٹ پڑے یہ نہیں دیکھا کہ ہمارے قائد نے کیا اعلان کیا ہے اس کی کچھ پرواہ نہیں کی بہت تھوڑے سے بچ گئے جن کی تعداد حدیث شریف میں تین سو تیرہ (۳۱۳) آتی ہے جو طالوت کے ساتھ نہر کو عبور کر کے اگلے میدان میں گئے باقی جن لوگوں نے پیٹ بھر کے پانی پیا تھا طالوت نے بھی ان کو مسترد کر دیا اور خود بھی ان پر ایسی سستی طاری ہوئی کہ وہ پیچھے رہ گئے اور لشکر کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور باقی سارے کے سارے پیچھے رہ گئے تو جتنے لوگ طالوت کے ساتھ نہر کو عبور کر کے میدان میں گئے تھے وہی جہاد میں شریک ہوئے یہ بات بخاری شریف میں کئی روایتوں کے اندر ذکر کی گئی ہے کہ اہل بدر کی تعداد بھی اتنی ہے، اب یہ خیال کرنے لگے کہ یہ تو بہت تھوڑی جماعت رہ گئی اور اُدھر جالوت بادشاہ بڑا جابر، بڑا فاتح جس نے پہلے بھی ان کو مارا تھا اس کا رعب بھی تھا۔

تو بعض لوگوں کی زبان سے نکلا ''لاطاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ'' آج ہم جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے ہمارے اندر طاقت نہیں ہے اور جو ''قوی الایمان'' تھے وہ کہنے لگے کہ تعداد کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے فتح ونصرت تعداد پر موقوف نہیں ہے کئی دفعہ ایسے ہو جاتا ہے کہ فتح ان کی ہوا کرتی ہے ''کم من فئۃٍ قلیلۃٍ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللہِ'' اس اعلان نے دل بڑھا دیا تو پھر وہ طالوت تین سو تیرہ (۳۱۳) کو لے کر میدان میں چلے گئے۔

مقابلے میں جالوت اور اس کی فوجیں آ گئیں جس وقت یہ فوجیں آئی ہیں تو سب سے پہلے جالوت آگے آیا پرانے زمانہ میں جنگ کا یہ طریقہ تھا کہ جب فوجیں بالمقابل کھڑی ہو جائیں تو ایک طرف سے ایک جوان نکلتا دوسری طرف سے بھی ایک جوان نکلتا یوں پہلے ایک ایک دو دو مقابلہ کرتے تھے پھر گھمسان کی لڑائی شروع ہو جاتی تھی جیسے میدان بدر میں بھی پہلے تین مشرک آئے تھے انہوں نے آ کر للکارا تھا تو ادھر سے بھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان میں اتارے تھے ابتداء یوں ہی ہوتی تھی۔

جالوت نے جب آ کر للکارا تو اس کے مقابلے میں حضرت داؤد علیہ السلام گئے یہ داؤد طالوت کی فوج میں تھے اور تھے ابھی چھوٹے اور انہوں نے جا کر جس وقت مقابلہ کیا تو جاتے ہی ایک پتھر جالوت پر پھینکا جو اس کی

پیشانی پر لگا اور وہ جالوت گر گیا بس جالوت کا گرنا تھا کہ مسلمانوں کا حوصلہ بڑھ گیا اور ان کی فوجوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور پھر مقابلہ میں جالوت کی فوجیں شکست کھا گئیں، طالوت کی فوجیں فتح پا گئیں اس واقعہ کو بیان کر کے کیا بتلایا؟ ہمیں کیا سبق دیا؟ کہ دیکھو جو مستقل مزاج تھے، ایمان میں پختہ تھے، تھوڑے ہونے کے باوجود کثیر تعداد میں آئے ہوئے دشمن پر فتح پا گئے اس لیے تم بھی اپنی قلت تعداد کو نہ دیکھو مستقل مزاج رہو، اللہ کے احکام کی پابندی کرو، اور اپنے قائد کی ہدایات کی پابندی کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اسی طرح فتح دے گا جس طرح طالوت کے آدمیوں کو جالوت کے مقابلہ میں فتح دے دی تھی۔

جہاد امن عالم قائم رکھنے کا ذریعہ ہے:

اور پھر آگے جہاد کی ایک حکمت بتا دی کہ اگر وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ ان شریروں کا سر نہ کٹوائے تو زمین میں سارا فتنہ وفساد پھیل جائے گا۔

جہاد اس لیے ضروری ہے تا کہ شرارت کا خاتمہ ہو یہ بھی ایک ترغیب کا پہلو ہے کہ جہاد کرو گے تو عالم سے فساد ختم ہوگا اگر جہاد نہ ہو تو پھر دوسرے لوگوں کی نہ عزت محفوظ رہے گی، نہ جان محفوظ رہے گی، نہ مال محفوظ رہے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے پٹوا کے دنیا کے اندر امن قائم کرتا ہے پھر یہ واقعہ جو بیان ہوا کتب سابقہ کا ہے، امم سابقہ کا ہے، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں پڑھا نہیں، کہیں سے سنا نہیں، پھر اس کو صحیح جزئیات کے ساتھ ذکر کر دینا یہ علامت ہے اس بات کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی ہے اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے واقعات کی تعلیم دیتے ہیں یہ آپ کی دلیل رسالت ہے، آخری آیت کے اندر اس واقعہ کے دلیل ہونے کی طرف اشارہ کر دیا، یہ واقعہ کا خلاصہ ہے جو آپ کے سامنے ذکر کیا گیا ہے۔

فائدہ:

طالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ بنے اور ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ بنے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ

یہ رسول ہم نے فضیلت دی ان میں سے بعض کو بعض پر، ان میں سے کوئی وہ ہے

كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

جس سے اللہ نے کلام کی اور ان میں سے بعض کے درجات اونچے کیے، اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ

واضح دلائل دیئے اور ہم نے اس کی تائید کی پاکیزہ روح (جبرائیل) کے ساتھ، اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ

مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا

جو ان سے پیچھے ہیں بعد اس کے کہ آگئے ان کے پاس واضح دلائل لیکن انہوں نے اختلاف کیا

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ قف

پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایمان لے آئے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا

لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے (۲۵۳) اے ایمان والو! خرچ کرلو اس مال میں سے جو

رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ

ہم نے تم کو دیا قبل اس کے کہ آجائے ایسا دن جس میں خرید وفروخت نہیں اور نہ اس دن میں یاری باشی ہے

لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

نہ اس دن میں شفاعت ہے اور انکار کرنے والے ہی ظلم کرنے والے ہیں (۲۵۴) اللہ، کوئی معبود نہیں مگر وہی،

اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

وہ زندہ ہے تھامنے والا ہے، نہیں پکڑتی اس اللہ کو اونگھ نہ نیند، اسی کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ

اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے جو سفارش کرے اس کے سامنے مگر اس کی اجازت کے ساتھ، جانتا ہے

مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ

اللہ تعالیٰ ان سب حالات کو جو لوگوں کے سامنے ہیں اور جو لوگوں کے پیچھے ہیں، نہیں احاطہ کرتے یہ لوگ کسی چیز کا

عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

اللہ کے علم میں سے مگر اسی چیز کا جو اللہ چاہے، اس کی کرسی آسمان وزمین سے وسیع ہے،

وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

زمین وآسمان کی حفاظت اس پر گراں نہیں گزرتی اور وہ علو اور عظمت والا ہے ﴿۲۵۵﴾

ماقبل سے ربط:

پچھلے رکوع میں طالوت اور جالوت کا واقعہ بیان کیا گیا تھا اور پھر اس قسم کے واقعہ کو صحیح انداز کے ساتھ بیان کرنا جبکہ نہ آپ نے کسی کتاب میں پڑھا نہ آپ اہل علم کی صحبت میں رہے یہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آنے کی دلیل ہے اس لیے آخری آیت میں " وانك لمن المرسلين " کہہ کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان کیا گیا تھا کہ یہ واقعات ہم آپ پر بیان کرتے ہیں، آیات ہم آپ پر پڑھتے ہیں اور آپ رسولوں میں سے ہیں، تو " انك لمن المرسلين " میں رسولوں کا ذکر آگیا اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہوگیا تو مرسلین کا ذکر آنے کے ساتھ یہ درمیان میں رسولوں کے متعلق ایک بات آگئی جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی پر مشتمل ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم من کل الوجوہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں:

تو تلك الرسل کا معنی یہ ہوا کہ یہ رسول جن کا پیچھے " المرسلين " میں ذکر آیا یہ رسولوں کی جماعت ایسی ہے کہ سب اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، رسالت کا شرف سب کو حاصل ہے۔

لیکن ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، بعض کو بعض کے مقابلہ میں فضل حاصل ہے کسی رسول میں اللہ نے کوئی کمال رکھا، کسی میں کوئی کمال رکھا، کوئی رسول کمالات سے خالی نہیں لیکن جزوی فضیلت ہر کسی کو دوسرے کے مقابلے میں ہے کہ ایک رسول کے اندر کوئی خصوصیت ہے جو دوسرے میں نہیں ہے، اور کلی فضل، " من كل الوجوه " فضیلت یہ دلائل کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہے جس طرح حدیث شریف میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " انا سید ولد آدم یوم القیامة ولا فخر و بیدی لواء الحمد ولا فخر " میں یہ بات کوئی فخر کے طور پر نہیں کہتا میں آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں یعنی اظہار واقعہ کے طور پر یہ بات بیان

کرتا ہوں اور قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہی ہوگا ''ومامن نبی یومئذ فمن سواہ الا آدم ومن سواہ تحت لوائی'' (مشکوٰۃ ص۵۱۳) آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کے علاوہ جتنے رسول گزرے ہیں وہ سارے کے سارے میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور یہ جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا یہ باتیں میں بطور فخر کے نہیں کہہ رہا یہ اظہار واقعہ کے طور پر کہہ رہا ہوں۔

تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا جس میں یہ بات آگئی کہ کلی فضیلت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے ویسے کوئی رسول فضائل سے خالی نہیں، ہر رسول میں کوئی نہ کوئی ایسی فضیلت موجود ہے جو دوسرے میں موجود نہیں من وجہ ہر کسی کو دوسرے سے افضل کہہ سکتے ہیں۔

مسئلہ تفضیل انبیاء علیہم السلام پر آیات وروایات میں تعارض:

حدیث شریف میں جو آتا ہے، ''لا تُفَضِّلواُ بین انبیاء الله'' کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت نہ بیان کیا کرو کہ ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں فضیلت دو، ''لاتُخَیِّروُا نی علی موسٰی'' مجھے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں افضل نہ قرار دو'' لا اقول انّ احدا افضل من یونس بن متّی'' (مشکوٰۃ ص۵۰۷) میں نہیں کہتا کہ یونس بن متّی سے کوئی بھی بڑھیا ہے ''یونس بن متّی'' سے حضرت یونس علیہ السلام مراد ہیں، ان روایات کی طرف دیکھ کے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کی آپس میں تفضیل نہیں کرنی چاہیئے، اور قرآن کریم میں آیت آگئی لانفرق بین احدٍ من رسلہ۔

''ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے'' ان روایات وآیات کا آپس میں مطلب کس طرح واضح ہوگا؟

تطبیق:

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو بھی رسول بنایا اس کو کچھ نہ کچھ خصوصیات ایسی دی ہیں جو دوسروں میں نہیں ہیں اس کو کہتے ہیں فضیلت جزوی ایسی فضیلت ہر پیغمبر کو دوسرے پر ہے مثلاً یہ جو'' لاتفضلوا بین انبیاء اللہ'' کا لفظ حدیث شریف میں آیا ہے وہ ایک واقعہ کے ضمن میں ہے، مدینہ منورہ میں ایک مسلمان کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا آپس میں گفتگو کرتے ہوئے مسلمان نے قسم اٹھائی'' الذی اصطفیٰ محمداً علی العالمین ''قسم اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمین کے مقابلہ میں چن لیا، اور آگے سے یہودی نے قسم اٹھائی '' الذی اصطفیٰ موسیٰ علی العالمین'' قسم اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو عالمین پر چن لیا تو انصاری مسلمان نے'' وعلیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بھی، یہ کہتے ہوئے یہودی کو ایک تھپڑ لگادیا یعنی وہ یہودی کے منہ سے موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کو سن نہیں سکا، اس لیے غصہ میں آکر تھپڑ لگادیا۔

وہ یہودی سردر کائنات ﷺ کی خدمت میں آیا اور آکر واقعہ ذکر کیا اس وقت آپ نے فرمایا کہ یہ تمہارا انداز اچھا نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان میں تم اس طرح بات کرو کہ جس میں کسی دوسرے کی تنقیص یا دوسرے کی تحقیر لازم آتی ہو تمہیں کیا پتہ موسیٰ علیہ السلام کی شان کا؟ قیامت کے دن جب لوگ سارے کے سارے بے ہوش ہوں گے، میں بھی بے ہوش ہوں گا اور میرا خیال یہ ہوگا کہ سب سے پہلے ہوش مجھے آئی ہے لیکن جس وقت میں دیکھوں گا تو موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے ہوں گے (مشکوٰۃ ص ۵۰۷) یعنی وہ مجھ سے بھی پہلے ہوش میں آگئے یا اللہ تعالیٰ نے ان کو ویسے ہی مستثنیٰ کر لیا اور وہ بے ہوش ہی نہیں ہوئے۔

یہ ان کی جزوی فضیلت بیان کر دی کہ مجھے ہوش بہر حال موسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا یا تو موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہی نہیں ہوئے بلکہ صاعقہ طور کے عوض میں ان کو اس بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دیا گیا یا اگر بے ہوش ہوئے تھے تو ان کو مجھ سے پہلے ہوش آگئی، اور اس وقت سمجھایا کہ تم لوگ اپنی رائے کے ساتھ اپنے خیال کے مطابق انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے کے مقابلے میں فضیلت نہ دیا کرو۔

کون افضل ہے کون افضل نہیں؟ یہ اللہ جانتا ہے اور کسی نبی کے کمالات وہی ذکر کیے جاسکتے ہیں جو اللہ نے بیان فرمائے، اللہ کے نزدیک کس کا مرتبہ بلند ہے کس کا نہیں ہے یہ کسی دوسرے کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

ہاں البتہ شرعی دلیل کے ساتھ، اللہ کے بیان کے ساتھ، اللہ کے رسول کے بیان کے ساتھ جو فضیلتیں ان کے لیے ثابت ہیں، کمالات ثابت ہیں ان کا تذکرہ کیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کو یہاں واضح کیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے براہ راست بات کی" منهم من كلم الله" ان انبیاء علیہم السلام میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کی، اس دنیا میں رہتے ہوئے اس آیت کا مصداق موسیٰ علیہ السلام ہیں کہ طور پر اللہ تعالیٰ کی ان کے ساتھ کلام براہ راست ہوئی بلا واسطہ فرشتوں کے اور سورۃ الشوریٰ کے اندر آپ پڑھیں گے" ما كان لبشر ان يكلمه الله الا وحياً او من وراء حجاب" اس کا مطلب یہ ہے کہ آمنے سامنے ہو کے بلا حجاب کوئی بشر گفتگو نہیں کر سکتا، اس دنیا کے اندر رہتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام سے بات تو ہوئی ہے لیکن من وراء حجاب ہوئی ہے بغیر حجاب کے نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ کی ذات سامنے نمایاں نہیں تھی، اللہ تعالیٰ کی آواز، اللہ تعالیٰ کی گفتگو براہ راست موسیٰ علیہ السلام نے سنی یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کمال ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح کچھ کمالات دیئے کہ جبرائیل علیہ السلام ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے ان کی تائید کے لیے اور واضح واضح معجزات جن کا قرآن کریم میں اعلان کیا گیا مردوں کو زندہ کرتے تھے، ابرص کو تندرست کر دیتے تھے، مادرزاد اندھوں کو اچھا کر دیتے تھے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خصوصی معجزات ہیں جو قرآن کریم

میں ذکر کیے گئے اور احیاء موتی، ابراءِ ابرص اور اکمہ اتنی وسعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ معجزات کسی دوسرے نبی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں کیے اور قرآن مجید میں دوسری جگہ آئے گا'' ولقد فضلنا بعض النبیین علیٰ بعض واٰتینا داوٗد زبورا '' ہم نے بعض نبیوں کو بعض کے مقابلہ میں فضیلت دی اور داؤد علیہ السلام کو ہم نے زبور دی'' انبیاء علیہم السلام میں بہت کم ہیں جن کو کتابیں ملی ہیں ان میں خصوصیت حضرت داؤد علیہ السلام کی ہوئی کہ ان کو زبور دے دی، ان کے ہاتھ میں لوہے کو نرم کر دیا، سلیمان علیہ السلام کے قرآن مجید نے اس قسم کے معجزات ذکر کیے جو دوسروں میں نہیں پائے جاتے اس قسم کی جزوی فضیلتیں انبیاء علیہم السلام کے لیے ثابت ہیں اور حضرت یونس علیہ السلام کا تذکرہ قرآن مجید نے کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان پر کچھ گرفت ذکر کی گئی ہے تو کوئی ان واقعات کو پڑھ کے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق یہ خیال نہ کرے کہ یونس علیہ السلام (نعوذ باللہ) کوئی ایسی شخصیت تھی جن میں کوئی نقص پایا جاتا تھا، جن میں کوئی کسی قسم کی کمی پائی جاتی تھی اس لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ کہا'' لا اقول ان احداً افضل من یونس بن متی '' میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر تھا'' یونس علیہ السلام کو اللہ نے بہت بہتری دی تھی اور جو کہتا ہے میں یونس بن متی سے بہتر ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ یونس بن متی کا نام لے کر ذکر اس لیے کیا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ لفظ آ گیا'' واصبر لحکم ربك ولاتکن کصاحب الحوت '' اپنے رب کے حکم پر استقامت اختیار کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جانا'' مچھلی والے سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب گرفت کی تھی تو یونس علیہ السلام کی تحقیر کسی کے ذہن میں نہ آ جائے۔

اس لیے فرمایا کہ میں تو نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متیٰ سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہر پیغمبر کے ساتھ اس کی حکمت کے تحت ہے، سب کو اللہ نے فضیلت دی ہے کسی کو کسی نہج سے، کسی کو کسی نہج سے، کلی فضیلت دلائل کے ساتھ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، انبیاء علیہم السلام کی ساری جماعت چونکہ جماعت حقہ ہے اس لیے اس پر ایمان لانا ضروری، ایک نبی کا دامن پکڑ کے دوسرے کی تحقیر کفر ہے، اتنی وسعت ہر کسی کے ذہن میں اگر ہو تو مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احترام کریں گے، اور یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام کریں گے، عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا احترام کریں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کریں گے، یہ تعصب جو ہے اپنے اپنے فرقے کا اس میں یقیناً کمی آ جائے گی۔

انبیاء علیہم السلام کی تحقیر کفر ہے اور اولیاء کی تحقیر برکات سے محرومی کا باعث ہے:

یاد رکھیے، علماء کرام اور مشائخ یہ بھی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں جیسا کہ پہلے پارہ کے آخر میں ہے '' یعلمھم الکتاب والحکمۃ '' اس آیت کے ضمن میں آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تزکیہ

والی شان مشائخ میں واضح ہے، اور تعلیم کتاب وحکمت کی شان علماء میں نمایاں ہے اور تلاوت کتاب کی شان قاریوں میں نمایاں ہے یہ سارے کے سارے طبقات ایسے ہیں کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے درجات کے ساتھ حضور ﷺ کی جانشینی سے نوازا ہے جب یہ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں تو اس ضابطہ کا تقاضہ یہی ہے کہ ان کے متعلق بھی کچھ ایسے ہی جذبات ہوں کہ چاہے آپ کا تعلق ایک عالم سے ہے، اور اسی طرح آپ کا روحانی تعلق کسی ایک شیخ سے ہے لیکن جہاں تک دوسرے مشائخ کا تعلق ہے دوسرے علماء کا تعلق ہے، ان کا ادب، احترام اس نسبت سے آپ کے دل، دماغ میں ہونا چاہیئے کہ یہ بھی سارے کے سارے دین کے حامل ہیں، سارے کے سارے رسول اللہ کے جانشین ہیں، کتاب کی تلاوت کرتے ہیں، تعلیم کتاب وحکمت کرتے ہیں، تزکیہ کرتے ہیں، جیسا جیسا اللہ نے مقام دیا ہے سب کا احترام دل میں ہونا چاہیئے ایک کا دامن پکڑ لینے کے بعد دوسروں کی تحقیر یا دوسروں کی تنقیص یا ان پر تنقید اس انداز سے کرنا کہ معلوم ہو یہ کچھ بھی نہیں ہیں یہ بھی انبیاء علیہم السلام کے ان جانشینوں کے ساتھ ایک قسم کا ظلم ہے اور اگر اتنی آپ اپنے دماغ کے اندر وسعت رکھیں گے کہ اپنے اساتذہ کا ادب ٹھیک ہے ضرور کریں۔

لیکن جو آپ کے اساتذہ میں شامل نہیں، اہل علم ہونے کی وجہ سے ان کا احترام بھی آپ کے دل میں ہو اپنے شیخ کی آپ تعظیم ضرور کریں، احترام کا تعلق اس کے ساتھ ہو لیکن باقی مشائخ جتنے ہیں ان کا بھی ادب، احترام عظمت دل کے اندر ہو پھر یہ فرقہ بازی، تعصب، پارٹی بازی میں یقیناً کمی آجائے گی، فساد یہیں سے آتا ہے کہ ایک شخص ایک کا دامن پکڑ لیتا ہے اور دوسروں کو سمجھتا ہے کہ یہ کچھ نہیں ہیں اور پھر اس طرح اپنے شیخ کی یا استاذ کی عظمت بیان کرتا ہے کہ دوسرے کی اس میں تحقیر ہو جاتی ہے اور یہ انداز غلط ہے، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس قسم کا انداز تو ویسے ہی کفر تک پہنچا دیتا ہے اور اولیاء امت کے ساتھ یا علماء امت کے ساتھ اس قسم کا انداز کہ ایک کے ساتھ اعتقاد لگا لینے کے بعد دوسروں کی تحقیر کرے ان کی عظمت دل میں نہ رکھے یہ بہت ساری برکات سے محرومی کا باعث بن جاتا ہے۔

المرسلین کے تذکرے کے ساتھ یہاں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کا ذکر کر دیا اور بعض انبیاء علیہم السلام کے کمالات کی طرف اشارہ کر دیا، بتا یہ دیا کہ ساری کی ساری جماعت با کمال ہے کسی کو فضیلت اللہ تعالیٰ نے کسی انداز کے ساتھ دی، کسی کو فضیلت کسی انداز کے ساتھ دی۔

انسانوں کا آپس میں اختلاف اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ ہے:

"ولو شاء الله ما اقتتل الذين من بعدهم" ان الفاظ میں سرورِ کائنات ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ

رسول تو بڑے بڑے درجوں والے آئے لیکن ان پر سب لوگ ایمان نہیں لائے، کسی نے مانا، کسی نے نہ مانا، کسی نے ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر ایمان قبول کیا کسی نے نہ قبول کیا۔

اب اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کیونکہ اللہ تعالیٰ قادر ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا خالق ہے، آپ کے جذبات آپ کے خیالات سب اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فطری طور پر انسانوں کو بھی مجبور پیدا کر دیتا کہ سوائے ایمان اور نیکی کے وہ کوئی راستہ اختیار نہ کر سکتے جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو ایسا پیدا کیا ان کی مشینری کچھ اس قسم کی ہے کہ جب وہ چلتی ہے اللہ کے احکام کے مطابق چلتی ہے، ان کو معصیت کرنے کا اختیار ہی نہیں، اگر اللہ چاہتا تو انسانوں کو بھی ایسا بنا دیتا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جو اختیار والا کمال ہے اللہ تعالیٰ یہ چھین لیتا، اختیار انسان کو حاصل نہ ہوتا، ایک ہی طرح ان کی خلقت رکھی جاتی وہ اس کے مطابق چلتے جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ انسانوں کو اختیار دیا جائے یہ اختیار والا کمال انسان کو ملا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ آپس میں اختلاف بھی ہوا، اور اس پر پھر وہ حکمتیں مرتب ہوں گی جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں۔

اب یہ اختلاف جو انسانوں کے اندر ہوتا ہے یہ انسانوں کی صفت اختیار کی بناء پر ہے جیسے مثال کے طور پر انسان کے کمالات میں سے اختیار بہت بڑا کمال ہے کہ یہ جدھر کو چاہے جا سکتا ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، اپنے آپ کو مختار محسوس کرتا ہے اس کی مشینری اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ اس کا گیئر ہر طرف لگتا ہے، اگر آپ حضرات کو ایک چیز طے کر کے بطور حکم کے سنا دی جائے کہ آپ نے یوں کرنا ہے تو ہو سکتا ہے آپ سارے اسی طرح کرنے لگ جائیں اور اس کے خلاف آپ سوچنا ہی چھوڑ دیں گے، جیسے میں کہہ دوں یہاں سے اٹھو اور سیدھے مسجد کے صحن میں جا کر بیٹھو کسی کو اجازت نہیں کمروں میں جانے کی وہاں دھوپ میں بیٹھ کے سبق یاد کرو۔

یہ بات میں نے آپ کے اختیار پر نہیں رکھی تو آپ سارے کے سارے یہاں سے اٹھیں گے اور جا کر مسجد کے صحن میں بیٹھ کر سبق یاد کرنے لگ جائیں گے اور اگر میں آپ کو اختیار دے دوں کہ جاؤ جا کر سبق یاد کرو مرضی ہے تمہاری درسگاہوں کے سامنے چبوترے پر بیٹھ جاؤ یا مسجد میں بیٹھ جاؤ، مرضی ہے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھ جاؤ، مجھے تو سبق یاد ملنا چاہئے مجھے اس سے بحث نہیں کہ تم کہاں بیٹھتے ہو تو کیا آپ حضرات کا اتفاق ہو جائے گا کہ ہم کہاں بیٹھیں؟ کوئی کمروں کی طرف چلا جائے گا، کوئی چبوترے کی طرف چلا جائے گا، کوئی کسی اور طرف چلا جائے گا، تو دیکھو اختیار کے نتیجہ میں اختلاف آتا ہے اب یہ کہنا کہ انسانوں میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اختیار کی صفت ہی ختم ہو جانی چاہئے جو انسان کی خصوصیت ہے، یہ خصوصیت امتیاز ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اس اختیار کو کوئی صحیح استعمال کرے کوئی غلط استعمال کرے۔

لیکن اختلاف ہے اور یہ نتیجہ ہے اختیار کا اگر اللہ تعالٰی تمہیں مختار نہ بناتا اور اختیار نہ دیتا اور ایک ہی طرح کے پیدا کر دیتا تو سارے کے سارے ایک ہی راستہ پر چلتے، تو ہم نے اسی طرح ایمان کے سلسلے میں لوگوں کو مجبور نہیں کیا کہ لوگ ایمان ضرور لائیں بلکہ ان کو مختار بنا دیا وہ اپنی عقل کے ساتھ سوچیں، دلائل کے اندر غور کریں جو ایمان لانا چاہے لائے جو نہیں لاتا نہ لائے تو رسولوں کی جماعت آئی، فضیلتیں لے کے آئی، کمالات لے کے آئی، لوگوں کے سامنے جب انہوں نے دین واضح کیا سب نے نہیں مانا، اختیار کی صفت کی وجہ سے کسی نے مانا، کسی نے نہیں مانا پھر اس کے نتیجہ میں آپس میں لڑائیاں بھی ہوئیں، پیچھے جس لڑائی کا ذکر آیا تھا وہ بھی تو اسی اختیار کا نتیجہ ہے اس لیے آپ بھی تسلی رکھیں اگر سارے کے سارے لوگ آپ پر ایمان نہیں لاتے تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے نہ یہ کوئی افسوس کی بات ہے یہ تو پہلے سے عادت اسی طرح چلی آرہی ہے جب آپ پر بھی بعض لوگ ایمان لائیں گے بعض لوگ ایمان نہیں لائیں گے تو نتیجہ میں آپ کے ساتھ لڑائی بھی ہوگی۔

یہ لفظ سرور کائنات ﷺ کے لیے بطور تسلی کے ارشاد فرمائے "ولو شاء اللہ ما اقتتل الذین من بعدھم" "اگر اللہ چاہتا تو ان رسولوں کے بعد آنے والے لوگ آپس میں نہ لڑتے" کیسے نہ لڑتے؟ کہ اللہ چاہتا تو ان کو ایک ہی راستہ پر چلا دیتا، ان کے اختیار کی صفت کو ختم کر دیتا، یہ سارے کے سارے فرمانبردار ہوتے، سیدھے راستہ پر چلنے والے ہوتے نہ آپس میں اختلاف ہوتا نہ لڑائی ہوتی "بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آگئے، لیکن انہوں نے آپس میں اختلاف کیا کوئی ایمان لایا اور کوئی ایمان نہ لایا اس نے کفر کیا۔

اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے، اور یہاں جو چاہنے کا مصداق یہ ہوا کہ اللہ نے یہی چاہا کہ انسانوں کو مجبور نہ کیا جائے انسانوں کو اختیار کی صفت دے دی جائے اور اپنے اس اختیار کی صفت کے ساتھ وہ مانیں یا اختلاف کریں اللہ نے یہاں یہی چاہا اسی میں حکمت ہے۔

خلاصہ:

اور اسی کے نتیجہ میں مؤمن اور کافر بھی موجود رہیں گے، اسی کے نتیجہ میں آپس میں لڑائی بھی ہوگی اللہ تعالٰی کی مشیت یہاں یہی ہے، اس لیے آپ کے سمجھانے سے یہ لوگ اگر نہ سمجھیں تو آپ اس پر افسوس نہ کریں آپ کے لیے یہ زیادہ حسرت اور افسوس کی بات نہیں ہونی چاہیے، پہلے انبیاء علیہم السلام سے بھی لوگوں کا یہ طریقہ چلا آرہا ہے یہاں تک جو مضمون آپ کے سامنے آیا یہ اصل کے اعتبار سے "قاتلوا فی سبیل اللہ" کی تفسیر چلی آرہی ہے کہ لڑنے کا حکم دیا تھا اور اس حکم کی وضاحت کے طور پر ترغیب کے طور پر طالوت اور جالوت کا قصہ سنایا پھر اس واقعہ کے دلیل نبوت ہونے کے اعتبار سے "انک لمن المرسلین" کا تذکرہ آگیا اور اسی مناسبت سے رسولوں کا کچھ ذکر ہوگیا۔

یا ایھاالذین آمنوا کا ماقبل سے ربط:

اب پھر مضمون عود کرتا ہے اسی سابق بات کی طرف کہ جس وقت یہ مضمون شروع ہوا تھا تو دو باتیں ذکر کی گئی تھیں ایک " انفاق فی سبیل اللہ "اور" قتال فی سبیل اللہ، قتال فی سبیل اللہ " کی کچھ وضاحت ہوگئی۔

اب یہاں سے انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے آگے بقیہ سورۃ میں مسئلہ زیادہ تر انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق ہے درمیان میں ضمنی طور پر کچھ مضمون اور آجائیں گے، یہ آیت ترغیب کے لیے ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ دیر نہ کرو معلوم نہیں کہ پھر نیکی کا موقع رہے گا یا نہیں" خرچ کرلو" یہ جلدی کرنے کی ترغیب ہے۔

قیامت کے دن سے قبل مال خرچ کرلو:

" اے ایمان والو! خرچ کرلو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا جہاں بھی اللہ تعالیٰ انفاق کا حکم دیتے ہیں وہاں "مما رزقناکم " کا لفظ بولتے ہیں یہ لفظ مستقل ایک ترغیب ہے، اور انفاق کے حکم میں آسانی پیدا کرنے والا ہے کہ جب آپ سوچیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں خرچ کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ چیز بھی اسی کی دی ہوئی ہے، اپنی حکمت کے ساتھ اس نے وہ چیز ہمیں دی، ہماری طرف منسوب کردی کہ یہ تمہارا مال ہے پھر کہا کہ اسی میں سے میرے راستہ میں خرچ کرو اور پھر وہ خرچ کرنا بھی ایسا کہ جس کا نفع بھی لوٹ کر تمہاری طرف ہی آئے گا ان باتوں کے اندر اگر انسان غور کرے تو غور کے بعد انفاق اس کیلئے آسان ہو جاتا ہے" خرچ کرلو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا قبل اس کے کہ ایسا دن آجائے" حاصل اس کا یہ ہے کہ جب وہ دن آجائے گا پھر آپ کسی نیکی کی تلافی نہیں کرسکیں گے اگر دنیا کے اندر کوئی نیکی نہیں کی تو پھر اب اس کی تلافی نہیں ہوسکے گی، تلافی کی کیا صورت ہے؟

قیامت کے دن خرید وفروخت اور یاری، باشی کچھ کام نہیں آئے گی:

جس طرح دنیا میں بازار لگتے ہیں خرید وفروخت ہوتی ہے آپ ایک چیز دیتے ہیں دوسری لے لیتے ہیں وہاں ایسا موقع نہیں ہوگا کہ آپ کسی سے نیکیاں خرید لیں، وہاں نیکیوں کی کوئی خرید وفروخت نہیں ہوگی کہ نیکی یا ایمان وہاں سے تم خرید لو ایسا نہیں ہوسکتا یہ صورت تو بالکل ہی واقع نہیں ہے اور پھر دوسرے نمبر پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز آپ نے وقت پر حاصل نہ کی ضرورت پیش آگئی، کسی دوست کے پاس تھی آپ استعمال کرنے کے لیے اس کی اٹھالاتے ہیں، دنیا کے اندر یہ طریقہ بھی چلتا رہتا ہے کہ اگر ایک وقت آپ کے پاس ایک چیز موجود نہیں ہے دوست کے پاس موجود ہے تو آپ جاتے ہیں دوست سے پیسے بھی لے آتے ہیں چیز بھی لے آتے ہیں، اور فائدہ اٹھالیتے ہیں۔

تو قیامت کے دن بھی یہ یاری باشی چل جائے اور کوئی شخص دوستی کے تعلق کی بناء پر تمہیں اپنی نیکیاں دے دے ایسا بھی نہیں ہوگا، وہاں تو نفسا نفسی ہوگی افراتفری ہوگی، کوئی شخص اپنی نیکیوں کا ایثار کسی دوسرے کے لیے نہیں کرے گا یعنی یہ صورت بھی یا تو بالکل واقع نہیں ہے اور اگر واقع ہوگی تو بالکل شاذ و نادر، وہ بھی بعض ضعیف روایتوں کے اندر کچھ اس قسم کے واقعات آتے ہیں کہ ایک شخص اپنی نیکی دوسرے کو دے دے گا لیکن وہ اتنی شاذ ہوگی جس کا وقوع عام نہیں ہے۔

قیامت کے دن کسی کی سفارش بھی کام نہیں آئے گی:

اور ایک تیسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آپ کسی گرفت میں آ گئے آپ کا تعلق والا حاکم کے پاس جاتا ہے اور جا کر سفارش کر کے آپ کو چھڑا لیتا ہے یہ صورت بھی وہاں نہیں ہوگی یعنی اختیاری نہیں ہوگی، جب تک اللہ تعالیٰ اجازت نہیں دیں گے اس وقت تک یہ واقع نہیں ہوگی جب اللہ کی اجازت کے بغیر واقع نہیں ہوگی تو یہ صورت بھی اختیاری نہیں ہے لہذا قابل اعتماد یہ بھی نہ ہوئی قابل اعتماد وہ چیز ہوتی ہے جو واقع ہو، پھر کثیر الوقوع ہو، پھر اپنے اختیار میں ہو، سفارش اختیار میں نہیں ہے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے تو ہوگی نہیں اجازت دیں گے تو نہیں ہوگی جس کے لیے اجازت دیں گے ہوگی، جس کے لیے اجازت نہیں دیں گے نہیں ہوگی، تو پھر یہ کوئی قابل اعتماد ذریعہ نہ ہوا نجات پانے کا اس لیے اس پر بھی اعتماد نہ کرو، جاہلیت کے زمانہ میں سفارش کا عقیدہ ایک ایسا عقیدہ تھا جس نے لوگوں کے اندر آخرت کی اہمیت ہی ختم کر دی۔

جب یہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارا تعلق ایک ایسے آدمی سے ہے جو بہر حال ہمیں چھڑا لے گا آج دنیا کے اندر فتنہ وفساد کی ایک وجہ یہ بھی ہے یہ جو سفارش کا نظریہ دنیا میں چلتا ہے فتنہ وفساد کی جڑ یہ بھی ہے کہ ایک آدمی کا کسی بڑے آدمی سے تعلق ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اول تو مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں اور اگر میں کسی گرفت کے اندر آ بھی گیا تو فلاں جائے گا جا کے چھڑا لے گا جب یہ اعتماد انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے تو بدعملی آ جاتی ہے، اور دنیا کے اندر بھی ایسے ہی بڑے لوگوں کے پاس بیٹھنے والے بڑے لوگوں سے تعلق رکھنے والے، حاکم کے رشتہ دار اس کے دوست یہ قانون کی پرواہ نہیں کرتے، اکثر و بیشتر یہ بدعملی اختیار کر لیتے ہیں، اور یہ سفارش کا نظریہ ایسا ہے جو حق کو باطل کر دیتا ہے باطل کو حق کر دیتا ہے مثلاً قانون کی گرفت میں آ گیا حق تو یہ ہے کہ اس شخص کو سزا دی جائے۔

لیکن دوسرا اپنی طاقت کو استعمال کر کے اس کو چھڑا لے گا تو اس حق کو باطل کر دے گا، خلاف حق فیصلہ کروا لے گا، قانون اور آئین کے خلاف فیصلہ کروا لے گا، یہ ظلم ہے، یہی عدل کے خلاف ہے، سفارش کا وقوع دنیا

کے معاملات میں ہوتو دنیا کا نظم خراب اور اگر آخرت کے معاملہ میں کسی نے سفارش کا عقیدہ اپنایا، وہ کہتے تھے کہ جب ہمارا ان کے ساتھ تعلق ہے جو اللہ کے محبوب ہیں تو اول تو اللہ کی گرفت ہوگی نہیں اگر ہوگی تو یہ چھڑا لیں گے پھر کیا ضرورت ہے نیکی اختیار کرنے کی؟ کیا ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کرنے کی؟ اللہ تعالیٰ نے اس نظریہ کو باطل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو بھی فیصلے ہوں گے اس کے علم کی وجہ سے ہوں گے وہ اگلے پچھلے سب حالات کو جانتا ہے، علم کے مطابق اللہ کے فیصلے ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی معلومات میں کسی نے کوئی اضافہ نہیں کرنا، سفارش کا ایک حاصل یہ بھی ہوتا ہے کہ فلاں بات آپ کے ذہن میں نہیں اس لیے توجہ کرو یہ شخص چھوڑنے کے قابل ہے اس قسم کا اضافہ اللہ کے علم میں کوئی نہیں کر سکے گا اس لیے جو حق ہوگا وہی فیصلہ ہوگا کوئی کہہ سن کے اللہ کے فیصلے کو تبدیل کرا کے حق کو باطل نہیں بنا سکتا یہ پابندی اس طرح لگا دی۔

نیک لوگوں کا اعزاز:

ہاں بعض بعض نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ یہ اعزاز دیں گے کہ حالات تو اس آدمی کے پہلے ہی چھوٹنے کے ہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس شخص کا ایمان ہے، چھوٹ سکتا ہے کچھ سزا بھی ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی کہ اس کو چھوڑ دیا جائے نیک آدمی کی عزت نمایاں کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کہہ دے گا کہ تو اس کی سفارش کر دے میں چھوڑ دوں گا، سفارش کی اجازت ہوگی حق بات کہے گا، باطل بات نہیں کہے گا اور اس کے کہنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کو چھوڑ دیں گے اس میں محض اس سفارش کرنے والے کی عزت میں اضافہ کرنا مقصود ہے اور اس کا اعزاز مقصود ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کافر کے مقابلہ میں سفارش نہیں ہو سکے گی چاہے اس کا باپ ہو چاہے بیٹا ہو کوئی دوست ہو وہ زبان ہی نہیں کھول سکے گا۔

بہر حال نجات کا یہ ذریعہ بھی اختیاری نہیں ہے اس لیے اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا نیکی کر لو ایسا دن آنے سے قبل کہ پھر تم اس نیکی کی تلافی نہیں کر سکو گے نہ خرید و فروخت کے ذریعہ سے، نہ یاری، دوستی کے ذریعہ سے نہ کسی کی سفارش کے ذریعہ سے "والکافرون هم الظالمون" کافروں کا مصداق خاص طور پر یہاں یہ ہوا جو ایسے دن کے منکر ہیں، جو ایسے دن پر یقین نہیں رکھتے، وہی ظالم ہیں جو اپنے آپ پہ ظلم کرنے والے ہیں حق تلفی کرنے والے ہیں، وہ فکر نہیں کرتے کہ ہم اپنے لیے کچھ کر لیں۔

آیت الکرسی کا ماقبل سے ربط:

اب یہاں "ولا شفاعة" کا لفظ آیا تھا اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسے طور پر حاکمیت نمایاں ہے کہ اس کے

فیصلوں کو تبدیل کروانے کی کسی کو اجازت نہیں، اس کے فیصلوں کو کوئی تبدیل نہیں کراسکتا، کوئی زبردستی نہیں کرسکتا تو شفاعت کی نفی سے اللہ تعالیٰ کی جو عظمت نمایاں تھی اسی سے مضمون عقیدہ توحید کی طرف منتقل ہو گیا کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں عقیدہ شفاعت یہ مستقل شرک کا ایک شعبہ بنا ہوا تھا، اگرچہ ذکر تو انفاق کا ہے اور آگے جا کر بھی انفاق کے ہی احکام آئیں گے اس مناسبت سے یہ مضمون توحید کی وضاحت کی طرف منتقل ہو گیا۔

آیت الکرسی کی فضیلت:

اب اگلی آیت جو ہے اس آیت کو آیت الکرسی کہتے ہیں، حدیث شریف میں اس کی بہت فضیلت آئی ہے نسائی شریف میں ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا رہے جنت میں جانے سے اس کیلئے صرف موت مانع ہے کہ مرے گا تو مرنے کے فوراً بعد اس کے لیے جنت ہے یعنی برزخ میں بھی اس کے جنت والے حالات اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو جنت دے گا اور اسی طرح فرمایا جس گھر کے اندر یہ آیت الکرسی پڑھی جائے اس گھر کے شیطان قریب نہیں آتا، عظمت والی آیت ہے، فضیلت کے لحاظ سے قرآن کریم کی سب آیات کے مقابلہ میں اس کو فضیلت حاصل ہے۔

قرآن کی سب سے عظیم آیت، آیت الکرسی ہے:

سرور کائنات ﷺ نے ایک دفعہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا جن کو سید القراء کہا جاتا ہے کہ ''اَیُّ آیَۃٍ فِی الْقُرآنِ اَعْظَمُ'' قرآن کریم میں عظمت کے لحاظ سے اعظم آیت کونسی ہے'' انہوں نے کہا'' آیت الکرسی'' حضور ﷺ نے شاباش دیتے ہوئے ان کو ہاتھ بھی مارا اور فرمایا ابو المنذر! تجھے علم مبارک ہو کہ واقعی تو نے صحیح سمجھا (مشکوٰۃ ۱۸۵) قرآن کریم میں عظمت کے لحاظ سے سب سے اعظم آیت آیت الکرسی ہی ہے، اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ توحید کو بہت جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے عقیدہ توحید کی بہت ساری جزئیات پر یہ آیت مشتمل ہے جس کی بناء پر اس آیت کو عظمت حاصل ہے۔

آیت الکرسی اور اکابرین وعاملین کا عمل:

اکابر کے معمول میں بعض آیات ہیں جن کو بطور وظائف کے وہ پڑھتے ہیں اور ان کی برکات کا انکار نہیں کیا جاسکتا، علامہ مظہری رحمہ اللہ نے چند آیات کو آیات العز سے تعبیر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی پابندی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں عزت سے نوازتے ہیں جن میں ایک آیت یہ بھی ہے اور دوسری آیت ہے'' اللھم مالك الملك تو تی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعزمن تشاء وتذل من تشاء بیدك الخیر انك

علی کل شیء قدیر" اور شھد اللہ انہ، عند اللہ الاسلام" تک، اور سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آیت الحمد اللہ الذی لم یتخذ ولداً الخ ان آیات کی تلاوت کی فضیلت آتی ہے، یہ چھوٹے چھوٹے وظائف ہوتے ہیں ان کو انسان اگر اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ برکات نصیب فرماتے ہیں، اللہ کے نام میں بڑی برکت ہے، اور روایات میں جس کا ذکر آجائے تو وہ پھر یقینی چیز ہو جاتی ہے مثلاً صحیح روایات میں آگیا کہ آیت الکرسی پڑھنے کے ساتھ شیطان بھاگتا ہے اور آپ کو معلوم ہوگا کہ جو لوگ جنات کا عمل کرتے ہیں یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ اگر کسی کو جن لگ جائیں تو آیت الکرسی پڑھی جائے، اور جنات کے تکلیف پہنچانے کا خطرہ ہو تو آیت الکرسی پڑھی جائے تو اللہ تعالیٰ ان سب شریر چیزوں سے حفاظت فرما دیتے ہیں عاملین کے تجربہ کے اندر بھی یہ بات آئی ہوئی ہے تو یہ آیت آیت الکرسی کہلاتی ہے۔

ہر قسم کی صفات کمال اللہ کے لیے ثابت ہیں:

" اللہ لا الٰہ الا ھو " اللہ یہ تو نام ہے اس ذات کا جو کہ جامع ہے صفات کمال کے لیے، مستجمع لجمیع صفات الکمال ہے، لا الٰہ الا ھو "کوئی معبود نہیں اس کے سوا" معبود صرف وہی ہے، عبادت کا حق صرف اسی کا ہے کسی دوسرے کے لیے نہیں۔

"الحی" وہ زندہ ہے، صاحب حیات ہے حیات کی صفت اس کے لیے کمال درجہ کی ثابت ہے، نہ کبھی موت اس کے اوپر وارد ہوئی، نہ کبھی موت اس کے اوپر وارد ہوگی، وہ سراپا حیات ہے اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حیات، علم، قدرت، یہی صفتیں ہیں جو امہات صفات کہلاتی ہیں باقی تمام صفتوں کا مدار انہی پر ہے، وہ زندہ ہے اس میں موت کا شائبہ نہیں "حیّ لا یموت" نہ اس پر کبھی موت طاری ہوئی نہ کبھی طاری ہوگی۔

" القیوم " خود قائم ہے بغیر کسی سہارے کے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے، سنبھالنے والا ہے، اس طور پر سنبھالنے والا ہے کہ اگر وہ نہ سنبھالے تو کوئی چیز اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی، ساری کائنات کو سنبھالنے والا وہی ہے" الحیّ القیوم " ان دونوں لفظوں کا مجموعہ بہت دعاؤں کے اندر سرور کائنات ﷺ نے استعمال فرمایا ہے اس لیے اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ " الحیّ القیوم " دونوں ناموں کا مجموعہ یہی اسم اعظم ہے، اکثر و بیشتر دعاؤں کے اندر سرور کائنات ﷺ یہی لفظ استعمال فرماتے ہیں" یا حیّ یا قیوم برحمتك استغیث، استغفر اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الحیّ القیوم" تو اس کو "الحیُّ القیوم" مرفوع بھی پڑھ سکتے ہیں

اور'' الحیّ القیوم ''منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں بلکہ حضرت انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس کے منصوب ہونے کو ہی ترجیح دی ہے ''استغفرا للہ'' میں اللہ کی صفت بن کر یہ بھی منصوب ہوں گے۔

اللہ کو نیند نہ آنا اس کے حیی اور قیوم ہونے کا نتیجہ ہے:

''لا تأ خذہٗ سنۃٌ ولا نوم '' نہ اس کو اونگھ پکڑتی ہے نہ نیند' اب یہ الحیّ القیوم کیلئے بطور دلیل کے ہے، یا الحیّ القیوم کا نتیجہ ہے، حدیث شریف میں آتا ہے النوم اخ الموت نیند موت کی بہن ہے کہ جس وقت انسان سویا ہوتا ہے کوئی شخص اس کی کوئی چیز اٹھا کر لے جائے اور کوئی گڑبڑ ہو جائے تو اس کو بسا اوقات پتہ نہیں چلتا تو ایسے موقع پر کہا کرتے ہیں کہ سویا ہوا انسان ایسے ہے جیسے مرگیا کیا پتہ چلتا ہے؟ یہ نیند موت کی بہن ہے اور حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ! کیا جنتی سویا بھی کریں گے'' اینامُ اھل الجنۃ ''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا النوم اخ الموت ولا موت فی الجنۃ (مشکوٰۃ ۵۰۰) نیند تو موت کی بہن ہے اور جنت میں موت نہیں، جب موت نہیں تو موت کے آثار بھی جنتیوں پر طاری نہیں ہوں گے، وہ سویا نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ جو کہ سراپا حیات ہے تو نیند جس کے اندر موت کا شائبہ پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ پر طاری کیسے ہوسکتی ہے؟ تو اس کے حیی ہونے کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ نہ اس کو اونگھ آئے نہ نیند، نہ ہلکے درجہ کی نیند نہ گہری نیند۔

'' سـنـۃ'' کہتے ہیں اس نیند کو جس کا اثر آنکھوں تک رہتا ہے، اور نوم کہتے ہیں شدت کی نیند کو جس سے دماغ پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے، الحیی ہونے کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ '' لاتأخذہٗ سنۃ ولانوم '' اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا نتیجہ بھی یہی ہے لا تـأخذہٗ سنۃ ولا نـوم کیونکہ قیوم کا معنیٰ ہوا خود قائم رہنے والا، دوسروں کو قائم رکھنے والا اور آپ جانتے ہیں کہ دوسرے کو قائم وہی رکھ سکتا ہے، خود قائم وہی رہ سکتا ہے جس کے ہر وقت حواس درست ہوں اور اگر نیند آجائے تو دیکھو جس پر ذرا سی اونگھ طاری ہو جاتی ہے وہ اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا کبھی گردن کدھر کو جائے گی، کبھی کدھر کو جائے گی، کبھی آگے کو گرے گا کبھی پیچھے کو تو نیند کی حالت میں انسان اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتا تو کسی دوسری چیز کو کیسے سنبھالے گا، کتاب ہاتھ میں ہوگی تو کتاب گر جائے گی، کوئی دوسری چیز آپ کے ہاتھ میں ہوگی، وہ گر جائے گی کبھی بس کے اندر سفر کرو تو یہ نظارہ دیکھا کرو کہ سواریوں میں اور ڈرائیور میں کیا فرق ہوتا ہے کہ سواریاں تو کسی کی گردن دائیں طرف لٹک رہی کسی کی بائیں طرف لٹک رہی ہے کوئی آگے کو جھوم رہا ہے کوئی پیچھے کو جھوم رہا ہے۔

اور اگر یہی کیفیت ڈرائیور کے اوپر طاری ہوجائے تو بس بھی گئی اور پچاس جانیں بھی ساتھ ہی گئیں، اونگھ آئی نہیں اور ایکسیڈنٹ ہوا نہیں، تو بس چونکہ سنبھالنی ہے ڈرائیور نے اس لئے ڈرائیور کو چوکنا ہو کے بیٹھنا پڑتا ہے، اس وقت سمجھ لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ کی جو شان قیومیت ہے اس کا یہ ادنیٰ سا مظہر ہے کہ بس نہیں سنبھالی جاسکتی اگر ڈرائیور کے اوپر اونگھ یا نیند طاری ہوجائے اور ذرا اونگھ آئی جھٹکا لگا اور گئے تو جس نے ساری کائنات کو سنبھالنا ہے اس کیلئے غفلت یا اونگھ اور نیند کا کیا سوال؟

تو اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا بھی تقاضہ ہے کہ اس پر نہ اونگھ طاری ہو، نہ اس پر نیند طاری ہو تو لاتأخذہٗ سنۃ ولا نــــوم کا تعلق دونوں کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ سراپا حیات ہے اس کے اوپر موت طاری ہوئی، نہ ہوسکتی ہے اور نیند کے اندر موت کی مشابہت پائی جاتی ہے لہٰذا یہ بھی اللہ تعالیٰ پر طاری نہیں ہوسکتی، اور وہ قیوم ہے سب کو سنبھالنے والا ہے خود قائم رہنے والا ہے اور جس نے دوسرے کو سنبھالنا ہو اس کے اوپر کسی قسم کی غفلت طاری نہیں ہوسکتی قیوم ہونے کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر نیند بالکل طاری نہ ہو نہ ادنیٰ نہ اعلیٰ، سـنۃ یہ نیند کا ادنیٰ حصہ ہے ابتدائی حصہ، اور نوم میں غفلت تام ہوتی ہے، غفلت کی صورت میں دوسرے کو سنبھالا نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کو نیند نہ آنے کی وضاحت ایک مثال سے:

اس کو اگر سمجھنا چاہیں تو ایک مثال کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں ایک ناقص سی مثال ہے اللہ تعالیٰ کی اس صفت قیوم کو سمجھانے کیلئے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو کما حقہ، ہم اپنے الفاظ میں واضح نہیں کرسکتے لیکن ایک ادنیٰ سی مثال جیسے میں نے ایک ظاہری مثال دی تھی کہ بس کا ڈرائیور بس کو سنبھالے ہوئے ہوتا ہے اور اندر جو سواریاں ہوتی ہیں وہ بےفکر ہوتی ہیں وہ تو سو بھی جاتی ہیں، غافل بھی ہوجاتی ہیں، ادھر اُدھر لڑھکتی رہتی ہیں لیکن اگر یہی کیفیت ڈرائیور پر طاری ہوجائے تو بس کسی صورت قابو میں نہیں رہ سکتی تو اللہ تعالیٰ کی صفت قیومیت کا مظہر ڈرائیور ہوتا ہے جس وقت وہ گاڑی کو چلاتا ہے، اس سے بھی واضح مثال آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ اپنے ذہن میں ایک چیز کا تصور کرتے ہیں، آنکھیں بند کرکے سوچو، کسی کا تصور کرو تو فوراً آپ نے اپنے دماغ میں ایک تصویر بنالی یہ تصویر آپ کے دماغ کے ساتھ قائم ہے اور آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ اس وقت تک قائم ہے جب تک آپ ادھر متوجہ رہیں گے، اور آپ کی سوچ ایک لمحہ کے لیے ہٹی تو وہ تصویر معدوم ہوگئی۔

آپ اپنے ذہن میں تصور کرلیجئے کہ آپ کہروڑ پکا کے اسٹیشن پر کھڑے ہیں، اور گاڑی آرہی ہے، اور لوگ سوار ہونے کے لیے تیار کھڑے ہیں یہ سارا نقشہ آپ اپنے ذہن میں بٹھالیں گویا کہ ایک عالم آپ کے ذہن میں

آباد ہو گیا، یہ آباد اس وقت تک ہے جب تک آپ اس کی طرف متوجہ ہیں اور ذرا آپ کی غفلت ہوئی اور آپ کا خیال دوسری طرف ہوا تو یہ یکسر مٹ جائے گا یہ ایک دھیمی سی مثال سے سمجھ لیجئے اللہ تعالیٰ کا تعلق جو اپنی کائنات کے ساتھ ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ ہی قائم ہے، زمین ہو، آسمان ہو، جو کچھ بھی ہے تحت الثریٰ سے لے کر فوق السماء جتنا بھی عالم ہے وہ سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے قصد، ارادے اور توجہ کے ساتھ قائم ہے۔

تو جس وقت اللہ تعالیٰ ان کو سنبھالے رہے گا یہ سنبھلے ہوئے ہیں اور ان کا وجود ہے اگر کسی وقت بھی اللہ کی توجہ ہٹ جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ عالم اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتا، اسی وقت یہ سارے کا سارا سلسلہ ختم ہو جائے گا، اس لیے "لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم" یہ قیوم ہونے کا تقاضہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خود قائم ہے دوسرے کو سنبھالنے والا ہے اس قیومیت کا تقاضہ یہ ہے کہ نہ اس کے اوپر کوئی ادنیٰ درجہ کی غفلت طاری ہو نہ اعلیٰ درجہ کی، ہر وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہیں، کسی وقت مخلوق کی طرف سے غافل نہیں ہیں "لا تحسبن اللہ غافلاً عما یعمل الظالمون" ظالم جو کچھ کرتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کو بے خبر نہ سمجھو اللہ غافل نہیں ہیں" کل یوم ھو فی شأن"

ساری کائنات کا مالک اور حاکم حقیقی صرف اللہ ہے:

"لہٗ مافی السمٰوٰت ومافی الارض" یہ اس کی مالکیت آگئی، ملکیت اسی کے لیے ہے یہ لام ملکیت کے لیے ہے اسی کا مملوک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے جو کچھ زمین میں ہے، سب میں ملکیت اسی کی ہے "مافی السمٰوٰت والارض" بول کر ساری کائنات مراد ہے۔

"من ذاالذی یشفع عندہٗ الا باذنہ" یہ اس کی حاکمیت آگئی کہ اپنی کائنات کے اندر وہی حاکم ہے، وہی مدبر ہے، اپنے علم کے ساتھ جو عدل وحکمت کا تقاضہ ہوتا ہے وہ فیصلہ کرتا ہے، ایسا کوئی شخص نہیں جو اس کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کرے کہ اللہ ایک فیصلہ کرنا چاہیں اور دوسرا اس کی مرضی کے خلاف اس کو مجبور کر دے ایسا کوئی شخص نہیں ہے، اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی طاقت نہیں ہے، کوئی بول نہیں سکتا "لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن" کوئی بول نہیں سکے گا جب تک رحمٰن اجازت نہ دے، جس کو اجازت ہو گی وہی بات کر سکے گا، پھر بات بھی وہ حق کہے گا خلاف حق کوئی بات نہیں کہہ سکتا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کافروں کیلئے تو کسی کو سفارش کرنے کی اجازت ہی نہیں دے گا، ان کے حق میں شفاعت کا سرے سے وجود ہی نہیں ہو گا اور مؤمنوں میں سے جس کے حق میں بولنے کی اجازت دیں گے یہ اجازت دینا بھی محض شفاعت کرنے والے کا ایک اعزاز ہے کہ چھوڑنا تو اللہ نے ہے اور یہ کہلوا دیا کہ تم کہہ دو

میں چھوڑ دیتا ہوں اس میں اس کی عزت بنانا مقصود ہے، باقی کوئی شخص یہ اعتماد نہیں کر سکتا کہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہوگا اور کوئی شخص اس بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا کہ میرے بارے میں کسی کو کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوگی، اس لیے جو لوگ اپنی بدعملی کیلئے اس بات کو سہارا بناتے ہیں کہ ہم فلاں کی اولاد ہیں، فلاں کے شاگرد ہیں، فلاں کے مرید ہیں، ہمارا فلاں کے ساتھ تعلق ہے اور وہ اللہ کے محبوب ہیں وہ ہمیں چھڑا لیں گے اس اعتماد پر اگر کوئی بدعملی اختیار کرتا ہے تو یہ پرلے درجہ کی حماقت ہے، کون ہے جو اس کے سامنے سفارش کرے مگر اس کی اجازت کے ساتھ، یعنی اس کی اجازت کے ساتھ ہی کوئی بول سکے گا، اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے سامنے نہیں بول سکتا یہ اس کی حاکمیت ہے اور اس کی قہاریت ہے۔

اللہ کا علم تام ہے اور کوئی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا:

" یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم "اس کا علم تام ہے جو کچھ مخلوق کے سامنے ہے جو کچھ پیچھے ہے، جو کچھ حاضر ہے جو کچھ غائب ہے، ماضی، مستقبل سب اللہ تعالیٰ جانتا ہے جب اس کا علم محیط ہے تو جو اس کا فیصلہ ہوگا اس کے اپنے علم کی بناء پر ہوگا کوئی بول کر کیا اس کے علم میں اضافہ کرے گا؟ اس لیے جہاں بھی شفاعت کے نظریہ کی نفی آتی ہے، اللہ تعالیٰ ساتھ ساتھ اپنے علم کو ذکر فرماتے ہیں۔

" ولایحیطون بشیء من علمہٖ "اللہ تعالیٰ تو مخلوق کے علم کو محیط ہے، مخلوق کا کوئی حال اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں جتنی چیزیں مخلوقات کے علم میں ہیں وہ تو سب اللہ کے علم میں ہیں لیکن اللہ کی معلومات میں سے کسی چیز کا لوگ احاطہ نہیں کر سکتے، " الابماشاء " مگر اتنی مقدار کا ہی جو اللہ چاہے اس میں سب مخلوق کے متعلق یہ اعلان ہو گیا چاہے کوئی نیک ہے چاہے کوئی بد ہے، چاہے کوئی پیغمبر ہے، چاہے کوئی فرشتہ ہے کسی میں طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات کا احاطہ کرے ہاں اتنی مقدار ہی کسی کے علم میں آ سکتی ہے جتنی اللہ چاہے تو جس کے پاس جو علم ہوگا وہ عطائی ہوگا، اللہ تعالیٰ جتنا دے دے اتنا ملے گا اور جو نہ دے اس کا علم حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا احاطہ علمی ہے۔

تخت نشین اور چیئرمین کا مفہوم:

" وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض " کرسی "مفہوم اس کا متعین ہے بیٹھنے کے لئے اونچی جو چیز بنائی جاتی ہے اس کو کرسی کہہ دیتے ہیں جس طرح عرش تخت کے لیے بولا جاتا ہے، تو ایک شخص اپنی مملکت میں جس اونچی نشست کے اوپر بیٹھ کے احکام جاری کرتا ہے، مخلوقات کا نظم کرتا ہے اس کو کرسی کہا جاتا ہے، یا ہماری زبان میں تخت

کہا جاتا ہے، فلاں شخص فلاں ملک میں تخت نشین ہے اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں حکومت اس کی چلتی ہے اور آج اس اقتدار کے لیے کرسی کا لفظ استعمال ہوتا ہے، انگریزی میں کرسی کو چیئر کہتے ہیں فلاں شخص چیئر مین ہے یعنی کرسی سنبھالنے والا، کرسی پر بیٹھنے والا آدمی تو جس کو جس حلقہ کے اندر اقتدار حاصل ہو جائے اس کو اس حلقہ کا چیئر مین کہتے ہیں۔

جیسے بھٹو صاحب پیپلز پارٹی کے چیئر مین تھے اسی طرح ہر کمیٹی میں ایک چیئر مین ہوتا ہے، اس لیے جس وقت انسان یہ سمجھتا ہے کہ اب میرا مدمقابل کوئی نہیں، مجھ سے کوئی شخص اقتدار اور اختیار چھین نہیں سکتا تو وہ کہتا ہے میری کرسی بڑی مضبوط ہے تو یہ کرسی نشین ہونا، تخت نشین ہونا اقتدار کے حاصل ہونے سے کنایہ ہوتا ہے مثلاً فلاں شخص کو کرسی مل گئی، یہ کرسی کے ہوس میں پھر رہے ہیں، یہ کرسی کے پیچھے مر رہے ہیں، ان کو کرسی کی فکر ہے، عام طور پر سیاسی میدانوں میں یہ فقرے استعمال ہوتے ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس سے یہی چار ٹانگوں والی کرسی مراد ہوتی ہے؟ یہ تو ہر کسی کے گھر میں ہوگی، بیٹھ کے شوق پورا کرلے لیکن اس سے یہی لکڑی کی کرسی مراد نہیں ہوتی بلکہ کرسی پر بیٹھ کے انسان کو جو حاکمیت حاصل ہوتی ہے، اختیار اور اقتدار جو حاصل ہوتا ہے اس سے وہ مراد ہوتا ہے، کرسی مل جائے، کرسی کو بچانے کی فکر ہے یہ لفظ اختیار اور اقتدار کے لیے بولا جاتا ہے۔

استویٰ علی العرش کا مطلب:

تو" استویٰ علی العرش " اللہ تعالیٰ جو کہتے ہیں، اس لفظ کا جو مبدا ہے اس کو کسی مثال سے واضح نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا عرش کیسا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اس کے اوپر مستوی کیسے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی کرسی کیسی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اپنی کرسی پر کس طرح بیٹھے ہیں؟ اس کو کسی مثال کے ساتھ واضح نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہیں جو اس شان کو واضح کردیں، اس لیے ہم اس مبدا کو تو متعین نہیں کرسکتے اور جو منتہا ہے وہ متعین ہے کہ اللہ کے مستوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات پر تخت نشین وہ ہے، ساری کائنات پر حکومت اس کی چلتی ہے، اور اس کا کوئی ذرہ اس کی حکومت اور اقتدار سے باہر نہیں ہے، اس کائنات کی کرسی پر اللہ بیٹھا ہے، کیا مطلب؟ کہ یہ ساری کائنات اسی کی حکومت کے نیچے ہے اور کوئی ذرہ اللہ تعالیٰ کی اس اقتدار کی صفت سے باہر نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کے اقتدار کا احاطہ کہ زمین و آسمان سب اس کی کرسی کے نیچے ہیں۔

کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے عرش کے نیچے ہے، عرش اور کرسی یہ دو علیحدہ علیحدہ وجود ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی شان ہے اس نے اپنی شان کے لائق یہ بنائے ہوئے ہیں، موجود چیز ہیں، صرف اس کا یہی مجازی معنی نہیں کہ اقتدار

کی طرف اشارہ ہے، واقعہ ہے لیکن ہم اس واقعہ کو کسی مثال سے واضح نہیں کر سکتے ،عرش معلوم ہے کہ تخت کو کہتے ہیں استواء معلوم ہے کہ ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔

لیکن اب اس کی کیفیت کہ اللہ عرش پہ کیسے ٹھہرتا ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کرسی نشین کیسے ہے، ''کیفیتہ مجھول والایمان بہ واجب وانکارہ کفر'' اس کا انکار کفر ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے، کیفیت اس کی مجہول ہے واقعہ صحیح ہے لیکن اس کا جو اثر ہے اس اثر کو ہم بیان کر سکتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ہم کہیں کہ اللہ دیکھتا ہے اور ہم جس وقت دیکھنے کا تصور کرتے ہیں تو فوراً آنکھ کا خیال آتا ہے کہ آنکھ ہے جس کے ذریعہ سے ہم دیکھتے ہیں، تو دیکھنے کے لیے آنکھ مبدا بنتی ہے، ہمارے ہاں دیکھنے کی ایک صورت متعین ہے کہ ہم آنکھ کھولتے ہیں رخ اس طرف کرتے ہیں جو چیز ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، ہمیں نظر آجاتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو اس میں یہ تصور قطعاً نہ کیجئے اگر چہ اس کے لیے عین کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے ''واصنع الفلك باعیننا'' ''ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بناؤ'' انك باعیننا تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے بے شک عین کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن یہ تصور ہم اپنے ذہن میں نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کی آنکھ بھی ایسی ہی ہے جیسی ہماری ہے، یہ تشبیہ لازم آجاتی ہے'' لیس کمثلہ شیئ'' اللہ جیسی کوئی چیز نہیں جس کے ساتھ ہم اس کو تشبیہ دے دیں، لیکن اس دیکھنے کا جو منتہا ہے مبصرات کہ جو چیزیں دیکھنے میں آیا کرتی ہیں دیکھنے سے وہ انسان کے علم میں آجائیں وہ معنیٰ متعین ہے کہ کوئی چیز جو مبصر ہے دیکھی جاتی ہے وہ اللہ سے مخفی نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے تو جو منتہا ہے وہ تو متعین ہے باقی اس صفت کے مبدا کا ہم تصور نہیں کر سکتے کہ اللہ کی شان کے لائق ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔

اسی طرح یہ معنیٰ بھی یقینی ہوا کہ اس کائنات میں کرسی نشین اللہ ہے یہ ساری کائنات اسی کی کرسی کے نیچے ہے یعنی اسی کے اقتدار کے نیچے ہے حکومت اسی کی چلتی ہے باقی کرسی کا نقشہ اور اللہ تعالیٰ اس کرسی پر بیٹھے کس طرح ہیں اس کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے یہاں وہ بات ہے'' سبحانہ ما اعظم شانہ لایُحَدُّ ولایُتصور'' ہم اس پر قادر نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا تصور اس طرح قائم کر لیں جو کریں گے تشبیہ لازم آجائے گی اور'' لیس کمثلہ شیء'' کے اندر اس تشبیہ کی نفی ہے تو'' وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض'' کا مفہوم یہ ہوا کہ اس زمین و آسمان کے اوپر حاکمیت اسی کی ہے اقتدار اسی کا ہے، تصرف اسی کا چلتا ہے، اس کائنات کے اندر کرسی نشین وہی ہے، عرش نشین وہی ہے، تخت نشین وہی ہے، کسی دوسرے کی حکومت نہیں چلتی، تم جو کہو فلاں شعبہ فلاں کے سپرد ہے، بیٹا فلاں دیتا ہے، بارش

فلاں دیتا ہے رزق فلاں دیتا ہے ان کے دروازے کھٹکھٹاؤ، ان کی چوکھٹ پہ پیشانی رگڑو یہ بات غلط ہے یہ سارا اقتدار و اختیار سب اللہ کو حاصل ہے سب کچھ اسی کی کرسی کے نیچے ہے۔

سوال: پھر یہ کہا جاتا ہے کہ عرش کو اٹھانے والے بھی ہیں جو اس کو اٹھاتے ہیں تو اس سے اس کی کیفیت کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ ہوتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوگا؟

جواب: یہ بھی سمجھانے کیلئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش چار فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے اور قیامت کے دن یہ آٹھ ہو جائیں گے یحمل عرش ربك فوقهم یومئذ ثمانية اور فرشتوں کی شکل ایسی ہے، وہ اتنے بڑے بڑے ہیں، اور وہ اس شکل وصورت کے ہیں تو یہ سارے الفاظ ذہن میں اس بات کا یقین ڈالنے کیلئے ہیں کہ عرش کوئی ہے، اب اتنا بڑا عرش سمجھ لیجئے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ساتوں آسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جس طرح ایک بڑی ساری ڈھال ہو اور اس میں سات درہم ڈال دیے جائیں۔

اب درہم تو ہوتا ہے آپ کے چار آنے کے سکہ کے برابر اور ڈھال ہوتی ہے اتنی بڑی جس پر تلوار کو روکا جاتا ہے اور اس میں سات درہم ڈال دیے جائیں تو ان درہموں کی اس ڈھال سے کیا نسبت ہے؟ اور عرش کے مقابلہ میں ساتوں آسمان ایسے ہیں اب اس کا بھی آپ کوئی تصور نہیں کر سکتے نہ آسمان پورا آپ کے تصور میں آئے اور نہ عرش پورا آپ کے تصور میں آئے۔

بہر حال یہ کہیں گے کہ اس کا عرش ساری کائنات پر محیط ہے اور سب زمین و آسمان اس کے عرش کے نیچے ہیں، الفاظ یہی بولیں گے اور اس کا منتہا متعین ہے کہ حکومت ساری کائنات میں اللہ کی ہے، اقتدار اسی کا چلتا ہے، اختیار اسی کا چلتا ہے اس لیے کائنات کے کسی کونے میں کوئی دوسرا آدمی کوئی حکومت نہیں رکھتا یہ مفہوم منتہا کے اعتبار سے متعین ہے باقی ظاہری طور پر تو ظاہری حکمرانوں کی بھی کرسیاں ہوتی ہیں، جس وقت وہ اپنی حاکمانہ شان کے ساتھ اپنے دربار میں آتے ہیں تو ان کی ایک خاص کرسی ہوتی ہے جن پر وہ آکے بیٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت حکیم العصر مدظلہ کی تخت نشینی:

ایک مرتبہ ہم نواب آف بہاولپور کے محل میں گئے تھے تو اس کی جو مخصوص کرسی تھی جس پر بیٹھ کے وہ اپنا دربار لگایا کرتا تھا تو چند لمحے میں بھی اس کے اوپر بیٹھا ہوں اور وہاں بیٹھ کے ہم نے تھوڑی دیر تصور کر لیا کہ یہ ریاست کا حاکم بھی عارضی طور پر اس کرسی پہ بیٹھا ہے اور ہم بھی عارضی طور پر بیٹھ گئے یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کا عارضی طور پر بیٹھنا کئی سالوں میں پورا ہوا اور ہمارا چند لمحوں میں پورا ہو گیا۔

بہر حال ہے تو عارضی طور پر ہی، چند لمحے کے لیے ہم تخت نشین ہوگئے ریاست بہاولپور میں،

''وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض'' وسیع ہے اس کی کرسی زمین وآسمان سے یعنی اس کی کرسی میں زمین وآسمان سمائے ہوئے ہیں اس کی کرسی سب کے اوپر حاوی ہے۔

زمین وآسمان کے نظام کو سنبھالنا اللہ پر گراں نہیں ہے:

''ولا یؤدہٗ حفظھما'' ھما ضمیر سمٰوٰت والارض کی طرف لوٹ گئی، دنیا کے اندر عارضی طور پر، حسی طور پر، ظاہری طور پر اگر کسی علاقہ کا کوئی بادشاہ ہو جاتا ہے، تخت نشین ہو جاتا ہے تو بسا اوقات اس کا انتظام سنبھالنے سے عاجز آجاتا ہے، تھک جاتا ہے اس کا انتظام سنبھالتا ہوا کسی وقت اس کے بس سے یہ بات باہر ہو جاتی ہے لیکن یہاں زمین وآسمان کا سنبھالنا اللہ کو کوئی گراں نہیں گزرتا، اللہ پہ کوئی بھاری نہیں ہے، آد کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کا اس قدر گراں ہونا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے، ان دونوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ پر گراں نہیں ہے۔ وہ ایسا حاکم نہیں کہ اپنے ماتحت ملک سنبھال نہیں سکتا، کبھی کسی طرف کوئی تحریک شروع ہوگئی، کبھی کسی طرف کوئی تحریک شروع ہوگئی اور نظم خراب ہو جائے ایسی بات نہیں اللہ ان دونوں کو سنبھالنے والا ہے ان کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو گراں نہیں گزرتی۔

''وھو العلی'' وہ علو والا ہے، عظیم، عظمت والا ہے، علو اور عظمت یہ دو لفظ جو بولے گئے تو علو سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر کوئی نقص کی صفت نہیں پائی جاتی اور عظیم سے مراد ہے کہ اس میں ہر صفت کمال پائی جاتی ہے۔
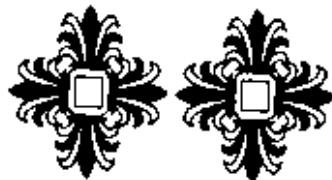
لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

دین میں اکراہ نہیں تحقیق واضح ہوگئی ہدایت گمراہی سے پھر جو کوئی انکار کرے

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

طاغوت کا اور اللہ پر ایمان لے آئے پس تحقیق اس نے مضبوطی سے تھام لیا حلقہ کو

لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

اس حلقہ کے لیے ٹوٹنا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۲۵۶﴾

لا اکراہ فی الدین کا مطلب:

"لا اکراہ فی الدین" اس کا معنی یہ ہے کہ دین کے بارے میں اکراہ نہیں ہے، ظاہری طور پر اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، ہدایت اور ضلالت واضح ہوگئی اب انسان کو چاہیے کہ اپنے اختیار کے ساتھ سوچے، ہدایت کو اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے گا، اور اگر وہ ضلالت اختیار کرنا چاہے تو اس میں بھی کوئی کسی قسم کی مجبوری نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت بھی کسی شخص کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کر سکتی، کسی کافر کو ڈنڈا دکھا کر مسلمان نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ اگر کوئی کافر فتنہ وفساد کو چھوڑ دے اور اسلامی حکومت کا ماتحت ہو جائے، فرمانبرداری کے اظہار کے طور پر جزیہ ادا کرے تو اپنے کفر پر باقی رہتا ہوا زندگی گزار سکتا ہے، رعایا بننے کے بعد اسلامی سلطنت میں اس کو تحفظ حاصل ہوگا اس کی جان محفوظ ہوگی، اس کا مال محفوظ ہوگا، اس کی عزت محفوظ ہوگی پھر اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا کہ تو اپنا عقیدہ بدل، جزیہ کا فلسفہ یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ بچے جن کی طرف سے فساد کا خطرہ نہیں، عورتیں جو کسی قسم کا فساد برپا نہیں کر سکتیں اور بوڑھے جن کے اندر یہ طاقت نہیں رہی کہ کسی قسم کا فتنہ اٹھائیں ان سے جزیہ بھی نہیں لیا جاتا یہ ویسے ہی اپنے عقیدے پر باقی رہ سکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی عورت اندرا گاندھی کی طرح لیڈر بن جائے اور فتنہ اٹھاتی پھرے یا کوئی بوڑھا تجویزیں بنا کر لوگوں میں بغاوت پھیلاتا ہے تو ان کو قتل کیا جا سکتا ہے یہ سزا فساد کی ہے کفر کی نہیں ہے، اگر فساد نہیں کرتے تو ایسی صورت میں ان سے کچھ نہیں لیا جائے گا، نوجوان چونکہ فساد برپا کر سکتے ہیں، فساد چھوڑنے کا عہد کرلیں اور ان کے عہد کا یہ عنوان ہے کہ سالانہ ٹیکس ادا کریں جس وقت یہ ادا کرتے رہیں گے تو یہ علامت ہوگی کہ یہ حکومت کے

فرمانبردار ہیں ان کو بھی قتل نہیں کیا جائے گا، یہ اسی طرح عبادت کر سکتے ہیں، اپنے عبادت خانوں کو آباد کر سکتے ہیں، اور اپنے اسی نظریے اور عقیدے پر زندہ رہ سکتے ہیں، اس لئے دین کے بارے میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لیکن اگر کوئی شخص دین کو قبول کر لیتا ہے مسلمان ہونے کے بعد جب اس نے اس آئین کو قبول کر لیا عقیدے کے بارے میں مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن جس وقت وہ عقیدے کو قبول کر لے تو اس عقیدے کے احکام اس پر نافذ ہوں گے اور ڈنڈے کے ساتھ نافذ ہوں گے، قانونی اکراہ اور قانونی جبر اسلام میں ہے، اور اگر یہ قانونی جبر بھی نہ ہو، قانونی اکراہ بھی نہ ہو، تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ پھر تم کلمہ پڑھ لو اور پھر تم سانڈھ کی طرح آزاد ہو جو چاہو کرتے پھرو، زنا کرو، چوری کرو، ڈاکے ڈالو، نماز نہ پڑھو، قتل کرو، زکوٰۃ نہ دو، بس ایک دفعہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھ کے اسلام قبول کر لو، اور پھر بالکل ایک آزاد حیوان کی طرح زندگی گزار سکتے ہو یہ بات نہیں ہے۔

دین کو قبول کرنے کے بعد اس کے احکامات پر عمل ضروری ہے:

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو اس اسلام کو قبول کرے گا قبول کرنے کے بعد اس آئین کی پابندی کرنی پڑے گی، زنا ڈنڈے مار مار کے چھڑوایا جائے گا، شراب کوڑے مار مار کر چھڑوائی جائے گی، اگر کوئی شخص کسی کی خون ریزی کرے گا تو اس کو اس خون ریزی کے عوض اڑا دیا جائے گا، اگر کوئی چوری کرے گا تو چوری کرنے والے ہاتھ کو کاٹ دیا جائے گا، اس کی چھٹی نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اب تمہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا کوئی بدمعاش استدلال کرے کہ یہ جو کوڑے مارے جاتے ہیں یہ تو مولویوں کی من گھڑت باتیں ہیں اسلام میں تو ''لا اکراہ فی الدین'' ہے دین کے معاملہ میں کوئی جبر ہی نہیں ہے، نماز پڑھے چاہے نہ پڑھے، دین تو ایک نجی زندگی کا معاملہ ہے، اس کو قانونی رنگ دے کر لوگوں کی پکڑ دھکڑ کرنا یہ تو ''لا اکراہ فی الدین'' کے خلاف ہے۔

اس سوال کا جواب آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا، کوئی شیطان تمہیں یہ مغالطہ نہ دے دے ''لا اکراہ فی الدین'' کا یہ معنی قطعاً نہیں ہے، اگر یہ مفہوم ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ کلمہ پڑھو اور اس کے بعد آزادانہ زندگی گزارو، کوئی پوچھنے والا نہیں، لادینی حکومتیں مذہب کو ایک نجی معاملہ قرار دیتی ہیں، اس لئے ان کے ہاں جو قانون بنایا جائے گا اس قانون کے اندر اس بارے میں تو سزا ہو گی کہ اس نے موجودہ حکومت کے قانون کو توڑا ہے، اور اس کو زبردستی اس قانون کا پابند بنایا جائے گا، آئین میں جس بات کی سزا ہو گی جب کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو حکومت اس کو سزا دے

گی باقی مذہب ان کے نزدیک ایک نجی معاملہ ہے اس لئے کوئی عقیدہ رکھا جائے، کوئی عمل اختیار کیا جائے، حکومت کے آئین کے خلاف نہیں ہے تو حکومت میں چھٹی ہوگی۔

لادینی حکومتوں کا نظریہ یہی ہے، نماز پڑھنا نہ پڑھنا چونکہ اس کے متعلق ان کے آئین میں کوئی دفعہ نہیں ہے اس لئے کوئی پڑھے گا تو وہ نہیں پکڑیں گے، اگر کوئی نہیں پڑھے گا تب بھی وہ نہیں پکڑیں گے، اور ایسے ہی دوسرے فرائض ہیں، جس کو نجی معاملہ قرار دے دیتے ہیں کہ مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے لیکن اسلامی حکومت اصولی طور پر یہ اللہ کی حکومت ہے، اور اللہ کے قانون کی پابندی اصولاً اس میں تسلیم ہوتی ہے، اس لئے کوئی ظاہری گناہ کرلے باطنی گناہ کرلے علی الاعلان کرلے، خفیہ کرلے، اللہ کے آئین کے خلاف جس وقت ہوگا اللہ پکڑ لے گا یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے پکڑنے کے دو طریقے ہیں، مخفی جرائم کو آخرت میں پکڑ لے گا اور علی الاعلان جرائم میں اس نے حاکم کو اپنے قائم مقام اختیار دے دیا کہ جو اس قسم کا جرم کرے اس کو سزا دے دیا کرو۔

اس لئے حاکم یہ واضع قانون نہیں ہے یہ اس قانون کو نافذ کرنے والا ہے جو قانون اللہ نے بنا کے دیا ہوا ہے اور جو مخفی گناہ ہیں جن کے اوپر وقت کا حاکم دسترس نہیں رکھتا پکڑ ان پر بھی ہوگی، نجی زندگی بھی آزاد نہیں ہے لیکن وہ پکڑ براہ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کریں گے، جس کا علم محیط ہے، تو مخفی گناہ اللہ کی گرفت میں آئیں گے چاہے دنیا میں سزا دے دے بیماری کی شکل میں، فقر کی شکل میں، کسی دوسری شکل میں، چاہے آخرت میں پکڑ لے اور جو گناہ علی الاعلان ہوں گے ان کی پکڑ کا اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کو اختیار دے دیا ہے، اور اس کو پابند کر دیا کہ اگر کوئی جرم کرنے والا اس قسم کا جرم کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس کو یہ سزا دینی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے جرائم اگر حاکم کے سامنے ثابت ہو جائیں تو حاکم کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے اس سزا کا دینا ضروری ہے، اور اللہ کے حکم کے تحت یہ سزا دی جاتی ہے، ایک تو یہ پابندی ضروری ہوگی اور اس میں پکڑ دھکڑ بھی ہوگی، مار دھاڑ بھی ہوگی، تو یہ ''لا اکراہ فی الدین'' کے خلاف نہیں بلکہ دین کے اندر داخل ہونے کے بعد دین کے فرائض میں یہ بات شامل ہو جاتی ہے کہ آپ کو پھر اس آئین کا پابند ہونا پڑے گا اور اگر آپ پابندی نہیں کریں گے تو اللہ کا خلیفہ جو اس ملک پر مسلط ہے اس بارے میں مجبور کر کے آپ کو سیدھے راستے پر چلائے گا، یہ ایک بیّن حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام صرف یہی ہے کہ عقیدہ قبول کرلو اس کے بعد تمہیں چھٹی ہے کوئی پوچھنے والا نہیں اور یہ بالکل کلیۃً دین کا انکار ہے۔

دین قبول کرنے کے بعد پھر اس کو چھوڑنے کی اجازت نہیں:

اور دوسرا شعبہ اس میں یہ آ گیا کہ دین قبول کر لینے کے بعد، اسلام قبول کر لینے کے بعد پھر اس کو چھوڑنے کی اجازت نہیں یعنی دین پر باقی رکھنے کے لئے جبر کیا جائے گا، اور اگر قبول کرنے کے بعد پھر کوئی انکار کرتا ہے تو یہ بغاوت ہے، ایک آدمی پاکستان کا باشندہ ہی نہ بنے تو وہ پاکستان کے قانون کا پابند نہیں اور اس حاکم کا فرمانبردار ہونے کا پابند نہیں ہے، لیکن ایک دفعہ جو پاکستان کا باشندہ بن گیا، پاکستان کے قانون کو قبول کر لیا اب اگر اس آئین کے خلاف کسی کو بھڑ کا تا ہے یا اس آئین کا انکار کرتا ہے تو وہ باغی ہے اور باغی کی سزا تمام دنیا کے اندر، تمام عقل مندوں کے نزدیک پھانسی ہے، اب اگر دنیا کا قانون اپنے خلاف بغاوت کو برداشت نہیں کرتا اور بغاوت کے نتیجہ میں کسی کو لٹکا دیتا ہے یا گولی کا نشانہ بنا دیتا ہے تو کسی کے نزدیک بھی یہ بے انصافی نہیں، تو اگر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کر لی جائے اور اللہ تعالیٰ کے آئین کو قبول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے آئین کے خلاف اگر کوئی بغاوت کرتا ہے تو یہاں بھی گولی سے اڑا دینا یا قتل کر دینا یہ کوئی عدل وانصاف کے خلاف نہیں ہے۔

اس لئے اسلامی حکومت کے اندر مسلمان ہو جانے کے بعد کسی کو مرتد ہونے کا حق نہیں ہے، ہاں اسلام قبول نہ کرے اس کا اس کو اختیار ہے، ہمارے آئین کو قبول ہی نہ کرے اس کا اختیار ہے لیکن قبول کرنے کے بعد پھر اگر اس کے خلاف چلتا ہے تو باغی ہے پھر باغی کی جو سزا ہوتی ہے وہی اس کو دی جائے گی، قول اقرار کر لینے کے بعد پھر اس کے اوپر پابند کیا جا سکتا ہے، جیسے حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک لڑکی آپ کے نکاح میں آئے یا نہ آئے اس کو اختیار ہے، وہ اس نکاح کو قبول کرے نہ کرے تم کسی کو زبردستی کھینچ کے اپنے گھر نہیں لا سکتے لیکن ایک مرتبہ رضا مندی کے ساتھ اس نے اگر ایجاب وقبول کر لیا پھر اگر نکل کے جائے تو فرمایا کرتے تھے کہ پھر چاہے تم اس کے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹ لو تمہیں حق پہنچتا ہے، جب وہ اپنے اختیار کے ساتھ ایک دفعہ آ گئی اب اس کو جانے کا اختیار نہیں ہے اب اس کو آپ پابند کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی اسلام کو قبول نہ کرے اس کی مرضی لیکن قبول کرنے کے بعد اس کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے اس پر اس کو پابند رکھا جائے گا، اس لئے ''لا اکراہ فی الدین'' کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی کافر کو دین کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، اس طرح اس کو بیان کیا جائے تو بھی اپنی جگہ بات بالکل صحیح ہے۔

لا اکراہ فی الدین کا دوسرا مطلب:

ورنہ اس کا صحیح مطلب یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ '' لا اکراہ فی الدین '' کا مطلب وہی ہے جو پیچھے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا تھا کہ '' لو شاء اللہ ما اقتتلوا و لکنّ اللہ یفعل ما یرید'' کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت

اور ضلالت واضح ہوگئی اب اللہ کی طرف سے اکراہ نہیں ہے کہ سارے کے سارے لوگ اس دین کو ضرور قبول کریں، اس اکراہ کو فطری اکراہ پر محمول کریں کہ اللہ تعالیٰ نے فطرۃً انسان کو مجبور نہیں کیا کہ اس کو ضرور قبول کرے بلکہ حق اور باطل دونوں کو واضح کر دیا اور اس کے قبول کرنے نہ کرنے کا فطری طور پر اختیار دے دیا اب جو شخص اپنے اختیار کے ساتھ قبول کرے گا اللہ سے اجر پا لے گا، اور جو قبول نہیں کرے گا اللہ کے ہاں سزا پائے گا تو اس کو فطری اکراہ پہ محمول کیا جائے گا کہ انسان کو اختیار دے کے آزاد چھوڑ دیا لیکن اگر وہ قبول کرتا ہے پھر اس کو اس کی پابندی کرنی پڑے گی تو اس اکراہ سے فطری اکراہ مراد ہے کہ اللہ نے ضلالت اور ہدایت کے بارے میں انسان کو مختار پیدا کیا ہے مجبور پیدا نہیں کیا۔

حق واضح ہو گیا، ہدایت اور ضلالت واضح ہوگئی، اب جو شخص طاغوت کا انکار کرے یعنی جتنی طاقتیں اللہ تعالیٰ کے خلاف چلنے والی ہیں وہ لوگوں کو اللہ کے خلاف چلنے کی ترغیب دیتی ہیں، ان کا دامن چھوڑتا ہے اور اللہ پہ ایمان لاتا ہے، اللہ کا دامن پکڑتا ہے تو اس نے مضبوط حلقہ کو تھام لیا یہ بہت مضبوط سہارا ہے، اس سہارے کی طرف سے کبھی تمہیں دھوکہ نہیں دیا جائے گا، یہ حلقہ ٹوٹنے والا نہیں ہے یہ مضبوط حلقہ ہے اور تم اس کے ذریعہ سے نجات پا جاؤ گے، بخلاف اس کے کہ جو شخص طاغوت کا دامن پکڑتا ہے یہ دھوکے کا حلقہ ہے اور یہ کسی نہ کسی وقت تم سے غداری کر کے تمہیں کسی ایسے ذلت کے گڑھے میں پھینکے گا کہ پھر تمہارے لئے کوئی سہارا نہیں ہوگا، اس حلقہ کو تم اپنے اختیار کے ساتھ چھوڑ تو سکتے ہو، یہ تمہارے ہاتھ سے چھوٹ تو سکتا ہے لیکن یہ رسی ٹوٹنے والی نہیں ہے، یہ مضبوط رسی ہے جس کسی نے پکڑ لی۔

لفظ طاغوت کا معنیٰ اور مفہوم:

طاغوت یہ لفظ طغیان سے لیا گیا ہے سرکش ہو جانا، اپنی حد سے تجاوز کر جانا، دریا میں طغیانی آگئی یہ لفظ طغیانی طاغوت سے ہی لیا گیا ہے، جس وقت دریا اتنا اچھل آتا ہے کہ وہ اپنی حد سے زیادہ ہو گیا تو کہتے ہیں کہ دریا میں طغیانی آگئی، قرآن کریم میں بھی یہ لفظ آیا ہوا ہے "لما طغی الماء حملناکم فی الجاریة" جب پانی میں طغیانی آگئی تو ہم نے تمہیں کشتی میں سوار کر لیا، طاغوت ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو حدود عبدیت سے نکل جائے، خود اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کا اقرار نہیں کرتا اور دوسروں کو بندگی سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے خود سرکش ہے اور دوسروں کو سرکش بناتا ہے اسے طاغوت کہا جاتا ہے، تو جو بھی اس کائنات میں ایسا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں سرکش ہے۔

اور دوسروں کو سرکش بنانے کی کوشش کرتا ہے اس کے لئے طاغوت کا لفظ بولا جاتا ہے، اس کا مصداق شیطان بھی ہو سکتا ہے اور ہر وہ گمراہ، بددین لیڈر بھی جو کسی غلط راستے کی طرف لے جا رہا ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی نہ کرتا ہو اس کو طاغوت کہیں گے تو طاغوت کے لفظ کی میں نے وضاحت کر دی کہ طاغوت اس کو کہیں گے

جو اپنی ذات کے اعتبار سے سرکش ہو گیا اور لوگوں کو سرکش بنانے کی کوشش کرتا ہے، تفسیروں کے اندر عام طور پر اس کا معنیٰ لکھا ہوا ہو گا طاغوت سرکش'' کل من عُبِدَ من دون اللہ '' ہر وہ شخص جس کی پوجا اللہ کے علاوہ کی گئی وہ طاغوت کا مصداق ہے، اس کا معنیٰ یہی ہو گا جس کا مصداق شیطان یا وہ لوگ جو اپنی عبادت کی طرف بلاتے ہیں، عبادت کرنے والوں کی عبادت پر خوش ہوتے ہیں ان کو ہم کہیں گے کہ یہ حد عبدیت سے باہر نکل گئے۔

انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے لیے طاغوت کا لفظ استعمال کرنا حرام ہے:

اور ایسی شخصیت جو اللہ کی عبادت کی دعوت دے اور لوگ اس کو زبردستی معبود بنالیں یہ ''ماعبد من دون اللہ '' کا مصداق تو بن گیا لیکن اس کے اوپر طاغوت کا لفظ بولنا جائز نہیں ہے، کیونکہ طاغوت انتہائی درجہ کی مذمت کا عنوان ہے۔

ایک کتاب لکھی گئی تھی کسی زمانہ میں اب وہ ناپید ہو گئی ''بلغۃ الحیران ''اس کا نام تھا اس کتاب میں انہی آیات کی تفسیر میں یہ لفظ بھی چھپ گیا اور اب بھی اس کتاب میں موجود ہے کہ طاغوت کا معنیٰ'' کل ما عبد من دون اللہ ''اور اس معنیٰ کے اعتبار سے طاغوت کا لفظ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء پر بھی بولا جاسکتا ہے جن کی لوگوں نے عبادت کی تو جو اس کتاب کے اوپر اعتراضات تھے جس کی وجہ سے اس کتاب کے خلاف اشتعال پھیلا، ان میں سے ایک عبارت یہ بھی تھی اب اس کے اوپر مولانا غلام اللہ صاحب نے جو اصلاحی کام کیا ہے، اور ''جواھر القرآن'' کے نام سے تفسیر چھاپی ہے، اس میں سے یہ عبارت نکال دی ہے، پرانی ''بلغۃ الحیران ''میں ہے جواہر القرآن میں یہ عبارت نہیں ہے، اور ہم حسن ظن کے طور پر یہ کہیں گے کہ یہ لغزش قلم ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ کسی ولی کے لئے طاغوت کا لفظ استعمال کریں یہ تو مذمت کا عنوان ہے اور ایک ولی جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وقت گزارا لوگوں کو اللہ کی عبادت کی ترغیب دی اگر لوگوں نے اسی کی عبادت شروع کردی تو اس کا کیا قصور، وہ طاغوت کیوں بن گیا، طاغوت کے لفظ میں بے ادبی کا معنیٰ پایا جاتا ہے اس لئے ہم اس عبارت کو قلم کی لغزش قرار دیں گے۔

راعنا کا لفظ جس میں یہود نے مذموم معنیٰ کا ارادہ کرلیا تھا اللہ نے اپنے نبی کے لئے وہ برداشت نہیں کیا چاہے لفظ استعمال کرنے والے اس کو صحیح معنیٰ میں استعمال کریں، لیکن یہ لفظ مقام نبوت کے مناسب نہیں ہے، اور طاغوت کا لفظ تو ایک مذمتی معنیٰ کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لئے اولیاء انبیاء علیہم السلام کے لئے اس لفظ کو استعمال نہیں کیا جائے گا، ہاں البتہ طاغوت اس کو کہیں گے جو سرکش ہے اور لوگوں کو سرکشی کی تعلیم دیتا ہے، تو ''بلغۃ الحیران'' کی اس عبارت پر اعتراض صحیح ہے اور ہم اس کو قلم کی لغزش قرار دیتے ہیں۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۬ؕ

اللہ مددگار ہے ان لوگوں کا جو ایمان لے آتے ہیں اور نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف،

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے اولیاء طاغوت ہیں وہ ان کو نکالتے ہیں نور سے

اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۠ (۲۵۷) اَلَمْ تَرَ

ظلمات کی طرف یہی لوگ جہنم والے ہیں اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں (۲۵۷) کیا دیکھا تو نے

اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ

اس شخص کی طرف جس نے جھگڑا کیا ابراہیم کے ساتھ ابراہیم کے رب کے بارے میں اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا

جب کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اس نے کہا میں بھی

اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ

زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ لاتا ہے سورج کو

مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ

مشرق سے لے آتو اس کو مغرب سے پس مبہوت ہو گیا وہ جس نے کفر کیا تھا

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ (۲۵۸) اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ

اور اللہ تعالیٰ نہیں منزل مقصود تک پہنچاتا ظالم لوگوں کو (۲۵۸) یا کیا دیکھا آپ نے اس جیسے شخص کی طرف جو گزر رہا تھا ایک بستی پر

وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ

جو گری پڑی تھی اپنی چھتوں پر اس نے کہا کیونکر زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس قریہ کو (باشندوں کو) بعد

مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ

اس کے مرنے کے اللہ تعالیٰ نے اس کو موت دے دی سو سال تک پھر اس شخص کو اٹھایا اللہ تعالیٰ نے کہا تو کتنا ٹھہرا،

قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ

اس نے کہا ٹھہرا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ ٹھہرا تو سو سال،

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ

دیکھ تو اپنے کھانے کی چیز کی طرف اور پینے کی چیز کی طرف کہ وہ سڑا نہیں اور دیکھ تو اپنے گدھے کے طرف

وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا

تا کہ بنادیں ہم تجھے لوگوں کے لئے نشانی اور دیکھ تو گدھے کی ہڈیوں کی طرف ہم ان کو کیسے ابھارتے ہیں

ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ

پھر ان کے اوپر کیسے گوشت چڑھاتے ہیں پھر جب اس شخص کے لئے یہ سارا حال ظاہر ہوگیا تو اس شخص نے کہا میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ

قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۵۹﴾ اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے پروردگار دکھادے مجھ کو تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا،

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو جانتا نہیں اور تو ایمان نہیں لاتا؟ ابراہیم نے کہا کیوں نہیں تا کہ میرے دل کو اطمینان آجائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لے

اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ

پرندوں میں سے چار پرندے پھر ان کو تو اپنی طرف مائل کرلے (پھر ذبح کر) پھر رکھ ہر پہاڑ پر

مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ

ان میں سے ایک ٹکڑا پھر تو ان کو بلا آئیں گے وہ تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تو یقین کرلے بے شک اللہ تعالیٰ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾

زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲۶۰﴾

پورے سبق کا خلاصہ:

اصل مسئلہ تو چلا تھا پچھلے رکوع کی ابتداء میں انفاق فی سبیل اللہ کا، وہاں سے کلام منتقل ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بیان کرنے کی طرف اور توحید کے عقیدے کی وضاحت کی طرف، اور توحید کے عقیدے کو واضح کرنے کے بعد یہ ذکر آگیا تھا کہ جو لوگ ایمان لے آتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی دست گیری فرماتے ہیں اور ان کو ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور جو کافر ہوتے ہیں ان کے اولیاء شیطان بن جاتے ہیں، وہ ان کو نور سے نکال کے ظلمات کی طرف لے جاتے ہیں، اس مضمون سے تعلق کے طور پر آگے تین مثالیں دی جارہی ہیں جن میں ایک مثال کافر کی ہے کہ کس طرح شیطان اس کے اوپر مسلط ہوا واضح سے واضح دلیل اس کے سامنے آئی روشنی اس کے سامنے آئی لیکن اس کی آنکھیں چندھیا تو گئیں، مگر حقیقت کو نہ دیکھ سکیں، جس طرح وہ تاریکی میں پڑا ہوا تھا ویسے کا ویسے ہی پڑا رہا، اور اس کو اس حق اور نور کے قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی، متحیر تو ہوگیا آنکھیں تو اس کی چندھیا گئیں لیکن اس نے اس نور کو قبول نہیں کیا اس کو حقیقت نظر نہیں آئی۔

اور دو مثالیں اللہ تعالیٰ کے مقبولین کی دیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کیا ان کے دل میں کسی معاملہ میں اگر کوئی تردد پیدا ہوا تو اللہ نے دستگیری کر کے ان کو اعلیٰ منزل تک پہنچایا، یہ مثال ہوجائے گی اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی کس طرح راہنمائی کرتا ہوا ترقی کی طرف لے جاتا ہے، اور پہلی مثال کافر کی ہے کہ جب اس کا تعلق اللہ کے ساتھ نہیں تھا، شیطان اس کے اوپر مسلط تھا تو واضح دلیل آنے کے بعد بھی اس نے حق کو قبول نہیں کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مابین مناظرہ اور نمرود کی کھلی شکست:

پہلا واقعہ جو بطور مثال کے ذکر کیا جارہا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اس زمانہ کے بادشاہ نمرود کا ہے، مفسرین کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ "الذی حاجّ" سے مراد نمرود ہے، نمرود یہ عراق کا بادشاہ تھا، اور اس زمانہ میں اکثر وبیشتر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اپنی رعایا کا رب بھی قرار دیتے تھے، مصر، عراق اور چین ان کے بارے میں صراحتاً تاریخوں کے اندر موجود ہے کہ یہاں لوگ مشرک تھے، بت پرست تھے، اور جو ان کے دیوتا تھے ان میں سے بادشاہ کو سب سے بڑا خدا قرار دیتے تھے، اور بادشاہ کے ساتھ ان کے ویسے ہی روابط تھے جیسے روابط معبود کے ساتھ ہوا کرتے ہیں، اسی کو سجدہ کرنا اور اسی کو اپنے لئے سب کچھ سمجھنا، مصر کا ذکر آپ کے سامنے فرعون کے تذکرے میں آیا، جو کہتا تھا "انا ربکم الاعلیٰ"

اور اسی طرح عراق کے باشندے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اصولاً یہ ستاروں کو پوجتے تھے، اور ان ستاروں میں سب سے بڑا دیوتا ان کا سورج تھا، اور وقت کے بادشاہ کو یہ سورج کا اوتار سمجھتے تھے، اور نمرود بھی اس ماحول کے مطابق اپنے آپ کو اپنی مخلوق کا رب سمجھتا تھا اور اپنی قوم کا سب سے بڑا اوتار بنا ہوا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت ہوش سنبھالا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت مل گئی اور آپ نے اس بات کا اعلان کیا کہ رب حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے ربوبیت ثابت نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ کے مختلف انداز تھے، باپ کے ساتھ تبلیغ کا ذکر ہے یہ گھریلو تبلیغ ہے، پھر قوم کے ساتھ ہے یہ عوامی تبلیغ ہے اور پھر درجہ بدرجہ یہ بات شاہی دربار تک پہنچ گئی، اور بادشاہ کے علم میں جس وقت یہ بات آئی کہ کوئی شخص میری ربوبیت کے مقابلے میں لوگوں کو اور ربوبیت کی طرف متوجہ کر رہا ہے، جس سے میرا حلقہ کم ہو جائے گا تو ابراہیم علیہ السلام کو اس معاملہ میں گفتگو کرنے کے لئے اپنے دربار میں بلا لیا کہ میں نے سنا ہے کہ تو رب کسی اور کو قرار دیتا ہے، اس بات کی تحقیق کے لئے سامنے بلا لیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جس وقت گئے تاریخ میں جس طرح واقعہ کی تفصیل ہے دربار کا یہ دستور تھا کہ جو آتا بادشاہ کو سلام کے طور پر سجدہ کیا کرتا تھا، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لے گئے تو آپ نے سجدہ نہیں کیا، اس نے گرفت کی کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں سجدہ اپنے رب کو کرتا ہوں، رب کے علاوہ میں کسی دوسرے کو سجدہ نہیں کرتا۔

گفتگو شروع ہوگئی اس کے لیے یہ بات عجیب تھی کہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو رب قرار دیا جائے، اس نے سوال کیا کہ تیرا رب کون ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسی بات کہی کہ اگر اس میں غور کیا جائے تو جاہل سے جاہل آدمی بھی اس دلیل کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ یہ جو بادشاہ تھا اس کے سامنے یہ تو حقیقت تھی کہ اس سے قبل اس کا باپ بادشاہ ہوگا، اور اس سے قبل اس کا دادا بادشاہ ہوگا، باپ دادا نہ ہوں تو بہر حال کوئی دوسرا ضرور تھا، جس کے مرنے کے بعد یہ آیا، اور ان کے سامنے یہ حقیقت نمایاں ہونی چاہیئے کہ وہ بھی اسی طرح رب کہلاتے تھے، اگر موت وحیات ان کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ مرتے کیوں؟ اور بادشاہت چھوڑ کر یہاں سے جاتے کیوں؟ جب وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکے تو معلوم ہو گیا کہ موت وحیات ان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

اور اس طرح نمرود کو بھی یقین ہونا چاہیئے کہ میں نے بھی ایک دن مرنا ہے اور مرنے کو کسی انسان کا جی نہیں چاہتا، اور مرنا ضرور ہے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ موت وحیات کسی دوسری قوت کے ہاتھ میں ہے، موت وحیات ان انسانوں میں سے کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے، چاہے وہ خدا بنا بیٹھا ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی بات کی طرف متوجہ کیا کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، آپ کا خیال یہ ہوگا کہ یہ ایسی واضح بات ہے جس کے سمجھنے میں نمرود کو کوئی دقت پیش نہیں آئے گی، وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ واقعی کوئی طاقت اوراوپر ہے جس کے قبضہ میں ہماری موت وحیات ہے، اگر موت وحیات ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو ہمارے بڑے کیوں مرتے؟ آج تخت نمرود کے پاس نہ ہوتا، نمرود کے باپ دادا کے پاس ہوتا، یہاں اپنا عجز نمایاں ہو جانا چاہیئے تھا، اور اس کا ذہن ادھر متوجہ ہو جانا چاہیئے تھا کہ واقعی ہمارے اوپر کوئی طاقت موجود ہے جو اپنی مشیت کے تحت ہمیں زندگی دیتی ہے اور اپنی مشیت کے تحت اس زندگی کو واپس لے لیتی ہے، تو اوپر والی بالائی قوت کی طرف توجہ ہو جائے گی، اس کو احساس ہو جائے گا کہ واقعی ہمارے اوپر کوئی اور بھی ہے۔

لیکن جس وقت انسان ارادہ کر لے کہ میں نے سمجھنا نہیں ہے، اس وقت ہر دلیل کے اندر انسان ہیر پھیر کر لیتا ہے، یا تو اتنی بدی عقل کا تھا کہ بات کو سمجھا نہیں یا اس نے جان بوجھ کے اس بات کو بگاڑا، وہ کہنے لگا یہ صفت تو مجھے بھی حاصل ہے، میں ہی زندگی دیتا ہوں میں ہی موت دیتا ہوں، جس طرح تفاسیر کے اندر واقعہ لکھا ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو بلا کے قتل کر دیا کہ دیکھو اسے میں نے موت دے دی اور ایک ایسا شخص جس کا قتل کیا جانا طے ہو چکا تھا اس کو آزاد کر دیا کہ دیکھو اسے میں نے زندگی دے دی، حالانکہ یہ سراسر مغالطہ تھا زندگی دینے کا مطلب یہ ہے کہ بے جان چیز میں زندگی ڈالو یہ نہیں کہ زندہ چیز کو زندہ رہنے دو۔

احیاء تو بے جان چیز میں زندگی ڈالنے کو کہتے ہیں، اور ایک زندہ چیز کو تم نے ذبح نہیں کیا زندہ چھوڑ دیا یہ زندہ چھوڑا ہے زندہ کیا نہیں ہے، یہ حیات دینا نہیں کہلاتا، اور موت دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے اختیار کے ساتھ کسی کی جان نکالو، موت وہ دیا کرتا ہے جس کے اختیار کے ساتھ جان نکلتی ہے کہ چاہے تو وہ باقی رکھے اور چاہے تو وہ نکال دے، ''القدرۃ تتعلق بالضدین'' قدرت کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے، جو شخص ضدین پہ قادر نہیں ہے وہ قادر نہیں مجبور ہے، ایک شخص کی ٹانگیں بے کار ہو گئیں اور وہ بیٹھا ہے آپ اس کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اپنی قدرت سے بیٹھا ہے، یہ عاجز ہے بیٹھنے پہ مجبور ہے، اور آپ کی ٹانگیں صحیح ہیں چاہیں تو کھڑے ہو جائیں چاہیں تو بیٹھ جائیں، تو کہا جائے گا کہ آپ اپنی طاقت سے بیٹھے ہیں اپنے اختیار سے بیٹھے ہیں۔

اب میری آنکھ میں اللہ نے بینائی رکھی ہوئی ہے اگر میں چاہوں تو آنکھ کھولوں تو سامنے کی کتابیں مجھے نظر آ جائیں گی، میں چاہوں بند کر لوں نظر نہیں آئیں گی، یہاں کہا جائے گا کہ میں اپنے اختیار سے دیکھتا ہوں اور مجھے دیکھنے کی قدرت حاصل ہے، چاہوں تو دیکھوں چاہوں تو نہ دیکھوں، اور اگر ایک شخص کی آنکھوں میں نور ہی

نہیں ہے اور وہ کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتا تو یہ نہیں کہیں گے کہ یہ نہ دیکھنے پہ قادر ہے، یہ نہ دیکھنے پہ قادر نہیں، نہ دیکھنے پہ مجبور ہے، اس لئے آپ دیوار کو اندھا نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ دیکھنے پہ قادر نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دیکھنے پہ قادر ہے قدرت وہاں ہوتی ہے جہاں تعلق جانبین کے ساتھ ہو، دونوں شقوں پر اگر قدرت حاصل ہو تو پھر ہم کہیں گے کہ یہ قادر ہے، اور اگر ایک ہی ہے دوسری نہیں ہے تو وہ مجبور ہے قادر نہیں ہے۔

اسی طرح آپ لوگ چھری کے ساتھ بکری کی رگیں کاٹتے ہیں، رگیں کاٹنا تو آپ کا کام ہے باقی روح کا نکالنا یہ آپ کا کام نہیں ہے، اگر روح کا نکالنا بھی آپ کی قدرت کے ساتھ ہو تو آپ چاہیں تو اس کو روک بھی سکتے ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ رگیں کٹ جانے کے بعد آپ کو اختیار نہیں کہ اگر آپ اس روح کو روکنا چاہیں تو روک لیں رگیں اسی طرح قائم ہیں تو آپ اس کی روح نکالنے پہ قادر نہیں اور رگیں کاٹنے کے بعد آپ اس کی روح کو روکنے پر قادر نہیں، اب اگر روح باقی ہے تو اللہ کی قدرت کے ساتھ باقی ہے، اور رگیں کٹنے کے بعد اگر روح نکلے گی تو اللہ کی قدرت کے ساتھ نکلے گی، اس لئے رگیں کاٹنے کی نسبت تو آپ کی طرف ہے لیکن موت دینے کی نسبت اللہ کی طرف ہے، کیونکہ روح آپ کے اختیار سے نہیں نکلی وہ اللہ کے اختیار سے نکلی ہے۔

اس لئے جس شخص نے تلوار کے ساتھ کسی شخص کی گردن اڑائی ہے اس کو یہ نہیں کہیں گے کہ موت اس نے دی ہے گردن کا کٹ جانا ایک ظاہری سبب ہے، روح کا نکلنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے، اگر انسان کے اختیار میں ہوتا تو چاہتا تو روح نکلنے دیتا چاہتا تو نہ نکلنے دیتا، یہ ہے جس کو قدرت کہتے ہیں، اور احیاء اور اماتت اس تفصیل کے ساتھ یہ دونوں صفتیں اللہ کے لئے ثابت ہیں، کسی دوسرے کے لئے ثابت نہیں ہیں، لیکن اس نے ظاہری طور پر ایک کو زندہ چھوڑ دیا یہ حیات باقی جو رہ گئی وہ کہتا ہے کہ میں نے زندہ کیا اور ایک آدمی کو قتل کر دیا تو کہتا ہے میں نے موت دی، تو یہ احیاء اور اماتت تو مجھے بھی حاصل ہے، اور جو تو نے علامت بیان کی ہے اپنے رب کی وہ تو میرے اندر بھی پائی جاتی ہے لہٰذا اس دلیل سے تو میری ربوبیت کی نفی نہیں ہوتی۔

اب اصول تو یہ ہے کہ جو دلیل بیان کی گئی مدمقابل شخص نے اس پر جو اعتراضات کیے ہیں، تو اس کے اعتراض کا جواب دیا جائے، اور اپنی دلیل کو صاف کیا جائے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح نہیں کیا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صرف مجادل ہی نہیں بلکہ وہ تو داعی الی الحق تھے، وہ سمجھ گئے کہ اس میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ بات سمجھنے پہ قادر نہیں ہے اس دلیل کو چھوڑ کے دوسری دلیل کی طرف آگئے، فرمانے لگے کہ میرا رب وہ ہے جو ہر روز مشرق سے سورج کو چڑھاتا ہے تو ذرا ایک دن مغرب سے طلوع کر کے دکھا دے،

اس بات پر کافر مبہوت ہو گیا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں، کیونکہ جب وہ اپنے آپ کو رب قرار دیتا ہے تو اس کی قدرت ثابت ہونی چاہیئے، اب وہ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ مشرق کی طرف سے ہر روز میں چڑھاتا ہوں، کیونکہ وہ بھی جانتا ہے کہ یہ بات خلاف واقعہ ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ کہے کہ میں چڑھاتا ہوں تو پھر ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک دن نہ چڑھاؤ، ادھر سے چڑھا کے دکھا دو تب ہم سمجھیں گے کہ تم قادر ہو۔

اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ میں کیسے کہہ دوں کیونکہ اگر وہ کہتا کہ میں چڑھاتا ہوں، تو پھر سوال واضح ہو گیا تھا کہ اگر تو چڑھاتا ہے تو پھر ایک دن ہمیں اپنی قدرت دکھلا دے، اور سورج ادھر سے چڑھا دے، لیکن اگر تو اس کی رفتار کو بدل نہیں سکتا، اس کے طلوع کی جگہ کو بدل نہیں سکتا، تو معلوم ہو گیا کہ یہ تیرے بس میں نہیں ہے، یہ کسی اور کے بس میں ہے۔

اور پھر سورج ہی ان کا سب سے بڑا دیوتا تھا جس کا یہ اپنے آپ کو قائم مقام قرار دیتا تھا، گویا کہ میں اس کا مظہر ہوں تو گویا کہ سورج کے مسئلہ کو ذکر کر کے ہی اس کے اوپر اتمام حجت کر دیا، اب یہاں وہ مبہوت ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا، لیکن اس نے اس حق کو قبول بھی نہیں کیا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستگیری نہ ہو شیطانی قوتیں انسان کے اوپر مسلط ہو جائیں، تو حق کی روشنی کتنی ہی تیز طور پر سامنے آ جائے تو آنکھیں چندھیا تو جائیں گی لیکن حقیقت نظر نہیں آئے گی۔

یہی ہے جس کو ذکر فرمایا کہ "واللہ لا یھدی القوم الظالمین" جو لوگ اس قسم کے بے انصاف ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو غلط استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرامات کو شکر کا ذریعہ بنانے کی بجائے اپنے غرور اور گھمنڈ کا باعث بنا لیتے ہیں ایسے لوگوں کو حق سمجھنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

پہلی مثال تو یہ ہوئی ابتدا کے اندر جو الفاظ آئے تھے کہ کیا دیکھا آپ نے اس شخص کی طرف جس نے جھگڑا کیا ابراہیم علیہ السلام سے ابراہیم علیہ السلام کے رب کے بارے میں، جھگڑا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی تو سلطنت کا مل جانا اللہ کا بہت بڑا انعام تھا چاہیئے تھا کہ شکر گزار ہوتا، اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا لیکن یہی انعام اس کے لئے غرور اور گھمنڈ کا باعث بن گیا، یہ انعام اس کو سرکشی کی طرف لے گیا، نیازمندی کی طرف نہیں لایا، یہ بھی ایک اعتراض تھا کہ اللہ کی دی ہوئی سلطنت کو اس نے اللہ سے بغاوت کا ذریعہ بنا لیا، اور ظالم بھی وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی معصیت میں صرف کرتا ہے، اطاعت میں صرف نہیں کرتا، اس کو شکر گزاری کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ کفران کا باعث بنا لیا، ایسے لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام کی موت اور پھر زندہ ہونے کا واقعہ:

''الذی مر'' ''جو شخص گزرا'' یہ گزرنے والا کون تھا؟ قرآن کریم میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، البتہ اکثر مفسرین نے یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام کا قرار دیا ہے، یہ اسرائیلی پیغمبر ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے ''قالت الیھود عزیر ابن اللہ'' ''ایک بستی اجڑی ہوئی تھی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی سے مراد بیت المقدس کی بستی ہے، جو بخت نصر بادشاہ نے حملہ کر کے یہاں کے لوگوں کو قتل بھی کیا، اور بستی کو آگ لگادی، اور ویران کردی، کھنڈرات بنے ہوئے تھے، حضرت عزیر علیہ السلام اپنے گدھے پر سوار تھے اور گذرے جا رہے تھے۔

اب نبی عقائد صحیحہ کا حامل ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا ان پر پختہ یقین ہوتا ہے، اس میں ریب اور شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ یقین ہونے کے باوجود بسا اوقات جب تک مشاہدہ نہ ہو تو دل میں پریشانی ہوتی ہے کہ یہ کیسے ہوگی اللہ تعالیٰ نے بشارت دے دی زکریا علیہ السلام کو کہ تیرے لڑکا ہوگا اور وہ چونکہ ظاہری اسباب کے خلاف بات تھی، اس لئے کہا ''انی یکون لی ولد'' بیٹا کیسے ہوگا، اس کے پیدا ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ میں دوبارہ جوان ہوں گا، مجھے نئی شادی کا حکم دیا جائے گا کیا صورت ہوگی۔

اب یہ اللہ کے کہنے کے بعد یقین تو آ گیا کہ اولاد ہوگی لیکن کیسے ہوگی یہ ذہن میں سوال ابھرتا ہے، جیسے آپ کے سامنے آج کل کی نئی مصنوعات کے متعلق تذکرہ کیا جائے کہ ایک مشین ہے جو خود حساب کرتی ہے، وہ خود میزان بناتی ہے اور اس کا حساب بالکل صحیح ہوتا ہے، تو آپ اس کمپیوٹر کے متعلق اتنی خبریں سن چکے ہیں آپ کو یقین ہے کہ ایسا ہے لیکن جس وقت تک آپ دیکھ نہیں لیں گے اس وقت تک دل میں تردد رہے گا کہ وہ مشین کیسی ہوگی، وہ کیسے حساب کرتی ہے، تو یہ کیسے والا سوال جو پیدا ہوتا ہے یہ یقین کے بعد بھی ایک کیفیت ہے جو انسان کو مشاہدہ سے حاصل ہوتی ہے۔

اس کو حاصل کرنے کے لئے انسان کے ذہن کے اندر یہ سوال پیدا ہوتا ہے ایک آدمی کے متعلق آپ نے سن لیا کہ وہ دس من وزن اپنے دانتوں کے ساتھ اٹھالیتا ہے، آپ کو یقین آجائے گا کہ اٹھالیتا ہے، لیکن دل میں ایک چاہت سی ہوگی کہ دیکھیں تو سہی وہ دس من وزن کیسے اٹھالیتا ہے؟ پھر جب اس کو اٹھاتا ہوا دیکھ لیں گے تو آپ کو اطمینان کی کیفیت حاصل ہو جائے گی کہ واقعی جو ہم نے سنا تھا بالکل صحیح ہے، تو یقین آجانے کے بعد بھی جس وقت تک اس چیز کا مشاہدہ نہ ہو اس وقت تک انسان کے دل کے اندر اس قسم کے سوالات ابھرتے رہتے ہیں کہ کیونکر ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ کیا صورت ہوگی؟ اس قسم کی کیفیات انبیاء علیہم السلام پر بھی طاری ہوتی ہیں، وہ اپنے درجہ کے

مطابق اطمینان کے طالب ہوتے ہیں، چاہے ان کو جو اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ ہم سے لاکھ درجہ زیادہ ہو پھر بھی ان کے درجہ کے مطابق اس قسم کے سوالات ان کے دل و دماغ میں ابھر سکتے ہیں۔

ان کے ذہن میں بھی ایسی ہی بات آئی اللہ تعالیٰ نے فوراً دستگیری فرمائی، اور ان کے سوال کا اللہ نے مشاہدہ کرادیا، مشاہدہ کرانے کے بعد دیکھو، ایمان میں ترقی ہوگئی اللہ تعالیٰ اس طرح دستگیری کر کے اپنے بندوں کو آگے لے جاتا ہے، تو جب ان کے دل میں یہ سوال ابھرا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر، ان کے گدھے کے اوپر موت طاری کردی، اور سو سال تک ان کے اوپر موت طاری رہی۔

سو سال کے بعد اٹھایا جس وقت اٹھایا پہلے تو یہ سوال کیا کہ کتنی مدت یہاں ٹھہرے ہو؟ وہ کہنے لگے ایک دن یا دن کا بعض حصہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایک دن یا دن کا بعض حصہ نہیں تو ایک سو سال تک یہاں پڑا رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے بتانے سے یقین آگیا کہ واقعی سو سال کے بعد اٹھا ہوں، لیکن پھر قدرت دیکھ کھانے پینے کی چیز تیرے ساتھ تھی جیسے تھی ویسی کی ویسی ہی پڑی ہے، اس کے اوپر مرور زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوا، اس لئے اللہ تعالیٰ اگر کسی چیز کو محفوظ رکھنا چاہے تو اس کا نمونہ دیکھ لو، آدمی کے بدن سے روح نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتے ہیں، اس میں کوئی تغیر نہیں آنے دیتے۔

جس چیز کو بچانا چاہیں اس کا نمونہ بھی موجود ہے کہ نہ تیرے کھانے میں کیڑے پڑے، نہ بو آئی، نہ باسی ہوا تازہ کا تازہ ویسے ہی موجود ہے، اور دوسرا نمونہ دیکھ لو گدھے کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں، چمڑے کا نام ونشان نہیں ہے ریزہ ریزہ ہوگیا، بوسیدہ ہوگیا، اب اس کی طرف دیکھو یہ جو ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں، ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں، ہم ان کو کس طرح اٹھا کے ان کی بنیاد بناتے ہیں، عمارت بناتے ہیں اور پھر تیرے سامنے اس پر کس طرح گوشت چڑھاتے ہیں، وہ سارا نمونہ گدھے کو زندہ کر کے دکھادیا، تو جس وقت اس شخص نے یہ سارا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اللہ نے بتادیا کہ یہ ہم نے تجھے اس لئے دکھایا ہے تاکہ تجھے بھی اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور تاکہ دوسرے لوگوں کے لئے تو نمونہ بھی بن جائے، دوسروں کے سامنے عقیدہ آخرت کی ایک بہت نمایاں اور واضح دلیل مہیا ہو جائے۔

یہ سارا حال دیکھنے کے بعد وہ شخص پکار اٹھا ''اعلم ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر'' میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، اب یہ مطلب نہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کے اللہ کی قدرت کا یقین آیا، یہ ایسے ہی ہے کہ جب ہمارے سامنے کوئی عجیب سا واقعہ پیش آتا ہے، تو ہم کہتے ہیں ''سبحان اللہ'' اللہ کی عجیب

قدرت ہے، اب قدرت کا عقیدہ تو پہلے بھی ہوتا ہے لیکن اس واقعہ کو دیکھ کر ہم اس عقیدہ کا استحضار کرتے ہیں، یہاں بھی اسی طرح انہوں نے اپنی زبان سے پکارا ''اعلم ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر'' میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

آیت مذکورہ سے عدم سماع موتی پر استدلال اور اس کا جواب:

اور پھر یہ آیت ان لوگوں کا مستدل بھی ہے جو سماع موتی پر گفتگو کرتے ہیں، ایک تفسیر چھپی ہے اس میں اس آیت پر یہ الفاظ ہیں کہ یہ حال ہے موت کا اس شخص کی زبانی جو سو سال موت کو دیکھ کے آیا ہوا ہے، اور لوگ پھر بھی کہتے ہیں کہ مردے سنتے ہیں، گویا کہ اس واقعہ سے استدلال ہو گیا کہ مردے سنتے نہیں ہیں کہ اللہ نے اس سے پوچھا تھا کہ تو کتنے دن ٹھہرا اس کو اتنا ہی نہیں پتہ کہ میں کتنی مدت ٹھہرا، اس کے زندہ ہونے کا کیا سوال، یہ علامت ہے اس بات کی کہ ان کو مرنے کے بعد کچھ پتہ نہیں ہوتا، اس آیت پر چونکہ یہ تذکرہ ہوتا رہتا ہے اس لئے میں نے آپ کو ادھر متوجہ کر دیا۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ گذرے ہوئے وقت کا پتہ نہ چلنا یہ حیات کے خلاف نہیں ہے، ایک آدمی زندہ ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کو گذرے ہوئے وقت کا پتہ نہیں چلتا، اس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے، اصحاب کہف کا قصہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ضربنا علیٰ آذانھم '' ہم نے ان کے کانوں پہ تھپکی دے دی تھی، سو گئے تھے مرے نہیں تھے، اپنی غار کے اندر وہ تین سو سال ٹھہرے اور اس کے اوپر نو کا اضافہ یعنی تین سو نو سال وہ اپنی غار میں ٹھہرے، ''ثم بعثناھم '' پھر ہم نے ان کو اٹھایا، تو یہ تین سو نو سال تک زندہ تھے پھر جس وقت وہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ ''کم لبثتم '' تم کتنا ٹھہرے ہو ''قالوا لبثنا یوما او بعض یوم'' کہنے لگے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، کسی نے کہا اللہ کو پتہ ہے کہ کتنی مدت ٹھہرے ہیں، تو ایک آدمی کو وقت کے گزرنے کا پتہ نہ چلے یہ اس بات کی علامت نہیں کہ وہ زندہ نہیں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ ان کو بالکل پتہ ہی نہیں کہ کیا ہوا کیا نہیں ہوا، اس بارے میں ایک سوال آپ اپنے ذہن کے اندر اٹھائیے کہ احادیث صحیحہ میں آتا ہے جس کا انکار بالاجماع کفر ہے کہ مرنے کے بعد برزخ میں جس وقت انسان منتقل ہو جاتا ہے تو اس کے پاس منکر نکیر آتے ہیں، حساب و کتاب ہوتا ہے، حساب و کتاب کے بعد اگر اچھا آدمی ہو تو اس کے سامنے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے، اور اگر برا آدمی ہو تو اس کے سامنے جہنم کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے، اور یہ عقیدہ قطعی ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، ثواب برزخ اور عذاب برزخ کا انکار کرنا یہ

اہلسنت والجماعت کے نزدیک کفر ہے، عقائد کی کتابوں کے اندر لکھا ہوا ہے تفصیلات میں کچھ اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن جہاں تک عقیدہ کی بات ہے روایات صحیحہ کے تحت وہ عقیدہ قطعی ہے۔

اب ایک آدمی ثواب اور عذاب کا انکار کرتا ہے اور وہ استدلال کرے آپ کے سامنے اس بات سے کہ یہ حال ہے اس شخص کا جو سو سال موت کو دیکھ کے آیا اس نے نہ جنت کی کھڑکی کھلتی ہوئی دیکھی نہ جہنم کی کھڑکی کھلتی ہوئی دیکھی، اس نے نہ ثواب دیکھا نہ عذاب دیکھا، اگر یہ کیفیات اس نے دیکھی ہوتیں تو اس کو پتہ نہ چلتا کہ میں کہاں وقت گزار کے آیا ہوں، یہ آیت تو دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ مرنے والے کو پتہ ہی نہیں کہ کیا ہوا کیا نہیں ہوا، اس لئے وہ سو سال کے بعد بھی اٹھے تو ایسا ہوتا ہے گویا کہ ابھی سویا تھا۔

اگر کوئی اس آیت سے عذاب برزخ اور ثواب برزخ کے انکار کے لئے استدلال کرے اور اسی طرح لفظ بولے کہ یہ حال ہے موت کا اس شخص کی زبانی جو سو سال تک موت کو دیکھ کے آرہا ہے، اس کو پتہ ہی نہیں کہ کیا ہوتا ہے؟ اور نہ فرشتے آئے، نہ جنت کی کھڑکی کھلی، نہ جہنم دیکھی اگر دیکھی ہوتی تو اس کے سامنے کوئی تفصیلات ہوتیں، اور اسے معلوم ہوتا کہ میں کتنا وقت گزار کے آیا ہوں تو پھر ثواب اور عذاب کے انکار کے لئے اس آیت سے استدلال کرتا ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟

تو لازماً ایسی بات کہنی پڑے گی کہ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کا مقصود کیا ہے؟ اور اس قسم کے اجمالی الفاظ کے ساتھ برزخ کے تفصیلی احوال کو مرتب نہیں کیا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ اسلاف میں جہاں بھی سماع موتی پر بحث آئی ہے کہ موتی کے لئے سماع ہے یا نہیں اسلاف میں سے کسی نے اس آیت سے استدلال نہیں کیا، موجودہ دور کے لوگ اس سے استدلال کرنے لگے ہیں، سماع موتی کی بحث کتابوں کے اندر مذکور ہے پرانے زمانے سے لکھی چلی آرہی ہے، شرح کے اندر ان اختلافات کو بیان کیا جاتا ہے، لیکن آج تک کسی شخص نے سماع موتی کے انکار کے لئے اس آیت سے استدلال نہیں کیا، سماع موتی کے اثبات یا انکار کے لئے جن آیتوں سے استدلال کیا جاتا ہے وہ متعین ہیں اور یہ آج کی نئی ریسرچ ہے جو کہتے ہیں کہ عدم سماع پر پچھتر آیتیں دلالت کرتی ہیں، حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر اس وقت تک آپ نقول اٹھا کر دیکھ لیجئے کہ سماع کے بارے میں لوگوں کی آراء مختلف ہیں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ سماع ہے بعض کہتے ہیں کہ نہیں ہے، جو کہتے ہیں کہ سماع ہے شاید ان کے قرآن میں یہ پچھتر آیتیں ہی نہیں تھیں، اور جو کہتے ہیں کہ نہیں ہے ان کے قرآن میں ہوں گی۔

دور کی بات چھوڑیئے فتاویٰ رشیدیہ اٹھا لیجئے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (جو علماء دیوبند کے جد اعلیٰ ہیں) نے لکھا ہے کہ اس کا آج فیصلہ نہیں کیا جاسکتا یہ مسئلہ پہلے سے مختلف فیہ ہے، اس کو مختلف فیہ قرار دینے

کے بعد کہتے ہیں کہ یہ اختلاف عام مردوں کے بارے میں ہے، انبیاء علیہم السلام کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ ان کے لئے سماع ثابت ہے، اب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو انبیاء علیہم السلام کے سماع کو متفق علیہ قرار دیں اور عام لوگوں کے متعلق مختلف فیہ قرار دیں چاہے دلیل کے ساتھ ترجیح کوئی عدم سماع کو دے دے، چاہے دلیل کے ساتھ ترجیح کوئی سماع کو دے دے، ان دونوں باتوں کی گنجائش ہے، مختلف فیہ مسئلہ کے اندر یہی بات ہوا کرتی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ اتفاق ہے اب اس واقعہ کو حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بنایا جائے اور استدلال کیا جائے اس واقعہ سے کہ مرنے والے کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوتا ہے، اور عدم سماع کے لئے اس کو دلیل بنایا جائے تو کیا پھر اس بات کی گنجائش رہتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام سنتے ہیں اگر انبیاء علیہم السلام کے سننے کے مسئلہ کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کے مطابق متفق علیہ مان لیا جائے تو ایک نبی کے واقعہ سے استدلال کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ مردے نہیں سنتے۔

میں یہاں دلائل کے ساتھ اس مسئلہ کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا میں تفصیل وہاں کروں گا جو آگے آئے گی جس پر علماء سماع کے مسئلہ کو ذکر کرتے ہیں، "انك لا تسمع الموتىٰ" یہ آیت ہے جس پر سماع کے مسئلہ کو ذکر کیا جاتا ہے، یہ آیت پرانی تفسیر اور مباحث میں مستدل نہیں ہے سماع اور عدم سماع کے مسئلہ کے بارے میں، یہ آج کل کی نئی تحقیق ہے، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس واقعہ کا سماع کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس قسم کے اجمالی الفاظ کے ساتھ احوال برزخ کی تفصیل مرتب نہیں کی جا سکتی، اگر ان اجمالی الفاظ سے برزخ کی تفصیل آپ مرتب کرنا چاہتے ہیں تو عذاب وثواب کا بھی کوئی قصہ یہاں سے معلوم نہیں ہوتا، جس آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس بات کو ہی یہاں لو اور جس آیت میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں جس پر اس مسئلہ کو اٹھایا جا سکتا ہے تفصیل دلیل کے تحت وہاں کریں گے یہاں دلیل کے ساتھ اس کی تفصیل کرنی مقصود نہیں ہے۔

اب صرف اتنی بات کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ سو سال تک اس شخص کے اوپر موت طاری رکھی نہ اس کو آخرت میں منتقل کرنا مقصود تھا نہ برزخ کے احوال کی طرف منتقل کرنا مقصود تھا، بلکہ اپنی ایک نشانی واضح کرنے کے لئے اس کو دوبارہ دنیا کی طرف لانا تھا، اور اتنی سی کیفیت واضح کی جس کے لئے ظاہری طور پر وہ نشانی بن گئے، باقی مرنے کے بعد آپ پر کیا گزرا کیا نہیں گزرا، یہ چیز یہاں بیان کرنا مقصود نہیں ہے، احوال برزخ کی تفصیل اس آیت سے اخذ نہیں کی جا سکتی۔

یہ اجمالی الفاظ جس مقصد کے لئے یہاں آئے ہیں اسی مقصد پہ رکھیے، برزخ کے احوال کی تفصیل دوسری آیات میں موجود ہے، یہ آیت برزخ کے حالات بیان کرنے کے لئے نہیں، اگر برزخ کے احوال بیان

کرنے کے لئے آئی ہوتی تو پھر چاہیئے تھا کہ کوئی شخص کہہ دے کہ مرنے کے بعد سو سال تک تو کچھ ہوتا نہیں ہے اس کے بعد کا ہمیں پتہ نہیں ہے حالانکہ حدیث صحیح سے معلوم ہوتا ہے کہ دفن کرنے کے بعد لوگ ابھی واپس آ رہے ہوتے ہیں، جوتیوں کی آواز مردے کے کان میں جا رہی ہوتی ہے کہ فرشتے اس کو اٹھا کے بٹھا دیتے ہیں، اور سوال و جواب شروع کر دیتے ہیں اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سو سال تک کچھ نہیں ہوتا، تو یہ قرآن اور حدیث کو بازیچۂ اطفال نہیں بنایا جا سکتا یہ آیت احوال برزخ کو بیان کرنے کے لئے ہے ہی نہیں، اس لئے احوال برزخ کی تفصیل اس سے اخذ نہ کیجئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلاف میں سماع موتی کے مسئلہ میں اس آیت کو بطور استدلال پیش نہیں کیا جاتا یہ مسئلہ اگر آئے گا تو "انک لا تسمع الموتیٰ" کے تحت آئے گا، وہاں ذکر کیا جائے گا کہ ان آیتوں سے سماع موتی ثابت نہیں ہوتا، اور جو سماع کے قائل ہیں وہ ان آیتوں کی کیا تفصیل کرتے ہیں اور جو سماع کے قائل نہیں ہیں وہ ان روایات کی کیا تاویل کرتے ہیں، ان کی تفصیل ان شاء اللہ العزیز وہاں کریں گے، یہ آیت جس مقصد کو بیان کرنے کے لئے اتری ہے وہ واضح ہے باقی احوال برزخ کے لئے یہ آئی ہی نہیں۔

اگر اس طرح الفاظ قرآن پر جم کے بیٹھنا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آئے کوئی ماں کا لال اور بتائے کہ کہاں سے اشارہ ملتا ہے کہ عذاب وثواب کے قصے برزخ میں گزرتے ہیں، تو پھر صرف سماع کی ہی نہیں ہر چیز کی نفی کرنی پڑے گی اور یہ عقیدہ کفر ہے، عقائد کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ سرے سے برزخ کے عذاب وثواب کا انکار کرنا کفر ہے تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن مرنے کے بعد قیامت سے پہلے قبر میں عذاب وثواب کے قصے پیش آتے ہیں یہ چیز قطعی ہے، تو یہ آیت مستدل نہیں ہے نہ حیات انبیاء علیہم السلام کے لئے، اور نہ سماع موتی کے لئے، نہ برزخ کے احوال کے لئے، اس لئے اسلاف نے اس مسئلہ کو ذکر کرتے ہوئے اس آیت سے کبھی بھی استدلال نہیں کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور پرندوں کا زندہ ہونا:

یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرے گا؟ سوال کیفیت کے متعلق ہے باقی اس بات پر یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا اس کی قدرت میں شک نہیں ہے جیسا کہ پچھلی مثال کے اندر آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ ایک بات کے یقین ہونے کے باوجود جب تک اس کا مشاہدہ نہ کر لیا جائے بسا اوقات انسان کے ذہن کے اندر مختلف قسم کے

سوال ابھرتے رہتے ہیں، مشاہدہ کرنے کے بعد حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے، قلب کو سکون و اطمینان نصیب ہو جاتا ہے، تو یقین کے بعد اطمینان کا ایک اور درجہ ہے یقین ہونے کے باوجود کیفیت کا جب تک مشاہدہ نہ کیا گیا ہو اس وقت تک قلب کے اندر تردد رہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو احیاء موتی کی کیفیت پوچھی تو اللہ تعالیٰ کا آگے سوال یہ ہے "اولم تؤمن" کیا تو ایمان نہیں لاتا؟ اب یہ ایمان کس بات پہ نہیں؟ احیاء موتی پر، حضرت ابراہیم کا جواب یہ ہے "بلیٰ" کیوں نہیں ایمان تو ہے لیکن میں سوال اس لئے کرتا ہوں تاکہ مجھے اطمینان قلب حاصل ہو جائے، اب اللہ تعالیٰ کے سوال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب سے یہ شبہ ہی ختم ہو گیا کہ شاید حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال کسی شک کی بناء پر تھا، کوئی غلط کار کہہ سکتا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین نہیں تھا اس لئے سوال کیا لیکن اللہ کے سوال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب نے اس شبہ کی جڑ کاٹ دی۔

اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "نحن احق بالشك من ابراهيم (مشکوۃ ۵۰۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں، اگر ابراہیم علیہ السلام کو اس معاملہ میں شک ہوتا تو ہمیں اس کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا، لیکن جب ہمیں بھی شک نہیں ہے تو ابراہیم علیہ السلام کو شک کیوں ہو سکتا ہے؟ اس لئے یہ سوال اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کے طور پر نہیں تھا، البتہ یقین ہونے کے باوجود کیفیت پوچھی جارہی ہے اور اطمینان قلب کے لئے یہ سوال کیا جارہا ہے، اطمینان یہ "اطمئن" سے ہے سکون پکڑنا، مثلاً ایک چیز آپ نے رسی کے ساتھ لٹکائی ہوئی ہے جو ہلتی ہے تو وہ مطمئن نہیں جس وقت اپنے وزن کے ساتھ بالکل وہ ٹھہر جائے گی تو کہیں گے اب یہ مطمئن ہو گئی، اب اس میں اطمینان پیدا ہو گیا۔

مثلاً دیا جلا کے رکھا ہوا اور ہوا کے ساتھ کبھی وہ ادھر حرکت کرتا ہے اور کبھی ادھر حرکت کرتا ہے تو یہ اس کی غیر مطمئن کیفیت ہے اور جس وقت اس کی روشنی بالکل سیدھی ہو جائے گی اور اس میں حرکت نہیں رہے گی تو اس کو کہتے ہیں "اطمئن السراج" دیا مطمئن ہو گیا یعنی ٹک گیا، اور اس کی روشنی میں اطمینان پیدا ہو گیا، انسان کے قلب کی بھی یہی کیفیت ہے کہ یہ پلٹے کھاتا رہتا ہے اور جس وقت کوئی بات مشاہدہ میں آجاتی ہے تو پھر اس کی حرکت ختم ہو جاتی ہے اور یہ ایک موقف کے اوپر ٹک جاتا ہے اس کو اطمینان قلب کہتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ جب انسان کا تعلق قوی ہو جائے تو دنیا کے معاملات کے بارے میں انسان کا دل ٹک جاتا ہے، اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ دل کا تعلق مضبوط نہ ہو تو پھر فکر کے طور پر کبھی کدھر کو پلٹا کھا گیا

کبھی کدھر کو پلٹا کھا گیا، کسی وقت بھی اپنے ٹھکانے پر آتا نہیں ہے۔" الا بذکر اللہ تطمئن القلوب " کا معنی بھی یہی ہے کہ یہ پھر بے بس ہو کر جھولتا ہے، کبھی اولاد کا فکر، کبھی مال کا فکر، کبھی کاروبار کا فکر، کبھی کسی چیز کا اندیشہ، کبھی کسی چیز کا اندیشہ، ہر وقت یہ پلٹے کھاتا رہتا ہے، لیکن جب اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو جاتا ہے پھر یہ اپنی جگہ ٹک جاتا ہے، پھر کوئی فکر کوئی پریشانی اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی، یہ اطمینان قلب کے اندر آ سکتا ہے تو اللہ کے ذکر کے ساتھ ہی آ سکتا ہے، وہاں بھی یہی اطمینان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا "بلیٰ " کیوں نہیں "ولٰکن لیطمئن قلبی "میں نے یہ سوال اس لئے کیا ہے تا کہ میرے دل میں اطمینان آ جائے، اللہ نے فرمایا " فخذ اربعۃ من الطیر "اب یہ مشاہدہ کروایا جا رہا ہے کہ چار پرندے لے لو تا کہ چاروں طرف سے اس کا مشاہدہ ہو جائے، پرندے کون کون سے لیے تھے قرآن کریم میں اس کا ذکر نہیں ہے، اسرائیلی روایات میں اس کا ذکر ہے کہ ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا، اور ایک کبوتر تھا، یہ چار جانور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لیے تھے پھر فرمایا کہ ان کو اپنے ساتھ مائل کر لو یعنی مانوس کر لو، جب آواز دو تو دوڑے ہوئے آئیں، جیسے بکریوں والوں کی طرف بکریاں مانوس ہو جاتی ہیں، بھیڑوں والوں کی طرف بھیڑیں مانوس ہو جاتی ہیں پہلے ان کو مائل کر لے پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک جزو رکھ دے اس جزو سے مراد یہ ہے کہ ان کو ذبح کر لو، ذبح کرنے کے بعد ان کے اجزاء علیحدہ علیحدہ کر لو، جیسے تفسیر کی روایات میں تفصیل ذکر کی گئی ہے کہ ان سب کا اکٹھا کر کے قیمہ کر لو، ان کے سارے اجزاء آپس میں خلط ملط ہو جائیں، پھر ان کے اجزاء کو اپنے اردگرد پہاڑوں پر بکھیر دو۔

پھر ان کو اپنی طرف بلانا، جب بلاؤ گے تو یہ آپ کی طرف دوڑے ہوئے آئیں گے، تو اس وقت آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے کیونکہ اس میں جو چیز انسان کے لئے تردد کا باعث بنتی ہے وہ یہی چیز ہے کہ بکھرے ہوئے اعضاء کو اللہ تبارک وتعالیٰ جمع کس طرح کریں گے قدرت پر یقین ہونے کے باوجود کیفیت کی جستجو ہو سکتی ہے، لیکن مشرکین مکہ اسی چیز کو انکار کا باعث بناتے تھے کہ جب اجزاء بکھر جائیں گے ہوا اڑا کے لے جائے گی، پانی بہا کے لے جائے گا پرندے کھا جائیں گے، ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی، ذرہ ذرہ بکھر جائے گا تو پھر یہ دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتی ہیں، یہ کیسے کا سوال وہ بطور انکار کے کرتے تھے۔

ان کا مطلب تھا کہ نہیں زندہ ہو سکتا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں جو مشاہدہ کروایا تھا تو وہ بھی یہ تھا کہ

اجزاء بکھر گئے، بکھرنے کے بعد خلط ملط ہو گئے، اس کے بعد جس وقت وہ زندہ ہونے لگے تو مور کے اجزاء اس طرح اکٹھے ہو گئے، مرغ کے اجزاء اس طرح اکٹھے ہو گئے، کبوتر کے بھی اکٹھے ہو گئے، اور کوے کے بھی ہو گئے، تو اب مشاہدے میں یہ بات آگئی کہ بکھرے ہوئے اجزاء اس طرح اکٹھے ہوں گے، یہاں اللہ تعالیٰ نے مشاہدہ کروادیا۔

احیاءِ موتیٰ کی سب سے بیّن دلیل:

ویسے جہاں بھی اس قسم کا سوال قرآن مجید میں اٹھایا گیا ہے وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ آپ کہہ دیجئے کہ ان کو زندہ وہی کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا، یہ جواب بتاتا ہے کہ وہ انکار کرتے تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے انکار کو رد کرنے کے لئے دلیل یہ دی کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

تو پہلی مرتبہ پیدا کرنا یہ دلیل کے طور پر پیش کیا ہے دوبارہ پیدا کرنے کے لئے، اس لفظ پر ذرا غور فرمالیں ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم یہ سمجھنا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کیسے کرے گا اور اس انکار کی وجہ تمہارے قلب کے اندر یہ آتی ہے کہ اجزاء بکھر جائیں تو اکھٹے کیسے ہوں گے، یہ اکٹھے نہیں ہو سکتے، یہ بات تمہاری عقل میں نہیں آتی تو تم اپنی ابتدائی خلقت کے اندر غور کرو تمہیں یہ بات سمجھ آجائے گی، ابتدائی خلقت میں غور کس طرح سے کہ تم بنے کس طرح سے ہو، بنیاد تمہاری کہاں سے چلی ہے۔

نطفہ آیا رحم میں، حیض کے خون کے ساتھ تربیت ہوئی، بچہ بن کے باہر آگیا، غذا کھاتے کھاتے ہم جوان ہو گئے، یہ ہمارا وجود بن گیا، اب اس پہ ذرا غور کیجئے کہ نطفہ کیا چیز ہے، غذا کا خلاصہ ہے، ایک آدمی نے غذا کھائی غذا کے بعد بدن کے اندر یہ نطفہ پیدا ہو گیا، یہ غذا کا خلاصہ ہے، اور وہ غذا جتنی اس نے کھائی تھی اس کے اثرات اس میں آئے ہوئے ہیں، اور وہ غذا کیا کھائی تھی؟ گندم کھائی معلوم نہیں کس کس کھیت سے پیدا ہوئی تھی جو آپ کے منہ میں گئی، سبزیاں آپ نے کھائیں معلوم نہیں کہاں کہاں سے آئیں، گوشت آپ نے کھایا معلوم نہیں کس کس جانور کا آپ نے کھایا، اور جس جانور کا آپ نے گوشت کھایا معلوم نہیں کہاں کہاں سے اس نے چارہ کھایا تھا۔

دودھ آپ نے پیا معلوم نہیں کتنے جانوروں کا پیا، اور جن کا دودھ آپ نے پیا ہے معلوم نہیں کہاں کہاں سے اس نے چرا تھا، ادویات آپ نے استعمال کیں کوئی امریکہ سے آئی، کوئی جرمن سے آئی، تو یہ ذرات آپ کے امریکہ افریقہ اور جرمن میں پتہ نہیں کہاں کہاں بکھرے پڑے تھے جو دوائی کی شکل میں آپ کے بدن کا

حصہ بنے، پانی آپ نے پیا معلوم نہیں کہاں کہاں کا پیا، اور اس کے اجزاء بدن کے اندر آ گئے یہ سب کے سب جمع ہونے کے بعد ایک نطفہ کی شکل میں آیا، اور پھر ماں کا خون جو بچہ کی تربیت کا ذریعہ بنتا ہے وہ بھی تو غذا کا خلاصہ ہے، اور ماں نے کیا کچھ کھایا، کھانے کے بعد آپ کے سارے اجزاء جو بکھرے ہوئے تھے اللہ نے خون کی شکل میں اکٹھے کر کے آپ کے بدن میں پہنچا دیئے، پھر آپ پیدا ہو گئے، جس وقت آپ پیدا ہوئے، تو آپ چھ انچ، نو انچ، یا ایک فٹ لمبے تھے اور اب چھ فٹ لمبے ہو گئے۔

یہ تعمیر آپ کی غذا کے ذریعے سے ہوئی ہے گویا کہ جو غذا آپ کھاتے ہیں وہ آپ کے بدن کو لگتی جا رہی ہے، جو آپ کی تعمیر ہو رہی ہے اور کون ہے جو بتائے کہ اس نے کہاں کہاں سے کھایا اور کیا کیا کھایا؟ اور اس کھانے میں کس کس دھرتی کے اجزاء شامل ہیں؟ کیلا آپ کھاتے ہیں سندھ سے آیا معلوم نہیں کس کھیت سے آیا، سیب آپ کھاتے ہیں کشمیر کی طرف سے آیا معلوم نہیں کس کس طرف سے آیا، پانی آپ پیتے ہیں معلوم نہیں کن دریاؤں اور چشموں کا ہے، ادویات آپ نے کھائیں معلوم نہیں کہاں کہاں سے آئیں، گوشت آپ نے کھایا معلوم نہیں وہ جانور کہاں کہاں چرے تھے، دودھ آپ نے پیا معلوم نہیں کن کن جانوروں کا پیا اور وہ کہاں کہاں سے چر کے آئے تھے، اس وقت بھی ہمارا وجود ساری دنیا کے اندر پھیلے ہوئے ذرات کو اکٹھا کر کے اللہ نے بنایا ہے، یہ نہیں کہ ایک ہی جگہ سے مٹی کی ٹوکری اٹھائی اور اس کو گوندھ کے بت بنا کے کھڑا کر دیا کہ یہ تو سارے اجزاء اکٹھے تھے تو بنانا آسان ہو گیا۔

اور مرنے کے بعد یہ اجزاء بکھر جائیں گے پھر دوبارہ اکٹھے کس طرح ہوں گے؟ اب جو ہمارا وجود بنا ہوا ہے یہ بھی تو متفرق اجزاء کا مجموعہ ہی ہے، یعنی جو کچھ ہم کھاتے ہیں وہ ہمارے بدن کے ساتھ لگتا جا رہا ہے اور وہاں کی چیز آپ کے بدن میں آ گئی مٹھائی کی شکل میں آ گئی، غذا کی شکل میں آ گئی، پھلوں کی شکل میں آ گئی، دودھ کی شکل میں آ گئی، پانی کی شکل میں آ گئی، ادویات کی شکل میں آ گئی، عالم کے اندر آپ کے حصے بکھرے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اکٹھا کر کے آپ کا وجود بنا دیا تو دوبارہ اگر وہ اسی طرح بکھر جائیں گے تو بکھر جانے کے بعد ان کو دوبارہ اکٹھا کرنا کیا مشکل ہے، اس لیے کہا "قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ" ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی دفعہ بنایا تھا، یہ بھی ذرات کو اکٹھا کر کے بنانا ہے اور دوبارہ ذرات کو اکٹھا کر کے بنانا اس کے لئے کیا مشکل ہوگا۔

مشرک یہ سوال کرتے تھے انکار کی بناء پر تو ان کو جواب اس انداز سے دیا گیا ہے، اور کیفیت کے متعلق سوال مؤمن صادق کے دل میں بھی آ سکتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ مشاہدہ کروا دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدہ کروایا گیا، واقعہ پیش آ گیا کہ اللہ نے مری ہوئی چیزوں کے اجزاء اکٹھے کر کے ان کو زندہ کیا، ہمارے سامنے نقل صحیح کے طور پر یہ بات آ گئی اور آخرت میں مردوں کو زندہ کرنے کے لئے ہمارے سامنے بھی دلیل واضح ہو گئی۔

تو یہاں جزء سے ان کے اجزاء بدنی مراد ہیں کہ ان کے جزء علیحدہ پہاڑوں پر ڈال دو پھر ان کو بلاؤ تو وہ تیری طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے، اڑ کر نہیں آئیں گے کیونکہ اڑ کر آئیں تو اشتباہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی اور طرف سے کوئی جانور اڑ کے آ گیا ہو، وہ سامنے بنیں گے اور قدموں پہ چل کے آپ کی طرف آئیں گے اب خوب اچھی طرح مشاہدہ ہو جائے گا کہ یہ وہی ہیں جن کو ذبح کیا تھا، اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اولیاء کی دست گیری کرتا ہے، یہ مثال بھی جو پچھلی آیت میں آیا تھا "یخرجھم من الظلمات الی النور" کی ہو جائے گی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کے راستہ میں اس دانہ کی طرح ہے

اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

جو اگاتا ہے سات بالیاں ہر بالی میں سو دانہ ہے

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ

اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے ﴿۲۶۱﴾ جو لوگ

يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا

خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کے راستہ میں پھر نہیں پیچھے لگاتے اپنے خرچ کرنے کے

مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

احسان جتلانے کو اور نہ تکلیف پہنچانے کو، ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ ان پر کوئی خوف ہے

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ

اور نہ یہ غمزدہ ہوں گے ﴿۲۶۲﴾ اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا بہتر ہے ایسے

صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

صدقہ سے جس کے پیچھے تکلیف پہنچاتا ہو، اللہ تعالیٰ غنی ہے اور تحمل والا ہے ﴿۲۶۳﴾ اے ایمان والو!

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ

اپنے صدقات کو باطل نہ کردیا کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے

مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ

اپنے مال کو لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ایمان لاتا اللہ کے ساتھ اور یوم آخر کے ساتھ پھر اس کی مثال

كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ

اس چٹان جیسی ہے کہ اس کے اوپر مٹی ہو پھر پہنچے اس کو زوردار بارش، پھر چھوڑ دے وہ بارش اس پتھر کو چٹیل

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

نہیں قادر ہوں گے وہ لوگ کسی شیٔ پر اس چیز میں سے جو انہوں نے کیا ، اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ

کافر لوگوں کو ﴿۲۶۴﴾ اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے

وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ

اور اپنے دلوں کو مضبوط کرنے کے لیے ان کی مثال ایک باغ کی طرح ہے جو اونچی جگہ میں ہو اس کو موٹے موٹے قطروں والی بارش پہنچ جائے

فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا

پھر دے وہ اپنا پھل دوگنا، اور اگر اس کو موٹے قطروں والی بارش نہ پہنچے تو اس کے لئے شبنم ہی کافی ہو جاتی ہے، اللہ اس چیز کو

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ

دیکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۲۶۵﴾ کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کے لئے باغ ہو

نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ

کھجوروں کا اور انگوروں کا جس کے نیچے نہریں جاری ہوں اس شخص کے لئے اس باغ میں

كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ

ہر قسم کے میوے ہوں اور اس کو بڑھاپا پہنچ جائے اور اس کے لئے کمزور چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، پھر پہنچ جائے اس باغ کو

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

بگولہ اس میں آگ کا اثر ہو پھر وہ باغ جل جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لئے آیات کو

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

تا کہ تم غور کرو ﴿۲۶۶﴾

خرچ کرنے سے مال کے بڑھنے کی حسی مثال:

ترجمہ کے ساتھ ہی آپ سمجھ گئے کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ انفاق فی سبیل اللہ کے آداب بیان فرمارہے ہیں تا کہ وہ انفاق انسان کے لئے دنیا وآخرت میں نافع ہو اور اس انفاق کو اس قسم کی کوتاہیوں سے بچالیا جائے جن کوتاہیوں کا ارتکاب کرنے کے بعد انفاق ضائع ہو جاتا ہے، دنیا وآخرت میں اس کی برکات انسان کو نصیب نہیں ہوتیں اور جو حکمتیں شریعت کو مطلوب ہیں وہ حکمتیں بھی اس کے اوپر مرتب نہیں ہوتیں اگر ان آداب کو چھوڑ دیا جائے اور ان شرائط کی رعایت نہ رکھی جائے، پہلی آیت تو ترغیب دے رہی ہے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی، اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے ہر وہ خرچ کرنا مراد ہے کہ جو انسان اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرتا ہے چاہے جہاد میں خرچ کرے، چاہے قومی ضرورتوں میں خرچ کرے، خدمت خلق میں خرچ کرے، اہل حقوق کے حقوق ادا کرے، یہ بھی انفاق فی سبیل اللہ ہے اس لئے انسان اگر اپنی اولاد پر صحیح طریقہ سے خرچ کرتا ہے تو حدیث شریف میں آتا ہے اس میں بھی صدقہ کا ثواب ہے (مشکوۃ ص ۱۷۰)

حتیٰ کہ اگر جائز طریقہ سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں خرچ کرتا ہے تو اس میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ صدقہ کا ثواب دیتے ہیں، اہل حقوق کے حقوق ادا کرنا، ذی قرابت کے حقوق ادا کرنا، مساکین اور یتیموں کے حقوق ادا کرنا، خدمت خلق کے طور پر خرچ کرنا، جہاد میں خرچ کرنا، دین کی نشر واشاعت میں خرچ کرنا، یہ سارے اخراجات فی سبیل اللہ ہیں اس میں سے بعض افراد پر خرچ کرنا فرض ہے اور بعض افراد پر خرچ کرنا مستحب ہے، مختلف درجات کے طور پر ان کے احکام آپ کے سامنے آتے رہیں گے، ایک مقدار ایسی ہے جو فرض ہے جس کو عام طور پر قرآن کریم میں ایتاء زکوۃ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اور باقی صدقات میں درجہ بدرجہ کسی میں تاکید زیادہ ہے اور کسی میں کم ہے، یہ انفاق فی سبیل اللہ سب کو شامل ہے، ان کی مثال یہ دی گئی کہ جو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں ان کا خرچ کیا ہوا مال اللہ کے نزدیک اس طرح بڑھتا ہے جس طرح تم حسی طور پر دیکھتے ہو کہ ایک کاشتکار ایک بیج ڈالتا ہے اور جب وہ پھوٹتا ہے تو اس میں سے سات شاخیں نکلتی ہیں، اور ہر شاخ کو ایک سٹہ لگتا ہے اور ایک سٹے میں سو دانہ ہوتا ہے، تو بویا ایک دانہ تھا اور نتیجۃً سات سو دانہ حاصل ہو گیا، بالکل اسی طرح جب تم اللہ کے نام پر کوئی چیز دیتے ہو بشرطیکہ پاک مال میں سے ہو، صحیح جگہ خرچ کرو، نیک جذبات کے تحت خرچ کرو، خرچ کرنے کے بعد اس کو محفوظ رکھو، احسان جتلا کے، تکلیف پہنچا کے اس کو ضائع نہ کرو ایسے وقت خرچ کرنے میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ سات سو گنا اس کو کر دیتے ہیں، اور پھر سات سو پر بھی بند نہیں اس سے بھی زیادہ بڑھاتے رہتے ہیں، جتنا اخلاص زیادہ ہوگا، جتنا برموقع خرچ کیا جائے گا اتنا ہی اللہ تبارک وتعالیٰ ثواب میں اضافہ فرماتے ہیں۔

جیسے آپ کے سامنے مثال عرض کی تھی کہ حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک کھجور اگر کوئی شخص اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی پرورش کرتے ہیں بڑھاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ احد پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے (مشکوۃ ص ۱۶۷) اب احد کے برابر ہو جانے کے بعد وزن کرو تو کیا صرف سات سو کھجور آئے گی، یا کھجور کے برابر اس کے ٹکڑے کیے جائیں گے تو کیا صرف سات سو ٹکڑے ہوں گے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سات سو پر بھی پابندی نہیں ہے، جتنا اخلاص بڑھتا جائے گا اتنا ثواب زیادہ ہوتا چلا جائے گا یہ تو ترغیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دیا ہوا مال اس طرح بڑھتا ہے کہ دیتے کم ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں جا کے اتنا زیادہ ہو جاتا ہے، ان لوگوں کے نفقات کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح ہے جو سات بالیاں اگائے اور ہر بالی کے اندر سو دانہ ہو اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے علم والا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے آداب:

اب آگے اس خرچ کرنے کے بعد اس کو باقی رکھنے کے آداب ہیں کہ تمہارے لئے اس کا ثواب باقی کیسے رہے گا؟ اس کا حاصل یہ ہے کہ جب تم اللہ کے نام پر دو چاہے حلال مال میں سے دیا ہے اور چاہے بالکل مستحق کو دیا ہے لیکن اگر اس دینے کے بعد تم نے احسان جتلانا شروع کر دیا یا تکلیف پہنچانا شروع کر دی تو تمہارا دیا ہوا باطل ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا، احسان جتلانا، تکلیف پہنچانا، دونوں کا مطلب ایک ہی ہے احسان جتلانا یہ بھی ایک تکلیف پہنچانا ہی ہے یعنی بسا اوقات ایک شخص اپنا مال کسی محتاج کو دیتا ہے تو اس کو احساس برتری حاصل ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اعلیٰ اور دوسرے کو ادنیٰ سمجھنے لگ جاتا ہے۔

پھر اگر دل میں تنگی ہو وسعت نہیں ہے حلم اور بردباری حاصل نہیں ہے، تو پھر وہ اس شخص سے امیدیں لگا لیتا ہے کہ جب میں نے اس کو یہ دیا ہے تو اب یہ میرا بندہ بن کے رہے، میرا غلام بن کے رہے، میرا خدمت گار بن کے رہے، میرے سامنے یہ آنکھ نہ اٹھائے اور اگر اس کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی ہے جو اس کی توقع کے خلاف ہے تو جتاتا ہے ذلیل کرتا ہے، اس سے خدمت طلب کرتا ہے ان سب چیزوں کے ساتھ انسان کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اپنے صدقات سے فائدہ تبھی اٹھا سکو گے کہ جس کو دیا ہے، نہ اس کی تحقیر کرو اور نہ اس سے خدمت لے کے اس کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ اس کو طعن و تشنیع کر کے اس کو تکلیف پہنچاؤ، اگر تم اس کو تکلیف پہنچاؤ گے یا طعن و تشنیع کرو گے یا احسان جتلاؤ گے تو تم نے جو کچھ دیا ہے انہی اغراض فاسدہ کی وجہ سے تمہارا یہ ثواب ضائع ہو جائے گا۔

تو اس میں کتنی حکمت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو محتاج بنایا ہے بعض کو مال دیا ہے دونوں کو آزمایا ہے، مقصد شریعت کا یہ ہے کہ دونوں آپس میں جڑ کے رہیں اور جڑ تب ہی سکتے ہیں کہ وسعت والا محتاج کی امداد کرے، اور پھر اس سے کوئی کسی قسم کی غرض اور مطلب نہ رکھے، بلکہ اس کے دل کے اندر جذبات یہ ہوں ''انما نطعمکم لوجه الله لانرید منکم جزاءً ولا شکورا'' ہم نے تو تمہیں اللہ کے لئے یہ کھانا کھلایا ہے باقی ہم تمہاری طرف سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ کوئی شکر گزاری چاہتے ہیں، وہ لے کے انسان اپنے آپ کو فارغ کر لے اس کا نتیجہ پھر یہ ہوگا کہ محتاجوں کو مال داروں کے ساتھ محبت رہے گی، اور آپس میں معاشرہ جڑا رہے گا، کیونکہ معاشرے کے جڑنے کے اندر بنیادی چیز احتیاج ہے کہ جب ایک دوسرے کی طرف احتیاج ہوتا ہے تب آپس میں ربط پیدا ہوتا ہے، اور اگر احسان جتلانا شروع کر دیں گے تو بسا اوقات ایک شریف آدمی ضرورت کی بناء پر دوسرے سے ایک چیز لے لیتا ہے لیکن جب دوسرے کی طرف سے احسان جتلایا جاتا ہے تو پھر تکلیف ہوتی ہے، اور اس سے وہ حکمت باطل ہوگئی، تو یہ ادب سکھایا کہ دینے کے بعد احسان نہ جتلایا کرو تکلیف نہ پہنچایا کرو، ورنہ اس کے ساتھ تمہارے صدقہ کا ثواب باطل ہو جائے گا۔

نرم بات کہہ کر ٹال دینا دے کر تکلیف پہنچانے سے بہتر ہے:

''قول معروف خیر'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایک سائل تمہارے سامنے آجاتا ہے اور اپنی ضرورت پیش کرتا ہے تمہارے پاس گنجائش نہیں ہے تو نرم بات کہہ کے اس کو ٹال دو اور اگر سائل کی طرف سے کوئی بدتمیزی ہو اصرار ہو، وہ اپنی حاجت کی بناء پر تمہارے ساتھ لپٹتا ہے اصرار کرتا ہے تو اس سے درگزر کرو، اس کے اوپر سختی نہ کرو، یہ کیفیت اختیار کر لینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے دینے کے بعد پھر احسان جتلایا جائے، نہ دینے کا ارادہ ہو تو عذر کر دو، نرم الفاظ کے ساتھ اس سائل کو ٹال دو، لیکن دے کر احسان جتلانا یا اس کو ذلیل کرنا یہ درست نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپنانے کی کوشش کرو:

''والله غنی حلیم'' اللہ تعالیٰ غنی ہے بردبار ہے یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں اللہ غنی ہے اور غنی ہونے کے ساتھ ساتھ بردبار ہے، اور ''تخلقوا باخلاق الله'' کے تحت اس وقت چونکہ خطاب کیا جا رہا ہے اغنیاء کو انہیں کہا جا رہا ہے کہ تمہیں بھی اللہ کا اخلاق حاصل کرنا چاہیئے اگر ظاہری طور پر تمہیں غناء حاصل ہوگیا ہے تو ساتھ ساتھ صفت حلم کو بھی اپناؤ، اللہ تعالیٰ کو دیکھو کہ کتنے خزانوں کا مالک ہے اور کتنا محتاجوں کو کھلاتا پلاتا ہے

اور محتاج آگے سے کیسی کیسی گستاخیاں کرتے ہیں کھا پی کر کس طرح نافرمانیاں کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سب کچھ برداشت کر جاتا ہے اسی طرح اگر تمہیں بھی غناء حاصل ہے، اور اس غناء کی بناء پر تم کسی حاجت مند کی مدد کر بیٹھو تو پھر وہ حاجت مند تمہارے ساتھ سخت رویہ سے پیش آتا ہے یا ترش روئی سے پیش آتا ہے تو بردباری کا مظاہرہ کیا کرو۔

یہ دو صفتیں ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی طرف متوجہ کیا ہے اور بندوں کو چاہیئے کہ اللہ کے اس اخلاق کو اپنائیں اور وہ بھی یہی صفتیں حاصل کریں، غناء کے ساتھ بردباری کا حاصل ہو جانا بہت بڑی بات ہے، عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ مال دار نازک مزاج ہو جاتے ہیں، ان کے مزاج کے خلاف تھوڑی سی بات پیش آ جائے تو بہت جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں، اور پھر محتاجوں کے ساتھ بہت بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں، یہ اچھی بات نہیں ہے اگر اللہ نے مال دیا ہے تو حوصلہ بھی بڑا ہونا چاہیئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ غنی بھی ہے اور ساتھ ساتھ بردبار بھی ہے۔

ریا کاری کے نقصان کی حسی مثال:

آگے ایک مثال کے ساتھ اسی مضمون کو پختہ کیا جا رہا ہے ریا کاری کے طور پر اگر خرچ کرو گے تو پھر تمہارے صدقات کا کوئی ثواب نہیں ملے گا، جس طرح من واذی کے ساتھ صدقہ باطل ہو جاتا ہے اسی طرح ریا کاری کے ساتھ بھی صدقہ باطل ہو جاتا ہے، اس کی مثال یوں دی کہ جیسے پہاڑی علاقوں میں ایک پتھر ہے اور اس کے اوپر مٹی جمع ہو گئی اور ایک آدمی نے سمجھ لیا کہ اگر اس کے اوپر بیج بو دیا جائے گا تو فصل حاصل ہو جائے گی، نیچے پتھر ہے عارضی طور پر اس کے اوپر مٹی چڑھ گئی اور اس کے اندر بیج ڈال دیا۔

لیکن بارش آتی ہے اور ساری مٹی کو بہا کر لے جاتی ہے اور وہ چٹان بالکل صاف ستھری ہو کر باہر نکل آتی ہے تو جیسے اس مثال میں اس کاشتکار کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، ایسے ہی جو ریا کاری کے طور پر خرچ کرتے ہیں اللہ پر ان کا صحیح ایمان نہیں ہے یہ دیکھو ریا کاری کے ساتھ اللہ پر ایمان نہ ہونے کا تذکرہ آ گیا جس میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ریا کاری وہ کرے جس کا اللہ پر ایمان نہیں، جس کا اللہ پر ایمان ہے اور اس نے آخرت میں ثواب لینا ہے اس کو ریا کاری کی کیا ضرورت ہے؟ گویا کہ ریا کاری ان لوگوں کے ساتھ جوڑ کھاتی ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے مؤمن کے لئے ریا کاری مناسب نہیں، کیونکہ مؤمن کا تو اللہ پہ ایمان ہے اس نے تو آخرت میں ثواب لینا ہے تو اس کو ریا کاری اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کیا کرو احسان جتلا کے، تکلیف پہنچا کے، مثل باطل کرنے

اس شخص کے جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے اور نہیں ایمان لاتا اللہ اور یوم آخرت پر مثال اس کی ایسے ہے جیسا کہ ایک چٹان ہو اس کے اوپر مٹی ہو پھر اس کو موٹے موٹے قطروں والی بارش پہنچ جائے پھر اس چٹان کو وہ صاف ستھرا چھوڑ دے، جیسے یہاں سب کچھ بے کار گیا کوئی نباتات حاصل نہیں ہوگی اسی طرح ریاکاری، من واذیٰ وقت پہ بوئی ہوئی فصل کو تباہ کر دیتے ہیں، صدقات ان کی رو میں بہہ جاتے ہیں، اور پھر ان پر کوئی ثواب مرتب نہیں ہوتا۔

"لایقدرون علیٰ شیء" ایسے لوگ جو صدقہ کر کے من واذیٰ کرتے ہیں یا صدقہ ریاکاری کے طور پر کرتے ہیں یا ان میں صحیح ایمان نہیں ہوتا یہ اپنی کمائی میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہوں گے جیسے وہ کاشتکار اپنی کمائی میں سے کسی چیز پر قادر نہیں جس نے بے عقلی کے ساتھ ایسے پتھر پہ بیج بویا۔

"واللہ لایھدی القوم الکافرین" اللہ تعالیٰ کافروں کو ان کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا اور مقصد نیکی سے آخرت میں اجر و جزا پانا ہوتا ہے کافر لوگ اس سے محروم رہیں گے "لایھدی" سے یہاں ہدایت الی الجنۃ مراد ہے، کیونکہ یہ انسان کا دنیا کی محنت و مشقت سے آخری مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کافروں کو جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا کمال تک نہیں پہنچائے گا۔

خلوص سے خرچ کیے ہوئے مال کی مثال:

"ومثل الذین ینفقون اموالھم" اب ان کے مقابلہ میں دوسری مثال آئی کہ جو لوگ اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اور اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ اپنے نفسوں میں پختگی پیدا کریں جیسا کہ ایک اونچی ہموار جگہ ہے اور اس کے اوپر باغ ہے، اونچی ہموار جگہ میں آب و ہوا صاف ستھری ہوتی ہے، اور بارش نہ بھی ہو تو ہلکی سی پھنوار بھی کافی ہو جاتی ہے اور باغ اپنا پھل دے دیتا ہے۔ اس طرح اگر دل میں خلوص ہے اللہ کی رضا طلب کرنا مقصود ہے تو بہت خرچ کرو گے تو ثواب زیادہ لے لو گے اور اگر تھوڑا خرچ کرو گے تو وہ بھی ضائع نہیں جائے گا اس کی مثال اس طرح دے دی کہ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے اور اپنے دلوں میں پختگی پیدا کرنے کے لئے ان کی مثال ایسے ہے جیسے باغ ہو اونچی جگہ میں پہنچے اس کو موٹے قطروں والی بارش پھر دے وہ باغ اپنا پھل دوگنا اور اگر اس کو موٹے قطروں والی بارش نہ پہنچے تو اس کے لئے پھنوار ہی کافی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

بغیر خلوص سے خرچ کیے ہوئے کی مثال:

"ایود احدکم" یہاں سے ایک اور مثال کے ساتھ ترغیب دے دی کہ جو خرچ کیا کرو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا کرو اگر اللہ کی رضا کے لئے خرچ نہیں کرو گے تو تمہاری یہ محنت بے کار جائے گی، اس کو ایک مثال سے سمجھایا کہ فرض کرو کہ ایک شخص نے محنت کر کے اپنی جوانی کے زمانہ میں باغ لگایا باغ بھی بہت عمدہ جس کا اچھے سے اچھا نمونہ یہ ہو سکتا ہے کہ اردگرد کھجوروں کی قطاریں اندر انگور اور پھر مختلف قسم کے درخت اور ہر قسم کا دانہ، پھل فروٹ اس کو حاصل ہوتا ہے، اور اردگرد کھجوروں کی باڑ حفاظت کے لئے ہے، پھر پانی اس میں وافر مقدار میں ہے، نہریں بہہ رہی ہیں، اور پھل خوب لگتا ہے جوانی میں اس نے محنت کی اور اس کو کمال تک پہنچا دیا۔

اب یہ شخص بوڑھا ہو گیا بوڑھا ہونے کا ذکر اس لئے کر دیا کہ پھر محنت کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی، پھر اس کی اولاد بھی چھوٹی چھوٹی ہے اب دیکھو کہ خود بوڑھا ہو گیا اور بچے چھوٹے چھوٹے ہیں اور ایسا ہوا کہ ایک بگولہ آیا جس میں انتہائی گرم ہوا تھی اور اس نے سارے باغ کو جلا کے رکھ دیا، اب آپ اندازہ کیجئے کہ ایسے وقت میں انسان کو کتنی حسرت ہوتی ہے نہ تو دوبارہ باغ لگانے کی ہمت کہ خود ضعیف اور بوڑھا ہو گیا ہے، اور اولاد بھی ابھی چھوٹی ہے جو معاون بھی نہیں بن سکتی، بلکہ الٹا ان کا بوجھ ہے، اور پھر اس پر اہل وعیال کے خرچے کا بوجھ بھی ہے تو اس وقت انسان کو انتہائی پریشانی ہوتی ہے۔

کیا تم ایسا بننا چاہتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے اوپر یہ مثال فٹ آجائے، جس وقت یہ سوال ہو گا تو جواب واضح ہے کہ ہم تو یہ نہیں چاہتے، اگر ایسا نہیں چاہتے تو پھر ہر کام کے اندر خلوص پیدا کرو ورنہ تم زندگی بھر نیکیاں کرتے رہو گے اگر اس میں خلوص نہیں ہے تو مرنے کے بعد جو کہ اصل فائدہ اٹھانے کا وقت ہے تو آپ کو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ کا لگایا باغ اجڑ گیا، اور پھر اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی، جیسے اس بوڑھے کو دنیا کے اندر ایسے موقع پر باغ اجڑ جانے سے حسرت ہوگی تو مرنے کے بعد جو اصل فائدہ اٹھانے کا وقت ہو گا اس وقت جب تم دیکھو گے کہ ہماری ساری نیکیاں ریاکاری کی وجہ سے ضائع ہو گئیں یا جذبات کے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گئیں، اور پھر وہ موقع ایسا ہو گا جس میں تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی پھر یہ حسرت وافسوس ہو گا۔

اگر تم اس بوڑھے جیسا نہیں بننا چاہتے تو اپنی زندگی کی نیکیوں کو ضائع نہ کرو اور ان کے اندر خلوص اور صحیح جذبات پیدا کرو تا کہ وقت پر اس سے فائدہ اٹھاؤ، اس مثال کے ساتھ اس چیز کی وضاحت کی گئی ہے کہ ریاکاری اور غلط جذبات سے اپنے آپ کو بچاؤ ورنہ پھر فائدہ اٹھانے کے وقت حسرت وافسوس کے سوا کچھ کام نہیں آئے گا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ

اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے عمدہ اشیاء میں سے خرچ کرو اور اس چیز میں سے جو

اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ

نکالا ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے، نہ قصد کرو ان میں سے ردی چیز کا

تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ

کہ خرچ کرتے ہو تم اس کو اور نہیں ہو تم لینے والے اس چیز کو مگر یہ کہ تم اس میں چشم پوشی کر جاؤ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ

اور یقین کر لو بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے ﴿۲۶۷﴾ شیطان ڈراتا ہے تمہیں

الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ

محتاجی سے اور حکم دیتا ہے تمہیں بے حیائی کا اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے بخشش کا

وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ ۖ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ

اور زیادہ دینے کا اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں علم والے ہیں ﴿۲۶۸﴾ دیتا ہے حکمت جس کو چاہتا ہے

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ

جو دین کی سمجھ دے دیا گیا پس تحقیق وہ بہت زیادہ بھلائی دے دیا گیا اور نہیں نصیحت حاصل کرتے مگر

اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ

عقل والے ﴿۲۶۹﴾ جو نفقہ تم خرچ کرو اور جو تم مانو

نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ

نذر پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾ اگر

تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ

تم صدقات کو ظاہر کرو تو یہ بھی اچھی بات ہے اور اگر تم ان صدقات کو چھپاؤ اور ان کو فقراء تک پہنچا دو

فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور دور ہٹائے گا اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے گناہ اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی

خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ

خبر رکھنے والا ہے ﴿۲۷۱﴾ ان کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ،

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ

اور جو کچھ مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے نفع کے لئے ہے اور نہیں خرچ کرتے تم مگر حاصل کرنے کیلئے

وَجْهِ اللّٰهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

اللہ کی رضا ، اور جو مال بھی تم خرچ کرو تمہاری طرف پورا کر دیا جائے گا اور تم ظلم نہیں کیے جاؤ گے ﴿۲۷۲﴾

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

صدقات ان فقراء کے لئے ہیں جو اللہ کے راستہ میں مشغول کیے ہوئے ہیں نہیں طاقت رکھتے وہ

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

زمین میں چلنے پھرنے کی ، ناواقف آدمی ان کو مال دار سمجھتا ہے سوال سے بچنے کی وجہ سے ،

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا

تو ان کو پہچانتا ہے ان کی علامت سے ، وہ نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر ، اور جو تم خرچ کرو گے

مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

مال پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو

بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

رات میں اور دن میں پوشیدہ طور پر اور کھلے طور پر پس ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس ،

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

نہ ان کے اوپر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۲۷۴﴾

زکوۃ اور عشر کی ادائیگی کا حکم:

انفاق فی سبیل اللہ کے احکام چلے آرہے ہیں اس کے آداب ذکر کیے جا رہے ہیں، اور اللہ کے نزدیک اس کے مقبول ہونے کی شرطوں کا ذکر تھا، اور ثواب کے باقی رہنے کے لیے کن چیزوں کی رعایت رکھنا ضروری ہے اس کا ذکر تھا، یہ رکوع بھی اسی کے احکام وآداب پر مشتمل ہے، پہلی آیت کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ جو کچھ تم کماتے ہو، اس سے اموال تجارت مراد ہیں "مااخرجنا لکم" یہ زمین کی پیداوار ہے ان دونوں میں سے ہی اللہ کے راستہ میں عمدہ چیز خرچ کرو، مال تجارت میں سے جو کچھ دیا جاتا ہے اس کو زکوۃ کہتے ہیں جو فرض کے درجہ میں ہے، اور مقدار زکوۃ سے جو زائد دیا جائے وہ نفلی صدقات ہیں اور یہ بات پہلے عرض کر دی گئی تھی کہ انفاق فی سبیل اللہ فرض کو بھی شامل ہے اور نفلی صدقات کو بھی، تو "ماکسبتم" میں سے جو فرض مقدار ادا کی جائے گی اس کو زکوۃ کہتے ہیں، اور جو نفلی طور پر خرچ کیا جائے اس کو عام طور پر خیرات اور صدقات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور "مااخرجنا لکم من الارض" کے دو درجے ہیں، ایک ہے کہ زمین خراجی ہو تو اس میں خراج آتا ہے لیکن یہاں عشر مراد ہے، مفسرین کی صراحت کے مطابق کہ مسلمان کی زمینوں پر فصل کے اعتبار سے عشر آتا ہے کیونکہ عشر کے اندر عبادت کا معنی ہے اور "مااخرجنا" کا لفظ عام آ گیا تو حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کے مطابق عشر چونکہ ہر چیز میں ہوتا ہے اس کیلئے کوئی نصاب شرط نہیں اور ثمرہ باقیہ ہونا شرط نہیں ہے تو قرآن کریم کے اس ظاہری لفظ سے حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہم نے تمہارے لیے نکالا اس میں سے عمدہ چیزوں کو خرچ کیا کرو، یہ دو لفظ بول کے زکوۃ اور عشر دونوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔

جو چیز تمہیں پسند نہیں وہ دوسروں کو بھی نہ دیا کرو:

"ولا تیمموا الخبیث منہ" اس میں ردی کا قصد نہ کر لیا کرو جو گھر میں استعمال کرنے کے قابل نہیں، نکمی فضول اس کو اللہ کے راستہ میں نہ دیا کرو، ردی ہونے کا معیار کیا ہے؟ اس کا معیار بتا دیا کہ تمہارا حق کسی شخص کے ذمہ لگا ہوا ہے وہ تمہارے حق کے طور پر وہ چیز تمہیں دینا چاہے اور تم اس کو دیکھ کے ناک چڑھاتے ہو وہ چیز لینے کو تمہارا دل نہیں کرتا اور تم سمجھتے ہو کہ یہ ہمارے حق کی ادائیگی نہیں ہے لیکن ظاہری طور پر بسا اوقات دوسرے کا خیال کرتے ہوئے، لحاظ کرتے ہوئے شرما شرمی لے لیتے ہو انکار بھی نہیں کرتے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اگر تمہارے حق واجبی کے طور پر نہیں بلکہ ہدیہ کے طور پر تمہیں کوئی آدمی کوئی چیز دیتا ہے اور وہ چیز ردی ہے کہ لینے کو تمہارا دل نہیں کرتا، چاہے بعد میں شرما شرمی تم لے ہی لو جس چیز کو دیکھ کے تمہارے دل کے اندر

انقباض پیدا ہوتا ہے کہ تم اس کو اپنے حق میں وصول نہیں کرنا چاہتے یہ سمجھ لیا کرو کہ یہ ردی کا مصداق ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خیرات نہ کیا کرو بلکہ عمدہ چیز جس کو تم خوشی کے ساتھ لیتے ہو ایسی عمدہ چیزیں اللہ کے راستہ میں دیا کرو، یہ معیار بتادیا کہ ردی ایسی چیز ہے کہ جس کو تم لینے کے لئے تیار نہیں اور تم اس کو لے کر خوش نہیں ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اچھی سے اچھی چیز دو جو تمہارے لئے خوشی کا باعث ہے۔

لیکن یہ حکم اس کو ہوگا جس کے پاس عمدہ چیز بھی موجود ہو"ما کسبتم "میں عمدہ بھی ہیں اور ردی بھی ہیں "ما اخرجنا" میں عمدہ بھی ہیں اور ردی بھی ہیں، اس میں سے خبیث کا قصد کر لینا یہ ٹھیک نہیں، لیکن اتفاق سے اگر کسی شخص کے پاس ہے ہی ردی مال خربوزے پیدا ہوئے لیکن وہ میٹھے نہیں سارے ہی پھیکے ہیں یا سارے ہی ایسے ہیں کہ جن کا ایک پہلو مرا ہوا ہے اور اس طرح جو چیز بھی ہے وہ گھٹیا قسم کی ہے تو پھر جو پیدا ہوئی ہے وہی دے دو پھر تم اس کے مکلف نہیں ہو کہ اس ردی کی جگہ اعلیٰ سے اعلیٰ چیز دو، اگر سارا مال ہی ردی ہے تو پھر اس میں سے دینے کا کوئی حرج نہیں ہے،"الا ان تغمضوا" کا مفہوم یہ ہے۔

"واعلموا ان اللہ غنی حمید" یقین کر لو کہ اللہ غنی ہے حمید ہے، اس کو تمہاری چیزوں کی ضرورت نہیں، وہ بے نیاز ہے (نعوذ باللہ) وہ محتاج ہونے کے طور پر تم سے نہیں لیتا کہ تم ردی بھی دے دو گے تو وہ خوش ہو جائے گا، وہ تو بے نیاز ہے وہ اپنا دیا ہوا مال تم سے خرچ کراتا ہے یہ دیکھنے کے لئے کہ تم اللہ کے نام پر اسی کے دیے ہوئے مال میں سے کتنا خرچ کر سکتے ہو اور کیسا خرچ کر سکتے ہو، یہ تمہاری آزمائش ہے، حمید ہے یہ حمید حمد سے لیا گیا ہے قابل تعریف ہے۔

شیطان کے وسوسے اور رحمٰن کے وعدے:

"الشیطان یعدکم الفقر" یہ بھی انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب ہے اور انسان کے دلی جذبات کے تحت شیطان کی طرف سے جو رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اس کی نشاندہی کی جارہی ہے، بسا اوقات کوئی موقع ایسا آجاتا ہے کہ اس وقت خرچ کرنے کی ضرورت ہے پھر دل کے اندر خیالات آنے شروع ہو جاتے ہیں کہ آج اگر ہم نے اس کو دے دیا تو کل کو ہمیں بھی ضرورت پڑ سکتی ہے، پھر ہم کیا کریں گے اس لئے مستقبل کے واسطے اس مال کو محفوظ رکھ لو اس کو خرچ نہ کرو ورنہ پھر ہم محتاج ہو جائیں گے تو پھر تکلیف ہوگی، اس قسم کے خیالات آنے لگ جاتے ہیں، تو قرآن کریم یہ نشاندہی کرتا ہے کہ جب اس قسم کے خیالات آئیں اور مستقبل کے اندر فقر کا اندیشہ پیدا ہو جائے اور اس کی وجہ سے انفاق میں رکاوٹ پیدا ہو تو سمجھ لیا کرو کہ یہ وسوسہ تمہارے دل میں شیطان ڈال رہا ہے۔

شیطان اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے دو طرح سے روکتا ہے ایک تو مستقبل میں فقر اور احتیاج سے ڈرا کر اور ایک تمہیں فحشاء کے اندر مبتلا کر کے، بے حیائیوں میں ڈالنا انفاق سے مانع اس طرح بنتا ہے کہ ایک شخص جس وقت عیاشی میں مبتلا ہو گیا، مے نوشی کرتا ہے، زنا کاری کرتا ہے، سینما بینی کرتا ہے، فضول خرچی کی عادت ہے، تو اس کی آمدنی اتنی نہیں ہوگی جو فضول کاموں کے لئے اس کو کافی ہو جائے، تو جب اس کی آمدنی ہوگی نہیں جو فضول کاموں میں خرچ کرنے کے بعد فاضل ہو تو ان بے حیائی کے کاموں میں اس کی ساری آمدنی چلی جائے گی، اللہ کے راستہ میں خرچ ہی نہیں کرے گا یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار، عیاشی میں تو ہزاروں روپے قربان کر دیتے ہیں لیکن اگر ان کے سامنے کوئی گداگر آ جائے تو ان کے پاس پانچ روپے دینے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی، ان فضول کاموں میں خرچ کرنے کی وجہ سے ان میں ہمت نہیں ہوتی کہ وہ نیکی کے کاموں میں خرچ کریں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تو اپنے خرچے پورے نہیں ہوتے ہم آگے کسی کو کیا دیں۔

تو یہ دونوں طریقے شیطان کے اللہ کے راستہ سے روکنے کے ہیں کہ پہلے تو ڈراتا ہے کہ مستقبل میں محتاج ہو گئے تو پھر کیا کرو گے اس لئے جمع کر کے رکھو اور پھر فضول کاموں میں تمہیں مبتلا کر دیتا ہے جب بے حیائی کے کاموں میں مبتلا ہو جاؤ گے فحشاء کی طرف لگ جاؤ گے پھر تمہاری آمدنی میں اتنی گنجائش ہی نہیں رہے گی کہ تم اللہ کے راستہ میں خرچ کر سکو، اسی وجہ سے فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے اس لیے فرمایا کہ جب تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے قلب کو مضبوط کرو کہ جب اللہ حکم دیتا ہے اور اپنے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے تو مستقبل کا ذمہ دار بھی وہی ہے، ہم مغفرت حاصل کرنے کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر یقین ہو کہ آج اگر ہم دے رہے ہیں تو کل کو اللہ تعالیٰ زیادہ کر کے ہماری طرف لوٹائے گا جیسے پہلے مثال دی تھی کہ تم ایک خرچ کرو اللہ تعالیٰ سات سو بنا کے دیتا ہے، دنیا میں برکت ہوتی ہے جیسا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ صدقہ کے ساتھ کسی کے مال میں کمی نہیں آتی یعنی معنوی طور پر اس میں اضافہ ہی ہوتا ہے، اللہ کے اس وعدے پر یقین ہوگا تو تم انفاق کر سکو گے اور پھر اپنے آپ کو فضول خرچی سے روکنے کی کوشش کرو گے، عیاشی بدمعاشی میں مال خرچ کرنے سے بچو گے اور اللہ کے راستہ میں دو گے، یہ جذبات جب دل میں پیدا ہو جائیں تو سمجھو کہ قلب اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو قبول کر رہا ہے اور فرشتہ کی طرف سے الہام ہو رہا ہے، اور اگر فقر کا اندیشہ ہو جائے اور طبعیت فضول خرچی کی طرف راغب ہو جائے تو یہ سمجھ لیجئے کہ شیطان قلب کے اوپر مسلط ہو گیا ہے، اور یہ جذبات تمہارے دل کے اندر شیطان ابھار رہا ہے۔

جس کو دین کی سمجھ مل گئی اس کو خیر کثیر مل گئی:

انفاق فی سبیل اللہ کے اندر اکثر و بیشتر چونکہ یہ چیزیں رکاوٹ بنتی ہیں اس لئے ان کو یہاں اٹھایا جا رہا ہے لیکن یہ باتیں سمجھنا اس کا کام ہے جس کو دین کی سمجھ مل جائے، اور جس کو دین کی سمجھ مل گئی سمجھو اس کو خیر کثیر مل گیا وہ اپنی دنیا کو بھی سنبھال لیتا ہے اور آخرت کو بھی سنبھال لیتا ہے، وہ شیطان کی حقیقت کو سمجھتا ہے، فحشاء کی حقیقت کو سمجھتا ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت کی حقیقت کو سمجھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے وعدے کی حقیقت کو جانتا ہے، دنیا کا فانی ہونا اس کے سامنے منکشف ہے اور آخرت کا باقی ہونا اس کے سامنے منکشف ہے، اور اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ نے مجھے دیا ہے اور وہ اس بات کو بھی سمجھتا ہے کہ اللہ کے حکم کے تحت عمل کرنے میں کیا فائدہ ہے، اس قسم کی چیزوں کی سمجھ جس کو مل جائے سمجھو خیر کثیر اس کو مل گیا، وہ اپنی دنیا بھی سنوار لیتا ہے اور آخرت بھی سنوار لیتا ہے اسی کو اس آیت میں بیان کیا۔

"یوتی الحکمۃ من یشاء" من یشاء جس کو اللہ چاہتا ہے اور اللہ چاہتا کس کو ہے؟ یہ بات آپ کے سامنے بار ہا ذکر کی گئی ہے کہ اللہ کی مشیت کا تعلق اسی چیز کے ساتھ ہے جو آدمی اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ نیک راستہ اختیار کرنا چاہے اللہ کی مشیت اس کو خیر کی توفیق دینے سے متعلق ہو جاتی ہے، اور جو قصد اور ارادے کے ساتھ بری چیز کو اختیار کرنا چاہتا ہے تو اللہ کی مشیت اس کو برائی کی طرف دھکیل دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تعلق اسی طرح ظاہری اسباب کے ساتھ متعلق ہو کر انسان کے لئے نمایاں ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت مل جائے گی اور جتنا اعراض کرنے کی کوشش کرو گے اتنا ہی تمہارے لئے گمراہ ہونا آسان ہو جائے گا۔

"وما انفقتم من نفقۃ" جو کچھ تم خرچ کرو یا تم نذر مانو پس بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے، نذر کا مطلب ہوتا ہے اپنے اوپر کسی دوسری چیز کو لازم کر لینا ایک تو انفاق اللہ کے حکم کے تحت فرض زکوٰۃ ہے اور ایک ہے نفلی صدقہ اور ایک انفاق کی صورت یہ بھی ہے کہ تم اپنے اوپر خود لازم کر لو جس کو نذر کہتے ہیں، نذر بدنی عبادت کی بھی ہوتی ہے اور نذر مالی بھی ہوتی ہے اور پھر جس کام کی نذر مانی گئی ہے اس کے ہو جانے کے بعد اس کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے، نذر اگرچہ شریعت کی نظر میں محمود چیز نہیں ہے لیکن اگر کوئی مان لے تو اس کا وجوب آ جاتا ہے۔

"وما للظالمین من انصار" ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ظالموں کا مفہوم یہاں یہی ہے کیونکہ ظلم کا اصل مصداق ہوتا ہے "وضع الشیء فی غیر محلہ" چیز کو کسی غیر محل میں رکھنا، جہاں رکھنی چاہیئے تھی وہاں نہیں رکھی،

اس لیے سب معاصی ظلم کا مصداق ہوتے ہیں، اپنے نفس کے حقوق ادا نہ کرنا یہ بھی ظلم ہے اور جن کو اللہ نے مال دیا اور وہ مال کے حق کو نہیں پہچانتے فضول خرچی میں مال اڑاتے ہیں، فقر کے اندیشہ سے جمع کر کے رکھتے ہیں یہ بھی ظالم ہیں جو اپنا ثواب گھٹاتے ہیں اور اپنے حقوق کو تلف کرتے ہیں۔

یہ آج سہارے لیتے ہیں اس مال کے اور سمجھتے ہیں کہ ہم جمع کر کے رکھیں گے تو ہمارے کام آئے گا لیکن کل کو یہ مال چھن جائے گا، پھر تہی دامن کھڑے ہوں گے اور کوئی ان کا دستگیر اور مددگار نہیں ہوگا، اور جو لوگ اللہ کے وعدے پر انفاق کرتے ہیں اللہ کے وعدے پر یقین رکھتے ہیں اللہ کی نصرت ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور جو مال پر اعتماد کر کے بیٹھ جاتے ہیں تو مال ساتھ دے گا نہیں اور یہ بے سہارا رہ جائیں گے یہاں ظالمین کا موقع محل کے مطابق مصداق یہی ہے۔

صدقات میں اخفاء افضل ہے یا ابداء؟

"ان تبدوا الصدقات فنعما ھی" اب یہاں صدقات کے متعلق ایک اور ادب واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ خفیہ دینے چاہئیں یا علی الاعلان دینے چاہئیں اصل کے اعتبار سے فی حد ذاتہ فضیلت تو اخفاء کو ہے کہ چھپا کے دو اور چھپا کے دینے میں دینی فائدہ بھی ہے کہ انسان ریاکاری سے بچتا ہے اور دنیوی فائدہ بھی ہے کہ کسی دوسرے شخص کو اس کے مال کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے پاس کتنا مال ہے اگر آپ لوگوں کو بتا دیں گے کہ میری ایک لاکھ زکوٰۃ نکلی ہے تو لوگ اندازہ کر لیں گے کہ آپ چالیس لاکھ کے مالک ہیں اور یہ مال ایسی چیز ہے کہ جب پتہ چل جاتا ہے کہ کسی کے پاس ہے تو چور، ڈاکو، بدمعاش سب اسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، ایک آدمی خالی ہاتھ جا رہا ہو تو قدرتی بات ہے کہ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں ہوتا کوئی تردد نہیں ہوتا، کوئی اندیشہ نہیں ہوتا، بڑے اطمینان کے ساتھ چلتا جائے گا اور اگر اس کے پاس پیسے ہیں تو بظاہر اگرچہ اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے مگر پھر بھی اس کا دل دھڑکے گا کہ کہیں کوئی چور اور ڈاکو نہ آجائے، میری جیب نہ کٹ جائے اور چھپتا ہوا، بچتا بچاتا ہوا چلتا ہے، تو یہ قدرتی بات ہے کہ اپنے دل میں بھی یہ خطرات پیدا ہو جاتے ہیں اور جہاں یہ مال ہوتا ہے تو چور، ڈاکو بدمعاش سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اگر اخفاء کے ساتھ دیا جائے تو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اس کے پاس کتنا مال ہے اور کتنا نہیں ہے اس طرح دنیوی خطرات سے بھی کسی حد تک بچاؤ ہو جاتا ہے، یہ تو ہے دینے والے کے لئے فائدہ اور اس میں ایک فائدہ اور بھی ہے کہ بسا اوقات ایک آدمی اپنی ذات میں خوددار ہے، باوقار ہے اور وہ اپنا محتاج ہونا کسی کے سامنے ظاہر

نہیں کرنا چاہتا تو اس کو علی الاعلان کسی کے سامنے اگر صدقہ دیا جائے گا تو وہ لیتا ہوا شرماتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ میری عزت نفس کے خلاف ہے، تو بسا اوقات محتاج ہونے کے باوجود انسان کی طبیعت کے جذبات ایسے ہوتے ہیں، اور جب خفیہ دیا جائے گا تو اس کی خودداری بھی بحال رہ جائے گی۔

اس لئے فی حد ذاتہ کمال تو یہی ہے کہ انسان اخفاء کے طور پر دے اسی لئے حدیث شریف میں آتا ہے جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سبعة يظلهم الله في ظله يوم لا ظل الا ظله" سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے بغیر کوئی سایہ نہیں ہوگا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جو ایسے طور پر خرچ کرتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ نے دیا اور بائیں ہاتھ کو پتہ بھی نہیں یعنی خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے لہٰذا فی حد ذاتہ تو فضیلت اس کو ہے لیکن بسا اوقات کسی عارض کی بناء پر ابداء بھی افضل ہو جاتا ہے، مثلاً ایک آدمی کے متعلق لوگوں کو بدگمانی ہے کہ یہ زکوٰۃ نہیں دیتا ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو بدگمانی سے بچانے کے لئے زکوٰۃ ظاہر کر کے دے تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ واقعی زکوٰۃ دیتا ہے، اور فرض کو ادا کرتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے تو دوسروں کو ترغیب نہیں ہوتی اور اگر وہ سب کے سامنے دے رہا ہے اس جذبہ کے تحت کہ مجھے دیکھ کر لوگوں میں بھی خرچ کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا اس طرح علی الاعلان دینا بھی بسا اوقات افضل ہو جاتا ہے۔

قومی چندوں، اور اجتماعی چندوں میں یہ چیز مفید ہوتی ہے کہ ایک کی طرف دیکھ کر دوسروں کو ترغیب ہو جاتی ہے، اور وہ بھی دینے لگ جاتے ہیں ایسے موقع پر ابداء کو افضل قرار دے سکتے ہیں اور فی حد ذاتہ جواز دونوں کا ہے چاہے اصل کے اعتبار سے افضلیت اخفاء کو ہے، لیکن عارض کے طور پر یہ افضلیت ابداء کے لئے بھی ہو سکتی ہے، اچھے جذبات کے تحت، نیکی کے جذبات کے تحت، للّٰہیت کے ساتھ اگر ابداء انسان کسی موقع پر مفید سمجھتا ہے تو ابداء کو اختیار کر لے اور اگر دیانت داری کے ساتھ کسی موقع پر اخفاء کو افضل سمجھتا ہے تو اخفاء کو اختیار کرے، نہ ابداء ممنوع ہے، نہ اخفاء ممنوع ہے، ریا سے بچنا اور اللہ کی رضا کا حاصل کرنا دونوں جگہ ضروری ہے اس کی طرف اس جگہ اشارہ کیا ہے۔

"يكفر عنكم من سيئاتكم" بظاہر اس کو اخفاء کے ساتھ لگایا کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے گناہ دور ہٹائے گا یہ گناہوں کا معاف ہونا اخفاء کے ساتھ خاص نہیں ہے لیکن ظاہری طور پر اس کو اس کے ساتھ جو لگا دیا تو مفسرین کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان کی کمزوری کا ایک علاج ہے کہ بسا اوقات انسان مال خرچ کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ میں خرچ بھی کروں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے تو خرچ کرنے کا کیا فائدہ ہوا، تو یہ کہہ دیا کہ اگر کسی

دوسرے کو پتہ نہیں تو اللہ کو تو پتہ ہے اور جو فائدہ خرچ کے او پر تم چاہتے ہو اللہ کی مغفرت وہ بہر حال ہوگی چاہے کسی کو پتہ نہ چلے، بلکہ جب اخفاء کے جذبہ کے ساتھ دیا جائے گا تو چونکہ اس میں خلوص زیادہ نمایاں ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت زیادہ ہوگی جو فائدہ تمہیں مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف کردے وہ اللہ کے جاننے پر ہے مخلوق کے جاننے پر تو نہیں ہے اس لئے مخلوق کو نہ بھی پتہ چلے اللہ تعالیٰ تو بھی تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

صدقات کافروں کو بھی دیے جاسکتے ہیں:

اب ایک اور ادب بھی بتایا جا رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خرچ کرنا باعث ثواب ہے اس میں مسلم اور کافر کی بھی تمیز نہیں اگر کوئی محتاج سامنے آجائے تو اس کی مدد کرو چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ فقہ کے اندر آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ صرف زکوٰۃ کے بارے میں پابندی ہے کہ یہ کافر کو نہیں دی جاسکتی، کیونکہ اس کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ " تؤخذ من اغنیائهم فترد علیٰ فقرائهم (مشکوٰۃ ص ۱۵۵) کہ یہ مال مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے فقراء پہ لٹایا جاتا ہے، زکوٰۃ کے بارے میں تو یہ تعلیم ہے کہ مسلمانوں کے اغنیاء سے لو اور مسلمانوں کے فقراء پر لوٹاؤ اس کا مصرف کافر نہیں ہے۔

ہاں البتہ زکوٰۃ کے علاوہ باقی خیرات صدقات کافر کو دیے جاسکتے ہیں اس میں مسلمان ہونا شرط نہیں، بوقت ضرورت کافر کی امداد کرنا یہ بھی باعث ثواب ہے حتیٰ کہ حدیث شریف میں تو یہاں تک آیا ہے کہ کسی حیوان کو اگر تم محتاج پاتے ہو تو اس پر احسان کرو، اللہ اس پر بھی ثواب دے گا، بخاری شریف، مشکوٰۃ شریف میں فضائل صدقات میں روایت موجود ہے کہ ایک فاحشہ عورت نے ایک محتاج کتے کو مشقت اٹھا کے کنویں سے پانی نکال کے پلا دیا، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کی وجہ سے اس کی مغفرت کردی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا اس طرح حیوانوں کی خدمت کرنے میں بھی ثواب ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں جو بھی جاندار ہے اس کی خدمت پر اللہ تعالیٰ ثواب دیتا ہے (مشکوٰۃ ص ۱۶۸) محتاج کوئی بھی ہو اس محتاج کی امداد کرو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں یہ خیال پیدا ہوا تھا جس کی یہاں اصلاح کی جارہی ہے کہ صدقات صرف مسلمانوں کو دینے چاہئیں اور کافروں کو نہیں دینے چاہئیں تاکہ اسی ترغیب کے ساتھ ہی اسلام قبول کرلیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں رہنمائی فرمائی کہ ان کی ہدایت تمہارے ذمہ نہیں کہ تم اس قسم کے حیلے کرو، محتاج کی مدد بہر حال کرو باقی اگر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو ان کی مرضی نہیں کرتے تو ان کی مرضی، بوستان کے اندر حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ آپ کی عادت تھی کہ جس وقت تک کوئی مہمان نہ آجائے اس وقت

تک کھانا نہیں کھایا کرتے تھے ایک دفعہ کوئی مہمان نہ آیا کھانے کا وقت آ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام انتظار میں تھے کہ کوئی آئے تو میں کھانا کھاؤں کوئی نہ آیا تو باہر نکل گئے کہ کسی مسافر کو دیکھ کر لاؤں، جب گئے تو ایک بوڑھا آتش پرست جارہا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے پکڑ لائے کہ آؤ کھانا کھا کے جانا، لا کے اس کو دستر خوان پر بٹھا لیا جب دستر خوان پر بٹھایا تو اس سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ جس نے یہ کھانا دیا ہے تو وہ کہنے لگا کہ میں تو اللہ کو نہیں جانتا میں تو اس کا نام نہیں لیتا، اس بوڑھے نے اللہ کا نام لینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غصہ ہو کر اس کو دستر خوان سے اٹھا دیا کہ چل جب تو اللہ کا نام نہیں لیتا تو تجھے یہ کھانے کا حق نہیں ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تنبیہ کی گئی کہ یہ آج تیرے دستر خوان پر آیا اور اللہ کا نام نہ لینے کی وجہ سے تو نے اس کو دستر خوان سے اٹھا دیا یہ کتنے سالوں کا بوڑھا ہے آخر میں بھی تو اس کو کھلا ہی رہا ہوں، تو اس میں بھی یہی بتایا گیا کہ محتاج، ضرورت مند، حاجت مند آجائے تو ایسے شخص کو بوقت ضرورت دینا باعث ثواب ہے، چاہے کوئی کافر ہے یا مسلمان ہے، "لیس علیك ھداھم" میں یہی بات بتائی گئی ہے کہ ان کو راستہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے صحیح راستہ پر پہنچا دیتا ہے، تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدے کے لئے تمہیں اللہ کی رضا حاصل ہو جائے گی کوئی ہدایت قبول کرے یا نہ کرے اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں۔

صدقات کا سب سے اعلیٰ اور اچھا مصرف:

خرچ تو کیا جا سکتا ہے بوقت ضرورت ہر کسی پر لیکن اعلیٰ مصرف ان صدقات کا یہاں نمایاں کیا جارہا ہے سب سے اچھا مصرف یہ ہے کہ یہ صدقات ان محتاجوں کے لئے ہیں جو اللہ کے راستہ میں گھیر لیے گئے، اللہ کے راستہ میں گھیر لئے گئے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی دینی خدمت میں مشغول ہیں اس وقت اس کا مصداق اصحاب صفہ تھے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسہ کے طالب علم تھے جو ہر طرف سے تعلقات قطع کر کے آ بیٹھے تھے، یہ فقراء اور مساکین کا گروہ تھا جن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں، ان کی جائیداد نہیں، کوئی کاروبار نہیں، مسجد میں ایک چبوترہ تھا اس پر بیٹھے رہتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آتے، ان کے پاس بیٹھتے، انہیں قرآن پڑھاتے، اور انہیں اپنی باتیں یاد کرواتے اور کہیں سے کوئی صدقہ خیرات آجاتا تو ان میں بانٹ دیتے اور ان کا گزارہ اسی پر تھا، فاقے برداشت کرتے تھے لیکن قرآن و حدیث یاد کرتے تھے، جب پھر باہر سے کوئی مطالبہ آتا کہ ہمارے پاس کوئی مبلغ بھیج دو جو دین کی تبلیغ کرے تو ان میں سے جس نے قرآن زیادہ یاد کیا ہوتا جو سمجھدار ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مبلغ بنا کر

بھیج دیتے تھے، مسجد کے ساتھ ہی یہ مدرسہ تھا جس کی بنیاد سرور کائنات ﷺ نے اپنی زندگی کے اندر رکھی جو طالب علم اس میں آتے تھے ساٹھ ستر، اسّی تک ہو جاتے تھے یہ اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔

یہ مساکین کا گروہ تھا جو دینی خدمات کے لیے رکے بیٹھے تھے کہ حضور ﷺ جہاں بھیجیں گے چلے جائیں گے، دن کو حضور ﷺ کے گھر کی ضروریات پوری کرتے تھے، پانی بھرتے تھے، ایندھن لا کے دیتے تھے، اور حضور ﷺ ان پر شفقت فرماتے اصولاً ان کا خرچ حضور ﷺ کے ذمہ تھا بس صدقہ خیرات جو آجاتا وہ ان میں تقسیم ہو جاتا اور باقی یہ لوگ اپنے طور پر کوئی ذریعہ معاش اختیار کیے ہوئے نہیں تھے، اور آج کل عربی مدارس کے طلباء اسی کا مصداق ہیں وہ بھی ہر طرف سے کٹ کٹا کے آتے ہیں بیٹھ جاتے ہیں اللہ کے دین کے لئے تو یہ ''محصر فی سبیل اللہ'' ہو گئے طلباء بھی اور ان کو پڑھانے والے بھی جو دینی خدمت کے لیے بیٹھ گئے ''لایستطیعون ضرباً فی الارض'' کاروبار کے لئے وہ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے یہاں یہ معنی نہیں کہ ان کی ٹانگیں کمزور ہیں، اپاہج ہیں، ہل نہیں سکتے مشغولیت اتنی ہے کہ اگر وہ دوسرے کاموں میں لگ جائیں گے تو پھر یہ دین کا کام کس طرح کریں گے۔

اسی کا مصداق ہیں مجاہد اور غازی کہ اگر وہ دوکانیں چلانے لگ گئے، کاشتکاری کرنے لگ گئے، ریڑھیاں لگا کے بازار میں کھڑے ہو گئے، تو پھر ان کے پاس اتنا وقت کہاں ہوگا کہ یہ دینی کام کرسکیں، اس لیے اپنے صدقات خیرات تلاش کر کر کے ان لوگوں تک پہنچایا کرو جو دینی ضرورت میں مشغول ہونے کی وجہ سے کاروبار کے لئے پھر نہیں سکتے، کوئی دوسرا کاروبار نہیں کرسکتے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے اندر استطاعت نہیں ہے صلاحیت نہیں ہے یہ ٹوکری نہیں اٹھا سکتے، ریڑھی نہیں لگا سکتے یا کسی دوسرے شغل میں نہیں لگ سکتے، بلکہ وہ ''محصر فی سبیل اللہ'' ہیں اللہ کے راستہ میں گھیرے ہوئے ہیں اگر وہ ان کاموں میں لگتے ہیں تو دین کا کام نہیں ہوتا اور دین کا کام کرتے ہیں تو کمانے کی فرصت نہیں ہے، اور پھر ان میں عزت نفس ہے، اپنے مقام کا احساس ہے، لوگوں سے سوال نہیں کرتے اور کسی سے نہ مانگنے کی وجہ سے صاف ستھرا رہنے کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو غنی ہیں ان کو تو کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے جو ان کے حال سے واقف نہیں وہ ان کو مالدار سمجھتا ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ جب سے ہم نے پابندی لگائی ہے کہ باب العلوم کے طالب علم کسی کے گھر کھانا کھانے نہیں جائیں گے تو عام لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کے پاس سرمایہ ہے، بڑے خزانے ہیں اس لئے یہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے کہ لوگوں کے گھر میں کھانا کھانے جائیں، تو جو لوگ حالات سے واقف نہیں ہیں

وہ یہی سمجھتے ہیں کہ بہت خزانوں کے مالک ہیں، حالانکہ جو ہمارا حال ہے وہ ظاہر ہے کہ صبح وشام پریشان ہیں، اس سے معلوم ہو گیا کہ جو لوگ دین کے کاموں میں لگے ہوئے ہوں ان کی شان یہی ہے کہ اتنا تعفف ہو کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ تم محتاج نہیں ہو۔

اللہ تعالیٰ پھر یہ کہتے ہیں "تعرفهم بسيماهم" تو ان کے حالات کو دیکھ کے پہچانتا ہے کہ اگر چہ سوال نہیں کرتے لیکن ان کے حال سے یہ بات نمایاں ہے کہ جب ان کا کوئی کاروبار نہیں، ان کی کوئی آمدنی نہیں، ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں، چہرے کے اوپر عبادت کے، ریاضت کے، مسکنت کے آثار ہیں تو یقیناً یہ لوگ ضرورت مند ہیں تو تو ان کو ان کی علامات دیکھ کے پہچان سکتا ہے۔

بیان القرآن میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ان فقراء کا اعلیٰ مصداق عربی مدارس کے طلباء کو ہی قرار دیا ہے کہ مال دار لوگوں کو چاہیئے کہ ان کی ضرورتیں معلوم کر کر کے ان کی امداد کیا کریں یہ ضروری نہیں کہ یہ تم سے مانگنے کے لیے ہی آئیں اور تمہارے سامنے اپنی حاجات کو نمایاں کریں کیونکہ یہ اللہ کے دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور اگر یہ کمانے میں لگ جائیں گے تو یہ خدمات جاری نہیں رہ سکتیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت:

"الذين ينفقون اموالهم" یہ اس سلسلہ کی آخری آیت ہے، جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں یہ اوقات کی تعمیم آ گئی ضرورت پیش آ جائے رات کو خرچ کرو، ضرورت پیش آ جائے دن کو خرچ کرو، وقت کی کوئی تعیین نہیں اور "سراً وعلانیۃً" یہ حال کی تعمیم آ گئی کہ چھپ کر یا علی الاعلان تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ یہ غمزدہ ہوں گے، یہ آخرت میں کامیابی کا عنوان ہے کہ آخرت میں ان کو انتہائی درجہ کی اطمینان کی زندگی نصیب ہوگی جو خوف وحزن سے خالی ہوگی۔
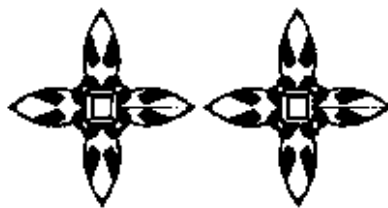
اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ

جو لوگ ربا کھاتے ہیں نہیں اٹھیں گے مگر جیسے کہ اٹھتا ہے وہ شخص

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا

جس کو خبطی بنادیا ہو شیطان نے لپٹ کر یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ سوائے اس کے نہیں کہ

الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ

بیع سود کی طرح ہے، اور اللہ نے حلال ٹھہرایا ہے بیع کو اور حرام قرار دیا ہے ربا کو پس وہ شخص کہ

جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى

جس کے پاس نصیحت آگئی اس کے رب کی طرف سے پھر وہ رک گیا پس اس کے لیے ہے جو پہلے ہوگیا اور اس کا معاملہ

اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اللہ کی طرف ہے اور جو کوئی عود کرے گا (اس قول وفعل کی طرف) پس یہی ہیں جہنم والے اور اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۲۷۵﴾

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا کسی ناشکرے کو

اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ

گناہ گار کو ﴿۲۷۶﴾ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے نماز قائم کی

وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور زکوۃ دی ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ ان پر کوئی خوف ہوگا

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا

اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے ﴿۲۷۷﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور چھوڑ دو

مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا

جو سود باقی ہے اگر تم ایمان والے ہو ﴿۲۷۸﴾ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ

سن لو اللہ کی طرف سے اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی، اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے لئے تمہارے اصل

اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ

مال ہیں نہ تم ظلم کرو گے اور نہ تم ظلم کیے جاؤ گے ﴿۲۷۹﴾ اور اگر وہ (مدیون) تنگی والا ہے

فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

پھر مہلت دینا ہے کشادگی تک اور صدقہ کردینا تمہارا یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۣ ثُمَّ تُوَفّٰى

جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾ اور ڈرو اس دن سے جس میں تم لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف پھر پورا دیا جائے گا

كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

ہر نفس جو اس نے کیا ہے اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے ﴿۲۸۱﴾

ماقبل سے ربط:

پچھلی آیات میں صدقہ اور خیرات کے متعلق احکام تھے جس کا عنوان قائم کیا گیا تھا انفاق فی سبیل اللہ، اس کی تاکید، اس کی ترغیب، دنیا وآخرت میں اس کے فوائد اور اس کے آداب وشرائط آپ کے سامنے گذشتہ دو رکوع میں ذکر کیے گئے ہیں، انفاق فی سبیل اللہ کے بالکل برعکس ہے سود کا لینا اور سود کا کھانا، ان آیات میں اس کو ذکر کیا جارہا ہے۔

سود کی مذمت اور سود کا حکم:

انفاق فی سبیل اللہ اللہ کے ہاں مرغوب اور سود کا لینا اللہ کے ہاں انتہائی درجہ کا مبغوض ہے، سود کا لینا حرام اور دنیا وآخرت میں صدقہ کے متضاد نتائج کا حامل ہے جس طرح صدقہ خیرات میں ہمدردی، مواسات اور خیرخواہی کا معنیٰ پایا جاتا ہے کہ ایک آدمی اپنی محنت کے ساتھ کماتا ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے

ضرورت مند لوگوں کو وہ مفت تقسیم کر دیتا ہے اپنی محنت کی کمائی لوگوں میں بانٹ دیتا ہے، جس میں انسانی ہمدردی ہے مواسات ہے خیر خواہی ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جذبہ ہے اور آخرت پر یقین ہے یہ چیزیں منشاء بنتی ہیں اس انفاق فی سبیل اللہ کا۔

اور اس کے برعکس انسانیت کے لئے انتہائی درجہ کا ظالم، درندہ صفت، خونخوار بھیڑیا وہ سرمایہ دار ہے کہ جس کے پاس مال تو جمع ہے اور وہ کسی غریب کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے تیار نہیں، خیر خواہی کرنے کے لئے تیار نہیں کسی کی بوقت ضرورت دستگیری نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی محتاج اس کے پاس پیسہ لینے کے لئے آتا ہے تو وہ جتنے اس کو دیتا ہے اس سے زائد وہ اس سے لے لیتا ہے اور زائد لینے کی شرط ٹھہراتا ہے اس کے دل میں مال کی محبت ہوتی ہے دنیوی زندگی کی قدر ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہیں، آخرت کی پرواہ نہیں، انسانوں کے ساتھ ہمدردی نہیں اس لئے یہ معاملہ بالکل صدقہ خیرات کے برعکس ہے۔

تیسری صورت ایک درمیانی صورت ہے وہ ہے کسی کو قرض دے دینا بغیر سود کے وہ درمیانی صورت ہے کہ اگر اپنا مال دوسرے کی ملکیت نہیں کر سکتے، بوقت ضرورت دوسروں کو دے نہیں سکتے تو پھر قرض دے دیا کرو اور پھر پورا واپس لے لیا کرو، اس کے اوپر بڑھوتری لینا یہ ظلم ہے اور اس کے اندر انسانیت کے ساتھ ہمدردی کا پہلو نہیں ہے تو انفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ آگے اخذ ربا کا قصہ ہے اور اگلے رکوع میں قرض کے متعلق کچھ احکام ذکر کیے گئے ہیں، اس طرح مالیات کے متعلق یہ احکام پورے ہو جاتے ہیں۔

پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد جمع ہو جائے تو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے محتاج انسانوں کی دست گیری کرے اور اگر بالکل دے نہیں سکتا تو بطور قرض کے دے دے اور دوسرے وقت میں وصول کر لے یہ دونوں صورتیں درجہ بدرجہ جائز ہیں، مرغوب فیہ ہیں اور تیسری صورت کہ کسی کو دے کے پھر زیادہ لینا جس کو سود یا ربا کہتے ہیں یہ حرام ہے اور یہ انسانیت پر ظلم ہے درمیان میں اس کی مذمت بیان کر دی۔

زمانہ جاہلیت میں سود کی مروجہ صورت اور اس کا حکم:

ربا یہ ربیٰ یربو سے بڑھنے کے معنی میں ہے ترجمہ اس کا سود کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، سود یہ فارسی کا لفظ ہے جس کا معنی ہوتا ہے نفع، یہ لفظ قرآن مجید میں جس وقت اترا اس وقت جاہلیت کے اندر یہ لفظ متعارف تھا اور اس کے معاملات لوگوں کے اندر جاری تھے، اس کے متعلق لوگوں کو پوری واقفیت تھی کہ ربا کس کو کہتے ہیں، صرف جاہلیت میں ہی نہیں بلکہ توراۃ وانجیل کے اندر بھی اس کی حرمت مذکور ہے، یہود کو بھی حکم تھا کہ سود نہیں لینا

اس لیے لوگوں کے اندر یہ مروج تھا لوگ اس کے مطابق معاملات کرتے تھے اس کے مفہوم کے اندر کوئی کسی قسم کا خفاء نہیں تھا۔

اس وقت ربا کی یہ صورت تھی کہ قرض دے کر زیادہ لینے کی شرط ٹھہرانا، مثلاً ایک آدمی آپ کے پاس آ گیا وہ آپ سے دس روپے ایک مہینہ کے لیے لیتا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ ایک ماہ کے لئے آپ کو دس روپے دیتا ہوں لیکن ایک ماہ کے بعد گیارہ روپے واپس لوں گا، سود کی یہ صورت اس وقت جاہلیت میں مروج تھی، پھر اگر اس میعاد پر اس کو وہ ادا نہ کرتا تو پھر اس سود کو اصل رقم میں شامل کر کے اس سود کو اور بڑھا دیتے کہ اگر اب آپ وقت پر ادا نہیں کر سکے تو آئندہ مہینے میں دو روپے اور لوں گا، اگر اگلے ماہ بھی قرض ادا نہ ہو سکا تو کہتے کہ آئندہ مہینے تین لوں گا، اسی طرح محتاج کے احتیاج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سود کئی گنا زیادہ ہو جاتا بلکہ اصل رقم سے بھی بڑھ جاتا، اسی کو "اضعافاً مضاعفةً" کے ساتھ تعبیر کیا ہے کیونکہ اس وقت واقعہ یہی تھا کہ سود کئی کئی گنا ہو جاتا تھا بلکہ بسا اوقات اصل رقم سے بھی بڑھ جاتا تھا، یہ سود اس وقت مروج تھا جس پر قرآن کریم میں صراحتاً نفی آ گئی کہ یہ صورت تمہارے لئے جائز نہیں کہ کسی کو تم قرضہ دو اور وقت متعین کر کے اس کے اوپر اضافہ لو یہ اضافہ جو آپ لیں گے بلاعوض ہے اس لئے شرعی اصطلاح میں ربا کا مفہوم یہی ہے زیادت بلاعوض کہ نقد دے کر اس کے اوپر زیادتی بلاعوض لینا یہ سود کہلاتا ہے، یہ مروج تھا اور اسی کے اوپر صراحتاً قرآن کریم کے اندر انکار کیا گیا ہے۔

سود کی چھ مختلف صورتیں اور ان کا حکم:

اس کے علاوہ بعض صورتیں جس کو جاہلیت کے زمانہ میں رواج حاصل نہیں تھا اور لوگوں کا ذہن ربا سے اس طرف منتقل نہیں ہوتا تھا، سرور کائنات ﷺ نے ربا کے مفہوم میں ان کا اضافہ فرمایا کہ اس کو صرف نقد اور قرض کے ساتھ خاص نہ رکھا بلکہ فرمایا کہ " الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ يداً بيدٍ فمن زاد اواستزادفقد اربى الآخذ والمعطى فيه سواء (رواہ مسلم کمافی المشکوۃ ص ۲۴۴) کہ یہ چھ چیزیں یاد رکھو سونا، چاندی، گندم، جو، کھجور، نمک، ان چیزوں کا تبادلہ جب بھی کرو برابر سرابر کرو نقد بنقد کرو اگر ایک طرف سے زیادہ ہو جائے گا ایک طرف سے کم ہو جائے گا تو یہ بھی سود میں شامل ہے۔

اس لیے جو بیوعات جاہلیت میں مروج تھیں اور جن کی طرف سود ہونے کا ذہن نہیں جاتا تھا، سرور کائنات ﷺ نے ان سے بھی روک دیا، چھ چیزوں کا ذکر تو صراحتاً آ گیا کہ مقابلہ کرتے وقت ان کو برابر کے ساتھ کرنا ہے، اور ان میں ادھار کی کیفیت بھی پیدا نہیں کرنی، اس طرح ان کو بیچ سکتے ہو اس میں کمی بیشی سود ہے، یہ سرور کائنات ﷺ نے تعمیم فرما دی۔

سود کی دیگر پیش آنے والی صورتوں کا حکم:

اب آگے کچھ وضاحت باقی رہ گئی جو سرور کائنات ﷺ نے صراحتاً بیان نہیں فرمائی حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور ہمارے لئے ابواب ربا کو واضح نہیں فرمایا اور ہمارے لئے اشتباہ باقی رہ گیا کیا ہی اچھا ہوتا کہ حضور ﷺ اس کی تفصیل بیان فرمادیتے (مشکوٰۃ ص ۲۴۶) اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کریم میں جو لفظ ربا آیا ہے اس کے مفہوم میں کوئی اشتباہ باقی رہ گیا یہ تو صاف ستھری بات ہے عرب کے ماحول میں جو ربا مروج تھا قرآن کریم کا لفظ اسی مفہوم پہ محمول ہے وہ تو قطعی طور پر حرام ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا تعلق اس بات کے ساتھ ہے کہ یہ چھ چیزیں جو حضور ﷺ نے بیان فرمائیں کیا یہی چھ مقصود ہیں یا بعض دوسری چیزیں بھی اس میں داخل کی جاسکتی ہیں؟ اور یہی منشاء بنا فقہاء کے اختلاف کا کہ فقہاء اس طرف گئے ہیں کہ یہ چھ ہی مقصود نہیں بلکہ اس میں سے علت کا استنباط کر کے ہر فقیہ نے اپنی اپنی جگہ اس کی تعمیم کی ہے اور یہ تعمیم جو ہوئی ہے یہی صورتیں مشتبہ تھیں جن کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ ہمارے سامنے ان کی تفصیل نہیں آئی۔

یہ صورتیں فی حکم الربا ہو جائیں گی قطعی طور پر حرام وہی رہے گا جو کہ قرآن کریم کے زمانہ میں مروج تھا اور یہ چھ چیزیں بھی قطعیت میں آئیں گی کیونکہ ان کے اوپر اجماع ہے ان میں تو کسی قسم کے اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے، ان کے علاوہ باقی جو فقہاء کے اجتہاد کے ساتھ ثابت ہوں گی وہ صورتیں اشتباہ کی ہیں اس لیے ان کو فی حکم الربا رکھیں گے اور قطعی حرام تو ان کو قرار نہیں دیں گے، لیکن بہرحال فقہاء کے بیان کرنے کے ساتھ وہ حرام ہیں اس لیے بعض چیزوں کے بارے میں اختلاف آسکتا ہے کہ وہ چیز بھی اس ربا کے حکم میں آسکتی ہے کہ نہیں، مثال کے طور پر چاول ہیں چاول بالاتفاق ائمہ اربعہ کے نزدیک ربا میں داخل ہیں، ان کا حکم وہی ہے جو گندم کا ہے لیکن یہ چونہ قلعی وغیرہ جو کھانے میں شامل نہیں سونے چاندی کا بھی مصداق نہیں کیا ان میں بھی حکم ربا ہے یا نہیں، سیمنٹ کی ایک بوری دے کے آپ دو لے سکتے ہیں یا نہیں، احناف کے نزدیک ربا کے حکم میں آتی ہیں انہوں نے ان چھ چیزوں سے استنباط کر کے ان کی علت نکالی اتحاد جنس وقدر اور وہ چونہ کلی پر بھی صادق آتا ہے۔

اور دوسرے ائمہ کے نزدیک یا سونا چاندی ہو یا کھانے کی چیز ہو کیونکہ باقی چار چیزیں جو شمار کی گئیں ہیں وہ کھانے کی ہیں ان میں غیر ماکول چیز کوئی نہیں نقل کی گئی اس لیے نقدین کے علاوہ باقی چیزوں میں سود وہاں حرام ہوگا کہ جہاں وہ ماکولات میں سے ہوں گی اور جو چیزیں قوت میں نہیں آتیں جیسے لوہا اور تانبا ہو گیا قلعی ہو گئی

جو چیز ماکولات میں شامل نہیں ہے لیکن وہ ذخیرہ کرنے کی ہے احناف کے نزدیک یہ حرام ہوں گی اور دیگر ائمہ کے نزدیک حرام نہیں ہیں اس طرح ان جزئیات میں اشتباہ ہوسکتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا تعلق انہی جزئیات کے ساتھ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ صراحتاً بیان فرمادیتے تو بڑی اچھی بات تھی ہمارے سامنے اس کے کچھ ابواب مشتبہ رہ گئے، اور اس طرح کہنے کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں سود کے اوپر انتہائی شدت آئی ہے۔

قرآن کریم میں اعلان جنگ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آیا ہے تو صرف اس ربا کے مسئلہ میں آیا ہے اور حدیث شریف میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اوپر اتنی سختی بیان فرمائی حتی کہ یہاں تک فرمایا کہ ایک درہم ربا کا اگر کوئی شخص کھاتا ہے تو یہ چھتیس دفعہ زنا کرنے کے برابر ہے، بلکہ یوں فرمایا کہ سود کے ستر درجے ہیں اور سب سے نچلا درجہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے (مشکوٰۃ ص ۲۴۶) اور کامل درجہ کا جو سود ہوگا وہ یوں سمجھو کہ ستر مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر قرار دے دیا، اتنی کسی کے بارے میں شدت نہیں جتنی سود کے بارے میں آئی ہے، دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی، قرآن کریم میں بھی، اور حدیث شریف میں بھی، تو جب اس میں اتنی شدت ہے تو پھر دل دھڑکتا ہے کہ بعض ایسی صورتیں جن کے بارے میں اشتباہ پیدا ہوگیا کہ یہ سود میں شامل ہیں یا نہیں۔

ایک مؤمن تو یہ چاہتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بھی وضاحت فرمادیتے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم اس کو سمجھیں کہ یہ سود نہیں ہے اور حقیقت کے اعتبار سے وہ بھی سود میں شامل ہو، اور ہم بھی گرفت میں آجائیں، یہ بات بیان کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاں حقیقی ربا ہے اس کو بھی چھوڑ دو اور جس میں شبہ پیدا ہوجائے اس کو بھی چھوڑ دو احتیاط کا تقاضا یہ ہے اس لئے ہماری فقہ کا مدار اسی بات پر ہے، حقیقتاً سود وہاں ہوگا جہاں اتحاد جنس وقدر پائی گئی، ہم اس کو حقیقتاً سود قرار دے کر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور شبہ وہاں ہوتا ہے جہاں ایک پائی جائے دونوں نہ ہوں اس لئے ہم کہتے ہیں اس کو بھی چھوڑ دو، کیونکہ اس بارے میں قرآن وحدیث کے اندر شدت بہت زیادہ آئی ہے، اور آج دنیا کو اس شدت کی حکمت کا احساس ہوگیا کہ آج یہ سودی نظام ہی ہے جس کی وجہ سے ساری دنیا جنگ کی لپیٹ میں ہے اور اس سودی نظام نے دنیا کو بے چینی، پریشانی، لڑائی، جنگ وجدل میں مبتلا کر رکھا ہے، تو ربا کا مفہوم بھی متعین ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی وجہ بھی سامنے آگئی اور مختصر سا اس کا خاکہ بھی آپ کے سامنے آگیا کہ کون کونسی چیزیں اس میں داخل ہیں اور کون کون سی چیزیں اس میں داخل نہیں ہیں۔

سودخور کا انجام:

اس رکوع کی پہلی آیت کے اندر سود خور کی مثال بیان کی کہ یہ قیامت کے دن اس طرح اٹھیں گے جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص جس کو جن نے لپٹ کر خبطی بنادیا ہو، جن اگر کسی کو لگ جائے تو وہ شخص بدحواس ہو جاتا ہے اور بدزبانی بکواس، بے ہودہ بولنا اس میں بہت زیادہ ہوتا ہے ایسے ہی یہ سود خور قیامت کے دن قبروں سے جب اٹھیں گے تو ان کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوگی کہ پاگل اور مجنون بنے ہوئے ہوں گے اور یہ اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے بات ہی بڑی بے عقلی کی کی تھی دنیا کے اندر بے عقلی کا مظاہرہ کرتے رہے وہ کہتے تھے کہ بیع بھی تو ربا کی طرح ہے یعنی اگر ربا کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو کیونکہ خرید و فروخت بھی تو نفع کے لیے ہوتی ہے اور ربا میں اگر کوئی نفع لیتا ہے تو اس میں کیوں حرمت آ گئی۔

یعنی وہ یوں کہتے تھے کہ جب ربا کو حرام کہتے ہو تو بیع کو بھی حرام کہو، اللہ نے جواب دیا کہ دونوں برابر نہیں بیع کو اللہ نے حلال ٹھہرایا اور ربا کو حرام ٹھہرایا ہے جب اللہ احکم الحاکمین ہے اور ایک چیز کو وہ حلال ٹھہراتا ہے اور دوسری کو وہ حرام ٹھہراتا ہے تو اس کے بندوں کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا، اب معلوم ہوگیا کہ لوگوں کی نظر میں بیع کا مفہوم بھی متعین اور ربا کا مفہوم بھی متعین یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ربا کی حقیقت کیا ہے اور بیع کی حقیقت کیا ہے، قرآن کریم جس زبان میں اترا جس ماحول میں اترا وہ سب لوگ جانتے تھے کہ بیع کا مفہوم یہ اور ربا کا مفہوم یہ ہے، ایک مالی معاملہ تھا اس کو وہ ربا کہتے تھے اور اس کے علاوہ جو اجناس کا تبادلہ ہوتا تھا اس کو وہ بیع کہتے تھے۔

کیونکہ سامان کی مالیت کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے اور روپے پیسے کی مالیت میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی ہوتی ہے، ایسے وقت میں اگر کوئی ایک روپیہ دے کر ایک آنہ بھی زائد لیتا ہے تو یہ آنہ نفع میں آیا ہے اور یہ زیادتی بغیر کسی معاوضہ کے ہے بخلاف اس کے کہ جب اجناس کا تبادلہ اجناس سے ہوتا ہے یا نقد کا تبادلہ اجناس سے ہوتا ہے، یہاں مالیت کا اندازہ کہ یہ کتنی مالیت کی ہے اور کتنی کی نہیں ہے یہ حالات کے تحت ہوتا ہے اس لئے بڑھتے بھی رہتے ہیں اور کم بھی ہوتے رہتے ہیں، سونا چاندی میں ایسی چیز نہیں ہے سونا چاندی جیسا دیا ویسے کا ویسا واپس آجائے گا تو اس لیے بیع حلال اور ربا حرام ہے۔

جس شخص کے پاس نصیحت آگئی اس کے رب کی طرف سے پھر وہ رک گیا تو جو وہ پہلے لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہیں لیا جائے گا، جاہلیت کے زمانہ میں جو اس نے سود اکٹھا کرلیا وہ اسی کا ہے، وہ اس سے واپس نہیں

لیا جائے گا، ''وامرہ الی اللہ'' اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اگر دل سے تائب ہوا ہے تو آخرت میں بھی اس کا گناہ معاف اور آخرت میں گرفت نہیں ہوگی اور اگر اوپر اوپر سے اس نے قانون کو قبول کر لیا لیکن دل اس کا صاف نہیں ہے تو اللہ کے حوالے تمہیں اس سے بحث نہیں ہے کہ دل سے تائب ہوا ہے یا نہیں، اور جو دوبارہ اس قول وفعل کی طرف لوٹے گا سود لے گا یا سود کو بیع کی طرح حلال جانے گا یہ لوگ جہنم والے ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، خلود تب آئے گا جب کفریہ قول صادر ہوگا اور جہنم میں جانا صرف عمل حرام کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے، سود لیں گے تو جہنم والے ہیں اور اس کو حلال قرار دیں گے تو ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں۔

سود کے نقصانات اور صدقات کے فوائد:

اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے صدقات کو بڑھاتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ سودی نظام آخر مخلوق کے لئے تنگی کا باعث بن جاتا ہے، یہ ایسے ہے جیسے ایک آدمی کے بدن پر ورم آجائے بظاہر وہ موٹا ہوتا ہوا نظر آئے گا لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی قوت نہیں ہے، اور سرمایہ دار جو آپ کو روز بروز مال دار ہوتا نظر آ رہا ہے یہ سرمایہ کا اکٹھا ہونا غیر فطری ہے یہ ایسے ہے جیسے بدن کے اوپر موٹاپا حقیقتاً قوت کے اعتبار سے تو نہ آئے، اس کے لئے بھی نتیجۃً یہ نقصان دہ ہے دنیا و آخرت میں اس کی نحوستیں بڑھتی ہیں، معاشرے میں انسان مبغوض ہو جاتا ہے اور اس کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں، مال کی حرص زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے مال سے فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ زیادہ جمع کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے یوں سمجھو کہ اس کے پاس مال کم ہی ہے اگرچہ بظاہر اس کے پاس زیادہ ہی کیوں نہ جمع ہو جائے۔

صدقات کو اللہ بڑھاتا ہے مال سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دیتا ہے، برکات نصیب ہوتی ہیں جو صدقہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں معاشرے میں محبوب بن جاتے ہیں، لوگ ان کے ساتھ محبت کرتے ہیں، راحت اور سکون اس کو نصیب ہوتا ہے، اور یہ ایک واقعہ ہے یعنی محلہ کے اندر ایک سود خور ہو تو سارا محلہ اس سے نفرت کرے گا اس لئے اس کو نہ حقیقتاً عزت حاصل اور جب دشمنیاں نمایاں ہوتی ہیں تو وہ ہر وقت خوف میں مبتلا رہتا ہے اور پھر مال کا حرص اس میں اتنا آجاتا ہے کہ وہ اپنے مال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تو خود بھی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے اور ارد گرد والوں کو بھی پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اور جو شخص صدقہ خیرات کا عادی ہوتا ہے لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ہوگی، لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت ہوگی، جب وہ ارد گرد محبت کرنے والوں کو دیکھے گا تو اس کو بھی راحت حاصل ہوگی، اور مال کی محبت اس کے دل میں نہیں ہوگی تو خود بھی اس مال سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسروں کو بھی پہنچاتا ہے، اس طرح دنیا و آخرت

میں یہ مال اس کے لئے برکت کا باعث بن جاتا ہے ملکی اور قومی سطح پر بھی صورتحال یہی ہے کہ سودی نظام مخلوق خدا کو تنگی میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہے اور صدقہ خیرات کا جذبہ مخلوق خدا کو راحت میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہے، جب مال تقسیم ہوگا یوں معلوم ہوگا کہ ساری دنیا ہی مال دار ہے اور راحت وسکون سے وقت گزار رہی ہے اور جب ایک طرف یہ اکٹھا ہونا شروع ہو جائے گا تو ایسے معلوم ہوگا جیسے ساری دنیا ہی بھوکی مر رہی ہے، اور شخصی طور پر بھی ایسے ہی ہے کہ سود خور مال سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اس کی راحت اور سکون ختم ہو جاتا ہے اور عالمی سطح پر بھی ایسے ہی ہے۔

سودی کاروبار کرنے والوں کے لیے ایک خاص حکم:

"یاایھا الذین آمنوا الخ" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی ہے وہ چھوڑ دو، یعنی جاہلیت کے زمانہ میں اگر تمہارے لوگوں کے ساتھ سودی معاملات چلتے تھے آج تم نے وصول کرنا ہے تو تم اس کو چھوڑ دو، گویا کہ یہ قانونی درجہ میں ہے اس کی حرمت نافذ ہوگئی، اس لیے اگر کسی مسلمان نے کافر سے قرضہ لیا ہوا ہے اور وہ کافر آئین اسلام کے تحت آ گیا جیسا کہ واقعہ پیش آیا تھا تو حضور ﷺ نے مسلمانوں کو منع کر دیا کہ تم نے سود نہیں دینا، اور جو ماتحت کافر تھے انہیں بھی منع کر دیا کہ تمہیں بھی لینے کی اجازت نہیں، اس میں ان کو اشکال ہوسکتا تھا کہ اسلام نے کافروں کا حق مارا ہے اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا ہے، لیکن سرور کائنات ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان جس وقت فرمایا کہ سود کا لین دین بند تو اس میں ساتھ ہی یہ فرمایا کہ سب سے پہلا سود جو میں معاف کرتا ہوں وہ میرے چچا عباس رضی اللہ عنہ کا سود ہے جس جس سے اس نے لینا ہے قطعاً وہ نہیں لیا جائے گا، وہ سب کو معاف ہے اپنی طرف سے معافی کا اعلان پہلے کیا ہے، اس لیے مسلمانوں پر بھی پابندی لگائی کہ جو تم نے لینا ہے وہ لینا جائز نہیں ہے۔

اور اسی طرح اپنے ماتحت جو کافر موجود تھے انہیں بھی کہہ دیا کہ اگر تم نے کسی مسلمان سے سود لینا ہے تو وہ بھی لینے کی اجازت نہیں گویا کہ مملکت اسلامیہ کے اندر قانونی پابندی لگ گئی، اس لئے کوئی ذمی بھی کسی کے ساتھ سودی کاروبار نہیں کر سکتا، یہ قانون سب کے لئے عام ہے اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان سن لو، پھر مار پٹائی ہوگی، اور یہ باغی ہیں ان کے ساتھ باغیوں والا معاملہ ہوگا، اور اگر سود کو حلال کہنے لگ جائیں تو پھر مرتد ہیں تو بھی مملکت اسلامیہ میں نہیں رہ سکتے، "فاذنوا بحرب من اللہ" کے اندر یہ ساری صورتیں ہوں گی، اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر توبہ نہیں کرو گے تو اصل بھی ضبط کیونکہ مرتد ہونے کی صورت میں بھی مال چھین لیا جاتا ہے اور باغی ہونے کی صورت میں بھی

مال چھین لیا جاتا ہے اصل مال تب ملیں گے جب اس قانون کو قبول کرو گے اور پچھلے سے توبہ کرو ورنہ وہ بھی ضبط کر لئے جائیں گے۔

لیکن یہ خیال نہ کرنا کہ جب سود نہیں لیتا تو ہم نے مفت دوسرے کے پاس پیسے کیوں چھوڑے ہوئے ہیں تنگدست ہو تو تم ان کو تنگ کرنا شروع کر دو ایسی بات نہیں اگر وہ تنگدست ہے تو مہلت دینا ہے میسرہ تک یعنی اس کو تنگ نہ کرنا اور اس کو کشادگی تک مہلت دو اور صدقہ کر دینا یہ بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

"واتقوا یوما" اور ڈرو تم اس دن سے یہ قانون شریعت میں ایک خاص بات ہے کہ اللہ تعالیٰ قانون نافذ کرتا ہے تو آگے پیچھے اس قسم کے جذبات ابھارتا ہے جس کے ساتھ اس قانون کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، اسی لئے فرمایا ڈرو اس دن سے جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اس نے کیا ہے اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے۔

فائدہ:

شریعت میں دو ہی گناہ ہیں جن کے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ کا ذکر آیا ہے ایک یہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے یعنی سود کا نہ چھوڑنا، اور ایک کا ذکر حدیث شریف میں ہے "من عادیٰ لی ولیا فقد آذنته بالحرب (مشکوٰۃ ص ۱۹۷) کہ جو میرے کسی ولی کے ساتھ عداوت رکھے میری طرف سے اس کے ساتھ جنگ کا اعلان ہے اور علماء یہ کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جس گناہ پر جنگ کا اعلان ہو گیا اس کے ارتکاب کے بعد سلب ایمان کا خطرہ ہے کیونکہ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ لڑتا ہے تو اس کی قیمتی سے قیمتی چیز کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں ہے جس کی بناء پر اندیشہ ہے کہ کہیں ایسے شخص کا ایمان ہی سلب نہ ہو جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ

اے ایمان والو! جب تم آپس میں دین کا معاملہ کرو کسی وقت

مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا

متعین تک تو اس کو لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ لکھے تمہارے درمیان کوئی کاتب انصاف کے ساتھ، اور نہ

يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ

انکار کرے کاتب لکھنے سے جیسا کہ اللہ نے اسے تعلیم دی ہے اس کو لکھ دینا چاہیے، اور چاہیے کہ لکھوائے

الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ

وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے اور چاہیے کہ وہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور نہ کم کرے اس حق میں سے کسی چیز کو،

فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ

پھر اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے نادان ہو یا ضعیف ہو یا وہ طاقت نہیں رکھتا

اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا

لکھوانے کی تو چاہیے کہ لکھوائے اس کا کارکن عدل کے ساتھ ، اور بنا لیا کرو

شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ

دو گواہ اپنے مردوں میں سے ، اور دو گواہ مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد

وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا

اور دو عورتیں ان میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو بوجہ بھول جانے ان دونوں عورتوں میں سے کسی ایک کے

فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ

پھر یاد دلا دیے ان میں سے ایک کے دوسری کو ، اور گواہ انکار نہ کیا کریں جب ان کو بلایا جائے ،

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ

اور اکتایا نہ کرو اس معاملہ کو لکھنے سے چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک ، یہ لکھنا

اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ

زیادہ انصاف کا باعث ہے اللہ کے نزدیک اور زیادہ درست رکھنے والا ہے گواہی کو اور زیادہ قریب ہے اس بات کے کہ تم شبہ میں نہیں پڑو گے مگر

اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ

یہ کہ ہو وہ نقد تجارت جس کو تم لیتے دیتے ہو آپس میں پس نہیں تم پر

جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ

کوئی گناہ کہ تم اس کو نہ لکھو، اور گواہ بنا لیا کرو جب تم آپس میں خرید و فروخت کرتے ہو نہ نقصان پہنچائے

كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا

لکھنے والا اور گواہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ گناہ ہے جو لگا ہوا ہے تمہارے ساتھ، ڈرتے رہو

اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ

اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے ﴿۲۸۲﴾ اور اگر تم ہو

عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ

سفر پر اور نہ پاؤ تم لکھنے والے کو پھر کچھ اشیاء رہن رکھی ہوئی ہیں جو قبضہ میں دی ہوئی ہیں۔ پھر اگر اعتبار کرے

بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ

تم میں سے بعض بعض کا پھر چاہیئے کہ ادا کرے وہ شخص جس کا اعتبار کیا گیا ہے اپنی امانت کو اور چاہیئے کہ ڈرے اللہ سے

رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ

جو کہ اس کا رب ہے، اور گواہی کو چھپایا نہ کرو اور جو شہادت کو چھپائے گا پس بے شک اس کا دل گناہ گار ہے

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع

اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کے ساتھ علم رکھنے والا ہے ﴿۲۸۳﴾

ماقبل سے ربط اور قرض کی مختلف صورتوں کا ذکر:

مالی معاملات کا تذکرہ شروع تھا جن میں سے پہلے صدقہ خیرات کے احکام ذکر کیے گئے تھے اور آداب ذکر کیے گئے تھے اور اس کے بعد سود کا مسئلہ ذکر کیا گیا تھا اس رکوع کے اندر قرض کے کچھ احکام ذکر کئے گئے ہیں میں نے عرض کیا تھا کہ جس وقت انسان کے پاس مال موجود ہوتا ہے تو پھر دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے تین ہی طریقے ہوتے ہیں یا تو صدقہ خیرات کے طور پر دوسروں کو دے یہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس کی تفصیل آپ کے سامنے بیان کردی گئی ہے پھر اس کی مخالف سمت میں سود ہے یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے، اس کی مذمت بھی آپ کے سامنے تفصیلاً قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کردی گئی ہے۔

تیسرا معاملہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس ضرورت سے زائد سرمایہ موجود ہے اور کوئی حاجت مند آجائے تو اس کو بطور قرض کے دے دو وہ اپنا وقت پورا کرے اس کے بعد تمہیں واپس کردے تو قرض دینا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب چیز ہے، اور اس صورت میں چونکہ پیسے دینے کے بعد واپس لینے ہوتے ہیں اس لئے اس صورت میں جھگڑے کا اندیشہ رہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان آیات میں ایسی باتیں بتارہے ہیں جو آپ کو جھگڑا فساد سے بچانے والی ہیں سب سے پہلی ہدایت تو یہ کی گئی کہ جب بھی آپس میں کوئی قرض کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو، قرض کا معاملہ دونوں طرح ہوتا ہے بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ نقد پیسے دے دیے اور وقت متعین کردیا کہ ایک مہینہ کے بعد واپس دینے ہوں گے تو بھی لکھ لو۔

اور کبھی ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی چیز خریدی ہے اور پیسے نقد دے کر مبیع کو ادھار کرلیا جیسا کہ بیع سلم میں ہوتا ہے تو اس کو بھی لکھ لینا چاہیئے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ چیز آپ نے لے لی اور قیمت کو قرض کرلیا یہ بھی قرض کا معاملہ ہے اس کو بھی لکھ لینا چاہیئے اور یہاں تینوں صورتیں مراد ہیں کہ ان تینوں صورتوں میں وقت متعین کرلینا چاہیئے تاکہ بعد میں جھگڑے کی صورت پیش نہ آئے جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی تفصیل آتی ہے کہ اجل متعین کی جائے اور اجل بھی ایسی متعین کی جائے جس میں جھگڑے کی گنجائش باقی نہ رہے، مثلاً مہینہ متعین کرلیا اس کی تاریخ متعین کرلی اور جن میں اختلاف ہوسکتا ہے وہ اجل متعین کرنا ٹھیک نہیں ہے مثلاً کہہ دے کہ جب میری بھینس بچہ دے گی تب میں قرض دوں گا، یا جب آم پک جائیں گے پھر قرض ادا کروں گا کیونکہ اس میں موسموں کے اعتبار سے تقدم وتاخر ہوجاتا ہے، ''فاکتبوا'' اس کو لکھ لیا کرو اور چاہیئے کہ لکھے تمہارے درمیان کوئی کاتب انصاف کے ساتھ، کاتب کو بھی عدل کی رعایت رکھنی چاہیئے یہ نہیں کہ لکھانے والا کچھ لکھائے اور وہ کچھ لکھ دے۔

خرید وفروخت کے متعلق مختلف احکام:

اور آگے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کاتب کو تعلیم ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند آپ کے پاس لکھوانے کے لیے آجائے تو چاہیئے کہ وہ لکھ دیا کرے اللہ تعالیٰ نے اس کو کتاب کی تعلیم دی ہے تو ضرورت مندوں کی دستگیری کرنی چاہیئے وقت پر انکار نہ کرے، اور پھر جس وقت لکھنے کے لئے بیٹھیں تو بول بول کر لکھوانا چاہیئے اس شخص کو جس کے ذمہ حق ہے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اقرارنامہ ہوتا ہے یہ بھی اسی کی زبان سے جاری ہونا چاہیئے، مثلاً جس کے ذمہ بیع سلم کی صورت میں مبیع ہے یا جس کے ذمہ ادھار بیع کی صورت میں ثمن ہے یا جس نے قرض لیا ہے وہ اپنی زبان سے بول کر لکھوائے اور یہ لکھواتے وقت بھی اللہ سے ڈرے اور کسی قسم کی کمی بیشی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اور اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے وہ بے عقل سا ہے اپنے امور کا خود متولی نہیں، سفیہ ہے یا وہ ایسا ضعیف ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے نہیں لکھوا سکتا بوڑھا ہے بہت زیادہ بولنے سے تکلیف ہوتی ہے یا بچہ ہے ادا پہ قادر نہیں یا وہ کسی وجہ سے لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا گونگا ہے یا وہ زبان نہیں سمجھتا تو پھر جو اس کا کارکن ہے اس کا ولی امور وہ لکھوائے اور وہ بھی انصاف کی رعایت رکھے۔

اور پھر اپنے مردوں میں سے دو گواہ بنالیا کرو، فیصلہ کا مدار اصل کے اعتبار سے شہادت پر ہے، فیصلہ جات میں تحریر کا اعتبار نہیں ہوتا جب تک کہ اس تحریر کے اوپر شہادت نہ ہو جیسا کہ فقہ میں لکھا ہوا ہے ''الخط یشبہ الخط'' کہ خط خط کے مشابہ ہو سکتا ہے اس لئے تحریر یاد دہانی اور وثوق کا ذریعہ ہے ورنہ فیصلہ اصل کے اعتبار سے شہادت پر ہوتا ہے، خط کے اندر اختلاف ہو سکتا ہے جب تک اس کے اوپر شہادت نہ ہو اس وقت تک وہ قابل اعتماد نہیں ہوتا، اس لیے لکھتے وقت دو گواہ بھی بنالیا کرو اصل تو یہی ہے کہ دو مردوں کو گواہ بناؤ، رجال کا لفظ بول دیا جس سے معلوم ہو گیا کہ گواہ بالغ ہونے چاہئیں اور پھر ''رجالکم'' کہا تو معلوم ہو گیا کہ گواہ مؤمن ہونے چاہئیں اور آگے ''ممن ترضون'' ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ پسندیدہ ہونے چاہئیں، یعنی فریقین کے نزدیک وہ قابل اعتماد ہوں، اور یہی شرطیں فقہاء نے ذکر کی ہیں کہ شاہد عاقل ہو، بالغ اور مسلم اور عادل ہو۔

اور اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں یہ دو گواہوں کے قائم مقام ہو جائیں گے، صرف خالص عورتوں کی شہادت ایسے معاملات میں معتبر نہیں ہے ایک مرد ساتھ ہو اور دو عورتیں ہوں، عورتوں کے اندر تعدد اس لئے ہے کہ عورتیں بسا اوقات اپنا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہیں ان میں سے کوئی ایک غلطی کر رہی ہو یا بیان کا کوئی حصہ چھوڑ رہی ہو تو دوسری اس کو یاد دلا دے گی دونوں کا بیان مل کر مرد کے قائم مقام ہو جائے گا، اور آگے شہداء کو تاکید کردی کہ جب تمہیں گواہ بننے کے لئے بلایا جائے تو شہداء کو چاہیئے کہ انکار نہ کریں ایک

دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے، کیونکہ حقوق کا تحفظ، صحیح فیصلہ کا مدار ہی شہادت پر ہوتا ہے اور اگر ایک دوسرے کے معاملہ میں انسان گواہ بننا نہ چاہے تو پھر یہ معاملہ صحیح طریقہ سے ادا نہیں ہوسکتا۔

اور آگے فرمایا "لاتسئموا" اکتانہ جایا کرو اس معاملہ کو لکھنے سے چھوٹا ہو یا بڑا ہو، اس سے اکتایا نہ کرو، اس رکوع میں امر و نہی کی صورت میں جتنے احکام دیے جا رہے ہیں فقہاء کے نزدیک یہ استحباب کے درجہ میں ہیں اگر ایک دوسرے کا اعتبار کرلیا جائے کہ قرضہ دے دیا تحریر نہیں لی گواہ نہیں بنائے تو یہ جائز ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شفقت ہے کہ آپ کو ایسے طریقے بتائے جا رہے ہیں کہ کل کو آپس میں جھگڑے کی نوبت نہ آجائے، یا کسی کی حق تلفی نہ ہوجائے اس لئے احتیاط کرو اور کل کے فساد سے آج کی احتیاط بہتر ہے، لکھنے میں اور گواہ بنانے میں یہی حکمت بیان کی جارہی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ انصاف کا باعث ہے کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی، شہادت کو زیادہ قائم رکھنے والا ہے کہ جب لکھا ہوا موجود ہوگا اور گواہ اس لکھے ہوئے کو دیکھیں گے تو ان کو سارا واقعہ یاد آجائے گا، اور پھر یہ لکھا ہوا آپ کے پاس پڑا ہوگا گواہی اس کے اوپر ہوگی اقرار والے کا اقرار ہوگا تو آپ کے دل میں شبہ پیدا نہیں ہوگا کہ کہیں وہ دبا نہ جائے گویا کہ ایک وثوق کی چیز آپ کے پاس موجود ہے۔

ہاں البتہ اگر کوئی معاملہ نقد بنقد کیا ہے چیز لی اور پیسے دیئے تو پھر نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر کوئی بڑی خرید وفروخت ہے تو آپس میں گواہ بنالو جیسے بھینس خریدی چالیس، پچاس ہزار کی چاہے پیسے نقد دے دیے لیکن پھر بھی دو آدمی موجود ہوں تاکہ پھر دوبارہ کوئی غلط بیانی نہ کردے اور بھینس والا کہہ دے کہ تو نے پیسے تو دیے نہیں اور بھینس لے جارہا ہے اب بھینس تو سب کو نظر آرہی ہوگی کہ اس کی ہے اور یہ اس کے گھر سے کھول کر لایا ہے اور پیسے کسی کو نظر نہیں آئیں گے تو پھر فیصلہ کس طرح کریں گے، اس لیے اگر کوئی بڑا سودا ہو تو پھر بھی احتیاط اسی میں ہے کہ اس کو ضبط تحریر میں لایا جائے گواہ بنالیے جائیں۔

"ولایضار کاتب ولاشھید" کاتب اور گواہ کو چاہیئے کہ وہ بھی نقصان نہ پہنچائے صحیح لکھے اور صحیح گواہی دے اور کاتب اور گواہ کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے یہ بھی ایک بہت بڑی حکمت کی بات ہے، آج ہمارا نظام عدالت جو خراب ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ نظام شہادت ٹھیک نہیں ہے، اول تو کوئی شخص جلدی سے گواہ بننے کی جرأت نہیں کرتا کیونکہ گواہ بن جانے کے بعد پھر کئی کئی سالوں تک جب عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں اس سے انسان تنگ آجاتا ہے کاروباری آدمی کو اپنا کام چھوڑنا پڑتا ہے اور پھر فریق مخالف کی طرف سے گواہوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں، ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، عداوتیں پیدا ہوجاتی ہیں کہ ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو، ان سب چیزوں سے شریف آدمی ڈرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اچھے آدمی گواہ بنتے نہیں اور گھٹیا قسم کے لوگ گواہ بنالئے جاتے ہیں اور ان سے پھر مرضی کے مطابق گواہی لی جاتی ہے تو جب یہ نظام شہادت خراب ہوگا تو نظام عدالت تو ساتھ

خراب ہونا ہی تھا، کیونکہ عدالت کا دارومدار ہی شہادت پر ہے جب تک گواہ صحیح نہیں ہوں گے واقعہ صحیح بیان نہیں کریں گے اس وقت تک حاکم وقت صحیح فیصلہ کیسے دے سکتا ہے۔

اس لئے کہا جا رہا ہے کہ کاتب اور شہید میں بھی جذبہ یہ ہونا چاہیئے کہ کسی فریق کو نقصان نہ پہنچایا جائے، جھوٹا بیان نہ دے، جھوٹی تحریر نہ لکھے، اور اس طرح لوگوں کو بھی چاہیئے کہ اس کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں، پھر حقوق کا تحفظ نہیں ہوگا اور حقوق تلف ہو جائیں گے اگر تم ایسا کرو گے تو یہ گناہ ہے جو تمہیں چمٹا ہوا ہے، اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے، یہ احکام کے بیان میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا حوالہ اور اللہ سے ڈرنے کی تلقین یہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اسلامی آئین کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ انسان کے جذبات کو ساتھ ساتھ سنوارتا ہے، تو جب اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے اوپر اعتماد ہوگا اللہ تعالیٰ کا تقویٰ انسان کو حاصل ہوگا پھر جیسے کیسے بھی حالات ہوں انسان صحیح بات کہنے کی کوشش کرے گا، اور صحیح کام کرنے کی کوشش کرے گا، تو احکام کا قابل قبول ہونا ان صفات کے استحضار سے ہوتا ہے اور انسان کا عمل سیدھا تبھی ہوتا ہے جب اللہ کے تقویٰ اور اس کے علم کا استحضار ہو کہ اگر کوئی کسی قسم کی کوتاہی کروں گا تو وہ اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اور اگر تم سفر پر ہو اور وہاں پر کوئی کتاب کا سامان نہیں ملتا کاغذ قلم نہیں ہے یا کوئی لکھنے والا نہیں ہے تو پھر کچھ اشیاء، دوسرے کے قبضہ میں بطور رہن کے دے دیا کرو یہ وثوق کا ذریعہ بن جائیں گی، اور کتاب الرہن جو فقہ کے اندر مذکور ہے وہ سب اسی کے احکام پر مشتمل ہے، یہ بھی استحباب کے طور پر ہی ہے پھر اگر بعض بعض کا اعتبار کرے رہن بھی نہیں لیتا تحریر بھی نہیں کرتا گواہ بھی نہیں بناتا تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ اپنے حق لازم کو ادا کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے یہ نہ سوچے کہ جب کوئی دوسرا دیکھنے والا نہیں کسی دوسرے کے علم میں نہیں تو میں انکار کر دوں ایسا نہیں کرنا چاہیئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈر کر جو اس کا پروردگار ہے صاحب حق کا حق صحیح صحیح ادا کرنا چاہیئے، اور پھر آگے فرمایا کہ گواہی کو چھپایا نہ کرو جو واقعہ دیکھا ہے اس کو صحیح صحیح بیان کرو جو گواہی کو چھپائے گا پس بے شک اس کا دل گناہ گار ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ

اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے اگر ظاہر کروگے تم اس بات کو جو

اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

تمہارے دلوں میں ہے یا اس کو چھپاؤ گے تو اللہ تعالیٰ محاسبہ کرے گا اس کے ذریعہ سے تمہارا پھر بخش دے گا جس کو چاہے گا

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٨٤﴾ اٰمَنَ

اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے ﴿٢٨٤﴾ ایمان لے آیا

الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ

رسول اس چیز پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور ایمان لے آئے مؤمن، ہر کوئی ایمان لے آیا

بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کہ ہم فرق نہیں ڈالتے کسی کے درمیان

مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا

ان رسولوں میں سے اور ان سب نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور قبول کرلیا ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار!

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا

اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے ﴿٢٨٥﴾ نہیں تکلیف دیتا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو مگر اس کی وسعت کے مطابق، اس نفس کے لئے ہے جو کچھ

كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ

اس نے کمایا اور اس پر ہے جو اس نے کیا اے ہمارے پروردگار! ہم سے مواخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا

اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي

ہم خطاء کرجائیں، اے ہمارے پروردگار! نہ لاد ہم پر مشکل احکام جیسا کہ لاد دیئے تھے تو نے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ

ان لوگوں پر جو ہم سے پہلے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم سے نہ اٹھوا ایسی چیز جس کی ہمیں طاقت نہیں

وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا
ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے اور ہمارے اوپر رحم کردے تو ہمارا مولا ہے، پس تو ہماری مدد کر
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾
کافر لوگوں کے خلاف ﴿۲۸۶﴾

آخری دو آیتوں کی فضیلت:

اس آخری رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں ان کا حاصل بھی یہی ہے کہ انسان ظاہر و باطن سے اللہ تعالیٰ کے سامنے صاف ستھرا ہے اور پھر دعا بھی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو جو جان بوجھ کے ہو جائیں، غلطی سے ہو جائیں جیسی کیسی بھی ہیں معاف فرمائے اور مصائب جو تکوینی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں وہ بھی ہم پر کوئی ناقابل برداشت صورت میں نہ آئیں اور احکام بھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترتے ہیں وہ بھی مشکل نہ ہوں جیسے پہلی امتوں کے اندر اتارے گئے، یہ دعائیں تلقین فرمائیں اور حضور ﷺ نے ان آیات کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص ان آخری دو آیتوں کو رات کو سونے سے قبل پڑھ لے تو یہ آیتیں رات کے وظائف کے قائم مقام ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ شر سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سید انور شاہ رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق ''کفتاہ'' کا لفظ جو حدیث شریف میں آیا ہوا ہے کہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں جو پڑھ لے اس کے لئے وہ کافی ہو جاتی ہیں (مشکوٰۃ ص ۱۸۵) عام طور پر تو اس کا مطلب یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ اگر وظائف نہ ہو سکیں تو یہ پڑھی ہوئی کافی ہو جاتی ہیں، حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے کہ رات کو قرآن کریم کا کچھ حصہ ضرور پڑھے، قرآن کریم کا یہ حق ہے اگر قرآن کو نہ پڑھا جائے تو قرآن کریم کو یہ شکایت ہوگی لیکن اگر کوئی شخص سورۃ البقرۃ کی یہ دو آیتیں ہی پڑھ لیتا ہے تو قرآن کریم کے حق کی ادائیگی کے لیے ان دو آیتوں کی تلاوت ہی کافی ہے یعنی اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم یہ دو آیتیں ہی پڑھ لینی چاہئیں۔

کیا انسان کے تمام خیالات پر گرفت ہوگی؟

اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اگر ظاہر کرو تم ان باتوں کو جو تمہارے دل میں ہیں یا تم ان کو چھپاؤ اللہ تم سے محاسبہ کرے گا اب ''مافی انفسکم'' کے اندر عموم ہے جس سے بظاہر ذہن اس بات کی طرف جاتا ہے کہ دل کے جو خیالات بھی ہیں وہ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے اور آپ جانتے ہیں کہ

خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو انسان سوچ سوچ کے اپنے دل میں بٹھاتا ہے جس میں فعل قلب کے طور پر انسان کو اختیار ہے مثلاً آپ کسی کے متعلق کینہ، بغض، حسد رکھتے ہیں یا کوئی عقیدہ جماتے ہیں یہ افعال اختیاریہ ہیں جو قلب سے صادر ہوتے ہیں۔

اور بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو بلا اختیار قلب سے صادر ہوتے ہیں جس کو ہم وسوسہ سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ روایات میں آتا ہے (مشکوۃ ص ۱۹) کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہتے تھے یا رسول اللہ! ہمارے دلوں میں ایسے خیالات آتے ہیں کہ ہم جل کر کوئلہ ہونا تو گوارہ کرلیں لیکن ان باتوں کو اپنی زبان پر لانا گوارہ نہیں کریں گے، اس قسم کے خیالات انسان کے دل میں آتے ہیں تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمادی کہ اس قسم کے غیر اختیاری خیالات کے اوپر گرفت نہیں ہے بلکہ بسا اوقات اس قسم کے وسوسوں کا آنا انسان کے ایمان کی علامت ہے، اور اس برے خیال کے آنے کے ساتھ قلب کے اندر انقباض کا پیدا ہونا یہ بھی علامت ہے اس بات کی کہ انسان کے قلب کا مزاج صحیح ہے اور اس کا ایمان درست ہے۔

البتہ اختیاری امور کے اوپر گرفت ہے اور اچھے اخلاق پر ثواب ہے، اخلاق رزیلہ کے اوپر گرفت ہے، عقائد فاسدہ پر گرفت ہے، عقائد صحیحہ پر ثواب ہے تو امور اختیاریہ جو قلب سے صادر ہوتے ہیں ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کا محاسبہ ہے اور غیر اختیاری پر نہیں لیکن یہاں چونکہ لفظ عام آیا ہوا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذہن ادھر گیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا کہ یا رسول اللہ! اس وقت تک تو اللہ کے احکام ایسے آئے جو ہمارے بس میں تھے اب اگر دل کے خیالات پر بھی محاسبہ شروع ہو گیا تو ہم میں سے کون بچے گا، کیونکہ دل کے خیالات تو بس میں نہیں ہیں تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ادب کے طور پر یہ بات سکھائی کہ تمہیں اس سے کیا؟ اللہ کی طرف سے جو حکم ہو تمہیں اس کو قبول کرنا چاہیئے ایسا نہ کرو جیسے یہودیوں نے کہا "سمعنا وعصینا" کہ سن لیا لیکن مانا نہیں۔

ہمارا کام تو یہ ہے کہ جو اللہ کی طرف سے آجائے اس کو قبول کرلیں باقی یہ اللہ کی مرضی جس طرح چاہے معاملہ کرے، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین پر اس طرح ایمان کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی آیا اس کو قبول کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی تعریف کی اور اس کے بعد اس کی وضاحت کردی کہ اللہ تعالیٰ وسعت سے زائد کسی کو تکلیف نہیں دیا کرتا اس لئے "مافی انفسکم" سے مراد بھی ایسی چیزیں ہیں جو تمہارے بس میں ہیں اور جو تمہارے بس میں نہیں ہیں ان کے اوپر اللہ کی طرف سے نہ تکلیف ہے اور نہ اس کے اوپر کوئی محاسبہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا اظہار:

"فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء" پھر بخشے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا، ان الفاظ سے آپ کا ذہن ادھر نہ جائے کہ چاہے ایک آدمی اچھا ہو اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا چاہے ایک آدمی برا ہو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا اگر چہ قدرت اللہ کی ہے لیکن ان لفظوں کا یہ مطلب نہیں ہے ان لفظوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلہ میں کوئی شخص حائل نہیں ہو سکے گا جس کو چاہے گا اللہ معاف کرے گا لیکن معاف کرنا اس کو چاہے گا جو معافی کے قابل ہے اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور لیکن عذاب اسی کو دے گا جو گناہ گار ہے، جس کو چاہے گا کا مطلب یہ ہے کہ کوئی آگے رکاوٹ نہیں ڈال سکتا اللہ تعالیٰ جو کچھ کرے گا اپنی قدرت کاملہ کے مطابق کرے گا، اور اپنی حکمت کے تحت طے شدہ قانون کے مطابق کرے گا۔

اس لئے واقعہ یوں ہی ہے کہ کافر کو جنت میں نہیں ڈالے گا اور مؤمن کامل کو جہنم میں نہیں ڈالے گا لیکن مؤمن کامل کو جنت میں بھیجنا یہ بھی اس کی مشیت سے ہے اور کافر کو جہنم میں بھیجنا یہ بھی اس کی مشیت سے ہے کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کو مجبور کر کے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے خلاف فیصلہ نہیں کروا سکتا، جس کو چاہے گا بخشے گا بخشنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا عذاب دینے سے کوئی نہیں روک سکتا، اللہ تعالیٰ یہ اپنے اختیار کو ذکر فرماتے ہیں کہ میرا اختیار ہے میں جس کو چاہوں گا بخشوں گا جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا، میرے فیصلہ پر کوئی دوسرا آدمی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

" آمن الرسول " یہ ان کے ایمان کی تعریف ہے کہ ایمان لے آیا رسول اس چیز پر جو اس کی طرف اتاری گئی اس کے رب کی طرف سے رسول سے سرور کائنات ﷺ مراد ہیں، اور مؤمنوں نے یعنی جو پہلے ایمان لا چکے ہیں اس نئی آنے والی بات کو قبول کر لیا ہے ہر کوئی ایمان لے آیا ہے اللہ پر اس کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں ڈالتے تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، یہاں فرق مراتب مراد نہیں ہے بلکہ ایمانی فرق مراد ہے، فرق مراتب تو منصوص ہے جس کی تفصیل " تلك الرسل فضلنا بعضهم علىٰ بعض " کے تحت گذر چکی ہے، فضیلت تو بعض کو بعض پر ہے تفضیل کا یہاں انکار نہیں تفریق کا معنی یہ ہے کہ ان میں فرقے بنا لئے جائیں کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں ایسا نہیں کرتے سب رسولوں کو مانتے ہیں اور انہوں نے یہ کہا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا ہم تیری مغفرت طلب کرتے ہیں اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اس کی وسعت کے مطابق تکلیف دیتا ہے:

"لایکلف اللہ نفسا الا وسعھا" یہ اس مسئلہ کی وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ تکلیف نہیں دیتا کسی نفس کو مگر اس کی گنجائش کے مطابق، اسی کے نفع میں ہے جو اس نے نیکی کی اور اسی پر وبال پڑے گا جو اس نے برائی کی تو کسب کے اندر اختیار کی طرف اشارہ ہے کہ اپنے اختیار کے ساتھ نیکی کریں گے تو اس کا فائدہ ہے اور اختیار کے ساتھ برائی کریں گے تو وبال اسی پر ہے، یہ ہے براہ راست جن چیزوں کا ثواب وعذاب انسان کو ہوگا اس میں تو اپنے کسب کا اعتبار ہے اور بالواسطہ بغیر کسب کے بھی آسکتا ہے لیکن کسب اس میں بھی پایا جاتا ہے، اگرچہ کچھ مخفی ہے جیسے ایک اچھا طریقہ کسی نے اپنے اختیار کے ساتھ جاری کردیا اب یہاں اس کا کسب ہے ثواب ملے گا، اور اسی طرح میں اپنے اختیار کے ساتھ کوئی نیکی کرتا ہوں اور اس کا ثواب دوسرے کو بخش دیتا ہوں تو چاہے اس میں بظاہر اس کا کسب نہیں پایا گیا، لیکن یہ ثواب اس کو پہنچ جاتا ہے، یہ ہے بالواسطہ، بلاواسطہ انسان کے اوپر عذاب وثواب اسی چیز کا ہوگا جو اس نے اپنے اختیار کے ساتھ اچھائی یا برائی کی ہے باقی واسطہ بننے کے طور پر برائی کا عذاب بھی پہنچے گا کہ بری رسم جاری کردی اور آگے جتنے عمل کریں گے سب کے برابر اس کو وبال ہوگا جیسا کہ روایات کے اندر صراحت ہے۔

اہم دعاؤں کی تلقین:

"ربنا لاتؤاخذنا" یہاں دعائیں تلقین فرمادیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہم سے مواخذہ نہ کرنا اگر ہم بھول جائیں یا ہم چوک جائیں، یعنی تیرا حکم وقت پہ یاد نہیں رہا یا یاد تو تھا لیکن ہم زبان سے کہنا کچھ چاہتے تھے نکل کچھ گیا، کرنے کچھ لگے تھے ہاتھ سے کچھ اور ہوگیا جس طرح قتل خطا میں ہوتا ہے کہ ہم نے گولی تو ماری ہرن کے لیکن لگ گئی کسی انسان کو تو اس پر آخرت میں گناہ نہیں اس میں مواخذہ دنیا میں ہی ہے، اے ہمارے پروردگار! ہم پر مشکل احکام نہ ڈالنا جیسا کہ تو نے مشکل احکام کا بوجھ ڈالا تھا ہم سے پہلے لوگوں پر، اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسے مصائب نہ ڈال جن کے برداشت کی ہم میں طاقت نہیں، ہم سے درگزر کر یا جو ہم سے نسیان اور خطا ہوگیا اس کو معاف کردے اور ہمارے گناہوں کو ڈھانپ دے اور ہمارے اوپر رحم کر، ہمیں مصیبتوں سے بچا تو ہمارا کارساز ہے پس تو مدد کر ہماری کافرلوگوں کے خلاف۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید
ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین
صدق اللہ العظیم
محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر
قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
انا خاتم النبیین لا نبی بعدی
میں "خاتم النبیین" ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں
کتبہ الفقیر نفیس الحسینی غفر اللہ ذنوبہ وستر عیوبہ ○ دار النفائس ○ کریم پارک لاہور

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

(اے ہمارے ربّ!)

ہمیں معاف فرما اور ہماری مغفرت فرما اور ہمارے اوپر رحم فرما

حکیم العصر حضرت الشیخ مدظلہٗ العالی کی درسی تفسیر

تبیانُ الفرقان

الجزءالاوّل

سورۃ الفاتحہ وسورۃ البقرہ پر مشتمل

آپ کے پیشِ خدمت ہے۔ انشاءاللہ العزیز بتدریج قرآنِ پاک کی یہ مکمل تفسیر آپ کے زیرِ مطالعہ ہوگی۔

- ☆ طالبانِ علم کے لیے ایک انمول تحفہ
- ☆ علماء وخطباء حضرات کے لیے توشۂ خاص
- ☆ عوام الناس کے لیے عقائد واعمال کی اصلاح کا ذریعہ

قارئین سے گذارش ہے کہ قرآن کریم کی مکمل تفسیر کی جلد از جلد طباعت کے لیے رب العزت کے حضور دعا گو رہیں۔